کلیات رسائل نور سے ملخوذ
مکتوبات
www.KitaboSunnat.com
تالیف
بدیع الزمان سعید نورسی
کتاب محل

کلیات رسائل نور سے ماخوذ
مکتوبات
تالیف
بدیع الزمان سعید نورسی
کتاب محل
DATA ENTERED
www.KitaboSunnat.com
3153

نام کتاب : مکتوبات (Urduca Mektubat)

مصنف : بدیع الزمان سعید نورسیؒ

ناشر : RNK and Pak Nur Foundation

طباعت : کتاب محل لاہور

0300-4827500,0321-8836932
0348-4078844,0311-7004893

طبع اوّل : اپریل 2017ء

قیمت : -/1200
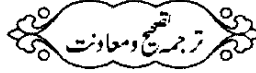
ثناء اللہ شاہد، محمد عثمان اجمل، مصطفیٰ کچھ، افضل حسین، عبدالرحمٰن آراز

جمیل اُزترک، صالح سونمز، محمود آراز، منیر توران

مصطفیٰ کچھ، محمد عثمان اجمل

0336-5923336,0300-8127507
0333-1708174,0333-5130243

URL : http://www.rnk.com.tr
E-mail: info@rnk.com.tr
Tel: +902125121006-07

فہرست مکتوبات

☆ ☆ ☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبه نستعين

پہلا مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

چار سوالوں کے مختصر جوابات

پہلا سوال: خضر علیہ السلام بقید حیات ہیں یا نہیں؟ اگر بقید حیات ہیں تو پھر کچھ اہم علماء ان کے زندہ ہونے کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟

الجواب: وہ بقیدِ حیات ہیں۔ لیکن زندگی کے پانچ مراتب ہیں، اور وہ دوسرے مرتبے میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اُن کی زندگی کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

زندگی کا پہلا طبقہ:

ہماری یہ زندگی ہے جو کہ بہت سی قیود میں مقیّد ہے۔

زندگی کا دوسرا طبقہ:

خضر اور الیاس علیہما السلام کی زندگی ہے۔ یہ زندگی بندھنوں سے کسی حد تک آزاد ہے۔ مطلب یہ کہ یہ دونوں پیغمبر ایک ہی وقت میں بہت سی جگہوں میں موجود ہو سکتے ہیں، یہ ہماری طرح ہمیشہ بشری لوازم میں مقید نہیں ہیں، چنانچہ یہ جب چاہیں ہماری طرح کھاتے پیتے تو ہیں لیکن ہماری طرح مجبور نہیں ہیں۔۔۔

اصحابِ کشف وشہود اولیاء کرام کے خضرؑ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات جو کہ تواتر کے درجے تک پہنچ چکے ہیں، زندگی کے اِس دوسرے طبقے پر روشنی ڈالتے اور اس کا اثبات کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ولایت کے مقامات میں سے ایک مقام ''مقامِ خضر'' کے نام سے معروف ہے۔ جو ولی اس مقام تک پہنچ جاتا ہے وہ براہِ راست خضرؑ سے درس لیتا ہے اور ان کے ساتھ ہم نشینی کرتا ہے۔ لیکن بسا اوقات مقام خضر پر فائز ہو جانے والے ولی کو غلطی سے خود خضر ہی سمجھ لیا جاتا ہے!

زندگی کا تیسرا طبقہ:

سیدنا ادریس اور عیسیٰ علیہما السلام کی زندگی کا طبقہ ہے یہ لوگ بشری لوازمات سے پاک فرشتوں جیسی زندگی گزارتے

ہیں اور ایک قسم کی نورانی لطافت کا اکتساب کر لیتے ہیں۔ اور آسمانوں میں اپنے ان دنیاوی جسموں کے ساتھ پائے جاتے ہیں جو بعینہٖ مثالی بدن کی لطافت اور نجمی بدن کی نورانیت سے بہرہ ور ہیں۔

اس ضمن میں جو ایک حدیث آتی ہے کہ: ''عیسیٰ آخری زمانے میں آئیں گے اور شریعتِ محمدیہ عَلَـى صَاحِبِهَا التَّحِيَّةُ وَالسَّلَامُ کے مطابق عمل کریں گے''، اس کا مطلب یہ ہے کہ: آخری زمانے میں عیسائی مذہب الوہیت کے انکار اور طبیعی فلسفے سے جنم لینے والے کفر کے دھارے سے پاک صاف اور خرافات سے الگ تھلگ ہو جائے گا اور اسلامی رنگ میں رنگا جائے گا۔ چنانچہ ان حالات میں جس طرح عیسائیت کا معنوی شخص آسمانی وحی کی تلوار کے ساتھ اس ہولناک الحاد کے معنوی شخص کو قتل کر دے گا، اسی طرح عیسیٰ عیسائیت کے معنوی شخص کی نمائندگی کریں گے اور الحاد کے معنوی شخص کی نمائندگی کرنے والے دجال کو قتل کر دیں گے مطلب یہ کہ وہ دجال کے الوہیت کے انکار پر مبنی طرزِ فکر کو قتل کر دیں گے۔

زندگی کا چوتھا طبقہ:

شہداء کی زندگی ہے۔ قرآنِ کریم کی نص کے مطابق شہداء ایک ایسی زندگی سے بہرہ ور ہیں جو اہلِ قبور کی زندگی سے بالاتر حیثیت کی حامل ہے۔

جی ہاں؛ اللہ تعالیٰ اپنے کمال فضل و کرم سے شہداء کو عالم برزخ میں ایک ایسی زندگی عطا کر دیتا ہے جو دنیاوی زندگی کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے، لیکن زندگی کی کدورت اور دَرد و اَلم سے پاک ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس دنیاوی زندگی کو راہِ حق میں فدا کر دیا۔ وہاں ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مر چکے ہیں بلکہ ان کے علم میں یہ بات ہوتی ہے کہ ایک خوبصورت ترین جہان میں آ گئے ہیں، چنانچہ وہ کامل سعادت مندی کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور انہیں موت کی وجہ سے حاصل ہونے والے دردِ جدائی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اہلِ قبور کی روحیں اگرچہ باقی رہتی ہیں لیکن انہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ مر چکے ہیں، اس لیے وہ لذت اور سعادت جس سے یہ لوگ عالم برزخ میں لطف اندوز ہوتے ہیں، وہ شہداء کو حاصل ہونے والی لذت و سعادت کی ہم پلہ نہیں ہوتی۔ بالکل ایسے جیسے دو شخص خواب میں کسی جنت جیسے محل میں داخل ہوتے ہیں۔ اب اُن میں سے ایک تو یہ بات جانتا ہے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے خواب میں ہے، اس لیے اُسے حاصل ہونے والی لذت اور ذائقہ بہت ناقص ہوتا ہے اور یوں وہ دل میں کہتا ہے: ''میں بیدار ہو جاؤں گا تو یہ لذت ختم ہو جائے گی'' لیکن دوسرا آدمی اسے خواب کا معاملہ نہیں سمجھتا ہے اس لیے وہ حقیقی لذت پا کر حقیقی سعادت کا مظہر بن جاتا ہے۔

یُوں عالم برزخ میں مردگاں کے برزخی زندگی میں مقید ہونے میں اور شہداء کے اس سے لطف اندوز ہونے میں واضح فرق ہے۔۔۔

غیر محدود واقعات وروایات کی رُو سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ شہداء اس طرح کی زندگی سے بہرہ ور ہیں اور وہ اپنے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ حتیٰ کہ سید الشہد احمزہؓ نے ان لوگوں کی حفاظت کی تھی جو اُن کی پناہ میں آئے تھے اور ان کی دنیاوی ضرورتیں بھی پوری کی تھیں، ایسے واقعات کئی بار وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ زندگی کے اس طبقے پر ایسے بہت سے واقعات کے ذریعے روشنی ڈال دی گئی ہے اور اسے واضح طور پر ثابت کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ خود میرے ساتھ کچھ اسی طرح کا واقعہ پیش آچکا ہے اور وہ اس طرح کہ:

میرا بھانجا ''عُبید'' جو کہ میرا شاگرد بھی تھا، اسے میرے پاس ہی میرے بدلے میں شہید کر دیا گیا۔ میں نے اپنے نزدیک ایک سچے خواب میں دیکھا کہ میں زمین کے نیچے اُس کی قبر میں داخل ہوا جو کہ ایک گھر کے ساتھ مشابہت رکھتی تھی۔ میں وہاں سے تین مہینے کی مسافت پر قید میں تھا اور مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اسے دفن کہاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اُسے شہداء کی زندگی والے طبقے میں دیکھا۔ اور میں اس کے علم کے مطابق مر چکا تھا۔ اُس نے یہ بھی ذکر کیا کہ وہ مجھ پر بہت رویا تھا۔ اُسے اپنے بارے میں یہ علم تھا کہ وہ بقیدِ حیات ہے لیکن اُس نے روسی تسلط سے بچنے کے لیے اپنے لیے زمین کے نیچے اچھا سا ایک گھر بنا لیا تھا۔ اب اس جزوی خواب نے کچھ شرائط اور علامات کے ساتھ مجھے اس مذکورہ حقیقت کے بارے میں درجۂ شہود کی حد تک اطمینان عطا کر دیا۔

زندگی کا پانچواں طبقہ:

یہ اہلِ قبور کی روحانی زندگی ہے۔

جی ہاں؛ موت جگہ کی تبدیلی، روح کی آزادی اور ذمہ داری سے سبکدوشی کا نام ہے، معدوم کر دینے، معدوم ہو جانے اور فنا کے گھاٹ اتر جانے کا نام نہیں، چنانچہ اُولیاء کرام کی روحوں کا صورت پذیر ہونا اور اہلِ کشف کے ہاں ظاہر ہونا، تمام اہلِ قبور کا ہمارے ساتھ تعلق میں رہنا اور ہمیں بیداری اور نیند کی حالت میں ایسے غیر محدود واقعات کے متعلق بتانا جو عین مطابق واقع ہوتے ہیں۔۔۔ یہ تمام چیزیں زندگی کے اس طبقے پر روشنی ڈالتی ہیں اور اس کا اثبات کرتی ہیں۔

''انتیسویں مقالے'' نے جو کہ خصوصی طور پر بقائے روح کے متعلق بحث کرتا ہے، زندگی کے اس طبقے کو قطعی دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔۔۔

دوسرا سوال: فرمانِ گرامی: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ جیسی فرقانِ حکیم کی بعض آیات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موت بھی مخلوق ہے اور زندگی کی طرح ایک عظیمُ الشان نعمت ہے، حالانکہ موت بظاہر تحلیل ہو جانے، معدوم ہو جانے، ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہو جانے، زندگی کے بُجھ جانے کا اور لذّتوں کو تہس نہس کر دینے والی چیز کا نام ہے۔۔۔ پس یہ ایک مخلوق اور نعمت کیسے ہو سکتی ہے؟

الجواب: موت- جیسے کہ پہلے سوال کے اخیر میں ذکر کیا گیا ہے- زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی، فارغ البال اور معطل ہو جانے کا، جگہ اور وجود کو تبدیل کرنے کا، ابدی زندگی کی طرف بلانے کا اور اس ابدی زندگی کے آغاز اور اُس کے مقدمے کا نام ہے۔۔۔

تو جس طرح زندگی کا اس دنیا میں آنا خلق و تقدیر کے ساتھ وابستہ ہے، اِسی طرح اِس کا دنیا سے جانا بھی خلق و تقدیر اور حکمت و تدبیر کے ساتھ وابستہ ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ نباتات جو کہ زندگی کے ادنیٰ طبقے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، ان کی موت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ایسی کاریگری کا شاہکار ہیں جو نظم و ضبط کے لحاظ سے خود زندگی سے بھی بلند درجے کی حامل ہے، کیونکہ پھلوں، گٹھلیوں اور بیجوں کی موت جو کہ بظاہر ٹوٹ پھوٹ، پراگندگی، خستگی اور بوسیدگی نظر آتی ہے، درحقیقت ایک مسلسل منظم کیمیاوی عمل سے عبارت ہے اور ان عناصر کو آٹے کی طرح گوندھ کر خمیر بنانے، انہیں انتہائی دقیق اور موزوں صورت میں آپس میں خلط ملط کرنے کا اور ان ذرّات کے انتہائی حکیمانہ انداز میں شکل پذیر ہونے کا نام ہے۔

توان کی یہ نظر نہ آنے والی پُر حکمت اور نظم و ضبط سے بھری موت ہی خوشوں اور بالیوں کی صورت میں نظر آجاتی ہے۔ گویا کہ گٹھلی کی موت خوشے کی موت کی ابتدا ہے۔ بلکہ اس کی عین زندگی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بنا پر موت بھی زندگی کی طرح ایک منظم مخلوق ہے۔۔۔

اسی طرح زندگی سے بہرہ ور ثمرات و حیوانات کا انسانی معدے میں موت سے دوچار ہو جانا ان کا انسانی زندگی کے درجے تک پہنچنے کا آغاز ہوتا ہے، اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ "یہ موت مخلوق ہے اور ان ثمرات و حیوانات کی زندگی سے کہیں زیادہ منظم ہے"

تو جب زندگی کے ادنیٰ اور کمترین طبقے کے ساتھ تعلق رکھنے والی نباتات کی موت پر حکمت اور نظم و ضبط سے بھرپور مخلوق ہے، تو پھر موت جو کہ زندگی کے بلندترین طبقے کے ساتھ تعلق رکھنے والی انسانی زندگی کو لاحق ہوتی ہے زمین میں دبی ہوئی گٹھلی کی موت کی طرح ہوگی جو زمین میں دب گئی اور عالم ہوا میں ضخیم درخت کی صورت میں سامنے آگئی۔ اس بنا پر یہ بات کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ زمین میں چلا جانے والا انسان عالم برزخ میں ایک ابدی زندگی کا خوشہ نکالتا ہے۔

رہی یہ بات کہ موت ایک نعمت ہے، تو اس کی بہت سی جہتوں میں سے ہم چار جہتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

پہلی جہت: یہ سب سے بڑی نعمت ہے، اس لیے کہ یہ انسان کو زندگی کی ذمہ داری سے اور اس میں پائی جانی والی بوجھل تکلیفوں سے آزاد کر دیتی ہے، اس جہت سے موت انسان کے لیے اُس کے ننانوے فیصد اعزاو اقربا سے ملنے کے لیے وصال کا دروازہ بن جائے گی۔۔۔

دُوسری جہت: یہ انسان کو دنیا کے تغیر پذیر مضطرب، متزلزل اور تنگ و تاریک قید خانے سے نکال دیتی ہے۔ اور یوں انسان ایک خوشگوار، مسرور کُن، پُر سکون، وسیع و عریض اور بقا بدوش زندگی کا مظہر بن کر اپنے ہمیشہ رہنے والے محبوب کی رحمت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

تیسری جہت: یہ بڑھاپے جیسے اُن بہت سے اسباب کی موجد ہے جو موت کو زندگی سے بھی کہیں زیادہ بڑی نعمت بنا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر اِس وقت آپ کے بوڑھے والدین کے ہمراہ آپ کے دادا کے آباء و اجداد اپنی خستہ حالی کے ساتھ موجود ہوں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ زندگی کتنی بڑی قسمت اور موت کتنی بڑی نعمت ہے! پھر یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ خوبصورت پھولوں کے عاشق بھونروں اور دوسرے حشرات الارض کی زندگی سردی کی شدّت میں کتنی مشکلات کی زد میں ہوتی ہے اور ان کی موت میں کتنی رحمت پائی جاتی ہے!

چوتھی جہت: جس طرح نیند - خاص طور پر - پریشان حال، مصیبت زدگان، زخمیوں اور مریضوں کے حق میں راحت و رحمت اور استراحت ہے، اِسی طرح موت جو کہ نیند کی بڑی بہن ہے ان پریشان حال اور مصیبت زدگان کے لیے نعمت و راحت ہے جن کی مصیبتیں انہیں خودکشی پر آمادہ کر دیتی ہیں۔۔۔

رہے گمراہ قسم کے لوگ، تو ان کی موت زندگی کی طرح قسمت در قسمت اور عذاب در عذاب ہے، جیسے کہ متعدد مقالات میں قطعی طور پر ثابت کیا گیا ہے اس لیے یہ چیز ہماری اِس بحث کے دائرے سے خارج ہے۔۔۔

تیسرا سوال: جہنم کہاں ہے؟

الجواب: ﴿قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَاللّٰهِ﴾ ﴿وَلَا يَعْلَمُ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾۔۔۔ بعض روایات میں ہے کہ: جہنم زمین کے نیچے ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ کرۂ ارض اپنی سنوی حرکت کے ساتھ ایک میدان کے اردگرد ایک خط کھینچتا ہے جو مستقبل میں حشر کا میدان بنے گا۔

رہی جہنم، تو وہ جیسے کہ ہم نے دیگر مقامات پر واضح کیا ہے_ زمین کے نیچے ہے_ لیکن اس کے نظر نہ آنے اور محسوس نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی آگ ہے جس میں روشنی نہیں ہے اور اس پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ اور زمین اپنے مدار میں گھومتی ہوئی جو طویل مسافت طے کرتی ہے اس میں بہت سی مخلوقات پائی جاتی ہیں لیکن وہ روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتی ہیں۔ اور ہماری آنکھوں کے سامنے بہت سی مخلوقات اور بہت سے کُرے موجود ہیں لیکن بے نور ہونے کی وجہ سے ہم انہیں دیکھ نہیں پاتے ہیں۔ جیسے کہ جب چاند کی روشنی ختم ہو جاتی ہے تو اس کا وجود گُم ہو جاتا ہے۔

جہنم دو ہیں: جہنم صغریٰ اور جہنم کبریٰ۔

جہنم صُغریٰ جہنم کُبریٰ کے لیے بیج کی حیثیت رکھتی ہے، اور عنقریب وہی رُوپ دھار لے گی اور مستقبل میں اُس کی منزلوں میں سے ایک منزل بن جائے گی۔ پس جہنمِ صغریٰ زمین کے نیچے ہے، یعنی اس کے مرکز میں ہے، کیونکہ کسی بھی گول چیز کا نچلا حصہ اس کا مرکز ہوتا ہے۔۔۔

علم طبقاتُ الارض میں یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ زمین کی کھدائی کی جائے تو غالباً ہر تینتیس میٹر کے بعد حرارت ایک درجے بڑھ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرکز تک یہ درجۂ حرارت دو لاکھ تک جا پہنچے گا، یعنی حدیث شریف کے مطابق یہ حرارت دنیا کی آگ سے دو سو گنا زیادہ سخت ہو جائے گی۔ اور وہ اس طرح کہ زمین کے قطر کا نصف تقریباً چھ ہزار کلومیٹر ہے۔

اس جہنم صُغریٰ نے دنیا میں اور عالم برزخ میں ایسے بہت سے وظائف ادا کیے ہیں جن کا تعلق جہنمِ کبریٰ کے ساتھ ہے۔ اس چیز کی طرف احادیث میں اشارہ ملتا ہے۔

کرۂ ارض جس طرح اپنے باسیوں کو حشر کے اُس میدان میں لا پھینکے گا جو اُس کے سنوی مدار میں پایا جاتا ہے، اُسی طرح یہ عالمِ آخرت میں اپنے بطن میں پائی جانے والی جہنمِ صغریٰ کو اللہ کے حکم سے جہنمِ کبریٰ کے سپرد کر دے گا۔

رہا بعض ائمۂ معتزلہ کا یہ قول کہ جہنم موجود نہیں بلکہ بعد میں پیدا کی جائے گی، تو یہ قول سراسر غلط اور کند ذہنی پر مبنی ہے؛ کیونکہ عصرِ حاضر میں یہ بات پورے طور پر کھل کر سامنے نہیں آئی اور اس کا انکشاف کچھ اس انداز سے نہیں ہوا ہے جو زمین کے باسیوں کے ساتھ مکمل طور پر مناسبت رکھتا ہو۔

پھر پردۂ غیب میں پائے جانے والے عالمِ آخرت کی منزلوں کو دکھانے اور انہیں اپنی دنیاوی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے دو میں سے ایک چیز نہایت ضروری ہے: یا تو کائنات کو اتنا چھوٹا کر دیا جائے کہ یہ سمٹ کر دو شہروں کا رُوپ دھار جائے، یا پھر ہماری آنکھیں ستاروں کے حجم جتنی بڑی بڑی ہو جائیں تاکہ ہم ان منزلوں کے موقع محل دیکھ کر ان کا تعین کر سکیں۔۔۔

وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ، البتہ عالمِ آخرت کی منزلیں ہماری ان دنیاوی آنکھوں سے نظر نہیں آتی ہیں، لیکن بعض روایات کے اشاروں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آخرت میں پائی جانے والی جہنم ہماری اس دنیا کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے؛ کیونکہ موسمِ گرما کے بارے میں کہا گیا ہے: "مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ"۔ (حاشیہ)

پس جہنم یہی عظیم آگ ہے جو عقل کی اس چھوٹی سی اور مدھم سی دنیاوی آنکھ سے نظر نہیں آتی ہے، لیکن اسے ہم اسمِ گرامی "الحکیم" کی روشنی سے دیکھ سکتے ہیں، اور وہ اس طرح کہ: زمین کے سنوی مدار کے نیچے پائی جانے والی جہنم کبریٰ نے گویا کہ زمین کے مرکز میں پائی جانے والی جہنم صغریٰ کو اپنا وکیل بنایا ہوا ہے اور وہ اس کے ذریعے اپنے کچھ

(حاشیہ) قال النبی ﷺ: "أَبْرِدُوْا بِالظُّهْرِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ"۔ رواہ البخاری وابن ماجہ واحمد عن ابی سعید الخدریؓ۔ مترجم۔

وظائف ادا کروا رہی ہے۔اور یہ کہ القدیرُ الجلیل کا مُلک بہت زیادہ وسیع ہے۔اس لیے حکمتِ الٰہیہ جس جگہ کا بھی تعیّن کردے گی جہنم کبریٰ وہیں اپنا ٹھکانہ بنا کر ٹھہر جائے گی۔۔۔

جی ہاں؛ وہ قدیرِ ذوالجلال، حکیم ذوالکمال، اور امرِ ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کا مالک جس نے ہماری آنکھوں کے سامنے کمال حکمت وانتظام کے ساتھ چاند کو زمین کے ساتھ باندھا ہوا ہے اور جس نے قدرت وانتظام کی عظمت کے بل پر زمین کو سورج کے ساتھ باندھا ہوا ہے اور جس نے اپنی ربوبیت کی حشمت کے ذریعے سورج کو۔ بالفرض۔ اس کے سیاروں کے ہمراہ لگ بھگ زمین کی سالانہ رفتار سے سورجوں کے سورج کی طرف رواں دواں کر رکھا ہے۔ اور جس نے بجلی کے چراغوں کے چمکتے دمکتے ستاروں کو اپنی ربوبیت کی سلطنت کے تابناک شواہد بنا دیا ہے اور ان کے ذریعے اپنی ربوبیت کی سلطنت اور اپنی قدرت کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔۔۔ ایسی قدیرُ الجلیل ہستی کی کمال حکمت، اُس کی قدرت کی عظمت اور اس کی ربوبیت کی سلطنت سے یہ بات بعید نہیں کہ وہ جہنمِ کُبری کو بجلی کے چراغوں کے ایک کارخانے کی شکل دے دے اور اس کے ذریعے آخرت کی طرف دیکھنے والے ستاروں کو روشن رکھے اور اُس سے اُنہیں حرارت اور قوّت مہیا کرتا رہے، مطلب یہ کہ ستاروں کو جنت سے جو کہ عالمِ نور ہے، روشنی عطا کرتا رہے اور جہنم سے اُن کی طرف آگ اور حرارت بھیجتا رہے۔ اور عین اُسی وقت اس جہنم سے عذاب کے مستحق لوگوں کے لیے رہائش گاہ اور قید خانہ تیار کرتا رہے۔۔۔

اسی طرح وہ فاطرُ الحکیم جو پہاڑ جیسے ضخیم درخت کو ناخن جیسی چھوٹی گٹھلی میں محفوظ رکھتا ہے، اُس فاطرُ الجلیل کی قدرت اور حکمت سے یہ چیز بعید نہیں کہ وہ جہنمِ کبرٰی کو کرۂ ارض کے دل میں پائی جانے والی جہنمِ صغرٰی کی گٹھلی میں محفوظ کر دے!

حاصلِ کلام یہ ہے کہ: جنت اور جہنم ایک ایسی ٹہنی کے دو پھل ہیں جو تخلیق کے درخت سے دراز ہوتی چلی آ رہی ہے اور جھولتی ہوئی ابد کی طرف چلی جا رہی ہے۔ کیونکہ پھل ٹہنی کے آخری سرے پر ہوتا ہے۔

اسی طرح جنت اور جہنم کائنات کے اس سلسلے کے دو نتیجے ہیں۔ اور نتائج کا موقع محل سلسلے کے دونوں سرے ہیں، سفلی اور ثقیل نتیجہ اس کی نیچے والی جانب میں ہے اور عُلوی اور نورانی اُوپر والی جانب میں۔

اسی طرح یہ دونوں زمین کے معنوی شئوون واحوال اور محصولات کے دو مخزن ہیں، اور مخزن کی جگہ محصولات کی انواع واقسام کے حساب سے ہوتی ہے، فاسد اور نکمی محصولات کا مخزن نیچے اور پاکیزہ و کار آمد کا اُوپر ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ دونوں ابد کی طرف بہتی ہوئی موجزن اور رواں دواں موجودات کے لیے دو حوض ہیں۔ اور حوض وہاں بنتا ہے جہاں سیل رواں رُک جائے اور پانی جمع ہو جائے۔ مطلب یہ کہ اس کا گندا، ناپاک اور ناصاف حصہ نیچے ہوتا ہے اور پاکیزہ اور شفاف حصہ اُوپر۔

اسی طرح یہ دونوں لطف وقہر اور رحمت وعظمت کی تجلّی کے دو مقام ہیں۔ اور تجلّی کا موقع محل ہر جگہ پہ ہونا ممکن ہے۔

پس وہ رحمانِ ذوالجمال اور قہارِ ذوالجلال جہاں بھی چاہے وہیں اپنی تجلّی کی نمائش گاہ کھول سکتا ہے۔۔۔

رہا جنت اور جہنم کا وجود، تو اُس کا اثبات دسویں، اٹھائیسویں اور انتیسویں مقابلے میں انتہائی قطعی صورت میں کر دیا گیا ہے۔ البتہ اس مقام پر ہم فقط یہ کہتے ہیں کہ:

جس قدر ٹہنی کا پایا جانا قطعی اور یقینی ہے اُسی قدر پھل کا پایا جانا بالکل قطعی اور یقینی ہے۔ اسی طرح نتیجے کا پایا جانا اُسی قدر قطعی اور یقینی ہے جس قدر سلسلے کا وجود قطعی ہے اور مخزن کا پایا جانا اُسی قدر قطعی اور یقینی ہے جس قدر محصولات کا وجود یقینی ہے۔ حوض کا وجود اُتنا ہی یقینی ہے جتنا نہر کا وجود یقینی ہے۔ اور تجلّی کی نمائش گاہ کا وجود اُتنا ہی قطعی اور یقینی ہے جتنا رحمت اور قہر کا وجود قطعی اور یقینی ہے۔۔۔

چوتھا سوال: اکثر لوگوں میں جو دنیا کے لیے مجازی عشق پایا جاتا ہے، کیا یہ حقیقی عشق میں تبدیل ہو سکتا ہے؟ جیسے کہ دنیاوی محبوباؤں کے ساتھ تعلق رکھنے والا مجازی عشق، حقیقی عشق میں تبدیل ہو جاتا ہے؟

الجواب: جی ہاں؛ دنیا کے فانی چہرے کے ساتھ تعلق رکھنے والے عشق مجازی میں مبتلا عاشق کو جب اس چہرے میں پائے جانے والے زوال وفنا کی بدصورتی و بدنمائی نظر آ جائے اور تب وہ اُس طرف سے اپنا منہ پھیر کر غیر فانی محبوب کی تلاش میں نکل کھڑا ہو، اور اسے دنیا کے اُن دو خوبصورت چہروں پر نظر ڈالنے کی توفیق مل جائے جو اسمائے الٰہیہ کا آئینہ اور آخرت کی کھیتی ہیں، تو اُس وقت وہ غیر مشروع مجازی عشق حقیقی عشق میں تبدیل ہونے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، لیکن ایک شرط کے ساتھ، اور وہ یہ کہ وہ اپنی زندگی کے ساتھ بندھی ہوئی اپنی زوال پذیر اور غیر مستقر دنیا کو خارجی دنیا کے ساتھ خلط ملط نہ کر دے۔ چنانچہ اگر وہ اہلِ ضلالت کی طرح اپنے آپ کو بھول گیا اور آفاق میں سرگرداں ہو گیا اور اپنی خصوصی دنیا کو عمومی دنیا سمجھ بیٹھا، تو پھر نیچر کی دلدل میں گر کر غرق ہو جائے گا، الا یہ کہ دستِ عنایت کسی غیر معمولی اور خارقِ عادت طریقے سے اُسے بچا لے۔۔۔

اس حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لیے مندرجہ ذیل تمثیل میں غور کریں:

یوں سمجھو کہ ہم چاروں ایک مزیّن کمرے میں داخل ہوتے ہیں، کمرے کی چاروں دیواروں پر انسانی قد کے برابر آئینے لگے ہوئے ہیں۔ تب یہ کمرہ پانچ کمرے بن جائیں گے، اُن میں سے ایک کمرہ حقیقی اور عمومی ہو گا اور چار کمرے مثالی اور خصوصی ہوں گے۔ اب ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے آئینے کی وساطت سے اپنے خصوصی کمرے کی شکل، ہیئت اور اُس کا رنگ تبدیل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم اپنے آئینوں پر سرخ رنگ چڑھا دیں تو وہ ہمیں تمام اشیاء کو سرخ رنگ کی دکھائیں گے اور اگر اُن کو سبز رنگ میں رنگ دیں تو وہ تمام اشیاء کو سبز رنگ کا دکھائیں گے۔ اس طرح ہم اپنے آئینوں میں

تصرف کر کے اپنے کمروں کو بہت سی حالتیں اور بناوٹیں دے سکتے ہیں، اور انہیں بہت سی ایسی شکلوں صورتوں میں نمایاں کر سکتے ہیں جوان کمروں کو بدصورت یا خوبصورت بنا دیں۔ لیکن ہم عمومی خارجی کمرے کو آسانی کے ساتھ نہ تو تبدیل کر سکتے ہیں اور نہ اس میں کوئی تصرّف کر سکتے ہیں۔ پس خصوصی اور عمومی کمرے احکام کے لحاظ سے تو مختلف ہیں لیکن حقیقت میں متحد ہیں: پس آپ اپنے خصوصی کمرے کو تو ایک انگلی کے ساتھ بھی منہدم کر سکتے ہیں جبکہ دوسرے عمومی کمرے کا ایک پتھر بھی نہیں ہلا سکتے۔

اس دنیا کی صورتِ حال بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ یہ ایک خوبصورت آراستہ پیراستہ منزل ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کی زندگی انسانی قد کے برابر کا آئینہ ہے، اور ہم میں سے اس دُنیا سے ہر ایک کی ایک اپنی دُنیا ہے اور اُس کا اپنا جہان ہے، لیکن ہماری اس دنیا کا اصل ستون اور اس کا مرکز اور دروازہ ہماری زندگی ہے، بلکہ ہماری دنیا اور ہمارا خصوصی جہان ایک صحیفہ ہے اور ہماری زندگی ایک قلم ہے جس کے ساتھ ایسی بہت سی چیزیں لکھی جاتی ہیں جو ہمارے اعمال کے صحیفے میں داخل ہوتی رہتی ہیں۔ پس اگر ہم اپنی دنیا کے ساتھ محبت کریں، پھر ہمیں نظر آ جائے کہ ہماری یہ دُنیا فانی اور زوال پذیر ہے، اسے ہماری زندگی کی طرح کہیں بھی قرار نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد ہماری زندگی پر رکھی گئی ہے، اس چیز کا ہمیں پوری طرح شعور اور علم ہو جائے، تو اُس کے حق میں ہماری یہ محبت اسمائے الٰہیہ کے نقوش میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ خوبصورت نقوش جن کی ترجمانی ہماری یہ خصوصی دنیا کرتی ہے۔ اور یہ محبت ان اسمائے الٰہیہ کا آئینہ بن جائے۔ اور یہ محبت ان نقوش سے اسمائے حسنیٰ کی تجلیات کی طرف منتقل ہو جائے۔

اسی طرح ہمیں جب اِس بات کا ادراک ہو جائے کہ ہماری یہ خصوصی دنیا آخرت اور جنت کے لیے ایک عارضی کھیتی کا حکم رکھتی ہے، اور یوں ہم اپنے اِس کے ساتھ تعلق، حرص، محبت اور طلب جیسے احساسات کو اِس کے اُن اخروی فوائد میں تبدیل کر دیں جو کہ اس کے نتائج وثمرات اور خوشوں کی حیثیت رکھتے ہیں، تو پھر ہمارا یہ مجازی عشق حقیقی عشق میں تبدیل ہو جائے گا۔ لیکن اگر کوئی خود کو بھول کر ﴿نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ کا مظہر بن گیا، اپنی زندگی کی زوال پذیری کا تصور نہ کر سکا اور اپنی خصوصی ڈانواں ڈول زندگی بعینہٖ عام دنیا کی طرح ثابت و برقرار سمجھتا رہا، دنیا میں گھس گیا اور اپنے تمام حواس کے ذریعے اس کے ساتھ بغل گیر ہو گیا، اور یہ فرض کر بیٹھا کہ وہ کبھی مرے گا ہی نہیں۔۔۔ ایسا آدمی اِس میں غرق ہو جائے گا اور اس کا نام ونشان مٹ جائے گا۔

دنیا کے ساتھ اس طرح کی محبت ایک بہت بڑی مصیبت اور آخری درجے کا عذاب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس محبت سے ایک یتیمانہ شفقت اور نا اُمید قسم کی رقتِ قلبی جنم لیتی ہے، چنانچہ ایسا انسان تمام ذی حیات کے حالات سے دُکھی ہوتا ہے، حتیٰ کہ وہ ان تمام خوبصورت مخلوقات کے بارے میں رقتِ قلبی اور غمِ فراق کے احساسات رکھتا ہے جو فنا وزوال کی زد میں ہیں اور یہ اُن کے لیے کچھ کر نہیں سکتا، اسی بنا پر یہ شخص نا اُمیدی کے عالم میں دکھ اُٹھاتا رہتا ہے۔

لیکن پہلا آدمی جو غفلت کے پنجے سے نجات پا چکا ہے، اس آدمی کو شفقت کے اس شدید دکھ میں ایک قیمتی تریاق مل جاتا ہے، اور وہ اس طرح کہ:

اسے یہ نظر آجاتا ہے کہ وہ تمام ذی حیات جن کی موت کا اُسے دکھ ہوتا ہے، اُن سب کی موت میں اور اُن کے فنا و زوال کی صورت میں ان کی روحوں کے وہ آئینے باقی ہیں جو اُس باقی اور ہمیشہ رہنے والی ذات کے باقی رہنے والے اسمائے گرامی کی دائمی تجلیات کی صورت گری اور ترجمانی کرتے ہیں، تب اس کی یہ شفقت سرور میں بدل جاتی ہے۔

اسی طرح اُسے یہ نظر آجاتا ہے کہ فنا و زوال سے دو چار ہونے والی ان خوبصورت مخلوقات کے پیچھے ایک دائمی نقش گری ہے، مضبوطی داستحکام ہے، تزئیں و آرائش کا سامان ہے، صنعت گری ہے خوبصورت اور روشن ترین بنانے کا عمل جاری ہے جو ایک پاکیزہ جمال اور مقدس حُسن کا شعور بخشتا ہے۔۔۔

اور اسے یہ نظر آجاتا ہے کہ یہ فنا و زوال افزائشِ حسن، تجدیدِ لذت اور تشہیرِ صنعت کی ہی ایک صورت ہے، تب یہ چیز اس کی لذت، شوق اور حیرت میں اضافے کا باعث بن جاتی ہے۔۔۔

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

دوسرا مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

(یہ اُس جواب کا ایک جزء ہے جو آپ کے مذکورہ معروف شاگرد کی طرف سے تحفہ ملنے پر لکھا گیا۔۔۔)

ثالثاً: آپ نے مجھے ایک تحفہ بھیجا ہے، آپ اس سے میرا زندگی کا ایک اہم قاعدہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ: میں آپ کا تحفہ بھی اُسی طرح قبول نہیں کرتا جس طرح اپنے بھائی عبدالمجید اور بھتیجے عبدالرحمان سے قبول نہیں کرتا، اُس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ان دونوں سے سبقت رکھتے ہیں اور میری روح کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے ہر آدمی کا تحفہ ردّ بھی کیا جائے تو آپ کا تحفہ ردّ نہیں کیا جائے گا، لیکن اس شرط پر کہ ایسا صرف ایک بار ہی ہوگا۔

البتہ میں اس مناسبت سے اپنے قاعدے میں پائے جانے والے راز کی وضاحت کیے دیتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ: پرانا سعید کسی کا احسان نہیں اُٹھاتا تھا اور کسی کے زیرِ بارِ احسان ہونے پر موت کو ترجیح دیتا تھا اور اس نے بہت سی تکلیفوں اور مشقتوں کا سامنا کرنے کے باوجود اپنے اس قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ پس تمہارے اس عاجز و درماندہ بھائی کو قدیم سعید سے ورثے میں ملنے والی یہ خصلت کوئی بناوٹی زہد و استغناء کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے چار پانچ سنجیدہ اسباب کارفرما ہیں:

پہلا سبب:

اہلِ ضلالت اہلِ علم پر بے محابا یہ تہمت لگاتے ہیں کہ اہلِ علم اپنے علم کو اپنے گزر اوقات کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اور اُن پر ظلم و زیادتی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علماء علم اور دین کو اپنے روزگار کا وسیلہ بنا لیتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کو اپنے عمل کے ذریعے جھوٹا ثابت کرنا بہت ضروری ہے۔۔۔

دوسرا سبب:

ہم حق کو نشر کرنے کے لیے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی اتباع کے مکلّف ہیں؛ کیونکہ جن لوگوں نے حق کو نشر کیا ہے اُنہوں نے لوگوں سے مکمل استغناء کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے قرآن کریم کی زبان سے کہا ہے: ﴿اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔۔۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ﴾۔ اور سورۃ یٰس کا یہ جملہ ﴿اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْئَلُکُمْ اَجْرًا وَّھُمْ

مُهْتَدُوْنَ﴾ ہمارے اس مسئلے کے بارے میں بڑا پُر مغز ہے۔۔۔

تیسرا سبب:

جیسا کہ "پہلے مقالے" میں واضح کیا گیا ہے، لینا اور دینا اللہ کے نام پر ہونا ضروری ہے۔ لیکن اکثر ایسے ہوتا ہے کہ یا تو دینے والا غافل ہوتا ہے اور اللہ کی بجائے اپنے نام پر دیتا ہے اور اُس دینے کے پیچھے دوسروں پر احسان دھرنے کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں یا پھر لینے والا غافل ہو کر غلطی کر جاتا ہے اور شکر و ثنا کے جذبات کا رُخ منعم حقیقی کی طرف کرنے کی بجائے ظاہری اسباب کی طرف کر دیتا ہے۔۔۔

چوتھا سبب:

توکل، قناعت اور اقتصاد ایک ایسا خزانہ اور ایسی دولت و ثروت ہے جن کا بدل کوئی بھی چیز نہیں ہو سکتی۔ اور میں لوگوں سے اُن کا مال ہتھیا کر ان غیر فانی خزینوں اور دفینوں کے دروازے بند نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس بات پر اُس رزّاق الجلیل کا لاکھوں بار شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے بچپن ہی سے کسی کا احسان اُٹھانے اور ذلت برداشت کرنے سے محفوظ رکھا ہے۔ اور میں اس کے فضل و کرم پر اعتماد کرتے ہوئے اُس کی رحمت سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ میری بقیہ عمر بھی اسی دستور کے مطابق گزرے گی!

پانچواں سبب:

بہت سی علامات و تجربات کی رُو سے سال دو سال کے عرصے سے مجھے لوگوں کا مال لینے اور خاص کر مالداروں اور گورنمنٹ ملازموں کے تحفے لینے کی اجازت نہیں ہے، چنانچہ ان میں سے بعض تو مجھے تکلیف پہنچاتی ہیں، بلکہ انہیں میرے لیے نقصان دہ بنا دیا جاتا ہے اور یوں مجھے ان کے کھانے کی اجازت نہیں ملتی ہے، اور کبھی اُس چیز کو ایسی صورت میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ تو گویا کہ دوسروں کے اموال کو ترک کر دینا اور انہیں قبول نہ کرنا ایک معنوی امر ہے۔ اسی طرح مجھ میں ایک قسم کی وحشت سی پائی جاتی ہے اس لیے میں ہر ایک کو ہر وقت قبول نہیں کر سکتا۔ اگر میں کسی کا تحفہ قبول کروں تو مجھ پر لازم ہو جاتا ہے کہ تحفہ دینے والا جب بھی آئے میں اس کا استقبال کروں اور اس کا احترام و اکرام کروں اور یہ چیز مجھے پسند نہیں ہے۔

اسی طرح میں خشک روٹی کا ٹکڑا کھانے اور سو جگہ سے پیوند لگے کپڑے پہننا پسند کرتا ہوں جو مجھے تصنع اور چاپلوسی سے بچاتے ہیں۔ لیکن دوسروں کی بہترین مٹھائیاں، کھانے اور ان کے بہترین کپڑے پہننے اور اُن کے احترام کے لیے مجبور ہو جانے کو پسند نہیں کرتا۔

چھٹا سبب:

یہ استغناء کا اہم سبب ہے، اور وہ یہ ہے کہ: ابن حجر ہیثمی کہ جن پر ہمارے مذہب میں ترجیحی صورت میں اعتماد کیا جاتا ہے، کہتے ہیں:

''اگر آپ صالح نہیں ہیں تو صالحیت کی نیت سے جو آپ کو دیا جائے اُسے قبول کرنا حرام ہے''۔

اس دور کے لوگ حرص وطمع کی غرض سے اپنے چھوٹے سے ہدیے کو مہنگے داموں بیچتے ہیں؛ چنانچہ وہ میرے جیسے درماندہ ونافرمان انسان کو صالح یا ولی سمجھ لیتے ہیں اور پھر اُسے روٹی دے دیتے ہیں۔

پس اگر میں خود کو۔ حاشاوکلا۔ صالح سمجھتا ہوں تو یہ غرور کی علامت اور عدمِ صالحیت کی دلیل ہے۔ اور اگر میں خود کو صالح نہیں سمجھتا ہوں تو وہ مال قبول کرنا میرے لیے جائز نہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ آخرت رُخی اعمال کے بدلے میں صدقات وخیرات اور تحفے تحائف قبول کرنا آخرت کے دائمی ثمرات کو دنیا میں فانی صورت میں کھا جانے کے مترادف ہوگا۔۔۔

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

تیسرا مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

یہ اُس مکتوب کا جزء ہے جو آپ کے اس معروف شاگرد کی طرف ارسال کیا گیا۔۔۔

خامسا: آپ نے اپنے ایک خط میں اپنی اس رغبت کا اظہار کیا ہے کہ آپ یہاں میرے احساسات میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔۔۔تو پھر ان ایک ہزار احساسات میں سے صرف ایک کو غور سے سنو، اور وہ یہ ہے کہ:

ایک رات میں نے جبلِ "چام" کی چوٹی پر اُگے ہوئے صنوبر کے درخت کی ایک سوگز بلند چوٹی پر بنے ہوئے گھونسلے میں سے آسمان کے خوبصورت اور ستاروں سے مزیّن سنہرے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے آیتِ کریمہ: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ﴾ میں قرآن حکیم نے جو قسم کھائی ہے، اس قسم میں اعجاز کا ایک بلند و بالا نور اور بلاغت کا ایک تابندہ راز نظر آیا۔

جی ہاں؛ یہ آیت جو سیاروں کی طرف اور ان کے چھپ جانے اور پھیل جانے کی طرف اشارہ کر رہی ہے، چشمِ عبرت کے لیے صنعت گری کا ایک بلند آہنگ نقش اور عبرت کی ایک جاذبِ نظر لوح کا منظر پیش کرتی ہے۔۔۔

جی ہاں؛ یہ سیّارے اپنے قائد سورج کے دائرے سے نکلتے ہیں اور نجومِ ثوابت کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں اور یوں آسمان میں نئے نئے نقوش اور صنعت گری کے نئے نئے نمونے آشکار کرتے ہیں۔ کبھی ان میں سے ایک آدھ اپنی ہی طرح کے کسی چمکدار ستارے کا ہمدوش بن جاتا ہے، تب دونوں مل کر ایک خوبصورت کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کبھی ان میں سے کوئی چھوٹے ستاروں میں داخل ہو جاتا ہے اور ایک قائد کے رُوپ میں سامنے آتا ہے۔۔۔ اور خاص کر زُہرہ ستارہ جو کہ عشاء کے بعد جلوہ ریز ہوتا ہے اور اس کے ہمراہ ایک اور درخشاں ستارہ جو فجر سے پہلے نظر آتا ہے۔ یہ دونوں اس موسم میں اُفق پر ایک انتہائی خوبصورت اور دلکش کیفیت نمایاں کرتے ہیں۔۔۔

پھر یہ ستارے جب اپنی تفتیشی اور قائدانہ ڈیوٹی ادا کر لیتے ہیں اور صنعت گری کے یہ دلکش نقوش بُننے میں ایک نلکی کی خدمات سرانجام دے لیتے ہیں تو اپنے حکمران سورج کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس کے ہیبت خیز دائرے میں داخل ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔۔۔

پس یہ سیّارے جنہیں الخُنّس اور الکنّس کہا گیا ہے، یہ ہماری اس زمین کے ساتھ مل کر اس ہستی کی ربوبیت کی عظمت و حشمت پر دلالت کرتے ہیں جو انہیں کمال انتظام کے ساتھ رواں دواں رکھے ہوئے ہے، اُنہیں گردش میں رکھے

ہوئے ہے اور انہیں فضائے کائنات میں بحری جہازوں اور طیاروں کی طرح چلا رہا ہے۔

اسی طرح یہ سیارے اپنی سورج جیسی تابندگی کے ذریعے اُس ہستی کی اُلوہیت اور سلطنت کی عظمت وحیثیت پر دلالت کرتے ہیں۔

پس اس سلطنت کی عظمت وحشمت پر نگاہ کرو جس کے سفینوں اور طیاروں میں وہ سیارے پائے جاتے ہیں جو جسامت میں کرۂ ارض سے ہزار گنا زیادہ بڑے ہیں اور اتنے تیز رفتار ہیں کہ ایک سیکنڈ میں آٹھ گھنٹوں کی مسافت طے کرتے ہیں۔

پس آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ ایسے عظیم الشان حکمران کی طرف ایمان وعبودیت کے ساتھ منسوب ہونے میں اور اس دنیا میں اس کا مہمان بن کر رہنے میں کتنی بڑی سعادت اور شرف عظیم ہے۔۔۔!

پھر میں نے چاند کی طرف دیکھا، تو مجھے نظر آیا کہ آیتِ کریمہ: ﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾ اعجاز کا ایک تابدار نور رمبیّا کر رہی ہے۔

جی ہاں؛ چاند کے لیے منزلیں مقرر کر دینا، اُسے زمین کے گرد گھمانا، اُس کی تدبیر کرنا، اسے روشن کرنا اور اسے زمین اور سورج کی نسبت سے انتہائی دقیق حساب کتاب سے ایسی خارقِ عادت شکلیں صورتیں عطا کرنا جو عقلوں کو حیران کرتی اور مشاہدہ کرنے والے اصحابِ شعور کو یہ کہنے پر آمادہ کر دیتی ہیں کہ: وہ صاحبِ قدرت ہستی جس نے اسے اس طرح منظم کیا اور اس کی منزلیں مقرر کیں اُس کے لیے کوئی بھی چیز قطعاً مشکل نہیں ہے اور یہ کہ جس نے چاند کو اس شکل وصورت پر بنا یا ہے وہی ہر چیز کو بنا سکتا ہے۔

پھر یہ ہے کہ چاند سورج کے پیچھے پیچھے اس طرح چلتا ہے، کہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنا راستہ نہیں بھٹکتا اور اپنے وظیفے سے ذرّہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹتا، اور یوں وہ ایک گہری نظر سے دیکھنے والے کو یہ کہنے پر آمادہ کر دیتا ہے کہ: ''سُبْحَانَ مَنْ تَحَيَّرَ فِيْ صُنْعِهِ الْعُقُوْلُ ''۔ اور خاص کر جب وہ بعض دفعہ باریک ہلال کی شکل میں ''ثریا'' نامی منزل میں داخل ہوتا ہے، جیسے کہ مئی کے آخر میں ہوتا ہے، تو اس وقت چاند کھجور کے کمان جیسے ٹیڑھے سفید تنے کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اور ثریا اس وقت ایک گچھے کی صورت میں نظر آتی ہے، اس بنا پر اس منظر سے نیلے آسمان کے پیچھے ایک بہت نورانی درخت کے وجود کا خیال آتا ہے۔ گویا کہ اس درخت کی باریک سی ٹہنی نے آسمان کے پردے میں سوراخ کر کے اپنے گچھے کے ہمراہ اپنے سر کو باہر نکالا ہوا ہے اور یوں وہ دونوں ثریا اور ہلال کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اور یہ منظر خیال میں یہ بات بھی ڈالتا ہے کہ تمام ستارے اس غیبی درخت کے ثمرات ہیں۔

پس فرمانِ گرامی: ﴿كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾ میں پائی جانے والی تشبیہ کی لطافت اور بلاغت میں غور کریں!

پھر میرے دل میں یہ آیتِ کریمہ: ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا﴾ آئی اور وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ زمین ایک سواری اور مسخر سفینہ ہے۔۔۔ اسی اشارے کے ذریعے میں نے خود کو فضائے کائنات میں تیزی کے ساتھ تیرتے ہوئے اس سفینے میں ایک اُونچی جگہ پر دیکھا تو میں نے آیت کریمہ: ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ﴾ پڑھی، جس کا گھوڑے یا کشتی وغیرہ پر سوار ہوتے وقت پڑھنا سنت ہے۔

اسی طرح میں نے دیکھا کہ کرۂ ارض نے اس حرکت کے ذریعے ایک ایسے پروجیکٹر کی کیفیت اختیار کر لی ہے جو سینما کی تصویروں کو ڈسپلے کرتا ہے، چنانچہ اس نے تمام آسمانوں کو متحرک کر دیا، اور تمام سیاروں کو ایک پرشکوہ لشکر کی طرح ہانکنا شروع کر دیا اور ایسے عالی شان اور میٹھے مناظر کو مست اور حیران کر دیتے ہیں۔ تو میں نے کہا: ''سبحان اللہ'' یہ چیزیں کس طرح تھوڑے سے خرچے پر کتنے زیادہ، عظیم الشان اور عجیب وغریب اور قیمتی اعمال ادا کر رہے ہیں! پھر اس نقطے سے دل میں مندرجہ ذیل دو ایمانی نکتوں کا القاء ہوا:

پہلا نکتہ: میرے ایک مہمان نے چند دن پہلے مجھ سے ایک سوال کیا، اور اس مُشتبہ سوال کا بنیادی تصور یہ ہے کہ:

جنت اور جہنم بہت دُور ہیں چلو مان لیتے ہیں کہ اہلِ جنت میدانِ حشر سے نکلتے ہیں اور لطفِ الٰہی سے برق و براق کی طرح اُڑتے ہوئے جنت کی طرف چلتے ہیں لیکن اہلِ جہنم اپنے بوجھل جسموں کے ساتھ محشر سے کیسے نکلیں گے اور ادھر اُدھر کیسے جائیں گے؟

تو اس کا جواب جو ذہن میں آیا یہ ہے کہ:

جس طرح ۔مثال کے طور پر۔ اگر تمام قوموں کو امریکا میں کسی عالمی کانفرنس میں بلایا جائے تو ہر قوم اپنے بڑے بحری جہاز میں بیٹھ کر وہاں جائے گی، اسی طرح کرۂ ارض جو کہ کائنات کے اِس بحرِ محیط میں ایک سال میں پچیس ہزار سال کے برابر طویل ترین سیاحت کا عادی ہو چکا ہے، یہ بھی اپنے باسیوں کو اُٹھا کر چلا جا رہا ہے اور وہ انہیں میدانِ حشر میں جا اُتارے گا، اور اسی طرح وہ اپنے مرکز میں پائی جانے والی آگ کو جہنم میں پھینک دے گی، وہ آگ جو کہ دو لاکھ درجۂ حرارت پر مشتمل ہے۔ اس دلیل کی رُو سے کہ درجۂ حرارت ہر تینتیس میٹر کے بعد ایک درجہ بڑھ جاتا ہے۔ اور یہ درجۂ حرارت حدیث کے مطابق۔ جہنم کے درجۂ حرارت کے مطابق ہے اور جو کہ دنیا اور برزخ میں جہنم کبریٰ کے بعض وظائف ادا کرتی ہے جیسے کہ روایات میں آیا ہے۔ اور پھر یہ زمین اللہ کے حکم سے ایک دائمی اور خوبصورت ترین رُوپ دھار جائے گی اور عالمِ آخرت کی ایک منزل بن جائے گی۔۔۔

دل پرور ہونے والا دوسرا نکتہ بلاشبہ الصانعُ القدیر، الفاطرُ الحکیم اور الواحدُ الأحد نے اپنے کمالِ

قدرت، جمالِ حکمت کے اظہار کے لیے اور اپنی وحدت کی دلیل کے لیے ایک طریقۂ کار بنایا ہے، اور وہ ہے انتہائی تھوڑی چیز کے ساتھ بہت سے عمل ادا کرنا اور انتہائی چھوٹی سی چیز کے ساتھ بڑے بڑے وظائف سرانجام دے دینا۔۔۔ میں نے بعض مقالات میں یہ کہا تھا:

تمام اشیاء کی نسبت اگر واحدِ اَحد کی طرف کی جائے تو اتنی سہولت اور آسانی حاصل ہو جاتی ہے کہ درجۂ وجوب تک جا پہنچتی ہے، لیکن اگر اشیاء کی نسبت بہت سے اسباب اور بہت سے کاریگروں کی طرف کر دی جائے تو اتنی صعوبتیں اور مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ درجۂ امتناع تک جا پہنچتی ہیں؛ کیونکہ کوئی افسر یا بانی مبانی درجے کا ایک آدمی صرف ایک عمل، ایک کردار اور ایک حرکت سے انتہائی سہولت کے ساتھ بہت سے افراد کو اور بہت سے پتھروں کو کوئی بھی وضع قطع دے سکتا ہے، اور یوں نتیجہ انتہائی سہولت کے ساتھ برآمد ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ وضع قطع لینے اور یہ نتیجہ حاصل کرنے کے لیے معاملہ لشکر کے افراد کے یا پتھروں سے بنائے گئے قُبّے کے سپرد کر دیا جائے تو پھر اس چیز کا حاصل ہونا بہت سی جدوجہدوں، مشکلوں اور آویزشوں کے بعد ممکن ہوگا۔۔۔

پس اس کائنات میں جو رقص و سرور، گردش، گھومنا گھامنا، جولانی، تسبیحات کی خوشبوئیں بکھیرنے والے حسین مناظر اور سیر گاہیں اور چاروں موسموں میں اور رات دن میں تحول وتغیر اور گردشِ دوراں کے جو انفعال نظر آ رہے ہیں، اگر ان کی نسبت وحدت کی طرف کر دی جائے تو ایک ہی صاحبِ امر ایک ہی امر کے ساتھ ایک کُرے کو حرکت دینے سے موسموں کی تبدیلیوں میں صنعت کے عجائب، اختلافِ لیل ونہار میں پائی جانے والی حکمت کے غرائب اور شمس وقمر اور نجوم کی ظاہری حرکات میں پائی جانے والی لذیذ الواح جیسے افعال کے اظہار جیسی تمام کیفیات اور تمام بیش قیمت نتائج حاصل کر سکتا ہے۔۔۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ تمام موجودات اُس کے لشکر کی حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ وہ چاہے تو زمین جیسے سپاہی کو تمام ستاروں کا قائد بنا دے، ضخیم سورج کو چراغ بنا دے، تاکہ اہلِ زمین کو روشنی اور حرارت مہیا کرتا رہے۔ چاروں موسموں کو۔ جو کہ قدرت کے نقوش کی تختیاں ہیں۔ تکلی بنا دے اور راتوں اور دنوں کو۔ جو کہ حکمت کی تحریر کے صحیفے ہیں۔ سپرنگ بنا دے۔ چاند کو ہر روز نئی شکل پر طلوع کرے اور یوں اُسے اوقات کی پہچان کے لیے ایک ڈائری بنا دے۔ ستاروں کو لطیف، خوبصورت، تابندہ اور مزین چراغوں کی صورت عطا کر دے، جو جذب وسرور کے عالم میں رقص کرتے ہوئے فرشتوں کے ہاتھوں میں خود بخود رقص کرتے پھرتے ہیں۔ یوں وہ اِن حکمتوں جیسی بہت سی حکمتوں کا اظہار کرتا ہے جو خاص طور پر زمین کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔۔۔

پس اگر یہ کیفیتیں اُس آقا سے طلب نہ کی جائیں جس کا حکم، نظام، قانون اور جس کی تدبیر تمام موجودات میں نافذ ہے، تو پھر لازم آتا ہے کہ تمام سورج اور ستارے ہر روز حقیقی حرکت کے ذریعے اور غیر محدود سرعت کے ساتھ غیر محدود

مسافت طے کریں!

پس وحدت میں انتہائی قسم کی سہولت ہے اور کثرت میں غیر محدود قسم کی صعوبت ہے، اسی وجہ سے اہلِ صنعت و تجارت کو ان کی کثرت کے لیے وحدت عطا کر دی جاتی ہے تاکہ سہولت اور آسانی مہیّا رہے، مطلب یہ ہے کہ وہ کام کاج کی آسانی کے لیے کمپنیاں بنا لیتے ہیں۔۔۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ: گمراہی کے راستے میں بے انتہا مشکلات ہیں اور ہدایت اور وحدت کے راستے میں بے انتہا سہولت ہے۔۔۔

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

چوتھا مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

سَلَامُ اللّٰهِ وَرَحْمَتُهٗ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ وَعَلٰى اِخْوَانِكُمْ لَا سِيَمَا۔۔۔الخ

میرے معزز بھائیو!

میں اس وقت جبلِ چام کی فلک بوس بلندیوں پر صنوبر کے ایک گرانڈیل درخت کی چوٹی پر ایک مچان میں رہائش پذیر ہوں، کہ میں انسانوں سے وحشت کھا کر جنگلی جانوروں کے ساتھ مانوس ہو چکا ہوں۔ اگر کبھی انسانوں کے ساتھ مل بیٹھنے کو جی چاہتا ہے تو تم لوگوں کو خیال ہی خیال میں اپنے پاس پاتا ہوں، تمہارے ساتھ بات چیت کرتا ہوں اور تسلّی پاتا ہوں۔ میں اب اس جگہ پر اگر کوئی رکاوٹ آڑے نہ آئی تو مہینہ دو مہینے اکیلا ہی رہوں گا۔ ''بارلا'' واپس آنے پر رُو برو ملاقات کا کوئی راستہ نکالیں گے جس کا میں تم لوگوں سے بھی زیادہ مشتاق ہوں۔ اور یہ ملاقات تمہاری خواہش کے عین مطابق ہوگی۔

اب میں اُن چند قلبی واردات کا ذکر کرتا ہوں جو صنوبر کے اس درخت پر وارد ہوئیں۔

پہلی: جزوی طور پر ایک خاص پرائیویٹ راز ہے۔ لیکن آپ سے راز چھپایا نہیں جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے: جس طرح بعض اہلِ حقیقت اسم ''الودود'' کا مظہر ہوتے ہیں اور اس اسم کے مرتبۂ عظمیٰ کی تجلیات کے ساتھ موجودات کی کھڑکیوں سے واجب الوجود کی طرف دیکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ کے اس معدومِ محض بھائی کو ایک ایسی کیفیت عطا کر دی گئی ہے جو اسمِ ''الرحیم اور الحکیم'' کی مظہریت کا وسیلہ بنتی ہے، صرف اس وقت جب وہ اس غیر متناہی خزانے کی منادی کرتا ہے۔ تمام مقالات اس مظہریت کے جلوے ہیں اور یہ مقالات اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ میں پائے جانے والے راز کے مظاہر ہیں۔ ان شاء اللہ

دوسری: نقشبندی سلسلے میں پڑھا جانے والا یہ فقرہ اچانک دل پر وارد ہوا:

در طریق نقشبندی لازم آمد چار ترک ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ ہستی، ترکِ ترک

پھر اس فقرے کے بعد یہ فقرہ وارد ہوا:

در طریقِ عجز مندی لازم آمد چار چیز فقرِ مطلق، عجزِ مطلق، شکرِ مطلق، شوقِ مطلق اے عزیز

پھر دل پر اس کے بعد وہ رنگین فنی شعر وارد ہوئے جو آپ نے لکھے ہیں، یعنی: ''کتابِ کائنات کا یہ صفحۂ رنگین دیکھو۔۔۔الخ'' چنانچہ میں نے ان شعروں کے ذریعے روئے آسمان پر جھلملاتے ستاروں کو دیکھا تو کہا: کاش میں شاعر ہوتا

اور یہ شعر مکمل کر سکتا۔ اور پھر میں نے شعر و نظم کی استعداد نہ رکھنے کے باوجود اس کا آغاز کر دیا، لیکن اسے نظم و شعر میں نہ ڈھال سکا۔ تب میں نے جیسے وارد ہوا ویسے ہی لکھ دیا۔ لیکن میرا وارث بننے والے شخص! اگر آپ اسے نظم میں ڈھال سکتے ہیں تو ڈھال لیں۔

[اچانک وارد ہونے والی واردات یہ ہے]

ستاروں کو یعنی ان کے لذت بھرے خطاب کو سنو

حکمت کی تابندہ کتاب کو دیکھو کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے

یہ سب کے سب ایک ساتھ زبانِ حق کے ساتھ پکار رہے ہیں کہ:

ہم قدیرِ ذوالجلال کی سلطنت کی جاہ وحشمت کی درخشندہ براہین ہیں۔

ہم صانع و کردگار کے وجود کی، اس کی وحدت کی اور اس کی قدرت کی گواہی دینے والے ہیں۔

ہم آسمان کی گہری نظر سے دیکھنے والی ہزاروں آنکھیں ہیں جو روئے زمین کو سنہرا بنا دینے والے ناز بردار معجزات سے دل لبھانے اور تفریح خاطر کے لیے گہری نظر کے ساتھ جنت کی طرف اور زمین کی طرف دیکھتی ہیں۔ جیسے کہ فرشتے دل لبھاتے اور تفریح کرتے ہیں۔

ہم تخلیق کے شجرِ طوبیٰ کے خوبصورت پھل ہیں جنہیں جمیل ذوالجلال کے دستِ حکمت کے ساتھ آسمانوں کے درمیان اور کہکشاں کی ٹہنیوں پر لٹکا دیا گیا ہے۔

ہم اہلِ آسمان کے لیے چلتی پھرتی مسجدیں، گھومنے پھرنے والے گھر، بلند گھونسلے، روشنی بکھیرنے والے چراغ اور رعب دار اور لرزہ خیز ہوائی جہاز اور بحری سفینے ہیں۔

ہم قدیرِ ذوالکمال اور حکیم ذوالجلال کی قدرت کے معجزات، صنعت کے خوارق، حکمت کے نوادرات، تخلیق کے زیرک و دانشمند افراد اور نور کے عوالم ہیں۔

یوں ہم لاکھوں زبانوں کے ساتھ لاکھوں براہین کو نمایاں کرتے ہیں اور یہ براہین اسے سناتے ہیں جو انسان ہے۔

اس ملحد کی وہ آنکھیں اندھی ہو جائیں۔ جو ہمارا چہرہ نہیں دیکھتیں اور ہمارے اقوال نہیں سنتیں۔ جبکہ ہم حق کے ساتھ بولنے والی آیات ہیں۔

ہمارا سکّہ ایک ہے، ہمارا طرّہ ایک ہے۔ ہم اپنے پروردگار کے مسخر اور اس کے تسبیح خواں ہیں۔ ہم پرستش کرتے ہوئے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اور ہم کہکشاں کے حلقۂ کبریٰ کی طرف منسوب مجذوب ہیں۔

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

پانچواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ﴾

نقشبندی سلسلے کے آفتاب وبطلِ جلیل امام ربّانی مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں فرمایا ہے: ''میں ایمانی حقائق کے ساتھ تعلق رکھنے والے کسی مسئلے کے واضح اور منکشف ہو جانے کو ہزاروں ذوقوں، وجدوں اور کرامتوں پر ترجیح دیتا ہوں''۔

اور یہ بھی فرمایا ہے: ''ولایت کی تین قسمیں ہیں:

ولایت صغریٰ۔ اور یہ وہی مشہور ولایت ہے جسے لوگ عام طور پر جانتے ہیں۔

دوسری ولایتِ وسطیٰ اور **تیسری ولایتِ کبریٰ**۔

ولایتِ کبریٰ نبوّت کی وراثت کے وسیلے سے تصوّف کی برزخ میں داخل ہوئے بغیر ہی براہِ راست حقیقت کی طرف راستہ کھولنے کا نام ہے''۔

اور یہ بھی فرمایا ہے: ''نقشبندی سلسلے میں چلنے کے لیے دو چیزیں درکار ہیں: ایمانی حقائق کا صحیح صورت میں اعتقاد رکھنا اور دینی فرائض کی بجا آوری۔ ان دو چیزوں میں کمی آجائے تو اس راستے میں چلنا مشکل ہے''۔

تو گویا کہ نقشبندی سلسلے کے تین حجاب ہیں:

پہلا اور بلند ترین اور عظیم ترین حجاب یہ ہے کہ ایمانی حقائق کی براہِ راست خدمت کی جائے۔ امام ربّانیؒ اپنی آخری عمر میں اسی راہ پر چلے تھے۔

دوسرا یہ ہے کہ دینی فرائض اور سنت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی طریقت کے حجاب کے تحت خدمت کی جائے۔

تیسرا یہ کہ راہِ تصوف میں دل کے قدموں سے چل کر قلبی امراض کا ازالہ کرنے کی تگ ودَو کی جائے۔

پہلی چیز فرض ہے۔ دوسری واجب اور تیسری سنّت کا حکم رکھتی ہے۔

حقیقت جب یہی ہے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ شیخ عبدالقادر جیلانی، شاہِ نقشبند اور امام ربّانی رحمہم اللہ جیسے اکابر بھی اگر اس دور میں ہوتے تو وہ اپنی تمام تر ہمّت ایمانی حقائق اور اسلامی عقائد کی تقویت کے لیے صَرف کر دیتے؛ کیونکہ یہ حقائق و عقائد ہی اَبدی سعادت کے لیے دارومدار کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو وہ ابدی بدبختی کا باعث بن جائے گی۔ پس جس کے پاس ایمان نہیں وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا لیکن تصوّف کے بغیر جنت میں جانے والے بہت زیادہ ہیں۔ انسان غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہے لیکن پھل کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے۔ پس تصوّف پھل ہے اور ایمانی

حقائق غذا ہیں۔

قدیم زمانے سے کسی شخص کے لیے بعض ایمانی حقائق تک پہنچنا چالیس دن سے لے کر چالیس سال کی سیر وسلوک کے ذریعے ہی ممکن ہوتا تھا، لیکن اب اگر اللہ کی رحمت سے ایک ایسا راستہ مل جائے جس کے ذریعے ان حقائق تک چالیس منٹوں میں رسائی حاصل ہوسکتی ہے تو پھر ایسے راستے کی پرواہ نہ کرنا کوئی عقل مندی کی بات نہیں!

ذرا گہری نظر سے پڑھنے والے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان "تینتیس مقالات" نے کچھ اسی طرح کا قرآنی راستہ کھولا ہے۔

پس حقیقت جب یہی ہے تو پھر میرا تو پختہ اعتقاد ہے کہ قرآن کریم کے اسرار کے بارے میں لکھے گئے یہ مقالات عصرِ حاضر کی بیماریوں کے لیے بہترین علاج اور اس کے زخموں کے لیے بہترین مرہم کی اور اسلامی معاشرے پر چھائے ہوئے تاریکی کے بادلوں کو تتر بتر کرنے کے لیے نافع ترین نور اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے لوگوں کے لیے صادق ترین مرشد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بات تو آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ گمراہی کا سرچشمہ اگر جہالت ہو تو اُس کا ازالہ آسان ہوتا ہے، لیکن اگر اس کا سرچشمہ علوم وفنون ہوں تو پھر اس کا ازالہ مشکل اور دشوار ہو جاتا ہے۔

پہلے زمانے میں دوسری قسم کے لوگ تقریباً ایک فیصد ہی تھے اور ان میں سے رہنمائی کے ذریعے بسا اوقات ہزار میں سے صرف ایک ہدایت پاتا تھا؛ کیونکہ اس طرح کے لوگ خود پسند ہوتے ہیں اور کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔

میرا یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالی نے اِن مشہور مقالات کو۔ جو کہ اس دور میں قرآن کریم کے اعجاز کی معنوی کرنیں ہیں۔ اِس گمراہی بردوش زندیقیت کے زہر کے لیے تریاق کی خاصیت عطا کر دی ہے۔

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

چھٹا مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

سَلَامُ اللّٰهِ وَرَحْمَتُهٗ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمَا وَعَلٰى اِخْوَانِكُمَا، مَادَامَ الْمَلَوَانُ وَتَعَاقَبَ الْعَصْرَانِ وَمَادَامَ الْقَمَرَانِ وَاسْتَقْبَلَ الْفَرْقَدَانِ

میرے غیرت مند بھائیو اور حمیت پسند اور اس دارِ اجنبیت یعنی دنیا میں میری تسلی کے وارو مدار دوستو!

آپ لوگوں کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان معانی میں میرا حصے دار بنایا ہے جو مجھ پر انعام کیے گئے ہیں، اسی لیے آپ لوگوں کا میرے احساسات میں بھی حصہ داری کے حق دار بن جانا ضروری ٹھہرا۔

اور میں اپنی اس اجنبیت میں جدائی کے جو دکھ اُٹھا رہا ہوں، اُن میں سے کچھ دکھوں کا ذکر میں آپ لوگوں کے لیے کروں گا، لیکن جو زیادہ کڑے اور زیادہ المناک دکھ ہیں ان کا ذکر نہیں کروں گا تا کہ آپ لوگ زیادہ پریشان نہ ہوں۔

میں گزشتہ دو تین مہینوں سے بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ البتہ پندرہ بیس دنوں کے بعد کبھی کوئی مہمان آ جاتا ہے تو سماں تبدیل ہو جاتا ہے ورنہ ہمہ وقت اکیلا ہی رہتا ہوں، اور تقریباً پچھلے بیس دنوں سے تو یہاں کے پہاڑی لوگ بھی چلے گئے ہیں، اب ان میں سے میرے ارد گرد کوئی بھی موجود نہیں ہے سب ادھر اُدھر بکھر گئے ہیں۔

اب اس اندھیری رات میں، ان اجنبی پہاڑوں کے درمیان کہ جہاں درختوں کی غمگین سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز یا چیخ چنگھاڑ سنائی نہیں دیتی ہے، میں خود کو باہمد گر متداخل پانچ مختلف قسم کی اجنبیتوں کے درمیان گھرا ہوا پاتا ہوں۔

پہلی اجنبیت:

بڑھاپے کی وجہ سے میں اپنے اکثر ہم عمروں، ہم جولیوں، قرابت داروں اور محبوب دوستوں سے بچھڑ کر بالکل اکیلا رہ گیا ہوں؛ وہ مجھے چھوڑ کر عالمِ برزخ کو چلے گئے ہیں۔ ان کی اس جدائی کی وجہ سے اجنبیت کا یہ احساس شدید تر ہو گیا ہے۔

اس اجنبیت سے ایک مزید اجنبی دائرہ ابھر آیا ہے، اور وہ یہ کہ مجھے المِ فراق سے جنم لینے والی اجنیت کا احساس ہو رہا ہے، کیونکہ اکثر چیزیں جن کے ساتھ میرا تعلق تھا مجھے چھوڑ گئی ہیں۔ جیسے گزرا ہوا موسم بہار۔

اور اس اجنبیت کے اندر سے اجنبیت کا ایک اور دائرہ نکل آیا ہے، اور وہ یہ کہ میں اپنے وطن اور اپنے احباب واقرباء سے دور ہو گیا ہوں اور اس بنا پر اکیلا رہ گیا ہوں۔ چنانچہ مجھے اس صورتِ حال سے پیدا ہونے والی فرقت سے بھری ہوئی

اجنبیت کا شدید احساس ہو رہا ہے۔

اس تاریک رات اور خاموش پہاڑوں کی ان عجیب و غریب کیفیات نے مجھے اس غربت میں ایک اور گہری اجنبیت کا احساس دلا دیا ہے۔

اور اس اجنبیت کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ میری اس فانی مہمان سرائے سے لبدُ الآبادی کی طرف کوچ کر جانے کے لیے تیار کھڑی روح کے سامنے ایک اور غیر معمولی قسم کی اجنبیت کا میدان کھل گیا ہے۔ تب میں نے سوچا اور اچانک کہہ دیا: سبحان اللہ! ان تاریکیوں کا اور اجنبیت کی ان اقسام کا مقابلہ کیونکر ہوگا؟

پھر میرے دل نے فریاد کی اور کہا:

یارب! غریبم، بے کسم، ضعیفم، ناتوانم، علیلم، عاجزم،

بے اختیارم، الأمان گویم، عفو جویم، مدد خواہم، ز درگاہت الٰہی۔

تو ناگہاں نورِ ایمان، فیضِ قرآن اور لطف الرحمان مجھے اتنی قوت فراہم کرنے لگے کہ جس سے یہ پانچوں قسم کی تاریک اجنبیتوں کے دائرے اُنس و سرور کے پانچ دائروں میں تبدیل ہو گئے۔ اور میری زبان ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ کا ورد کرنے لگی اور میرا دل ﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ کی تلاوت کرنے لگا۔

اور میری عقل بھی میرے دہشت و اضطراب کی وجہ سے فریاد کرنے والے نفس کو مخاطب کر کے کہنے لگی:

ارے مسکین! چیخ و پکار چھوڑ، فریاد چھوڑ اور اپنی مصیبت میں اللہ پر بھروسا رکھ؛ کیونکہ شکوہ نری مصیبت ہے۔

بلکہ مصیبت در مصیبت، اور خطا در خطا ہے۔

اگر تجھے وہ مل جائے جس نے تجھے مبتلائے مصیبت کیا ہے،

تو پھر یہ مصیبت عطا در عطا اور صفا در صفا بن جائے گی۔

جب ایسا ہی ہے تو گلہ شکوہ چھوڑ، اور بلبلوں کی طرح شکر و سپاس کا خوگر بن، کہ ان کی سرخوشیوں سے پھول مسکرا اُٹھتے ہیں۔

اور اگر تُو اس چیز سے محروم رہا تو پھر یاد رکھ کہ یہ دنیا تمام کی تمام درد ہے، رنج ہے، فنا ہے، زوال ہے۔ ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے۔ اِس لیے آ، اور اپنی مصیبت میں اُس پر توکل کر۔

تجھے کیا ہو گیا ہے کہ چھوٹی سی مصیبت میں چیخ و پکار کر رہا ہے۔ جبکہ حالت یہ ہے کہ تجھ پر اتنے مصائب کا بوجھ لادا گیا ہے جو کہ ساری دنیا کو پورے آسکتے ہیں!

توکل کی مدد سے مصیبت کا سامنا کر کے مسکرایا کرتا کہ مصیبت بھی مسکرا دے؛ کیونکہ مصیبت جوں جوں مسکرائے گی

چھوٹی ہوتی چلی جائے گی اور دھیرے دھیرے پگھل کر خوشی میں تبدیل ہو جائے گی۔

اور میں نے وہی کہا جو میرے استاد مولانا جلال الدین رومیؒ نے کہا تھا:

اُو گفت: "أَلَسْتُ" وتُو گفتی: "بلی"	شکر "بلی" چیست؟ کشیدنُ بلا
سرِّ بَلاچیست که یعنی منم	حلقه زنِ درگهِ فقر و فنا

تب میرے نفس نے کہا: جی ہاں؛ جی ہاں۔۔۔ عجز، توکل اور فقر و التجا کے ذریعے ہی تاریکیاں چھٹتی ہیں اور نور کا دروازہ کھلتا ہے۔ والحمد للہ علی نور الایمان والاسلام۔

ابن عطاء اللہ الاسکندری کے اس حکیمانہ قول میں مجھے ایک عالی شان حکمت دکھائی دی:

''مَاذَا وَجَدَ مَنْ فَقَدَهُ وَمَاذَافَقَدَمَنْ وَجَدَهُ ؟'' یعنی جسے اللہ تعالیٰ مل گیا اُسے ہر چیز مل گئی اور جو اس سے محروم رہا وہ ہر چیز سے محروم رہا، اور اگر اُسے کوئی چیز مل بھی گئی تو وہ اس کے گلے میں مصیبت بن کر رہ جائے گی۔ اور میں حدیث شریف: ''طُوبیٰ لِلْغُرَبَاء'' میں پایا جانے والا راز سمجھ گیا۔ تب میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

پس اے میرے بھائیو!

اجنبیت کی یہ انواع و اقسام کی تاریکیاں اگرچہ نورِ ایمان کی بدولت منور ہو گئی ہیں، لیکن یہ ہے کہ وہ مجھ پر اپنے تھوڑے بہت احکام لاگو کر گئی ہیں اور مجھے کچھ اس طرح کا اندازِ فکر عطا کر گئی ہیں:

میں جب اجنبی ہوں، اجنبیت میں زندگی گزار رہا ہوں اور کوچ کر کے اجنبیت کی طرف ہی جانے والا ہوں، تو کیا اس مہمان خانے میں جو ذمہ داریاں میرے سپرد کی گئی تھیں وہ ختم ہو گئی ہیں کہ اب میں تم لوگوں کو اور ان ''مقالات'' کو اپنا نمائندہ بنا کر چلا جاؤں؟ اور اس دنیا سے اپنا تعلق کلی طور پر ختم کر لوں؟ یہ سوچ میرے دِل میں اِسی طرح وارد ہوئی۔ اس لیے میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ: ''مقالات'' جو تألیف ہو چکے ہیں کافی ہیں؟ کیا ان میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟ مطلب یہ کہ کیا میری ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے تاکہ میں اس دنیا کو فراموش کر کے خود کو بطیب خاطر حقیقی لذیذ اور نورانی اجنبیت کی گود میں گرا دوں؟ اور مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرح کہوں۔

رانی سماع چه بوَد؟	بی خود شدن زِ ہستی
اندر فنائی مطلق	ذوقِ بقا چشیدن

کیا مجھے کسی بلند پایہ اجنبیت کی کھوج میں لگ جانا چاہیے؟ یہ سوال آپ لوگوں سے اسی غرض کے پیشِ نظر کیے گئے ہیں۔

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

ساتواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَبَدًا دَائِمًا

میرے معزز بھائیو! آپ لوگوں نے حافظ شامی (حاشیہ) کے ساتھ دو مسئلوں کا تذکرہ کیا ہے اور اسے یہ کہا ہے کہ وہ ان دو باتوں کے بارے میں مجھ سے پوچھے، اور وہ دو مسئلے یہ ہیں:

پہلا مسئلہ: عصرِ جدید کے گمراہ لوگ قدیم دور کے منافقوں کی طرح رسول گرامی ﷺ کی زینبؓ کے ساتھ شادی کو تنقید و اعتراض کا نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نکاح کے پیچھے نفسانی اور شہوانی جذبات کارفرما تھے!

الجواب: ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ایسے پست شبہات کا ہاتھ اس عالی شان دامن تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ ہزار بار حاشا و کلّا! جی ہاں؛ جو آدمی ذرّہ برابر بھی انصاف کا مالک ہے وہ جانتا ہے کہ ایک شخص جس نے پندرہ سال سے چالیس سال کی عمر تک۔ جو کہ حرارتِ غریزی اور نفسانی ہوسات و شہوات کے بھڑکنے اور جوش کھانے کا دور ہے۔ دوستوں دشمنوں کی گواہی کے مطابق آخری درجے کی عفت و عصمت کے ساتھ زندگی گزاری اور خدیجۃ الکبریٰؓ جیسی ایک ہی بوڑھی سی عورت پر اکتفا کیا، ایسے شخص کا چالیس سال کے بعد یعنی حرارت غریزی کے تھم جانے اور نفسانی شہوات کے ٹھہر جانے کے زمانے میں زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کر لینا ایک ایسی دلیل ہے جو ثابت کرتی ہے کہ یہ چیز نفسانی خواہشات کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اس میں بالضرورت اور بالبداہت دیگر بہت سی اہم حکمتیں پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

رسالتمآب ﷺ کے اقوال آپ کے احوال و اطوار و حرکات و سکنات دین و شریعت کے سرچشمے اور احکام کے مصادر و مآخذ ہیں۔ اس لیے جس طرح صحابہ کرامؓ شریعت کے وہ تمام اُمور روایت کرتے تھے جو ان پر آشکار ہوتے تھے، اسی طرح ازواجِ مطہرات بھی آپ ﷺ کے خصوصی ذاتی دائرے میں صادر ہونے والے آپ ﷺ کے مستور و مخفی حالات کے ساتھ تعلق رکھنے والے شریعتِ مطہّرہ کے احکام اور دین کے اسرار کو روایت کرتی تھیں، چنانچہ اُنہوں نے اس ذمہ داری کو بالفعل نبھانے کا حق ادا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دین کے تقریباً آدھے اسرار و احکام انہیں سے

(حاشیہ) حافظ شامی (1965م۔ 1887م) رسائل نور کے اوائل طالب علموں اور کاتبوں میں سے ایک۔ قرآن کریم کے حافظ ہونے کی وجہ سے حافظ اور شام میں اپنے والد کے ساتھ جو کہ وہاں پولیس آفیسر تھے۔ کافی دیر تک سکونت پذیر رہنے کی وجہ سے شامی کہلاتے تھے۔ بڑے متقی پرہیزگار نیک اور صاحبِ علم آدمی تھے۔ ''بارلا'' میں اور ''اسکی شہر'' کی جیل میں استاد کے ساتھ رہے۔ مترجم۔

روایت کیے جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس عظیم الشان ذمہ داری کو نبھانے کے لیے مختلف مشرب رکھنے والی بہت سی پاکیزہ بیویاں درکار ہیں۔

رہا مسئلہ حضرت زینبؓ کے ساتھ شادی کرنے کا، تو اس ضمن میں ''پچیسویں مقالے'' کے ''پہلے شعلے'' کی ''تیسری شعاع'' کی مثالوں میں ذکر کی گئی آیت کریمہ: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾ کی وضاحت میں ذکر کیا گیا ہے کہ: ایک ہی آیت لوگوں کے مختلف طبقات کی سمجھ سوچ کے حساب سے متعدد پہلوؤں سے متعدد معانی پر مشتمل ہوتی ہے۔ پس اس آیت کو سمجھنے میں ایک طبقے کا حصہ یہ ہے کہ:

حضرت زیدؓ جو کہ رسولِ خدا ﷺ کے خادم اور ''اے میرے بیٹے'' کے خطاب سے سرفراز تھے، اُنہوں نے جب دیکھا کہ اُن کی عزیز بیوی معنوی طور پر ان کی ہم پلہ نہیں ہے۔ جیسے کہ صحیح روایت کے مطابق انہوں نے اس کا خود اعتراف کیا ہے۔ تو اُسے طلاق دے دی۔

یعنی حضرت زید اپنی فراست کے ذریعے یہ بات سمجھ گئے تھے کہ حضرت زینبؓ اخلاقِ عالیہ کے کسی اور ہی معیار پر پیدا ہوئی ہیں اور یہ فطری طور پر نبی ﷺ کی بیوی بننے کے قابل ہیں۔ چنانچہ حضرت زیدؓ نے چونکہ اپنی فراست کی روشنی میں خود کو فطری طور پر ان کا ہم پلہ اور ان کا خاوند ہونے کے قابل نہ سمجھا، اس لیے ان کے درمیان معنوی طور پر ناہمواری پیدا ہو گئی اس لیے انہوں نے زینبؓ کو طلاق دے دی۔ اور ان کے ساتھ رسول اکرم ﷺ نے اللہ کے حکم سے شادی کر لی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شادی تقدیرِ الٰہی کے حکم کے مطابق ایک غیر معمولی، خارقِ عادت اور ظاہری رواج و عادات و معاملات کے برخلاف تھی۔

پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿زَوَّجْنَاكَهَا﴾ میں اشارہ ہے کہ اس نکاح کا بندھن آسمانوں میں باندھا گیا تھا۔ اور رسول اکرم ﷺ نے اس تقدیری حکم کے سامنے مجبور ہو کر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ وگرنہ اس معاملے میں ہوائے نفس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

بس اس تقدیری فیصلے میں آیتِ کریمہ: ﴿لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ﴾ جو کہ ایک اہم شرعی حکم، اہم عمومی حکمت اور ایک ہمہ گیر عمومی مصلحت پر مشتمل ہے، اس آیت کے اشارے کے مطابق حکم یہ پایا جاتا ہے کہ بڑوں کا چھوٹوں کو ''اے میرے بیٹے'' کہہ دینا ''ظہار'' کے مسئلے کی طرح حرام نہیں ہے، یعنی جیسے کوئی آدمی اپنی بیوی کو یہ کہہ دے کہ تُو میری ماں کی طرح ہے تو حکم بدل جاتا ہے اور بیوی حرام ہو جاتی ہے، اس مسئلے میں ایسا نہیں ہے اور حکم نہیں بدلتا ہے۔

اِسی طرح اکابر بھی جب اپنی رعایا کو اور انبیاء علیہم السلام اپنی اُمت کو مخاطب کرتے ہیں اور انہیں ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے باپ بیٹے کو دیکھتا ہے، تو یہ ریاست اور رسالت کی ذمہ داری کے اعتبار سے ہوتا ہے، انسانی شخصیت کے اعتبار سے نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ نکاح نہ ہو سکے!

اور اس آیتِ کریمہ سے دوسرے طبقے کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ:

ایک عظیمُ الشان آمر اور حاکم اپنی رعایا کو باپ کی شفقت والی نظر سے دیکھتا ہے۔ پس اگر وہ آمر ظاہری اور باطنی لحاظ سے روحانی سلطان ہو تو اس کی رعایا کے افراد اسے باپ سمجھتے ہیں اور حقیقی اولاد کی طرح اسے بیٹوں کی نظر سے دیکھتے ہیں، کیونکہ اُس کی رحم دلی و مہربانی باپ کی شفقت سے سوگنا زیادہ ہوتی ہے۔ پس باپ کی نظر چونکہ آسانی سے تبدیل ہو کر خاوند کی نظر نہیں بن سکتی، اور بیٹی کی نظر بیوی کی نظر نہیں بن سکتی، اس لیے رسالت مآب ﷺ اس راز کی رُو سے عام لوگوں کی نظر میں اہلِ ایمان کی بیٹیوں کے ساتھ شادی کرنا غیر مناسب لگتا ہے۔ اور قرآن کریم اس وہم کو دور کرنے کی غرض سے کہتا ہے:

یہ نبی تمہیں رحمتِ الٰہیہ کی وجہ سے شفقت سے دیکھتا ہے اور تمہارے ساتھ باپ والا معاملہ کرتا ہے، اور تم رسالت کی بدولت اس کی اولاد کی مانند ہو۔ لیکن وہ انسانی شخصیت۔ کے اعتبار سے تمہارے باپ نہیں ہیں کہ تمہارے ہاں شادی نہ کر سکیں۔ اور وہ تمہیں جب ''اے میرے بیٹو'' کہے تو تم لوگ احکامِ شریعت کے اعتبار سے اس کی اولاد نہیں بن جاؤ گے!

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

آٹھواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

اسمائے گرامی "الرحمن الرحیم" کے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ میں داخل ہونے، اور ان کے ہر بابرکت چیز کے آغاز میں ذکر ہونے میں بہت سی حکمتیں پائی جاتی ہیں۔ اس مقام پر میں صرف انہی حکمتوں کا ذکر کروں گا جو مجھے محسوس ہوئی ہیں، اور بقیہ کا ذکر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

میرے بھائی!

میں تو اسمائے گرامی ﴿الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ﴾ کو ایک عظیم ترین نور سمجھتا ہوں جس نے تمام کائنات کا احاطہ کیا ہوا ہے، اور یہ دونوں اتنے چمکدار اور اتنے قوی ہیں کہ ہر روح کو اُس کی تمام حاجات وضروریات فراہم کرنے کی گارنٹی دیتے ہیں اور اُسے اُس کے لاتعداد دشمنوں سے بچاتے ہیں۔ اور ان دو اسموں تک یعنی ان دو عظیم ترین نوروں تک پہنچنے کا بہترین وسیلہ جو مجھے ملا ہے وہ ہے "فقر و شکر اور عجز و شفقت، یعنی عبودیت و افتقار"۔

اِس مسئلے کی مناسبت سے میں محقق علماء حق کہ اپنے استاد امامِ ربانی کے برخلاف اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔

حضرت یعقوبؑ کے وہ شدید تابناک احساسات جو ان میں حضرت یوسفؑ کی یاد میں پیدا ہوئے تھے، ان کا سرچشمہ محبت اور عشق نہیں تھا بلکہ شفقت و مہربانی تھی؛ کیونکہ شفقت، محبت اور عشق سے کہیں زیادہ نفوذ پذیر، بلند تر، تابندہ تر اور پاکیزہ تر ہے اور مقامِ نبوّت کے لیے مناسب ترین ہے۔

لیکن مجازی محبوبات و مخلوقات کے ساتھ مجازی عشق و محبت اگر شدت اختیار کر جائیں تو نبوّت کے مقامِ بلند کے لائق نہیں رہتے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم نے جو انتہائی تابندہ اعجاز اور درخشندہ صورت حضرت یعقوبؑ کے حضرت یوسفؑ کے بارے میں وہ احساسات بیان کیے ہیں جو اسمِ گرامی "الرحیم" تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں، وہ شفقت کے بلند ترین مرتبے کے حامل ہیں۔

رہا عشق جو کہ اسم گرامی "الودود" تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، تو وہ اس محبت میں جلوہ گر ہے جو عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا کو یوسفؑ کے ساتھ ہوئی تھی۔

پس قرآنِ معجز بیان نے حضرت یعقوبؑ کے احساسات کو بیان کرتے وقت زلیخا کے احساسات سے جتنا بلند مرتبہ دیا

ہے، شفقت کا مرتبہ بھی عشق کے مرتبے سے اُتنا ہی زیادہ ہے۔

میرے استاد امام ربانیؒ نے عشقِ مجازی کو مقامِ نبوّت کے لائق نہیں سمجھا ہے، اسی بنا پر وہ کہتے ہیں: یوسفؑ کے جمالی محاسن اُخروی محاسن کی قبیل سے تھے، اس لیے ان محاسن کے ساتھ محبت کرنا مجازی محبت نہیں ہوگا کہ اِس محبت سے اُن میں کمی کوتاہی در آئے۔

اور میں کہتا ہوں: اُستاد جی! یہ ایک پُر تکلف تاویل ہے۔ رہی حقیقت، تو وہ کچھ یوں ہونی چاہیے کہ وہ احساسات محبت نہیں تھے بلکہ محبت سے سو درجے زیادہ تابناک، وسیع اور بلند شفقت کا ایک مرتبہ تھے۔

جی ہاں؛ شفقت اپنی تمام انواع و اقسام سمیت بہت لطیف اور پاکیزہ ہے۔ لیکن عشق و محبت کی بہت سی انواع و اقسام ایسی ہیں جن میں عاجزی و فروتنی کا کوئی کام نہیں۔

پھر شفقت بہت وسیع وعریض ہے؛ کیونکہ جو والد اپنی اولاد پر شفقت کرتا ہے وہ تمام تر بچوں پر شفقت کرتا ہے، حتی کہ اس شفقت کی مناسبت سے وہ تمام ذی ارواح پر شفقت کرتا ہے اور اسم گرامی ''الرحیم'' کے ہمہ گیر انوار کے یک نوعی انعکاس کا اظہار کرتا ہے۔ جبکہ ''عشق'' اپنی نظر صرف اپنے محبوب میں ہی محصور رکھتا ہے اور اپنے محبوب کے لیے ہر چیز کی قربانی دے دیتا ہے۔ یا اپنے محبوب کا بول بالا کرنے کے لیے اور اس کی تعریف کرنے کے لیے دوسرے لوگوں کی بے قدری کرے گا اور معنوی طور پر ان کی مذمت اور بے عزتی کرے گا۔ مثال کے طور پر ایک عاشق کہتا ہے:

تَبَدَّتْ لَنَا كَالشَّمْسِ تَحْتَ غُمَامَةٍ
بَدَا حَاجِبٌ مِنْهَا وَضَنَّتْ بِحَاجِبِ

''یعنی سورج میرے محبوب کے حُسن و جمال کو دیکھ کر شرما جاتا ہے، چنانچہ نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے بادل کے پردے میں چھپ جاتا ہے''۔

پس اے عاشق صاحب! تجھے آفتاب کو شرمندہ کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے، وہ آفتاب جو کہ آٹھ اُسمائے عُظمٰی کے لیے ایک نورانی صحیفے کی حیثیت رکھتا ہے؟

اسی طرح پھر شفقت خالص ہوتی ہے جس پر شفقت کی جائے اُس سے بدلے میں کوئی چیز نہیں مانگتی ہے، اور وہ صاف شفاف ہے عوض معاوضہ طلب نہیں کرتی، حتی کہ حیوانات جو کہ کمترین درجے کے مالک ہیں، ان کا اپنے بچوں کے ساتھ کسی بھی عوض معاوضے کے بغیر شفقت کا برتاؤ کرنا اور اُن پر جان تک فدا کر دینا اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے۔

جبکہ عشق اُجرت اور عوض معاوضہ طلب کرتا ہے۔ عاشقوں کی انواع و اقسام کی آہ زاریاں ایک طرح کی طلب اور اُجرت کا سوال ہی ہے۔

پس یعقوبؑ کی شفقت جو کہ سورۂ یوسف کا تابندہ ترین نور ہے، سورۂ یوسف جو کہ قرآن کی تابندہ ترین سورت ہے، یہ شفقت اسمائے گرامی ''الرحمٰن الرحیم'' کو آشکار کرتی ہے اور اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ شفقت ہی ''رحمت'' کا راستہ ہے۔ اور فرمانِ گرامی ﴿فَاللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظًا وَّھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ کے ذریعے اس شفقت کے درد کا درمان بتا رہی ہے۔

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

نواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

''اُسی خط کا حصہ ہے جو آپ نے اپنے خالص شاگرد کو بھیجا''

ثانیاً: قرآنی انوار کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں آپ کا ذوق و شوق، جدوجہد اور توفیق سے نوازا جانا اور اس راستے میں کامیابیوں سے ہمکنار ہونا اکرام الٰہی کے علاوہ اور کچھ نہیں، بلکہ یہ چیز کرامتِ قرآنی اور عنایتِ ربانی ہے، میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور کرامت، اکرام اور عنایت کا ذکر آیا تو اس مناسبت سے میں کرامت اور اکرام کے درمیان فرق بیان کرتا ہوں: اور وہ کچھ اس طرح ہے:

کسی ضرورت کے بغیر کرامت کا اظہار کرنے میں نقصان ہے جبکہ اِکرام کا اظہار تحدیثِ نعمت ہے۔ چنانچہ کرامت کے شرف سے نوازے گئے شخص سے اگر کسی کرامت یا خارق عادت کام کا ظہور ہو جائے اور اسے اس کا علم بھی ہو تو ہوسکتا ہے کہ خود پسندی اور اپنے نفس اور اپنے کشف پر اعتماد کرنے کی وجہ سے اور غرورِ نفس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کا نفس امارہ باقی ہو! اس بنا پر وہ غیر معمولی اور خارقِ عادت معاملہ اس کے حق میں ''استدراج'' ہوسکتا ہے لیکن اگر اس سے کوئی خارقِ عادت معاملہ اس طرح صادر ہو کہ اُسے اس کا علم اور احساس تک نہ ہو، جیسے اگر کسی کے دل میں سوال ہو اور وہ کسی آدمی کے پاس وہ سوال لے کر جائے، اور وہ آدمی اس کے سوال کے عین مطابق جواب دے دے، کہ گویا اس کی زبان پر حق جاری کر دیا گیا ہو، لیکن پھر جب اُسے اس بات کا ادراک ہو جائے کہ اس کا جواب بالکل صحیح تھا، تو اپنے آپ پر بھروسا نہ کرے بلکہ اس کا اپنے رب پر اعتماد اور بڑھ جائے اور وہ کہے کہ: ایک ہستی میری حفاظت کر رہی ہے اور میری مجھ سے بھی زیادہ تربیت کر رہی ہے تو یہ چیز اس کے توکل میں اضافے کا باعث ہوگی۔

اس قسم کی کرامت میں کوئی خطرہ نہیں اور صاحبِ کرامت اپنی کرامت کو چھپانے کا مکلّف نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اَز راہِ فخر اس کے اظہار کی کوشش بھی نہ کرے؛ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کرامت کو اپنی ذات کی طرف منسوب کر لے کیونکہ بظاہر تو اس میں انسان کا کچھ اپنا عمل دخل بھی موجود ہے!

رہا ''اِکرام''، تو وہ میرے نزدیک دوسری قسم کی کرامت سے زیادہ محفوظ اور بلند ہے۔ اس کا اظہار تحدیثِ نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انسانی کسب و اختیار کا کوئی عمل دخل نہیں، اس لیے اس کا نفس اس کی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا۔ اس لیے برادر! اس سے قبل میں نے اللہ تعالیٰ کے جن احسانات کے ضمن میں اور خاص کر اپنی قرآنی خدمات کے

باب میں اپنے اور آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور جو کچھ آپ نے دیکھا ہے، وہ سب ''اِکرام'' ہے اور اس کا اظہار تحدیثِ نعمت ہے۔ اسی بنا پر میں قرآنی خدمات کے میدان میں اپنی کامیابیوں کے بارے میں تحدیثِ نعمت کی صورت میں لکھ کر آپ کو بھیجتا ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ یہ چیز آپ میں شکر کے جذبات پیدا کرے گی نہ کہ فخر کے!

ثالثاً: میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس دنیاوی زندگی میں سب سے زیادہ خوش نصیب انسان وہ ہے جو کہ اس دنیا کو ایک عسکری مہمان خانہ سمجھتا ہے، اس کے بارے میں یہی یقین رکھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور وہ اس یقین کے ذریعے فوراً رضا جیسا مرتبۂ عظمیٰ حاصل کر لیتا ہے؛ کیونکہ اس طرح وہ کانچ کے معمولی ٹکڑوں کو باقی رہنے والے ہیرے کی قیمت نہیں دیتا ہے، اور یوں وہ اپنی زندگی استقامت اور لذت کے ساتھ گزارتا ہے۔

جی ہاں؛ دنیا کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام اُمور کانچ کے ٹوٹنے پھوٹنے والے ٹکڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہمیشہ باقی رہنے والے اُخروی اُمور مضبوط ہیروں کی قیمت رکھتے ہیں۔

پس انسان کی فطرت میں جو شدید غم، جوشیلی محبت، ہولناک حرص اور منہ زور طلب جیسے احساسات پائے جاتے ہیں، صرف اُخروی اُمور کو حاصل کرنے کے لیے عطا کیے گئے ہیں، اس بنا پر ان احساسات کو زبردستی دنیا کے فانی اُمور میں اُلجھائے رکھنا ایسے ہی ہے جیسے کانچ کے فضول سے ٹکڑوں کو ہیروں کی قیمت دے دی جائے!

اس مضمون کی مناسبت سے ذہن میں ایک نقطہ وارد ہوا، وہ میں یہاں ذکر کر رہا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ: عشق شدید محبت کا نام ہے، چنانچہ اس کا رُخ جب فانی محبوباؤں کی طرف ہوتا ہے تو یا تو عاشق کو دائمی عذاب اور دکھ میں مبتلا کر دیتا ہے، یا پھر اُسے ہمیشہ باقی رہنے والے محبوب کی طلب میں لگا دیتا ہے؛ کیونکہ یہ مجازی محبوب اس شدید محبت کی قیمت کے برابر نہیں، چنانچہ یہ مجازی عشق حقیقی عشق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پس انسان کے اندر ہزاروں قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں، اور ان میں سے ہر احساس کے عشق کی طرح دو مرتبے ہیں؛ ایک حقیقی اور دوسرا مجازی۔

مثال کے طور پر:

ہر انسان میں مستقبل کے خوف کی حس پائی جاتی ہے، چنانچہ جب وہ اپنے مستقبل کے بارے میں بہت زیادہ خوف کھاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جس مستقبل کے بارے میں وہ خوف زدہ ہے اس تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس کوئی سہارا بھی نہیں ہے، اور جب اُس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ رزق کی جہت سے جس کوتاہ قد مستقبل کی ضمانت دی جا چکی ہے اس کے بارے میں اس حد تک خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ تو پھر وہ اس چھوٹے سے مستقبل سے نظریں ہٹا لیتا ہے اور اپنی تمام تر توجہ اس حقیقی مستقبل پر لگا دیتا ہے جو قبر کے بعد ہے اور جس کی غافل لوگوں کے ہاں کوئی ضمانت نہیں

دی گئی ہے!

اسی طرح انسان مال وجاہ کے بارے میں شدید حرص کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب وہ یہ بات سمجھ جاتا ہے کہ یہ فانی مال عارضی طور پر امانت کے طور پر اس کی نگرانی میں دیا گیا ہے اور وہ یہ جاہ وجلالت جو کہ ریا کاری کا باعث ہے اور یہ شہرت جو کہ بُری مصیبت ہے؛ یہ دونوں ہی اس شدید حرص کی مستحق نہیں ہیں، تو وہ ان سے اپنی توجہ ہٹا کر مکمل طور پر معنوی مراتب، درجاتِ قُرب اور زادِ آخرت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو کہ حقیقی جاہ وجلالت ہے، اور اعمالِ صالحہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو کہ حقیقی مال ومتاع ہیں، اور یوں اس کی مجازی حرص جو کہ ایک بہت بری خصلت ہے حقیقی حرص میں تبدیل ہو جاتی ہے جو کہ ایک بلند پایہ خصلت ہے۔

اسی طرح انسان- مثال کے طور پر- شدید ضد، عناد اور ہٹ دھری کی وجہ سے اپنے احساسات کو بے قیمت، فانی اور زوال پذیر امور ومعاملات میں صَرف کرتا رہتا ہے، لیکن پھر اُسے محسوس ہو جاتا ہے کہ جس چیز پر وہ ایک سال تک اصرار کرتا رہا ہے وہ تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ اس پر ایک منٹ بھی اصرار کیا جائے!

اسی طرح وہ اس ضد اور عناد کی وجہ سے کسی نقصان دہ اور زہریلی چیز پر دھرنا دیے بیٹھ جاتا ہے، لیکن پھر اُسے سمجھ آ جاتی ہے کہ یہ قوی احساس اُسے اس طرح کے فضول کاموں کے لیے نہیں دیا گیا ہے اور اس احساس کو اس طرح کے کاموں میں کھپا دینا حکمت اور حقیقت کے منافی ہے؛ تب وہ اپنی اس شدید ضد وعناد کو اس طرح کے زوال پذیر اور غیر ضروری کاموں میں نہیں بلکہ اُخروی خدمات، اسلامی احساسات اور ہمیشہ رہنے والے بلند پایہ ایمانی حقائق کے لیے صَرف کرے گا، اور یوں اس کا مجازی عناد جو کہ ایک رذیل خصلت ہے حقیقی عناد میں تبدیل ہو جائے گا جو کہ ایک خوبصورت قابلِ تعریف عادت ہے، اور وہ یہ کہ حق پر سختی سے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا۔

پس انسان کو جن معنوی آلات واوزار سے نوازا گیا ہے، اگر وہ انہیں نفس اور دنیا کی راہ میں استعمال کرے گا، اور غافل رہ کر کچھ اس انداز سے مصروفِ عمل رہے گا کہ جیسے اسے اس دنیا میں سدا کے لیے بیٹھ رہنا ہے، تو یہ آلات رذیل اور پست اخلاق، اسراف اور بے کاری کا دارومدار بن جائیں گے، اور اگر ان میں سے خفیف احساسات کو اُمورِ دنیا میں اور شدید احساسات کو اُخروی اور معنوی وظائف واعمال میں صَرف کرے گا، تو یہ ان مذکورہ مثالوں کی طرح اخلاقِ حمیدہ کا سرچشمہ بن جائیں گے، حکمت وحقیقت کے موافق بیٹھیں گے اور سعادتِ دارین کا دارومدار بن جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ اس دور میں ناصحین کی نصیحتوں میں جو تاثیر نہیں رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اخلاق سے محروم لوگوں سے کہتے ہیں: حسد نہ کرو، حرص نہ کرو، آپس میں دشمنیاں نہ رکھو، ایک دوسرے کے ساتھ بغض وعناد نہ رکھو، دنیا سے محبت نہ رکھو۔۔۔ وغیرہ وغیرہ: یعنی انہیں ایسی چیزوں کا مکلّف کرتے ہیں جو بظاہر ان کے بس میں ہی نہیں ہیں، گویا کہ وہ

انہیں یہ کہتے ہیں کہ: اپنی فطرت تبدیل کرلو۔ لیکن اگر وہ انہیں یہ کہیں کہ: اپنی ان عادتوں اور خصلتوں کا رُخ بھلائی کے کاموں کی طرف موڑ دو اور ان کی گزرگاہیں تبدیل کردو، تو نصیحت کارگر اور مؤثر ہوگی۔ اور یہ چیز انہیں ایسی چیز کا پابند کرنے کے مترادف ہوگی جو ان کے دائرۂ اختیار میں ہوگی۔

رابعاً: اسلام اور ایمان کے درمیان فرق۔ علماء کے ہاں بحث مباحثے کا دارومدار بن چکا ہے، چنانچہ ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اور کچھ نے کہا ہے کہ یہ دونوں ایک تو نہیں ہیں لیکن ایک دوسرے سے علیحدہ بھی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ علماء سے اس طرح کی دیگر بھی بہت سی مختلف قسم کی آراء منقول ہیں۔ میں ان دونوں کے درمیان جو فرق سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ:

اسلام التزام ہے اور ایمان اذعان۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ: اسلام حق کی دوستی و مددگاری اور تسلیم وانقیاد و فرمانبرداری کا نام ہے اور ایمان حق کو قبول کرنے اور اس کی تصدیق کرنے کا۔

پچھلے دنوں میں نے کچھ بے دین ملحدوں کو دیکھا کہ وہ قرآنی احکام کے ساتھ بڑی گہری دوستی اور وابستگی کا اظہار کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مُلحد بھی حق کا التزام کرنے کی وجہ کسی نہ کسی پہلو سے مسلمان تھے! چنانچہ ایسے لوگوں کو مُلحد یا بے دین مسلمان کہا جائے گا۔

پھر میں نے دیکھا کہ کچھ مومن لوگ قرآن کے احکام کے ساتھ دوستی اور وابستگی کا اِظہار نہیں کرتے اور ان کا التزام نہیں کرتے ہیں، یعنی وہ ''مومن غیر مسلم'' کے الفاظ کا مظہر بن جاتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایمان بغیر اسلام کے نجات کا ذریعہ ہوسکتا ہے؟

الجواب: جس طرح اسلام بغیر ایمان کے نجات کا سبب نہیں ہوگا اسی طرح ایمان بھی بغیر اسلام کے نجات کا دارومدار نہیں بنے گا۔

اس میں حمد و ثنا، شکر و سپاس و احسان کی سزاوار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ رسائلِ نور کے پیمانوں نے قرآن کے معنوی اعجاز کی برکت سے دینِ اسلام کے ثمرات اور قرآن کے حقائق کو کچھ ایسے واشگاف انداز میں بیان کردیا ہے کہ اگر مُلحد انہیں سمجھ جائے تو لامحالہ ان کی تصدیق کرے اور انہیں سینے سے لگالے۔

اسی طرح ان رسائل نے ایمان اور اسلام کے دلائل و براہین کو اتنی قوی اور مضبوط صورت میں بیان کیا ہے کہ اگر انہیں کوئی غیر مسلم سمجھ جائے تو وہ غیر مسلم رہتا ہوا بھی بہر صورت ان کی تصدیق کرے اور ان پر ایمان لے آئے۔

جی ہاں؛ ''مقالات'' نے ایمان و اسلام کے خوبصورت لذیذ ثمرات کو جنّت کے شجرِ طوبیٰ کے خوبصورت اور لذیذ ثمرات کی خوبصورتی اور لذت کی طرح کچھ اس انداز سے آشکار اور اس کے سعادتِ دارین کی خوبصورتیوں جیسے پکے اور

میٹھے نتائج کو کچھ اس انداز سے طشت اَز بام کیا ہے کہ جو انہیں دیکھ لیتا اور پہچان جاتا ہے اُسے آخری درجے کی دوستی، وابستگی، طرفداری، التزام اور تسلیم کے احساسات سے مالا مال کر دیتے ہیں۔

اور ان رسائل نے ایمان واسلام کے سلسلۂ موجودات کی طرح قوی اور ذرّات کی طرح بے شمار دلائل و براہین کو کچھ اس طریقے سے واضح کیا ہے کہ یہ آخری درجے کا اذعان پیدا کرتے ہیں۔

حتی کہ میں جب بھی ''شاہِ نقشبند'' کے اوراد میں کلمۂ شہادت پڑھتا ہوں اور کہتا ہوں ہم اسی پر جی رہے ہیں، اِسی پر مریں گے اور کل قیامت کو اسی پر اُٹھائے جائیں گے''، عَلَى ذٰلِكَ نُحيِ وَعَلَيهِ نَمُوتُ وَعَلَيهِ نُبعَثُ غَدًا، تو مجھے آخری درجے کے التزام کا احساس ہوتا ہے، اتنا زیادہ کہ اگر مجھے تمام دنیا بھی مل جائے تو میں اس کے بدلے ایک بھی ایمانی حقیقت کو قربان نہیں کروں گا؛ کیونکہ ایک بھی حقیقت کے خلاف جانے والی کسی بھی چیز کو ایک لمحے کے لیے بھی فرض کر لینا میرے لیے انتہائی تکلیف دہ معاملہ ہے۔

اور جب میں کہتا ہوں: ''وَآمَنَّا بِمَا اَرسَلتَ مِنْ رَسُولٍ وَ آمَنَّا بِمَا اَنزَلتَ مِنْ كِتَابٍ، وَصَدَّقنَا'' ، تو مجھے انتہائی قسم کی ایمانی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ اور میں ہر اس چیز کو جو ایمان کے حقائق میں سے کسی بھی حقیقت کے خلاف جاتی ہو، ''محالِ عقلی'' سمجھتا ہوں اور اہلِ ضلالت کو آخری درجے کے پاگل، احمق اور بیوقوف سمجھتا ہوں۔

میری طرف سے اپنے والدین کو سلام مع الاحترام پہنچا دینا اور ان سے میرے لیے دعا کی درخواست کرنا؛ کیونکہ وہ میرے لیے میرے والدین کی حیثیت ہی رکھتے ہیں۔ تمام گاؤں والوں کو اور خاص کر آپ سے ''مقالات'' سننے والوں کو میرا اسلام کہنا۔

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

دسواں مکتوب

(دوسوالوں کا جواب)

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْئٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

پہلا جواب: تیسویں مقالے کے دوسرے مقصد میں بیان کیے گئے مضمون، ذرّات کے تحوّلات وتغیرات'' کا طویل حاشیہ ہے۔

قرآنِ حکیم میں متعدد جگہوں پر ''امامِ مبین'' اور'' کتابِ مبین'' آیا ہے۔ مفسّرین نے اِس بارے میں کہا ہے: ان دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے، البتہ اُن میں سے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ: ان دونوں کا مفہوم مختلف ہے۔ مطلب یہ کہ اِن کی حقیقت کی وضاحت میں اُن کے بیانات مختلف ہیں، اور اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ: یہ دونوں علمِ الٰہی کے عنوان ہیں۔۔۔

لیکن قرآن کریم کے فیضان سے مجھے یہ اطمینان حاصل ہوگیا ہے کہ: ''امامِ مبین'' ایک قسم کے علمِ الٰہی اور امرِ الٰہی کا عنوان ہے، چنانچہ یہ عالمِ شہادت سے زیادہ عالمِ غیب کی طرف دیکھتا ہے یعنی وہ حال سے زیادہ ماضی اور مستقبل کو دیکھتا ہے، مطلب یہ کہ وہ ہر چیز کی اُس کے ظاہری وجود کی بہ نسبت اُس کی اُصل، اُس کی نسل اور اس کی جڑوں اور بیجوں کی طرف زیادہ دیکھتا ہے۔ پس وہ تقدیرِ الٰہی کا ایک رجسٹر ہے۔ اور اس رجسٹر کا وجود چھبیسویں مقالے میں اور دسویں مقالے کے حاشیے میں ثابت کردیا گیا ہے۔ جی ہاں؛ یہ ''امامِ مبین'' الٰہی علم وامر کی ایک قسم کا عنوان ہے۔ مطلب یہ کہ: اشیاء کے مبادی اور جذور واصول جو اشیاء کو انتہائی عمدگی، اچھوتے پن اور پائیداری واُستواری اور نظم وضبط کے ساتھ پیدا کرتے ہیں، اس چیز پر دلالت کرتے ہیں کہ ان اشیاء کی تنظیم سازی کا کام علمِ الٰہی کے دساتیر کے رجسٹر میں انجام پاتا ہے، اور اشیاء کے نتائج، اُن کی نسلیں اور اُن کے بیج اس بات کی جانکاری دیتے ہیں کہ وہ قطعی طور پر اوامرِ الٰہیہ کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہیں؛ کیونکہ وہ موجودات کے اُن مناہج وفہارس پر مشتمل ہیں جو کہ مستقبل میں آنے والی ہیں، مثال کے طور پر ایک گٹھلی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ: یہ اُن تکوینی اوامر کے لیے ایک چھوٹے سے مجسّم سراپے کا حکم رکھتی ہے جو کہ ایک مکمل درخت کی تشکیل وترکیب کرنے والے مناہج وفہارس کی تعیین کرتے ہیں۔۔۔

الحاصل: ''امامِ مبین'' جب تخلیق کے اُس درخت کے منہج اور اُس کی فہرست کا حکم رکھتا ہے جس نے اپنی جڑیں اور شاخیں ماضی، مستقبل اور عالمِ غیب کے علاقوں میں پھیلا رکھی ہیں، تو پھر بے شک ''امامِ مبین'' اِس معنی میں تقدیرِ اِلٰہی کا ایک رجسٹر اور اس کے دساتیر کا مجموعہ ہے۔ پس ذرّات اِن دساتیر کی املا اور ان کے حکم کے ذریعے اشیاء کے وجود میں اپنی

خدمات اور حرکات کے لیے دوڑے چلے آتے ہیں۔۔۔

اور کتابِ مُبین جو ہے، اس کی نظر عالمِ غیب سے زیادہ عالمِ شہادت پر ہے۔ یعنی یہ ماضی اور مستقبل سے زیادہ زمانہ حاضر کی طرف دیکھتا ہے، اور یہ علم وامر سے زیادہ قدرت و إرادہ الٰہیہ کا عنوان، رجسٹر اور کتاب ہے۔ پس ''امام مبین'' اگر تقدیر کا رجسٹر ہے تو ''کتابِ مبین'' قدرت کا رجسٹر ہے یعنی کہ ہر چیز کے وجود، ماہیت، صفات اور حالات و کیفیات میں جو صنعت گری کے کمالات اور انتظامات پائے جاتے ہیں، ان کے پیشِ نظر وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ: اُس چیز کو تقدیر کے کامل دساتیر اور ارادۂ نافذہ کے قوانین کے ساتھ وجود کا لباس پہنایا جاتا ہے، اس کی صورتیں شکلیں متعین کی جاتی ہیں، اُسے تشخص، معین مقداریں اور خصوصی شکل عطا کی جاتی ہے، پس یہ اس قدرت اور ارادے کا بہت بڑا رجسٹر اور عمومی و کُلی قوانین کا مجموعہ ہے کہ جہاں ہر چیز کے خصوصی وجود اور خصوصی صورتوں کی وضع قطع ہوتی ہے اور پھر اُس وجود اور اُن صورتوں شکلوں کی سلائی کر کے ان چیزوں کے ماپ کے مطابق اُنہیں پہنا دی جاتی ہیں۔ ''امام مبین'' کی طرح اس دفتر کے وجود کا اثبات بھی تقدیر اور جزو اختیاری کے مسائل میں کر دیا گیا ہے۔

اب ذرا اہلِ غفلت وضلالت وفلسفہ کی حماقت ملاحظہ ہو کہ اُنہوں نے اشیاء میں پائی جانے والی قدرت فاطرہ کی لوح اور حکمت وارادۂ ربانیہ کی کتاب یعنی بصیرت سے بھرپور کتاب لوح محفوظ کی جلوہ گری کو محسوس تو کر لیا لیکن اسے _ حاشا للہ _ طبیعت یا نیچر کا نام دے کر اس کو اندھا کر کے رکھ دیا ہے۔

پس یاد رہے کہ قدرتِ الٰہیہ ''اِمام مبین'' کی املا سے یعنی تقدیر کے حکم اور اس کے دستور کے ساتھ زمانے کے مثالی صفحے پر کہ جس کا نام ''لوحُ المحوِ والا ثبات'' ہے، موجودات کے اس سلسلے کو رقم کرتی اور پروان چڑھاتی ہے جن میں سے ہر چیز ایک مستقل آیت یا نشانی کا حکم رکھتی ہے اور اشیاء کی ایجاد کے ضمن میں ذرّات کو حرکت دیتی ہے۔۔۔ پس اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذرّات کی حرکات دراصل ان حرکات واہتزازات کا نام ہے جو اس وقت ظہور میں آتی ہیں جب موجودات اُس کتابت، تحریر اور استنساخ یعنی نقلِ تحریر کے عمل کے دوران میں عالمِ غیب سے عالمِ شہادت اور علم سے قدرت کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔۔۔

رہی لوحِ محو و اثبات تو وہ اس دائرہ ممکنات میں دائمی اور ثابت و برقرار لوحِ اعظم یعنی لوحِ محفوظ کا ایک متبادل دفتر اور کتابت ومحو یعنی لکھنے اور مٹانے کی لَوح ہے، یعنی وہ اُن اشیاء کا دفتر ہے جو دائماً موت وحیات اور وجود وفنا سے دوچار رہتی ہیں۔۔۔ اور یہ زمانے کی حقیقت ہے۔۔۔ جی ہاں؛ جس طرح ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے اسی طرح اُس چیز کی حقیقت جسے ہم زمانہ کہتے ہیں جو کہ اس کائنات میں ایک عظیم نہر کی طرح رواں دواں ہے، یہ ہے کہ: وہ لوحِ محو واثبات میں قدرت الٰہی کی کتابت کے لیے ایک صفحے اور روشنائی کا حکم رکھتا ہے۔۔۔ لَا يَعْلَمُ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔۔۔

دوسرا سوال: میدانِ حشر کہاں ہے؟

الجواب: وہ حکمتِ عالیہ جس کا اظہار خالق الحکیم ہر چیز میں کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ کسی حقیری چیز کے ساتھ بڑی عظیم الشان حکمتوں کو وابستہ کر دیتا ہے؛ وہ حکمت مکمل صراحت کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کرۂ ارض اپنی سالانہ گردش کے دوران ایک بہت بڑا دائرہ فضول بے کار اور اندھا دھند ہی نہیں کھینچتا ہے بلکہ یہ ایک بہت بڑی چیز کے ارد گرد گھوم رہا ہے اور اس گردش کے دوران ایک ایسا خط کھینچتا ہے جو ایک بہت بڑے میدان کا احاطہ کرتا ہے اور اس کی حدود متعین کرتا ہے۔ اور یہ کرۂ ارض ایک بہت بڑی نمائش گاہ کے گرد گھومتا ہے اور اپنی معنوی محصولات کو اُس کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور عنقریب مستقبل میں وہ ان محصولات کو اس نمائش گاہ میں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دے گا۔ مطلب یہ کہ ایک احاطہ کر لینے والے اور اپنے گھیرے میں لے لینے والے دائرے کے اندر جس کی مسافت تقریباً پچیس ہزار سال کی ہوگی حشر کا وہ میدان پھیلا دیا جائے گا جو اس دائرے کو کھچا کھچ بھر دے گا اور ایک روایت کی بنا پر شام کا علاقہ اس کے لیے ایک گٹھلی کے حکم میں ہوگا۔

اور یہ میدان جو کہ پردۂ غیب میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے، زمین کی معنوی محصولات کو ابھی سے اس معنوی میدان کی ڈائریوں اور تختیوں کی طرف بھیجا جا رہا ہے، اور پھر جب مستقبل میں اس میدان کا گیٹ کھول دیا جائے گا اس زمین کے باسیوں کو بھی اس میدان میں جھونک دیا جائے گا، اور یہ معنوی محصولات بھی غیب سے شہادت کی طرف چلی جائیں گی۔

جی ہاں؛ یہ کرۂ ارض ایک کھیت، سرچشمے اور ایک پیمانے کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اتنی زیادہ محصولات پیدا کر دی ہیں جو اُس میدانِ اکبر کو پُر کر دیں گی۔ اور اس سے اتنی مخلوقات سیلاب کی طرح بہہ گئی ہیں جو کہ اُس میدان کو مکمل طور پر اس طرح بھر دیں گی کہ اس کا کوئی بھی کونہ خالی نہ رہے گا۔ اور اس سے اتنی مصنوعات نکلی ہیں جو کہ اُسے لبریز کر دیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کرۂ ارض ایک گٹھلی کی حیثیت رکھتا ہے اور میدان حشر۔ اُس میں موجود تمام چیزوں سمیت درخت، بالی اور مخزن ہے۔

جی ہاں، جس طرح ایک نورانی نقطہ اپنی تیز ترین حرکت کے ذریعے ایک نورانی لکیر بن جاتا ہے اُسے تیزی کے ساتھ گول گھمایا جائے تو نورانی دائرہ بن جاتا ہے، اسی طرح یہ کرۂ ارض بھی اپنی تیز ترین حکیمانہ حرکت کے ذریعے وجود کے دائرے کا نمونہ پیش کرنے کا سبب بن جائے گا، اور وہ وجودی دائرہ حشر اکبر کے میدان کی شکل اختیار کرنے کا وارو مدار بن جائے گا۔

﴿قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَاللّٰہِ﴾

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

گیارہواں مکتوب

بِاسْمِہٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

یہ مکتوب ایک اہم علاج ہے جو چار آیتوں کے خزانے کے چھوٹے چھوٹے جواہرات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

میرے عزیز بھائی!

قرآنِ حکیم نے میرے نفس امارہ کو مختلف اوقات میں ان چار مختلف مسائل کا درس دیا ہے۔ پس میں نے ان درسوں کو قلم بند کرلیا تا کہ میرے بھائیوں میں سے جو بھی چاہے ان سے کوئی درس یا اپنے حصّے کی کوئی چیز حاصل کر لے۔

ان کی وضاحت اس انداز سے کی گئی ہے کہ یہ مباحث کے لحاظ سے مختلف چار آیاتِ کریمہ کے حقائق کے خزینے کے چھوٹے چھوٹے جواہرات کے نمونے ہیں۔ اور ان چاروں مباحث میں سے ہر مبحث کی خصوصی صورت اور دیگر فائدہ ہے۔

پہلا مبحث: ﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا﴾

اے میرے سُوءِ وسوسہ کی وجہ سے نا اُمید ہونے والے نفس! تداعی خیالات اور تخطُّرِ فرضیات یعنی افکار کا سلسلہ وار تتا باندھ کر آنا اور فرضی چیزوں کا ذہن میں آٹپکنا ایک ایسی چیز ہے جن کے نقش ونگار بالکل غیر اختیاری طور پر دل ودماغ میں چپک جاتے ہیں۔

اس نقش ونگار کا تعلق اگر خیر کے ساتھ ہو اور وہ نورانی ہو تو اس کی حقیقت کا حکم کسی نہ کسی حد تک اس کی شکل صورت اور اپنی مثال کی طرف منتقل ہو جائے گا، بالکل ایسے کہ جیسے سورج کی روشنی اور حرارت آئینے میں اس کی مثال کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کا تعلق شرّ سے ہو اور وہ کثیف ہو تو پھر اصل کا حکم اور اس کی خاصیت، اس کی شکل صورت اور اس کی تمثال کی جگہ نہیں لے سکتا۔

مثال کے طور پر: کسی پلید یا مردہ چیز کی آئینے میں نظر آنے والی صورت پلید یا مردہ نہیں ہو گی۔ اور سانپ کی شکل صورت ڈستی نہیں۔

پس اس راز کی بنا پر کفر کا تصوّر کرنا کفر نہیں اور گالی گلوچ کا خیال کرنا گالی گلوچ نہیں، اور خاص کر اس وقت جب یہ چیز اختیار میں نہ ہو۔ اور ذہن میں آٹپکنے والے فرضی خیالات کلّی طور پر نقصان دہ نہیں ہوں گے۔

پھر یہ بھی ہے کہ اہلِ حق یعنی اہل السنہ والجماعۃ کے مذہب میں کسی چیز کا شرعی طور پر قبیح وخبیث ہونا نہیِ الٰہی کے سبب سے ہوتا ہے۔ اور یہ فرضی تصوّرات اور خیالی بلاوے چونکہ اختیار اور رضامندی کے بغیر ہوتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ

نہیِ الٰہی کا تعلق نہیں ہوتا، اس لیے کوئی بھی معاملہ ظاہری صورت میں کتنا بھی قبیح، ناپاک اور نجس کیوں نہ ہو، قبیح، ناپاک اور نجس نہیں ہوگا!۔

دوسرا مسئلہ: حاصلِ فکر

جو بارلا کے بالائی مقام صنوبر، سرو اور پہاڑی سفیدے کے درختوں کے درمیان غور و فکر سے ظہور میں آیا۔

یہ سترہویں مقالے کا ایک ٹکڑا ہے، جس کی وجہ سے اسے یہاں ذکر نہیں کیا جا رہا۔

تیسرا مسئلہ:

یہ مسئلہ اور اس کے بعد والا چوتھا مسئلہ، دونوں پچیسویں مقالے میں بیان کی گئی ان مثالوں کا ایک حصہ ہیں جنہوں نے یہ بات واضح طور پر آشکار کر دی ہے کہ جدید تہذیب قرآن کریم کے اعجاز کے مقابلے میں بالکل عاجز و درماندہ ہے۔ اور یہ دو مثالیں ان ہزاروں مثالوں میں سے ہیں جو یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ اس خلافِ قرآن جدید تہذیب و تمدن نے انسانی معاشرے کے لیے جو حقوق متعیّن کیے ہیں، غلط اور باطل ہیں۔

پس قرآنی حکم: ﴿فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ عین رحمت اور خالص ''عدالت'' ہے۔

جی ہاں؛ یہ عدالت ہے؛ کیونکہ مرد عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے تو مطلق اکثریتی رواج کے مطابق اس عورت کے اخراجات کا کفیل بن جاتا ہے اور عورت مرد کے ساتھ شادی کر کے اپنے نان نفقہ کا بوجھ اس پر ڈال دیتی ہے۔ اور یوں اُس نقصان کی تلافی کر لیتی ہے جو اسے وراثت میں ہوا ہوتا ہے۔

پھر یہ قرآنی ''رحمت'' ہے؛ کیونکہ یہ کمزور بیٹی اپنے باپ کی شفقت کی اور اپنے بھائی کی رحمت کی بہت زیادہ محتاج ہے، چنانچہ اس کمزور بیٹی کو اپنے باپ کی شفقت قرآنی حکم کے مطابق بے خوف و خطر مل جاتی ہے؛ کیونکہ اس کا باپ اُسے ڈرتی اور خوف کھاتی نظر سے نہیں دیکھتا کہ یہ میرے لیے نقصان کا سبب ہے، جس کی وجہ سے عنقریب اُس کی آدھی دولت و ثروت اغیار و اجانب کے ہاتھوں میں چلی جائے گی! چنانچہ بیٹی کے لیے اس پدرانہ شفقت و مہربانی میں کسی ڈر خطرے کا شائبہ نہیں ہوتا۔

پھر اسے اپنے بھائی کی طرف سے ایسی رحمت، مہربانی اور حمایت ملتی ہے جس میں حسد اور بغض و کینے کا شائبہ نہیں ہوتا؛ چنانچہ اس کا بھائی اُسے یہ نہیں سمجھتا کہ یہ ہماری رقیب ہے جو ہمارا آدھا خاندان برباد کر دے گی اور ہماری دولت و ثروت کا ایک اچھا خاصہ حصہ غیروں کے ہاتھوں میں تھما دے گی۔ اس لیے وہ اس رحمت و حمایت میں حقد و بغض اور کدورت کی آمیزش نہیں ہونے دے گا۔

پس وہ فطری طور پر لطیف و رقیق اور نرم و نازک سی اور پیدائشی طور پر کمزور اور نحیف و نزار بیٹی اس حالت میں بظاہر

تھوڑی سی چیز سے محروم ہو جاتی ہے لیکن اس کے بدلے میں وہ اپنے اعزہ واقارب کی ختم نہ ہونے والی شفقت ومہربانی حاصل کر لیتی ہے۔

لیکن اُس پر ترس کھا کر اُسے اُس کا حق اس کے مقرّرہ حصّے سے بڑھ کر دے دینا، اس گمان پر کہ ہم اس پر اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر مہربان ہیں؛ یقیناً اس کے ساتھ مہربانی کا نہیں بلکہ بدترین ظلم کا رویّہ ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ یہ وحشی قسم کی حرص جو اِس دور میں نفوس پر غالب آچکی ہے کسی ایسی بدترین ظالمانہ خصلت کا راستہ ہموار کر دے جو اُس وحشیانہ ظلم وستم کی یاد تازہ کر دے جس کے زیرِ اثر لوگ دورِ جاہلیت میں وحشیانہ غیرت کی بنا پر بچیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ پس اِس حکم کی طرح تمام قرآنی احکام اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾ کی تصدیق کرتے ہیں۔

چوتھا مسئلہ: ﴿فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ﴾

یہ میم کی بغیر مدنیّت (یعنی دنیّت) جس طرح بیٹی کو اس کا حق اُس کے حق سے زیادہ دے کر اس پر ظلم کرنے کا سبب بن رہی ہے، اسی طرح یہ ماں کو اس کے حق سے محروم کر کے اس پر بدترین ظلم کر رہی ہے۔

جی ہاں؛ والدہ کی وہ شفقت ومہربانی جو کہ رحمتِ ربانی کا ایک شیریں ترین، لطیف ترین، لذیذ ترین اور احترام کے لائق ترین جلوہ ہے، کائنات میں پائی جانے والی حقیقتوں میں سے ایک بلند ترین محترم اور معزّز حقیقت ہے۔

اور خود والدہ جو کہ اس طرح کی معزّز ترین، عزیز ترین اور مہربان ترین جاں نثار دوست ہے۔ کہ اپنے بچے کے لیے اپنی اس شفقت کے جذبے کے تحت تمام دنیا، اپنی زندگی اور اپنی راحت وآرامش کو قربان کر دیتی ہے۔ حتی کہ ایک بزدل سی مرغی جو کہ ایک کمترین قسم کی ماں کا درجہ رکھتی ہے، اس شفقت کی معمولی سی جھلک کے تحت اپنے چوزوں کے دفاع میں کتے پر حملہ کر دیتی ہے اور شیر پر دھاوا بول دیتی ہے۔

پس اس جیسی محترم اور معزّز حقیقت سے متصف والدہ کو اس کے بیٹے کے ترکے سے محروم کر دینا، اس قابلِ احترام حقیقت کے مقابلے میں ایک ایسا خوفناک ظلم، ایک وحشیانہ بے ادبی، ایک مجرمانہ تحقیر اور کفرانِ نعمت ہے جو عرشِ رحمت کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اور نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی کے لیے نفع بخش تابناک تریاق میں زہر ملا دینے کے مترادف ہے۔

یہ بات اگر نوعِ بشر کی خدمت کا دعویٰ کرنے والے یہ درندے نہیں سمجھ سکے ہیں تو نہ سہی کامل لوگ اسے بہر کیف سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانِ گرامی ﴿فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ﴾ میں پایا جانے والا قرآنِ حکیم کا حکم عین حق اور عین عدل ہے۔

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

بارھواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْئٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَعَلٰى رُفَقَائِكُمْ

میرے معزز بھائیو! آپ لوگوں نے اس رات مجھ سے سوال کیا تھا لیکن میں نے اس کا جواب نہیں دیا تھا؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمانی مسائل میں مناقشے کی صورت میں بحث کرنا جائز نہیں، اور تم لوگوں نے آپس میں بحث مناقشے کی صورت میں کی تھی۔ لیکن اس وقت میں آپ لوگوں کے ان تینوں سوالوں کا انتہائی اختصار کے ساتھ جواب لکھ رہا ہوں جو آپ کے اس مناقشے کی بنیاد بنے تھے۔ ان کی تفصیلات آپ لوگوں کو ان ''مقالات'' میں ملے گی جن کے نام محترم کیمسٹ نے لکھے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں ''چھبیسواں مقالہ'' نہ آیا جس میں تقدیر اور جزوی اختیار کے بارے میں بحث کی گئی ہے، اس لیے میں نے اس کا ذکر آپ کے ساتھ نہ کیا۔ آپ لوگ ایک نظر اُسے بھی دیکھ لیں، البتہ اُسے ایسے نہ پڑھنا جیسے اخبار وغیرہ پڑھے جاتے ہیں۔

اس محترم کیمسٹ کو میں نے ان ''مقالات'' کا مطالعہ کرنے کے لیے اس لیے کہا ہے کہ: اس طرح کے مسائل میں وارد ہونے والے شکوک وشبہات ان ایمانی ارکان پر ایمان کی کمزوری کی راہ سے آتے ہیں۔ اور مذکورہ ''مقالات'' ''ایمانی ارکان'' کا مکمل طور پر اثبات کرتے ہیں۔

تمہارا پہلا سوال: آدمؑ کو جنت سے نکالنے میں اور اُن کی بعض اولاد کو جہنم میں داخل کرنے میں کیا حکمت ہے؟

الجواب: اس میں پائی جانے والی حکمت ''توظیف'' ہے، یعنی ذمہ داری اور وظیفہ سونپنا۔ چنانچہ انہیں زمین پر اتنی جلیل القدر ذمہ داری دے کر بھیجا گیا کہ نوعِ بشر کی تمام تر معنوی ترقیوں کا انکشاف، تمام انسانی استعدادوں کی نشوونما اور انسانی ماہیت کا تمام اَسمائے اِلٰہیہ کا جامع ترین آئینہ بن جانا اسی وظیفے اور اسی ذمہ داری کے نتیجے ہیں۔ چنانچہ آدمؑ اگر جنت میں ہی رہتے تو ان کا مقام فرشتے کی طرح ایک ہی جگہ پر ثابت و برقرار رہتا اور بشری استعدادوں اور قابلیتوں کا انکشاف نہ ہو پاتا۔ کیونکہ ترتیب وار ثابت و برقرار مقامات کے مالک فرشتے تو بہت زیادہ ہیں اس لیے اس طرح کی عبودیت کے لیے آدمؑ کی ضرورت بالکل نہ تھی۔ اس بنا پر حکمتِ الٰہیہ کا یہ تقاضا ہوا کہ ایک ''دار التکلیف'' کا وجود ہونا چاہیے جو اس بے پایاں مقامات طے کر لینے کی طاقت رکھنے والے انسان کی استعدادوں کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ اس بنا پر آدمؑ کو ایک معلوم گناہ کی پاداش میں جنت سے نکال دیا گیا جس کا ارتکاب کرنا۔ فرشتوں کے برخلاف۔ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔

تو پتا چلا کہ آدمؑ کو جنت سے نکالنا عین حکمت اور خالص رحمت ہے، اسی طرح کافروں کو جہنم میں داخل کرنا حق اور عدل ہے۔ جیسے کہ دسویں مقالے کے تیسرے اشارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ: ''کافر نے اس چھوٹی سی عمر میں اگرچہ ایک گناہ ہی کیا ہے، لیکن وہ گناہ بے پایاں جرم پر مشتمل ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر تمام کائنات کی تحقیر کرنے اور اس کی قدر و قیمت گرادینے، تمام مصنوعات وحدانیت پر جو گواہی دے رہی ہیں اس گواہی کی تکذیب اور موجودات کے آئینوں میں جن اسماء کے جلوے نظر آرہے ہیں ان اسماء کو کھوٹا اور ناکارہ ثابت کرنے کے مترادف ہے''۔ اس بنا پر القھار الجلیل سلطانُ الموجودات کافروں سے ان موجودات کے حقوق وصول کرنے کے لیے انہیں جہنم میں ڈال دے گا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

پس کافروں کو ابد تک کے لیے جہنم میں پھینک دینا عین حق اور عدل ہے؛ کیوں کہ بے پایاں جرم بے پایاں عذاب کا تقاضا کرتا ہے۔

آپ کا دُوسرا سوال: شیاطین کو خلق اور ایجاد کیوں کیا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے شرور و شیاطین کو پیدا کر دیا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ کیونکہ شر کو پیدا کرنا شرّ اور بری چیز کو پیدا کرنا بُرا ہے؟

الجواب: حاشا وکلّا! شرّ کو پیدا کرنا شرّ نہیں بلکہ شرّ کا اکتساب کرنا اور اسے اپنانا شرّ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خلق و ایجاد کی نظر تمام نتائج پر ہوتی ہے جبکہ کسب چونکہ خصوصی طور پر براہِ راست کام کرنے کا نام ہے اس لیے اس کی نظر خالص نتائج پر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر: بارش کے ہزاروں نتائج ہیں اور سبھی اچھے ہیں۔ اب اگر کوئی اپنے سوءِ اختیار اور بدعملی کی وجہ سے بارش کی وجہ سے نقصان اٹھاتا ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ بارش کو ایجاد کرنے میں کوئی رحمت نہیں ہے، اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ بارش کو پیدا کرنے میں شرّ ہی شرّ ہے۔ بلکہ اس کے لیے بارش اس کے سوءِ اختیار اور سوءِ کسب کی وجہ سے شرّ بن گئی ہے۔

اسی طرح آگ کی پیدائش میں بہت سے فوائد ہیں اور سبھی بہتر ہیں۔ لیکن اگر کوئی آدمی اپنے سوءِ کسب اور سوءِ استعمال کی وجہ سے آگ سے نقصان اُٹھاتا ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ: آگ کو پیدا کرنا شرّ ہے؛ کیونکہ آگ صرف اُسی کو جلانے کے لیے پیدا نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس نے خود اُس آگ میں ہاتھ ڈالا جو اُس کا کھانا پکاتی ہے اور اپنے سوءِ اختیار سے اپنی اس فرمانبردار خادمہ کو اپنا دشمن بنالیا۔

الحاصل: خیرِ کثیر کو حاصل کرنے کے لیے شرّ قلیل کو قبول کر لیا جاتا ہے، کیونکہ اگر خیرِ کثیر کو جنم دینے والی شرّ کو صرف اس بنا پر چھوڑ دیا جائے کہ اس سے شرّ قلیل وجود میں نہ آئے، تو پھر شرّ کثیر کا ارتکاب ہوگا، یعنی بہت زیادہ برائی ظہور میں آئے گی۔

مثال کے طور پر: فوج کو میدان جنگ میں جھونک دینے میں کچھ جزوی سے مادی اور جسمانی نقصانات ہوتے ہیں اور برائیاں ظہور میں آتی ہیں، لیکن اس جہاد میں اس طرح خیر کثیر پائی جاتی ہے، کہ اسلام کافروں کے غلبہ وتسلُّط سے محفوظ ہو جاتا ہے۔لیکن اگر اس شرِّ قلیل کے ڈر سے جہاد چھوڑ دیا جائے تو پھر صرف یہی نہیں کہ شرِّ کثیر وجود میں آئے گا بلکہ خیر کثیر بھی ہاتھ سے جائے گی۔اور یہ عین ظلم ہے۔

اسی طرح مثال کے طور پر ایک کینسر زدہ انگلی کو کاٹ دینے میں۔جس کا کاٹ پھینکنا ضروری ہو گیا ہو۔خیر اور بہتری ہے، حالانکہ بظاہر یہ چیز شرّ اور برائی ہے؛ کیونکہ اگر انگلی نہ کاٹی گئی تو پورا ہاتھ کاٹنا پڑے گا، اور یوں شرِّ کثیر جنم لے گا۔

پس کائنات میں جو برائیاں، نقصانات، مصیبتیں، پریشانیاں، شیاطین اور نقصان دہ چیزیں ہیں، ان کی تخلیق وایجاد میں برائی یا بدصورتی نہیں ہے، کیونکہ وہ بہت سے اہم نتائج کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔مثال کے طور پر:

فرشتے ترقی نہیں کرتے اور ان کے مقامات ثابت وبرقرار ہیں تبدیل نہیں ہوتے؛ کیونکہ ان پر شیاطین کو مسلط نہیں کیا گیا ہے۔

اسی طرح حیوانات کے مراتب ودرجات بھی ثابت اور ناقص ہیں، کیونکہ ان پر شیاطین کو مسلّط نہیں کیا گیا ہے۔لیکن عالمِ انسانیت میں ترقیوں، تنزّلیوں اور بلندیوں پستیوں کے بے انتہا مراتب ہیں، چنانچہ اس میں نمرودوں فرعونوں سے لے کر صدیقین، اولیاء اور انبیاء تک ترقی کی طویل ترین مسافت پائی جاتی ہے۔

پس کوئلوں کے ساتھ مشابہت رکھنے والی پست روحوں کو ہیرے کے ساتھ مشابہت رکھنے والی بلند روحوں سے ممتاز اور جدا جدا کرنے کے لیے شیاطین کو پیدا کرکے، مکلف کرکے اور پابندیاں عاید کرکے اور نبیوں کو بھیج کر امتحان تجربے، جہاد اور مسابقت کا میدان کھول دیا گیا ہے۔اس لیے اگر مجاہدہ اور مسابقت نہ ہوتی تو انسانیت کے جوہر میں موجود ہیرے اور کوئلے کے ساتھ مشابہت رکھنے والی یہ صلاحیتیں اور استعدادیں مساوی رہ جاتیں، یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بلند ترین روح اور ابوجہل کی پست ترین روح ایک برابر رہ جاتیں!

تو اس سے پتا چلا کہ شرور وشیاطین کی تخلیق وایجاد بُری اور بدصورت نہیں ہے؛ کیونکہ اُن کی اِیجاد کی نگاہ کُلّی اور عظیم شان نتائج پر ہے؛ بلکہ غلط استعمال اور کسب یعنی براہِ راست خصوصی ارتکاب سے جنم لینے والی برائیوں اور بدصورتیوں کا تعلق انسانی کسب واکتساب کے ساتھ ہے ایجادِ الٰہی کے ساتھ نہیں۔

اگر آپ یہ سوال کرو کہ:

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی وجہ سے بہت سے لوگ شیاطین کے وجود سے نقصان اُٹھاتے ہیں، کافر ہو جاتے ہیں اور کفر کی ڈگر پر رواں دواں رہتے ہیں۔اب چونکہ اکثر لوگ برائی سے دوچار ہوتے ہیں، اور فیصلہ اکثریت کو دیکھ کر کیا جاتا

ہے؛اس لیے شر کو پیدا کرنا شر ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ:انبیاء علیہم السلام کی بعثت رحمت نہیں ہے۔

الجواب: کیفیت کے مقابلے میں کمیت کی کوئی اہمیت نہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اکثریت کی نظر کیفیت پر ہوتی ہے کمیت پر نہیں۔مثال کے طور پر:

اگر کھجور کی ایک سو گٹھلیاں ہوں، انہیں نہ تو زمین میں دبایا جائے، نہ انہیں پانی دیا جائے اور کیمیائی عمل بھی نہ چلے، یعنی وہ گٹھلیاں زندگی کی جدوجہد کے عمل سے نہ گزریں، تو یہ سو گٹھلیاں تعداد میں سو ہی اور قیمت میں سو پیسوں کی رہیں گی۔لیکن اگران کی دیکھ بھال کی جائے، انہیں پانی دیا جائے اور زندگی کی جدوجہد سے دوچار کیا جائے، اور پھر ان سو میں سے اسّی اپنے سوءِ مزاج کی وجہ سے خراب ہو جائیں، اور بقیہ بیس کھجوروں کے پھل دار درخت بن جائیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ ان گٹھلیوں کو پانی دینا شر بن گیا ہے؛ کیونکہ اس کام نے بہت سی گٹھلیاں خراب کر دی ہیں؟ بلاشبہ آپ ایسا ہر گز نہیں کہیں گے؛ کیونکہ نشو ونما پانے والی وہ بیس گٹھلیاں بیس ہزار گٹھلیوں کا رُوپ دھار گئی ہیں۔پس جس نے اسّی گنوا کر اسّی ہزار پالیں وہ خسارے میں نہیں رہے گا اور آبپاشی کا یہ کام شر نہیں ہوگا!

اسی طرح اگر۔مثال کے طور پر۔مورنی کے سو انڈے ہوں جو انڈے ہونے کی حیثیت سے پانچ سو روپے کے برابر ہوں۔لیکن جب مورنی ان سو انڈوں کو سینے کے لیے ان پر بیٹھ جائے اور ان میں سے اسّی انڈے گندے پڑ جائیں اور بقیہ بیس انڈے بیس مور بن جائیں تو کیا یہ کہا جائے گا کہ شر بن گیا ہے؟ اور مورنی کا انڈوں پر بیٹھنا بدصورت اور بُرا ہے؟ نہیں نہیں، بلکہ یہ کام تو خیر ہے؛ کیونکہ موروں کی قوم نے اور انڈوں کے گروہ نے صرف چار سو روپوں کی قیمت کے اسّی انڈے گنوائے ہیں لیکن اسّی لیروں کی قیمت کے بیس مور حاصل کر لیے ہیں!

اور یوں نوعِ بشر نے نقصان دہ حیوانات کی قبیل کے تعداد میں بہت زیادہ لیکن بالکل بے قیمت کفّر و منافقین تو کھو دیے لیکن اس کے بدلے میں اُنہوں نے ہزاروں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی برکت سے مکلف اور پابند ہو جانے کے طفیل اور شیطانوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے کی وجہ سے ہزاروں انبیاء، لاکھوں اولیاء اور کروڑوں اُصفیاء پالیے جو عالمِ انسانیت کے لیے آفتابوں، ماہتابوں اور ستاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ کا تیسرا سوال: اللہ تعالیٰ مصائب و آلام اُتارتا ہے اور بلائیں مسلّط کرتا ہے، اور خاص کر معصوموں پر، حتّی کہ حیوانات پر بھی؛ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟

الجواب: حاشا و کلا! بادشاہت صرف اُسی ایک کی ہے اور وہ اپنی بادشاہت میں جیسے چاہے تصرّف کرسکتا ہے۔یہ بتاؤ کہ اگر کوئی معزز صنعتکار اپنے فن کی مہارت و حذاقت کا اظہار کرنے کے لیے آپ کو اُجرت دے کر ایک ماڈل کے طور پر استعمال کرے اور آپ کو اپنے بنائے ہوئے خوبصورت اور زیبا ترین کپڑے پہنا دے، پھر ان کپڑوں کی کتر بیونت کر کے

انہیں چھوٹا بڑا کرنا شروع کر دے، اور آپ کو کبھی اُٹھائے کبھی بٹھائے؛ تو آپ اسے یہ کہہ سکیں گے کہ: کپڑوں نے مجھے جو زیب و زینت بخشی تھی آپ نے اُسے بدنما کر دیا ہے، اور مجھے بار بار اُٹھا بٹھا کر تھکا دیا ہے؟ بلا شبہ آپ یہ بات نہیں کہہ سکیں گے۔ اور اگر کہیں گے تو یہ پاگل پن کی دلیل ہوگی۔

بعینہٖ اسی طرح صانع الجلیل نے تمہیں انتہائی درجے کا ساختہ پرداختہ اور کان آنکھ اور زبان جیسے حواسِ خمسہ سے مرصّع و مزیّن وجود پہنایا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے انواع و اقسام کے اسمائے حُسنیٰ کے اظہار کے لیے تمہیں بیمار کرتا ہے، آزماتا ہے، تجھے بھوک لگاتا ہے، سیر کرتا ہے، پیاس لگاتا ہے اور اس طرح کے دیگر حالات سے گزارتا ہے اور اس طرح کے طور اطوار میں گھماتا پھراتا رہتا ہے تاکہ زندگی کی ماہیت مضبوط ہوتی رہے اور اس کے اسماء حسنیٰ کے جلوے آشکار ہوتے رہیں۔

اگر تم اُسے یہ کہو کہ:

تُو مجھے اس طرح کے مصائب کے ذریعے آزماتا کیوں ہے؟ تو سینکڑوں حکمتیں تمہارا منہ بند کر دیں گی، جیسے کہ تمثیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔

کیونکہ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ سکون، خاموشی، روزگاری تسلسل، بے کاری اور توقّف، عدم اور ضرر کی ایک قسم ہے۔ اور اس کے برعکس حرکت اور تبدّل و تغیّر وجود اور خیر ہے۔ اور زندگی تمام پہلوؤں سے حرکات کے ذریعے مکمل ہوتی اور آلام و مصائب کے ذریعے ترقی کے منازل طے کرتی ہے۔ اور اسمائے حسنیٰ کے جلووں کے ذریعے مختلف حرکات میں تبدیلیوں سے گزر کر پاک صاف ہوتی ہے، مضبوط ہوتی ہے، منکشف ہوتی ہے، نشو و نما پاتی ہے اور وسعت پکڑتی ہے۔ اور اپنے منصوبہ جات کو لکھنے والا ایک متحرک قلم بن جاتی ہے، اپنا وظیفہ ادا کرتی ہے اور اس طرح اُخروی اجر کی مستحق بن جاتی ہے۔

آپ کے مناقشے میں زیرِ بحث آنے والے تینوں سوالوں کے جوابات اِسی قدر ہی کافی ہیں۔ ان کی پوری وضاحت درکار ہو تو وہ "تینتیس مقالوں" میں موجود ہے۔

میرے عزیز بھائی!

یہ رسالہ اُس کیمسٹ کو اور دیگر لوگوں کو بھی جنہیں آپ مناسب سمجھتے ہیں سنا دیں جو اس بحث میں شریک تھے۔ اور میری طرف سے اُس کیمسٹ کو سلام کہیں جو کہ میرا نیا شاگرد بنا ہے اور اسے کہو کہ: ایمانیات کے ساتھ تعلق رکھنے والے اس طرح کے دقیق مسائل کے متعلق عام مجلس میں اور بغیر کسی میزان کے، جھگڑے کے انداز میں بحث برائے بحث کرنا جائز نہیں؛ کیونکہ بحث اگرچہ تریاق کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اگر وہ صرف جھگڑے کے لیے کی جائے اور اس میں بات ناپ تول کے نہ کی جائے، تو یہ چیز بات کرنے والوں کو بھی اور سامعین کو بھی نقصان دیتی ہے۔ اس طرح کے ایمانی مسائل میں

بحث صرف اسی صورت میں جائز ہے جب انصاف سے کام لیا جائے، بلڈ پریشر اعتدال پر ہو اور صرف تبادلۂ افکار پیش نظر ہو، وگرنہ نہیں۔

اور اسے یہ بھی کہہ دو کہ: اس طرح کے مسائل میں اگر کبھی شبہات پیدا ہوں اور ''مقالات'' میں ان کے جوابات نہ ملیں تو مجھے براہِ راست پرائیویٹ خط لکھ کر پوچھ لیا کرے۔

اور اُسے یہ بھی کہو کہ اس نے اپنے والد کے بارے میں جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ذہن میں یہ آئی ہے کہ:

اس کے والدِ مرحوم چونکہ ڈاکٹر تھے، اور اُن کے ہاتھوں بہت سے نیک لوگوں کو حتی کہ بہت سے اولیاء کو بھی فائدہ ہوا ہے، اس لیے ان پاکباز لوگوں کی روحیں جنہیں اس کے والد سے فائدہ پہنچا تھا اُس کی وفات کے وقت اس کے سب سے قریبی رشتے دار یعنی اُس کے بیٹے کے سامنے پرندوں کی صورت میں آشکار ہوئیں۔ پس میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اُنہوں نے اس کی روح کی سفارش کے لیے اور اس کو شفقت بھرے انداز میں خوش آمدید کہنے کے لیے بھرپور استقبال کیا ہے۔

اُس رات وہاں مل بیٹھنے والے تمام دوستوں کو میری طرف سے سلام اور دعا۔

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

تیرھواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَالْمَلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهَوٰى

میرے عزیز بھائیو!

آپ لوگ اکثر میرے حال احوال اور راحت ورامش کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ اور یہ بھی پوچھتے ہیں کہ میں حکومت سے رہائی کا پروانہ کیوں نہیں مانگتا، اور یہ کہ میں احوالِ عالم کی سیاست کے ساتھ دلچسپی کیوں نہیں رکھتا۔ آپ کے یہ سوال مجھ پر تکرار کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔۔۔ اور مجھ سے معنوی طور پر پوچھا گیا ہے۔ اس بنا پر میں ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں، اور یہ جوابات جدید سعید کی زبان سے نہیں بلکہ قدیم سعید کی زبان سے ہیں۔

آپ کا پہلا سوال: آپ کا کیا حال ہے؟ آپ خیر وعافیت سے ہیں؟

الجواب: میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے انواع واقسام کے اس ظلم کو رحمت میں تبدیل کر دیا ہے جو اہلِ دنیا نے مجھ پر ڈھائے ہیں (حاشیہ) اور اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ: میں نے سیاست کو خیر باد کہہ دیا تھا اور دنیا سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ اور ایک دفعہ میں کسی پہاڑ کی غار میں آخرت کے بارے میں سوچ بچار کر رہا تھا کہ اچانک اہلِ دنیا نے مجھے وہاں سے نکال دیا اور اَز راہِ ظلم مجھے جلاوطن کر دیا۔ لیکن خالقِ رحیم وکریم نے اس جلاوطنی کو میرے حق میں رحمت بنا دیا اور اس خوفناک اور اخلاص شکن اسباب کے ساتھ دوچار پہاڑ کے دامن میں پائی جانے والی اس تنہائی کو ''بارلا'' کے مخلص اور پُر امن پہاڑوں میں خلوت نشینی کے رُوپ میں تبدیل کر دیا۔ میں جب روس میں قید تھا، اس وقت میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا اور اللہ کے حضور گڑگڑایا بھی تھا کہ میں اپنی آخری عمر میں کسی غار میں خلوت نشیں ہو جاؤں گا۔ اب اُس اَرحم الراحمین نے ''بارلا'' کو وہ غار بنا دیا ہے اور مجھے غار کے فوائد عطا کر دیے اور میرے کمزور کندھوں پر تنگ وتاریک غار کی مشقتوں کا بوجھ نہیں ڈالا۔ بس اتنا ہے کہ ''بارلا'' میں کچھ لوگ وہم کا شکار ہو گئے تھے جس کی وجہ سے مجھے کچھ تکلیفیں اُٹھانا پڑیں؛ کیونکہ میرے یہ وہم کے شکار لوگ بزعمِ خویش میرے آرام وسکون کا خیال رکھتے تھے، لیکن اس وہم پرستی کی وجہ سے وہ میرے دل کو اور قرآن کی خدمت کو نقصان پہنچا بیٹھے!

پھر ان اہلِ دنیا نے تمام جلاوطنوں کو رہائی کے پروانے دے دیے اور مجرموں کو معاف کر دیا اور انہیں جیل سے نکال

(حاشیہ) اہلِ دنیا سے مراد یہاں صاحب اقتدار لوگ ہیں نہ کہ عام دنیادار۔ مترجم۔

دیا، لیکن میرے ساتھ ظلم وتعدّی کا رویہ روا رکھا اور مجھے اس طرح کی دستاویز نہ دی۔ چنانچہ ربّ رحیم نے مجھ سے قرآن کی خدمت اور زیادہ لینے کے لیے اور ان ''مقالات'' نامی قرآنی انوار کی تالیف کروانے کے لیے مجھے اس شور وغوغا سے محفوظ جگہ پر مزید رہنے کا موقع دیا اور اس جلاوطنی کو ایک عظیم الشان رحمت میں تبدیل کر دیا۔

پھر یہ بھی ہے کہ ان اہلِ دنیا نے ان تمام اثر ورسوخ رکھنے والے طاقتور اور صاحبِ حیثیت مشائخ ورؤساء کو۔ جو اُن کی دنیا میں دخل اندازی کر سکتے ہیں۔ اور انہیں اپنے اعزہ و اُقرباء کے ساتھ بلکہ ہر ایک کے ساتھ میل جول رکھنے کی اجازت بھی دے دی۔ جبکہ مجھے بالکل علیحدہ رکھا اور ایک بستی میں بھیج دیا اور ایک دو کے علاوہ میرے تمام اُقرباء واُصدقاء کو مجھ سے ملنے اور میری ملاقات کے لیے آنے سے منع کر دیا۔

پس میرے خالقِ رحیم نے اس خلوت کو میرے حق میں ایک عظیم الشان رحمت میں تبدیل کر دیا اور میرے ذہن کو غیر اہم چیزوں سے بالکل صاف شفاف کر دیا اور اس چیز کو قرآن کریم کے فیض کو قبول کرنے کے لیے ایک وسیلہ بنا دیا۔

پھر شروع شروع میں مَیں نے اگر دو سال کے عرصے میں بھی ایک دو معمول کے رسالے لکھے ہیں تو اہلِ دنیا نے اسے بہت زیادہ سمجھا، حتیٰ کہ آج کے دن تک بھی ان لوگوں کا یہی رویہّ ہے کہ ہر دس بیس دنوں میں یا ایک مہینے میں مجھے ملنے کے لیے ایک دو مہمان بھی آ جائیں تو یہ اچھا نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ میل ملاقات صرف آخرت کی غرض سے ہوتا ہے! یوں ان لوگوں نے اس پہلو سے بھی مجھ پر ظلم کیا، لیکن میرے ربّ رحیم اور خالقِ حکیم نے اس ظلم کو میرے حق میں رحمت میں تبدیل کر دیا، اور وہ اس طرح کہ اس نے میری اِس اقامت کو ان تین مہینوں میں مرغوب ومحبوب خلوت اور مقبول عزلت کا رُوپ دے دیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی كُلِّ حَالٍ۔

پس میرے حال احوال اور راحت وآرام تو کچھ اسی طرح کے ہی ہیں۔

تمہارا دوسرا سوال: آپ حکومت کو رہائی کا پروانہ حاصل کرنے کے لیے درخواست کیوں نہیں دیتے؟

الجواب: میں اس مسئلے میں حکومت کا اور اہلِ دنیا کا نہیں بلکہ تقدیر کا پابند ہوں۔ اس لیے میں تقدیر کی طرف رجوع کروں گا۔ پس جب تقدیر مجھے اجازت دے گی اور میرا رزق یہاں سے ختم ہو جائے گا، میں چلا جاؤں گا۔

اس معنی کی حقیقت یہ ہے کہ:

ہر مصیبت میں دو سبب پائے جاتے ہیں:

ظاہری سبب۔ حقیقی سبب

اہلِ دنیا ظاہری سبب بنے اور مجھے یہاں لایا گیا۔ لیکن تقدیرِ الٰہی حقیقی سبب ہے، پس تقدیرِ الٰہی نے میرے بارے میں اس عزلت نشینی کا فیصلہ کیا۔ ظاہری سبب نے ظلم کیا ہے اور حقیقی سبب نے عدل۔

ظاہری سبب نے کچھ اس طرح سوچا کہ: یہ آدمی علم اور دین کی بہت زیادہ خدمت کرتا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ ہماری دنیا کو نقصان پہنچائے۔ پس اس احتمال کے پیشِ نظر اُنہوں نے مجھے جلاوطن کر دیا اور تین پہلوؤں سے مجھے دُگنا ظلم کا نشانہ بنایا۔

رہی تقدیرِ الٰہی، تو اُس نے دیکھا کہ میں علم اور دین کی کماحقّٗہ اور پورے اخلاص کے ساتھ خدمت نہیں کر رہا ہوں، اِس لیے اُس نے میرے بارے اس جلاوطنی کا فیصلہ صادر کر دیا، اور ان کے اس دُگنے ظلم کو دُگنی رحمت میں تبدیل کر دیا۔ پس جب میرے بارے میں فیصلہ تقدیر نے کیا ہے، اور وہ عادل ہے؛ تو میں اُسی کی طرف رجوع کروں گا۔ رہا ظاہری سبب، تو وہ کچھ وسائل وذرائع کا مالک ضرور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ دنیا کی طرف رجوع کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے؛ کیونکہ اگر ان کے ہاتھ میں کوئی حق ہوتا یا وہ کچھ قوی اسباب کے مالک ہوتے تو ان کی طرف رجوع کیا جا سکتا تھا پس میں نے اُن کی اس تباہ شدنی _ دنیا کو مکمل طور پر تیاگ دیا ہے۔ اور میں ان کی اس _ برباد شدنی _ سیاست کو کلی طور پر چھوڑ چکا ہوں۔ بنابریں، جن وسائل واوہام کا انہیں وہم ہے ان کی قطعاً کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اس لیے میں اُن کی طرف رجوع کر کے ان اوہام کو کوئی حقیقت نہیں دینا چاہتا۔ اور اگر میرے دل میں دنیا کی سیاست میں دخل اندازی کرنے کی کوئی تھوڑی سی خواہش بھی ہوتی جس کی باگ ڈور کے سرے غیروں کے ہاتھوں میں ہیں، تو آٹھ سال اور آٹھ گھنٹے بھی پیچھے نہ رہتا اور میدان میں آکر اپنے آپ کو نامزد کر لیتا، جبکہ آٹھ سال سے میں نے ایک بھی اخبار کو پڑھنے کی خواہش تک نہیں کی اور پڑھا بھی نہیں، اور پچھلے چار سال سے تو میں بڑی کڑی نگرانی میں ہوں اور میری طرف سے ایسی کسی حرکت کا اظہار تک بھی نہیں ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ قرآن کی خدمت بذاتِ خود تمام سیاسیات سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے یہ خدمت مجھے دنیا کی اس سیاست میں دخل اندازی کا موقع ہی نہیں دیتی جو کہ اکثر وبیشتر جھوٹ کا پلندہ ہے!

اور حکومت سے مراجعت نہ کرنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ حق کو باطل سمجھنے والوں کے سامنے حق کا دعویٰ کرنا باطل ہی کی ایک قسم ہے، اس لیے میں اس طرح کے باطل کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا۔

آپ کا تیسرا سوال: آپ دنیا کی سیاست سے اس حد تک بے پروائی کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں؟ اور صفحاتِ عالم پر گزرنے والے واقعات وحوادث کے سامنے اپنے طور اطوار قطعاً تبدیل نہیں کرتے ہیں؟ آپ دنیاوی سیاست کے ان صفحات کو اچھا سمجھتے ہیں اس لیے خاموش رہتے ہیں، یا پھر ڈر کر خاموش رہتے ہیں؟

الجواب: قرآن کی خدمت نے مجھے عالمِ سیاست سے اس شدّت کے ساتھ منع کر رکھا ہے کہ مجھے اس کا تصوّر تک بھلا دیا ہے۔ وگرنہ میری گزشتہ زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ میں جس مسلک کو حق سمجھتا ہوں اس پر چلنے سے نہ تو خوف نے میرا ہاتھ پکڑ کر کبھی روکا ہے اور نہ کبھی روک سکے گا!

پھر یہ بھی ہے کہ میں خوف کھاؤں کس سے؟ کیونکہ ''اَجل'' کے علاوہ میرا اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ میرے اہل وعیال نہیں ہیں کہ جن کی مجھے فکر دامن گیر ہو۔ میرے پاس مال نہیں کہ جس کا تصوّر مجھے پریشان کرے۔ نہ کوئی خاندانی عزّ وشرف ہے جو میری نگاہ میں رہے۔ اور اللہ کی رحمت ہو اس پر جو دنیاوی شان وشرف یعنی ریا کارانہ جھوٹی شہرت کو توڑنے کے لیے میری مدد کرے، نہ کہ اس کی حفاظت کرنے کے لیے۔

رہ گئی میری اجل، تو وہ خالق الجلیل کے ہاتھ میں ہے، اور اُسے اس کا وقت آنے سے پہلے ہاتھ کون لگا سکتا ہے؟ لیکن یہ بات یاد رہے کہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو عزّت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں:

قدیم سعید کی طرح ایک شاعر کہتا ہے:

وَنَحْنُ أُنَاسٌ لَا تَوَسُّطَ بَيْنَنَا

لَنَا الصَّدْرُ دُونَ الْعَالَمِينَ أَوِ الْقَبْرُ (حاشیہ:۱)

اصل بات یہ ہے کہ قرآن کی خدمت مجھے سیاسی سماجی زندگی کے بارے میں سوچنے ہی نہیں دیتی؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی ایک سفر کا نام ہے۔ اور میں قرآن کی روشنی میں دیکھ چکا ہوں کہ نوعِ انسانی جس راستے میں محوِ سفر ہے وہ راستہ کیچڑ میں دھنس چکا ہے اور انسانی قافلہ اس بدبودار کیچڑ میں لت پت گرتا پڑتا اور سنبھلتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اُن میں سے بعض محفوظ راستے میں چل رہے ہیں، اور بعض ایسے ہیں کہ اُنہیں اس کیچڑ سے بچ نکلنے کا بقدرِ امکان راستہ مل گیا ہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ اس گندے اور بدبودار کیچڑ میں اندھیرے میں چل رہے ہیں۔ چنانچہ اُن سو میں سے بیس لوگ مدہوشی کی وجہ سے اس گندے گارے کو مشک وعنبر سمجھ کر اپنے چہروں اور آنکھوں پر ملتے جا رہے ہیں، چنانچہ وہ اس میں گرتے ہیں اور اُٹھ کر پھر چلتے ہیں، حتیٰ کہ اس میں غرق ہو جاتے ہیں۔

رہے باقی اسّی فیصد، تو وہ اس کیچڑ کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ نجس اور متعفّن ہے۔ لیکن وہ حیران ہیں، سیدھا راستہ نہیں پا سکتے۔ اب ان کے سامنے دو راستے ہیں:

پہلا راستہ: ان مدہوشوں کو ڈنڈے مار مار کر ہوش میں لانا۔

دُوسرا راستہ: ان حیرت زدگان کو نور کا اظہار کر کے سلامتی کا راستہ دکھانا۔

اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اسّی آدمیوں نے بیس آدمیوں کے مقابلے میں ہاتھوں میں ڈنڈے پکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اِن اسّی عدد حیرت کے مارے مسکینوں کے لیے نور کا حقیقی طور پر ظہور نہیں ہوتا ہے، اور اگر ہو بھی جائے تو خطرے سے خالی نہیں؛ کیونکہ ان لوگوں نے ہاتھوں میں نور اور ڈنڈا ایک ساتھ پکڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ حیرت زدہ انسان ڈر رہا ہے کہ کہیں یہ لوگ مجھے نور کے ذریعے اپنی طرف کھینچ کر ڈنڈے تو نہیں ماریں گے؟ پھر یہ بھی ہے کہ ڈنڈا بسا اوقات کسی وجہ

(حاشیہ) یہ شعر ابو فراس حمدانی کا ہے۔ مترجم۔

سے ٹوٹ بھی جاتا ہے، اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر تو نور بھی اُڑ جائے گا یا بجھ جائے گا!

اب یہ سمجھو کہ وہ کیچڑ نوعِ انسانی کی بیوقوف غافل اور گمراہ معاشرتی زندگی ہے۔ اور وہ بدمست و مدہوش اس گمراہی سے لذت گیر ہونے والے سرکش لوگ ہیں۔ اور حیرت زدگان وہ لوگ ہیں جو گمراہی کو ناپسند تو کرتے ہیں لیکن اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اور اس سے نجات چاہتے ہیں لیکن راستہ نہیں پا رہے ہیں۔ اور رہے وہ ڈنڈے تو وہ سیاسی دھارے ہیں۔ باقی رہے وہ انوار، تو وہ قرآنی حقائق ہیں۔

پس نور کے ساتھ نہ تو لڑائی جھگڑا ہو سکتا ہے، نہ اس کے ساتھ دشمنی ہو سکتی ہے۔ اُسے صرف شیطان مردود ہی ناپسند کرتا ہے۔ اِسی بنا پر میں نے قرآن کے نور کی پاسبانی کرنے کے لیے یہ کہتے ہوئے سیاست کی لاٹھی ہاتھ سے جھٹک دی ہے کہ: "أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ وَالسِّيَاسَةِ"

چنانچہ میں نے اس نور کو اپنی دونوں بانہوں میں لے کر اپنی چھاتی کے ساتھ لگا لیا۔

اور میں نے یہ دیکھ لیا کہ سیاست کے ان دھاروں میں موافقوں اور مخالفوں میں ان انوار کے عاشق موجود ہیں۔

پس یہ قرآنی دروس و انوار جو کہ ان سیاسی دھاروں اور گروہ بندیوں سے کہیں زیادہ بلند درجہ رکھتے ہیں، اور جن کا اعلان و اظہار ایک پاکیزہ صاف ستھری اور ان لوگوں کے افکار و اغراض سے یکسر پاک جگہ سے کیا جا رہا ہے، ان کے کسی پہلو پر صرف وہی لوگ تہمت لگا سکتے ہیں اور ان سے صرف وہی لوگ کنارہ کش رہ سکتے ہیں جو حیوان خصلت ہیں لیکن انسانوں کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں، اور شیطان ہیں لیکن انسانوں کا روپ دھارے ہوئے ہیں اور الحاد و زندیقیت کو سیاست سمجھ کر اس کے دامن کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے سیاست سے دور ہو کر سیاسی پروپیگنڈے کی تہمتوں کے تحت قرآن کے ہیروں جیسے حقائق کی قیمت گرا کر کانچ کے ٹکڑوں کی قیمت کے برابر نہیں کی ہے، بلکہ ان ہیروں کی قیمت ہر گروہ کی نظر میں لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ان کی تابناکیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِىَ لَوْ لَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

چودھواں مکتوب

(تالیف نہیں کیا گیا)

پندرھواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

میرے عزیز بھائی! آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نظرِ ولایت کے ساتھ مفسدین کو آشکار کیوں نہیں کر سکے؟ جس کے نتیجے میں تین خلفائے راشدین کی شہادت ہوئی؛ حالانکہ کہا یہ جاتا ہے کہ: چھوٹے صحابہ کرام کبار اَولیاء سے کہیں زیادہ بڑے ہیں؟

الجواب: اس میں دو مقام ہیں:

پہلا مقام

یہ سوال ولایت کے ایک گہرے راز کی وضاحت کے ساتھ حل ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ:

صحابہ کی ولایت وہ ولایت ہے جو نبوّت کی وراثت سے وارد ہوتی ہے جس کا نام ''ولایتِ کبریٰ'' ہے۔ اس کا گزر طریقت کی برزخ سے نہیں ہوتا، اور یہ ظاہر سے گزر کر براہِ راست حقیقت تک پہنچ جاتی ہے اور اقربیّتِ الٰہیہ کے انکشاف کا نظارہ کرتی ہے۔ اس ولایت کا راستہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت عالی شان ہے اور اس کے خارقِ عادت معاملات بہت کم ہیں لیکن امتیازی خصوصیات بہت زیادہ ہیں۔ اس میں کشف و کرامات کا مشاہدہ بہت کم ہوتا ہے۔ اور اولیاء کرام کی اکثر کرامتیں اختیاری نہیں ہوتی ہیں، چنانچہ کبھی کبھی جب انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِکرام ملتا ہے، ان کے ہاتھوں کسی خارقِ عادت چیز کا ظہور اس طرح سے ہو جاتا ہے کہ ان کے گمان میں بھی نہیں ہوتا! اس قسم کے اکثر کشف و کرامات کا ظہور سیر و سلوک کے دوران اس وقت ہوتا ہے جب وہ طریقت کی برزخ سے گزرتے ہیں اور کسی حد تک معمول کی بشریت سے عاری ہو جاتے ہیں اور یوں وہ معمول کے مخالف حالات کا مظہر بن جاتے ہیں۔

لیکن صحابہ کرام حقیقت تک پہنچنے کے لیے صحبتِ نبوّت کے انعکاس و انجذاب اور اُس کی اکسیر کی برکت سے طریقت میں سیر و سلوک کے ذریعے دائرۂ عظیمہ کو طے کرنے کے لیے مجبور نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ ایک ہی قدم میں اور ایک ہی صحبت میں ظاہر سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس طرح گزشتہ لیلۃ القدر تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں:

پہلا راستہ: یہ ہے کہ سالک ایک سال تک چلتا اور طواف کرتا رہے تا آنکہ اس رات تک پہنچ جائے۔ لیکن اِس

قُربیت کو حاصل کرنے کے لیے ایک سال کی مسافت طے کرنا ہو گی۔ اہلِ سلوک کا یہی مسلک ہے، چنانچہ اکثر اہلِ طریقت اسی راستے سے چلتے ہیں۔

دُوسرا راستہ: یہ ہے کہ سالک ''زمان'' میں قیداس مادی جسم کے غلاف سے مجرّد ہو جائے اور اس طرح روحانی طور پر بلند ہو جائے اور آنے والی شبِ عید کے ساتھ گزشتہ شبِ قدر بھی آج کے دن کی طرح اپنے سامنے حاضر دیکھ لے؛ کیونکہ روح ''زمان'' میں مقیّد نہیں ہے پس جب انسانی حسّیات روح کے درجے تک ترقی کر جاتی ہیں تو وہ ''زمانِ حاضر'' وسیع ہو جاتا ہے اور ماضی اور مستقبل کے زمانے دوسرے لوگوں کے لیے ایسے ہی ہو جائیں گے جیسے اُس کے لیے زمانِ حاضر۔ پس اس تمثیل کی روشنی میں گزشتہ شبِ قدر تک پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ سالک روح کے مرتبے تک ترقی کر جائے اور ماضی کو حاضر کے درجے میں دیکھے۔ اس گہرے راز کی بنیاد ''اقربیتِ الٰہیہ'' کا انکشاف ہے۔ مثال کے طور پر:

سورج ہم سے قریب ہے؛ کیونکہ اس کی روشنی، حرارت اور اس کی مثالی صورت ہمارے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آئینے میں ہے لیکن ہم اُس سے بہت دور ہیں۔ اب اگر ہم اس کی اقربیت کا احساس نورانیت کی جہت سے کریں اور اس کی اپنے آئینے میں پڑنے والی مثالی صورت کے ساتھ اپنے تعلق کا ادراک کر لیں اور اس واسطے کے ساتھ اس کی پہچان کر لیں اور اس کی روشنی، حرارت اور ہیئت کا علم حاصل کر لیں؛ تو ہمارے لیے اس کی اقربیت کا انکشاف ہو جائے گا اور ہم سورج کی پہچان کر جائیں گے اور ہمارے ساتھ قربت کی وجہ سے اس کے ساتھ ہمارا تعلق رہے گا۔

لیکن اگر ہم اپنی دوری کی حیثیت سے اس کا تقرب اور اس کی پہچان چاہیں تو پھر ہم بہت زیادہ فکری سیر اور عقلی سلوک کے لیے مجبور ہوں گے، اور وہ اس طرح کہ ہم سائنسی قوانین کے ذریعے فکری طور پر آسمانوں پر چڑھ جائیں اور سورج کا تصوّر کریں اور پھر ان لمبی چوڑی سائنسی تحقیقات وتدقیقات کی مدد سے اُس کی ماہیت میں پائی جانے والی روشنی اور حرارت اور اس روشنی میں پائے جانے والے سات رنگوں کو سمجھ جائیں۔ اتنی مشقت کریں گے تو پھر کہیں جا کر ہم وہ معنوی قربت حاصل کر سکیں گے جبکہ پہلا شخص اپنے آئینے میں تھوڑا سا غور فکر کرنے کے بعد اُسے حاصل کر لیتا ہے۔

پس نبوت اور اس کی وراثت میں پائی جانے والی ولایت دونوں کی نظر اس تمثیل کی طرح ''اقربیت'' کے راز کے انکشاف پر ہے۔ رہیں باقی ولایتیں، تو ان میں سے اکثر ''قُربیت'' کی بنیاد پر چلتی ہیں، اس لیے سالک بہت سے مراتب میں سیر وسلوک کے لیے مجبور ہوتا ہے۔

دوسرا مقام

کہا گیا ہے کہ: ان حادثات کا سبب اور اس فتنہ وفساد کا موجب صرف مٹھی بھر یہودی ہی نہیں ہیں کہ انہیں بے نقاب کر کے اس فساد کے آگے بند باندھا جا سکے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں بہت سی مختلف اقوام کے داخل ہو جانے کی

وجہ سے بہت سے متخالف، متباین اور متضاد افکار کے دھارے ایک دوسرے میں مخلوط ہو گئے ہیں، اور خاص کر ان میں سے بعض تو وہ تھے جو اپنی طبیعت اور خصلت کی وجہ سے انتقام لینے کے لیے فرصت کی گھات میں تھے، کیونکہ حضرت عمرؓ کی ضربوں سے ان کا قومی فخر وغرور بُری طرح مجروح ہو چکا تھا؛ کیونکہ ان کا قدیم دین باطل کر دیا گیا تھا اور ان کی وہ قدیم حکومتیں اور سلطنتیں تباہ کر دی گئی تھیں جو ان کے شرف وافتخار کا دارومدار تھیں۔ اس لیے ان لوگوں نے اپنے ان احساسات کے تحت شعوری اور لاشعوری طور پر اسلامی خلافت سے انتقام لینے کے جذبات پال رکھے تھے۔ چنانچہ اس اجتماعی صورت حال سے بعض یہودیوں جیسے ذہین سازشیوں نے فائدہ اُٹھایا۔

اس سے پتا چلا کہ ان فتنوں کے سامنے بندھ باندھنا اُن بھانت بھانت کے افکار کی اور اس وقت کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کر کے ہی ممکن تھا، صرف چند فسادیوں کو بے نقاب کر کے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ: سیدنا عمرؓ نے اپنے ساریہؓ نامی قائد کو منبر سے آواز دی تھی کہ: یَاسَارِیَۃُ اَلْجَبَلَ اَلْجَبَلَ ساریہ! پہاڑ کی اوٹ میں ہو جاؤ۔ اور یہ آواز انہیں سنا بھی دی تھی۔ اور وہ اس وقت ایک مہینے کی مسافت پر تھے۔ (حاشیہ:۱) اور یہ ماہرانہ لشکر کشی ان کی فتح کا سبب بن گئی تھی۔ پس ان کی یہ کرامت والی آواز اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ بڑے صاحب بصیرت اور بڑی تیز نگاہ کے مالک تھے۔ لیکن وہ اپنی اس تیز نظرِ ولایت کے ذریعے اپنے قریب کھڑے قاتل فیروز کو کیوں نہ دیکھ سکے؟

الجواب: ہم اس کا جواب انہی الفاظ کے ساتھ دیتے ہیں جن کے ساتھ یعقوبؑ نے دیا تھا اور وہ اس طرح کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ: آپ نے یوسفؑ کی مصر سے روانہ ہونے والی قمیص کی خوشبو تو سونگھ لی، لیکن خود اپنے قریب ہی کنعان کے کنویں میں پڑے ہوئے یوسف کو نہ دیکھ سکے؟ تو انہوں نے جواب دیا:

ہمارے احوال برق کی طرح ہیں، وہ کبھی نظر آتی ہے کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم کبھی تو ایسے ہوتے ہیں کہ گویا ہم کسی بلند مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ہر طرف دیکھ رہے ہیں؛ اور کبھی اپنے پاؤں کی ایڑیاں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ (حاشیہ:۲)

(حاشیہ:۱) یَاسَارِیَۃَ اَلْجَبَلَ اَلْجَبَلَ۔ حدیث صحیح ہے: اسے امام احمد نے فضائل الصحابہ میں امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں، ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ: 131/7 میں حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: الاصابۃ: 3/2، المقاصد الحسنۃ حدیث نمبر: 1331 اور سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ حدیث نمبر: 1110۔ مترجم۔

(حاشیہ:۲) شیخ سعدی نے یہ جواب اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی چرا در چاہ کنعانش ندیدی

بگفت: احوالِ ما برقِ جہان است دمی پیدا و دیگر دم نہان است

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم (گلستان سعدی) مترجم

الجواب: انسان کتنا بھی فاعل ومختار کیوں نہ ہو، اصل چیز فرمانِ گرامی ﴿وَمَا تَشَاءُ وْنَ اِلَّآاَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ کی رُو سے مشیّتِ الٰہیہ ہی ہے۔ اور حکم تقدیر کا ہی چلتا ہے چنانچہ مشیّتِ الٰہیہ مشیّتِ انسانیہ کو پیچھے ہٹا دیتی ہے اور "اِذَا جَاءَ الْقَدَرُ عَمِیَ الْبَصَرُ" کا حکم جاری کر دیتی ہے۔ اور جب تقدیر بولتی ہے تب انسانی طاقت خاموش ہو جاتی ہے اور جُزوی اختیار بے زبان ہو جاتا ہے۔

تمہارے دوسرے سوال کا مفہوم یہ ہے کہ ان واقعات کی اصل حقیقت کیا ہے جو سیّدنا علیؓ کے عہد میں شروع ہوئے؟ اور ان جنگوں میں لڑنے والوں کو، قتل کرنے والوں کو اور قتل ہو جانے والوں کو کس نام سے یاد کریں گے؟

الجواب: جمل کے نام سے برپا ہونے والی جنگ کہ جس میں ایک طرف حضرت علیؓ اور ان کے ہمنوا تھے اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ اور ان کے ہمنوا تھے، یہ جنگ خالص عدالت اور اضافی یا نسبتی عدالت کی جنگ تھی۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ:

حضرت علیؓ نے خالص عدالت کو بنیاد بنایا اور اس بنیاد پر چلنے کی بھرپور کوشش کی جیسے کہ شیخین کے زمانے میں ہوا تھا۔ لیکن آپ کے مقابلے میں آنے والے لوگ یہ کہتے تھے کہ شیخین کے عہد میں پائی جانے والی دلوں کی صفائی ستھرائی خالص عدالت کے لیے مددگار تھی۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ جب کمزور اسلام والی مختلف قومیں معاشرتی زندگی میں داخل ہو گئیں تو خالص عدالت کو بروئے کار لانا مشکل ہو گیا، اس بنا پر اُنہوں نے نسبتی عدالت کو لاگو کرنے کی کوشش کی جسے دوسرے لفظوں میں "اَهْوَنُ الشَّرِّ" یعنی "کمتر برائی کو اختیار کرنا" کہا جاتا ہے۔ لیکن اجتہاد کی یہ کشمکش جب سیاست میں گھس آئی تو اس سے فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔

اب ہر دو فریق نے چونکہ یہ اجتہاد اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اسلام کی مصلحت کے لیے کیا تھا، اور جنگ اس اجتہاد کے نتیجے میں ہوئی تھی، اس لیے ہم کہتے ہیں، قاتل ومقتول دونوں جنت میں ہیں اور دونوں کو ثواب ملے گا، وہ عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ اگرچہ علیؓ کا اجتہاد درست تھا اور ان کے مخالفین کا غلط؛ کیونکہ مجتہد اپنے اجتہاد میں اگر صحیح فیصلے پر پہنچ جائے تو اُسے دو اجر ملیں گے اور اگر صحیح فیصلہ نہ کر پائے تو ایک ثواب پائے گا، اور وہ ہے اجتہاد کا اجر جو کہ عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔ اور اس کی غلطی میں اُسے معذور سمجھا جائے گا۔

ایک مشہور محقق نے ــ کہ جس کا قول ہمارے نزدیک حجت مانا جاتا ہے ــ کردی زبان میں شعر کی صورت میں کہا ہے:

ژی شَرِّ صَحَابَانْ مَکَہ قَالْ وَقِیلْ

لَوْرَا جَنَّتِیْنَہْ قَاتِلْ وَهُمْ قَتِیلْ

یعنی صحابہ کرام کی آپس کی لڑائیوں کے بارے میں بحث نہ کرو؛ کیونکہ قاتل اور مقتول دونوں جنتی ہیں۔

خالص عدالت اور اضافی عدالت کے درمیان فرق ہے، اور وہ یہ کہ:

آیت کریمہ: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ کے اشاری معنی سے یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ کسی معصوم اور بے گناہ آدمی کا حق تمام لوگوں کی خاطر باطل نہیں کیا جائے گا۔ اور فردِ واحد کو عام لوگوں کی سلامتی کے لیے قربانی کا بکرا نہیں بنایا جائے گا۔ اور یہ کہ حق اللہ تعالیٰ کی نظرِ رحمت میں حق ہے، اس کے بارے میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ وہ چھوٹا ہے کہ بڑا؛ اور چھوٹے حق کو بڑے حق کی خاطر قربان نہیں جائے گا۔ اور فردِ واحد کی زندگی اور اس کے حق کو اس کی رضامندی کے بغیر جماعت کی سلامتی پر نثار نہیں کیا جائے گا، ہاں! اگر یہ جاں نثاری کا مسئلہ غیرت وحمیت کے نام پر اس کی رضامندی کے تحت ہو تو یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہوگا۔

رہی اضافی عدالت، تو یہ ''کل'' کی سلامتی کے لیے ''جزء'' کو قربان کر دیتی ہے، اور جماعت کی وجہ سے فردِ واحد کے حق کی طرف نہیں دیکھتی۔ چنانچہ انسان اضافی عدالت کو جاری کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مقابلتاً چھوٹی برائی ہے۔ لیکن جب خالص عدالت قائم کرنا ممکن ہو تو پھر اضافی عدالت کو نہیں اپنایا جائے گا۔ اور اگر کسی نے ایسا کر لیا تو وہ ظالم ہوگا۔

پس حضرت علیؓ نے فیصلہ کیا کہ خالص عدالت کو اُسی بنیاد پر قائم کر دینا ممکن ہے جیسے کہ اسلامی خلافت میں شیخین کے زمانے میں تھی۔ لیکن ان کے مقابلے میں آنے والے مخالفین نے یہ دعویٰ کیا کہ اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا اور اس راہ میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ اس لیے اُنہوں نے اضافی عدالت پر عمل درآمد کی کوشش کی۔

رہے تاریخی اسباب، تو وہ اسباب نہیں بلکہ کمزور دلائل و وسائل تھے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ: حضرت علیؓ اپنی بلند پایہ لیاقت، غیر معمولی ذہانت اور خارقِ عادت اقتدار کے باوجود خلافت اسلامیہ کے ضمن میں اپنے پیشرووں کی طرح توفیق سے کیوں نہ نوازے گئے اور کامیاب کیوں نہ ہو سکے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: وہ بابرکت شخص سیاست وسلطنت سے بڑھ کر دیگر کئی اہم ترین کاموں کے زیادہ لائق تھے۔ اس لیے اگر انہیں سیاست وسلطنت کے میدان میں مکمل توفیق سے نواز دیا جاتا تو وہ ''سلطانُ الولایت'' کے بلند پایہ عنوان کے مرتبے پر حقیقی طور پر فائز نہ ہو سکتے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ آپ ایک ایسی معنوی سلطنت کے مرتبے پر فائز ہو گئے ہیں جو اس ظاہری سیاسی خلافت سے کہیں زیادہ بلند ہے، اور ''اُستاذ الکُل'' کا مقام حاصل کر گئے۔ حتیٰ کہ آپ کی معنوی سلطنت قیامت کے دن تک باقی رہ گئی۔

رہا حضرت علیؓ کا واقعۂ صفین میں حضرت معاویہؓ کے پیروکاروں کے ساتھ جنگ کرنا، تو وہ خلافت وسلطنت کی جنگ تھی۔

مطلب یہ کہ حضرت علیؓ نے آخرت اور احکامِ دین اور حقائقِ اسلام کو بنیاد بنایا، چنانچہ وہ اس راہ میں سلطنت کے بعض قوانین اور ظالم سیاست کے تقاضوں کو قربان کر دیتے تھے۔ اور حضرت معاویہؓ اور ان کے پیروکاروں نے اسلام کی معاشرتی زندگی کو حکومت و سلطنت کے ذریعے مضبوط بنانے کے لیے ''عزیمت'' کو چھوڑ کر ''رخصت'' کا دامن پکڑ لیا تھا اور یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ عالمِ سیاست میں یہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ''رخصت'' کو ترجیح دی اور یوں غلطی کر گئے۔

رہا ''حسن'' و ''حسین'' کا امویوں کے خلاف جنگ و جدل، تو وہ دین اور قومیت کی جنگ تھی۔ اور وہ اس طرح کہ: اُموی اسلامی سلطنت کی بنیاد عربی قومیت پر استوار کر رہے تھے اور یوں اسلامی رابطے کو پیچھے ہٹا کر قومی رابطے کو آگے کرتے جا رہے تھے۔ اس بنا پر اُنھوں نے دو پہلوؤں سے نقصان پہنچایا:

ایک یہ کہ اُنھوں نے دیگر اقوام کو تکلیف دی، ان کے احساسات کو مجروح کیا اور اُن کے دلوں میں عربوں کے خلاف نفرت و کراہت بھر دی۔

دیگر یہ کہ نسل و قومیت کی بنیادیں عدل و حق کا خیال نہیں رکھتی ہیں اور عدل کی راہ پر نہیں چلتی ہیں؛ کیونکہ قوم پرست حکمران اپنے ابنائے جنس کو ترجیح دے گا، اور یوں عدل نہیں کر سکے گا، لیکن " اَلْاِسْلَامِيَّةُ جَبَّتِ الْعَصَبِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةَ، لَا فَرْقَ بَيْنَ عَبْدٍ حَبَشِيٍّ وَ سَيِّدٍ قُرَيْشِيٍّ اِذَا أَسْلَمَا" کے قطعی حکم کے مطابق قومی رابطے کو دینی رابطے کے قائم مقام نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ اور اگر اسے اس کے قائم مقام بنا دیا جائے تو وہ عدل سے کام نہیں لے سکے گا، اور یوں حق ضائع ہو جائے گا۔

تو سیدنا حسینؓ نے دینی رابطے کو بنیاد بنایا اور حق پر قائم رہ کر اُن کے خلاف جنگ کی، تا آنکہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: اس حد تک حق و حقیقت پر ہونے کے باوجود سیدنا حسینؓ کامیاب کیوں نہ ہو سکے اور تقدیرِ الٰہی اور رحمتِ الٰہی نے انھیں اس دردناک انجام سے دوچار کیوں کیا؟

تو جواب یہ ہے کہ: نہ صرف آپ کے خواص مقربین میں بلکہ اُن تمام اقوام میں جو آپ کی جماعت کے ساتھ مل گئی تھیں، ان میں اپنی مجروح ہو جانے والی عصبیت کی وجہ سے عربوں کے خلاف انتقام کے جذبے نے حضرت حسینؓ اور ان کے پیروکاروں کے خالص تابناک مسلک میں دراڑیں ڈال دیں اور یہ چیز ان کی شکست کا سبب بن گئی۔

رہی تقدیرِ الٰہی کی رُو سے اس دردناک انجام میں پائی جانے والی حکمت، تو وہ یہ ہے کہ:

حضرت حسنؓ و حسینؓ، ان کا خاندان اور ان کی آل اولاد معنوی سلطنت کے لیے نامزد تھے، اور دنیاوی سلطنت اور معنوی سلطنت کا ایک ساتھ ہونا بہت زیادہ مشکل ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا سے ناراض کر دیا اور انھیں دنیا کا

بدصورت چہرا دکھا دیا تا کہ ان کا اس دنیا کے ساتھ کوئی قلبی تعلق باقی نہ رہ جائے۔ چنانچہ ان کے ہاتھ اس ظاہری صورت کی وقتی اور زوال پذیر سلطنت سے تو خالی ہو گئے، لیکن انہیں معنوی، دائمی اور روشن ترین سلطنت کے لیے نامزد کر دیا گیا، اور یوں وہ حکمرانوں کی بجائے اُقطابُ الأولیاء کا مرجع وماویٰ بن گئے۔

تمہارا تیسرا سوال: وہ ظالم اور دردناک معاملہ جس سے یہ پاکیزہ اور بابرکت سادات کرام دوچار ہوئے اس میں کیا حکمت تھی؟

الجواب: جیسے کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے، حضرت حسینؓ کے مخالف اُمویوں کی سلطنت میں تین بنیادیں تھیں جن کی ظالمانہ غداری کے ساتھ پیروی کی جاتی تھی۔

پہلی بنیاد: ظالم سیاست کا دستور ہے کہ حکومت کو بچانے کے لیے اور امن قائم رکھنے کے لیے افراد کی قربانی دے دی جاتی ہے۔

دوسری بنیاد: ان کی سلطنت نسل پرستی اور قومیت پر تکیہ کناں تھی۔ اور قومیت کے غدّار دستوروں میں سے ایک دستور یہ ہے کہ: قوم کی سلامتی کی خاطر ہر چیز قربان کی جاسکتی ہے۔

تیسری بنیاد: اُمویوں کی طبیعت میں ہاشمیوں کے خلاف جو عصبیت پائی جاتی تھی وہ یزید جیسے بعض لوگوں میں اُبھر کر سامنے آگئی تھی، اسی وجہ سے اس نے ایسی دشمنی اور ایسی غداری کا اظہار کیا جس میں شفقت کا وجود نہیں تھا۔ اور

چوتھا سبب: حضرت حسینؓ کے پیروکاروں میں پایا جاتا تھا، اور وہ یہ کہ آپ کے ساتھ جو لوگ آکر ملے تھے انتقام لینے کی غلط نیت سے ملے تھے، اور وہ اس طرح کہ اُمویوں نے عرب قومیت کو اپنی بنیاد بنایا تھا، چنانچہ وہ دوسری تمام اقوام کو ''ممالیک'' کہا کرتے تھے اور انہیں ایسے ہی دیکھتے تھے کہ جیسے وہ ان کے غلام ہوں۔ اور اپنی قومی عصبیت کو بزرگ و برتر سمجھتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ حضرت حسینؓ کے ساتھ آملے۔ ان کے اس رویے سے اُمویوں کی قومی عصبیّت کی آگ مزید بھڑک اُٹھی اور یوں اُنہوں نے اس مشہور المناک واقعے کا ارتکاب کر لیا جس میں انتہائی درجے کا ظلم وتشدد اور آخری درجے کی وحشت و بربریت تھی۔

یہ مذکورہ چار اسباب ظاہری تھے۔ لیکن جب ان اسباب کی طرف تقدیر کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حضرت حسینؓ اور ان کے عزیز واقارب کو اِس حادثۂ فاجعہ کی وجہ سے حاصل ہونے والے اُخروی نتائج، روحانی سلطنت اور معنوی ترقیات اتنی قیمتی ہیں کہ اس حادثے کی وجہ سے اُنہوں نے جو تکلیف اُٹھائی ہے وہ اُن کے مقابلے میں بالکل معمولی سی رہ جاتی ہے۔

مثال کے طور پر:

جو آدمی ایک گھنٹے کی تکلیف اُٹھا کر شہید ہو جاتا ہے وہ شہادت کے اتنے بلند مراتب و درجات حاصل کر لیتا ہے جنہیں دوسرا آدمی دس سال کی جہدِ مسلسل کے ذریعے بھی حاصل نہیں کرسکتا۔ چنانچہ درجۂ شہادت پر فائز ہو جانے کے بعد اس شہید سے اگر اس تکلیف کے بارے میں پوچھا جائے جو اُس نے اُٹھائی تھی تو وہ جواب دے گا کہ میں نے بالکل معمولی سی چیز کے مقابلے میں بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔

تمہارے چوتھے سوال کا مفہوم: آخری زمانے میں لوگوں کی مطلق اکثریت دینِ حق میں اس وقت داخل ہوگی جب عیسیٰ دجال کو قتل کر دیں گے: جبکہ بہت سی روایات میں آیا ہے کہ:

"لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ : اَللّٰهُ۔اَللّٰهُ" "یعنی جب تک "اللہ اللہ" کہا جاتا ہے قیامت نہیں آئے گی" (حاشیہ)؛ سوال یہ ہے کہ لوگ حلقۂ ایمان میں داخل ہو چکنے کے بعد پھر سے کافر کیسے بن گئے ہوں گے؟

الجواب: حدیث میں جو آیا ہے کہ عیسیٰ نازل ہو کر دجال کو قتل کر دیں گے اور اسلامی شریعت پر عمل کریں گے۔۔۔ کمزور ایمان والے لوگ اس چیز کو بعید از عقل سمجھتے ہیں اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، لیکن اگر اس روایت کی حقیقت کی وضاحت کر دی جائے تو استبعاد کی گنجائش نہیں رہے گی، اور وہ یوں ہے کہ:

اس حدیث کا اور مہدی اور سفیانی کے بارے میں وارد ہونے والی روایات کا مفہوم یہ ہے کہ:

آخری زمانے میں الحاد کے دو دھارے بہت زیادہ قوت پکڑ جائیں گے:

پہلا دھارا: ایک خوفناک قسم کا آدمی جس کا نام "سفیانی" ہوگا نفاق کے پردے میں نبوت و رسالت محمدی کا انکار کر دے گا اور منافقین کی قیادت سنبھال لے گا اور اسلامی شریعت کو برباد کرنے کی کوشش کرے گا۔۔۔ اور اس کے مقابلے میں آلِ بیت سے ایک اور آدمی اُٹھے گا جس کا نام محمد مہدی ہوگا وہ آلِ بیت کی نورانی نسل کے ساتھ وابستہ اہلِ ولایت و اہلِ کمال لوگوں کی قیادت کرے گا اور نفاق کے اس دھارے کو قتل کر دے گا اور اسے تباہ و برباد کر دے گا جس کی نمائندگی سفیانی کا معنوی شخص کر رہا ہوگا۔

دوسرا دھارا: وہ باغی سرکش اور بے لگام دھارا ہوگا جو مادی طبیعی فلسفے کی کوکھ سے جنم لے گا، یہ دھارا آخری زمانے میں مادی فلسفے کی وساطت سے پھیلتا اور زور پکڑتا جائے گا تا آنکہ اُلوہیت کے انکار تک پہنچ جائے گا اور دھارے میں بہتے چلے جانے والے منکرین خدا خود کو ایک طرح کی ربوبیت کا مالک بنا بیٹھیں گے جیسے کہ وہ کوئی چھوٹے موٹے نمرود ہوں! جیسے کہ بادشاہ کو نہ جاننے والا اور اس کے لشکروں اور افسروں کا اعتراف نہ کرنے والا، ہر سپاہی کو کسی نہ کسی طرح کی سلطنت اور حکمرانی کا مالک بنا دیتا ہے۔

رہا دجال، تو وہ ان کا بڑا قائد ہوگا، اور وہ کچھ اس طرح کے غیر معمولی کام سرانجام دے گا جو جادو اور ہپناٹزم کے ساتھ

(حاشیہ) رواہ مسلم، والترمذی، واحمد، والحاکم عن انس بن مالکؓ وھو حدیث صحیح۔ مترجم۔

مشابہت رکھتے ہوں گے۔ اور اس حد تک چلا جائے گا کہ اپنی جابرانہ حکومت کو بظاہر ایک قسم کی ربوبیت کا رنگ دے دے گا اور اپنی اُلوہیت کا اعلان کر دے گا۔

اور اس بات میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے، کسی اس طرح کے عاجز انسان کا اُلوہیت کا دعویٰ کرنا جو ایک مکھی بھی بلکہ مکھی کا ایک پر بھی پیدا نہ کر سکے، ایک آخری درجے کی مضحکہ خیز حماقت ہے۔

اور یوں اُس عرصے میں کہ جب یہ دھارا انتہائی شدید صورت میں نمایاں ہوگا، وہ دین حق ظاہر ہو جائے گا جو عیسیٰ لائیں گے اور جو سیدنا عیسیٰ کی معنوی شخصیت ہوگا، یعنی رحمتِ الٰہیہ کے آسمان سے نازل ہوگا۔ تب موجودہ عیسائیت اس حقیقت کے سامنے صاف شفاف ہو جائے گی اور خرافات وتحریفات سے پاک ہو کر اسلام کے حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گی۔

مطلب یہ کہ نصرانیت معنوی طور پر ایک طرح کے اسلام کا رُوپ دھار جائے گی۔ پس عیسائیت کا وہ معنوی شخص قرآن کریم کی اقتدا کرنے کی وجہ سے تابع ہوگا اور اسلام امامِ متبوع کے مقام پر ہوگا۔ اور دین حق اس التحاق کے نتیجے میں بڑی قوّت حاصل کر لے گا۔ یعنی عین وہ وقت کہ جب اسلام اور عیسائیت دونوں انفرادی طور پر علیحدہ علیحدہ دین ہوں گے اور الحاد کے اس دھارے کا راستہ روکنے کی طاقت نہیں رکھتے ہوں گے، اُن کے اتحاد اور ہم آہنگی کی برکت سے الحاد کے اس دھارے کو مکمل طور پر نیست ونابود کی استعداد میں آجائیں گے اور یہی وہ موقع ہوگا جب عیسیٰ جو کہ اپنے بشری جسم کے ساتھ عالمِ سماوات میں موجود ہیں۔ دینِ حق کے اس دھارے کی قیادت سنبھال لیں گے۔ اس بات کی خبر مُخبرِ صادق نے علیٰ کلِّ شیٔ قدیر ہستی کے وعدے پر بھروسا کرتے ہوئے دی ہے۔ اور آپ ﷺ چونکہ خبر دے چکے ہیں اس لیے بات بالکل حق اور شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اور پھر اس کا وعدہ چونکہ علیٰ کل شیٔ قدیر ہستی نے کیا ہے اس لیے وہ اس وعدے کو بہر کیف ضرور پورا کرے گا۔

جی ہاں؛ وہ ہستی جو آسمانوں سے زمین کی طرف پے در پے فرشتے بھیجتی ہے اور اُنہیں کبھی انسانوں کی صورت دیتی ہے، جیسے کہ جبریلؑ دِحیہ نامی صحابی کی شکل میں آیا کرتے تھے، اور جو ہستی عالمِ ارواح سے روحانیوں کو بھیجتی ہے اور انہیں انسانی صورت میں متمثّل ہونے کی طاقت دے دیتی ہے، حتیٰ کہ بہت سے فوت شدہ اولیاء کی روحوں کو ان کے مثالی جسموں کے ساتھ دنیا میں بھیجتی ہے۔۔۔ ایسی حکیم ذوالجلال ہستی کی حکمت سے بعید نہیں کہ وہ آسمان دنیا میں اپنے جسد عنصری کے ساتھ زندہ موجود حضرت عیسیٰ کو دنیا میں بھیج دے۔ بلکہ اگر وہ عالمِ آخرت کے آخری کونے میں جا چکے ہوں اور واقعتاً وفات پا چکے ہوں، تو وہ سبحانہ وتعالیٰ قادر ہے، اور اس کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کی روح کو نیا جسم پہنا دیں اور اس عظیم الشان نتیجے کو ظاہر کرنے کے لیے انہیں دنیا میں بھیج دیں، تاکہ یہ عظیم الشان نتیجہ ظہور میں آجائے اور تاکہ وہ عیسیٰ کے

لائے ہوئے دین کے لیے عظیم الشان اِنتہا اور مسکُ الختام ہونے کا ارادہ کرلیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جلیل القدر حکمت کے تقاضے کے پیشِ نظر اس چیز کا وعدہ کیا ہوا ہے، اور چونکہ اس نے وعدہ کیا ہے، اس لیے وہ انہیں حتمی طور پر ضرور بھیجے گا۔

پھر اس میں یہ لازم نہیں ہے کہ جب وہ دنیا میں نازل ہوں گے تو ہر آدمی انہیں پہچان جائے گا کہ یہ خود عیسیٰؑ ہی ہیں؛ بلکہ انہیں صرف ان کے خواص اور مقرب لوگ ہی نورِ ایمان کے ذریعے پہچان سکیں گے: کیونکہ لوگ انہیں بے ساختہ اور بدیہی طور پر نہیں پہچانتے ہوں گے!

سوال: روایات میں آیا ہے کہ دجال کے پاس ایک جھوٹی جنت ہوگی جس میں وہ اپنے پیروکاروں کو پھینکتا جائے گا۔ اور اس کے پاس جہنم بھی ہوگی جس میں وہ اپنے نافرمانوں کو پھینکے گا: حتی کہ وہ اپنے جانور کے ایک کان کو جنت کا اور دوسرے کو جہنم کا روپ دے دے گا۔ (حاشیہ) اور وہ ایک بہت زیادہ لمبائی چوڑائی اور دیگر اوصاف کا مالک جسم ہوگا! اب سوال یہ ہے کہ اس طرح کی روایات کا مطلب کیا ہے؟

الجواب: دجال ظاہری شخصیت میں تو انسان کی طرح ہی ہوگا، لیکن وہ ایک انتہائی قسم کا سازشی، شیطان، احمق اور مغرور انسان ہوگا: جو فرعونیت کا اور طغیانی کا مظاہرہ کرے گا اور اللہ کو اس حد تک بھولا ہوا ہوگا کہ اپنی جابرانہ حکومت پر واضح طور پر اُلوہیت کا اطلاق کرے گا!

رہی اس کی معنوی شخصیت جو طغیان بدوش اِلحاد کا دھارا ہوگی، تو وہ ایک بڑی موٹی تازی شخصیت ہے۔ اور اس کی اس ضخامت پر دلالت کرنے والے اوصاف کی طرف اشارہ کرنے والی روایتیں اس معنوی شخصیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، جیسے کہ ایک دور میں جاپانی فوج کے کمانڈر جنرل نے ایک ایسے انسان کی تصویر بنائی جو اپنا ایک قدم بحرِ محیط میں اور دوسرا پورٹ آرتھر کے قلعے میں رکھے ہوئے تھا، اور یہ قلعہ بحرِ محیط سے دس دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اور اس طرح اس نے اپنے لشکر کی بہت بڑی معنوی شخصیت کا اظہار جاپان کے اُس چھوٹے سے کمانڈر کی تصویر کے ذریعے کیا۔

رہی دجّال کی جھوٹی جنت، تو وہ تہذیب حاضر کے پُر کشش کھیل تماشے، تفریح گاہیں، تھیٹر اور سینما وغیرہ ہیں۔

رہی اس کی سواری، تو وہ نقل و حمل کا کوئی ریل گاڑی کے ساتھ ملتا جلتا وسیلہ ذریعہ ہے جس کے ایک سرے میں آگ کی بھٹی ہوگی جس میں وہ بسا اوقات ان لوگوں کو پھینکے گا جو اس کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور رہا اس سواری کا دوسرا کان یعنی اس کا دوسرا سرا، تو اُس میں اس کے پیروکاروں کے بیٹھنے کے لیے قیمتی بچھونے بچھے ہوئے ہوں گے۔

پس وہ ریل گاڑی جو کہ اس بدمست بے وقوف اور ظالم وغدّار دنیا کی بڑی اہم سواری ہے جو بیوقوفوں اور دنیا داروں

(حاشیہ) عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: الا أحدثکم عن الدجال ما حدث بہ نبی قومہ؟ انہ اعور، انہ یجیئ بمثال الجنة والنار۔ فالتی یقول انہا الجنة، ہی النار۔ وانی انذرکم بہ کما انذر بہ نوح قومہ" رواہ البخاری فی الانبیاء و مسلم برقم: 2936

کے لیے جھوٹی جنت لے کر اور مسکین دین داروں اور مسلمانوں کے لیے خطرات لے کر آتی ہے جدید تہذیب کے ہاتھوں جہنم کے داروغوں کی طرح انہیں قید و بند کی صعوبتوں سے اور ذلتوں سے دوچار کرتی ہے۔

پس حقیقی عیسائیت اگر چہ اپنے آشکار ہو جانے اور اسلام کی طرف پلٹ جانے کی وجہ سے دنیا میں مطلق اکثریت کے لیے اپنی روشنی بکھیر رہی ہے، لیکن الحاد کا ایک اور دھارا بھی پھر سے اُبھرے گا جو قیامت کے نزدیک غالب آ جائے گا۔ اور زمین میں ''اللہ اللہ'' کہنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ زمین میں کوئی اس طرح کی قابلِ ذکر اہم جماعت باقی نہیں رہ جائے گی جو ''اللہ اللہ'' کہے گی؛ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ ''الحکم للاکثر''، وگرنہ تھوڑے بہت اہلِ حق جو اقلیت کی صورت میں ہوں گے، یا مغلوب ہو چکے ہوں گے، وہ تو قیامت تک باقی رہیں گے۔ البتہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی روحیں ان پر رحم کھاتے ہوئے پہلے قبض کر لی جائیں گی تا کہ وہ قیامت قائم ہوتے وقت اس کی ہولناکیاں نہ دیکھ سکیں۔ چنانچہ قیامت سرکردہ کفار پر قائم ہو گی۔

آپ کا پانچواں سوال: اس سوال کا ماحصل یہ ہے کہ: کیا باقی رہ جانے والی روحیں قیامت کے واقعات سے متاثر ہوتی ہیں۔

الجواب: جی ہاں؛ یہ اپنے درجات کے حساب سے متاثر ہوتی ہیں، جیسے کہ ملائکہ قاہرانہ تجلیات سے اپنے حساب سے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ جس طرح گرم جگہ میں رہنے والا انسان اگر برفباری اور تند و تیز ہواؤں میں کانپنے والوں کو دیکھے گا تو عقل و وجدان کے اعتبار سے ان کی حالت سے متاثر ہو گا۔ اسی طرح قرآنی اشارات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ باقی رہنے والی روحیں جو شعور سے بہرہ ور ہیں اپنے درجات کے حساب سے کائنات میں رونما ہونے والے اہم حادثات و واقعات سے متاثر ہوتی ہیں؛ کیونکہ ان کا اُن واقعات کے ساتھ تعلق ہے۔ پھر وہ روحیں اگر اہلِ عذاب میں سے ہوں تو وہ المناک اور دُکھ بھرے انداز سے متاثر ہوتی ہیں اور اگر اہلِ سعادت میں سے ہوں تو حیران کُن، عجیب و غریب بلکہ ایک جہت سے خوش ہو جانے والے انداز سے متاثر ہوتی ہیں۔

پس قرآن کریم قیامت کے عجائبات کا ذکر دھمکی آمیز انداز میں کرتا ہے اور ہمیشہ کہتا ہے کہ: تم عنقریب اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ جبکہ اس کا ادراک بھی وہی لوگ کریں گے جو اسے انسانی جسم کے ساتھ دیکھیں گے۔ پس قبروں میں بوسیدہ ہو جانے والے اجساد کی روحوں کا بھی قرآن کی اس دھمکی سے ایک حصہ ہے۔

تمہارا چھٹا سوال: اس سوال کا ماحصل یہ ہے کہ: کیا اللہ تعالیٰ کے فرمانِ گرامی: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ میں آخرت، جنت، جہنم اور ان کے باسی بھی شامل ہیں یا نہیں؟

الجواب: یہ مسئلہ بہت سے اہلِ تحقیق اور اَصحابِ کشف و اہلِ ولایت کے ہاں بحث و نظر کا دار و مدار بنا ہوا ہے۔ اس

لیے اس معاملے میں اصل بات تو اُن کی ہی ہوگی۔ مزید یہ کہ اس آیت میں بڑی وسعت اور بہت سے مراتب پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ اکثر اہلِ تحقیق کہتے ہیں کہ اس میں عالمِ بقا شامل نہیں ہے۔ اور دیگر اہلِ تحقیق کہتے ہیں کہ یہ عوالم بھی تھوڑے سے وقت کے لیے صرف ایک آن کی صورت میں کچھ اس طرح کی ہلاکت کا مظہر بن جائیں گے کہ اُسے فنا کے گھاٹ اُترنے کا اور وہاں سے واپس آنے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔

رہی وہ فنائے مطلق کہ جس کے بارے میں کچھ اِفراط سے کام لینے والے اہلِ کشف نے فیصلہ دیا ہے، تو اس کی کوئی حقیقت نہیں؛ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات سرمدی اور دائمی ہے اور اس کے اسماء وصفات بھی دائمی اور سرمدی ہیں تو پھر یہ بات بہت ضروری ہے کہ اہلِ بقا اور عالمِ بقا میں پائی جانے والی باقی رہنے والی اشیاء جو کہ ان اسماء وصفات کے آئینے، ان کے جلوے، اور ان کے نقوش ومظاہر ہیں، وہ بھی قطعی طور پر فنائے مطلق کے گھاٹ نہیں اُتریں گی۔

ابھی ابھی قرآن کریم کے فیض سے دل پر دو نقطے وارد ہوئے ہیں، میں انہیں اجمال کے ساتھ لکھ رہا ہوں:

پہلا نقطہ: اللہ تعالیٰ اس طرح کی بے پایاں قدرت کا مالک ہے کہ اس کی قدرت اور اس کے ارادے کے مقابلے میں عدم اور وجود دو منزلوں کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ وہ انتہائی آسانی کے ساتھ اَشیاء کو عدم کی طرف بھیجتا ہے اور اُنہیں وہاں سے لے آتا ہے۔ اب وہ چاہے تو اُن اشیاء کو وہاں سے ایک دن میں واپس لے آئے اور چاہے تو ایک آن میں۔

پھر یہ بھی ہے کہ عدمِ مطلق بذاتہٖ کا کہیں وجود ہی نہیں ہے؛ کیونکہ ایک ایسا علم موجود ہے جو ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ علمِ الٰہی کے دائرے سے باہر کوئی چیز ہے ہی نہیں کہ اُس کی طرف کوئی چیز پھینکی جائے اور علم کے دائرے میں پایا جانے والا عدم، خارجی عدم ہے اور ایک عنوان ہے جو علمی وجود پر پردہ بن کر تن گیا ہے۔ حتی کہ بعض اہلِ تحقیق نے ان علمی موجودات کو ''اعیان ثابتہ'' کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

تو بات اگر یہی ہے، تو پھر فنا کی طرف چلے جانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اشیاء وقتی طور پر اپنا خارجی لباس اُتار دیتی ہیں اور اس طرح معنوی اور علمی وجود میں داخل ہو جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہلاک ہونے والی اور فانی ہونے والی اشیاء خارجی وجود ترک کر دیتی ہیں اور ان کی ''ماہیت'' ایک معنوی وجود پہن لیتی ہیں اور دائرۂ قدرت سے نکل کر دائرۂ علم میں داخل ہو جاتی ہیں۔

دوسرا نقطہ: ہم نے بہت سے ''مقالات'' میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہر چیز اپنے ''اسمی'' معنی کے ساتھ اور اپنی ذات کی طرف دیکھنے والے پہلو سے معدوم ہے، اس کا ذاتی طور پر کوئی مستقل وجود نہیں ہے اور وہ بنفسہٖ ثابت و برقرار نہیں ہے اور وہ کوئی بنفسہٖ قائم حقیقتِ ثابتہ نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھنے والے پہلو سے، یعنی اپنے ''حرفی'' معنی کی رُو

سے عدم نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں بہت سے باقی رہنے والے اسماء ہیں جن کے جلوے نظر آ رہے ہیں۔ اور وہ معدوم نہیں ہے؛ کیونکہ وہ ایک سرمدی وجود پر مشتمل ہے۔ اور ایک بلند پایہ حقیقتِ ثابتہ کی مالک ہے؛ کیونکہ وہ ایک باقی رہنے والے اسم کے سایوں میں سے ایک ثابت، و برقرار سائے کی ایک قسم ہے اور اس اسم کا مظہر بن چکی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ انسان کے ہاتھ میں ماسویٰ اللہ کے لیے ایک سیفِ قاطع کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کا حکم اس فانی دنیا میں پائی جانے والی فانی اشیاء کے ساتھ رہنے والے ماسوی اللہ کے ہر تعلق کو فانی اشیاء کے ذریعے کاٹ کر رکھ رہا ہے۔ یعنی اس کی نظر فنا پذیر اشیاء کی طرف لگی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی چیز جب اللہ کی راہ میں ہوگی، یعنی جب وہ اپنے ''حرفی معنی'' کے ساتھ ہوگی اور لوجہ اللہ ہوگی، تو ماسوی اللہ کے دائرے میں داخل نہیں ہوگی یعنی اس کا سر ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ کی تلوار سے کاٹا نہیں جائے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ: وہ جب اللہ کے لیے ہوگا، اور اللہ کو پالے گا تو غیر بچے گا ہی نہیں کہ اس کا سر کاٹا جا سکے! اور اگر وہ اللہ کو نہ پائے گا اور اللہ کی راہ میں نہیں دیکھے گا تو پھر ہر شے غیر ہوگی، تب اسے چاہیے کہ وہ ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ کی تلوار استعمال کرے اور حجاب چاک کر دے تاکہ اُسے دیکھ سکے۔

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

سولہواں مکتوب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ﴾

یہ مکتوب فرمانِ گرامی ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا﴾ کا مظہر بن چکا ہے اس لیے یہ سخت لہجے میں نہیں لکھا گیا ہے۔

یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے جو اکثر لوگوں کی طرف سے صراحتاً یا ضمناً وارد ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب لکھنا مجھے پسند نہیں اور نہ ہی میں لکھنا چاہتا ہوں؛ کیونکہ میں نے اپنے تمام اُمور اللہ کے سپرد کر دیے ہیں اور اس پر توکل کیے بیٹھا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے میرے عالم میں اور میری حالت میں آرام کے ساتھ نہیں رہنے دیا جاتا۔ اور یہ لوگ میرے چہرے کو دنیا کی طرف پھیرتے ہیں۔ اس لیے میں اب مجبوراً خود کو نہیں بلکہ اپنے احباب واَقرباء کو اور اپنے ''مقالات'' کو اہلِ دنیا کے اَوہام وشبہات اور ان کی تکلیفوں سے بچانے کے لیے، اپنے دوستوں کے لیے، اہلِ دنیا کے لیے اور حکمرانوں کے لیے حقیقتِ حال بیان کرنے کے لیے ''جدید سعید'' کی زبان سے نہیں بلکہ ''قدیم سعید'' کی زبان سے پانچ نقاط کی وضاحت کر رہا ہوں۔

پہلا نقطہ

کہا گیا ہے کہ: آپ سیاست سے اس حد تک بے رُخی کیوں اختیار کرتے ہیں کہ اب اس کے قریب تک نہیں پھٹکتے؟

الجواب: ''قدیم سعید'' نے نو دس سال پہلے سیاست میں کافی حد تک دلچسپی لی ہے، وہ سمجھتا تھا کہ شاید میں سیاست کے ذریعے دین اور علم کی کچھ خدمت کر سکوں گا! لیکن اس کی یہ کوشش بے کار ثابت ہوئی اور وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا، اور اُسے نظر آ گیا کہ یہ اُس کے حساب سے مشکوک، مشکل، خطرناک، اہم خدمات سے مانع اور فضول راستہ ہے، اس راستے میں زیادہ تر جھوٹ کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے، اور یہ لاشعوری طور پر کسی اجنبی کے ہاتھ کا آلۂ کار بن سکتی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ جو آدمی ملکی سیاست میں حصہ لیتا ہے وہ موافق کا کردار ادا کرے گا یا مخالف کا، اس لیے اگر میں موافق بن کر رہوں تو میرے لیے سیاست ایک فضول اور بے معنی چیز ہوگی؛ کیونکہ میں حکومت کا کوئی ملازم یا پارلیمانی ممبر نہیں ہوں، اس لیے میرا سیاست میں حصہ لینا بالکل غیر ضروری اور بے فائدہ ہے۔ اور اگر میں سیاست میں حصہ لے کر مدِ مخالف کا کردار ادا کروں تو پھر میری یہ دخل اندازی فکر ونظر کے ساتھ ہوگی یا طاقت کے ساتھ، اگر فکری طور پر ہوگی تو پھر تو میری ضرورت ہی نہیں کیونکہ تمام مسائل بالکل واضح ہیں اور انہیں میری طرح تمام لوگ جانتے ہیں، اس لیے ان مسائل

کے بارے میں یاوہ گوئیاں کرتے رہنا بالکل بے معنی سی بات ہے۔اور اگر میں سیاست میں حصہ طاقت اور قوّت کے ساتھ لوں اور مشکوک اہداف و مقاصد تک پہنچنے کے لیے ہنگامہ آرائی کروں تو اس سے مشکوک اہداف و مقاصد تک پہنچنے کے لیے ہزاروں قسم کی نافرمانیوں کا ارتکاب کرنے کا احتمال ہے۔اور بہت سے لوگ ایک شخص کی وجہ سے مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ میرا وجدان دس میں سے ایک دو احتمالات کی بنا پر خود کو اور دوسرے بے گناہ لوگوں کو نافرمانیوں کی دلدل میں گرانے کو پسند نہیں کرتا ہے۔اسی وجہ سے ''قدیم سعید'' نے تمباکو نوشی کے ساتھ ساتھ اخبار بینی، رسائل خوانی، سیاست اور دنیا دارانہ سیاسی گفتگو سے کنارا کرلیا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ میں نے آٹھ سال ہونے کو ہیں، اُس وقت سے لے کر آج تک کوئی اخبار نہ پڑھا ہے اور نہ سنا ہے۔اگر ایسا ہوا ہے تو کوئی میدان میں نکلے اور ثابت کردے کہ میں نے کبھی کوئی اخبار وغیرہ پڑھا ہے یا سنا ہے، حالانکہ ''قدیم سعید'' آٹھ سال پہلے ایک دن میں آٹھ آٹھ اخبار پڑھا کرتا تھا۔

مزید یہ کہ پانچ سال سے میری بود و باش اور نقل و حرکت کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔اب جس کو بھی مجھ میں کوئی سیاسی میلانات نظر آئے ہیں وہ بتائے، حالانکہ میرے جیسا مضبوط اعصاب کا انسان جو لا اُبالی اور بے تعلّق قسم کی زندگی گزار رہا ہے اور جو "اِنَّمَا الْحِيلَةُ فِي تَرْكِ الْحِيلَةِ" کے دستور کو پیشِ نظر رکھ کر حیلے وسیلے سے کنارہ کش رہنے کو ہی سب سے بڑا حیلہ سمجھتا ہو، ایسے آدمی کے افکار آٹھ سال تو کیا آٹھ دن بھی چھپے نہیں رہ سکتے ہیں۔اس لیے اگر اس کے دل میں سیاست کی اشتہا یا لالچ ہوتی تو وہ توپ کے گولے کی طرح گونج اُٹھتی اور ان گہری تحقیقات کی اور جانچ پڑتال کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

دُوسرا نقطہ: جدید سعید اس حد تک شدّت کے ساتھ سیاست سے کنارہ کش کیوں رہتا ہے؟

الجواب: وہ سیاست سے اس شدّت کے ساتھ اس لیے دور بھاگتا ہے کہ کہیں وہ اس میں غیر ضروری اور بے فائدہ طور پر مداخلت کر کے اپنی لاکھوں سالوں سے زائد زندگی کو حاصل کرنے والی تگ و دو کو اس دنیا کی سال دو سال کی مشکوک زندگی کی بھینٹ نہ چڑھا دے!

اور پھر سیاست سے اس شدت کے ساتھ اس لیے بھی دور بھاگتا ہے تاکہ ایمان اور قرآن کی اس خدمت کو سرانجام دینے میں کوئی خلل واقع نہ ہو جو کہ سب سے زیادہ اہم، جلیل القدر، صاف شفاف اور سب سے زیادہ حقیقت بردوش ہے؛ کیونکہ وہ کہتا ہے:

میں بوڑھا ہو رہا ہوں، اور اس عمر کو پہنچ جانے کے بعد نہیں جانتا کہ مزید کتنا جی سکوں گا! لہٰذا میرے لیے سب سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ میں اب ابدی زندگی کے لیے کام کروں۔اور ابدی سعادت کا شاہ کلید اور ابدی زندگی کو حاصل کرنے

کا پہلا وسیلہ ''ایمان'' ہے۔اس لیے صرف اُسی کے لیے دوڑ دھوپ کرنی چاہیے۔

البتہ میں چونکہ ایک عالمِ دین ہوں اور شرعی طور پر لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا مکلّف ہوں،اس لیے میں اس زاویے سے بھی لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔لیکن اس خدمت کا نفع یا تو دینی اور اُخروی زندگی کو ہوگا، یا پھر دنیاوی اور معاشرتی زندگی کو۔اور یہ مجھ سے ہوگا نہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ تند و تیز دور میں یہ خدمت صحیح طور پر ادا بھی نہیں ہوتی،اس بنا پر میں نے اس جہت کو چھوڑ کر ایمان کی خدمت کی جہت کو ترجیح دے دی جو کہ زیادہ اہم،زیادہ لازم اور زیادہ سلامتی والی ہے اور میں دروازہ کھلا چھوڑ رہا ہوں تاکہ وہ ایمانی حقائق جو میں نے اپنے لیے کمائے ہیں اور وہ معنوی دوائیں جن کا تجربہ میں نے خود اپنی ذات پر کیا ہے،تمام لوگوں تک پہنچ جائیں؛ شاید کہ اللہ تعالیٰ یہ خدمت قبول کر لے اور اسے میرے پہلے گناہوں کا کفارہ بنا دے! اور اس خدمت کی راہ میں شیطان مردود کے علاوہ کسی کو بھی رکاوٹیں ڈالنے کا حق نہیں پہنچتا ہے، وہ مومن ہو یا کافر، صدیق ہو یا زندیق؛ کیونکہ بے ایمانی دیگر اُمور کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی ہے؛ یہ بات ممکن ہے کہ ظلم وفسق اور کبائر میں کچھ منحوس شیطانی لذتیں پائی جائیں لیکن بے ایمانی میں لذت کا قطعاً کوئی پہلو نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ یہ الم دَر الم، ظلمت در ظلمت اور عذاب در عذاب ہے۔

پس میرے جیسے اکیلے انسان کا جو کہ بالکل لاتعلق جیسی زندگی گزار رہا ہے اور اپنے پہلے گناہوں کا کفارہ طلب کرنے پر مجبور ہے؛ ایسے انسان کا بڑھاپے کی اس عمر میں ایک غیر محدود ابدی زندگی کے لیے تگ و دو نہ کرنا اور ایمان جیسے قدسی نور کی خدمت چھوڑ دینا اور سیاست کی خطرناک اور غیر ضروری رنگ رلیوں میں مصروف ہو جانا ایسا پاگل پن اور عقل وحکمت کے خلاف کام ہے کہ جسے پاگل بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ: قرآن اور ایمان کی خدمت آپ کو سیاست سے کیوں روکتی ہے؟

تو میں کہوں گا: ایمانی اور قرآنی حقائق جواہرات کا حکم رکھتے ہیں،اس لیے میں اگر سیاست میں مصروف ہو جاؤں تو میرے ان جواہرات کے بارے میں بھولے بھالے اور دھوکے میں آجانے والے عوام کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ: کیا یہ پیروکاروں کی تعداد بڑھانے کے لیے سیاسی پروپیگنڈہ نہیں ہے؟ چنانچہ وہ لوگ کچھ اسی انداز سے سوچیں گے اور ان جواہرات کو ایسے دیکھیں گے کہ جیسے یہ کانچ کے عام ٹکڑے ہیں۔تب میں سیاست کے ساتھ وابستہ ہو کر ان جواہرات پر ظلم کروں گا۔اور یہ چیز ان کی قیمت کو گرانے کے مترادف ہوگی لہٰذا اے اہلِ دنیا! تم لوگ مجھے میری حالت پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہو؛ اور مجھے اُلجھا کر کیوں رکھنا چاہتے ہو؟

اگر تم یہ کہو کہ: مشائخ ہمارے معاملات میں مداخلت کرتے ہیں،اور لوگ آپ کو بھی بعض دفعہ ''شیخ'' کہتے ہیں۔

تو میں کہوں گا: صاحبو! میں شیخ نہیں ہوں، بلکہ میں تو صرف ایک عالم ہوں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میں گزشتہ چار سال سے یہاں ہوں، اس دوران میں اگر میں نے کسی ایک شخص کو بھی صوفیانہ طریقت کی تعلیم دی ہو تو تمہیں شک شبہ کرنے کا حق حاصل ہے، بلکہ اس کے برعکس میں نے اپنے پاس آنے والے ہر آدمی سے یہ کہا ہے کہ: یہ زمانہ طریقت کا نہیں ہے، ایمان ضروری ہے اور اسلام ضروری ہے۔

اگر تم یہ کہو کہ: لوگ آپ کو ''سعید کردی'' کہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ میں بھی نسل پرستی کی سوچ پائی جاتی ہو، اور یہ چیز ہمارے کام کے ساتھ میل نہیں کھاتی ہے!

تو میں کہوں گا: حضراتِ گرامی! ''قدیم سعید'' اور ''جدید سعید'' نے جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ سرِ عام سب لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اپنی ان تمام تحریروں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے قدیم ہی سے منفی قومیت اور نسل پرستی کو زہرِ قاتل سمجھا ہے؛ کیونکہ یہ یورپ کی بیماریوں میں سے ایک خبیث قسم کی افرنگی بیماری ہے۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ یورپ نے یہ افرنگی بیماری مسلمانوں کے درمیان پھینک دی ہے تاکہ وہ بکھر جائیں اور پارہ پارہ ہو جائیں اور پھر اُس کے لیے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو نگلنا آسان ہو جائے!

اور میرے وہ شاگرد اور دوست جو کہ میرے ساتھ وابستہ ہیں سب جانتے ہیں کہ میں نے شروع سے ہی اس فرنگی بیماری کا ''اَلْاِسْلَامِیَّۃُ جَبَّتِ الْعَصَبِیَّۃَ الْجَاهِلِیَّۃَ'' کے قطعی حکم کے تحت مداوا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ بات اگر یہی ہے تو پھر تم لوگ ہر واقعے کو بہانہ بنا کر میرا عرصہ حیات تنگ کیوں کرتے ہو؟

میرے ساتھ تمہارا یہ رویہ تو ایسے ہی ہے کہ جیسے اگر سپاہی مشرق میں غلطی کرے تو مغرب میں رہنے والے کسی سپاہی کو اس بنا پر سزا دے دی جائے کہ وہ دونوں سپاہی ہیں۔ یا پھر اگر کوئی دوکاندار استنبول میں غلطی کرے لیکن سزا کسی بغداد میں رہنے والے دوکاندار کو دے دی جائے؛ کیونکہ وہ بھی ہے تو دوکاندار ہی نا! ایسا کس قانون کے تحت ہو رہا ہے؟ اور اس کا فیصلہ کون سا وجدان کرتا ہے؟ اور ایسا کون سی مصلحت کے تقاضے کے تحت کیا جا رہا ہے؟

تیسرا نقطہ: میرے وہ دوست جو میرے حال احوال اور میری راحت و رامش کا خیال رکھتے ہیں اور ہر مصیبت پر میرے صبر کے ساتھ خاموش رہنے پر حیران ہوتے ہیں، وہ مجھ سے پوچھتے ہیں: آپ پر جو مشقتیں اور تنگیاں نازل ہوتی ہیں آپ ان پر صبر کیسے کرتے ہیں، حالانکہ پہلے پہل تو آپ اتنے غصے والے اور عزت دار تھے کہ معمولی سی تحقیر بھی برداشت نہیں کرتے تھے؟

الجواب: میں کہتا ہوں: دو کہانیاں اور دو چھوٹے چھوٹے واقعات سنو اور ان سے اپنے جواب اخذ کر لو۔

پہلی کہانی: آج سے دو سال قبل ایک ذمہ دار ڈائریکٹر نے میرے بارے میں میری عدم موجودگی میں بغیر وجہ کے کچھ

توہین آمیز، اناپ شناپ اور غلط سلط باتیں کی تھیں۔ لوگوں نے وہ باتیں مجھے بتا دیں، تو میں ''قدیم سعید'' کے مزاج کے مطابق ان سے صرف ایک گھنٹے تک پریشان رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے میرے دل پر ایک ایسی حقیقت نازل ہوئی جس نے میرے دل پر چھائی ہوئی تمام تنگی دور کر دی اور مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ میں اس شخص کو معاف کر دوں، اور وہ حقیقت یہ ہے کہ:

میں نے اپنے من سے کہا: اس نے میری جو تحقیر کی ہے اور میری جو برائیاں بیان کی ہیں، ان کا تعلق اگر میری ذات کے ساتھ ہے تو اللہ اسے معاف فرمائے کہ وہ میری ذات کے عیوب بیان کر رہا ہے۔ اس لیے اگر اس نے سچ کہا ہے تو وہ مجھے میرے نفسِ امارہ کی تربیت کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ اور یوں گویا کہ وہ مجھے غرور سے بچانے کے لیے میرا تعاون کر رہا ہے۔ اور اگر اس نے جھوٹ کہا ہے تو پھر یہ چیز مجھے ریا کاری سے، اور جھوٹی شہرت سے نجات دلائے گی جو اس ریا کاری کی بنیاد ہے۔

جی ہاں؛ میں نے اپنے نفس کے ساتھ کبھی مصالحت نہیں کی، کیونکہ میں اس کی تربیت نہیں کر سکا ہوں۔ چنانچہ اگر میری گردن میں بچھو ہو اور کوئی شخص مجھے بتا دے یا دکھا دے تو اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہوگا نہ کہ اس کے ساتھ ناراض ہونا!

اور اگر اس شخص کی تحقیر و اہانت کا تعلق میری صفت کے ساتھ ہے یعنی اس چیز کے ساتھ ہے کہ میں ایمان اور قرآن کی خدمت کر رہا ہوں، تو اس کا تعلق میرے ساتھ نہیں ہے، اور میں اس شخص کو صاحبِ قرآن کے حوالے کرتا ہوں جو مجھ سے یہ خدمت لے رہا ہے، پس وہ عزیز ہے، حکیم ہے۔ اور اگر اس کی تحقیر و اہانت اور سب و شتم میری عزّت گھٹانے کے لیے ہے، تو پھر بھی اس کا تعلق میرے ساتھ نہیں ہے؛ کیونکہ میں ایک جلا وطن، قیدی، اجنبی اور دست بستہ انسان ہوں، اس لیے میں اپنے ہاتھ سے اپنی عزّت کی اصلاح کے لیے کچھ بھی کرنے کا حق نہیں رکھتا ہوں، بلکہ اس چیز کا حق اس گاؤں کو پہنچتا ہے جو میرا میزبان ہے اور جو میری نگرانی کر رہا ہے۔ پھر اس کا تعلق اس ضلع کے حکمرانوں کے ساتھ ہے اور اس صوبے کے حکمرانوں کے ساتھ ہے، کیونکہ جو آدمی دوسرے آدمی کا قیدی ہو تو اس کی تحقیر اس کے مالک کی تحقیر ہوتی ہے، اور وہی اس کا دفاع کرے گا۔

مجھے جب پتا چلا کہ اصل حقیقت یہی ہے تو میرا دل مطمئن ہو گیا، اور میں نے کہا:

﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ چنانچہ میں نے اس واقعہ کے بارے میں یہ تصوّر کر لیا کہ گویا یہ پیش ہی نہیں آیا، اور میں نے اسے فراموش کر دیا، لیکن پھر کچھ دیر بعد مجھے پتا چلا کہ قرآن نے اسے معاف نہیں کیا۔۔۔

دوسری کہانی: اسی سال کی بات ہے، میں نے سنا کہ کوئی واقعہ رونما ہوا ہے، لیکن میرے ساتھ کچھ اس طرح کا سلوک

کیا گیا کہ جیسے میرا اس واقعے کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہو۔ حالانکہ میں نے اس واقعے کے رونما ہو جانے کے بعد اس کے بارے میں بالکل سرسری طور پر صرف سنا ہی تھا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ میں خط و کتابت کرتا ہی نہیں تھا، اور اگر کبھی کرتا تھا تو کسی دوست کی طرف کوئی ایمانیات کا مسئلہ لکھ دیتا تھا۔ اور ایسا بھی بالکل شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ حتیٰ کہ میں نے چار سالوں میں اپنے سگے بھائی کی طرف صرف ایک خط لکھا۔ چنانچہ میں خود کو لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے سے روکتا تھا اور اہلِ دنیا بھی مجھے روکتے تھے۔ بس پورے ہفتے میں اپنے ایک دو دوستوں کے ساتھ ملتا تھا۔ رہے بستی میں آنے والے مہمان، تو اُن میں سے پورے مہینے میں کبھی کبھار صرف ایک دو آدمی کے ساتھ کسی اُخروی مسئلے کے بارے میں منٹ دو منٹ کے لیے ملاقات ہو جاتی تھی۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں نے مجھے میری اس اجنبیت کی حالت میں ہر چیز سے اور ہر ایک سے روک رکھا تھا۔ اور میں ایک ایسی بستی میں کہ جہاں میرے جیسے آدمی کے لیے نان و نفقہ کے لیے بھاگ دوڑ کرنے کی گنجائش ہی نہیں، بالکل اجنبی، اکیلا اور کسی قریبی دوست رشتے دار سے محروم تھا۔ حتیٰ کہ میں نے چار سال قبل ایک منہدم مسجد کو نئے سرے سے تعمیر کر لیا تھا اور اس میں چار سال امامت بھی کرائی تھی۔ اللہ قبول کرے۔ کیونکہ میرے پاس امامت و خطابت کی سرکاری سند موجود ہے لیکن اس کے باوجود میں گزشتہ رمضان میں مسجد نہیں جا سکا، چنانچہ مجھے بسا اوقات نماز اکیلے ہی پڑھنی پڑی اور یوں میں جماعت کے ساتھ ادا کی جانے والی نماز کے پچیس گنا والے اجر سے محروم رہا۔ لیکن میں نے ان دو واقعات کو بھی برداشت کیا اور صبر کا مظاہرہ کیا، جیسے کہ میں نے دو سال پہلے پیش آنے والے اس افسر کے معاملے میں صبر کیا تھا، اور میں آئندہ بھی ان شاء اللہ ایسے ہی کروں گا۔

اب میرے ذہن میں جو بات آ رہی ہے اور میں جو کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ:

اہلِ دنیا کی طرف سے مجھ پر جو تکلیف، تنگی ترشی اور ظلم و زیادتی نازل ہوئی ہے، اگر وہ میرے عیب دار و قصور وار نفس کی خاطر ہے تو میں انہیں معاف کرتا ہوں؛ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے میرا نفس سدھر جائے اور یہ چیز میرے گناہوں کا کفارہ بن جائے!

میں دنیا کے اس مہمان خانے میں بہت سی خوشیاں دیکھ چکا ہوں، اس لیے اگر مجھے اس کی تھوڑی سی جفا کاری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو میں اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

اور اگر اہلِ دنیا مجھ پر یہ ظلم و ستم ایمان اور قرآن کی خدمت کی جہت سے کر رہے ہیں تو اس کے دفاع کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے، کیونکہ میں اس چیز کو العزیز الجبار کے حوالے کرتا ہوں۔

اور اگر ایسا کرنے سے مقصد یہ ہے کہ عوام الناس کی توجہ مجھ سے ہٹ جائے، یعنی وہ یہ سب کچھ اُس بے اصل جھوٹی شہرت کو ختم کرنے کے لیے کر رہے ہیں جو ریاکاری کو جنم دیتی ہے اور اخلاص کا ستیاناس کر دیتی ہے تو خدا اُن پر رحمت

کرے؛ کیونکہ عوام الناس کی توجہ حاصل کرنا اور لوگوں کی نظروں میں مشہور ہونا میرے جیسے لوگوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ جو میرے ساتھ میل جول رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اپنے ذاتی احترام کا طلبگار نہیں ہوں، بلکہ اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں، اس حد تک کہ میں اپنے ایک قیمتی دوست کو صرف اس بنا پر پچاس دفعہ ڈانٹ چکا ہوں کہ وہ میرا احترام کرنے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لیتا تھا۔

لیکن اگر اُن کے میری توہین کرنے اور مجھے لوگوں کی نظروں سے گرانے کا تعلق ان ایمانی اور قرآنی حقائق کے ساتھ ہے جن کی میں ترجمانی کر رہا ہوں، تو پھر تو ان کی کوششیں بالکل بے سود ہیں؛ کیونکہ قرآن کے ستاروں کو پردہ کے نیچے نہیں چھپایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی اپنی آنکھیں بند کر لے تو وہ اکیلا ہی ہوگا جو دیکھ نہیں سکے گا اور اپنے اس اندھے پن کو دوسروں کے لیے دلیل نہیں بنا سکے گا۔

چوتھا نقطہ۔ چند وہم خیز سوالوں کا جواب ہے۔

پہلا سوال: اہلِ دنیا مجھ سے پوچھتے ہیں: آپ گزر بسر کیسے کرتے ہیں؟ اور کام کیے بغیر گزارہ کیسے کرتے ہیں؟ ہم اپنے وطن میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والے ست لوگوں کو اور دوسرے لوگوں کی محنت مزدوری کے سہارے زندگی گزارنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

الجواب: میں برکت اور کفایت شعاری کے سہارے گزر بسر کر رہا ہوں اور اپنے رزّاق کے علاوہ کسی کا بھی احسان قبول نہیں کرتا ہوں، اور یہ طے کر چکا ہوں کہ کسی کا بھی احسان قبول نہیں کروں گا۔

جی ہاں؛ جو آدمی ایک دن میں سو بلکہ چالیس پاروں (حاشیہ) پر گزارا کر سکتا ہے وہ دوسرے کا احسان قبول نہیں کرے گا۔

میں اس مسئلے کی وضاحت میں قطعاً کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا کیونکہ اس میں خطرہ تھا کہ یہ انداز کہیں غرور و تکبر کی خبر نہ دے رہا ہو! اس لیے اس اندیشے کے پیشِ نظر اس چیز کی وضاحت مجھے بالکل ناپسند تھی، لیکن اہلِ دنیا اس بارے میں جس انداز سے سوال کرتے ہیں اس سے چونکہ کئی قسم کے وہم سر اُٹھاتے ہیں، اس لیے میں مجبور ہو کر بتا رہا ہوں کہ:

میری زندگی کا ایک اہم دستور یہ ہے کہ میں بچپن ہی سے دوسروں کا مال قبول نہیں کرتا اگرچہ زکاۃ ہی کیوں نہ ہو۔ اور تنخواہ بھی قبول نہیں کرتا۔ مگر جب میں دارُ الحکمۃ الاسلامیۃ میں ملازم تھا تو اپنے دوستوں کے مجبور کرنے پر میں نے سال دو سال کے لیے تنخواہ قبول کر لی تھی۔ اور یہ کہ میں دنیاوی گزر بسر کے لیے کسی کے زیرِ احسان نہیں ہوتا۔

میرے علاقے کے اور دوسرے علاقوں میں میرے ساتھ جان پہچان رکھنے والے سب لوگ یہ بات اچھی طرح

(حاشیہ:۱) پارہ، ایک تُرکی سکے کا نام۔ چالیس پاروں کا ایک قرش، اور دس قرش کا ایک لیرا بنتا ہے، یعنی ایک لیرے میں چار سو قرش ہوتے ہیں۔ مترجم۔

جانتے ہیں۔

میرے بہت سے دوستوں نے اس باب میں بہت کوشش کی کہ میں اپنی جلاوطنی کے ان پانچ سالوں میں اُن کے تحفے قبول کرلوں، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ پھر آپ گزراوقات کیسے کرتے ہیں؟

تو میں کہوں گا کہ: برکت اور اکرامِ الٰہی کے ساتھ؛ کیونکہ میرا نفس اگر چہ ہر قسم کی حقارت اور اہانت کا مستحق ہے، لیکن میں خاص کر رزق کے معاملے میں قرآن کی خدمت کا بھرم رکھنے کے لیے اکرامِ الٰہی کے رُوپ میں ملنے والی برکت کا مظہر بن جاتا ہوں۔ اس مقام پر میں فرمانِ گرامی ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ کو سامنے رکھ کر معنوی شکر ادا کرنے کی صورت میں اُن احسانات کی چند مثالیں ذکر کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کیے ہیں۔ یہ مثالیں اگر چہ معنوی شکر کے اظہار کے لیے ہیں تاہم پھر بھی میں ڈر رہا ہوں کہ ان میں کہیں ریا کاری وغرور کی آمیزش نہ ہو جائے اور یوں وہ مبارک برکت منقطع نہ ہو جائے؟ کیونکہ مخفی برکت کا اَز راہِ فخر اظہار کرنا برکت کے ختم ہو جانے کا کارن بن جاتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ کیونکہ میں ان کا ذکر کرنے پر مجبور ہو چکا ہوں۔

پہلی مثال: گیہوں کا ایک ''کیلہ'' (حاشیہ:۱) جس سے چھتیس نان بن جاتے ہیں، مجھے ان چھ مہینوں میں کافی رہا اور ابھی تک ختم نہیں ہوا، اور میں نہیں جانتا کہ کب تک میرے لیے کافی رہے گا؟ (حاشیہ:۲)

دوسری مثال: اس رمضان المبارک میں مجھے صرف دو گھروں سے کھانا آیا اور دونوں نے مجھے بیمار کر دیا۔ اس سے مجھے پتا چل گیا کہ مجھے دوسروں سے کھانا کھانے سے روک دیا گیا ہے۔ اور بقیہ رمضان میں مجھے میرے سچے دوست اور مبارک گھر کے مالک جس نے ماہ رمضان میں میرے اخراجات کی ذمہ داری لی تھی۔ ''عبداللہ چاؤش'' کی گواہی کے مطابق تین نان اور ایک اوقیہ چاول کافی رہے۔

تیسری مثال: پہاڑ پر مجھے اور میرے مہمانوں کو تین مہینے تک ایک اوقیہ گھی کافی رہا، حالانکہ ہم روزانہ روٹی کے ساتھ کھاتے رہے۔ حتیٰ کہ میرا ایک بابرکت مہمان تھا جس کا نام ''سلیمان'' تھا، اور ہُوا یوں کہ ہم دونوں کی روٹی ختم ہو گئی۔ وہ بدھ کا دن تھا۔ تو میں نے اسے کہا کہ جاؤ اور روٹی لے آؤ۔ تو اُس نے کہا کہ پچھلے دو گھنٹوں سے یہاں چاروں طرف مجھے کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آیا جس سے روٹی خریدی جا سکے۔ اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ ہم جمعرات کو دونوں اس پہاڑ پر اللہ سے دعا کریں۔ تو میں نے کہا: ٹھیک ہے میرے پاس ہی رہو، تَوَكَّلْنَا عَلَى اللّٰهِ۔

پھر ہم بغیر کسی وجہ کے چلتے رہے یہاں تک کہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ کیتلی میں تھوڑا سا پانی تھا اور ہمارے پاس چائے کی تھوڑی سی پتی اور چینی تھی۔ تو میں نے کہا بھائی! تھوڑی سی چائے تو بنا دو! تو اس نے چائے بنانا شروع کر دی اور

(حاشیہ:۱) کیل: ایک قدیم پیمانے کا نام جو لگ بھگ چالیس لیٹر کے برابر ہوتا ہے۔ مترجم۔

(حاشیہ:۲) اور یہ پورے سال کے لیے کافی رہا۔ مؤلف۔

میں نیچے گہری وادی میں جھانکنے والے ایک صنوبر کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ میں افسوس کرتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ ہمارے پاس ایک باسی روٹی کا ایک ٹکڑا رہ گیا ہے اور یہ تو صرف آج کی شام ہمارے کام آسکے گا، اور باقی دو دن ہم کیا کریں گے اور میں اس صاف دل آدمی سے کیا کہوں گا؟ میں اسی سوچ میں غرق تھا کہ پھر میں نے اچانک اپنا سر گھمایا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے میرا سر میرے اختیار کے بغیر خود بخود ہی گھوم گیا ہو! تو مجھے صنوبر کے درخت پر ایک بہت بڑی روٹی نظر آئی جو شاخوں کے درمیان سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ تو میں نے کہا سلیمان! خوشخبری ہو، اللہ نے ہمیں رزق دے دیا ہے! چنانچہ ہم نے وہ روٹی پکڑ لی اور پھر درخت کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ درخت کو کسی پرندے یا جنگلی جانور نے چھوا تک نہیں، اور بیس تیس دنوں سے کوئی بھی انسان اس چوٹی پر نہیں چڑھا ہے۔ چنانچہ وہ روٹی ہمیں دو دن تک کافی رہی، ہم اسے کھاتے رہے ختم ہونے کے قریب آئی تو اچانک دیکھا کہ میرا چار سالہ پرانا سچا دوست مستقیم سلیمان روٹی لے کر اُوپر چلا آرہا ہے۔

چوتھی مثال: یہ جیکٹ جو میں نے پہن رکھی ہے، یہ میں نے سات سال پہلے خریدی تھی اور اب اس پر پانچ سال ہونے کو ہیں۔ چنانچہ میں نے زیریں اور بالائی کپڑے، اور جوتے اور جرابیں صرف ساڑھے چار لیروں میں پورے کر لیے، اور یوں مجھے برکت، کفایت شعاری اور رحمتِ الٰہی کافی ہوگئی۔

اس جیسی اور بھی کافی مثالیں موجود ہیں، اور برکاتِ خداوندی کی بہت سی جہتیں ہیں جن میں سے بہت سی جہتوں سے اس بستی کے لوگ واقف ہیں۔ لیکن خبردار! یہ گمان کبھی نہ کرنا کہ میں یہ مثالیں اظہارِ فخر کے لیے ذکر کر رہا ہوں۔ بلکہ میں تو انہیں ذکر کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ اور یہ بھی مت سوچنا کہ ان کا تعلق میری فضیلت کے ساتھ ہے؛ کیونکہ یہ برکتیں یا تو میرے پاس آنے والے میرے مخلص دوست احباب کے لیے اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے، یا پھر یہ قرآنی خدمت کی عزت افزائی ہے، اور یا پھر یہ میرے پاس رہنے والی چار بلیوں کا رزق ہے جو "یا رحیم یا رحیم" پکارتی رہتی ہیں اور یوں اُن کا رزق برکت کی صورت میں آتا رہتا ہے اور میں اس سے فائدہ اُٹھالیتا ہوں۔

جی ہاں؛ آپ جب ذرا غور سے ان بلیوں کی غمگین خرخر سنیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ یہ "یا رحیم، یا رحیم" کا ذکر کرتی ہیں۔

بلی کے ذکر نے مجھے میری مرغی کی یاد دلادی۔

اور وہ اس طرح ہے کہ میرے پاس ایک مرغی تھی جو کہ اس سردی کے موسم میں انڈوں کی مشین کی حیثیت رکھتی تھی اور میرے لیے کبھی کبھار وقفہ کر کے ہر دن خزینۂ رحمت سے ایک انڈا دیا کرتی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اُس نے دو انڈے دے دیے تو میں حیران رہ گیا، اور میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا: ایسا بھی ہوجاتا ہے؟ تو انہوں نے کہا: یہ تو اللہ کا خاص

احسان ہی لگتا ہے۔اس مرغی کا ایک چوزہ تھا جو اس نے گرمیوں میں دیا تھا۔اس نے بھی رمضان شریف میں انڈے دینے شروع کر دیے اور چالیس دن دیتی رہی۔تب مجھے اور میرے خدمت گزاروں کو اس بات میں قطعاً کوئی شبہ نہ رہا کہ اس سردی میں اور رمضان شریف میں انڈوں کی یہ صورت حال اِکرامِ الٰہی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔پھر اس کی ماں نے جب دوبارہ انڈے دینے ختم کیے تو بیٹی نے دوبارہ شروع کر دیے،اور یوں انہوں نے مجھے انڈوں سے محروم نہ ہونے دیا۔

دوسرا و اہم خیز سوال: اہلِ دنیا کہتے ہیں: ہم آپ کی طرف سے اس باب میں کیسے مطمئن ہو جائیں کہ آپ ہماری دنیا کے ساتھ اختلاط نہیں رکھتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اگر ہم نے آپ کو آزاد کر دیا تو آپ اختلاط رکھنا شروع کر دیں؟ اور ہم کیسے جان سکیں گے کہ آپ حیلہ سازی نہیں کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو تارکِ دنیا ظاہر کر رہے ہیں؟ اور بظاہر تو لوگوں کا مال نہیں لیتے لیکن خفیہ طور پر لے لیتے ہوں؟ اور ہمیں اس بات کا علم کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کی یہ روش دھوکہ بازی نہیں ہے؟

الجواب: میرے حالات بیس سال قبل فوجی عدالت اور میرے اخلاق و اطوار پارلیمانی نظام کے اعلان سے پہلے سب کو معلوم ہیں۔اور اُس دور میں میرے دفاعی بیانات جو کتاب میں صادر ہوئے،اس بات پر قطعی دلالت کرتے ہیں کہ میں نے زندگی اس انداز سے گزاری ہے کہ کبھی کسی حیلے کا بلکہ کسی ادنیٰ سے حیلے کا بھی سہارا نہیں لیا۔اگر مجھے حیلہ سازیوں سے کام لینا ہوتا تو ان پانچ سالوں کے دوران ایک چاپلوس کی طرح تمہاری پناہ میں آتا؛ کیونکہ حیلہ ساز فریب کار آدمی کو اپنے ذاتی وقار کی کوئی پروا نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کا محبوب بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے،اس بنا پر وہ ہمیشہ لوگوں کو غفلت میں اور دھوکے میں رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔لیکن اِدھر صورتِ حال یہ ہے کہ میں نے اپنے اوپر ہونے والے حملوں اور تنقیدوں کے باوجود خود کو تمہارے سامنے گرا کر پست نہیں کیا ہے۔چنانچہ میں نے اللہ پر توکل کیا اور اہلِ دنیا سے منہ موڑ لیا۔

بات یہ ہے کہ جسے آخرت کا علم ہو جائے اور جس پر دنیا کی حقیقت کا انکشاف ہو جائے اور اس کے پاس عقل بھی ہو تو وہ اپنی اس روش سے پشیمان ہو کر پھر سے دنیا کی طرف نہیں لوٹے گا اور ایک ایسا انسان جو عمر کے پچاس سال گزار چکا ہے، اور بالکل تن تنہا ہے اور ہر شے سے لاتعلق ہو چکا ہے،وہ دنیا کی سال دو سال کی بے ہودہ، بے سروپا اور جھوٹی باتوں کے لیے اپنی ابدی زندگی کو قربان نہیں کر سکتا ہے،اور اگر ایسا کر بھی لے تو وہ حیلہ ساز و فریب کار نہیں ہوگا بلکہ بیوقوف پاگل ہوگا۔ اور بیوقوف پاگل کر بھی کیا لے گا کہ اُسے اہمیت دی جائے اور اس کا مقابلہ کیا جائے؟

باقی رہا یہ شبہ کہ میں بظاہر تارکِ دنیا لیکن بباطن طالبِ دنیا ہوں،تو میں اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی: ﴿وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيٓ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوٓءِ﴾ کے مطابق اپنے نفس کی براءت نہیں کرتا ہوں؛ کیونکہ میرا نفس تو ہر برائی کا طلب گار ہے۔لیکن کسی عقل مند کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ وہ چھوٹی سی عمر میں بڑھاپے کے وقت میں،اس عارضی سے مسافر خانے

میں اور فانی دنیا میں تھوڑی سی لذت کی خاطر اپنی دائمی زندگی اور ابدی سعادت کو خراب کر بیٹھے۔ چنانچہ میں نے ضروری سمجھتے ہوئے اپنے نفسِ امّارہ کو عقل کا پیروکار بنا دیا؛ کیونکہ ایسا نہ کرنا اہلِ عقل وشعور کو زیب نہیں دیتا ہے۔

تیسرا وہم خیز سوال: اہلِ دنیا کہتے ہیں: کیا آپ ہم سے محبت رکھتے ہیں؟ ہمیں پسند کرتے ہیں؟ اگر آپ ہم سے محبت رکھتے ہیں تو پھر ہم پر غصہ کیوں کھاتے ہیں اور ہمارے ساتھ میل جول کیوں نہیں رکھتے ؟ اور اگر آپ ہمیں پسند نہیں کرتے تو آپ ہمارے مدّمخالف ہیں۔ اور اپنے مدّمخالف کو تو ہم پیس کر رکھ دیتے ہیں؟

الجواب: تم لوگ تو رہے ایک طرف، میں اگر تمہاری دنیا کے ساتھ بھی محبت رکھوں تو دنیا سے کبھی منہ نہ پھیروں، اور میں تمہیں اور تمہاری دنیا کو پسند نہیں کرتا ہوں؛ کیونکہ میں کسی اور دنیا میں رہتا ہوں: میرے دل کو کچھ دیگر اُمور نے اتنا لبریز کر رکھا ہے کہ اس میں دیگر اُمور کے بارے میں سوچنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ تم ہاتھ پر یعنی ظاہری حالات پر نظر رکھو دل کے باطن پر نہیں؛ کیونکہ اگر تم لوگ امن وامان کی صورتِ حال کو کنٹرول میں اور اقتدار کو مضبوط رکھنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں دل کے معاملے میں دخل اندازی کرنے کا اور یہ کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے کہ دل کو ہمارے ساتھ محبت رکھنی چاہیے، کیونکہ تم اس محبت کے قابل ہی نہیں ہو۔ اور میرا ہاتھ تمہارے معاملات میں دخل اندازی کرتا ہی نہیں۔

جی ہاں؛ میں جس طرح فصلِ بہار کی تمنا کرتا ہوں اور یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ اسی موسمِ خزاں میں آ جائے، لیکن میں اُسے براہِ راست بالفعل لا نہیں سکتا ہوں، اسی طرح میں دنیا کے حالات کو سنوارنے کی آرزو رکھتا ہوں، اس کے لیے دعا کرتا ہوں اور اہلِ دنیا کی اصلاح کی تمنا رکھتا ہوں۔ لیکن یہ چیز میرے ارادے سے بالا اور میری طاقت کے دائرے سے باہر ہے۔ اس لیے میں بالفعل دخل اندازی نہیں کر سکتا؛ کیونکہ یہ میری ذمہ داری نہیں ہے اور نہ ہی میری طاقت اور قدرت کے دائرے میں ہے۔

اشتباہ میں ڈالنے والا چوتھا سوال: اہلِ دنیا کہتے ہیں: ہم نے اتنے آلام ومصائب کا سامنا کیا ہے کہ اب کسی کی طرف سے بھی بے خوف نہیں ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اب آپ پر بھروسا کیسے کر سکتے ہیں کہ آپ کو جب بھی موقع ملا آپ ہمارے معاملات میں اپنی مرضی کے مطابق دخل اندازی نہیں کریں گے؟

الجواب: پیچھے بیان کیے گئے نقاط اگرچہ تم لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں، بایں ہمہ میں کہتا ہوں کہ:

باوجود اس کے کہ میں نے اپنے وطن میں اور اپنے طالب علموں، رشتے داروں اور دیگر کہنے سننے والوں اور جذبات سے بے قابو کر دینے والے واقعات کے درمیان رہتے ہوئے تمہاری دنیا کے ساتھ میل جول نہیں رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود دیارِ غربت میں ایک یکّہ وتنہا، اجنبی، کمزور اور عاجز ودرماندہ انسان اپنی پوری قوّت کے ساتھ آخرت کی طرف متوجہ

ہو چکا ہے، اُسے اختلاط، میل جول اور خط وکتابت سے روک دیا گیا ہے، اور اسے ایمان اور آخرت کی مناسبت سے آخرت کی راہ پر چلنے والے کچھ دوست میسّر آ گئے ہیں۔ وہ لوگوں سے اجنبی ہے اور لوگ اُسے اجنبی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ایسا انسان اگر تمہاری اس خطرناک، نامراد اور بے پھل دنیا کے ساتھ اختلاط رکھے گا تو وہ دُگنے پاگل پن میں مبتلا پاگل ہوگا!

پانچواں نقطہ: پانچ چھوٹے چھوٹے مسائل کے اردگرد گھومتا ہے۔

پہلا مسئلہ: اہلِ دنیا مجھ سے کہتے ہیں: آپ اپنی ذات کو ہماری تہذیب کے آداب، ہمارے اسلوبِ حیات، ہماری بود و باش اور ہمارے لباس و پوشاک کے طور اطوار کے مطابق کیوں نہیں ڈھالتے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمارے مخالف اور مدّ مقابل ہیں؟

تو میں کہتا ہوں: حضرات گرامی! آپ لوگوں کو مجھے اپنی تہذیب کے آداب کا پابند کرنے کا کیا حق ہے؟ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ تم لوگوں نے بغیر حق کے مجھے پانچ سال سے ایک بستی میں رہائش رکھنے کے لیے مجبور کر رکھا ہے، مجھے خط و کتابت سے اور میل جول سے روک رکھا ہے۔ اپنے اس سلوک سے تو گویا کہ تم نے خود ہی مجھے تمدّنی حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ پھر تم نے تمام جلاوطنوں کو آزاد کر دیا اور انہیں شہروں میں اپنے دوستوں رشتہ داروں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ اور پھر انہیں آزادی کے پروانے بھی دے دیے لیکن مجھے بغیر کسی وجہ کے ان چیزوں سے محروم کر دیا اور مجھے ایک دو کے علاوہ میرے کسی بھی ہم وطن سے ملنے سے روک دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم لوگ مجھے اس قوم کا اور اس رعایا کا فرد ہی نہیں سمجھتے ہو، تو پھر مجھے اپنی تہذیب کے قوانین کے مطابق ڈھل جانے کا مکلّف کیوں کرتے ہو؟

پھر تم نے اس دنیا کو میرے لیے ایک جیل بنا کر رکھ دیا ہے؛ اور جیل کے قیدی کو تو اس طرح کے اُمور کا پابند نہیں کیا جاتا ہے!

پھر تم نے مجھ پر دنیا کا دروازہ بند کر دیا، تب میں نے آخرت کا دروازہ کھٹکھٹایا تو رحمتِ الٰہیہ نے کھول دیا۔ اب جو آدمی آخرت کے دروازے پر کھڑا ہوا سے دنیا کے ردّی آداب واَسالیب کا مکلّف کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اس لیے اگر تم لوگ مجھے آزاد کر دو، مجھے میرے شہر واپس بھیج دو اور مجھے میرے حقوق دے دو تو پھر مُجھ سے اپنے ان آداب کی پابندی کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہو۔

دوسرا مسئلہ: اہلِ دنیا کہتے ہیں: ہمارا ایک سرکاری محکمہ ہے جو ہمیں دین کے احکام اور اسلام کے حقائق کی تعلیم دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کس خصوصیت کی بنا پر دین کی نشر واشاعت کر رہے ہیں۔ اور آپ کے بارے میں جب جلاوطنی کا فیصلہ ہو چکا ہے تو پھر تو آپ کو ایسے معاملات کو ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے؟

الجواب: حق اور حقیقت محصور نہیں ہوتے تو پھر ایمان اور قرآن کو محصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ تم لوگ اپنی دنیا کے

اسالیب وقوانین کو تو محصور کر سکتے ہو، لیکن قرآنی بنیادوں کو کسی سرکاری صورت شکل میں دنیاوی معاملات میں منحصر نہیں کیا جا سکتا جہاں عمل اُجرت پر کیا جاتا ہے، بلکہ یہ اسرار و فیوضات عطیۂ خداوندی ہیں، یہ صرف اس صورت میں ملتے ہیں جب نیت خالص ہو اور دنیا اور حظوظِ نفس سے ہاتھ اُٹھالیا گیا ہو!

پھر یہ بھی ہے کہ میں جب اپنے علاقے میں تھا تو اس سرکاری محکمے نے مجھے اوقاف کا خطیب مقرر کیا تھا اور میں نے یہ ملازمت قبول کر لی تھی لیکن تنخواہ نہیں لیتا تھا۔ میری تعیناتی کا وہ آرڈر میرے پاس محفوظ ہے، اور میں اس آرڈر کی بنا پر جہاں چاہوں امامت وخطابت کی ڈیوٹی ادا کر سکتا ہوں، کیونکہ میری جلاوطنی بالکل ناجائز اور سراسر ناانصافی پر مبنی ہے۔

پھر چونکہ تمام دیس بدر کیے گئے لوگوں کو اُن کے علاقوں میں واپس بھیج دیا گیا ہے، اس لیے میری پرانی دستاویزات کا حکم بدستور باقی ہے اور وہ کارآمد ہیں۔

ثانیا: میں نے جتنے بھی ایمانی حقائق لکھے ہیں ان میں مخاطب براہِ راست اپنے نفس کو ہی کیا ہے اور ہر ایک کو ان پر عمل پیرا ہونے کی دعوت نہیں دی ہے، بلکہ جن کی روحیں محتاج ہیں اور جن کے دل زخمی ہیں وہ ان قرآنی دواؤں کو خود ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ البتہ اس میں صرف ایک بات کو استثناء حاصل ہے، اور وہ یہ کہ میں نے جدید رسمُ الخط کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے اپنی معیشت کا پہیہ رواں رکھنے کے لیے اپنے رسائل میں سے ''حشر'' نامی ایک رسالہ طبع کروایا تھا، میرے ساتھ پرخاش رکھنے والے سابقہ ظالم قسم کے گورنر کو اس کا پتا چلا تو اس نے اس کی جانچ پڑتال کروائی، لیکن جب اسے کوئی قابل اعتراض مواد نہ ملا تو درگزر کر گیا۔

تیسرا مسئلہ: اہلِ دنیا مجھے شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے میرے کچھ دوست بظاہر مجھ سے براءت و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں بلکہ مجھ پر تنقید بھی کرتے ہیں: تاکہ اہلِ دنیا انہیں اچھا سمجھیں اور وہ ان کی آنکھ کا تارا بنے رہیں۔ حالانکہ دنیا دار حیلہ گر اور سازشی لوگ ان کی مجھ سے براءت کا اظہار کرنے اور مجھ سے بچ کر رہنے والی اِس روش کو اپنے حق میں دوستی اور اخلاص نہیں سمجھتے، وہ ان لوگوں کو ریاکار اور بے ضمیر سمجھتے ہیں، اس لیے وہ انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

اور میں کہتا ہوں، اے میرے اُخروی بھائیو!

میری قرآنی خدمت سے بیزاری کا اظہار کر کے دُور مت بھاگو؛ کیونکہ تمہیں میری طرف سے - ان شاء اللہ - کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اور اگر کوئی مصیبت نازل ہو ہی گئی یا میرے ساتھ کوئی ظلم کا رویہ اختیار کیا گیا تو تم لوگ مجھ سے بیزاری کا اظہار کر کے بچ نہیں پاؤ گے، بلکہ اس صورت حال سے تو تم مصیبت اور تادیبی کارروائی کی لپیٹ میں اور زیادہ آجاؤ گے!

پھر بتاؤ تو سہی کہ آخر ہوا کیا ہے جس کی وجہ سے تم لوگ شکوک وشبہات واوہام کا شکار ہو گئے ہو؟

چوتھا مسئلہ: اپنی اس جلاوطنی کے دنوں میں۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض ریاکار لوگ جو سیاست کے کیچڑ میں گر چکے

ہیں، میری طرف ایسے دیکھتے ہیں کہ جیسے میں ان کا رقیب اور مدّ مخالف ہوں، گویا کہ میرا بھی ان کی طرح دنیا کے ان سیاسی دھاروں کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔

پس اے عزیزانِ گرامی! میں ایمان کے دھارے میں ہوں اور میرے مدّ مقابل الحاد کا دھارا ہے، اس لیے میرا دیگر جھمیلوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے ان لوگوں میں سے جو اُجرت پر کام کرتا ہے ہوسکتا ہے وہ اپنے آپ کو کسی حد تک معذور سمجھتا ہو۔ لیکن بغیر اُجرت کے اور حمیت کے نام پر میرے مقابلے کی پوزیشن بنائے رکھنا، اور مجھے ایذا دیتے رہنا اور پریشان کرتے رہنا یقیناً بہت بڑی غلطی ہے، کیونکہ میرا دنیا کی سیاست کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے جیسے کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے۔ میں نے تو اپنے تمام اوقات قرآنی اور ایمانی حقائق میں منحصر اور اپنی تمام زندگی انہیں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

بات اگر یہی ہے تو پھر میرا جو بھی مخالف مجھے تکلیف دے اور میرا نقصان کر رہا ہے، اُسے سوچنا چاہیے کہ اس کی یہ روش الحاد و زندیقیت کے نام پر ایمان کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

پانچواں مسئلہ: دنیا جب فانی ہے اور عمر چھوٹی سی ہے، ضروری ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں اور ابدی زندگی خود اسی دنیا میں ہی کمائی جا سکتی ہے، اور دنیا کا کوئی مالک ضرور ہے، دنیا کے اس مہمان خانے کا کوئی بہت کریم و حکیم مدبّر ہے، نیکی اور بدی کا بدل بہر کیف ملتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کی رُو سے تکلیفِ مالا یُطاق کا وجود ہی نہیں ہے، نقصان نہ دینے والے راستے کو نقصان دہ رستے پر ترجیح دی جاتی ہے، اور احباب و مراتب صرف قبر کے دروازے تک ساتھ دیں گے؛ تو پھر سب سے زیادہ سعادت مند شخص وہ ہے جو دنیا کے لیے آخرت کو نہ بھلائے، دنیا کے لیے اپنی آخرت کو قربان نہ کرے اور دنیاوی زندگی کے لیے اپنی ابدی زندگی کو تباہ نہ کرے، اپنی عمر فضول اور بے کار چیزوں میں ضائع نہ کرے، خود کو ایک مہمان سمجھے اور اسی بنا پر صاحبِ خانہ کے اوامر کے مطابق عمل کرے، قبر کا دروازہ امن و سلامتی کے ساتھ کھول لے اور اس طرح ابدی سعادت میں داخل ہو جائے۔ (حاشیہ)

(حاشیہ) میں انہی مذکورہ مقدمات کے پیشِ نظر ان مظالم و شدائد کی کوئی پروا نہیں کرتا اور نہ انہیں کوئی اہمیت دیتا ہوں جو میری شخصیت پر روا رکھے جاتے ہیں اور میں کہتا ہوں: یہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ انہیں اہمیت دی جائے۔ لہٰذا میں دنیا کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ مؤلف۔

سولہویں مکتوب کی ذیلی بحث

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

دنیا کی اس متاعِ غرور کے دیوانوں کو یہ وہم ہو چکا ہے کہ اس دنیا میں میرے جیسا عاجز و درماندہ اجنبی آدمی ہزاروں آدمیوں کی قوت کا مالک ہے، اور اس وہم کے تحت وہ مجھے شدید ترین قید و بند میں جکڑے رکھتے ہیں، چنانچہ ان لوگوں نے مجھے بطور مثال ''بارلا'' کے کسی محلے میں بلکہ اس کے قریبی پہاڑوں میں بھی ایک آدھ رات گزارنے کی اجازت نہیں دی۔ اور انہیں یہ بات کہتے ہوئے تو آپ لوگ سن ہی چکے ہیں کہ: ''سعید پچاس ہزار آدمیوں کی طاقت رکھتا ہے، اس لیے ہم اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتے''۔

اور میں کہتا ہوں:

اے دنیا کے بدبخت طلب گارو! تم اس دنیا کے کاموں میں تو اپنی تمام تر قوت صرف کر لیتے ہو لیکن اس کے معاملات کا علم حاصل کیوں نہیں کرتے ہو؟ اور یوں پاگلوں کی طرح فیصلے کیوں صادر کرتے ہو؟

اگر تم لوگ میری اس فانی شخصیت سے خوفزدہ ہو تو یہ ایک بے بنیاد خوف ہے جس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچاس ہزار ہی ضروری نہیں بلکہ کوئی بھی انسان میرے کام سے پچاس مرتبہ دگنا کام کر سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو کر یہ تو کہہ سکتا ہے کہ: ''تجھے باہر آنے کی اجازت نہیں ہے۔'' اور معاملہ ختم ہو جائے گا!

لیکن اگر تم لوگ میرے پیشے سے یعنی دعوت الی القرآن سے اور میری ایمانی قوّت کے ہتھیار سے خوفزدہ ہو تو پھر اچھی طرح جان لو کہ میں پچاس آدمیوں کی قوّت کا مالک نہیں ہوں۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ تم لوگ اس بات میں سخت غلطی پر ہو۔

میں ایمان کے فضل سے اور اپنے پیشے کی رُو سے پچاس ملین آدمیوں کی طاقت رکھتا ہوں۔ میں تمام یورپ کو تمہارے تمام ملحدوں سمیت چیلنج دیتا ہوں۔ میں ان کے ان تمام محفوظ قلعوں میں گھس چکا ہوں جنہیں وہ طبیعی یا سائنسی علوم کہتے ہیں، ہر ممنوعہ رکن کی اور کونے زاویے کی ڈھونڈ بھال کر چکا ہوں۔ اور ان کے تمام محفوظ ترین خفیہ خانوں کے پر دے چاک کر چکا ہوں۔

یہ سب کچھ ان بے پناہ ایمانی حقائق اور قرآنی دلائل و براہین کو نشر کرنے کے طفیل ممکن ہوا جن کی برکت سے میں نے

یورپ کے بڑے سے بڑے فلسفیوں کو چوپایوں سے بھی سو درجے نیچے درجے تک اُتار دیا۔ اب اگر تمہارے ان ملحدوں سمیت تمام کا تمام یورپ بھی اکٹھا ہو جائے تو میرے اس پیشے کے مسائل میں سے ایک مسئلے کے مقابلے میں بھی اللہ کی توفیق سے نہ تو ٹھہر سکیں گے اور نہ مجھے مغلوب کر سکیں گے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ: جس طرح میں تمہارے دنیاوی کاموں میں دخل اندازی نہیں کرتا، تمہیں بھی میرے اُخروی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔۔۔ اور ایسا کریں بھی نہ! لیکن اگر تم لوگ عقل کے دشمن بن کر میرے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہی رہے، تو پھر یقینی طور پر یاد رکھو کہ تمہیں اس سے کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں ہے اور تمہاری تمام تگ و دو بیکار جانے والی ہے۔

زورِ بازو سے کوئی تقدیر کو ردّ کیا کرے
وہ شمع بجھتی نہیں روشن جسے خدا کرے

اہلِ دنیا کے میرے اردگرد گھومنے والے شکوک و شبہات بڑے خاص قسم کے ہیں، ایسے لگتا ہے کہ وہ میری طرف سے خوف زدہ سے رہتے ہیں؛ کیونکہ وہ میرے بارے میں ایسے ایسے اُمور خیال میں لاتے رہتے ہیں جن کا میرے ہاں وجود ہی نہیں ہے، اور اگر ان کا وجود ہو بھی تو وہ نہ تو سیاسی غلطی کا باعث ہیں اور نہ ہی ان کی وجہ سے مجھ پر کوئی سیاسی تہمت لگ سکتی ہے، جیسے مشیخت، عظمت، ریاست، خاندان، حسب و نسب، اثر و نفوذ، پیروکاروں کی کثرت، اہلِ وطن کے ساتھ میل ملاقات، سیاست میں دخل اندازی، حتیٰ کہ حکومت مخالف سیاست وغیرہ۔۔۔ چنانچہ وہ اس حد تک اَوہام کا شکار ہو گئے ہیں کہ انہوں نے جب جیل والے اور جیل کے باہر والے ملزموں کو معافی دینے کے بارے میں بات چیت کی تو مجھے ہر چیز سے محروم کر دیا، یعنی مجھے ان لوگوں میں شمار کیا جو ان کی نظر میں معاف کر دینے کے قابل نہیں تھے۔

ایک ناپائیدار و بدکردار قسم کے انسان کا پائیدار اور خوبصورت سا کلام ہے: ظلم اگر توپ، گولے اور قلعے کا مالک ہے تو حق کے پاس ایک ایسی مضبوط کلائی ہے جو مُڑتی نہیں اور ایسا چہرہ ہے جو پھرتا نہیں' اور میں کہتا ہوں:

'اہلِ دنیا اگر حکومت اور قوّت و شوکت کے مالک ہیں، تو قرآن کے خادم کے پاس قرآن کے فیضان کی برکت سے اس کا وہ علم ہے جو غلطی نہیں کھاتا، اس کا وہ کلام ہے جو خاموش نہیں ہوتا، اس کا وہ دل ہے جو دھوکا نہیں کھاتا اور اس کا وہ نور ہے جو بجھتا نہیں''۔

میری حفاظت پر مامور پولیس افسر سمیت بہت سے احباب نے مجھ سے بارہا دفعہ پوچھا ہے کہ: آپ حکومت سے آزادی کا پروانہ یا اجازت نامہ کیوں نہیں لیتے اور اس کے لیے درخواست کیوں نہیں دیتے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: میں نہ اس کا مطالبہ کرتا ہوں اور نہ کر سکتا ہوں؛ اور اس کے پانچ چھ اسباب ہیں:

پہلا سبب: میں نے ان کی دنیا کے ساتھ اختلاط رکھا ہی نہیں ہے کہ تقدیرِ الٰہی کا محکوم ہوں؛ کیونکہ میری کمیوں کوتاہیوں کے پیشِ نظر میرے متعلق جو بھی فیصلہ کیا ہے تقدیر نے کیا ہے، اس لیے میں مطالبہ بھی اُسی سے ہی کروں گا۔

دوسرا سبب: مجھے اس بات کا یقینی علم ہے اور اس پر میرا مکمل ایمان ہے کہ یہ دنیا ایک مہمان خانہ ہے جس میں تیزی کے ساتھ تبدیلی آتی جاتی ہے، اس لیے یہ حقیقی وطن نہیں ہے۔

اور اس میں تمام جگہیں برابر ہیں، لہٰذا اگر میں ہمیشہ اپنے وطن میں نہ رہا تو پھر اس کے پیچھے پیچھے عبث بھاگے پھرنا اور اس کی طرف دوبارہ لوٹ کر جانے کی کوشش میں لگے رہنا بالکل بے کار ہے۔ اور جب اس کی ہر جگہ مہمان سرائے کی حیثیت رکھتی ہے، تو اگر اس کے مالک کی رحمت دوست ہے تو پھر ہر چیز دوست ہے، اور ہر جگہ مفید ہے۔ لیکن اگر اس کی رحمت دوست نہیں تو پھر ہر جگہ دل پر بوجھ اور ہر انسان دشمن ہے۔

تیسرا سبب: حکومت سے کسی بات کا مطالبہ کرنا قانون کے دائرے میں ہوتا ہے، اور اِدھر صورتِ حال یہ ہے کہ میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ بالکل ہوا و ہوس کے مطابق اور ماورائے قانون ہے، میرے ساتھ ان چھ سالوں میں جلاوطن کیے گئے لوگوں والے قانون کے مطابق سلوک نہیں کیا گیا ہے۔ اور مجھے ہمیشہ ہی ایسے دیکھا گیا ہے جیسے تمام تمدّنی حقوق سے بلکہ تمام دنیاوی حقوق سے محروم انسان کو دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے ان حالات میں اُن لوگوں سے قانون کے ذریعے مطالبہ کیسے کیا جا سکتا ہے جو میرے ساتھ یہ غیر قانونی سلوک کر رہے ہیں۔

چوتھا سبب: اس علاقے کے ڈائریکٹر نے اس سال حکومت سے میری طرف سے مطالبہ کیا کہ مجھے آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے ''بدرہ'' نامی ایک بستی میں اقامت اختیار کرنے کی اجازت دے دی جائے جو کہ ''بارلا'' سے اس حد تک قریب ہے کہ اس کا ایک مُحلّہ ہی بن چکی ہے، لیکن حکومت نے اجازت نہ دی۔ تو اب یہ لوگ جنھوں نے اس طرح کی ایک معمولی سی ضرورت پوری کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے، اُن سے مراجعت کیسے کی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگوں سے مراجعت ایک بے فائدہ قسم کی لذلت اور توہینِ ذات ہے۔

پانچواں سبب: جو حق کے بارے میں یہ دعوے کرتا ہے کہ یہ باطل ہے ایسے آدمی کے سامنے حق کا دعویٰ کرنا اور حق کا مطالبہ کرنا ایک باطل کام اور حق کے لیے سوءِ ادب کا حکم رکھتا ہے، اور میں اس باطل کا اور حق کے سامنے اس سوءِ ادب کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا۔ والسلام۔

چھٹا سبب: اہلِ دنیا میرے حق میں جس سختی کا مظاہرہ کر رہے ہیں وہ اس لیے نہیں ہے کہ میں سیاست میں ملوّث ہوں؛ کیونکہ وہ لوگ بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں سیاست میں دلچسپی نہیں لیتا ہوں اور اس سے دُور بھاگتا ہوں، بلکہ وہ مجھے مبتلائے عذاب۔ شعوری یا لاشعوری طور پر۔ الحاد و زندیقیت کو خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں، صرف اس

بنا پر کہ میں نے دین کا دامن مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔ اس لیے اس صورتِ حال میں ان سے کوئی مطالبہ کرنا یا انہیں درخواست دینا دینی جذبے پر ندامت کا اظہار کرنے اور زندیقیت کے مسلک کو اچھا سمجھنے کے مترادف ہوگا!

پھر یہ بھی ہے کہ میں جب بھی ان کی طرف رجوع کرتا ہوں اور ان سے کوئی مطالبہ کرتا ہوں یا اُن سے کوئی التجا کرتا ہوں تو عدل پرور تقدیرِ الٰہی مجھے ان کے ظالم ہاتھوں کے ذریعے سزا دے دیتی ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تو مجھ پر دین پر مضبوطی سے قائم رہنے کی وجہ سے سختیاں کرتے ہیں، اور تقدیر مجھ پر دین اور اخلاص کے بارے میں کمی کرنے کی وجہ سے اور بسا اوقات اہلِ دنیا کی خاطر ریا کاری سے کام لینے کی وجہ سے سختی کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرِ دست میرے لیے اس سختی سے نجات پانا بہت مشکل ہے! چنانچہ اگر میں اہلِ دنیا سے مراجعت کروں گا تو تقدیر کہے گی اے ریا کار! اس مراجعت کا مزا چکھ! اور اگر میں ان سے مراجعت نہ کروں تو وہ کہیں گے: تو ہمارے ساتھ جان پہچان نہیں رکھتا اور ہماری بات نہیں مانتا ہے نا، اس لیے اب سختیوں کا سامنا کرتا رہ!

ساتواں سبب: یہ بات سب جانتے ہیں کہ ایک سرکاری آفیسر کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ سماج دشمن لوگوں کا ہاتھ روکے اور ان کی لگام ڈھیلی نہ ہونے دے، اور معاشرے کے لیے سُودمند عناصر کے ساتھ تعاون کرے۔ اور اِدھر صورتِ حال یہ بنی ہے کہ سرکاری افسر جو میری نگرانی پر مأمور ہے، میرے پاس اس وقت آیا جب کہ میں ایک قبر کے کنارے پہنچے ہوئے بوڑھے مہمان کے لیے کلمہ طیبہ "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ" کے ایمانی ذوق وشوق کی وضاحت کر رہا تھا، اور وہ عین اُسی وقت ایسے انداز سے آیا کہ جیسے مجھے کسی جرم میں رنگے ہاتھوں گرفتار کرنا چاہتا ہو! حالانکہ ایک عرصہ گزر گیا ہے کہ اُس نے ادھر کا کبھی چکر نہیں لگایا۔ اس نے مجھے ایسا محسوس کروایا کہ جیسے میں کسی بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ چنانچہ اپنے اس انداز سے اُس نے اس بوڑھے مسکین کو محروم کر دیا جو میری باتیں بڑے اخلاص سے سن رہا تھا اور میرا غضب بڑھکا دیا۔ اور دوسری طرف یہاں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی اُس افسر کو کوئی پرواہ نہیں تھی، وہ لوگ جب بیہودگیوں کا ارتکاب کرنے لگے اور بستی کی معاشرتی زندگی میں زہر گھولنے لگے تو وہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے لگ گیا اور انہیں اپنی نظرِ عنایت سے دیکھنے لگا:

اسی طرح یہ بات بھی سب لوگ جانتے ہیں کہ جو آدمی جیل میں ہو وہ اگرچہ ایک سو جرائم کا ارتکاب کیوں نہ کر چکا ہو، وہ اپنی نگرانی پر مامور ملازم - وہ افسر ہو یا عام سپاہی - کے ساتھ کسی بھی وقت بات چیت کرنے کا حق رکھتا ہے اور ملازم کا بھی حق ہے کہ ہر وقت ملزم کے ساتھ رہے، لیکن ادھر صورتِ حال یہ ہے کہ قومی حکومت کے دو معتبر قسم کے ملازم جو میری نگرانی پر مأمور ہیں کئی دفعہ میرے کمرے کے پاس سے گزرے لیکن ایک سال ہونے کو ہے، وہ قطعاً نہ تو کبھی میرے پاس آئے ہیں، اور نہ ہی انہوں نے کبھی میرا حال پوچھا ہے۔ شروع شروع میں تو میرا خیال یہ تھا کہ وہ دشمنی کی وجہ سے میرے قریب نہیں پھٹکتے ہیں، لیکن پھر یہ کُھلا کہ وہ اپنے شکوک واوہام کی وجہ سے مجھ سے دور بھاگتے ہیں کہ گویا اگر وہ میرے قریب

ہوئے تو میں انہیں نگل جاؤں گا۔

اس بنا پر یہ بات عقل مندی کی نہیں ہوگی کہ انسان ایسی حکومت کا اعتراف کر لے اور اس سے مراجعت کرے جس کے ڈیوٹی پر مأمور ملازم ان لوگوں جیسے ہوں جن کے ساتھ میرا پالا پڑا ہوا ہے۔

اگر "قدیم سعید" موجود ہوتا تو عنترہ کی طرح کہتا:

مَـــاءُ الْـــحَـيَـــاةِ بِـذِلَّةٍ كَـجَـهَـنَّـمَ

وَجَـهَـنَّـمُ بِـــالْـعِـزِّ فَـخْـرُ مَـنْـزِلِـيْ

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ "قدیم سعید" اب نہیں ہے۔ رہا "جدید سعید" تو وہ اہلِ دنیا کے ساتھ بات کرنا بالکل بے معنی سمجھتا ہے اور یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ:

"تباہ ہو جائے اِن کی یہ دنیا! یہ جو بھی فیصلے کر رہے ہیں کر لیں۔ ہم عنقریب ان کا مقدمہ عدالتِ عظمیٰ میں لے کر جائیں گے"۔

میرا عدمِ مراجعت کا آٹھواں سبب:

میں جن نا اہل دنیا داروں کی نا اہلی کے بارے میں جانتے بوجھتے ہوئے اُن کی طرف جھک جاتا ہوں، عدل پرور تقدیرِ الٰہی مجھے انہی کے ہاتھوں سے سزا دیتی ہے، اور تقدیرِ الٰہی مجھے ان کے ظالم ہاتھوں کے ذریعے یہ سزا اس قاعدے کے تحت دیتی ہے:

"ناجائز محبت کا نتیجہ ظالم دشمنی ہے"

اور میں یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ میں اس سزا کا مستحق ہوں، اور چپ ہوں۔ میرے اس طرح خاموش ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے پہلی جنگِ عظیم میں ایک رضا کار دستے کی کمانڈ کرتے ہوئے دو سال تک جنگ کی اور کمانڈر انچیف "انور پاشا" کی کمانڈ میں اپنے قیمتی دوستوں اور طالب علموں کی قربانی دی۔ اس جنگ میں میں زخمی ہوا اور دشمنوں کے ہاتھ لگ کر قید ہو گیا۔ قید سے واپس آیا تو اپنی "خطوات ستہ" جیسی اُن کتابوں کی وجہ سے خود کو ہلاکت میں ڈال بیٹھا، جن کے ذریعے میں نے انگریزوں کو عین اس وقت للکارا جب انہوں نے استنبول پر قبضہ کیا تھا، اور اس طرح میں نے ان لوگوں کی مدد کی تھی جنہوں نے اب بغیر کسی وجہ کے مجھے قید با مشقت سے دو چار کیا ہے یعنی میرے یہ نادان دوست میرے اُس تعاون کی سزا مجھے اِس صورت میں دے رہے ہیں!

میرے ان دوستوں نے مجھ پر صرف تین مہینوں میں اتنی سختی اور اتنی مشقت کی ہے کہ روس میں اتنی تین سال میں بھی نہیں ہوئی تھی!

پھر روس کی نظر میں میں ایک غدار آدمی تھا جس نے ''گر دوں'' کے رضا کارانہ دستوں کی قیادت کر کے بہت سے قازقیوں اور قیدیوں کو ذبح کر ڈالا تھا۔لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے مجھے درس وتدریس سے منع نہیں کیا، چنانچہ میں اپنے دوستوں میں سے نوے قیدی افسروں کے ہمراہ اپنے اکثر شاگردوں کو درس دیا کرتا تھا، اور روس نے مجھے اس سے روکا نہیں تھا۔ایک دفعہ میں جب درس دے رہا تھا، روسی کمانڈر کا ادھر سے گزر ہوا اور اُس نے میرے اس درس کو کوئی سیاسی پروپیگنڈا سمجھ لیا، کیونکہ وہ ترکی زبان نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے ایک دفعہ تو منع کر دیا لیکن پھر اجازت دے دی۔ اسی طرح ہم نے اسی چھاؤنی میں ایک کمرے کو مسجد بنالیا تھا اور وہاں یہ لوگ میری امامت میں با جماعت نماز پڑھا کرتے تھے۔روسیوں نے میرے اس کام میں بھی مداخلت نہ کی، مجھے میل جول سے بھی منع نہ کیا اور خط وکتابت سے بھی نہ روکا۔

جبکہ یہ لوگ جن کے بارے میں یہ فرض کیا جاتا ہے یہ میرے دینی اور وطنی بھائی ہیں، یہ لوگ بغیر وجہ کے مجھے درس دینے سے منع کر رہے ہیں، حالانکہ میں انہیں ایمان کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ بات جانتے ہیں کہ میں دنیا اور سیاست سے تعلقات منقطع کر چکا ہوں۔اور یہ لوگ جنہیں میں ایمان کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہوں، انہوں نے مجھے تین نہیں بلکہ چھ سال سخت ترین قید میں رکھا ہے؛ کیونکہ اس دوران انہوں نے مجھے لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے سے روک دیا اور مجھے درس سے بھی روک دیا حالانکہ میرے پاس اس کا اجازت نامہ بھی موجود تھا، حتیٰ کہ مجھے اس خاص درس سے بھی روک دیا جو میں اپنے کمرے میں دیا کرتا تھا۔اور خط وکتابت کے راستے بھی بند کر دیے۔اور سند واجازت نامہ ہونے کے باوجود مجھے میری اس مسجد سے بھی روک دیا جو میں نے خود تعمیر کی تھی اور جس میں میں نے چار سال امامت کرائی تھی، اور اس طرح مجھے جماعت کے ثواب سے محروم کر دیا۔ بلکہ مجھے اپنے تین خصوصی اُخروی بھائیوں کی جماعت کرانے سے بھی روک دیا جن کی جماعت میں ہمیشہ کرایا کرتا تھا: اور اس پر مزید یہ کہ اگر کوئی آدمی میرے نہ چاہنے کے باوجود میرے بارے میں کوئی کلمۂ خیر کہہ دیتا تو میری نگرانی پر مأمور ملازم غضبناک ہو جاتا اور حسد سے جل بھن جاتا اور یہ کہتا ہوا بے سروپا قسم کے دلائل مہیا کرنا شروع کر دیتا ہے کہ: میں اس کا اثر ونفوذ توڑنا چاہتا ہوں۔اور اُولی الامر کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مجھ پر مزید سختیاں کرتا ہے اور مجھے تنگ کرتا ہے۔اب جس کی یہ حالت ہو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کس طرف رجوع کرے؟ اور جب خود حاکم ہی مدّعی ہو تو اس کے پاس شکایت لے کر نہیں جایا جاتا۔اب میں معاملہ آپ پر چھوڑتا ہوں، آپ ان حالات میں جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ: میرے ان دوستوں کے درمیان بہت سے منافق موجود ہیں، اور منافق چونکہ کافر سے زیادہ سخت ہوتا ہے، اس لیے یہ لوگ مجھے وہ سزائیں دے رہے ہیں جو ''روس'' کے کفار نے بھی نہیں دیں!

ارے بدبختو! میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے اور کر بھی کیا سکوں گا! میں تو یہ خدمت تمہارے ایمان کو بچانے اور

تمہاری آخرت کی سعادت مندی کے لیے سرانجام دے رہا ہوں۔ لیکن نتیجہ چونکہ خلاف اُمید برآمد ہو رہا ہے اس لیے لگتا ہے کہ میری یہ خدمت خالص لوجہِ اللہ نہیں ہے جس کی بنا پر تم لوگوں کو جب بھی فرصت ملتی ہے مجھے اس کے بدلے میں سزا دیتے ہو۔ پس اب بلاشبہ ہم اپنا مقدمہ عدالتِ عظمیٰ میں لے کر جائیں گے۔۔۔

اور میں کہتا ہوں:

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ﴾

الباقی ھوالباقی

سعید نورسی

سترھواں مکتوب

بچوں کی تعزیت کے بارے میں یہ پچیسویں لمعے کی ذیلی بحث ہے

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

میرے عزیز اُخروی بھائی! حافظ خالد آفندی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾

میرے بھائی! بچے کی وفات نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا ہے اور مجھے اس کا بہت دکھ ہوا ہے۔ لیکن الحکم للہ۔ پس اس کے فیصلے پر تسلیم ورضا کا شیوہ ہی اسلام کا شعار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو آپ کے لیے سفارشی اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔

ذیل میں ہم پانچ نقطے بیان کر رہے ہیں جو آپ کے لیے اور آپ جیسے تقوی شعار اہلِ ایمان کے لیے خوشخبری اور حقیقی تسلی کا باعث بنیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی ﴿وِلْدَانٌ مُخَلَّدُوْنَ﴾ میں پایا جانے والا راز اور اس کی مثال یہ ہے کہ:

اہلِ ایمان کی اولاد میں سے جو بچے بلوغت کو پہنچنے سے پہلے مر جاتے ہیں وہ جنت میں، جنت کے شایانِ شان طریقے سے ہمیشہ رہنے والے دائمی محبوب بچے بن کر رہیں گے۔ اور اپنے جنت میں داخل ہونے والے والدین کی گودوں میں انہیں خوش رکھنے کا ابدی وسیلہ بن جائیں گے اور والدین کے اُس لطیف ترین ذوق کا سبب بن جائیں گے، اور وہ ذوق ہے والدین کا بچوں کے ساتھ لاڈ پیار۔

اور یہ آیت کریمہ ﴿وِلْدَانٌ مُخَلَّدُوْنَ﴾ کے جملے کے ذریعے اشارہ کرتی اور خوشخبری دیتی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنت میں اولاد کی محبت اور ان کے ساتھ لاڈ پیار کے علاوہ ہر لذیذ شئے موجود ہے؛ کیونکہ جنت میں تناسل کا سلسلہ نہیں ہوگا؛ ان کی یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اور یہ کہ اہلِ ایمان کی سعادت مندی کا سب سے بڑا وسیلہ اس دنیا میں آلام و مصائب میں آلودہ دس سال کی تھوڑی سی مدت میں بچوں کی محبت اور ان کے لاڈ پیار کے مقابلے میں ہمیشہ رہنے والے بچوں کی اس محبت کو اور اس لاڈ پیار کو حاصل کرنا ہے جس میں کسی بھی طرح کے دکھ درد کی آلودگی نہیں ہوگی اور جو لاکھوں

سال تک کے لیے ہوگا۔

دوسرا نقطہ: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی معزز آدمی کو جیل ہوگئی۔۔۔ پھر کچھ دیر بعد اس کے محبوب بیٹے کو اس کے پاس جیل میں بھیج دیا گیا۔ اب وہ مسکین قیدی اپنی ذاتی مصیبتیں تو سہتا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ زیادہ دکھ اُسے اس بات کا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی تکلیفیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن اُن کا مداوا کرنے سے عاجز اور اُسے راحت پہنچانے سے قاصر تھا۔

ایک دن ایسے ہوا کہ حکمرانِ مہربان نے اس کے پاس ایک آدمی بھیجا۔ اس آدمی نے آ کر اُسے کہا: حاکم کا کہنا ہے کہ یہ بچہ اگرچہ آپ کا بیٹا ہے، لیکن یہ میری قوم اور میری رعایا سے ہے، اس لیے اسے میں آپ سے لے رہا ہوں اور اس کی اپنے خوبصورت محل میں تربیت کروں گا۔ تو وہ آدمی رونا پیٹنا شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے: میرا بیٹا جو کہ میری تسلی کا باعث ہے وہ میں حاکم کو ہرگز نہیں دوں گا۔ لیکن اس کے ہمراہی اس سے کہنے لگے: تمہاری یہ پریشانی بے معنی ہے۔ کیونکہ اگر تمہاری پریشانی اپنے بچے کی وجہ سے ہے تو وہ اس گندے، تاریک اور دکھ دینے والے قید خانے سے نکل کر ایک عالی شان محل میں جا رہا ہے جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور جہاں سعادتمندی کا راج ہے! اور اگر تمہاری یہ پریشانی خود اپنی وجہ سے ہے، اور تمہارے پیشِ نظر صرف اپنی مصلحت ہی ہے، تو یاد رکھو کہ اگر بچہ تمہارے پاس رہا تو یہ بچہ بہت سے دکھ درد اُٹھائے گا اور تنگیوں کا سامنا کرے گا، اور اس کے مقابلے تمہیں جو سکھ ملے گا وہ انتہائی محدود، مشکوک اور وقتی سا ہوگا۔ لیکن اگر بچہ وہاں چلا گیا تو تمہیں اس کے ہزاروں فائدے حاصل ہوں گے؛ کیونکہ یہ تمہارے لیے بادشاہ کی مہر و محبت کو کھینچنے کا سبب بنے گا اور تمہارے لیے ایک قسم کا سفارشی بن جائے گا!

پھر یہ ہے کہ بادشاہ بچے کی تمہارے ساتھ ملاقات بھی کرواتا رہے گا، اور یہ تو ظاہر ہے کہ وہ ملاقات کے لیے بچے کو جیل میں نہیں بھیجے گا بلکہ تمہیں جیل سے نکال کر وہاں محل میں لے جائے گا بشرطیکہ تم حاکم پر بھروسا کرو اور اُس کے مطیع رہو۔۔۔

میرے عزیز بھائی! آپ جیسے اہلِ ایمان جن کے بچے فوت ہو جاتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے حالات میں اس انداز سے سوچیں کہ:

یہ بچہ بالکل معصوم ہے، اور اس کا خالق رحیم و کریم ہے، اس لیے وہ اسے میری ناقص شفقت اور تربیت کے بدلے میں اپنی کامل رحمت اور عنایت کے سائے میں لے گیا ہے۔ اور اس نے اُسے دنیا کے اِس مصیبتوں، مشقتوں، کلفتوں اور کدورتوں سے اَٹے ہوئے قید خانے سے نکال کر اپنی جنت الفردوس کی طرف بھیج دیا ہے۔ پس کتنا خوش نصیب ہے یہ بچہ! اور کون جانتا ہے کہ اگر وہ بچ جاتا اور دنیا میں رہتا تو کیا کرتا؟ اس لیے میں اس کے جانے پر دکھی نہیں ہوں اور اُسے

نیک بخت سمجھتا ہوں!

رہا میرا اپنی ذات کے لیے دُکھی ہونا، تو اس کے جانے پر جو فائدے مجھے حاصل ہونے والے ہیں، ان کے پیشِ نظر میں بہت زیادہ دُکھ کا اظہار نہیں کر رہا ہوں؛ کیونکہ اگر وہ دنیا میں باقی رہتا تو کم وبیش دس سال کی محدود سی مدت کے لیے مجھے وہ محبت دے دیتا جو ایک بچہ اپنے باپ کو دیتا ہے، لیکن اُس محبت میں بھی دُکھ درد کی آمیزش ہوتی! پھر اگر وہ نیک اور دنیاوی کاموں میں طاقت وَر ہوتا، تو ممکن ہے کہ اُمورِ دنیا میں میرا ہاتھ بٹاتا!

لیکن اب اپنی وفات کی وجہ سے وہ میرا ایک قسم کا سفارشی بن جائے گا، ابدی سعادت میں داخل ہونے کے لیے وسیلہ بنے گا، اور ابدی جنّت میں دس ملین سال کے لیے بیٹے کی طرف سے ملنے والی محبت کا سبب بنے گا۔

بلا شبہ جو آدمی جلد حاصل ہو جانے والے مشکوک نفع سے محروم ہو جائے اور اس کے بدلے میں دیر سے لیکن بہر صورت اور لازمی طور پر حاصل ہو جانے والے نفع سے ہمکنار ہو جائے، تو وہ دردناک قسم کی آہ وفغاں نہیں کرے گا اور نا اُمید ہو کر فریاد نہیں کرے گا۔

تیسرا نقطہ: فوت ہو جانے والا بچہ خالقِ رحیم کی مخلوق، اس کا مملوک، اس کا غلام، اس کی صنعت کا شاہکار اور اپنی مجموعی ہیئت کے ساتھ اُسی کا تھا۔ اور وہ اپنے ان تمام اوصاف کے ساتھ اپنے والدین کا دوست تھا جسے وقتی طور پر ان کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا اور والدین کو اس کا خادم بنا دیا گیا تھا۔ اور والدین کو اس کی خدمت کرنے کے بدلے میں نقد قسم کی اُجرت دینے کے لیے ایک شفقت بھری لذت عطا کر دی گئی تھی۔

اور اب جبکہ اُس خالق رحیم نے۔ جس کے اس بچے میں ہزار میں سے نو سو ننانوے حصے ہیں اور اس کے باپ کا ایک ہی حصہ ہے۔ رحمت اور حکمت کے تقاضے کے تحت تمہارے ہاتھوں سے لے لیا ہے اور تمہیں تمہاری خدمات سے سبکدوش کر دیا ہے؛ تو اہلِ ایمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ نا اُمید ہو کر اس انداز سے غم کریں اور آہ وفغاں پر اُتر آئیں کہ جس سے اِس ایک ظاہری حصے کے مقابلے میں ایک ہزار حقیقی حصے کے مالک کے خلاف شکوہ کرنے کا اشارہ ملتا ہو، یہ کام تو صرف گمراہ اور غافل لوگوں کو ہی زیب دیتا ہے۔

چوتھا نقطہ: دنیا اگر ہمیشہ رہنے والی ہوتی، اور انسان بھی اس میں ہمیشہ رہنے والا ہوتا تو پھر تو اس نا امیدی سے لبریز افسوس اور دردناک رنج وغم کا کوئی مطلب ہوتا؛ لیکن دنیا چونکہ ایک مہمان خانہ ہے، اس لیے مرنے والا بچہ جہاں بھی گیا ہے ہم اور آپ **بھی** بہر کیف وہیں جانے والے ہیں۔

پھر یہ وفات صرف اسی بچے کے ساتھ ہی تو خاص نہیں ہے بلکہ یہ تو وہ راستہ ہے جس پر سب چلتے جا رہے ہیں۔

پھر فراق بھی چونکہ ابدی نہیں ہے، بلکہ آئندہ دنوں میں برزخ اور جنّت میں ملاقات ہونے ہی والی ہے؛ اس لیے

ہمیں یہ کہنا چاہیے: فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ کا ہے۔۔۔صرف اللہ کا ہے جو اس نے لیا اور جو دیا ہے اور ہر حال میں الحمد للہ کہتے ہوئے صبر و شکر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

پانچواں نقطہ: شفقت جو کہ رحمتِ الٰہیہ کے لطیف ترین جلووں میں سے ایک نمایاں ترین، خوبصورت ترین، پاکیزہ ترین اور شیریں ترین جلوہ ہے؛ ایک نورانی اکسیر ہے اور عشق سے کہیں زیادہ تیر بہدف اور پُر تاثیر ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا تیز ترین وسیلہ ہے؛ تو جس طرح دنیاوی اور مجازی عشق بہت سی مشکلات سے گزر کر عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اللہ کو پا لیتا ہے، اسی طرح شفقت دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ باندھ دیتی ہے لیکن مشکلات کے بغیر اور صاف ترین شکل میں اور مختصر ترین راستے کے ذریعے۔

ماں اور باپ دونوں ہی اپنے بچے کے ساتھ اتنی محبت کرتے ہیں کہ اُسے تقسیم کیا جائے تو ساری دنیا کو پوری آ جائے۔ لیکن جب ان کے ہاتھ سے ان کا بیٹا چھین لیا جاتا ہے تو اگر تو وہ سعادت مند اور حقیقی ایمان دار ہوں تو دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں اور مُنعمِ حقیقی کو اپنے سامنے پاتے ہیں اور کہتے ہیں: دنیا جب فانی ہے تو پھر اس کے ساتھ دل نہیں لگانا چاہیے، اور یُوں وہ جہاں اس کا بیٹا گیا ہوتا ہے اُسی جگہ کے ساتھ اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور ایک بلند ترین معنوی حالت حاصل کر لیتا ہے۔

ان پانچ حقائق میں جو سعادت اور خوشخبری پائی جاتی ہے، اہلِ غفلت و ضلالت اس سے محروم ہیں۔ اور ان کی دردناک حالت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ: ایک بوڑھی ماں جب اپنے محبوب بیٹے کو سکرات کی حالت میں تڑپتا ہوا دیکھتی ہے تو وہ غفلت یا گمراہی کے نتیجے میں اس وہم میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ ہم نے اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے، اسی بنا پر موت کو عدم اور ابدی فراق تصور کرتے ہوئے اس کے ذہن میں نرم و گداز بچھونوں کی بجائے قبر کی مٹی گھوم جاتی ہے۔

اور اب چونکہ غفلت یا گمراہی اُسے اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ کی رحمت کی جنّت اور اس کی نعمت کی فردوس نظر نہیں آنے دیتی، چنانچہ اس بنا پر وہ نا اُمیدی سے بھرے ہوئے رنج و غم سے کس حد تک دوچار ہو سکتی ہے، اس کا تصور آپ خود کر سکتے ہیں۔

لیکن ایمان اور اسلام جو کہ سعادتِ دارین کا وسیلہ ہیں، دونوں ہی مومن آدمی سے کہتے ہیں: تمہارا یہ بیٹا جو نزع کے عالم میں سکرات کی حالت سے دوچار ہے، اس کا خالقِ رحیم عنقریب اسے اِس بدنما دنیا سے نکال کر جنّت کی طرف لے جائے گا اور اسے تمہارے لیے شفاعت کنندہ اور ابدی بیٹا بنا دے گا۔ اور غمگین و مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ یہ فراق بالکل عارضی سا ہے۔ اس لیے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہتے رہو کہ: "اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ۔۔۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

اٹھارھواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

[یہ مکتوب تین اہم مسائل پر مشتمل ہے]

پہلا اہم مسئلہ:

سوال: "الفتوحات المکیة" کے مصنف محی الدین ابن عربی قدس سرّہ اور "الانسان الکامل" کے مُصنف عبدالکریم الجیلی قدس سرّہ جیسے مشہور اولیائے کرام زمین کے سات طبقات کے بارے میں، کوہ قاف کے پیچھے پائی جانے والی سفید زمین اور "مشمشیہ" جیسے عجیب وغریب اُمور کے بارے میں بحث کرتے ہیں، جیسے کہ "فتوحات" میں ہے، اور کہتے ہیں کہ ہم نے یہ چیزیں دیکھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں کیا وہ حق ہے؟ اگر حق ہے تو زمین میں تو ایسی کوئی بھی جگہ نہیں پائی جاتی ہے، اور جغرافیا اور جدید سائنس یہ بات نہیں مانتے ہیں! اور اگر یہ بات حق نہیں ہے تو یہ لوگ اولیاء کیسے ہوگئے؟ اور جو اس طرح کی خلافِ واقعہ اور خلافِ حق باتیں کرتا ہے وہ اہلِ حقیقت میں سے کیسے ہوسکتا ہے؟

الجواب: یہ لوگ اہلِ حق و اہلِ حقیقت اور اصحابِ ولایت واصحابِ شہود ہیں۔ اور ان لوگوں نے جو کچھ دیکھا سچ دیکھا، بس اتنا ہے کہ جو کچھ ان لوگوں نے بتایا ہے اس میں غلطی واقع ہوگئی ہے؛ کیونکہ جو کچھ انہوں نے حالتِ شہود اور خواب جیسے احوال میں دیکھ کر فیصلہ کیا ہے، اس کی تعبیر کرتے وقت ان کے پاس فیصلے کا حق نہیں رہا، اس لیے یہ ایک طرح سے غلط ہے؛ کیونکہ شہود کی حالت حُدود وضوابط سے باہر ہے، اسی طرح ان کا دیکھنا جو کہ خواب کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، اس کی تعبیر کرتے وقت بھی ان کے پاس فیصلے کا حق نہیں رہا۔

جس طرح کوئی خواب دیکھنے والا انسان اپنے خواب کی تعبیر خود نہیں کرسکتا، اسی طرح اِس طرح کے اہلِ کشف وشہود لوگ اپنی شہود کی حالت میں دیکھی ہوئی چیز کی تعبیر نہیں کرسکتے۔ اس کی تعبیر صرف وراثتِ نبوت کے وہ محققین کرتے ہیں جنہیں "اصفیاء" کہا جاتا ہے۔ اس لیے اہلِ شہود میں سے اس طرح کے لوگ بھی جب "اصفیاء" کے مقام پر پہنچ جائیں گے تو بلاشبہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوجائے گا اور کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی غلطی کو صحیح کرلیں گے، اور وہ ایسا کرچکے ہیں۔

اِس تمثیلی کہانی کو غور سے سنیں جو اس حقیقت کی وضاحت کررہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو صاحب دل چرواہوں نے اپنی دوہنیوں میں دودھ دوہا اور ان دوہنیوں کو اپنے پاس ہی رکھ کر اس پر اپنی اپنی بنسریاں رکھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک نے کہا کہ مجھے تو نیند آ رہی ہے، اور وہ سو گیا اور کافی دیر تک سوتا رہا۔

دوسرا آدمی جاگتا رہا اور اپنے ساتھی کی نگرانی کرتا رہا۔ تب اچانک اس نے دیکھا کہ سونے والے کی ناک سے مکھی جیسا ایک کیڑا سا نکل کر پہلے دودھ کی دوہنی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بنسری میں داخل ہو کر اس کی دوسری طرف سے نکل گیا اور پھر قریب ہی ایک خاردار جھاڑی کے چھوٹے سے سوراخ میں داخل ہو کر نظروں سے غائب ہو گیا۔

پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ کیڑا سوراخ سے نکلا اور بنسری کے اندر سے گزرتا ہوا پھر سونے والے کے ناک میں داخل ہو گیا۔ تب وہ بیدار ہو گیا اور کہنے لگا: اے دوست! میں نے ایک بڑا عجیب وغریب خواب دیکھا ہے۔ اس کے دوست نے کہا: اللہ خیر کرے! کیا دیکھا ہے آپ نے؟ وہ بولا: میں نے دیکھا کہ دودھ کا ایک سمندر ہے جس پر ایک عجیب و غریب قسم کا پُل بنا ہوا ہے، وہ پُل مسقّف ہے اور اس میں جا بجا کھڑکیاں اور روشن دان بنے ہوئے ہیں۔ میں اس پل پر سے گزر کر دوسری طرف چلا گیا وہاں میں نے بانسوں کا ایک جُھنڈ دیکھا جس کے سرے بہت تیز تھے۔ اس جُھنڈ کے نیچے میں نے ایک بہت بڑا غار دیکھا۔ میں اُس غار میں داخل ہو گیا۔ وہاں میں نے سونے سے بھرا ہوا ایک خزانہ دیکھا۔ اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟

تو اُس کے جاگتے رہنے والے ساتھی نے کہا: آپ نے جو دودھ کا سمندر دیکھا ہے، وہ یہ دوہنی ہے۔ وہ پُل ہماری یہ بنسری ہے۔ وہ تیز سروں والے بانسوں کا جُھنڈ یہ خاردار جھاڑی ہے۔ اور وہ غار یہ چھوٹا سا سوراخ ہے۔ اب پھاوڑا لاؤ تا کہ میں تجھے وہ خزانہ دکھاؤں۔ وہ پھاوڑا لایا تو اُنہوں نے خاردار جھاڑی کے نیچے کی زمین کھودی۔ تو انہیں وہاں سے اتنا سونا مل گیا جو ان کی اِس دنیا میں سعادت مندی کے لیے کافی تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ سونے والے نے خواب میں جو کچھ دیکھا سچ تھا اُس نے دیکھا تو سچ تھا لیکن اس نے جو فیصلہ کیا اس کا کچھ حصہ غلط تھا؛ کیونکہ اس نے کہا تھا: میں نے ایک حقیقی مادی سمندر دیکھا ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالم مادی اور عالمِ معنوی میں فرق نہ کر سکا، کیونکہ وہ عالمِ رؤیا میں غرق تھا اور عالمِ رؤیا کی کوئی حدود و قیود نہیں ہیں۔ اور چونکہ اس عالم کی حدود و قیود نہیں ہیں اس لیے وہ خود اپنے خواب کی تعبیر بھی نہیں کر سکتا ہے۔ جبکہ بیدار آدمی کو خواب کی تعبیر کرنے کا حق ہے، کیونکہ وہ عالمِ مادی اور عالمِ مثال میں فرق رکھتا ہے۔ اسی بنا پر اس نے کہا: تُو نے جو دیکھا ہے حق ہے لیکن وہ حقیقی سمندر نہیں بلکہ ہماری یہ دوہنی ہے جو تیرے خیال کی وجہ سے سمندر کا رُوپ دھار گئی تھی، اور بنسری پُل کا رُوپ دھار گئی۔ وغیرہ وغیرہ۔

پس اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے عالمِ روحانی اور عالمِ مادی میں امتیازی فرق رکھنا بہت ضروری ہے۔ اور اگر یہ دونوں عالم ایک دوسرے سے گھل مل جائیں تو دونوں کے بارے میں جو حکم لگے گا، غلط ہوگا۔

ایک اور مثال: آپ کا ایک تنگ سا کمرہ ہے، اُس میں آپ نے چار بڑے بڑے آئینے لگا رکھے ہیں جنھوں نے چاروں دیواریں مکمل طور پر ڈھانپ رکھی ہیں، آپ کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو وہ تنگ سا کمرہ آپ کو ایک کھلے میدان کی طرح وسیع نظر آتا ہے۔ اب آپ اگر یہ کہیں کہ مجھے اپنا کمرہ میدان جتنا وسیع نظر آتا ہے۔ تو آپ سچ کہیں گے۔ لیکن اگر آپ نے یہ فیصلہ دے دیا کہ میرا کمرہ میدان کے برابر وسیع ہے، تو آپ غلطی کریں گے، کیونکہ اس طرح آپ نے عالمِ مثال کو عالمِ حقیقی کے ساتھ ملا دیا ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ بعض اہلِ کشف نے کتاب وسنت کے ترازو میں تولے بغیر کرۂ ارض کے سات طبقات کی جو تصویریں بنائی ہیں وہ زمین کی مادی اور جغرافیائی کیفیت نہیں بتاتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں:

زمین کا ایک طبقہ جنوں اور عفریتوں کے لیے مخصوص ہے، اور یہ لاکھوں سال کی مسافت کے برابر وسیع ہے۔ اور صورتِ حال یہ ہے کہ کرۂ ارض جسے ایک دو سال میں قطع کرنا ممکن ہے، عجیب وغریب ہولناک وسعت کے حامل یہ عجیب و غریب طبقات اس کرۂ ارض کے اندر نہیں سماتے ہیں۔

لیکن اگر ہم اپنے اس کرۂ ارض کے بارے میں یہ فرض کرلیں کہ یہ صنوبر کے درخت کا ایک بیج ہے جسے عالمِ معنی میں، عالمِ مثال میں، عالمِ برزخ میں اور عالمِ اَرواح میں کاشت کیا گیا ہے، تو اس بیج سے جو مثالی درخت چھوٹے گا اور ان عوالم میں شکل پذیر ہوگا، وہ اس بیج کے حساب سے صنوبر کا ایک بہت ضخیم درخت ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اہلِ شہود کو اپنی روحانی سیر وسیاحت کے دوران عالمِ مثال میں زمین کے بعض طبقات بہت ہی زیادہ وسیع نظر آتے ہیں، اور وہ دیکھتے ہیں کہ وہ طبقات ہزاروں سالوں کی مسافت سے بھی زیادہ وسیع ہیں پس وہ جو کچھ دیکھتے ہیں حق ہوتا ہے، لیکن عالمِ مثال چونکہ عالمِ مادی کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، اس بنا پر وہ ان دونوں عالموں کو ایک دوسرے میں پیوست اور آپس میں مِلا جُلا دیکھتے ہیں، اس لیے وہ اپنے مشاہدات کی تعبیر کرتے وقت وہی کچھ بتاتے ہیں جس کا مشاہدہ اُنہوں نے کیا ہوتا ہے۔ اور پھر جب وہ ''عالمِ صحو'' میں واپس آتے ہیں تو اپنے مشاہدات بعینہٖ اُسی طرح قلم بند کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اِن مشاہدات کو خلافِ حقیقت تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ کتاب وسنّت کے ترازو میں تول کر نہیں لکھے گئے ہوتے ہیں۔

یوں سمجھو کہ ایک عالی شان محل کے ساتھ ایک بہت بڑا باغ، دونوں کے مثالی وجود ایک چھوٹے سے آئینے میں سما جاتے ہیں، اسی طرح عالمِ مثال کے ہزاروں سالوں کی وسعت رکھنے والے مثالی وجود اور معنوی حقائق عالمِ مادی کی ایک

سال کی مسافت میں سما جاتے ہیں۔

خاتمہ:

اس مسئلے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ:

شہود کا درجہ ایمان بالغیب کے درجے سے کہیں زیادہ پست ہے، مطلب یہ کہ بعض اہلِ ولایت جو صرف اپنے بے قاعدہ و بے ضابطہ کشفوں پر اعتماد رکھتے ہیں وہ اُن اصفیاء و محققین وارثانِ نبوّت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے، جو شہود کے بجائے قرآن اور وحی پر اعتماد کرتے ہیں اور اسی اعتماد پر وہ غیبی ایمانی حقائق کے ساتھ تعلق رکھنے والے احکام صادر کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ غیبی حقائق کسی بھی آمیزش سے پاک صاف، ہمہ گیر، سچے اور قرآن و وحی کے ضابطوں اور پیمانوں کے مطابق نپے تلے ہوتے ہیں۔

پس یاد رکھو کہ تمام روحانی احوال و کشفیات و اذواق و مشاہدات و واردات کا میزان کتاب و سنت ہے، اور انہیں پرکھنے کی کسوٹی قرآن و سنت کے قُدسی دساتیر اور اصفیائے محققین کے حدسی یعنی ظن و تخمین پر مبنی قوانین ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ:

''وحدۃ الوجود'' کا مسئلہ بہت سے لوگوں کے ہاں بڑا اعلیٰ مقام سمجھا جاتا ہے، جبکہ صحابہ کرام کہ جن میں سرفہرست خلفائے اربعہ ہیں، ائمۂ اہلِ بیت کہ جن میں سرفہرست آلِ عباء خمسہ ہیں، اور تابعین و مجتہدین کہ جن میں سرفہرست ائمۂ اَربعہ ہیں۔ یہ سب لوگ جو کہ ولایتِ کبریٰ کے مالک ہیں، ان کے ہاں وحدۃ الوجود کا یہ مشرب صراحتاً کہیں نظر نہیں آتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان کے بعد میں آنے والے لوگ ان سے آگے نکل گئے ہیں، اور اِن لوگوں نے کوئی زیادہ کامل جادۂ کبریٰ ڈھونڈ نکالا ہے؟

الجواب: حاشا وکلا! کسی کی کیا مجال کہ ان اصفیاء سے آگے نکل سکے جو خورشیدِ رسالت کے قریب ترین ستارے اور اُس کے قریب ترین وارث ہیں! بلکہ جادۂ کبریٰ وہی ہے جس پر وہ لوگ چلے ہیں۔

رہا وحدۃ الوجود، تو وہ ایک ناقص مشرب ناقص حال اور ناقص مرتبہ ہے، البتہ اس میں ذوق و مستی کا عنصر ضرور پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ سیر و سلوک کے دوران جب اس مرتبے میں داخل ہو جاتے ہیں تو اس سے باہر نہیں نکلنا چاہتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ وہیں رہ جاتے ہیں اور اسی کو آخری اور بلند ترین مرتبہ سمجھ لیتے ہیں!

تو اس طرح کا آدمی اگر ایک ایسی روح ہو جو مادیات و وسائط سے خالی ہو چکی ہو اور وہ اسباب کے پردے چاک کر چکی ہو اور کسی شہود کو اس حد تک حاصل کر چکی ہو کہ اس میں کلی طور پر غرق ہو چکی ہو، ایسا آدمی کبھی ایک طرح کے وحدتِ

وجود تک پہنچ جاتا ہے، اور وہ ایک خالی وحدتِ وجود ہوتا ہے علمی نہیں۔ اور اس کا سرچشمہ وحدتُ الشہود ہوتا ہے وحدتُ الوجود نہیں۔ اور یہ مرتبہ اُس سالکِ راہ کے لیے کوئی نہ کوئی کمال اور خاص مقام ہموار کر دیتا ہے، بلکہ کبھی جب اس کی توجہ مکمل طور پر اللہ پر مرکوز ہو جاتی ہے تو وہ مرتبہ اسے اس حد تک بھی پہنچا دیتا ہے کہ وہ کائنات کا انکار کر دیتا ہے!

اور اگر اس مشرب کا حامل اسباب میں اور مادیات کی دلدل میں گھس چکا ہو تو اس کی توجہ مکمل طور پر کائنات میں مرکوز ہو جانے کی وجہ سے اس کا وحدتُ الوجود کا دعویٰ اسے اللہ کے انکار تک پہنچا دیتا ہے۔

جی ہاں؛ جادۂ کبریٰ یا صراطِ مستقیم وہی ہے جس پر صحابہ و تابعین واصفیاء چلے ہیں، جن لوگوں کا یہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ "حَقَائِقُ الْاَشْيَاءِ ثَابِتَةٌ" اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانِ گرامی ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ کے مطابق اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا ہے، اور وہ تحیّز و تجزُّء (حاشیہ) سے پاک ہے۔ اور مخلوقات کے ساتھ اُس کا تعلق خالق و مخلوق کا ہے۔ اور یہ موجودات اَوہام و خیالات نہیں ہیں جیسا کہ وحدتُ الوجود کے قائلین کا خیال ہے، اور یہ کہ جو اشیاء مشاہدے میں آ رہی ہیں سب اللہ تعالیٰ کے آثار ہیں، اور یہ کہ ہر چیز اُس سے ہے اور ہر چیز وہ نہیں ہے؛ کیونکہ حادث اشیاء عین "قدیم" یعنی اَزلی نہیں ہو سکتیں۔

اس مسئلے کو ہم دو تمثیلوں کے ساتھ قریبُ الفہم بناتے ہیں۔

پہلی تمثیل: فرض کریں کہ ایک بادشاہ ہے، اس کا ایک "محکمۂ عدل" ہے یہ محکمہ اس کے "عادل حکمران" کے نام کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور وہ خلیفہ بھی ہے، اور اس نام کی ترجمانی کرنے کے لیے وزارتِ مذہبی اُمور ہے۔ اسی طرح وہ کمانڈر انچیف بھی ہے، اور یہ نام تمام عسکری محکموں میں اپنی کارکردگی کا اظہار کرتا ہے، اور فوج اس نام کا مظہر ہے۔

اب ایک آدمی اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ بادشاہ تو فقط "عادل حکمران" ہی ہے اور محکمۂ عدل کے سوا اور کوئی محکمہ ہے ہی نہیں۔ تو اس صورت میں اُسے مجبوراً۔ حقیقت میں نہیں بلکہ فرضی طور پر۔ عدلیہ کے ملازمین کے درمیان وزارت مذہبی اُمور کے علماء کے احوال و اوصاف ظاہر کرنے پڑیں گے، یعنی عدلیہ کے ملازمین کو علماء و مشائخ فرض کرنا پڑے گا اور حقیقی وزارت عدل میں تبعی اور ظلی اور خیالی طور پر وزارتِ مذہبی اُمور کا تصور رکھنا پڑے گا۔

یہی صورت عسکری محکمے کی اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے معاملات کی ہوگی، یعنی عدلیہ کے ملازمین کے درمیان ایک فرضی قسم کا عسکری ادارہ قائم کر لیا جائے گا اور اسے ایک غیر حقیقی عسکری ادارہ شمار کیا جائے گا، وغیرہ۔۔۔ وغیرہ

پس اس صورتِ حال میں بادشاہ کا حقیقی نام "عادل حکمران" ہوگا، اور اس کی حقیقی حاکمیت وہی ہے جو "عدلیہ" میں پائی جاتی ہے اور اس کے خلیفہ یا کمانڈر انچیف اور سُلطان جیسے دیگر نام حقیقی نہیں بلکہ اعتباری ہوں گے۔ لیکن صورتِ حال

(حاشیہ: ا) (تحیّز: کسی ایک جگہ میں محدود و منحصر ہونے) اور (تجزُّء: اجزاء میں تقسیم ہونے)

یہ ہے کہ سلطنت کی ماہیت وحقیقت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کے تمام نام حقیقی ہوں، اور حقیقی اسماء یہ تقاضا کرتے ہیں کہ تمام محکمے بہر صورت حقیقی ہوں۔

اسی طرح اُلوہیت کی سلطنت بھی الرحمان، الرزاق، الوھاب، الخلّاق، الفعّال، الکریم اور الرحیم جیسے حقیقی مقدس اسماء کا تقاضا کرتی ہے، اور یہ حقیقی اسماء بھی حقیقی آئینوں کا تقاضا کرتے ہیں۔

اب یہ سمجھو کہ وحدۃ الوجود کے قائلین جب یہ کہتے ہیں کہ: "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّاھُوَ" اور حقائقِ اشیاء کو عدم اور خیال کے درجے میں گرا دیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے "واجبُ الوُجود، الموجود، الأحد اور الواحد" جیسے اسماء کے حقیقی محکمے اور ان کی حقیقی تجلّیات موجود ہوتی ہیں، اگر اس کے آئینے، اس کے محکمے حقیقی نہ ہوں بلکہ خیالی اور عدمی ہوں تو بھی ان اسماء کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں، اگر حقیقی وجود کے آئینے میں وجود کا رنگ نہ بھی ہو تو بھی یہ آئینے اور بھی زیادہ صاف شفاف اور تابناک ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے الرحمن، الرزّاق، القھار، الجبّار اور الخلّاق جیسے اسمائے گرامی کی تجلیات اعتباری اور نسبتی ہوں گی حقیقی نہیں، حالانکہ یہ اسماء اِسم "الموجود" کی طرح حقیقی ہیں۔ اور یہ تجلیات پَرتو نہیں بلکہ اُصلی ہیں تبعی نہیں۔

صحابہ کرام اور اصفیاء مجتہدین اور ائمہ اہلِ بیت کہتے ہیں: "حَقَائِقُ الْأَشْيَاءِ ثَابِتَةٌ" کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء حقیقی تجلیات کے مالک ہیں۔ اور یہ کہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کے انہیں وجود عطا کرنے کی وجہ سے عارضی وجود کی مالک ہیں۔ اور یہ وجود واجبُ الوجود کے مقابلے میں اگرچہ ایک کمزور سا نہ ٹکنے والا سایہ ہے، لیکن وہ بہرکیف وہم اور خیال نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے اسمِ گرامی "الخلّاق" کے ذریعے اسے وجود عطا کر دیتا ہے اور اس وجود کو دوام بخشتا ہے۔

دوسری تمثیل: اس کمرے کی چاروں دیواروں پر اگر چار بڑے بڑے قد آدم آئینے لگے ہوئے ہوں تو ہر آئینے میں اس کمرے کی تصویر کے ساتھ ساتھ باقی تین آئینوں کا عکس بھی نمایاں ہوگا۔ لیکن آئینہ اشیاء کی صورت کو اُسی شکل میں منعکس کرے گا جو خود اس کی اپنی شکل صورت، ہیئت اور اپنے رنگ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہوگی۔ مطلب یہ کہ ہر آئینہ کمرے کا کوئی نہ کوئی خاص منظر منعکس کرے گا۔

اب اس کمرے میں دو آدمی داخل ہوتے ہیں، اور ان میں سے ایک آدمی صرف ایک ہی آئینے کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے: تمام چیزیں اس آئینے میں ہیں۔ لیکن پھر جب دوسرے آئینوں کے بارے میں اور ان میں پائی جانے والی تصویروں کے بارے میں سنتا ہے تو اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ یہ تمام ان آئینوں کی صورتیں ہیں جو خود اسی کے آئینے میں منعکس ہو رہے ہیں۔ یعنی وہ ایک آئینہ جو اس کمرے کے ایک چھوٹے سے کونے کو گھیرے ہوئے ہے اور جو دو دفعہ مدھم سا ہو کر ایک سایہ سا بن چکا ہے اور اس کی حقیقت بالکل چھوٹی سی اور تبدیل ہوگئی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

مجھے صورت حال اسی طرح نظر آ رہی ہے، اس لیے حقیقت یہی ہے۔

تب دوسرا آدمی اُسے کہتا ہے: جی ہاں؛ آپ کو کچھ ایسے ہی نظر آ رہا ہے، اور آپ کو جو نظر آ رہا ہے صحیح ہے۔ لیکن واقعہ میں حقیقت کی صورت یہ نہیں ہے؛ کیونکہ وہ ایک آئینہ جس میں آپ نظریں جمائے کھڑے ہیں، اس کے علاوہ یہاں اور آئینے بھی موجود ہیں۔ اور وہ آئینے اتنے چھوٹے، مدھم سے اور چھوٹے سے سائے کے سائے نہیں ہیں جیسے کہ آپ کو نظر آ رہا ہے!

پس یاد رکھو کہ اسمائے الٰہیہ میں سے ہر اسم مختلف آئینوں کا تقاضا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "الرحمن" اور "الرزاق" حقیقی اور اصلی ہونے کی بنا پر اپنے شایانِ شان ایسی موجودات کا تقاضا کرتے ہیں جو رزق اور رحمت کی محتاج ہوں۔ اسی طرح "الرحیم" بھی ایک حقیقی جنت کا تقاضا کرتا ہے۔

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ فقط "الموجود" اور "واجبُ الوجود" اور "الأحد" ہی حقیقی اسماء ہیں اور دیگر اسماء کو ان کے ضمنی اور تابع اسماء بنا دیا جائے کہ اِن اسماء کے پرتو اور سائے ہیں، تو یہ چیز ان اسماء پر ظلم کرنے کے مترادف ہو جائے گی۔

یہی وہ راز ہے جس کی رُو سے صحابہ کرام، اَصفیاء و تابعین، ائمہٴ اہلِ بیت اور ائمہٴ مجتہدین کا راستہ ہی اصل جادۂ کبریٰ ہے، یہی لوگ بلاشبہ ولایتِ کبریٰ کے مالک ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کے براہِ راست شاگردوں کے پہلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

﴿سُبۡحَانَكَ لَا عِلۡمَ لَنَا اِلَّامَا عَلَّمۡتَنَا اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ﴾

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَيۡتَنَا وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مَنۡ أَرۡسَلۡتَهُ رَحۡمَةً لِلۡعَالَمِيۡنَ، وَعَلَى آلِهٖ وَصَحۡبِهٖ أَجۡمَعِيۡنَ۔

تیسرا مسئلہ: [ایک ایسا اہم مسئلہ جو عقل و حکمت کے ساتھ حل نہ ہو سکا]

﴿كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِيۡ شَأۡنٍ﴾﴿فَعَّالٌ لِمَا يُرِيۡدُ﴾

سوال: کائنات میں دمادم جاری و ساری اس حیران کن فعالیت کا راز کیا ہے اور اس میں کون سی حکمت کارفرما ہے؟ ہمہ وقت حرکت میں رہنے والی یہ موجودات تھمتی کیوں نہیں ہیں؟ اور یہ ہر وقت گردش میں اور تجدُّد پذیر اور نئی نویلی کیوں رہتی ہیں؟

الجواب: اس حکمت کی وضاحت کے لیے ایک ہزار صفحہ درکار ہے، اس لیے اس کی وضاحت سے پہلو تہی کرتے ہوئے ہم اسے انتہائی مختصر اجمالی انداز کے ساتھ دو صفحوں میں سمیٹتے ہیں۔۔۔

اور وہ یوں ہے کہ کوئی بھی انسان جب کوئی فطری یا سماجی ذمہ داری ادا کرتا ہے اور اُس ذمہ داری کو خاطر خواہ نبھانے

کے لیے پوری سرگرمی سے دوڑ دھوپ کرتا ہے؛ تو اُسے غور سے دیکھنے والا آدمی یہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ آدمی اس طرح کی دوڑ دُھوپ دو وجہ سے کر رہا ہے:

پہلی وجہ: اس کام پر مرتّب ہونے والے نتائج وثمرات اور مصالح وفوائد جنھیں 'علّتِ غائی'' کہا جاتا ہے۔

دوسری وجہ: وہ محبت، اشتیاق اور لذت جو اُسے سرگرمِ عمل رکھتی ہے، جسے ''داعیہ اور تقاضا'' کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر: جو چیز اُسے کھانا کھانے پر آمادہ کرتی ہے وہ اشتیاق اور لذّت ہیں جو اشتہا سے جنم لیتے ہیں۔ پھر کھانے پینے کے نتیجے میں بدن کو غذا ملتی ہے اور اس سے اُس کی زندگی کو دوام ملتا ہے۔

اسی طرح -وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَى- اس کائنات میں جو ایک دہشت خیز اور حیرت انگیز قسم کی غیر محدود فعّالیت پائی جاتی ہے، وہ دو وسیع قسم کی حکمتوں کی خاطر دو قسم کے اسمائے الٰہیہ کے سہارے قائم ہے، اور ان دونوں حکمتوں میں سے ہر حکمت بے پایاں و بے کراں ہے۔

پہلی حکمت: اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی انواع واقسام کی غیر محدود اور بے شمار تجلیات ہیں اور مخلوقات کا تنوّع انہیں تجلّیات کے تنوّع سے نشو ونما پاتا ہے۔ اور یہ اسماء دائمی شکل میں اپنا ظہور چاہتے ہیں، یعنی اپنے نقوش کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں، یعنی اپنے حسن و جمال کے جلووں کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور اپنے نقوش کے آئینوں میں اُن کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں، یعنی کائنات کی کتاب کی تجدید کا، یعنی موجودات کے مکتوبات کی آناً فاناً دائمی تجدید کا تقاضا کرتے ہیں، یعنی یہ اسماء تقاضا کرتے ہیں کہ موجودات کو نئے سرے سے کچھ اس طرح کی حکیمانہ بلاغت اور پُر مغز اور معنی خیز انداز کے ساتھ لکھا جائے کہ جس سے ہر مکتوب اپنے آپ کو ذاتِ مقدّس اور مسمّیٰ اَقدس جلّ جلالہ کے ساتھ ساتھ تمام ذی شعور مخلوقات کے سامنے پیش کر دے، تاکہ وہ انہیں پڑھ سکیں اور ان کا مطالعہ کریں۔

دوسری حکمت: جیسے مخلوقات میں پائی جانے والی فعّالیت اشتہا، اشتیاق اور لذت سے جنم لیتی ہے، حتیٰ کہ ہر فعّالیّت میں قطعی طور پر لذت پائی جاتی ہے، بلکہ ہر فعّالیت فی حدّ ذاتہ لذت کی ہی ایک قسم ہے؛ اسی طرح وہ واجبُ الوجود اس طرح کی بے انتہا مقدس شفقت اور مقدّس محبت کا مالک ہے جو اس کی ذات کے شایانِ شان ہے، اس کے استغنائے ذاتی اور غنائے مطلق کے ساتھ موافقت اور اس کے کمالِ مطلق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ اور وہ لامحدود مقدّس شوق کا مالک ہے جو اس مقدس شفقت اور مقدس محبت سے جنم لیتا ہے، اور وہ بے پایاں مقدس سرور کا مالک ہے جو اس مقدس شوق سے جنم لیتا ہے، اور وہ ایک بیکراں مقدس لذت کا مالک ہے۔ اگر یہ تعبیر جائز ہو تو۔ جو کہ اس مقدس سرور سے جنم لیتی ہے، اسی طرح وہ بے حد وحساب مقدس امتنان وافتخار کا مالک ہے۔ اگر یہ تعبیر جائز ہو تو۔ جو کہ رحمان ورحیم ذات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور جو مخلوقات کے امتنان اور ان کے کمال سے جنم لیتے ہیں۔

مخلوقات کا وہ امتنان اور کمال جو اِن مخلوقات کے مکمل ہو جانے سے اور ان کی استعداد کی قوت سے نکل کر فعل تک آجانے سے جنم لیتا اور نشو ونما پاتا ہے۔۔۔وہ استعداد جو قدرت کی فعالیّت کے ضمن میں، اس مقدس لذت سے جنم لینے والی لامحدود رحمت سے نشو ونما پاتی ہے۔۔۔یہ تمام چیزیں لامحدود شکل میں غیر محدود فعالیت کا تقاضا کرتی ہیں۔

تو فلسفہ و سائنس اور حکمت اِس گہری حکمت کی تہ تک نہیں پہنچ سکے، اسی وجہ سے اُنہوں نے بے شعور نیچر، اندھے اتفاق اور جامد اسباب کو اس علیم وحکیم اور غایت درجے کی بصیر فعالیت کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے، اور اس طرح وہ گمراہی کے اندھیروں میں جا گرے ہیں اور حقیقت کے نور سے محروم ہو گئے ہیں۔۔۔

﴿قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى كَاشِفِ طِلْسِمِ كَائِنَاتِكَ بِعَدَدِ ذَرَّاتِ الْمَوْجُوْدَاتِ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ مَادَامَ الْاَرْضُ وَالسَّمَاوَاتُ۔

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

انیسواں مکتوب

یہ رسالہ تین سو سے زائد معجزات بیان کرتا ہے۔ اور جہاں یہ رسالتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے معجزات بیان کرتا ہے وہاں فی نفسہٖ خود اُن معجزات کی کرامت ہے۔ اور یوں یہ رسالہ تین چار جہتوں سے خارقِ عادت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

پہلی جہت: اس انیسویں مکتوب کا نقل اور روایت ہونے کے ساتھ ساتھ، سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہونے کے باوجود، کسی کتاب کی طرف رجوع کیے بغیر، زبانی طور پر، پہاڑوں اور باغات کے کونوں میں ہر روز دو تین گھنٹوں کی محنت سے، مجموعی طور پر بارہ گھنٹوں میں تالیف کیا جانا، ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

دوسری جہت: اس رسالے کی طوالت کے باوجود، نہ اس کی کتابت اکتاہٹ پیدا کرتی ہے اور نہ ہی اس کی قراءت اپنی مٹھاس میں کمی واقع ہونے دیتی ہے۔ چنانچہ اِس نے کسلمند کاتبوں میں شوق اور غیرت کا اتنا جذبہ بھڑکا دیا کہ اُن لوگوں نے اِس کڑے وقت میں اور اِس علاقے میں ایک سال کے اندر اندر ہاتھ سے ستر کے قریب نسخے لکھ لیے۔ اس چیز نے لوگوں کو مطمئن کر دیا کہ یہ رسالہ اس ذاتِ گرامی کی رسالت کے معجزے کی ایک کرامت ہے۔

تیسری جہت: ایک ناتجربہ کار اور توافق کے بارے میں بے علم کاتب کی لکھی ہوئی کتاب کے تمام نسخے میں اور دیگر آٹھ کاتبوں کے تمام نسخوں میں لفظ ''رسول اکرم'' ﷺ اور لفظ ''قرآن'' میں توافق پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ اس طرح سے ہوا کہ ان آٹھوں کاتبوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے ملا بھی نہیں اور ہمیں اس توافق کے بارے میں ابھی پتا بھی نہیں چلا تھا۔ پس جو آدمی ذرّہ برابر بھی انصاف کا مالک ہوگا وہ ظہور میں آنے والے اس بے ساختہ توافق کو کسی اتفاقی حادثے کا کرشمہ نہیں قرار دے گا۔ اور جس کسی نے بھی اس کو دیکھا اس نے قطعی طور پر فیصلہ کر لیا کہ یہ ایک غیبی راز ہے اور معجزاتِ رسول ﷺ کی ایک کرامت ہے۔

کتاب کے شروع میں جو بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں اِنتہائی اہم ہیں۔ اس میں ذکر کردہ اَحادیث اکثر ائمۂ حدیث کے ہاں صحیح اور مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ وہی واقعات بیان کرتی ہیں جو قطعی طور پر ثابت شدہ ہیں۔

اس کتاب کی خصوصیات ذکر کرنا چاہیں تو اس کے لیے اِسی طرح کی ایک مستقل تالیف درکار ہوگی، اس بنا پر ہم اصحابِ شوق سے کہیں گے کہ وہ یہ کتاب ایک دفعہ پڑھ کر ضرور دیکھیں۔ سعید نورسی

تنبیہ: اس کتاب میں میں نے بہت سی احادیث شریفہ نقل کی ہیں اور حالات یہ ہیں کہ میرے پاس احادیث کی کتابیں بھی نہیں تھیں، اس لیے میری نقل کردہ اَحادیث کے الفاظ میں کوئی غلطی نظر آئے تو یا تو اس کی تصحیح کر دی جائے، یا پھر یہ کہا جائے کہ: یہ حدیث بالمعنی ہے۔ کیونکہ راجح قول یہی ہے کہ حدیث بالمعنی نقل کی جا سکتی ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ راوی حدیث کا صرف معنی لے لے اور لفظ اپنے پاس سے ذکر کر دے۔ پس جب صورتِ حال یہ ہے تو اگر کوئی ایسی حدیث مل جائے اور اس کے لفظ میں کوئی غلطی پائی جائے تو اُسے روایت بالمعنی کی نظر سے دیکھا جائے۔ سعید نورسی

معجزاتِ رسول ﷺ

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ...﴾

انیسویں اورا ایں مقالے میں جو رسالتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مشتمل ہیں، اُن میں نبوتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا قطعی دلائل کے ساتھ اثبات کر دیا گیا ہے۔ اس لیے اثباتِ نبوت کا معاملہ ہم انہی دو مقالوں کے سپرد کرتے ہیں۔ البتہ ان دونوں مقالوں کے تتمے کی غرض سے کچھ اہم نکات پر مشتمل انیس بلاغی اشاروں کے ذریعے اس حقیقتِ کبریٰ کی چند کرنیں آشکار کرتے ہیں۔

پہلا بلاغی اشارہ

اس کائنات کا مالک و متصرّف یقیناً علم کی روشنی میں پیدا کرتا اور بناتا ہے، اپنے معاملات میں حکمت کے ساتھ تصرّف کرتا ہے، ہر جہت کی ادارت بصیرت کے ساتھ کرتا ہے، ہر شے کو علم و بصیرت کے ساتھ پروان چڑھاتا ہے، ہر چیز میں جو حکمتیں اور مقاصد و فوائد نظر آتے ہیں وہ انہیں ارادے کے ساتھ بروئے کار لاتا ہے تو جب بنانے والا ہی جانتا ہے، تو یقیناً جاننے والا ہی بولتا ہے، اور یقیناً وہی بولتا ہے تو پھر اس کی یہ گفتگو ذی شعور اور سمجھنے سوچنے والی مخلوقات کے ساتھ ہو گی۔ اور اگر وہ گفتگو ذی شعور مخلوق کے ساتھ کرے گا تو پھر بلاشبہ وہ گفتگو نوعِ انسان کے ساتھ ہی کرے گا جو کہ تمام ذی شعور مخلوقات کے مابین عمومی اور ہمہ گیر شعور کا مالک ہے۔ اور جب وہ نوعِ انسان کے ساتھ گفتگو کرتا ہے تو پھر بلاشبہ وہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر ان کامل لوگوں کے ساتھ گفتگو کرے گا جن میں مخاطب ہونے کی استعداد پائی جاتی ہے۔ اور جب وہ ان لوگوں کے ساتھ گفتگو کرے گا جو نوعِ بشر کے لیے نمونہ ہیں، جو اُن میں سے سب سے زیادہ باکمال، بلند استعداد اور بلند پایہ اخلاق کے مالک ہیں، تو پھر بلاشبہ وہ محمد ﷺ کے ساتھ گفتگو کرے گا جو کہ دوستوں دشمنوں کے بالاتفاق بلند ترین استعداد اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں، نوعِ بشر کے پانچویں حصے نے جن کی اقتدا کی ہے اور آدھی زمین جن کی معنوی فرمانروائی کی ماتحتی قبول کر چکی ہے۔ جنہوں نے اپنے لائے ہوئے نور کی تابانی کے ساتھ نوعِ انسانی کے مستقبل کو ساڑھے تیرہ سو سال تک روشن کر دیا، اور نوعِ انسانی سے اہلِ ایمان اور اس روشنی سے فیض یاب ہونے والے لوگ روزانہ پانچ

مرتبہ آپ ﷺ کی مدح سرائی کرتے اور آپ ﷺ کے ساتھ محبت کا دم بھرتے ہیں۔

یقیناً انہیں تمام نوعِ بشر کے لیے رسول بنانا تھا اور بنایا بھی۔ ان کے ساتھ گفتگو کرنی تھی اور کی بھی، اور انہیں لوگوں کے لیے رہنما بنانا تھا اور بنایا بھی۔

دوسرا ابلاغی اشارہ

رسولِ اکرم ﷺ نے نبوت کا دعوی کیا اور قرآنِ عظیمُ الشان جیسے منشور کا اعلان کیا اور محققین کے مطابق ایک ہزار کے لگ بھگ تابندہ معجزات کا اظہار کیا۔ ان معجزات کا وجود مجموعی طور پر دعوائے نبوت کی طرح قطعی طور پر ثابت ہے۔ قرآن حکیم جو بہت سے مقامات پر ہٹ دھرم قسم کے کافروں کے بارے میں یہ نقل کرتا ہے کہ وہ ان معجزات کو جادو کا نام دیتے تھے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ضدی اور ہٹ دھرم قسم کے کافر بھی معجزات کے وجود کا اور ان کے وقوع پذیر ہونے کا انکار نہیں کر سکتے تھے بلکہ انہوں نے خود فریبی اور اپنے پیروکاروں کو مطمئن کرنے کی خاطر انہیں جادو کا نام دے دیا تھا۔

جی ہاں؛ محمدی معجزات اتنے قطعی طریقے سے ثابت ہیں کہ ایک سو تواتر کی قوّت رکھتے ہیں۔

معجزہ خالقِ کائنات کی طرف سے آپ ﷺ کے دعوے کی تصدیق ہے، اس بنا پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ سے کہتا ہے: صَدَقْتَ۔

یہ بالکل ایسے ہی جیسے کہ آپ کسی بادشاہ کی مجلس میں یا دربار میں یہ کہیں کہ: بادشاہ سلامت نے مجھے فلاں کام پر مأمور کر دیا ہے، اور آپ سے اس دعوے کی دلیل مانگی جائے تو بادشاہ خود کہہ دے: ہاں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بادشاہ آپ کی تصدیق کر رہا ہے۔ اسی طرح جب وہ آپ کی وجہ سے اپنی کوئی عادت اور کیفیت کو تبدیل کر دے تو وہ اس انداز سے آپ کے دعوے کی ''ہاں'' کہنے سے کہیں زیادہ قطعی اور مضبوط طریقے سے تصدیق کرتا ہے۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے دعویٰ کیا اور کہا: میں خالقِ کائنات کی طرف سے سے ث ہوں، اور اس بات پر میری دلیل یہ ہے کہ وہ میری دعا اور میری طلب پر اپنے عادی اور معمول کے قوانین کو تبدیل کر دیتا ہے۔ پس میری انگلیوں کو دیکھو کہ وہ اُن سے پانچ نالیوں جیسے چشمے کی طرح پانی بہا دیتا ہے۔ چاند کو دیکھو کہ وہ اُسے میری انگلی کے ایک اشارے کے ساتھ شق کر دیتا ہے۔ اِس درخت کی طرف دیکھو، وہ میری طرف چل کر آتا ہے اور میری تصدیق کی گواہی دیتا ہے۔ صرف دو تین آدمیوں کو پورا آنے والے اس تھوڑے سے کھانے کو دیکھو کہ اس سے دو تین سو آدمی سَیر ہو رہے ہیں۔ اور یوں آپ ﷺ نے اس طریقے سے سینکڑوں معجزات کا اظہار کیا۔

اب یہ بھی یاد رہے کہ اس نبی کریم ﷺ کی صداقت کے دلائل اور آپ کی نبوت کے براہین فقط آپ ﷺ کے

معجزات میں ہی منحصر نہیں ہیں، بلکہ آپ کی تمام حرکات وسکنات، افعال واحوال واقوال، اخلاق واطوار اور سیرت اور صورت گہری نگاہ والوں کے لیے آپ کی سچائی اور اخلاص کا اثبات کرتی ہیں۔حتیٰ کہ بنی اسرائیل کے مشہور عالم عبداللہ بن سلام جیسے بہت سے لوگ فقط آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کو دیکھ کر ہی ایمان لے آئے تھے، چنانچہ انہوں نے کہا: اس پیشانی میں جھوٹ کا وجود نہیں اور اس چہرے میں حیلہ سازی نہیں پائی جاتی ہے۔

محقق علماء نے اگرچہ یہ کہا ہے کہ: ''آپ ﷺ کے معجزات اور آپ ﷺ کی نبوت کے دلائل ایک ہزار کے لگ بھگ ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ نبوت کے دلائل ہزاروں بلکہ لاکھوں ہیں'' اور مختلف افکار رکھنے والے لاکھوں لوگوں نے لاکھوں طریقوں سے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی ہے۔ اور قرآنِ حکیم اپنے اعجاز کے چالیس پہلوؤں کے علاوہ نبوتِ محمدی ﷺ کے ایک ہزار دلائل و براہین آشکار کرتا ہے۔

پھر یہ ہے کہ نوعِ بشر میں جب نبوت کا سلسلہ پایا جاتا ہے اور لاکھوں لوگوں نے اگر نبوت کا دعویٰ کیا اور معجزات کا اظہار کیا ہے، تو پھر اس بات میں کسی بھی قسم کا کوئی شک نہیں رہ جاتا ہے کہ نبوتِ محمدی ﷺ یقینی طور پر ان سب سے بالاتر ہونے کی حیثیت سے ثابت ہے؛ کیونکہ وہ دلائل واوصاف وکیفیات ومعاملات جو عیسیٰؑ اور موسیٰ جیسے تمام انبیاء نے اپنی اُمتوں کے ساتھ کیے ہیں، وہ تمام کے تمام کامل ترین اور جامع ترین صورت میں رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی میں پائے جاتے ہیں۔ تو جب حکم نبوت کی علت اور اس کا سبب دونوں ہی ذاتِ محمدی ﷺ میں کامل ترین صورت میں موجود ہیں تو پھر یہ بات کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ آپ ﷺ کے لیے نبوّت کا حکم تمام انبیاء سے بڑھ کر قطعی طور پر واضح ترین صورت میں ثابت ہے۔

تیسرا نکتہ دار اشارہ

رسولِ اکرم ﷺ کے معجزات بہت سی انواع واقسام پر مشتمل ہیں؛ کیونکہ آپ ﷺ کی رسالت عام ہے، اسی بنا پر آپ ﷺ کائنات کی اکثر انواع واقسام کے ساتھ تعلق رکھنے والے متعدد معجزات کا مظہر بن گئے ہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھیں:

اگر کسی شان وشوکت والے بادشاہ کا سفیر مختلف اور متنوّع قسم کے تحفے لے کر کسی ایسے شہر میں جائے جہاں مختلف قسم کی قومیں آباد ہوں، تو اُن میں سے ہر گروہ اس کے استقبال کے لیے اپنا نمائندہ بھیجتا ہے، وہ اس سفیر کو خوش آمدید کہتا ہے اور اپنے گروہ کی نمائندگی کرتا ہوا تالی بجاتا ہے۔

اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ بھی جو کہ سلطانُ الازل والابد کے سب سے بڑے سفیر ہیں، اُنہوں نے جب کائنات کو اپنی آمد کے ساتھ شرف بخشا اور وہ کرۂ ارض کی بسنے والی تمام نوعِ بشری کی طرف ت ث ہو کر آئے اور خالقِ کائنات کی

طرف سے عمومی کائنات کے ساتھ تعلق رکھنے والے معنوی تحفے اور حقیقت کے انوار لے کر آئے تو شجر و حجر، آب و ہوا، انسان وحیوان اور چاند سورج سے لے کر نجوم وکواکب تک ہر گروہ نے آپ کے لیے خوشی سے تالی بجائی، آپ کو اپنی خصوصی زبان میں اور آپ ﷺ کے کسی نہ کسی معجزے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر آپ ﷺ کو خوش آمدید کہا۔

آپ ﷺ کے ان تمام معجزات سے متعلق بحث کرنے کے لیے کئی جلدیں درکار ہیں اور محقق اصفیاء نے نبوّت کے دلائل کی تفصیلات میں بہت سی جلدیں لکھی بھی ہیں۔ اس مقام پر ہم ان میں سے قطعی اور معنوی طور پر متواتر درجے کے معجزات کی کلی انواع کی طرف اجمالی طور پر کچھ اشارات کریں گے:

نبوت محمدی ﷺ کے دلائل اوّلاً دو قسم پر ہیں:

پہلی قسم: خارقِ عادت حالات جن کا ظہور ہنگامِ ولادت نبوّت سے پہلے ہوا، انہیں ارہاصات کہا جاتا ہے۔

دوسری قسم: نبوت کے دیگر دلائل۔ اور ان کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ خارقِ عادت حالات جن کا ظہور آپ ﷺ کے بعد میں آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کے لیے ہوا۔

دوسری قسم: وہ خارقِ عادت حالات جن کا ظہور آپ کے عصرِ سعادت میں ہوا۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: نبوت کے وہ دلائل جن کا ظہور آپ ﷺ کی ذات، سیرت اور صورت مبارکہ اور اخلاق وفضائل میں ہوا۔

دوسری قسم: وہ معجزات جو آپ ﷺ پر آفاق میں اور خارجی موجودات میں جلوہ گر ہوئے۔

اس کی پھر دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: معنوی اور قرآنی

دوسری قسم: مادی اور کونی۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ خارقِ عادت معجزات جو دعوائے نبوت کے وقت اہلِ کفر کے عناد کو توڑنے یا اہلِ ایمان کے ایمان میں اضافہ کرنے کے لیے ظہور میں آئے، اور ان کی بیس قسمیں ہیں، جیسے شقُّ القمر، آپ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہونا، تھوڑے سے کھانے سے بہت سے لوگوں کا سیر ہو جانا، شجر و حجر وحیوان کا کلام کرنا۔ ان میں سے ہر قسم معنوی تواتر کا درجہ رکھتی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک قسم کے متعدد مکرر افراد ہیں۔

دوسری قسم: وہ احداث وواقعات جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے تھے اور اُن کے بارے میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے علم پا کر خبر دی، چنانچہ وہ سچ مچ اُسی طرح ظہور میں آئے جیسے آپ ﷺ نے خبر دی تھی۔

اب ہم بھی اس آخری قسم سے آغاز کر کے ایک مجمل سی فہرست دکھائیں گے۔ (حاشیہ)

(حاشیہ) میں نے جیسے نیت کی تھی ویسے لکھ نہ سکا، اس لیے جیسے دل پر وارد ہوا بے اختیار ویسے ہی لکھ دیا گیا ہے۔ افسوس کہ میں ان تقسیمات میں ترتیب کا بتمامہ خیال نہیں رکھ سکا۔ مؤلف۔

چوتھا بلاغی اشارہ

رسول اکرم ﷺ نے علام الغیوب کے علم دینے سے جن غیبی اُمور کی خبر دی ہے وہ اعداد وشمار سے باہر ہیں ہم نے اعجاز القرآن پر لکھے گئے پچیسویں مقالے میں ان کی انواع واقسام کی طرف اشارہ کیا ہے، اُن کا اثبات کیا ہے اوران کی پوری طرح سے وضاحت بھی کر دی ہے، اس لیے ماضی، سابقہ انبیائے کرام، الٰہی حقائق، کونی حقائق اور اُخروی حقائق کے ساتھ تعلق رکھنے والی غیبی خبروں کا معاملہ ہم پچیسویں مقالے کے سپرد کرتے ہیں اس لیے اس مقام پر اُن کے بارے میں بحث نہیں کریں گے۔

اس مقام پر ہم اُن بہت سی سچ ثابت ہونے والی غیبی خبروں کے بارے میں متعدد جزوی مثالوں کی طرف اشارہ کریں گے جو اُن حادثات و واقعات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جو آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام اور اہلِ بیت پر نازل ہوئے اور جن سے مستقبل میں اُمتِ مسلمہ دوچار ہوئی، اوراس حقیقت کو بتمامہ اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس سے پہلے چھ بنیادیں بیان کریں گے:

پہلی بنیاد: رسولِ اکرم ﷺ کے تمام حالات، سارے طور اطوار اگر چہ آپ ﷺ کی سچائی پر اور آپ ﷺ کی نبوت پر دلیل بن سکتے ہیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ کی ہر حالت اور ہر طور طریقہ خارقِ عادت ہو؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بشر کی صورت میں بھیجا تاکہ آپ لوگوں کی اُن کے اجتماعی حالات میں اور انہیں دین و دنیا کی سعادت سے ہمکنار کرنے والے اعمال وافعال کے بارے میں رہنمائی اور پیشوائی کریں اور تاکہ وہ زندگی کے معمولات اور روزمرہ کے ان کاموں میں قدرتِ الٰہی کے تصرّف اور خارقِ عادت صنعتِ ربانیہ کو نمایاں کریں جن میں سے ہر کام قدرتِ الٰہی کے ایک معجزے کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن اگر وہ بشریت سے باہر اور خارقِ عادت وغیر معمولی اعمال وافعال کے مالک ہوتے تو پھر نہ تو ذاتی طور پر دوسروں کے لیے امام و پیشوا بن سکتے اور نہ دوسروں کو اپنے افعال واحوال اور عادات واطوار کا درس دے سکتے۔ اس بنا پر خارقِ عادت اُمور کا اظہار آپ صرف ضدی اور ہٹ دھرم قسم کے لوگوں کے مقابلے میں اپنی نبوت کا اثبات کرنے کے لیے ہی کرتے تھے۔ تاہم معجزات کے اظہار کا انداز کچھ اس طرح کا بدیہی اور بے ساختہ نہیں تھا کہ چار و ناچار مجبور ہو کر ان کی تصدیق کرنی ہی پڑے؛ کیونکہ انسان کو جو مکلّف کیا گیا ہے اس میں اصل راز یہ ہے کہ اُسے آزمائش اور امتحان سے گزارا جائے، اور امتحان لینے میں جو راز اور مکلّف کرنے میں جو حکمت ہے ان دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ عقل کا دروازہ کھلا رکھا جائے اور اُس کے ہاتھ سے اس کا اختیار سلب نہ کیا جائے۔ اس بنا پر اگر معجزات انتہائی بدیہی صورت میں ظہور پذیر ہوتے تو پھر عقل بے اختیار ہو جاتی اور ابوجہل بھی ابوبکر صدیقؓ کی طرح ان کی تصدیق کر دیتا اور یوں امتحان اور تکلیف کا

کوئی فائدہ نہ ہوتا اور کوئلہ اور الماس ایک ہی سطح پر رہ جاتے۔

حیرت خیز بات یہ ہے کہ ہزاروں قسموں کے لوگ، ہزاروں طریقوں سے اور بغیر کسی مبالغہ کے ایمان لائے ہیں، ان میں سے ہر ایک رسولِ اکرم ﷺ کے معجزات میں سے ایک آدھ معجزے پر، نبوت کے دلائل میں سے کسی نہ کسی دلیل پر آپ ﷺ کی کسی بات پر یا آپ ﷺ کے رخِ انور کا دیدار کر کے اور اس طرح کی علامتوں میں سے کسی نہ کسی علامت پر ایمان لایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کی نبوت کے یہ ہزاروں دلائل جن کے پیشِ نظر لوگوں کے مختلف طبقوں کے یہ ہزاروں لوگ، باریک بین اور مفکرین ایمان لائے ہیں، گویا کہ نقل صحیح اور قطعی آثار پر مشتمل یہ ہزاروں دلائل بعض بدبخت قسم کے معاصرین کے لیے کافی نہیں ہیں، چنانچہ یہ لوگ گمراہی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسری بنیاد: رسول اکرم ﷺ بشر اور رسول ہیں، چنانچہ بشریت کے اعتبار سے وہ اپنے معاملات ایک بشر کی طرح سرانجام دیتے ہیں، اور رسالت کے اعتبار سے وہ اللہ کے ترجمان اور سفیر ہیں۔ اور یہ کہ آپ ﷺ کی رسالت کا دارو مدار وحی ہے۔ اور وحی کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وحی صریح: پس رسولِ اکرم ﷺ اس میں صرف ترجمان اور مبلغ ہیں، اس میں آپ ﷺ کسی قسم کا تصرّف یا دخل اندازی نہیں کرتے، جیسے قرآن کریم اور بعض قدسی اُحادیث۔

دوسری قسم: وحی ضمنی: بطورِ خلاصہ اور اجمالی طور پر تو اس کا دارومدار وحی اور الہام ہی ہے، لیکن اس کی تفصیل اور تصویر کی ذمہ داری رسولِ اکرم ﷺ پر عائد ہوتی ہے، چنانچہ وحی کے ذریعے وارد ہونے والے کسی واقعے کی تفصیلات بتانے میں وحی کی اس قسم کا اعتماد کبھی الہام پر اور کبھی خود وحی پر بھی ہوتا ہے، آپ ﷺ اس واقعے کی وضاحت یا تو الہام کے ساتھ کرتے ہیں یا اپنی فراست کے ساتھ۔

اور جس چیز کی تفصیل اور تصویر کا استنباط آپ ﷺ اپنے اجتہاد سے کرتے ہیں، اس کی وضاحت یا تو آپ ﷺ رسالت کی ذمہ داری کی رُو سے اپنی بلند پایہ قدسی قوت کے ساتھ کرتے ہیں، یا پھر اپنی بشری جہت کی رُو سے عُرف و عادات اور افکارِ عامہ کی سطح کے حساب سے کرتے ہیں۔

اس بنا پر ہر حدیث کی تمام تفاصیل کو وحی محض کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اور رسالت کے بلند پایہ نقوش کی جستجو آپ ﷺ کے اُن افکار و معاملات میں نہیں کرنی چاہیے جن کا تعلق بشری تقاضوں کے ساتھ ہے۔

بعض حوادث و واقعات چونکہ آپ ﷺ پر بذریعہ وحی مُجمل اور مطلق صورت میں نازل ہوتے ہیں، اور آپ ﷺ ان واقعات کی صورت گری اور ذاتی فہم و فراست سے اور عرفِ عام کے پیشِ نظر کرتے ہیں، اس لیے کبھی کبھار اس صورت گری میں پائی جانے والی متشابہات و مشکلات کی تفسیر بلکہ تعبیر لازم ہو جاتی ہے؛ کیونکہ کچھ حقائق ایسے

ہیں جنہیں تمثیل کے ساتھ قریب الفہم بنایا جاتا ہے مثال کے طور پر:

ایک دفعہ حضورِ نبوی میں ایک گہری گونج کی آواز سُنی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ ایک پتھر کے گرنے کی گونج ہے جو ستّر سال سے لُڑھکتا جارہا تھا اور اب جا کے جہنم کی تہ میں گرا ہے۔ پھر گھنٹے کے بعد خبر آئی کہ فلاں مشہور منافق جو ستر سال کا ہو چکا تھا مر کر جہنم رسید ہو گیا ہے۔ تو گویا کہ اس خبر نے اُس واقعے کی تاویل کو نمایاں کر دیا جسے آپ ﷺ نے ایک بلیغ تمثیل کے ذریعے بیان فرمایا تھا۔

تیسری بنیاد: روایت کیے جانے والے اخبار و آثار اگر متواتر ہوں تو قطعی ہوتے ہیں۔ تواتر کی دو قسمیں ہیں:

1۔ تواترِ صریح

2۔ تواترِ معنوی

تواتر معنوی کی پھر دو قسمیں ہیں: (حاشیہ)

1۔ تواترِ سکوتی: اس کا مطلب یہ ہے کہ خاموش رہ کر قبولیت اور رضامندی کا اظہار کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر: کوئی آدمی ایک گروہ کے سامنے کسی ایسے واقعے کی خبر دیتا ہے جو اُن کے سامنے وقوع پذیر ہوا ہو اور وہ گروہ اگر اس واقعے کو جھٹلاتا نہیں بلکہ اُس کا استقبال خاموشی کے ساتھ کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے یہ واقعہ قبول کر لیا ہے، اور خاص کر اس وقت جب کہ وہ واقعہ اس گروہ کے ساتھ تعلق بھی رکھتا ہو، اور وہ گروہ نقد و نظر کے لیے تیار ہو اور غلطی کو قطعاً قبول نہ کرتا ہو اور جھوٹ کو بہت برا سمجھتا ہو۔ ایسی صورت میں اس جماعت کا سکوت اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر قوی دلالت کرتا ہے۔

2: تواترِ معنوی کی دوسری قسم: یہ ہے کہ خبر دینے والے کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر تو متفق ہوں البتہ اُن کا اُس واقعہ کے بیان کرنے میں اختلاف ہو۔ مثال کے طور پر: ایک اُوقیہ کھانا کھانے سے دو سو آدمی سیر ہو گئے۔ خبر دینے والے اس واقعہ کی خبر مختلف صورتوں میں دیں گے، ایک شخص اس کے بارے میں ایک طریقے سے خبر دے گا، دوسرا کسی اور صورت میں، تیسرا کسی اور شکل میں۔ لیکن تمام کے تمام عین واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر متفق ہیں۔ پس حادثے کا مطلق شکل میں واقع ہونا قطعی اور متواتر بالمعنی ہے اور شکل و صورت کا اختلاف نقصان دہ نہیں۔

اِسی طرح کبھی خبرِ واحد بعض شرائط کے ساتھ تواتر کی طرح قطعیت کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اسی طرح خبرِ واحد کچھ خارجی علامات کے ساتھ یقین کا فائدہ دیتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کی طرف جو معجزات اور ان کی نبوت کے جو دلائل ہم تک پہنچے ہیں ان کی ایک بڑی قسم صریحی معنوی یا سکوتی تواتر کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ ایک دوسری قسم اگر چہ خبر

(حاشیہ) اس کتاب میں ذکر کیے جانے والا لفظ "تواتر" تر کی زبان میں بولے جانے والے تواتر کی معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ قوی خبر ہے جو یقین کا فائدہ دے اور اس میں جھوٹ کا احتمال نہ ہو۔ مؤلف۔

واحد کے ذریعے روایت کی گئی ہے لیکن مطلوبہ شرائط کے پائے جانے کی وجہ سے جرح وتعدیل کے ماہر محدثین کی نظروں میں قبولیت کے درجے پر فائز ہو جانے کی وجہ سے بہر صورت تواتر کی قطعیت کا فائدہ دے گی۔

جی ہاں؛ وہ خبرِ واحد جسے اُن ہزاروں محقق محدثین نے صحیح کہا جنہیں ''الحافظ'' کہا جاتا ہے، جو کم از کم ایک لاکھ حدیث کے حافظ ہیں، اور جسے اُن متقی محدثین نے صحیح کہا جنہوں نے پچاس سال تک فجر کی نماز عشاء کے وضوء کے ساتھ پڑھی۔ اور جسے صحاح سِتہ کے مصنفین جیسے علمِ حدیث کے تجربہ کار محدثین نے قبول کیا، جن میں بخاری اور مسلم سرِفہرست ہیں، ایسی خبرِ واحد ''تواتر'' کے درجے سے کم نہیں ہوتی ہے۔

جی ہاں، محققین اور نقادانِ فنِ حدیث نے اس حد تک تخصص حاصل کر لیا ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کے کلام، آپ ﷺ کے انداز اور بلند پایہ اُسلوب سے مانوس ہیں، اور انہوں نے اس میں ایسا ملکہ حاصل کر لیا ہے کہ اگر اُن میں کسی کو ایک سو حدیثوں کے مابین کوئی موضوع حدیث نظر آتی ہے تو وہ کہہ دیتا ہے: یہ موضوع ہے، یہ نہ تو حدیث ہے اور نہ ہی نبی ﷺ کا کلام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک ماہر صراف کی طرح حدیث کے جوہر کو پہچانتا ہے اور اس حدیث کو ردّ کر دیتا ہے اور کسی دوسرے کلام کو حدیث کے ساتھ خلط ملط نہیں ہونے دیتا۔

البتہ ابن جوزی جیسے بعض محققین نے نقد ونظر کے سلسلے میں کچھ افراط سے کام لیا ہے، چنانچہ اُنہوں نے بعض صحیح حدیثوں کو بھی موضوع کہہ دیا ہے۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ ہر ''موضوع'' معنی ومفہوم کے لحاظ سے غلط ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کلام حدیثِ رسول ﷺ نہیں ہے۔

سوال: محدثین جو غیر ضروری طور پر اور کسی معلوم واقعہ میں عَنْ فُلَانٍ ۔۔۔ عَنْ فُلَانٍ ۔۔۔ عَنْ فُلَانٍ کہتے ہیں، اس مُعنعَن سند کا کیا فائدہ ہے؟

الجواب: اس کے بہت سے فائدے ہیں: اُن میں سے ایک یہ کہ وہ متصل سند اُن صادق، ثقہ اور قابلِ حجت اصحابِ حدیث کے ایک طرح کے اجماع کو ظاہر کرتی ہے جو سند میں پائے جاتے ہیں۔ اور سند میں پائے جانے والے اہلِ تحقیق کے ایک طرح کے اتفاق کو ظاہر کرتی ہے۔ گویا کہ اس سند میں اور اس عنعنہ میں پایا جانے والا ہر امام اور ہر علاّمہ اس حدیث کے حکم پر دستخط کر رہا ہے اور اس کی صحت پر مہر لگا رہا ہے۔

سوال: ضروری احکامِ شرعیہ کی طرح معجزانہ واقعات بھی اہتمام بالغ اور متعدد طرق کے ساتھ متواتر صورت میں روایت کیوں نہیں کیے جاتے ہیں؟

الجواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اکثر اوقات فرضِ عین کی طرح اکثر شرعی احکام کے محتاج ہوتے ہیں، تو گویا کہ فرضِ عین کی طرح ان احکام کا ہر فرد کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ رہے معجزات، تو ہر آدمی ہر معجزے کا محتاج نہیں، اور اگر کبھی

ضرورت پڑ بھی جائے تو ان کے بارے میں ایک ہی دفعہ سُن لینا کافی ہو جاتا ہے، جیسا کہ فروض کفایہ ہیں کہ ان کے بارے میں بعض لوگوں کا جان لینا ہی کافی ہوتا ہے۔اس بنا پر کبھی کسی معجزے کا وجود اور اس کا ظہور پذیر ہونا کسی شرعی حکم کے مقابلے میں دس گنا زیادہ قطعی ہوتا ہے حالانکہ اُسے روایت کرنے والا ایک راوی ہوتا ہے یا دو، جبکہ شرعی حکم کو روایت کرنے والے دس بیس ہوتے ہیں۔

چوتھی بنیاد: بعض وہ واقعات جن کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے خبر دی ہے کہ وہ مستقبل میں ظہور پذیر ہوں گے وہ محض جزوی واقعات ہی نہیں ہیں بلکہ آپ ﷺ جزوی صورت میں بار بار رونما ہونے والے کلی واقعات کے بارے میں خبر دیتے ہیں، اور وہ کلی واقعہ کئی پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے آپ ﷺ ہر مرتبہ اس کے کسی نہ کسی پہلو کو بیان کر دیتے ہیں۔ لیکن پھر جب راوی ان تمام پہلوؤں کو کسی جگہ پر یکجا کرتا ہے تو کوئی چیز خلاف واقعہ سامنے آجاتی ہے۔

مثال کے طور پر:

مہدیؑ کے بارے میں روایات وتفصیلات مختلف اور خد وخال متغایر ہیں۔اور یہ چیز چوبیسویں مقالے کی ایک شاخ میں ثابت کر دی گئی ہے کہ: رسول اکرم ﷺ نے وحی کا سہارا لیتے ہوئے مہدیؑ کے بارے میں خبر دے دی ہے تاکہ وہ آنے والے ہر دور میں اہلِ ایمان کی معنوی قوّت کو محفوظ کر لیں، تاکہ اہلِ ایمان ہولناک حوادث تھپیڑوں میں اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ دیں اور تاکہ وہ اہلِ ایمان کو اپنے اُن اہلِ بیت کے بندھن میں معنوی طور پر باندھ کر رکھیں جو کہ عالمِ اسلام کے لیے ایک نورانی سلسلے کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ ہر دور نے آلِ بیت سے مہدیٔ آخر الزمان جیسا کوئی نہ کوئی بلکہ بہت سے مہدی پائے ہیں، حتی کہ اُس نے آلِ بیت میں سے شمار ہونے والے عباسی خلفاء میں سے مہدی کبیر کے بہت سے اوصاف رکھنے والا کوئی نہ کوئی مہدی ضرور پایا ہے یہی وجہ ہے کہ مہدیٔ کبیر سے پہلے آنے والے خلفائے مہدیین اور اقطاب مہدیین جیسے لوگوں کے اوصاف اصلی مہدی کے اوصاف کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں، اور اسی بنا پر اس ضمن میں روایت کی جانے والی روایات میں اختلاف واقع ہو گیا ہے۔

پانچویں بنیاد: رسول اکرم ﷺ ﴿وَلَا يَعْلَمُ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ﴾ کی رُو سے بذاتِ خود غیب کا علم نہیں رکھتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ علم دیتے تھے اور آپ ﷺ لوگوں کو بتا دیتے تھے۔اور اللہ تعالیٰ چونکہ حکیم ورحیم ہے اس لیے اس کی حکمت اور رحمت بہت سے غیبی اُمور کو پردے میں اور مخفی اور مبہم رکھنے کا تقاضا کرتی ہیں؛ اُس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو ناخوش کرنے والی چیزیں اس دنیا میں زیادہ ہیں اس لیے ان کے بارے میں پیشگی علم ہو جانا دکھ دیتا ہے۔اسی بنا پر موت اور اجل کو مخفی رکھا گیا ہے اور انسان پر نازل ہونے والے مصائب پردۂ غیب میں ہیں۔پس حکمتِ ربانیہ اور رحمتِ الٰہیہ کا تقاضا یہی ہے۔پس اسی بنا پر حکمت اور رحمت کا تقاضا یہ رہا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو اُن ہولناک مصائب وآلام کی

اطلاع نہ دے جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے اہلِ بیت پر آپ ﷺ کے صحابہ پر اور آپ ﷺ کی اُمت پر نازل ہونے والے تھے، تاکہ رسول اکرم ﷺ کی اس حساس رحمت اور گہری شفقت کو ٹھیس نہ پہنچے جو آپ ﷺ کے دل میں اپنی آل اور اپنے اصحاب کے لیے پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام چیزیں عمومی اور تفصیلی انداز سے تو بیان نہیں کیں (حاشیہ) البتہ بعض حکمتوں کے پیشِ نظر کچھ اہم واقعات کے بارے میں آپ ﷺ کو بتا دیا وہ بھی دہشت خیز انداز میں نہیں اور آپ ﷺ نے بھی اپنی اُمت کو خبر دے دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو کچھ اچھے واقعات کے بارے میں بھی بتا دیا، بعض کے متعلق اجمالی طور پر اور بعض کے متعلق تفصیل کے ساتھ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بھی ان کے بارے میں اپنی اُمت کو خبر دے دی۔

آپ ﷺ کے بتائے ہوئے ان واقعات کے تقوی، عدل اور صدق وصفا کے اعلیٰ درجے پر فائز اور ''وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ '' میں پائے جانے والے انداز سے لرزاں وترساں رہنے والے اور ﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ﴾ میں پائی جانے والی شدید دھمکی سے دُور بھاگنے والے باعمل محدثین نے ہم تک بالکل صحیح روایات کی صورت میں نقل کیا ہے۔

چھٹی بنیاد: رسول اکرم ﷺ کے احوال واوصاف سیرت وتاریخ کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر اوصاف واحوال آپ ﷺ کی بشریت کی عکاسی کرتے ہیں، حالانکہ رسالتمآب ﷺ کی معنوی شخصیت اور قُدسی ماہیت اس حد تک بلند اور نورانی ہے کہ سیر وتاریخ میں بیان کیے گئے اوصاف اُس بلند قد وقامت کے مناسب اور اس بلند قدرت و قیمت کے ساتھ ہم آہنگ اور ہم پلہ نہیں ہو سکتے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے صحیفۂ کمالات میں آپ ﷺ کی تمام اُمت کی عبادات کے برابر ہر دن حتی کہ آج تک بھی 'السَّبَبُ كَالْفَاعِلِ '' میں پائے جانے والے راز کی رُو سے ایک عظیم الشان عبادت کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور یوں آپ ﷺ ہر دن اپنی اُمت کی غیر محدود دعاؤں کا بے پایاں مظہر بن جاتے ہیں، جیسے کہ آپ ﷺ اپنی غیر محدود استعداد کے ذریعے غیر محدود صورت میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا مظہر بن جاتے ہیں۔

(حاشیہ) اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس بات کی مکمل طور پر اطلاع نہیں دی تھی، یہ ہے کہ: آپ نے اپنی ازواج مطہرات سے کہا تھا: ''تم میں سے کون ہے جس پر ''حوأب'' کے کتے بھونکیں گے۔ یعنی کاش میں جان لوں کہ تم میں سے کون ہے جو اس واقعہ میں شرکت کرے گی؟'' ۔ یہ اس لیے نہیں بتایا ہے کہ آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو اس معاملے میں تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔ البتہ اس کے بعد اس نے اجمالی طور پر کچھ کچھ بتا دیا۔ تب آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ''جب تمہارے اور عائشہ کے درمیان کوئی واقعہ رونما ہو تو ''فَارْفُقْ وَ بَلِّغْهَا مَأْمَنَهَا'' اُن کے ساتھ نرمی کرنا اور انہیں پرامن جگہ پر پہنچا دینا۔'' مؤلف

اور وہ بابرکت ذات جو کہ اس کائنات کا حاصل، اس کا کامل ترین پھل، اِس کے خالق کی ترجمان اور اس کی حبیب ہے، اُس کی تمام ماہیت اور اس کے کمالات کی حقیقت سیر و تاریخ میں لکھے گئے بشری احوال واطوار میں نہیں سما سکتی۔ مثال کے طور پر:

ایک ایسا بابرکت شخص کہ جبرئیلؑ و میکائیلؑ جس کے سامنے غزوۂ بدر میں دو نگران و نگہبان مشیر بنے ہوئے ہوں، وہ شخص اپنے ان حالات و اطوار و معاملات میں نہیں سما سکتا کہ جو اس وقت مشاہدے میں آئے جب آپ ﷺ کا ایک بدوی اعرابی سے گھوڑا خریدتے وقت تنازع چل رہا تھا اور آپ ﷺ نے حضرت حذیفہؓ کو گواہ بنایا اور وہ اُس وقت صرف اکیلے ہی گواہ تھے۔

اس لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ انسان اپنی نظر ہمیشہ بلند رکھے اور جب آپ ﷺ کے اُن معمول کے اوصاف کے بارے میں سُنے جو آپ ﷺ کی بشری ماہیت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تو اُن سے گزر کر آپ ﷺ کی حقیقی ماہیت اور مرتبۂ رسالت میں قائم نورانی معنوی شخصیت تک پہنچ جائے تاکہ گمراہی سے بچ جائے، وگرنہ یا بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھے گا یا شبہات کا شکار ہو جائے گا۔

اس راز کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل تمثیل سنو:

مثال کے طور پر: کھجور کی ایک گٹھلی ہے، اُسے مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ وہ پھوٹ کر ایک موٹا تازہ پھل دار درخت بن گئی ہے اور وہ آہستہ آہستہ مسلسل پھیلتی پھولتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یا مور کا ایک انڈا ہے، اس انڈے کو حرارت مہیا کی گئی تو اس سے مور کا ایک بچہ نکل آیا پھر وہ قدرت کی طرف سے بہترین سنہری نقوش و نگار کا حامل ایک کامل اور مکمل مور بن گیا، مسلسل بڑھتا اور خوبصورت ہوتا گیا۔

اب یہ سمجھو کہ کچھ حالات و اوصاف ایسے ہیں جو اس گٹھلی اور انڈے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور اس گٹھلی اور انڈے دونوں میں ایک دقیق مواد پایا جاتا ہے۔ اور ان سے نکلنے والے درخت اور پرندے میں بھی گٹھلی اور انڈے کی چھوٹی چھوٹی وضع قطع اور معمولی صفات کے مقابلے میں کچھ بلند پایہ صفات و کیفیات پائی جاتی ہیں، تو اب اس گٹھلی اور انڈے کے بارے میں بحث کرنے کے لیے اور ان دونوں کے اوصاف کو درخت اور پرندے کے اوصاف کے ساتھ جوڑنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بشر کی عقل اپنی آنکھ اُوپر اُٹھائے اور گٹھلی سے درخت کی طرف دیکھے اور اپنی نظر انڈے سے اُوپر اُٹھا کر پرندے کی طرف دیکھے اور اس میں ہر وقت غور کرتا رہے تاکہ اُس کی عقل اُن اوصاف کو قبول کر سکے جن کے بارے میں وہ سن رہا ہے۔ اگر اُس نے ایسا نہ کیا اور یہ کہہ دیا کہ: میں نے ایک درھم کے برابر گٹھلی سے ایک ٹن کھجوریں توڑی ہیں، یا یہ کہ یہ انڈا فضائے آسماں میں پرندوں کا بادشاہ ہے، تو تکذیب و انکار کی طرف مائل ہو جائے گا۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی بشریت بھی اس گٹھلی اور انڈے کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔ رہی آپ کی وظیفۂ رسالت کے ساتھ آب وتاب رکھنے والی ماہیت، تو اس کی حیثیت جنت کے شجرۂ طوبیٰ اور طیرِ ہمایوں کی سی ہے۔ اور وہ ہمہ وقت تکمیل وترقی کے مدارج طے کرتی رہتی ہے۔

اس بناپر جب وہ اُس شخص کے بارے میں غور کرے جس نے بازار میں ایک بدوی کے ساتھ تنازع کیا تھا، تو ضروری ہے کہ وہ اپنے خیال کی نظر کو اُوپر اُٹھائے اور اس نورانی شخص کو دیکھے جو رفرف یعنی براق پر سوار ہوا اور جبریلؑ کو پیچھے چھوڑ گیا اور تیز رفتاری کے ساتھ قاب قوسین تک جا پہنچا۔ وگرنہ سوءِ اَدب کا ارتکاب کر بیٹھے گا، یا پھر اس کا نفسِ امارہ اس بات کی تصدیق ہی نہیں کرے گا۔

پانچواں بلاغی اشارہ: ہم یہاں بطورِ مثال غیبی اُمور سے تعلق رکھنے والی احادیث کی کچھ مثالیں ذکر کریں گے۔

پہلی مثال: ہم تک صحیح اور متواتر درجے کی حدیث سے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت میں برسرِ منبر یہ فرمایا تھا کہ: "اِبۡنِیۡ حَسَنٌ سَیِّدٌ سَیُصۡلِحُ اللّٰہُ بِہٖ بَیۡنَ فِئَتَیۡنِ عَظِیۡمَتَیۡنِ"۔ چنانچہ چالیس سال کے بعد جب اسلام کے دو عظیم ترین لشکر آمنے سامنے آئے تو حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کر لی اور اس طرح آپ نے اپنے جدِّ امجد کے ایک غیبی معجزے کی تصدیق کر دی۔

نمبر 2: صحیح روایت کے مطابق آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: "سَتُقَاتِلُ النَّاکِثِیۡنَ وَ الۡقَاسِطِیۡنَ وَالۡمَارِقِیۡنَ"۔ یہ بات کہہ کر آپ ﷺ نے واقعۂ جمل، واقعہ صفّین اور واقعہ خوارج والی جنگ کی خبر دی۔

اسی طرح جب علیؓ اور زبیرؓ کو باہم دگر محبت کرتے دیکھا۔ تو آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "اِنَّ ھٰذَا سَیُحَارِبُكَ وَ لٰکِنَّهٗ بَاغٍ"۔ "یہ عنقریب تمہارے ساتھ جنگ کرے گا، لیکن یہ باغی ہوگا"

اسی طرح آپ ﷺ نے اپنی اَزواج مطہراتؓ سے فرمایا تھا: "اِنَّ وَاحِدَةً بَیۡنَکُنَّ سَتَقُوۡدُ فِتۡنَةً مُّھِمَّةً، وَیُقۡتَلُ حَوۡلَھَا کَثِیۡرُوۡنَ وَ تَنۡبَحُ عَلَیۡھَا کِلَابُ الۡحَوۡأَبُ"۔ "تم میں سے ایک عنقریب ایک اہم فتنے کی قیادت کرے گی اور اس کے اردگرد بہت سے لوگ قتل ہوں گے اور اُس پر "حوأب" کے کتے بھونکیں گے" چنانچہ علیؓ کا تیس سال بعد واقعۂ جمل میں عائشہؓ زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما کے خلاف لڑنا، صفّین میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف اور حروراء اور نہروان میں خوارج کے خلاف لڑنا قطعی طور پر صحیح احادیث اور غیبی خبروں کی ایک فعلی تصدیق تھی۔

اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ایک شخص کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ "سَیَبُلُّ لِحۡیَتَكَ بِدَمِ رَأۡسِكَ"۔ حضرت علیؓ اس شخص کو پہچانتے بھی تھے، اور وہ تھا عبدالرحمان بن ملجم خارجی۔

اسی طرح آپ ﷺ نے خارجیوں کے ایک شخص کے بارے میں خبر دی جسے "ذو الثدیة" کہا جاتا تھا، آپ ﷺ

نے اس کی پہچان ایک عجیب سی علامت کے ساتھ کروائی تھی۔ چنانچہ وہ آدمی خارجیوں کے مقتولوں کے درمیان پایا گیا تو اس سے حضرت علیؓ نے اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل لی اور معجزۂ نبویہ کا اعلان فرمایا۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے صحیح روایت کے مطابق اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر لوگوں کو یہ خبر دی تھی کہ: "اِنَّ الْحُسَیْنَ سَیُقْتَلُ فِی "طَفّ" یَعْنِیْ کَرْبَلَاء" ۔ چنانچہ پچاس سال کے بعد یہ زہرہ گداز واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا اور اس نے اس غیبی خبر کی تصدیق کر دی۔

اسی طرح آپ ﷺ نے بار بار یہ خبر دی کہ: "اِنَّ آلَ بَیْتِیْ یَلْقَوْنَ بَعْدِیْ قَتْلًا وَتَشْرِیْدًا" ۔ "میرے اہلِ بیت میرے بعد قتل اور بے قدری سے دوچار ہوں گے" مطلب یہ کہ قتل و آزمائش اور جلاوطنی جیسے مصائب سے دوچار ہوں گے۔ آپ ﷺ نے یہ بات ذرا وضاحت کے ساتھ فرما دی۔۔۔اور پھر بعینہٖ اسی طرح ہوا۔

یہاں ایک اہم سوال اُبھرتا ہے کہ

کہا جاتا ہے کہ: خلافت کے مکمل طور پر اہل ہونے، رسول اکرم ﷺ کے قرابت دار ہونے اور غیر معمولی علم اور بہادری کا نمونہ ہونے کے باوجود بھی حضرت علیؓ کو خلافت کے لیے سب سے آگے کیوں نہ کیا گیا اور یہ کہ آپؓ کے دورِ خلافت میں بہت زیادہ حد تک اختلافات کی آماجگاہ کیوں بنا رہا؟

الجواب: آلِ بیت کے ایک قُطبِ اعظم نے یہ کہا ہے کہ: رسول اکرم ﷺ خلافت حضرت علیؓ کو دینا چاہتے تھے لیکن غیب سے آپ ﷺ کو یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد کوئی اور ہے، تو آپ ﷺ نے اپنے ارادے کو خیر باد کہا اور مرادِ الٰہی کی اتباع کی۔

اب یہ ضروری ہے کہ مرادِ الٰہی میں پائی جانے والی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہو کہ: صحابہ کرامؓ کو وفاتِ نبوی کے بعد اتفاق و اتحاد پر اکٹھا ہونے کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ اس لیے اگر حضرت علیؓ سردار بن جاتے تو آپؓ کی مشہورِ عالم شجاعت، زہد و استغناء اور بہادری کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ نہ چلنے اور بے پرواہانہ طور اطوار کی وجہ سے اس بات کا قوی احتمال تھا کہ بہت سے افراد اور قبائل میں حسد و رشک کی رگ پھڑک جاتی اور یہ چیز تفرقہ و اختلاف کا باعث بن جاتی؛ آپؓ کے دورِ خلافت میں جو حادثات و واقعات رُونما ہوئے وہ اس احتمال کی بہت بڑی شہادت ہیں۔

اسی طرح اُن کی خلافت کی تاخیر کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جیسے کہ نبی ﷺ نے خبر دے دی تھی کہ انتہائی درجے کی مختلف اور متباین اقوام کہ جن میں سے ہر قوم بعد کو ظہور میں آنے والے تہتر فرقوں کے بنیادی افکار کی حامل تھی، ایسی اقوام کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی وجہ سے ان اقوام کے درمیان جو فتنہ خیز حوادث ظہور میں آئے اُن حوادث کے ساتھ نپٹنے کے لیے آلِ بیت جیسی مضبوط قوت اور علیؓ جیسے غیر معمولی فراست اور جسارت کے مالک ہاشمی کی بہت زیادہ ضرورت تھی

تا کہ وہ ان فتنوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہے۔ جی ہاں؛ بلاشبہ وہ ثابت قدم رہے جیسے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے اس فرمانِ گرامی کے ذریعے خبر دی تھی:

"اِنِّی حَارَبْتُ لِتَنْزِیْلِ الْقُرْآنِ وَاِنَّكَ سَتُحَارِبُ لِتَأْوِیْلِهٖ" ۔"میں نے قرآن کی تنزیل کے لیے جنگ کی ہے اور تُو اس کی تاویل کے لیے کرے گا"

پھر یہ بھی ہے کہ اگر علیؓ نہ ہوتے تو اس بات کا قوی احتمال تھا کہ دنیا کی سلطنت اُموی خلفاء کو راہِ راست سے کلی طور پر گمراہ کر دیتی ،لیکن چونکہ اُنہیں اپنے سامنے علیؓ اور اہلِ بیت نظر آ رہے تھے اس لیے وہ مسلمانوں کی نظروں میں اپنے مقام کی حفاظت کرنے کے لیے اُن کے مقابلے میں توازن برقرار رکھنے پر مجبور رہے۔ اِسی بنا پر ان کے پیروکاروں، خیر خواہوں اور مددگاروں نے اِسلامی و ایمانی حقائق اور قرآنی احکام کی حفاظت اور نشر و اشاعت کے لیے اپنی پوری قوت کے ساتھ تگ و دو کی اور اُموی خلافت کے خلفاء کی ترغیب و تحریض اور ہر حال میں حوصلہ افزائی کے ذریعے لاکھوں محقق مجتہدین، کامل محدثین اور اولیاء و اَصفیاء پیدا کیے۔ اگرچہ وہ سب بذاتِ خود یہ کام نہیں کرتے تھے۔ پس اگر ان کے سامنے اہلِ بیت کے کمالات، ان کی دین داری اور ان کی قوی ولایت نہ ہوتی تو اُن کا کلّی طور پر راہِ راست سے ہٹ جانے کا احتمال تھا، جیسے کہ اُمویوں اور عباسیوں کے آخری ادوار میں ہوا۔

اگر کہا جائے کہ: خلافتِ اسلامیہ اہلِ بیت نبوی میں برقرار کیوں نہ رہ سکی، حالانکہ وہ اس کے زیادہ اہل اور حق دار تھے؟

الجواب: دنیاوی سلطنت دھوکے باز ہے، جبکہ اہلِ بیت کو اسلامی حقائق اور قرآنی احکام کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اور جو شخص خلافت و سلطنت کی باگ ڈور سنبھالتا ہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو نبی کی طرح معصوم ہو، یا پھر خلفائے راشدین، عمر بن عبدالعزیز اور مہدی عباسی کی طرح غیر معمولی زُہدِ قلبی کا مالک ہو تا کہ فریب نہ کھا سکے۔ چنانچہ مصر میں اہلِ بیت کے نام سے قائم ہونے والی دولتِ فاطمیہ، افریقہ میں دولت موحدین اور ایران میں دولتِ صفویہ اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دنیاوی سلطنت اہلِ بیت کے شایانِ شان نہیں؛ کیونکہ یہ چیز اُنہیں ان کی اصلی ذمہ داری یعنی حفظِ دین اور خدمتِ اسلام کی ذمہ داری فراموش کروا دیتی۔ اور جب ان لوگوں نے سلطنت کو چھوڑا تو بلند پایہ، تابناک صورت میں اسلام اور قرآن کی خدمت کی، چنانچہ امام حسنؓ کی نسل سے مسلسل آنے والے اقطاب اور خاص کر اقطابِ اربعہ اور خصوصی طور پر غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو ہی دیکھ لیں۔ اور امام حسینؓ کی نسل سے آنے والے ائمۂ کرام کو اور خاص کر زین العابدینؒ اور جعفر صادقؒ کو دیکھ لیں، ان میں سے ہر ایک اپنی ذات میں ایک معنوی مہدی کے حکم میں ہے، چنانچہ ان لوگوں نے معنوی ظلم و ظلمات کے پردے چاک کیے اور قرآنی انوار اور ایمانی حقائق کو پھیلایا اور ثابت کر

دیا کہ وہ اپنے جدِ اَمجد کے وارث ہیں۔

اگر کہا جائے کہ:

اُس وحشت خیز فتنے میں کیا حکمت تھی جس سے اسلام عصرِ سعادت میں دوچار رہا، اور اس میں رحمت کا کون سا پہلو پایا جاتا ہے؟ کیونکہ وہ لوگ اس قہر کے متحمل نہیں تھے؟

الجواب: جس طرح بہار کے موسم میں بارش والی تیز دہشت خیز آندھی ہر گروہ کی جڑی بوٹیوں، بیجوں اور درختوں کی استعداد کو ہلا کر رکھ دیتی ہے اور ان کی صلاحیتوں کو نمایاں کر دیتی ہے، اور یوں اُن میں سے ہر جڑی بوٹی کے خصوصی پھول کھل جاتے ہیں اور وہ اپنی فطری ذمہ داری کو نبھانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ فتنہ جس سے صحابہ کرام اور تابعین دوچار ہوئے اس نے مختلف اور متغایر استعدادوں اور صلاحیتوں کو جو کہ گٹھلیوں کا حکم رکھتی تھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا، انہیں تازیانہ لگایا اور ہر گروہ کو خبردار کیا کہ اسلام خطرے سے دوچار ہے اور آگ بھڑک اٹھی ہے۔ انہیں اسلام کی حفاظت پر اُبھارا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے ہر گروہ نے اپنی استعداد کے مطابق اسلام کی شیرازہ بندی کے لیے بہت سے مختلف وظائف میں سے کوئی نہ کوئی وظیفہ اپنے سر لے لیا اور اُسے نبھانے کے لیے پوری محنت، سنجیدگی اور تگ ودو سے کام لیا، چنانچہ ان میں سے بعض نے احادیث کو محفوظ کرنے کی کوشش کی، بعض نے شریعت کو محفوظ کرنے کی، بعض نے ایمانی حقائق کو محفوظ کرنے کی اور بعض نے قرآن کو محفوظ کرنے کی جدوجہد کی، اور یوں ہر گروہ کسی نہ کسی خدمت میں لگ گیا اور ہر ایک نے پوری تندہی اور سرگرمی سے اسلام کی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ اِس تیز آندھی کی بدولت عالمِ اسلام کے وسیع ترین علاقے میں رنگا رنگ کے پھول کھلے اور بہت سے بیج بوئے گئے، چنانچہ اس نے آدھی زمین کو ایک گلستان میں تبدیل کر دیا۔ لیکن افسوس کہ ان پھولوں کے درمیان اور اس گلستان میں اہلِ بدعت کے بہت سے فرقوں کے کانٹے بھی نمودار ہو گئے۔۔۔ تو گویا کہ دستِ قدرت نے اس دور کو اپنے جلال کے ذریعے پاک صاف کر دیا اور اُسے پوری شدّت کے ساتھ حرکت دی اور اُس کی منصوبہ سازی کی، اہلِ ہمت کی غیرت وحمیت کو اُبھارا اور انہیں کرنٹ دیا۔ چنانچہ اُس نے اِس حرکت سے پھوٹنے والی مرکزی قوّت کی بدولت بہت سے تابناک مجتہدین، درخشاں محدثین، قدسی حُفاظ اور اصفیاء واولیاء کو محوِ پرواز کیا اور انہیں مہاجر بنا کر عالمِ اسلام کے علاقوں میں بھیج دیا، اہلِ اسلام کو مشرق سے لے کر مغرب تک ہیجان میں مبتلا کر دیا اور قرآن کے خزانوں سے استفادہ کرنے کے لیے ان کی آنکھیں کھول دیں۔۔۔ اب ہم موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے جن غیبی اُمور کی خبر دی ہے اور وہ بالفعل اُسی طرح وقوع پذیر ہوئے ہیں جیسے آپ ﷺ نے خبر دی ہے، وہ اُمور ہزاروں تک جا پہنچتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر ان میں سے چند ایسی مثالوں کی طرف اشارہ کریں گے جن کی صحت پر صحاحِ ستہ کے مؤلفین متفق ہیں، جن میں بخاری اور مسلم سرفہرست ہیں۔ ان میں سے بعض

اُمور تو معنی کے لحاظ سے متواتر نقل ہوئے ہیں۔ اور بعض تو اُن میں سے ایسے ہیں کہ اہلِ تحقیق اُن کی صحت پر متفق ہیں اس بنا پر کیا جا سکتا ہے کہ یہ متواتر کی طرح قطعی ہیں۔

☆ آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خبر دی کہ: ''تم لوگ عنقریب اپنے تمام دشمنوں پر غالب آ جاؤ گے۔ اور مکہ، خیبر، شام، عراق، ایران اور بیت المقدس کو فتح کر لو گے''۔ اور آپ ﷺ نے انہیں خبر دی کہ: ''عنقریب تم آپس میں شاہانِ ایران وروم کے خزانے تقسیم کرو گے'' وہ ایران اور روم جو کہ اس وقت کی عظیم ترین سلطنتیں تھیں۔ اس ضمن میں آپ ﷺ نے اس طرح نہیں فرمایا کہ میں یہ سمجھتا ہوں، یا میرا خیال ہے کہ آپ ایسے کرو گے وغیرہ، بلکہ قطعی طور پر ایسے خبر دی ہے کہ گویا آپ ﷺ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، اور پھر ویسے ہی ہوا جیسے آپ ﷺ نے خبر دی تھی۔ اور جس وقت آپ ﷺ نے یہ خبر دی تھی اس وقت آپ ﷺ ہجرت کرنے پر مجبور تھے، آپ ﷺ کے صحابہ قلیل تعداد میں تھے اور مدینہ کے قرب وجوار اور تمام دنیا والے دشمن تھے۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق کئی دفعہ فرمایا: ''عَلَيْكُمْ بِسِيرَةِ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ، أَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ'' ۔ مطلب یہ کہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کے بعد زندگی گزاریں گے اور آپ ﷺ کے خلیفہ بنیں گے اور اللہ اور اس کے نبی ﷺ کی رضامندی کے دائرے میں رہ کر خلافت کی ذمہ داریاں پوری کریں گے۔ اور یہ کہ ابو بکر تھوڑی عمر پائیں گے اور عمر طویل زندگی پائیں گے اور بہت سی فتوحات حاصل کریں گے۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''زُوِيَتْ لِيَ الْأَرْضُ، فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَ مَغَارِبَهَا، وَسَيَبْلُغُ مُلْكُ أُمَّتِيْ مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا'' ۔ پس آپ ﷺ نے خبر دی کہ زمین مشرق سے لے کر مغرب تک میری اُمت کے ہاتھ آ جائے گی۔ اور یہ کہ کوئی بھی اُمت کی بادشاہت کی مقدار اس حد تک نہیں پہنچے گی۔ اور پھر جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا ویسے ہی ہوا۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق غزوہ بدر سے پہلے فرمایا: ''هَذَا مَصْرَعُ أَبِيْ جَهْلٍ ، هَذَا مَصْرَعُ عُتْبَةَ، هَذَا مَصْرَعُ أُمَيَّةَ، هَذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ وَ فُلَانٍ''۔

اور یوں آپ ﷺ نے رؤسائے مشرکین قریش میں سے ہر ایک کا مقتل دکھا دیا اور فرمایا: ''اُبی بن خلف کو میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا'' اور پھر اُسی طرح ہوا جیسے آپ ﷺ نے خبر دی تھی۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق فرمایا: ''أَخَذَ الرَّايَةَ زَيْدٌ فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَهَا ابْنُ رَوَاحَةَ فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَهَا جَعْفَرٌ فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَهَا سَيْفٌ مِنْ سُيُوفِ اللّٰهِ ''۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو علیحدہ علیحدہ تمام واقعات کی ایسے اطلاع دی جیسے کہ آپ ﷺ ان صحابہ کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں جو کہ اُس وقت ایک مہینے کی مسافت پر شام کی سرحدوں پر واقع مؤتہ نامی جگہ پر لڑ رہے تھے۔ چنانچہ دو تین ہفتوں کے بعد یعلی بن

مُنیۃ میدانِ جنگ سے لوٹے تو اُن کے کچھ بتانے سے پہلے ہی آپ ﷺ نے جنگ کی تمام تفصیلات بیان کر دیں۔ تو یعلیٰ نے قسم کھا کر کہا: بالکل اُسی طرح ہوا ہے جیسے آپ ﷺ نے فرمایا۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق فرمایا:

''اِنَّ الْخِلَافَةَ بَعْدِیْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَضُوْضًا وَاِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ بَدَأَ نُبُوَّةً وَ رَحْمَةً ثُمَّ يَكُوْنُ رَحْمَةً وَ خِلَافَةً ثُمَّ يَكُوْنُ مُلْكًا عَضُوْضًا ثُمَّ يَكُوْنُ عُتُوًّا وَ جَبْرُوْتًا'' ۔ چنانچہ اس طرح آپ ﷺ نے حضرت حسنؓ کی چھ ماہ کی خلافت سمیت چاروں خلفائے راشدین کی خلافت کی مدت کی خبر دے دی۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اِن کے بعد خلافت سلطنت کی شکل اختیار کر جائے گی۔ پھر اس سلطنت کے بعد جبروت اور اُمت کا فساد رونما ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی طرح واقع ہوا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق فرمایا: ''يُقْتَلُ عُثْمَانُ وَهُوَ يَقْرَأُ الْمُصْحَفَ وَاِنَّ اللّٰهَ عَسَى اَنْ يُلْبِسَهُ قَمِيْصًا وَاَنَّهُمْ يُرِيْدُوْنَ خَلْعَهُ'' ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خبر دے دی کہ عثمانؓ خلیفہ بنیں گے اور ان سے خلافت کی دستبرداری کا مطالبہ کیا جائے گا، اور انہیں ظلم و تشدد سے اس وقت شہید کر دیا جائے گا جب وہ قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف ہوں گے۔ اور پھر اسی طرح ہوا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

☆ اسی طرح قطعی صحیح روایت کے مطابق جب آپ ﷺ نے سینگی لگوائی تو عبداللہ بن زبیرؓ نے از راہِ تبرّک آپ ﷺ کا مبارک خون پانی کی طرح پی لیا، اُس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ''وَيْلٌ لِلنَّاسِ مِنْكَ ، وَوَيْلٌ لَكَ مِنَ النَّاسِ'' ۔ اس طرح آپ ﷺ نے خبر دی کہ وہ اپنی بے نظیر شجاعت کے بل پر اُمت کی سربراہی کریں گے، خوفناک یلغاروں سے دوچار ہوں گے اور ان کی وجہ سے لوگ ہولناک حوادث کا شکار ہوں گے۔ اور پھر اُسی طرح ہوا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیرؓ نے اُموی دور میں مکہ مکرمہ میں اپنی خلافت کا اعلان کیا اور اُن کے ساتھ ایک بہادر سورمے کی طرح پنجہ آزما رہے۔ تا آنکہ حجاج بن یوسف جیسے ظالم نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ان کا محاصرہ کر لیا۔ اور یوں آپ کو شدید خونیں معرکے کے بعد شہید کر دیا گیا۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق دولتِ بنو اُمیہ کے ظہور میں آنے کی خبر دی اور بتایا کہ ان کے اکثر بادشاہ ظالم ہوں گے۔ ان میں یزید اور ولید جیسے لوگ بھی ہوں گے، اور یہ کہ معاویہؓ اُمت کے سربراہ بنیں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں ''وَاِذَا مَلَكْتَ فَأَسْجِحْ'' کہہ کر نرمی اور عدل کی وصیت کی۔

اور آپ ﷺ نے خبر دی کہ اُمویوں کے بعد دولتِ عباسیہ ظہور میں آئے گی اور ایک لمبی مدت گزارے گی۔ چنانچہ فرمایا: ''يَخْرُجُ وَلَدُ الْعَبَّاسِ بِالرَّايَاتِ السُّوْدِ وَ يَمْلِكُوْنَ اَضْعَافَ مَا مَلَكُوْا'' ۔ چنانچہ اسی طرح واقع ہوا جیسے

آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق فرمایا: "وَیْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ" ۔اور یوں آپ ﷺ نے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے دہشت خیز فتنے کے بارے میں خبر دی اور بتایا کہ یہ دونوں عربوں کی عباسی سلطنت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں۔

چنانچہ اسی طرح ہوا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اس وقت فرمایا جب وہ بہت زیادہ بیمار تھے: "لَعَلَّكَ تُخَلَّفُ حَتّٰى يَنْتَفِعَ بِكَ اَقْوَامٌ، وَيُسْتَضَرَّ بِكَ آخَرُوْنَ "۔اس طرح آپ ﷺ نے یہ خبر دی کہ وہ عنقریب مستقبل میں ایک عظیم الشان قائد بنیں گے اور بہت سی فتوحات کریں گے اور اُن سے بہت سی قومیں نفع اُٹھائیں گی، یعنی مسلمان ہو جائیں گی۔ اور یہ کہ اُن کے ہاتھوں بہت سی قومیں نقصان اٹھائیں گی، یعنی اُن قوموں کی حکومتیں اُن کے ہاتھوں ختم ہو جائیں گی۔ چنانچہ اُسی طرح ہوا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا، اور وہ اس طرح کہ حضرت سعدؓ نے اسلامی فوج کی قیادت کی اور ایرانی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس طرح آپؓ بہت سی اقوام کے لیے ہدایت پانے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا سبب بن گئے۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق اپنے صحابہ کو شاہ حبشہ نجاشی کی وفات کی خبر دی جو ہجرت کے ساتویں سال فوت ہوا تھا اور ایمان بھی لا چکا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں اُس کی وفات کی خبر اسی دن دی حتی کہ آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ پھر ایک ہفتے کے بعد خبر آئی کہ اُس کی وفات عین اُسی دن ہوئی تھی جس دن آپ ﷺ نے بتایا تھا۔

☆اسی طرح آپ ﷺ ایک دفعہ خلفائے اربعہ کے ہمراہ جبلِ احد یا حراء پر تھے کہ اچانک پہاڑ کپکپا اُٹھا اور اس پر لرزہ طاری ہوگیا۔ تو آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق پہاڑ سے فرمایا: "اُثْبُتْ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَصِدِّيْقٌ وَ شَهِيْدٌ"۔ چنانچہ اس طرح آپ ﷺ نے خبر دی کہ عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ شہادت کے درجے پر فائز ہوں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔

اَب اے دل سے محروم بد بخت مسکین اور درماندہ انسان! تو کہتا ہے کہ محمد عربی ﷺ ایک ذہین انسان تھے اور اس طرح اُس آفتابِ حقیقت کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے، آپ ﷺ کے کلی معجزات کی پندرہ انواع و اقسام میں سے اُمورِ غیبیہ صرف ایک نوع کا حکم رکھتے ہیں۔ اور تو نے ان اُمورِ غیبیہ کی پندرہ یا سو اقسام میں سے صرف ایک قسم کے بارے میں سُنا ہے۔ اور ان میں سے بھی تو نے صرف وہ واقعات سنے ہیں جو قطعی طور پر تواترِ معنوی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب جو آدمی عقل کی آنکھ سے غیبی خبروں کی ان سو اقسام میں سے صرف ایک قسم ہی دیکھ لے اس کے بارے میں یہ کہا

جائے گا کہ وہ ایک عبقری انسان ہے جس پر اُس کی فہم و فراست کی وجہ سے مستقبل کے حالات منکشف ہو جاتے ہیں۔ چلو ہم بھی تیری طرح یہی کہہ دیں کہ وہ ایک عبقری انسان تھے، تو اب یہ بتا کہ جو آدمی سینکڑوں عبقریوں کے درجے کی مقدس عبقریت کا مالک ہو اُس کی نگاہ دھوکہ کھا سکتی ہے؟ کیا وہ اتنا نیچے گر سکتا ہے کہ غلط قسم کی خبریں دیتا رہے؟

پس اس طرح کی سو درجے کی عبقریت کا حامل انسان جب سعادتِ دارین کے ساتھ تعلق رکھنے والی باتیں بتائے تو اُن سے پہلوتہی کر کے سنی اَن سنی کر دینا سو درجے کے پاگل پن کی علامت ہے!۔

چھٹا بلاغی اشارہ

قطعی صحیح روایت کے مطابق آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: " أَنْتِ أَوَّلُ أَهْلِ بَيْتِي لَحُوقًا بِي " ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے ذکر کیا کہ میرے اہلِ بیت میں سے تُو سب سے پہلے وفات پائے گی اور مجھ سے آ ملے گی۔ اور پھر چھ مہینے بعد ہی بعینہٖ اُسی طرح ظہور میں آ گیا جیسے کہ آپ ﷺ نے خبر دی تھی۔

☆ آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تھا، "سَتُخْرَجُ مِنْ هُنَا، وَتَعِيشُ وَحْدَكَ، وَتَمُوتُ وَحْدَكَ"۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہ خبر دی کہ انہیں مدینہ سے جلا وطن کر دیا جائے گا اور وہ اپنی زندگی اکیلے پن میں گزاریں گے اور صحراء میں تنہائی کے عالم میں وفات پائیں گے۔ اور پھر بیس سال کے بعد ایسا ہی ہوا۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ حضرت انسؓ بن مالک کی خالہ اُمِ حرام کے گھر نیند سے بیدار ہوئے تو مسکراتے ہوئے فرمایا: " رَأَيْتُ أُمَّتِي يَغْزُوْنَ فِي الْبَحْرِ كَالْمُلُوْكِ عَلَى الْأَسِرَّةِ "

تو اُمِ حرام نے فوراً التجا کی کہ حضور دعا فرمائیں کہ میں بھی اُس وقت اُن کے ساتھ رہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ان کے ساتھ رہو گی''۔ چنانچہ پھر چالیس سال کے بعد آپ نے اپنے شوہر عبادہؓ بن صامت کے ہمراہ قبرص کی فتح کے لیے سفر کیا تو وہیں آپ کی وفات ہو گئی اور اُن کی قبر زیارت گاہ بن گئی۔ اور معاملہ بعینہٖ اُسی طرح ظہور میں آیا جیسے کہ آپ ﷺ نے خبر دی تھی۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی طور پر صحیح روایت کے مطابق فرمایا: "يَخْرُجُ مِنْ ثَقِيفَ كَذَّابٌ وَمُبِيرٌ" یعنی قبیلہ ثقیف کا کوئی آدمی نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اور اس قبیلے سے عنقریب ایک ظالم اور سفاک آدمی سر اُٹھائے گا۔ یوں آپ نے مشہور مدعی نبوت مختار ثقفی اور ظالم حجاج بن یوسف کے بارے میں خبر دی جس نے ایک لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیے تھے۔

☆ اِسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق فرمایا: "سَتُفْتَحُ الْقُسْطَنْطِينِيَّةُ، فَنِعْمَ الْأَمِيْرُ أَمِيْرُهَا وَنِعْمَ الْجَيْشُ جَيْشُهَا" اس طرح آپ ﷺ نے خبر دی کہ استنبول اسلام کے ہاتھوں فتح ہو جائے گا اور سلطان

محمد فاتح ایک بلند پایہ مرتبے پر فائز ہو جائے گا۔ اور معاملہ بعینہٖ اُسی طرح ظہور میں آیا جیسے آپ ﷺ نے خبر دی تھی۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق فرمایا: "إِنَّ الدِّيْنَ لَوْ كَانَ مَنُوْطًا بِالثُّرَيَّا لَنَالَهُ رِجَالٌ مِنْ أَبْنَاءِ فَارِسَ" ۔اس سے آپ ایک بے نظیر صورت میں ایران میں پیدا ہونے والے علماء واولیاء کی طرف اشارہ کررہے ہیں اور ان کے بارے میں خبر دے رہے ہیں۔ اور ان میں سرِ فہرست امام ابو حنیفہؒ ہیں۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: "عَالِمُ قُرَيْشٍ يَمْلأُ طِبَاقَ الْأَرْضِ عِلْمًا" ۔ چنانچہ آپ ﷺ اس سے امام شافعیؒ کی طرف اشارہ کررہے ہیں اور ان کے بارے میں خبر دے رہے ہیں۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح حدیث کے مطابق فرمایا: " سَتَفْتَرِقُ أُمَّتِيْ ثَلَاثًا وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً، اَلنَّاجِيَةُ وَاحِدَةٌ مِنْهَا قِيْلَ مَنْ هُمْ؟ قَالَ مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ" ۔ چنانچہ آپ ﷺ اس سے یہ خبر دے رہے ہیں کہ آپ ﷺ کی اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور یہ کہ مکمل طور پر نجات پانے والا فرقہ اہل السنۃ والجماعۃ ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: "اَلْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ" ۔ چنانچہ اس طرح آپ ﷺ نے ایک ایسے گروہ کی خبر دی جو تقدیر کا منکر ہے اور بہت سی شاخوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اسی طرح روافض کے بارے میں بھی خبر دی جو کہ بہت سی شاخوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق حضرت علیؓ سے فرمایا: ''عیسیٰؑ کی طرح تیرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے: محبت میں افراط کرنے والا اور دوسرا دشمنی میں افراط کرنے والا''۔ کیونکہ نصاریٰ نے عیسیٰؑ کو حدِ شرعی سے تجاوز کر جانے والی محبت کی وجہ سے۔ حاشا وکلا۔ اللہ کا بیٹا کہہ دیا۔ اور یہودیوں نے اُن کی دشمنی میں حد سے بہت زیادہ تجاوز کی تو اُن کی نبوت اور ان کے کمال کا انکار کر دیا۔ اور کچھ لوگ تمہارے بارے میں بھی حدِ شرعی سے تجاوز کریں گے اور تمہارے ساتھ محبت کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے، چنانچہ آپ ﷺ نے اُن کے بارے میں فرمایا: "لَهُمْ نَبَزٌ يُقَالُ لَهُمُ الرَّافِضِيَّةُ" ۔اور کچھ لوگ تمہاری عداوت میں افراط سے کام لیں گے، اور وہ خوارج ہیں۔ اور کچھ لوگ اُمویوں کے پیروکاروں میں سے افراط سے کام لیں گے، انہیں ''ناصبہ'' کہا جائے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ: قرآن اہلِ بیت کے ساتھ محبت کا حکم دیتا ہے، اور نبی ﷺ نے اس پر بہت اُبھارا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ محبت شیعوں کے لیے عذر کی کوئی شکل پیدا کر دے؛ کیونکہ اہلِ محبت کسی حد تک بے سدھ اور مدہوش ہوتے ہیں، تو پھر شیعہ اور خاص کر رافضہ اس محبت سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے؟ بلکہ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ''فرطِ محبت'' کا ارتکاب کررہے ہیں جیسے کہ نبی ﷺ نے اشارہ کیا ہے؟

الجواب: محبت کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی: علیؓ، حسنؓ، حسینؓ اور اہلِ بیت کے ساتھ حرفی معنی کے لحاظ سے یعنی اللہ اور رسول اکرم ﷺ کی وجہ سے محبت رکھنا۔ یہ محبت رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ محبت میں اضافہ کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا وسیلہ ہے۔ اور یہ محبت مشروع ہے، اس میں اِفراط نقصان نہیں دیتا، یہ حد سے تجاوز نہیں کرتی اور دوسروں کی مذمت کرنے اور ان کے ساتھ دشمنی رکھنے کا تقاضا نہیں کرتی۔

دوسری محبت ''اسمی معنی'' کے لحاظ سے ہے، یعنی یہ کہ انسان اُن کے ساتھ ذاتی محبت رکھتا ہے، حضرت علیؓ کی بہادریوں، دلیریوں اور ان کے کمالات کا اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے بلند مرتبہ کمالات کا تصوّر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ نبی ﷺ کا تصوّر کیے بغیر محبت رکھتا ہے، اس حد تک کہ اگر وہ اللہ کو نہیں جانتا اور نبی ﷺ کو نہیں پہچانتا تو بھی اُن کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ ایسی محبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا سبب نہیں بنتی۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اس میں جب افراط دَر آتا ہے تو یہ دوسروں کی مذمت کرنے اور ان کے ساتھ دشمنی رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس بنا پر یہ لوگ علیؓ کے ساتھ فرطِ محبت کی وجہ سے ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ سے براءت کا اظہار کر کے اشارۂ نبویہ کے مصداق خسارے میں جا پڑے ہیں۔ اور یہ سلبی محبت خسارے کا سبب ہے۔

☆ اِسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق فرمایا: ''اِذَا مَشَوُا الْمُطَیْطَاءَ وَ خَدَمَتْهُمْ بَنَاتُ فَارِسَ وَالرُّوْمِ، رَدَّاللّٰهُ بَأْسَهُمْ بَیْنَهُمْ وَ سَلَّطَ شِرَارَهُمْ عَلٰی خِیَارِهِمْ''۔ چناچہ آپ ﷺ نے انہیں خبر دی کہ جب فارس اور روم کی لڑکیاں تمہاری خدمت کریں گی اس وقت تمہارے مابین آزمائش اور فتنہ وفساد واقع ہو جائے گا، تمہاری لڑائی اندرونی ہوگی، قیادت تمہارے شریر لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی اور وہ تمہارے اچھے لوگوں پر مسلّط ہو جائیں گے۔ ٹھیک تیس سال کے بعد بالکل اُسی طرح ظہور میں آیا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق فرمایا: ''وَتُفْتَحُ خَیْبَرُ عَلٰی یَدَیْ عَلِیٍّ'' ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خبر دی کہ خیبر حضرت علیؓ کے ہاتھوں فتح ہو گا۔ پس دوسرے دن حضرت علیؓ نے خیبر کے قلعے کا دروازہ اکھاڑ دیا اور اسے ایک ڈھال کی طرح استعمال کیا۔ پس نبی ﷺ کے معجزے کی رو سے وہ دروازہ آپؓ کے ہاتھوں ایک ایسے طریقے سے فتح ہو گیا کہ جس کی اُمید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ بعد ازاں آپؓ نے وہ دروازہ زمین پر پھینکا تو آٹھ طاقتور آدمی بھی اُسے اٹھا نہ سکے۔ اور ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ اُسے چالیس آدمی بھی نہ اُٹھا سکے۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تَقْتُلَ فِئَتَانِ دَعْوَاهُمَا وَاحِدَةٌ''۔ چنانچہ اس طرح آپ ﷺ نے صفّین میں حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان ہونے والی جنگ کی خبر دی۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''اِنَّ عَمَّارًا تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِیَةُ'' ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خبر دی کہ ایک باغی

گروہ عمار کو قتل کردے گا۔ پھر وہ جنگ صفین میں شہید ہوگئے تو حضرت علیؓ نے اس واقعہ سے یہ دلیل پکڑی کہ معاویہؓ کے پیروکار باغی ہیں۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے اس کی تاویل کی اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا: باغی صرف وہ چند لوگ ہیں جنہوں نے حضرت عمارؓ کو شہید کیا، ہم سب کے سب باغی نہیں ہیں۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: "اِنَّ الْفِتَنَ لَا تَظْهَرُ مَادَامَ عُمَرُ حَيًّا" ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خبر دی جب تک تمہارے درمیان عمر زندہ ہیں فتنے رُونما نہیں ہوں گے۔۔۔ چنانچہ ایسے ہی واقع ہوا۔

☆ اسی طرح سہیل بن عمروؓ ایمان لانے سے قبل گرفتار ہوئے تو عمرؓ نے رسول اکرم ﷺ سے کہا: ''مجھے اجازت دیں کہ میں اس کے دانت اُکھاڑ کر رکھ دوں؛ کیونکہ وہ کفارانِ قریش کو اپنی فصاحتِ لسانی کے ذریعے ہمارے ساتھ جنگ کرنے پر بھڑکاتا تھا''۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "عَسَى أَنْ يَقُوْمَ مَقَامًا يَسُرُّكَ يَا عُمَرُ" ۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے دہشت خیز اور صبر سوز حادثے کے وقت جس طرح حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ منورہ میں کمال متانت کے ساتھ ایک تسلی اور ایک اہم خطبے کے ذریعے صحابہ کرام کو ثابت قدم رکھا، بعینہ اسی طرح اس سہل نے اُس وقت مکہ مکرمہ میں صحابہ کرام کو ثابت قدم رکھا اور انہیں خود ابوبکرؓ کی طرح تسلی دی اور اپنی مشہور فصاحت میں خود ابوبکرؓ کے خطبے کے ساتھ ملتا جلتا خطبہ دیا، اس حد تک ملتا جلتا کہ دونوں خطبوں کے کلمات ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت سراقہؓ سے فرمایا: " كَيْفَ بِكَ إِذَا أُلْبِسْتَ سُوَارَيْ كِسْرَى" ۔ مطلب یہ کہ تو عنقریب کسریٰ کے دونوں کنگن پہنے گا۔ چنانچہ کسریٰ حضرت عمرؓ کے دور میں ہلاک ہوا اور اُس کے شاہی زیور اور کنگن آئے تو حضرت عمرؓ نے وہ دونوں کنگن سراقہ کو پہنا دیے اور فرمایا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ سَلَبَهُمَا كِسْرَى وَأَلْبَسَهُمَا سُرَاقَةَ" ۔ اور اس طرح اس واقعہ نے آپ ﷺ کی خبر کی تصدیق کر دی۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: "اِذَا ذَهَبَ كِسْرَى فَلَا كِسْرَى بَعْدَهُ" ۔ اس سے آپ ﷺ نے یہ خبر دی کہ فارس کا کسریٰ جب ختم ہو جائے گا تو اُس کے بعد دیگر کسریٰ نہیں آئے گا۔ اور واقعتاً اسی طرح ہوا۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے کسریٰ کے سفیر سے فرمایا: "اِنَّ ابْنَ كِسْرَى شِيْرَوَيْهِ بَرْوِيْزَ قَتَلَ الْآنَ كِسْرَى" ۔ ''کسریٰ کے بیٹے شیرویہ نے کسریٰ پرویز کو قتل کر دیا ہے'' تو اُس سفیر نے اس بات کی تحقیق کی تو پتا چلا کہ وہ حادثہ بالکل اُسی وقت میں پیش آیا تھا۔ چنانچہ سفیر مسلمان ہوگیا۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ اس سفیر کا نام فیروز تھا۔

☆ اسی طرح آپ ﷺ نے قطعی صحیح روایت کے مطابق اس خط کے بارے میں خبر دی جو حاطب بن ابی بلتعہ نے خفیہ طور پر قریش کو بھیجا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے علیؓ اور مقدادؓ کو بھیجا اور ان سے کہا: ''فلاں جگہ پر ایک عورت ہے۔ اس کے پاس اس طرح کا ایک خط ہے، اس عورت کو پکڑ و اور وہ خط لے آؤ''۔ وہ دونوں گئے اور عین اُسی جگہ سے وہ خط لے کر آ گئے۔ آپ ﷺ نے حاطب کو اپنے پاس بلایا اور اس سے فرمایا: تو نے یہ کام کیوں کیا؟ اس نے عذر پیش کیا تو آپ نے

اس کا عذر قبول کرلیا۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے صحیح روایت کے مطابق عتبہ بن ابولہب کے بارے میں فرمایا:"یَاْکُلُهٗ کَلْبُ اللّٰهِ"۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے بُرے انجام کے بارے میں خبردار کیا۔ پھر جب وہ ایک دفعہ یمن کی طرف سفر پر گیا تو اُسے ایک شیر نے کھالیا۔ یوں اس واقعے نے نبی ﷺ کی خبر کی اور اس کے لیے بددعا کی تصدیق کردی۔

☆اسی طرح صحیح روایت کے ساتھ مروی ہے کہ:"فتح مکہ کے موقع پر حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی تو رؤساءِ قریش میں سے ابوسفیان، عتاب بن اُسید اور حارث بن ہشام نے ا ۔ بیٹھ کر مندرجہ ذیل بات چیت کی:"عتاب نے کہا: ابواُسید بڑا خوش بخت ہے کہ اس نے یہ دن نہ دیکھا۔ حارث نے کہا: کیا محمد ﷺ کو اس کالے کولے کے سوا مؤذن بنانے کے لیے اور کوئی آدمی نہ ملا؟ چنانچہ اس نے بلال حبشیؓ کی مذمت کی۔ ابوسفیان بولا: میں تو ڈرتا ہوں اس لیے کچھ نہیں کہوں گا: اگر یہاں کوئی بھی نہ ہو، تو بھی اس پتھریلی زمین کا کوئی پتھر اُسے بتادے گا اور اُسے پتا چل جائے گا"۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ تھوڑے سے عرصے کے بعد ان سے ملے تو جو کچھ اُنہوں نے کہا تھا وہ حرف بحرف بتادیا"۔ تب عتاب اور حارث نے گواہی دی اور مسلمان ہوگئے۔

پس اے محرومِ دل مسکین ملحد! کہ جو دل سے محروم ہونے کی وجہ سے نبی ﷺ کو پہچان نہیں رہا ہے! دیکھ کہ قریش کے دو ہٹ دھرم سردار صرف غیبی خبر کی وجہ سے ہی ایمان لے آئے۔ تیرا دل کتنا خراب اور ویران ہے کہ اس غیبی خبر جیسے تواترِ معنوی کے ساتھ وارد ہونے والے ہزاروں معجزے سُن کر بھی تجھے مکمل اطمینان نہیں ہوتا ہے۔

بہرکیف اب ہم موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

☆اسی طرح صحیح روایت کے ذریعے منقول ہے کہ حضرت عباسؓ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں قیدی بن گئے تو آپ ﷺ نے اُن کی رہائی کا فدیہ طلب کیا تو اُنہوں نے کہا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:"آپ اپنی بیوی اُم الفضل کے ہاں فلاں فلاں جگہ پر اتنے پیسے رکھ کر آئے ہیں"، تو عباسؓ نے اس بات کی تصدیق کی اور کہا: یہ تو ایک راز تھا جسے ہمارے علاوہ اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ تب وہ مسلمان ہوگئے اور کمالِ ایمان پر فائز ہوگئے۔

☆اسی طرح قطعی صحیح روایت سے مروی ہے کہ لبید یہودی جو کہ ایک خطرناک جادوگر تھا، اُس نے رسول اکرم ﷺ کی ایذا رسانی کے لیے ایک عجیب وغریب پُرتاثیر جادو کردیا: اور وہ اس طرح کہ اُس نے ایک کنگھی پر بال

(حاشیہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ بحث وتکرار کے وقت "مارنے اور زندہ کرنے" سے منتقل ہو کر طلوع وغروبِ آفتاب کی طرف آجانا، جزوی طور پر مارنے اور زندہ کرنے سے کلی طور پر مارنے اور زندہ کرنے کی طرف منتقل ہونا اور ایک قسم کی ترقی ہے۔ یعنی اس دلیل کے وسیع ترین اور روشن ترین دائرے کا اظہار کرتا ہے۔ یہ انداز مخفی دلیل کو چھوڑ کر ظاہر دلیل کو اختیار کرنے کا نہیں جیسے کہ بعض مفسرین کہتے ہیں۔ مؤلف۔

لپیٹے، اس پر جادو کیا اور اُسے ایک ویران کنویں میں پھینک دیا۔ تو رسول اکرم ﷺ نے علیؓ اور دیگر صحابہؓ سے کہا کہ: ''فلاں کنویں پر جاؤ اور وہاں سے جادو کے آلات اُٹھا لاؤ''۔ صحابہ کرامؓ گئے اور وہاں سے وہ چیزیں لے آئے اور اس پر پڑی ہوئی گرہوں کو کھولنا شروع کر دیا۔ پھر جبھی کوئی دھاگہ کھلتا رسول اکرم ﷺ اپنے درد سے آرام پاتے۔

اسی طرح صحیح روایت سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کی ایک ایسی جماعت میں کہ جس میں ابو ہریرہؓ اور حذیفہ جیسے لوگ موجود تھے، فرمایا: ''ضِرسُ أَحَدِكُم فِي النَّارِ اَعظَمُ مِنْ اُحُدٍ''۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اُن میں سے کسی کے مرتد ہو جانے کی وجہ سے اُس کے خطرناک انجام کے متعلق خبر دی۔ ابو ہریرہؓ نے کہا: جس مجلس میں یہ بات کہی گئی تھی ان لوگوں میں سے صرف میں اور ایک اور آدمی باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ مجھے اپنے بارے میں خوف لاحق ہو گیا۔ پھر اُس آدمی نے جنگ یمامہ میں مسیلمۂ کذاب کا ساتھ دیا اور مُرتد ہو کر قتل ہو گیا۔ اور یوں نبی ﷺ کی دی ہوئی خبر کی حقیقت ظاہر ہو گئی۔

☆ اِسی طرح صحیح حدیث کے ذریعے مروی ہے کہ عمیر اور صفوان نے مسلمان ہونے سے پہلے بھاری رقم کے بدلے میں نبی ﷺ کو قتل کرنے کا پختہ ارادہ کیا، اور اِس ضمن میں عمیر نبی ﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ لیکن رسول اکرم ﷺ نے عمیر کو دیکھ لیا اور اُسے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور فرمایا: ''تُو نے صفوان کے ساتھ مل کر یہ پروگرام بنایا تھا۔ اور آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک عمیر کے سینے پر رکھا۔ تو عمیر نے اعتراف کر لیا''۔ اور مسلمان ہو گیا۔

ان مذکورہ خبروں کی طرح اور بھی بہت سی صحیح غیبی خبریں وارد ہوئی ہیں جو کہ حدیث کی صحاح ستہ نامی مشہور کتابوں میں مذکور ہیں اور سندوں سمیت بیان کر دی گئی ہیں۔

اس کتاب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ قطعی اور یقینی ہونے میں تواترِ معنوی کا حکم رکھتے ہیں۔ یہ تمام کے تمام اوّلاً صحیح بخاری اور مسلم جنہیں اہلِ تحقیق نے اَصحّ الکتب بعد القرآن کے طور پر قبول کیا ہے، اور پھر صحیح ترمذی، نسائی، ابو داؤد، مستدرک حاکم، مسند احمد اور دلائل البیھقی جیسی صحاح کی کتابوں میں سندوں کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔

پس اے مدہوش ملحد! صرف یہ مت کہنا کہ: محمد عربی ﷺ عقل مند اور زیرک انسان تھے۔ یہ کہے اور چلتا بنے؛ کیونکہ اُمورِ غیبیہ کے ساتھ تعلق رکھنے والی یہ سچی محمدی خبریں دو صورتوں سے خالی نہیں: یا تو تُو یہ کہے گا کہ وہ انتہائی تیز نظری، دور اندیشی اور چالاکی ہشیاری کے مالک تھے، ماضی مستقبل اور تمام دنیا کو دیکھتے اور جانتے تھے مشرق و مغرب اور دنیا کے تمام علاقوں کو نگاہ میں رکھنے والی نظر کے اور ماضی و مستقبل اور تمام زمانوں کو منکشف کر دینے والی زیرکی اور ہشیاری

کے مالک تھے۔۔۔تو اِس حالت کا کسی بشر میں پایا جانا ممکن نہیں، اور پائی جائے تو وہ ایک خارقِ عادت اور خالقِ عالم کی طرف سے ہبہ کردہ چیز ہوگی۔اور یہ خارقِ عادت چیز بذاتِ خود ایک سب سے بڑا معجزہ ہے۔

یا پھر تو یہ بات مانے گا کہ وہ بابرکت شخص ایک ایسی ہستی کا مامور اور شاگرد ہے کہ ہر چیز اور یہ تمام کائنات اور تمام زمانے جس کی نظر میں اور تصرّف میں ہیں، اور ہر چیز اس کے رجسٹر میں لکھی ہوئی ہے، اور وہ جب چاہے اپنے شاگرد کو اس کا علم دے دیتا ہے اور اسے دکھا دیتا ہے۔اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد عربی ﷺ پہلے اپنے استادِ ازلی سے پڑھ لیتے ہیں اور پھر اُسی طرح پڑھا دیتے ہیں۔۔۔

☆اسی طرح صحیح روایت سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے جب دومۃ الجندل کے سردار اُکیدر کی طرف خالد بن ولیدؓ کو بھیجا تو فرمایا: اِنَّكَ تَجِدُهُ يَصِيدُ الْبَقَرَ ''تو اسے گائے کا شکار کرتا ہوا پائے گا''۔چنانچہ آپ ﷺ نے بتایا کہ وہ جنگلی گائے کے شکار میں مصروف ہوگا اس لیے لڑائی کے بغیر ہی پکڑا جائے گا۔حضرت خالدؓ گئے تو دیکھا کہ وہ شکار کھیلنے میں مگن ہے، چنانچہ آپؓ نے اسے پکڑا اور قیدی بنا کر لے آئے۔

☆اسی طرح صحیح روایت کے مطابق مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس صحیفے کے بارے میں فرمایا جو قریش نے بنو ہاشم کے بائیکاٹ کے لیے لکھ کر دیوارِ کعبہ پر لٹکا دیا تھا۔''تم لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب کیڑوں نے کھالیا ہے۔اس میں سے صرف وہی جگہیں بچی ہیں جہاں جہاں اللہ کا نام تھا''۔ان لوگوں نے جا کر صحیفے کو دیکھا تو اُس کی حالت بعینہٖ واقعتاً وہی ہوچکی تھی جو آپ ﷺ نے بتائی تھی۔

☆اسی طرح صحیح روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا: ''فتح بیتُ المقدس کے وقت ایک خطرناک قسم کے طاعون کا ظہور ہوگا''۔چنانچہ بیتُ المقدس حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ہوا تو طاعون پھیل گیا۔اور صرف تین دن میں ستر ہزار انسان اس کا شکار ہوئے۔

☆اسی طرح صحیح روایت کے مطابق آپ ﷺ نے خبر دی کہ بصرہ اور بغداد جیسے شہر وجود میں آئیں گے جن کا اُس زمانے میں نام ونشان تک نہیں تھا۔اور دنیا کے خزانے بغداد میں اُمڈ آئیں گے۔عرب عنقریب ترکوں کے ساتھ اور بحرِ خزر کے اردگرد بسنے والی قوموں کے ساتھ لڑیں گے۔پھر وہ لوگ اسلام میں کثرت کے ساتھ داخل ہوجائیں گے اور وہ عربوں میں رہ کر عربوں پر حکومت کریں گے''چنانچہ فرمایا: ''يُوشِكُ أَنْ يَكْثُرَ فِيكُمُ الْعَجَمُ، يَأْكُلُونَ فَيْئَكُمْ، وَيَضْرِبُونَ رِقَابَكُمْ'' ۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''هَلَاكُ أُمَّتِي عَلَى يَدِ أُغَيْلِمَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ'' ۔چنانچہ اس سے آپ ﷺ نے اُمویوں کے یزید اور ولید جیسے شریر حکمرانوں کے بارے میں خبر دی۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے خبر دی کہ یمامہ جیسے بعض علاقوں میں ارتداد واقع ہوگا۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے بارے میں فرمایا: "اِنَّ قُرَیْشًا وَالْاَحْزَابَ لَا یَغْزُوْنَنِیْ اَبَدًا وَاَنَا اَغْزُوْھُمْ" ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خبر دی کہ وہ آج کے بعد مجھ پر دھاوا نہیں بولیں گے، میں ان پر یلغار کروں گا۔ چنانچہ اُسی طرح ہوا جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے اپنی وفات سے مہینہ دو مہینے پہلے فرمایا: "اِنَّ عَبْدًا خُیِّرَ ، فَاخْتَارَ مَاعِنْدَاللّٰہِ" ۔ چنانچہ اُس سے آپ ﷺ نے اپنی وفات کے بارے میں خبر دی۔

☆اسی طرح آپ ﷺ نے زید بن صوحان کے بارے میں فرمایا: "یَسْبِقُ عُضْوٌ مِنْہُ اِلَی الْجَنَّۃِ" ۔ آپ ﷺ نے خبر دی کہ زید کا ایک عضو اُس سے پہلے شہید ہو جائے گا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد ان کا ہاتھ جنگ نہاوند میں کٹ گیا۔ تو گویا کہ وہ ہاتھ پہلے شہید ہو گیا اور معنوی طور پر جنت میں چلا گیا۔

پس وہ تمام اُمورِ غیبیہ جن کے متعلق ہم نے بحث کی ہے، آپ ﷺ کے معجزات کی دس انواع میں سے صرف ایک نوع کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور اس نوع کی بھی دس انواع میں سے ہم نے صرف ایک ہی نوع کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے اعجازُ القران پر مشتمل ''پچیسویں مقالے'' میں اس مذکورہ قسم کے ساتھ غیبی خبروں کے وسیع وعریض مضمون سے چار اقسام کا ذکر اجمالی طور پر کر دیا ہے۔

اب اس بیان کردہ نوع میں غور کرو اور اسے اُن چار انواع کے ساتھ ملا کر یکجا کر دو جن کے بارے میں آپ ﷺ نے قرآن کی زبان میں خبر دی ہے، تو پھر دیکھو کہ یہ تمام کی تمام رسالت پر کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر کیسی ٹھوس، مضبوط قطعی اور تابناک دلیل پیش کر رہی ہیں! پس جس آدمی کا دل اور عقل کلی طور پر بے کار نہ ہو گیا ہو وہ یہ بات قطعی طور پر مان جائے گا کہ محمد ﷺ ایک خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ اور عَلَّامُ الْغُیُوْب ذات کے رسول ہیں اور اُسی سے خبر حاصل کرتے ہیں۔

ساتواں بلاغی اشارہ

یہاں ہم نبی ﷺ کے ان معجزات کی متعدد مثالوں کی طرف اشارہ کریں گے جن کا تعلق خصوصی طور پر کھانے پینے کی اشیاء میں برکت کے ساتھ ہے، اور جو معنوی طور پر قطعی اور متواتر طریقے سے ثابت ہیں۔

ان کے بارے میں بحث کرنے سے پہلے ایک مقدمہ لکھنا مناسب لگتا ہے۔

المقدمہ

کھانے میں برکت کے ساتھ تعلق رکھنے والی یہ تمام مثالیں صحیح صورت میں اور متعدد طرق سے منقول ہیں، حتیٰ کہ ان میں سے بعض سولہ طرق کے ساتھ مروی ہیں۔ پھر اُن میں سے اکثر واقعات بہت سے لوگوں کی موجودگی میں پیش آئے ہیں۔ اور اُنہی لوگوں میں سچے اور مقبول لوگوں نے ان معجزات کے متعلق بحث کی اور انہیں نقل کیا۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک آدمی یہ روایت کرتا ہے کہ ستر لوگوں نے ایک صاع وزن یعنی چار مد کے برابر کا کھانا سیر ہو کر کھایا۔ اب ستر لوگ اُس آدمی کی بات کو سنتے ہیں اور اُس کی تکذیب نہیں کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی خاموشی کے ذریعے اس کی تصدیق کرتے ہیں، حالانکہ صداقت اور حقیقت کے اُس دور میں اُن سنجیدہ اور سچے اہلِ حق صحابہ کرامؓ کی حالت یہ تھی کہ وہ ذرّہ برابر جھوٹ پر بھی خاموش نہیں رہتے تھے بلکہ اُسے ردّ کر دیتے اور جھٹلا دیتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جن واقعات کے بارے میں ہم ابھی بحث کریں گے انہیں بہت سے لوگوں نے روایت کیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اپنی خاموشی کے ساتھ تصدیق کی ہے۔ پس ہر واقعہ معنوی طور پر متواتر کی طرح قطعی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ تاریخ و سیر اس بات کے گواہ ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن و آیات کو حفظ کرنے کے بعد اپنی تمام قوت زیادہ سے زیادہ آپ ﷺ کے افعال و اقوال کو جمع کرنے میں صرف کی، خاص کر آپ ﷺ کے وہ حالات جن کا تعلق احکام و معجزات کے ساتھ ہے، اور ان کی صحت کا پورا پورا اہتمام کیا اور آپ ﷺ سے تعلق رکھنے والی کسی چھوٹی سے چھوٹی حرکت، سیرت اور حالت کو فروگذاشت نہ کیا۔ حدیث کی کتابیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ ان لوگوں نے ان کی پوری پوری حفاظت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگوں نے معجزات شرعی احکام کے ساتھ تعلق رکھنے والی احادیث کو قلم بند کر لیا، اور خاص کر عبادلۂ سبعہ اور ان میں سے بھی خصوصی طور پر ترجمانُ القرآن عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ ان سب لوگوں نے ان احادیث کو لکھ لیا اور خاص طور پر تابعین میں ہزاروں محققین نے احادیث اور معجزات کا ریکارڈ تحریری صورت میں محفوظ کر لیا۔ ان کے بعد انہیں مجتہدین اور ہزاروں محقق محدثین نے نقل کیا۔ ان میں سرفہرست أئمۂ اربعۂ مجتہدین ہیں۔ اور ہجرت کے دو سو سال بعد حفظ کی ذمہ داری صحاح ستہ نے اپنے کندھوں پر اُٹھالی، اور ان میں سرفہرست بخاری اور مسلم ہیں۔ پھر نقد و جرح کا دور آیا، چنانچہ ابن جوزی جیسے ہزاروں متشدد نقادانِ حدیث ظہور میں آئے اور اُنہوں نے ملحد، جاہل، ناداں، بے سمجھ اور کند ذہن لوگوں کی ان موضوع اور من گھڑت حدیثوں کو چُن چُن کر علیحدہ کر دیا جو کچھ بے دین، جاہل،

ناداں، بے سمجھ اور کند ذہن لوگوں نے خلط ملط کر دی تھیں، اور ان موضوع اور من گھڑت حدیثوں کی وضاحت کر دی۔ پھر تبحر اور محقق محدثین نے صحیح احادیث کے جواہر کو تمام اقوال اور موضوع احادیث سے علیحدہ کر دیا، جیسے جلال الدین سیوطیؒ جنھیں رسول اکرم ﷺ ستر دفعہ بیداری کی حالت میں ملے اور وہ آپ ﷺ کی ہم نشینی سے مشرف ہوئے، جیسے کہ اہلِ کشف نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔

پس ہم جن واقعات و معجزات کے متعلق بحث کرنے والے ہیں وہ ہم تک اِسی طرح بہت سے بلکہ بے حد و حساب مضبوط اور ایماندار ہاتھوں کے ذریعے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچے ہیں۔

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي

پس اس تحقیق کو سامنے رکھتے ہوئے ذہن میں یہ بات کبھی نہیں آنی چاہیے کہ وہ واقعات جو اُس زمانے سے لے کر اِس زمانے تک اتنی دور کی مسافت سے ہم تک پہنچے ہیں، ان کے متعلق ہمیں یہ کیسے پتا چلے کہ اُن میں کسی چیز کی آمیزش نہیں ہوئی اور وہ اِس زمانے تک کسی بھی ملاوٹ سے پاک صاف رہے ہیں؟۔

پہلی مثال: برکت کے ساتھ تعلق رکھنے والے قطعی معجزات کی پہلی مثال یہ ہے کہ: صحاح ستہ اور ان میں سرفہرست بخاری و مسلم ہیں۔ بالاتفاق بتاتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ شادی کے بعد جب ولیمہ کیا حضرت انسؓ کی والدہ اِم سلیمؓ نے ایک دو مُدّ کھجوریں گھی میں ملائیں اور برتن میں ڈال کر انسؓ کے ہاتھ نبی ﷺ کے ہاں بھیج دیں۔ تو آپ ﷺ نے انسؓ سے فرمایا: فلاں فلاں کو بلا لاؤ، اور جو بھی ملے اُسے بلا لاؤ۔ تو انسؓ کا جس آدمی سے بھی سامنا ہوا آپ نے اُسے دعوت دے دی۔ چنانچہ تین سو کے قریب صحابہ آگئے اور صفہ اور حجرۂ سعادت اُن سے بھر گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تَحَلَّقُوا عَشَرَةً عَشَرَةً" یعنی دس دس افراد حلقہ بنا کر بیٹھ جاؤ۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا دستِ مُبارک اُس تھوڑے سے کھانے پر رکھا اور دعا کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا: آجاؤ۔ چنانچہ جب وہ تین سو صحابہ تمام کے تمام سیر ہو کر کھا کر اُٹھ کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے انسؓ سے فرمایا: یہ برتن اُٹھا لے۔ تو انسؓ نے کہا: مجھے پتا نہیں چلتا تھا کہ کھانا اُس وقت زیادہ تھا جب میں نے برتن کو رکھا تھا یا اس وقت جب میں نے اسے اُٹھایا تھا۔ چنانچہ میں اُن دونوں کے درمیان فرق نہ کر سکا۔

دوسری مثال: میزبانِ رسول ﷺ ابو ایوب انصاریؓ اس وقت کے بارے میں فرماتے ہیں جب رسولِ اکرم ﷺ اُن کے گھر تشریف فرما ہوئے: میں نے ابو بکرؓ سمیت رسولِ اکرم ﷺ کے لیے صرف اتنا کھانا تیار کیا جو دو آدمیوں کے لیے کافی تھا۔ تو نبی ﷺ نے اُن سے فرمایا: ''اُدْعُ ثَلَاثِيْنَ مِنْ اَشْرَافِ الْاَنْصَارِ''، چنانچہ تیس آدمی آئے اور کھانا کھا کر چلے گئے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اُدْعُ سِتِّيْنَ''۔ چنانچہ میں نے ساٹھ آدمی اور بلائے، وہ بھی آئے

اور کھا کر چلے گئے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اُدْعُ سَبْعِیْنَ''۔ تو میں نے ستر اور لوگوں کو بلالیا۔ چنانچہ وہ بھی آئے اور کھا کر چلے گئے۔ لیکن برتنوں میں کھانا اُسی طرح بچا رہا۔ اور آنے والے تمام لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور اس معجزے سے متاثر ہو کر انہوں نے آپ ﷺ کی بیعت کر لی۔ پس دو آدمیوں کے لیے پکا ہوا کھانا ایک سو اسی آدمیوں نے کھایا۔

تیسری مثال: حضرت عمرؓ بن خطاب، ابو ہریرہؓ، سلمہ بن اکوعؓ اور ابو عمرۃ انصاریؓ متعدد طرق سے یہ کہتے ہیں کہ: ایک غزوہ میں لشکر بھوک سے نڈھال ہو گیا تو لوگ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس آئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگوں کے تھیلوں میں جتنی بھی خوراک بچی ہے اسے جمع کر لو'' تو ہر شخص تھوڑی تھوڑی کھجوریں لے کر آ گیا۔ اور سب سے زیادہ لانے والے شخص کی کھجوریں زیادہ سے زیادہ چار مُد تھیں۔ چنانچہ ان سب نے وہ کھجوریں ایک دسترخوان پر رکھ دیں۔ تو سلمہؓ نے کہا: میرا خیال ہے وہ تمام کی تمام مجموعی طور پر ایک بیٹھی ہوئی بکری کے برابر تھیں۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے برکت کی دعا کی اور فرمایا: ہر شخص اپنا اپنا برتن لے آئے۔ لوگ دوڑے دوڑے گئے اور لے کر واپس آ گئے تب اُنہوں نے پورے لشکر کے تمام برتنوں کو بھر لیا اور کھجوریں کچھ بچ بھی گئیں۔ صحابہ میں سے ایک راوی کہتے ہیں: اس برکت کے انداز سے مجھے علم ہو گیا کہ اگر زمین پر بسنے والے تمام لوگ بھی آ جاتے تو وہ کھجوریں انہیں بھی پوری آ جاتیں۔

چوتھی مثال: صحیح احادیث کی کتابیں۔ اور خاص کر بخاری و مسلم بیان کرتی ہیں کہ عبدالرحمان بن ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم ایک سو تیس صحابی رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ روٹی پکانے کے لیے ایک صاع یعنی چار مُد آٹا گوندھا گیا اور ایک بکری بھی ذبح کی گئی۔ اس کے جگر اور گردوں کے کباب بنا دیئے گئے اور باقی تمام بکری کو پکا لیا گیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ ﷺ نے اس کباب میں سے اُن ایک سو تیس صحابیوں میں سے ہر ایک کے لیے گوشت کاٹا اور ان کو دیا۔ پھر رسولِ اکرم ﷺ نے کٹے ہوئے گوشت کو دو پیالوں میں ڈالا تو ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ اور اس میں سے کچھ بچ بھی گیا۔ چنانچہ میں نے اس بچے ہوئے کھانے کو اُونٹ پر لاد لیا۔

پانچویں مثال: صحیح حدیث کی کتابیں یہ بات قطعی طریقے سے بیان کرتی ہیں کہ جابرؓ انصاری قسم کھا کر اعلان کرتے ہیں کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب خندق کھودی جا رہی تھی، ایک ہزار آدمی نے چار مُد ایک صاع وزن کے جو کی روٹی اور ایک بکری کے ایک سالہ بچے کے گوشت سے پیٹ بھر کر کھایا اور تمام کھانا ویسے کا ویسے ہی رہا۔ جابرؓ کہتے ہیں: اُس دن کھانا میرے گھر میں پکایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک صاع جو اور بکری کے بچے کا گوشت مکمل ایک ہزار آدمی کھا کر چلے گئے۔ لیکن ہماری ہنڈیا بدستور بھری ہوئی اُبل رہی تھی اور ہمارے آٹے سے روٹی پکتی جا رہی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے دہن مبارک کا پانی اس آٹے اور ہانڈی میں ملا دیا تھا اور برکت کی دعا کی تھی۔ پس برکت کا یہی معجزہ ہے جس کا اعلان جابر قسم کھا کر ایک ہزار آدمیوں کی حضوری میں کر رہے ہیں اور اس بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ ان سب کا اس واقعے کے ساتھ تعلق

ہے۔ پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ: یہ واقعہ ایسے ہی قطعی ہے جیسے کہ اسے ایک ہزار آدمیوں نے روایت کیا ہو۔

چھٹی مثال: خادمِ رسول انس بن مالکؓ کے چچا ابوطلحہ صحیح قطعی روایت کے مطابق کہتے ہیں کہ:
انس بن مالکؓ جو کی جوتھوڑی سی روٹی اپنی بغل میں دبا کر لائے، آپ ﷺ نے وہ ستر اسی آدمیوں کو کھلائی حتی کہ وہ سب کے سب سیر ہو گئے اور وہ اس طرح کہ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس تھوڑی سی روٹی کے ٹکڑے کرلو اور آپ ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی۔ گھر چونکہ چھوٹا تھا اس لیے لوگ دس دس کی مقدار میں آئے اور پیٹ بھر کے کھا کر واپس ہوئے۔

ساتویں مثال: صحیح مسلم اور شفاء شریف جیسی کتابیں قطعی صحیح طریقے سے روایت کرتی ہیں کہ جابر انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک آدی نے رسولِ اکرم ﷺ سے اپنے اہل وعیال کے لیے کھانا طلب کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اُسے اُونٹ کا آدھا بوجھ جو عطا کر دی، تو وہ آدی اپنے اہلِ خانہ اور مہمانوں سمیت ایک لمبے عرصے تک اُس جو کو کھاتا رہا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جو اتنے عرصے کے بعد بھی ختم نہیں ہو رہی، اُنھوں نے اس کی کمی جاننے کے لیے تولا، اس تولنے کی وجہ سے برکت زائل ہوگئی اور جو میں کمی ہونے لگی، وہ شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور سارا ماجرہ بیان کر دیا، حضور ﷺ نے فرمایا: لَوْ لَمْ تَكِلْهُ لَأَكَلْتُمْ مِنْهُ وَلَقَامَ بِكُمْ ''اگر تم اس کو نہ تولتے تو ساری زندگی کھاتے رہتے''

آٹھویں مثال: صحیح ترمذی، نسائی، بیہقی اور شفاء شریف جیسی کتابوں میں ہے کہ سمرۃ بن جندبؓ فرماتے ہیں کہ:
نبی اکرم ﷺ کے پاس گوشت کا ایک پیالہ لایا گیا، تو لوگ فوج در فوج آئے اور صبح سے لے کر شام تک اس سے کھاتے رہے۔

ہم نے مقدمے میں جو راز بتایا ہے اُس کی روشنی میں برکت کا یہ واقعہ صرف حضرت سمرہؓ کی روایت ہی نہیں ہے بلکہ سمرہؓ اس واقعے کا اعلان اُن تمام گروہوں کے نمائندے کی حیثیت سے اور اس کا اعلان اس تصدیق کی بنیاد پر کر رہے ہیں جنہوں نے وہ کھانا کھایا تھا۔

نویں مثال: صاحبِ شفاء شریف، مشہور ابن ابی شیبہؒ، اور طبرانیؒ جیسے ثقہ محققین کی روایت کے مطابق ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ: مسجد کے ساتھ ''صفہ پر رہائش رکھنے والے تمام مہاجر فقراء کو بلا لاؤ جو کہ سو سے متجاوز تھے'' تو میں نے اُن سب کو بلا کرا ـ کر دیا تو پھر ہم سب کے لیے کھانے کا ایک تھال رکھ دیا گیا۔ چنانچہ ہم سب نے جب تک چاہا اس سے کھایا اور فارغ ہوئے لیکن وہ بدستور اسی طرح بھرا رہا جیسے وہ ہمارے سامنے رکھا گیا تھا۔
البتہ یہ ہے کہ اس میں انگلیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔

تو ابو ہریرہؓ اس واقعے کی خبر تمام اصحابِ صفہ کی تصدیق پر اعتماد کرتے ہوئے دے رہے ہیں اور اس کا ذکر ان کی

نمائندگی کرتے ہوئے کر رہے ہیں۔ اس بنا پر یہ خبر ایسے قطعی ہوگی جیسے کہ روایت بالمعنی کے طور پر اسے تمام اہلِ صفہ نے روایت کیا ہو۔

پھر یہ بھی ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ خبر حق اور صواب نہ ہو لیکن پھر بھی وہ کامل اور صادق لوگ خاموش رہ جائیں اور اس کی تکذیب نہ کریں؟

دسویں مثال: قطعی صحیح روایت کے مطابق حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''رسولِ اکرم ﷺ نے بنوعبدالمطلب کو جمع کیا، اور یہ چالیس لوگ تھے۔ اُن میں سے کچھ تو اتنے پُر خور تھے کہ اونٹنی کا ایک سالہ بچہ کھا جاتے اور چار چار اوقیہ دودھ پی جاتے تھے، جبکہ رسولِ اکرم ﷺ نے اُن سب کے لیے صرف ایک مدّ کھانا پکایا تھا۔ ان سب نے سیر ہو کر کھایا لیکن کھانا بالکل اسی طرح بچا رہا جیسے کہ پہلے تھا۔ پھر آپ ﷺ لکڑی کے ایک پیالے میں صرف اتنا دودھ لائے جو کہ صرف تین چار آدمیوں کے لیے ہی کافی ہوسکتا تھا۔ پھر سب لوگوں نے پیٹ بھر کر پیا لیکن دودھ بدستور ایسے ہی بچا رہا کہ گویا کسی نے پیا ہی نہیں۔

پس برکت کا یہ ایسا معجزہ ہے جو کہ حضرت علیؓ کی شجاعت اور صداقت کی طرح قطعی ہے۔

گیارھویں مثال: صحیح روایت کے ذریعے منقول ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے علیؓ اور فاطمۃ الزہراءؓ کے ولیمے میں بلال حبشیؓ کو حکم دیا کہ چار پانچ مُدّ آٹا پکالے اور اونٹنی کا ایک بچہ ذبح کر لے۔ حضرت بلالؓ کہتے ہیں: میں کھانا لے کر آیا تو آپ ﷺ نے اس پر اپنا دستِ مبارک پھیرا پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گروہ در گروہ آئے اور کھا کر چلے گئے۔ آپ ﷺ نے بقیہ کھانے پر دوبارہ برکت کی دعا کی اور ازواجِ مطہراتؓ میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک پیالہ بھیجا۔ اور انہیں کہلا بھیجا کہ خود بھی کھائیں اور جو خواتین ان کے ہاں آئیں انہیں بھی کھلائیں۔

جی ہاں؛ اِس طرح کی ایک بابرکت شادی میں اسی طرح کی برکت کا ظہور میں آنا ضروری ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا قطعی طور پر ہوا ہے۔

بارھویں مثال: امام جعفر صادقؒ اپنے والد محمد الباقرؒ سے، وہ اپنے والد زین العابدینؒ سے اور وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ فاطمۃ الزہراءؓ نے صرف اتنا ہی کھانا پکایا جو کہ ان دونوں کے لیے کافی تھا۔ پھر اُنہوں نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کو بلا لائیں تاکہ سب مل کر کھائیں۔ چنانچہ نبی ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ تمام اُمہات المؤمنین میں سے ہر ایک کے لیے اس کھانے سے ایک ایک پیالہ بھیج دیں۔ حضرت فاطمہؓ نے ایسے ہی کیا پھر اپنے لیے اور حضرت علیؓ، فاطمہؓ اور ان کے بچوں کے لیے علیحدہ علیحدہ پیالہ بھرا۔ فاطمہ کہتی ہیں: ہم نے اس کے بعد اپنی ہنڈیا چولہے سے اُتاری تو وہ لبالب بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ ہم وہ کھانا اللہ کے حکم سے کافی عرصے تک کھاتے رہے۔

لیکن تمہارا رویہ کتنا عجیب ہے کہ تم ایک عالیشان تابندہ سلسلے سے وارد ہونے والے اس برکت والے معجزے کو اس طرح نہیں مان رہے ہو کہ گویا تم اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو! اور یہ ایسا معجزہ کہ شیطان کو بھی جس کا انکار کرنے کے لیے کوئی راستہ نہیں مل رہا ہے۔

تیرہویں مثال: ابوداوُدؒ، احمد بن حنبلؒ، بیہقیؒ جیسے ائمہ کرام دُکین اُحمسی بن سعید مُزنی اور نعمان بن مقرّن اُحمسی سے روایت کرتے ہیں۔ نعمان بن مقرن وہ صحابی ہیں جنہیں اپنے چھ بھائیوں کے ساتھ صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔ اسی طرح یہ ائمہ کرام متعدد طرق سے حضرت جریرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: رسولِ اکرم ﷺ نے عمرؓ بن خطاب کو حکم دیا کہ وہ اَحمسی قبیلے کے چار سو گھڑسواروں پر مشتمل وفد کو زادِ راہ دیں۔ تو عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ: خزانے میں تو صرف چند صاع باقی ہیں۔ اور کھجوروں کی ڈھیری صرف اتنی ہی رہ گئی ہے جتنی ایک سال کی بیٹھی ہوئی بکری ہوتی ہے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ اور انہیں دو۔ چنانچہ وہ گئے اور ان چار سو گھڑسواروں میں سے ہر ایک کو زادِ راہ کے لیے آدھے وسق میں سے بقدرِ کفایت کھجوریں دے دیں۔ عمرؓ فرماتے ہیں کہ کھجوریں بدستور اُسی طرح رہیں کہ گویا کچھ بھی کم نہ ہوئیں۔

پس برکت کے ضمن میں روایت کیا جانے والا یہ معجزہ چار سو آدمیوں کے ساتھ اور خاص کر عمرؓ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ یہ تمام لوگ ان زاویوں کی پشت پر ہیں اور اُن کی خاموشی اس معجزے کی تصدیق ہے۔ تم صرف یہ کہہ کر آگے نہ بڑھ جاؤ کہ خبرِ واحد ہے؛ کیونکہ اس طرح کے واقعات اگرچہ خبرِ آحاد ہیں، تاہم یہ ایک ایسا اطمینان عطا کر دیتے ہیں جو تواترِ معنوی کا ہمعنان ہوتا ہے۔

چودھویں مثال: کتبِ صحاح اور جن میں بخاری، مسلم سرِ فہرست ہیں، یہ خبر دیتی ہیں کہ جابرؓ کے والد وفات پا گئے اور وہ بہت زیادہ قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ اُن کے قرض خواہ یہودی تھے۔ جابرؓ نے قرض خواہوں کو اپنے باپ کا تمام سرمایہ دے دیا لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ جبکہ باغ کے پھل کئی سال تک قرض اُتارنے کے لیے کافی نہ تھے۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: باغ کے پھل توڑ کر ایک جُرمن میں ا ہو کر دو، انہوں نے ایسا کر دیا۔ پھر رسول اکرم ﷺ جُرمن میں گئے اور دعا فرمائی۔ پھر جابرؓ نے اس جُرمن سے اپنے تمام قرض خواہوں کے قرض چکا دیے۔ بعد اَزاں جُرمن میں اتنے پھل بچ رہے کہ جتنے باغ سے ایک سال میں حاصل ہوتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ اتنے پھل بچ رہے جتنے تمام قرض خواہوں کو ادا کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ قرض خواہ یہودی اس پر بہت زیادہ حیران ہوئے۔

پندرہویں مثال: محقق اصحابُ الحدیث کہ جن میں امام ترمذیؒ اور بیہقیؒ سرِ فہرست ہیں، صحیح روایت کے مطابق حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: کسی غزوے میں۔ اور ایک روایت کے مطابق غزوۂ تبوک میں لشکر بھوک سے دوچار تھا، تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "هَلْ مِنْ شَيْءٍ؟" تو میں نے کہا: کجاوے میں کچھ کھجوریں پڑی ہیں

اور ایک روایت میں ہے کہ صرف پندرہ کھجوریں تھیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں لے کر آؤ۔ تو میں وہ کھجوریں لے آیا۔ آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس کجاوے میں ڈالا اور مٹھی بھر کھجوریں اس سے باہر نکال لیں اور انہیں ایک دوسرے کجاوے میں ڈال دیا اور برکت کی دُعا کی۔ پھر دس دس کر کے تمام لشکر کو بلایا اور اس طرح ان سب نے وہ کھجوریں کھائیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "خُذْ مَا جِئْتَ بِهِ وَاقْبِضْ عَلَيْهِ وَلَا تَكُبَّهُ"۔ پس میں نے وہ کجاوا لے لیا اور اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو میرے ہاتھ میں اتنی کھجوریں آئیں جتنی میں پہلی دفعہ لایا تھا۔ پھر میں اُن کھجوروں میں سے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی زندگی میں بھی کھاتا رہا ایک دیگر روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ان کھجوروں میں سے چند فی سبیل اللہ صرف کیں۔ پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کے دور میں وہ کجاوے سمیت مجھ سے چھین لی گئیں اور ضائع ہو گئیں۔

پس برکت کے ساتھ تعلق رکھنے والا یہ معجزہ جس کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں لوگوں کے غزوۂ تبوک جیسے مجمع میں ابو ہریرہؓ خبر دے رہے ہیں، ابو ہریرہؓ جنہوں نے اپنی قوّتِ حافظہ کی زیادتی کے لیے دعائے نبوی کا شرف حاصل کیا تھا۔ اور جو شیخ الکائنات، فخرِ عالم ﷺ کی صُفّہ نامی خانقاہ اور ان کے قُدسی مدرسے کے ایک اہم رکن، مرید اور شاگرد تھے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ یہ معجزہ روایت بالمعنی کے لحاظ سے اُسی قدر قطعی اور قوی ہو کہ جسے ایک پورے لشکر نے روایت کیا ہو۔

سولھویں مثال: صحیح احادیث کی کتابیں کہ جن میں بخاری شریف سرِفہرست ہے، قطعی روایت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ: ایک دفعہ ابو ہریرہؓ بھوک سے نڈھال تھے، چنانچہ آپ رسولِ اکرم ﷺ کے پیچھے پیچھے چلے اور دونوں منزلِ سعادت کی طرف چلے گئے وہاں اُنہوں نے دیکھا کہ گھر میں دودھ کا ایک پیالہ ہدیۃً آیا ہوا ہے، تو رسولِ اکرم ﷺ نے مجھے حکم دے کر فرمایا: اہلِ صفہ کو بلا لاؤ۔ تو میں نے دل میں کہا: یہ دودھ تو تمام کا تمام میں اکیلا ہی پی سکتا ہوں، اور میں اس وقت اس کا سب سے زیادہ ضرورت مند بھی ہوں! لیکن امرِ نبوی کی اطاعت کرتے ہوئے میں اُن سب کو اکٹھا کر کے لے آیا۔ اور وہ سو سے زیادہ تھے۔ تو آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ یہ دودھ انہیں پلاؤ تو میں نے فرداً فرداً ان سب کو پلا دیا، چنانچہ جب ایک آدمی اس پیالے سے دودھ پی کر سیر ہو جاتا تو میں پیالہ دوسرے کو پکڑا دیتا اور یوں ایک ایک کر کے تمام اہلِ صفہ نے وہ صافی دودھ پیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "بَقِيَ أَنَا وَأَنْتَ فَاشْرَبْ" چنانچہ میں نے پینا شروع کر دیا، اور یوں یوں پیتا گیا آپ ﷺ فرماتے گئے: اور پیو۔ حتی کہ میں نے کہا: اُس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اب مزید پینے کی گنجائش۔ نہیں رہی۔ پھر پیالہ آپ ﷺ نے خود پکڑا: بسم اللہ پڑھی، اللہ کی تعریف کی اور بقیہ دودھ پی لیا۔

پس اُن کا کسی بھی شک و شبہے سے بالاتر، اس خالص صافی دودھ کی طرح لطیف معجزے کو صحیح کتابوں کے ذریعے نقل کرنا، اور خاص کر ان نقل کرنے والوں میں سرفہرست امام بخاریؒ ہیں جنھوں نے پانچ لاکھ حدیث حفظ کی ہوئی تھیں، اسی طرح قطعی ہے کہ جیسے آنکھوں دیکھی بات ہو۔ مزید برآں یہ کہ ابو ہریرہؓ جو کہ صُفّہ نامی مقدس مدرسہ محمدیہ علیہ الصلوۃ والسلام کے مشہور صادق اور حافظ شاگرد تھے، اُنہوں نے اس واقعے پر تمام اہلِ صفہ کو گواہ بنایا ہے، گویا کہ اُنہوں نے تمام اصحابِ صفہ کی ترجمانی کی ہے:

پس جو کوئی اس خبر کو تواتر کے درجے میں قبول نہیں کرتا وہ یا تو فاسدُ القلب ہے یا پھر بے عقل۔

یہ بات یقیناً باعثِ حیرت ہے کہ ابو ہریرہؓ جیسا سچا انسان جس نے اپنی تمام زندگی حدیث شریف اور دین کے لیے وقف کردی ہو اور جس نے ''وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ'' جیسی حدیث سنی اور نقل کی ہو، کیا ایسے آدمی کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی حفظ کردہ احادیثِ نبویہ کی قیمت اور صحت کو شبہات کے گھاٹ اُتار دے اور کسی خلافِ واقعہ بات کو یا بے اصل واقعہ کو نقل کر کے اُسے اہلِ صفہ کی تنقید کا نشانہ بنادے؟ حاشا وکلاّ!

اے پروردگار! تُو نے ہمیں جس مادی و معنوی رزق سے نوازا ہے، رسول اکرم ﷺ کی برکت کی عزت و حُرمت کے طفیل اس میں برکت ڈال دے۔

ایک اہم نکتہ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کمزور چیزیں جب اکٹھا ہو جائیں تو طاقتور ہو جاتی ہیں، چنانچہ باریک باریک دھاگوں کو جب بٹ دیا جائے تو وہ ایک مضبوط رسی بن جاتے ہیں۔ اور جب رسی کو بٹ دیا جائے تو اُسے کسی کے لیے بھی کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہم نے معجزات کی پندرہ انواع میں سے صرف برکت کے ساتھ تعلق رکھنے والے معجزات کی ایک قسم بیان کی ہے اور اس ایک قسم کی پندرہ اقسام میں سے پندرہ مثالوں کے ساتھ صرف ایک قسم بیان کی ہے۔ اور ان میں سے ہر مثال اتنی قوی تھی کہ بذاتِ خود مستقل طور پر نبوت کا اثبات کرتی ہے۔

اگر۔ بفرضِ محال۔ ہم ان میں سے کسی ایک مثال کو کمزور سمجھ لیں تو بھی یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ یہ کمزور ہے؛ کیونکہ قوی کے ساتھ متفق ہو جانے والا قوی ہو جاتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ ان پندرہ مثالوں کا اجتماع بلاشبہ قطعی معنوی تواتر کے ذریعے ایک نہایت قوی معجزۂ کبریٰ کو نمایاں کر رہا ہے۔

برکت کے ان معجزات سے مجموعی طور پر حاصل ہونے والے معجزۂ کبریٰ کو جب اُن چودہ اقسام کے ساتھ ملا دیا

جائے جن کا یہاں ذکر نہیں ہوا ہے، تو اس مجموعے سے ایک ایسا معجزۂ کبریٰ جھلملانے لگتا ہے جس کا اس مجموعے سے علیحدہ کرنا ممکن ہی نہیں، بالکل ایسے جیسے بہت سی مضبوط رسیوں کو بل دے کر اکٹھا کر دیا جائے تو وہ ٹوٹ نہیں سکتیں۔ پھر اس معجزۂ کبریٰ کو جب ان چودہ قسم کے معجزات کے ساتھ ملا دیا جائے تو تم دیکھو گے کہ وہ نبوتِ محمدیہ ﷺ پر ایک انتہائی مضبوط اور قطعی دلیل کو نمایاں کر دیتے ہیں۔

پس نبوت محمدیہ ﷺ کا ستون پہاڑ کی طرح مضبوط ہے جو کہ اس مجموعے سے تشکیل پاتا ہے۔ اب تمہیں اس آدمی کی کم عقلی کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا جو اس مضبوط اور بلند و بالا چھت کو جزئیات اور مثالوں میں سوءِ فہم کی وجہ سے وارد ہونے والے شبہات کی وجہ سے غیر ثابت قابلِ انہدام سمجھتا ہے۔

جی ہاں! برکت کے ساتھ تعلق رکھنے والے یہ معجزات بلاشبہ یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ محمد عربی ﷺ اُس رحیم و کریم پروردگار کے ایک مأمور، محبوب اور انتہائی قابلِ احترام بندے ہیں، وہ پروردگار جو تمام مخلوقات کو رزق دیتا ہے، رزق پیدا کرتا ہے، عدم سے اور غیب کے نہ ختم ہونے والے خزانوں سے خلاف عادت اپنے اس بندے کے لیے انواع و اقسام کی ضیافتیں بھیج رہا ہے۔

یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ جزیرۂ عرب ایک ایسی جگہ ہے جہاں پانی اور کھیتی باڑی کی کمی ہے۔ صدرِ اسلام میں وہاں کے باسی اور خاص کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تنگی معیشت سے دوچار اور خاص کر پیاس کا شکار ہو جاتے تھے۔ پس اسی حکمت کے پیش نظر آپ ﷺ کے تابندہ معجزات کا ظہور اکثر و بیشتر خصوصی طور پر کھانے پینے کی اشیاء میں اور پانی میں ہوا۔

پس یہ معجزات دعوائے نبوت کی دلیل سے بھی بڑھ کر اُس وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر اکرامِ ربانی، احسانِ الٰہی اور ضیافتِ رحمانی کا حکم رکھتے ہیں؛ کیونکہ جن لوگوں نے ان معجزات کا مشاہدہ کیا ہے انہوں نے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی ہے۔ پس جوں جوں معجزات کا ظہور ہوتا گیا ایمان بڑھتا گیا اور نور علی نور ہوتا گیا۔

آٹھواں اشارہ: اُن معجزات کی ایک قسم کی وضاحت کرتا ہے جو خصوصی طور پر پانی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

مقدمہ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ جماعتوں کے درمیان رونما ہونے والے واقعات کو جب آحاد کی صورت میں نقل کیا جائے اور وہ جھٹلائے بھی نہ گئے ہوں تو یہ چیز اُن کی صداقت پر دلالت کرتی ہے؛ کیونکہ انسان کی فطرت میں یہ میلان جبلّی طور پر پایا جاتا ہے کہ وہ جھوٹ کو کہے کہ یہ جھوٹ ہے، خاص کر اس وقت کہ جب معاملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ

تعلق رکھتا ہو جو کہ جھوٹ پر خاموش نہ رہنے میں سب لوگوں سے آگے ہیں، اور خاص کر اس وقت کہ جب واقعات کا تعلق رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ہو، اور خاص کر اُس وقت کہ جب نقل کرنے والے مشاہیر صحابہ میں سے ہوں، تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی خبرِ واحد کے ذریعے روایت کرنے والا آدمی اس واقعہ کو اس انداز سے روایت کرے گا کہ گویا وہ ان تمام لوگوں کی ترجمانی کر رہا ہے جو اُس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ پانی کے معجزات کی تمام مثالیں جن کے بارے میں ہم بحث کرنے والے ہیں انہیں ہزاروں محقق تابعین نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور انہیں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعدد طرق کے ذریعے سے حاصل کر کے صحیح سالم حالت میں دوسرے دور کے مجتہدین کے سپرد کر دیا، اور ان لوگوں نے بھی کمال سنجیدگی اور احترام کے ساتھ ان سے یہ چیز حاصل کی اور اسے قبول کر کے آنے والے دور کے محققین کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اور یوں یہ روایت ہر طبقہ کے ہزاروں مضبوط ہاتھوں سے گزرتی ہوئی ہمارے دور تک پہنچی۔

پھر یہ بھی ہے کہ عصرِ سعادت میں حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں وہ بالکل صحیح سالم صورت میں منتقل ہو کر بخاری و مسلم جیسے ماہر ائمہ حدیث کے ہاتھوں تک پہنچیں۔ ان لوگوں نے کمال تحقیق کے ساتھ احادیث کے مراتب کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا اور شک وشبہ سے پاک صحیح احادیث کو جمع کیا، ہمیں ان کتابوں کا درس دیا اور اس طرح وہ کتابیں ہمیں پیش کر دیں۔ جَزَاهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا کَثِیْرًا۔

پس رسول اکرم ﷺ کی بابرکت انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا اور رسول علیہ الصلوۃ والسلام کا بہت سارے لوگوں کو اُس سے پانی پلانا متواتر طریقے سے مروی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اتنی بڑی جماعت نے نقل کیا ہے کہ جن کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ہے۔ اور یہ معجزہ غایت درجے کا قطعی ہے اور تین بڑے بڑے مجمعوں میں تین مرتبہ ظہور میں آ چکا ہے۔ اور آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کا جاری ہونے کا اور اس پانی کے لشکر کو پلائے جانے کا واقعہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت جابرؓ جیسے مشاہیر صحابہ کی جماعتوں سے نقل ہو چکا ہے جن میں خادمِ رسول ﷺ انسؓ بن مالک سرِ فہرست ہیں اور اسے قتادہؒ، ابن شعیبؒ، مالکؒ اور بخاریؒ و مسلمؒ جیسے صحیح احادیث کا اہتمام کرنے والے ائمۂ حدیث نے روایت کیا ہے۔

اس مقام پر ہم اس نوع کے آبی معجزات کی بہت سی مثالوں میں سے نو مثالوں کی وضاحت کریں گے:

پہلی مثال: کتب صحاح نے جن میں سرِ فہرست بخاری و مسلم ہیں، میں حضرت انسؓ سے یہ روایت کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''تین سو کے قریب لوگ زوراء نامی جگہ پر رسول اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے آپ ﷺ نے نمازِ عصر کے لیے وضو کرنے کا حکم دیا لیکن پانی موجود نہیں تھا۔ تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ کہیں سے بھی میرے پاس تھوڑا بہت پانی

لاؤ۔ آپ ﷺ نے اس میں اپنے بابرکت ہاتھ ڈبو کر باہر نکال لیے، تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی انگلیوں سے چشمے کی طرح پانی رواں ہو گیا تب آپ ﷺ کے ہمراہ تین سو لوگوں نے وضو کر کے پانی پیا۔"

پس یہ مثال جس کے بارے میں انسؓ تین سو آدمیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے خبر دے رہے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تین سو آدمی معنوی طور پر اس خبر میں شریک نہ ہوں اور اگر شریک نہ ہوں تو کیا یہ ممکن ہے کہ اُسے جھٹلائیں نہیں؟

دُوسری مثال: بخاری اور مسلم اور صحیح احادیث کی دیگر کتابیں خبر دیتی ہیں کہ جابر بن عبداللہ انصاریؓ یہ کہتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ: صلح حدیبیہ کے موقع پر ہم لوگ پیاس سے نڈھال ہو گئے۔ تو رسول اکرم ﷺ نے چمڑے کے ایک مشکیزے سے وضو کیا اور پھر اپنا ہاتھ اس میں ڈبو کر نکال لیا۔ تو میں نے دیکھا کہ پانی آپ ﷺ کی انگلیوں سے چشموں کی طرح بہہ رہا تھا۔ چنانچہ پھر اس مشکیزے سے پندرہ سو آدمیوں نے پانی پیا اور اپنے برتن بھر لیے۔ سالم بن ابی جعدؒ نے جابرؓ سے پوچھا: تم کتنے لوگ تھے؟ تو جابرؓ نے جواب دیا: ایک لاکھ بھی ہوتے تو وہ پانی ان کے لیے کافی ہو جاتا، "ہم تو پندرہ سو یعنی ایک ہزار پانچ سو تھے"۔

پس اس تابندہ معجزے کے راوی معنوی طور پر پندرہ سو کی تعداد میں ہیں؛ جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا میلان اور طلب انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حق اور سچائی کی خاطر اپنی روحیں، اپنے مال اسباب، اپنے آباء و اجداد، اپنی قوم اور قبیلہ کو، غرض ہر چیز کو حق اور سچ پر قربان کر چکے تھے۔ وہ لوگ واقعتاً حق اور سچ کے فدائی تھے۔ تو کیا اُن کا جھوٹ کے سامنے خاموش رہنا ممکن تھا اور خاص اُس وقت کہ جب وہ "جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے" والی حدیث میں پائی جانے والی دھمکی کی روشنی میں اِس طرح کی خاموشی کا انجام بھی جانتے تھے؟ پس اگر وہ خاموش رہے اور اُنہوں نے اس واقعہ کو قبول کر لیا تو اس میں شریک ہیں اور معنی کے لحاظ سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

تیسری مثال: بخاری، مسلم سمیت صحاح کی دیگر کتابیں یہ بھی روایت کرتی ہیں کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا: رسول اکرم ﷺ نے غزوہ بُواط میں فرمایا: "نَادِ بِالْوُضُوْءِ"۔ تو آپ ﷺ سے کہا گیا کہ حضور پانی نہیں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "کہیں سے تھوڑا بہت پانی مہیا کرو" تو ہم تھوڑا سا پانی لے آئے آپ ﷺ نے اُس پانی کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ دیا اور اس پر کچھ پڑھا، لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا پڑھا پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "رِدْنَا بِجَفْنَةِ الرَّكْبِ" "یعنی قافلے میں جو پیالہ بڑا ہے لے آؤ" پیالہ میرے پاس لایا گیا تو میں نے اُسے رسول اکرم ﷺ کے سامنے رکھ دیا آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس کے اندر ڈالا اور اپنی انگلیاں کھول دیں اور میں نے وہ تھوڑا سا پانی آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر گرانا شروع کر دیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں سے پانی بہنا شروع ہو گیا اور پھر ٹب بھر

گیا۔ پس میں نے ضرورتمندوں کو پانی کی طرف بلایا تو سب نے آ کر اُس پانی سے وضوء کیا اور پیا۔ سب فارغ ہو گئے تو میں نے کہا: اب اور کوئی نہیں رہا۔ تو آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اُوپر اُٹھا لیا اور وہ ٹب بدستور اُسی طرح بھرا ہوا تھا۔

پس یہ درخشاں معجزۂ محمدیہ علیہ الصلاۃ والسلام معنی کے لحاظ سے متواتر ہے؛ کیونکہ اس معاملے میں جابرؓ سب سے آگے تھے اس لیے بات کرنے کا حق بھی سب سے پہلے اُنہی کا بنتا تھا اور وہی سب کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کا اعلان کرتے ہیں کیونکہ اُس وقت وہ آپ ﷺ کے خادم تھے، اس لیے سب سے پہلے اعلان کرنا اُنہی کا حق تھا۔

ابن مسعودؓ اپنی روایت میں فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ پانی آپ ﷺ کی انگلیوں سے چشمے کی طرح بہہ رہا تھا۔

سوال یہ ہے کہ سچائی کے علمبردار مشاہیر صحابہ میں سے انسؓ، جابرؓ اور ابن مسعودؓ جیسے صحابی جب یہ کہہ دیں کہ ہم نے دیکھا ہے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ اُنہوں نے نہ دیکھا ہو؟

اب ان تینوں مثالوں کو اکٹھا کر کے ان پر مجموعی طور پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ یہ کتنا تابندہ اور مضبوط معجزہ بنتی ہیں، کیونکہ یہ تینوں طرق ا ہو ہو جائیں تو پانی کے آپ ﷺ کی انگلیوں سے جاری ہونے کا اثبات قطعی طور پر حقیقی تواتر کی صورت میں کر دیتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کا پتھر سے پانی کے بارہ چشمے جاری کرنے والا معجزہ حضور اکرم ﷺ کے دس انگلیوں سے نلکوں کی طرح پانی کے نکلنے والے معجزے کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا؛ کیونکہ پتھر سے پانی کا جاری ہونا ممکن ہے، معمول کی چیزوں میں اس کی نظیر مل جاتی ہے، لیکن گوشت اور ہڈیوں سے آبِ کوثر کی طرح کثرت کے ساتھ پانی جاری ہو جانے کی نظیر معمول کے معاملات میں نہیں ملے گی۔

چوتھی مثال: امام مالکؒ اپنی معتبر کتاب ''المؤطا'' میں معاذ بن جبلؓ اور دیگر مشاہیر صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں ہمارا گزر ایک ایسے چشمے سے ہوا جو کہ ایک تسمے کی مقدار میں رِس رہا تھا۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ پانی تھوڑی سی مقدار میں جمع کر لو، تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس سے تھوڑا سا پانی اپنی ں میں جمع کر لیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس سے اپنا ہاتھ اور چہرہ دھویا۔ ہم نے وہ اُسی جگہ پر انڈیل دیا جہاں سے چشمہ رِس رہا تھا۔ جوں ہی پانی وہاں گرا چشمے کا سوراخ کھلنا شروع ہو گیا اور پانی کثرت سے اُمڈ آیا اور تمام لشکر کے لیے کافی ہو گیا۔ حتی کہ ایک راوی امام ابن اسحاقؒ کہتے ہیں: اس چشمے سے اُبلتا ہوا پانی گرجدار آواز نکال رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''يُوشِكُ يَا مُعَاذُ إِنْ طَالَتْ بِكَ حَيَاةٌ أَنْ تَرَى مَا هٰهُنَا قَدْ مُلِئَ جِنَانًا'' یعنی یہ پانی جو کہ معجزے کی تاثیر ہے امر ہو جائے گا اور آس پاس کی زمین کو باغات میں تبدیل کر دے گا۔ آپ کی عمر نے وفا کی تو عنقریب یہ منظر دیکھ لیں

گے۔ اور پھر ایسے ہی ہوا۔

پانچویں مثال: امام بخاریؒ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے، مُسلمؒ، سلمہ بن اکوعؓ رضی اللہ عنہ سے اور دیگر راویوں سے متفقہ طور پر روایت کرتے ہیں کہ: یومِ حدیبیہ میں ہم چار سو آدمی تھے۔ وہاں ہمیں ایک کنواں ملا لیکن اس کا پانی صرف پچاس آدمیوں کو پورا آسکتا تھا، چنانچہ ہم نے اس کا پانی تمام کا تمام کھینچ لیا۔ رسولِ اکرم ﷺ تشریف لائے اور کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور پانی کا ایک ڈول لانے کے لیے کہا۔ ہم نے ڈول مہیا کر دیا۔ آپ ﷺ نے اپنے مبارک منہ میں پانی بھرا اور وہ پانی ڈول میں گرا دیا اور دعا فرمائی۔ پھر ڈول والا پانی کنویں میں گرا دیا تو اچانک کنواں اُبلنے لگا اور لبالب بھر گیا۔ تب تمام لشکریوں نے اور ان کے سب جانوروں نے سیر ہو کر پانی پیا اور اپنے برتن بھر لیے۔

چھٹی مثال: ائمۂ حدیث کہ جن میں ابن جریر طبریؒ اور مسلمؒ جیسے ماہرین حدیث سرفہرست ہیں، ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، اُنہوں نے کہا کہ غزوۂ موتہ میں سرکردہ شہسواروں کے شہید ہو جانے کے بعد ہم لشکر کو کُمک پہنچانے کے لیے جاتے تھے میرے پاس ایک چھوٹا سا مشکیزہ تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: "اِحْفَظْ عَلَيَّ مِيضَأَتَكَ فَسَيَكُونُ لَهَا نَبَأٌ عَظِيمٌ"۔ یعنی اپنے مشکیزے کو حفاظت سے رکھو اس کی بڑی ضرورت پڑنے والی ہے۔ پھر پیاس نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اور ہم اس وقت بہتر آدمی تھے۔ اور طبریؒ کی روایت کے مطابق انہوں نے فرمایا کہ ہم تین سو آدمی تھے اور پیاس سے دو چار تھے۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اپنا مشکیزہ لاؤ۔ میں مشکیزہ لے آیا۔ آپ ﷺ نے اپنا دہن مبارک مشکیزے کے منہ کو لگایا۔ مجھے یہ پتا نہیں کہ آپ ﷺ نے اس میں سانس لیا کہ نہیں۔ پھر بہتر آدمی آئے اور انہوں نے پانی پیا اور اپنے برتن بھر لیے۔ پھر وہ مشکیزہ میں نے خود پکڑ لیا اور وہ بدستور اُسی طرح تھا جیسے میں نے دیا تھا۔

پس اس تابناک معجزۂ محمدیہ علیہ الصلاۃ والسلام کو دیکھو اور کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ بِعَدَدِ قَطَرَاتِ الْمَاءِ۔

ساتویں مثال: کتبِ صحاح کہ جن میں بخاری اور مسلم سرفہرست ہیں، عمران بن الحصینؓ سے روایت کرتی ہیں، وہ کہتے ہیں: ہم رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ ہمیں پیاس لگ گئی تو آپ ﷺ نے مجھ سے اور علیؓ سے کہا: فلاں جگہ پر ایک عورت اپنے جانور پر دو مشکیزے لادے ہوئے جا رہی ہے، جاؤ اور اسے میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ ہم دونوں گئے تو ہمیں وہ عورت عین اُسی جگہ پر پانی سمیت مل گئی ہم اسے آپ ﷺ کے پاس لے آئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے تھوڑا سا پانی لے کر کسی برتن میں ڈالو ہم نے ایک برتن میں پانی ڈال دیا۔ آپ ﷺ نے برکت کی دعا کی اور پھر ہم نے وہ پانی اسی مشکیزے میں جو اُس جانور پر تھا، ڈال دیا۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ہر آدمی اپنا اپنا برتن

بھر کے لے جائے۔ چنانچہ تمام قافلے والے آ گئے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا برتن بھرا اور پی بھی لیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اب اس عورت کو کوئی چیز مہیا کرو ہم نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں اس کے پلّو میں باندھ دیں۔ عمران بن حصینؓ کہتے ہیں؛ میں یہی خیال کر رہا تھا کہ دونوں مشکیزے پہلے سے بھی زیادہ لبالب بھرے ہوئے تھے پھر رسول اکرم ﷺ نے اس عورت سے فرمایا: "اِذْهَبِیْ فَاِنَّا لَمْ نَأْخُذْ مِنْ مَائِكِ شَیْئًا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَقَانَا"۔ یعنی ہم نے تیرے پانی میں سے کچھ نہیں لیا ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے خزانے سے پلایا ہے۔

آٹھویں مثال: ابن خزیمہؒ اپنی صحیح میں حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ، اُنہوں نے فرمایا: ہم غزوۂ تبوک میں پیاس سے اس حد تک نڈھال ہو گئے کہ بعض لوگ اونٹنی ذبح کرتے اور اس کے پیٹ میں پایا جانے والا پانی نچوڑ کر پی جاتے تھے۔ تب ابو بکر صدیقؓ رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے گر کر گڑگڑائے کہ آپ ﷺ دعا فرمائیں۔ پس آپ ﷺ نے ہاتھ اُٹھا کر دعا فرمائی تو فارغ ہو کر ابھی ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ بادل اُمڈ آئے اور اتنی بارش ہوئی کہ ہم سب نے اپنے برتن بھر لیے۔ پھر بارش تھم گئی۔ وہ بارش صرف ہمارے لشکر کے ساتھ خاص تھی، ہماری حدود سے باہر بالکل نہیں پڑی۔ اسی بنا پر وہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ خالص معجزۂ محمدیہ علیہ الصلاۃ والسلام تھا۔

نویں مثال: عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے پوتے عمرو بن شعیب۔ کہ جنہیں ائمۂ حدیث نے ثقہ کہا ہے اور ان سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں۔ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ: رسول اکرم ﷺ نبوت سے پہلے اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ اونٹنی پر سوار تھے۔ جب دونوں عرفات کے پہلو میں ذوالمجاز نامی جگہ پر آئے تو ابو طالب نے کہا: پیاس لگ گئی ہے۔ تو رسول اکرم ﷺ نے اونٹنی سے اُتر کر اپنا پاؤں زمین پر مارا تو وہاں فوراً ایک چشمہ پھوٹ پڑا جس سے ابو طالب نے جی بھر کر پانی پی لیا۔

ایک محقق عالم کہتے ہیں: یہ واقعہ نبوت سے پہلے وقوع پذیر ہونے کی وجہ سے اگر چہ ارہاصات میں سے شمار ہو گا تاہم ایک ہزار سال کے بعد عین اسی جگہ پر چشمۂ عرفات کا پھوٹ پڑنا اسی واقعہ کی بنیاد پر محمدی کرامت شمار ہو گی۔

اسی طرح پانی کے ساتھ تعلق رکھنے والے معجزات کی یہ نو مثالیں اگر چہ نوّے مثالیں نہیں ہیں، لیکن یہ نوّے صورتوں سے روایت کی گئی ہیں جو کہ پانی سے متعلقہ معجزات کی خبر دیتی ہیں۔

پس پہلی سات مثالیں تو تواترِ معنوی کی طرح قوی اور قطعی ہیں اور آخری دو مثالوں کے طرق اگر چہ قوی اور متعدد نہیں اور راویوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے، لیکن بادل والا دوسرا معجزہ حضرت عمرؓ سے مروی اس آٹھویں مثال میں بیان کیے گئے بادل والے اس معجزے کی تائید کرتا ہے جو ائمۂ حدیث نے کہ جن میں امام بیہقی اور حاکم سرفہرست ہیں، نے سیدنا عمرؓ سے روایت کیا ہے، اور وہ اس طرح ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اکرم ﷺ سے بارش کے لیے دعا کی درخواست کی؛ کیونکہ

لشکر کو پانی کی سخت ضرورت تھی۔ تو رسول اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ اُٹھائے تو بادل اُمڈ آئے اور برسنے لگے اور لشکر کو حسب ضرورت پانی مہیا کر کے چلے گئے۔ گویا کہ وہ لشکر کو پانی پلانے پر مأمور تھے اس لیے آئے اور حسب ضرورت پانی دے کر چلے گئے۔

تو یہ واقعہ جس طرح آٹھویں مثال کی تائید کرتا اور اس کا قطعی طور پر اثبات کرتا ہے، اسی طرح ابن الجوزی جیسا مشہور متبحر محقق جو اتنا متشدّد ہے کہ کسی حدیث کو مشکل ہی سے صحیح کہتا ہے بلکہ بسا اوقات بہت سی صحیح حدیثوں کو بھی موضوع کہہ کر ردّ کر دیتا ہے؛ وہ بھی اس واقعے کے بارے میں کہتا ہے؛ یہ واقعہ غزوۂ بدر میں پیش آیا۔ اور آیتِ کریمہ ﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ﴾ اس واقعے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس کی وضاحت کرتی ہے۔

تو جب آیت کریمہ اس واقعے کا اثبات اور اس کی وضاحت کرتی ہے تو پھر یہ واقعہ قطعی طور پر کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ دعا کے لیے اُٹھائے ہوئے ہاتھوں کو نیچے کرنے سے پہلے پہلے بارش کے فوراً آ جانے کا واقعہ کئی دفعہ ظہور میں آ چکا ہے۔ اور یہ مستقل طور پر ایک متواتر معجزہ ہے۔ اور یہ بھی متواتر منقول ہے کہ کبھی آپ ﷺ نے مسجد میں منبر پر کھڑے ہوئے بارش کی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور ہاتھ نیچے کرنے سے پہلے پہلے بارش ہو گئی۔

نواں اشارہ: رسولِ اکرم ﷺ کے معجزات کی ایک نوع درختوں کے آپ ﷺ کے حکم کی بجا آوری، اپنی جگہ سے اُکھڑ جانے اور انسانوں کی طرح چل کر آپ ﷺ کے پاس آنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ درختوں کے ساتھ تعلق رکھنے والا یہ معجزہ آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں سے بہنے والے پانی کے معجزے کی طرح معنوی طور پر متواتر ہے۔ معجزہ متعدد صورتوں کا حامل ہے اور متعدد طرق سے مروی ہے۔

جی ہاں؛ یہ کہنا صحیح ہے کہ: آپ ﷺ کے امر کے مطابق درختوں کا اپنی جگہ سے اکھڑ کر رسولِ اکرم ﷺ کے پاس چلے آنا صریح اور متواتر ہے؛ کیونکہ سیدنا علیؓ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، یعلی بن مرہؓ، جابرؓ، انس بن مالکؓ، بریدہؓ، اسامہ بن زیدؓ اور غیلان بن سلمہؓ جیسے تمام مشہور صدیق صحابہ نے درختوں والے اس معجزے کی قطعی خبر دی ہے۔ اور اس معجزے کو سینکڑوں ائمۂ تابعین نے مذکورہ صحابہ کرام میں سے ہر ایک صحابی سے الگ الگ روایت کے ساتھ نقل کیا ہے گویا کہ ان لوگوں نے اسے ہم تک دوگنا تواتر کی صورت میں نقل کیا ہے۔

پس یہ معجزۂ شجر یہ ایک ایسے قطعی معنوی تواتر کا حکم رکھتا ہے جو کسی بھی شبہے سے بالاتر ہے۔

یہ معجزہ اگرچہ بارہا دفعہ رونما ہوا ہے، مگر ہم متعدد مثالوں کے ساتھ اس معجزۂ کبریٰ کی متعدد صحیح صورتیں بیان کریں گے۔

پہلی مثال: ابن ماجہ، دارمی اور بیہقی صحیح روایت کے ذریعے حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت علیؓ سے، بزار اور امام بیہقی حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان تینوں صحابہ نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ کفار کی تکذیب سے متاثر ہو کر بہت غمگین ہوئے۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''یَارَبِّ أَرِنِیْ آیَةً لَا أُبَالِیْ مَنْ کَذَّبَنِیْ بَعْدَهَا''۔ ''پروردگار! مجھے کوئی ایسا معجزہ دکھادے کہ جس کے بعد مجھے اپنے جھٹلانے والے کی کوئی پرواہ نہ رہے'' اور حضرت انسؓ کی روایت میں ہے جبرئیلؑ اُس وقت حاضر تھے۔ اور وادی کے کنارے پر ایک درخت تھا پس رسول اکرم ﷺ نے اس درخت کو جبرئیلؑ کے کہنے پر بُلایا تو وہ چل کر آپ کے پاس آ گیا۔ تو آپ ﷺ نے اسے کہا کہ چلا جا، تو وہ چلا گیا اور اپنی جگہ پر جا کر ٹھہر گیا۔

دُوسری مثال: علامۃ المغرب قاضی عیاض ''شفاء شریف'' میں صحیح سالم، عالی اور صحیح معنعن سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک سفر میں کوئی اعرابی رسول اکرم ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ أَیْنَ تُرِیْدُ، یعنی ''کدھر جانے کا ارادہ ہے؟''۔ تو اس نے کہا: اپنے گھر۔ تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''هَلْ لَکَ إِلٰی خَیْرٍ مِنْ ذٰلِکَ؟ کیا تو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں چاہتا؟''۔ تو اعرابی نے پوچھا کہ وہ کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْکَ لَهُ، وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ''۔ تو اعرابی نے کہا: اس گواہی پر گواہ کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''هٰذِهِ الشَّجَرَةُ السَّمُرَةُ''۔ یعنی وادی کے کنارے والا درخت اس بات کی گواہی دے گا۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں: وہ درخت اپنی جگہ سے زور زور سے ہلتا ہوا اکھڑا اور زمین کو چیرتا ہوا رسول اکرم ﷺ تک پہنچ گیا۔ رسول اکرم ﷺ نے اس درخت سے تین دفعہ گواہی طلب کی تو درخت نے آپ ﷺ کی سچائی پر گواہی دی۔ پھر آپ ﷺ نے اُسے حکم دیا تو وہ اپنی جگہ پر لوٹ کر وہاں مضبوطی سے گڑھ گیا۔

حضرت بریدہؓ صحیح روایت کے ساتھ ابن صاحب الاسلمی کی سند کے ذریعے فرماتے ہیں: ہم ایک سفر میں رسول اکرم ﷺ کے پاس تھے کہ ایک اعرابی آیا اور آپ ﷺ سے کسی معجزے کا طلب گار ہوا۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قُلْ لِتِلْکَ الشَّجَرَةِ رَسُوْلُ اللّٰهِ یَدْعُوْکَ'' اس درخت سے کہو کہ تجھے اللہ کے رسول بلاتے ہیں۔ پس آپ ﷺ نے درخت کی طرف اشارہ کیا تو درخت دائیں بائیں ہلنا شروع ہو گیا، اور اپنی جڑیں زمین سے باہر کھینچ لایا نبی ﷺ کے سامنے حاضر ہو گیا اور بولا: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ'' ۔ پھر اعرابی نے کہا: اب ''وہ اپنی جگہ چلا جائے''، تب آپ ﷺ نے حکم دیا تو وہ اپنی جگہ پر چلا گیا۔ تب اعرابی نے کہا: مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کو سجدہ کروں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کام کی کسی کو اجازت نہیں۔ تو اس نے کہا: تو پھر میں آپ ﷺ کے ہاتھ پاؤں چوموں گا! تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔

تیسری مثال: صحیح مسلم اور دیگر کتب صحاح روایت کرتی ہیں جابرؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کسی

سفر میں تھے کہ آپ ﷺ کو قضائے حاجت کے لیے کسی جگہ کی طلب ہوئی لیکن کوئی باپردہ جگہ میسّر نہ آسکی۔ پھر آپ ﷺ وہاں کھڑے دو درختوں کی طرف چلے گئے۔ تو ایک درخت کی ٹہنی کو پکڑ کر کھینچا تو وہ اطاعت گزاری کے انداز میں کھنچا چلا آیا اور آپ ﷺ کے ساتھ چل دیا۔ آپ ﷺ اُسے کھینچتے ہوئے دوسرے درخت کے پاس لے آئے اور پھر دوسرے درخت کے ساتھ بھی ویسے ہی کیا اور اُن دونوں درختوں کو اُسی طرح پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا جیسے کہ ایک فرمانبردار اونٹنی کی جب مہار پکڑ لی جائے تو وہ مطیع و منقاد ہو جاتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اُن دونوں سے فرمایا: "اِلْتَئِمَا عَلَیَّ بِإِذْنِ اللّٰہِ"۔ یعنی اللہ کے حکم سے میرے لیے آپس میں مل جاؤ، تو وہ مل گئے اور پردہ دار بن گئے۔ پھر جب آپ ﷺ نے ان کی اَوٹ میں حاجت پوری کر لی تو انہیں حکم دیا اور وہ اپنی اپنی جگہ پر چلے گئے۔

جابرؓ ایک دوسری روایت میں کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: "یَا جَابِرُ قُلْ لِهٰذِهِ الشَّجَرَةِ، یَقُوْلُ لَكِ رَسُوْلُ اللّٰہِ، اِلْحَقِیْ بِصَاحِبَتِكِ حَتّٰی أَجْلِسَ خَلْفَكُمَا"۔ یعنی ان درختوں سے کہو کہ وہ اللہ کے رسول کی ضرورت کے پیشِ نظر آپس میں جڑ جائیں۔ میں نے اُسی طرح کہا تو وہ جڑ گئے۔ پھر میں انتظار ہی کر رہا تھا کہ اچانک رسول اکرم ﷺ نکل کر چلے آئے اور اپنے سر کے ساتھ دائیں بائیں اشارہ کیا تو دونوں درخت اپنی اپنی جگہ پر لوٹ گئے۔

چوتھی مثال: رسول اکرم ﷺ کے خادم خاص اور دلیر قائد اُسامہ بن زیدؓ صحیح روایت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہم رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے اور قضائے حاجت کے لیے کوئی پردہ دار خالی جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "هَلْ تَرَی مِنْ نَخْلٍ أَوْ حِجَارَةٍ؟ کیا تمہیں کوئی پتھر یا کھجور کا درخت نظر آرہا ہے؟" تو میں نے کہا کہ ہاں ہے۔ تو آپ نے حکم دیا اور فرمایا: "اِنْطَلِقْ وَقُلْ لَهُنَّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ یَأْمُرُكُنَّ أَنْ تَأْتِیْنَ لِمَخْرَجِ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَقُلْ لِلْحِجَارَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ"۔ یعنی درختوں سے کہو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ضرورت کے لیے آپس میں جڑ جائیں اور پتھروں سے کہو کہ اکٹھے ہو کر دیوار کی شکل اختیار کر لو۔

تو میں نے جا کر انہیں کہہ دیا۔ میں قسم اُٹھا کر کہتا ہوں کہ درخت ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ گئے اور پتھر دیوار بن گئے۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد مجھے حکم دیا اور فرمایا: "قُلْ لَهُنَّ یَفْتَرِقْنَ" "یعنی ان سے کہو کہ الگ ہو جائیں"۔ پس اس ذات کی قسم کہ جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے درخت اور پتھر علیحدہ علیحدہ ہو کر اپنی اپنی جگہوں پر چلے گئے۔

یہ دو واقعات جو جابرؓ اور اُسامہؓ نے بیان کیے ہیں، انہیں بعینہٖ یعلیٰ بن مُرۃؓ، غیلان بن سلمہ ثقفی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم غزوہ حُنین کے ضمن میں بیان کرتے ہیں۔

پانچویں مثال: علامۃ العصر امام ابن فورکؒ کہ جنہوں نے اپنے کمال اجتہاد اور علم و فضل کے بل پر کنایتاً "شافعی ثانی"

کا عنوان حاصل کر لیا تھا، قطعی طریقے سے خبر دیتے ہیں کہ: غزوۂ طائف میں رسول اکرم ﷺ ایک رات گھوڑے پر سوار جا رہے تھے اور آپ ﷺ پر اُونگھ طاری ہو رہی تھی آپ ﷺ اسی حالت میں تھے کہ اچانک سامنے بیری کا درخت آ گیا، لیکن درخت نے دو ٹکڑوں میں بٹ کر آپ ﷺ کو راستہ دے دیا تاکہ آپ ﷺ کے گھوڑے کو تکلیف نہ پہنچائے۔ پس رسول اکرم ﷺ درخت کے دونوں حصوں کے درمیان سے گھوڑے کے ساتھ چلتے گئے۔ اور اب وہ درخت ہمارے زمانے تک ایک قابل احترام کیفیت کے ساتھ اپنی دونوں پنڈلیوں پر باقی ہے۔

چھٹی مثال: حضرت یعلیٰ بن مرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ایک درخت جسے ''طلحہ یا سمرۃ'' کہا جاتا ہے، آیا اور رسول اکرم ﷺ کے اردگرد چکر کاٹنے لگا، جیسے آپ کے گرد طواف کر رہا ہو، اور پھر اپنی جگہ پر چلا گیا۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اِنَّهَا اِسْتَأْذَنَتْ اَنْ تُسَلِّمَ عَلَيَّ''۔ یعنی اس درخت نے اللہ تعالیٰ سے مجھے سلام کہنے کی اجازت مانگی تھی۔

ساتویں مثال: محدثین صحیح سند کے ساتھ ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: کہ جب نُصَیْبِیْن کے جن بطنِ نخل نامی جگہ پر رسولِ اکرم ﷺ سے رہنمائی لینے کے لیے آئے تو ایک درخت نے اُن کے آنے کی خبر دی۔ اسی طرح امام مجاہدؒ ابن مسعودؓ سے اسی حدیث کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ ان جنوں نے دلیل طلب کی تھی، تو رسولِ اکرم ﷺ نے ایک درخت کو حکم دیا تو وہ اپنی جگہ سے اُکھڑ کر آپ ﷺ کے پاس آیا اور پھر اپنی جگہ پر واپس بھی چلا گیا۔ پس جنوں کے اس گروہ کے لیے یہ ایک معجزہ ہی کافی رہا۔

لیکن کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک انسان اس طرح کے ہزار معجزوں کے بارے میں سنے اور پھر ایمان نہ لائے! کیا ایسا انسان ان شیطانوں سے بھی بڑا شیطان نہیں ہوگا جنہیں اس فرمان الٰہی میں جن کہا گیا ہے: ''يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا؟''۔ (حاشیہ)

آٹھویں مثال: صحیح ترمذی میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک اعرابی سے فرمایا: ''اَرَاَيْتَ اِنْ دَعَوْتُ هٰذَا الْعِذْقَ مِنْ هٰذِهِ النَّخْلَةِ اَتَشْهَدُ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ؟ ''۔ یعنی اگر میں کھجور کے اُس خوشے کو بلاؤں، اور وہ میرے پاس چلا بھی آئے تو کیا تُو ایمان لے آئے گا؟ تو اس نے کہا: جی ہاں۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے اسے بلایا تو وہ ٹہنی اپنے درخت کی چوٹی سے کٹ گئی اور پھر اس نے خود کو رسول اکرم ﷺ کے آگے ڈال دیا۔ پھر آپ ﷺ نے اُسے حکم دیا تو وہ اپنی جگہ واپس لوٹ گئی۔

ان آٹھ مثالوں کی طرح اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جو بہت سے طرق سے منقول ہیں۔ اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ جب سات آٹھ دھاگے اکٹھے ہو جائیں تو وہ مضبوط رسّی بن جاتے ہیں۔ اس بنا پر درختوں والا یہ معجزہ جو اس طرح

(حاشیہ) ''ہمارے نادان لوگ اللہ کے بارے میں بہت خلافِ حق باتیں کہتے رہے ہیں''

کے متعدد طرق سے اور مشہورترین راست گو صحابہ سے مروی ہے، بلاشبہ تواترِ معنوی کی قوت حاصل کر لیتا ہے، بلکہ یہ تواترِ حقیقی ہے۔ اور جب یہ صحابہ کے بعد تابعین تک منتقل ہو جائے تو تواتر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ خاص کر اس وقت جب بخاری، مسلم، ابن حبان اور ترمذی جیسی صحیح حدیث کی کتابوں نے صحابہ کرامؓ کے زمانے تک ان طرق پر اعتماد کیا ہو، اور ان کا اس طرح سے التزام کیا ہو کہ بخاری شریف میں انہیں دیکھ لینا بعینہ صحابہ کرام سے سننے کے مترادف ہے۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ درختوں نے تو رسولِ اکرم ﷺ کو پہچان لیا۔ انہیں سلام کیا، ان کی زیارت کی اُن کے حکم کو سنا اور اطاعت کی، لیکن ایک جامد بے عقل مخلوق جو خود کو انسان کہتی ہے، اُنہیں پہچان نہ پائی اور اُن پر ایمان نہ لائی۔ کیا ایسا انسان ایک سوکھے درخت سے بھی کم تر اور ایک ایندھن بننے والی غیر اہم اور بے قیمت لکڑی کی طرح آگ میں ڈالے جانے کے قابل نہیں ہے؟

دسواں اشارہ: یہ ستون بے تابی سے بلک بلک کر رونے کا معجزہ ہے جو کہ متواتر صورت میں منقول ہے، اور ''معجزۂ شجریہ'' کی قوی تائید کرتا ہے۔

جی ہاں؛ ایک خشک ستون کا مسجد نبوی میں ایک بہت بڑی جماعت کے سامنے وقتی طور پر ظہور میں آنے والے فراق محمدی ﷺ کی وجہ سے رو پڑنا، ہماری بیان کردہ ''معجزۂ شجریہ'' والی مثالوں کی تائید کرتا اور اُن کو قوت دیتا ہے اور کیونکہ ستون درخت ہے اور دونوں کی جنس ایک ہے۔ البتہ ستون والا معجزہ فی ذاتہ متواتر ہے جبکہ دوسری اقسام نوعی طور پر متواتر ہیں، مطلب یہ کہ ان کی اکثر جزئیات اور مثالیں صریح تواتر کے درجے کو نہیں پہنچتی ہیں۔

جی ہاں؛ رسول اکرم ﷺ مسجد نبوی میں خطبہ ارشاد فرماتے وقت کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگایا کرتے تھے۔ پھر جب منبر شریف تیار ہو گیا اور رسولِ اکرم ﷺ نے اس پر چڑھ کر خطبہ دینا شروع کیا تو اس تنے نے اونٹنی کی طرح رونا اور بلکنا شروع کر دیا۔ اُس کے رونے کی آواز تمام جماعت نے سنی حتی کہ رسول اکرم ﷺ خود اس کے پاس آئے اس پر اپنا دستِ شفقت رکھا، باتیں کیں اور اُسے تسلی دی تو وہ چپ ہو گیا۔

یہ معجزۂ محمدیہ علیہ الصلاۃ والسلام تواتر کے درجے میں بہت زیادہ طرق سے روایت کیا گیا ہے۔

جی ہاں؛ حَنِیْنُ الْجِذْعِ یعنی ستُون کے رونے بلکنے کا واقعہ بڑا مشہور منتشر اور زبان زدِ خاص و عام اور حقیقی معنوں میں متواتر ہے۔ چنانچہ اسے صحابہ کرامؓ کی ایک عظیم الشان جماعت سے پندرہ طرق سے روایت کیا گیا ہے۔ اور اس کی خبر انہی طرق سے سینکڑوں ائمۂ تابعین نے آنے والے ادوار کو دی ہے۔ اور سند کے آخری سرے پر اس معجزے کو اس جماعت کے خادمِ نبوی انس بن مالکؓ، خادمِ نبوی جابر بن عبداللہ انصاریؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، سہل بن سعدؓ، ابوسعید خدریؓ، ابی بن کعبؓ، بریدہؓ اور ام المؤمنین اُمّ سلمہؓ جیسے سربرآوردہ راویانِ حدیث میں سے ہر ایک نے روایت کیا

ہے۔اور صحیح حدیث کی تمام کتب نے جن میں سے بخاری اور مسلم سرفہرست ہیں اس متواتر معجزۂ کبریٰ کو اپنے مابعد کے آنے والے ادوار کے لیے انہی طرق کے ساتھ روایت کیا ہے۔

چنانچہ جابرؓ اپنی سند میں کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے وقت مسجد میں رکھے ہوئے لکڑی کے ایک خشک ستون کے ساتھ ٹیک لگایا کرتے تھے۔ لیکن جب منبر تیار ہو گیا اور آپ ﷺ نے منبر استعمال کرنا شروع کر دیا تو اُس ستون نے صبر نہ کیا اور اُس نے حاملہ اونٹنی کی آوازیں نکالنا شروع کر دیں اور رونے بلبلانے لگا۔

انسؓ اپنی سند میں فرماتے ہیں کہ اس نے بھینس کی طرح روتے ہوئے تمام مسجد ہلا کر رکھ دی۔

سہل بن سعدؓ اپنی روایت میں کہتے ہیں: وہ رویا تو اس کے رونے کی وجہ سے لوگوں نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

ابی بن کعبؓ اپنی سند میں بیان کرتے ہیں کہ وہ اتنی زور سے رویا کہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور رسول اکرم ﷺ نے ایک دیگر سند کے مطابق فرمایا: "اِنَّ ھٰذَا بَکٰی لِمَافَقَدَ مِنَ الذِّکْرِ" مطلب یہ کہ وہ اس لیے رویا ہے کہ اللہ کے اس ذکر سے محروم ہو گیا ہے جو اس کے پاس خطبہ دیتے وقت ہوتا تھا۔ اور ایک دیگر سند کے مطابق انہوں نے فرمایا: "لَوْ لَمْ اَلْتَزِمْهُ لَمْ یَزَلْ ھٰکَذَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ تَحَزُّنًا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ" یعنی اگر میں اسے بانہوں میں لے کر تسلی نہ دیتا تو یہ رسول اللہ کے فراق میں قیامت تک اسی طرح روتا رہتا۔

حضرت بریدہؓ اپنی سند میں کہتے ہیں کہ ستون جب رو دیا تو رسول اکرم ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس پر رکھا اور فرمایا: "اِنْ شِئْتَ اَرُدُّكَ اِلَی الْحَائِطِ الَّذِیْ کُنْتَ فِیْهِ تَنْبُتُ لَكَ عُرُوْقُكَ وَیَکْمُلُ خَلْقُكَ وَیُجَدِّدُ خُوْصُكَ وَثَمَرُكَ۔ وَاِنْ شِئْتَ اَغْرِسُكَ فِی الْجَنَّةِ یَأْکُلُ اَوْلِیَاءُ اللّٰهِ مِنْ ثَمَرِكَ" "اگر تو چاہے تو میں تجھے اسی دیوار میں واپس لوٹا دیتا ہوں جس میں تو تھا، وہاں تیری شاخیں اُگیں گی، تیری تخلیق مکمل ہو گی، تجھے نئے سرے سے پتے اور پھل لگیں گے۔ اور اگر چاہے تو میں تجھے جنت میں لگا دیتا ہوں وہاں اللہ کے دوست تیرے پھل کھائیں گے" پھر آپ ﷺ نے تنے کی طرف کان لگایا کہ جواب میں کیا کہتا ہے۔ تو اُس نے کہا اور دوسرے لوگوں نے بھی سنا کہ: "اِغْرِسْنِیْ فِی الْجَنَّةِ یَأْکُلُ مِنِّیْ اَوْلِیَاءُ اللّٰهِ فِیْ مَکَانٍ لَا یَبْلٰی"۔ "یعنی مجھے جنت میں لگا دیں؛ کہ اولیاء اللہ میرا پھل کھائیں، وہ ایسی جگہ ہے جہاں بقاء ہے فنا نہیں" تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "قَدْ فَعَلْتُ"۔ "ٹھیک ہے میں نے ایسا کر دیا" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: "اِخْتَارَ دَارَ الْبَقَاءِ عَلٰی دَارِ الْفَنَاءِ"۔ "اس نے دار الفنا کو چھوڑ کر دار البقاء کو اختیار کیا ہے"

مشہور متکلم ابو اسحاق اسفرائینی علم الکلام کے سرکردہ ائمۂ کرام سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ خود ستون کی طرف نہیں گئے تھے بلکہ خود ستون آپ ﷺ کے حکم پر چل کر آپ ﷺ کے پاس آیا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے

اُسے حکم دیا تو وہ اپنی جگہ پر واپس لوٹ گیا تھا۔

ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ اس غیر معمولی واقعے کے رونما ہونے پر رسول اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ اس ستون کو منبر کے نیچے رکھ دیا جائے تو اُسے منبر کے نیچے رکھ دیا گیا وہ اس وقت تک وہیں رہا تا آنکہ مسجد نبوی دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے شہید کی گئی۔ تب ابی بن کعبؓ نے وہ ستون اپنے پاس رکھ لیا اور بوسیدہ ہو جانے تک انہی کے پاس محفوظ رہا۔

حسن بصریؒ جب اپنے شاگردوں کو اس معجزے کے بارے میں درس دیتے تھے تو رو دیتے تھے اور کہا کرتے تھے: ایک درخت نے اگر رسولِ اکرم ﷺ کے لیے جذب و شوق اور بے تابی کا اظہار کیا ہے، تو پھر تم لوگوں کو تو آپ ﷺ کی ملاقات کے لیے زیادہ جذب و اشتیاق اور میلان کا اظہار کرنا چاہیے۔ اور ہم کہتے ہیں، جی ہاں؛ آپ ﷺ کے لیے میلان و اشتیاق و محبت صرف آپ ﷺ کی سنت مطہرہ اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے اتباع سے ہی ممکن ہے۔

ایک اہم نکتہ: اگر کہا جائے کہ: خوراک میں برکت کا معجزہ کہ جس میں چار مُدّ کی خوراک سے غزوۂ خندق میں ایک ہزار آدمی کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا گیا، اور پانی والا معجزہ کہ جس میں آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں سے جاری ہونے والے پانی نے پندرہ سو آدمیوں کی پیاس بجھائی، یہ دونوں معجزے ستون کے رونے والے معجزے کی طرح مشہور کیوں نہ ہوئے اور بہت سے طرق سے روایت کیوں نہ کیے گئے حالانکہ یہ دونوں معجزے اتنے لوگوں میں رُونما ہوئے ہیں جو ستون والے معجزے کے لوگوں سے کہیں زیادہ تھے؟

الجواب: ظہور میں آنے والے معجزات کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ان معجزات کی ہے جن کا ظہور نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں دعوائے نبوت کی تصدیق کے لیے ہوتا ہے۔ ستون کے ہچکیاں لے کر رونے کا واقعہ اسی قسم کے معجزات میں داخل ہے کہ صرف نبوت کی تصدیق کی حجت کو نمودار کرنے کے لیے ظہور میں آیا، تاکہ مومنین کے ایمان میں اضافہ کرے اور منافقین کو ہانک کر اخلاص و ایمان کی طرف لے آئے اور کافروں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے۔ اسی وجہ سے اسے خواص و عوام اور ہر ایک نے دیکھ لیا اور ہر ایک نے اس کی نشر و اشاعت میں پورے اہتمام سے کام لیا۔

لیکن خوراک یا پانی کے ساتھ تعلق رکھنے والا واقعہ معجزے سے زیادہ کرامت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، بلکہ کرامت سے بھی بڑھ کر اِکرام کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، بلکہ اِکرام سے بڑھ کر احتیاج پر مبنی ایک رحمانی ضیافت ہے؛ کیونکہ یہ اگرچہ ایک معجزہ اور دعوائے نبوت کی دلیل ہے لیکن اس سے اصل مقصد یہ ہے کہ لشکر بھوکا تھا اور اللہ تعالیٰ نے غیب کے خزانے سے ایک صاع کے وزن کے کھانے سے اُس کی مہمانی کی جیسے کہ وہ ایک گٹھلی سے ایک ہزار رطل کھجور پیدا کرتا

ہے۔(حاشیہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس رہبرِ اعظم کی انگلیوں سے آبِ کوثر کی طرح پانی جاری کر کے پیاسے مجاہدین کو پلایا۔اسی بنا پر کھانے اور پانی کے ساتھ تعلق رکھنے والے معجزات کی ہر مثال حَنِینُ الجذعِ کے معجزے کے درجے کو نہیں پہنچتی۔دونوں معجزات کی جنس اور نوع،کلی حیثیت سے حَنِینُ الجذعِ کی طرح متواتر اور کثرت کے ساتھ مروی ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ کھانے کی برکت اور آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کے بہنے کو براہِ راست ہر شخص ذاتی طور پر نہیں دیکھتا بلکہ صرف ان کے آثار دیکھتا ہے،لیکن ستون کے رونے کو ہر کوئی سنتا ہے،اس لیے وہ بہت زیادہ پھیل گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ:صحابہ کرام نے رسولِ اکرم ﷺ کی ہر حرکت اور ہر حالت کی بہت زیادہ نگرانی کی ہے اور انہیں کمال اہتمام کے ساتھ نقل کیا ہے۔تو پھر ایسا کیوں ہے کہ ایسے عظیم الشان معجزات صرف دس بیس طرق سے ہی روایت ہوتے ہیں،حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا یہ سو طرق سے روایت ہوتے؟ پھر یہ بھی ہے کہ ایسے معجزات زیادہ تر حضرت انسؓ،جابرؓ اور ابو ہریرہؓ سے ہی کیوں منقول ہیں،جبکہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ سے قلیل تعداد میں منقول ہیں؟

الجواب۔ چوتھے اشارے کی تیسری بنیاد کی پہلی شق کا جواب گزر چکا ہے۔رہا دوسری شق کا جواب،تو وہ اس طرح ہے کہ:جیسے کسی انسان کو جب علاج کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے،انجینئرنگ کے لیے کسی انجینئر کے پاس جاتا ہے اور اس سے یہ علم نقل کرتا ہے،اور کسی شرعی مسئلے کے بارے میں مفتی سے فتویٰ لیا جاتا ہے۔۔۔اسی طرح صحابہ کرام میں سے کچھ صحابہ آئندہ زمانوں کو احادیث نبویہ کا درس دینے پر متعین تھے،اور وہ اس کام کے لیے اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر تگ و دو کرتے تھے۔

جی ہاں؛ابو ہریرہؓ نے اپنی تمام زندگی حدیث نبوی کو یاد کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔عمرؓ عالمِ سیاست اور خلافتِ کبریٰ کے کاموں میں مصروف تھے۔اسی بنا پر وہ اُمّت کو حدیث کا درس دینے میں ابو ہریرہؓ،انسؓ اور جابرؓ جیسے صحابہ پر اعتماد کرتے تھے۔اور اسی وجہ سے حدیث کی روایت بہت کم کرتے تھے۔

پھر یہ بھی ہے کہ جب صدیق،صدوق،صادق اور مصدَّق صحابہ کرام میں سے کوئی مشہور و معروف صحابی ایک ہی طریق سے کسی واقعے کی خبر دے دے تو کہا جائے گا کہ یہی کافی ہے،اور کسی اور کے نقل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔یہی وجہ ہے کہ بعض اہم واقعات صرف دو تین طرق سے ہی روایت ہوتے ہیں۔

گیارھواں بلاغی اشارہ: جیسے دسویں اشارے نے درختوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے معجزات کو نمایاں کیا ہے،اسی طرح گیارھواں اشارہ جمادات میں سے سنگ و کوہ کے بارے میں معجزات نبویہ کو نمایاں کرتا ہے۔پس ہم اس کی بہت سی مثالوں میں سے سات آٹھ مثالیں ذکر کریں گے۔

(حاشیہ) ایک رطل (را کی زیر اور زبر کے ساتھ) ایک وزن جو شام میں پانچ پونڈ کا اور مصر میں تقریباً سولہ اونس کا ہوتا ہے،ہمارے ہاں مروجہ اوزان کے مطابق تقریباً آدھا کلو۔مترجم

پہلی مثال: علامۂ مغرب قاضی عیاض نے اپنی شفا شریف میں سند عالی کے ساتھ اور امام بخاری جیسے ائمۂ عظام سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ خادمِ نبوی ابن مسعودؓ نے فرمایا: ہم رسول اکرم ﷺ کے ہاں کھانا کھایا کرتے تھے تو کھانے کی تسبیح سُنا کرتے تھے۔

دوسری مثال: کتب صحاح صحیح سند کے ساتھ حضرت انسؓ اور ابو ذرؓ سے روایت کرتی ہیں کہ خادم نبوی انسؓ نے فرمایا: ہم رسولِ اکرم ﷺ کے پاس تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی ہتھیلی میں کچھ کنکریاں پکڑیں تو وہ آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں تسبیح کرنے لگ گئیں۔ پھر آپ ﷺ نے وہ کنکریاں ابوبکرؓ کے ہاتھ میں دے دیں، تو انہوں نے وہاں بھی تسبیح کی۔ ابوذرؓ اپنے طریق میں کہتے ہیں کہ: پھر آپ ﷺ نے وہ کنکریاں عمرؓ کے ہاتھ میں رکھ دیں تو وہ وہاں پھر تسبیح کرتی رہیں۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں پکڑ کر زمین پر رکھ دیا تو وہ خاموش ہوگئیں۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں پکڑ کر عثمانؓ کے ہاتھ میں رکھ دیا تو پھر تسبیح میں مصروف ہوگئیں۔ انسؓ اور ابوذرؓ کہتے ہیں پھر آپ ﷺ نے وہ کنکریاں ہمارے ہاتھوں میں رکھ دیں تو وہ خاموش ہوگئیں۔

تیسری مثال: سیدنا علیؓ، جابرؓ اور عائشہ صدیقہؓ سے یہ بات صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ پتھر اور پہاڑ رسول اکرم ﷺ کو سلام کہتے تھے اور کہتے تھے: السلام علیك یا رسول الله۔ سیدنا علیؓ اپنے طریق میں بیان کرتے ہیں کہ آغاز نبوت میں جب ہم مکہ کے گرد و نواح میں ا ہو چلتے پھرتے تو جہاں کہیں درخت اور پتھر سامنے آتے آپ ﷺ کو ان الفاظ کے ساتھ سلام کہتے: السلام علیك یا رسول الله۔

اور جابرؓ اپنے طریق میں کہتے ہیں: جب رسولِ اکرم ﷺ پتھروں اور درختوں کے سامنے ہوتے تو وہ آپ ﷺ کو سجدہ کرتے، یعنی وہ آپ ﷺ کی اطاعت کا اظہار کرتے اور کہتے: السلام علیك یا رسول الله۔

اور جابرؓ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ"۔ "میں اس پتھر کو جانتا ہوں جو مجھے سلام کیا کرتا تھا" بعض کہتے ہیں کہ یہ حجرِ اسود کی طرف اشارہ ہے۔

اور عائشہؓ اپنے طریق میں فرماتی ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "لَمَّا اسْتَقْبَلَنِي جِبْرِيلُ بِالرِّسَالَةِ جَعَلْتُ لَا أَمُرُّ بِحَجَرٍ وَلَا شَجَرٍ إِلَّا قَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ"۔ "جبریل میرے پاس رسالت لے کر آئے، اس وقت میں جس پتھر اور درخت کے پاس سے گزرتا وہ کہتا: السلام علیك یا رسول الله!"

چوتھی مثال: راویانِ حدیث حضرت عباسؓ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت عباسؓ کو اور اُن کے چاروں بیٹوں عبداللہ، عبیداللہ، فضل اور قُثَم کو ایک پردے کے نیچے چھپایا جسے "الملاءة" کہا جاتا ہے اور پھر یہ دعا فرمائی: "يَا رَبِّ! هٰذَا عَمِّي وَصِنْوُ أَبِي، وَهٰؤُلَاءِ بَنُوهُ فَاسْتُرْهُمْ مِنَ النَّارِ، كَسَتْرِي إِيَّاهُمْ بِمُلَاءَتِي" تو

گھر کی چھت، دروازہ اور دیواریں سب نے آمین آمین کہتے ہوئے دعا میں شرکت کی۔

پانچویں مثال: کتبِ صحاح کہ جن میں صحیح بخاری، ابن حبان، ابو داؤد اور ترمذی نے بالاتفاق حضرت انسؓ، ابو ہریرہؓ، عثمان ذوالنورینؓ اور سعید بن زیدؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ ابو بکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان ذوالنورینؓ ایک ساتھ جبلِ اُحد کی چوٹی پر چڑھے تو جبل احد کپکپا کر حرکت میں آ گیا، یا تو اُن کی ہیبت کی وجہ سے اور یا پھر فرح و سرور کی وجہ سے کپکپا کر حرکت میں آ گیا۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "اُثْبُتْ یَا أُحُدُ، فَإِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَ صَدِيْقٌ وَشَهِيْدَانِ" ۔ پس یہ حدیث ایک غیبی خبر ہے جو یہ بتاتی ہے کہ عثمان اور عمر شہادت کے رتبے پر فائز ہوں گے۔
اس مثال کا تتمہ بھی نقل کیا گیا ہے: رسولِ اکرم ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کی اور کفار نے آپ کا تعاقب کیا تو آپ ﷺ ثبیر نامی پہاڑ پر چڑھ گئے، تو ثبیر نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ، مجھ سے نیچے اُتر جائیں؛ کیونکہ ان لوگوں نے اگر آپ ﷺ کو میرے اُوپر قتل کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھے عذاب دے گا۔ پس میں اس چیز سے ڈرتا ہوں۔ تو جبلِ حراء نے آواز دی: "یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِلَيَّ" یعنی میری طرف آ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ دل ہمیشہ جبلِ ثبیر پر خوف اور جبل حراء پر امن محسوس کرتے ہیں۔

اس مثال سے یہ چیز سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ان گرانڈیل پہاڑوں میں سے ہر ایک مستقل غلام اور تسبیح خوان ملازم ہے جو نبی ﷺ کو پہچانتا ہے، آپ ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور بیہودہ و بیکار نہیں ہے۔

چھٹی مثال: راویانِ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسولِ اکرم ﷺ منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمٰوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِيْنِهِ" اور فرمایا: "إِنَّ الْجَبَّارَ يُعَظِّمُ نَفْسَهُ وَيَقُوْلُ: أَنَا الْجَبَّارُ أَنَا الْجَبَّارُ، أَنَا الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالُ" جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا: منبر پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ مضطرب ہو کر کچھ اس طرح سے کپکپانے لگا کہ ہم ڈر گئے کہ کہیں "رسول اکرم ﷺ" منبر سے گر ہی نہ جائیں!

ساتویں مثال: راویانِ حدیث صحیح سند کے ساتھ حبرُ الأمت اور ترجمانُ القرآن عبداللہ بن عباسؓ اور خادمِ نبوی اور عظیم صحابی عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان دونوں نے فرمایا: فتح مکہ کے دن کعبہ کے اندر اور اس کے اردگرد تین سو ساٹھ بت تھے جو سیسے کے ساتھ پتھروں میں گاڑھ دیے گئے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے اُن بتوں کی طرف ایک ایک کر کے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کمان جیسی چھڑی کے ساتھ اشارہ کیا اور فرمایا: "جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا"۔ یہ پڑھتے ہوئے آپ ﷺ جس بت کی طرف اشارہ کرتے گئے وہ زمین پر گرتا گیا۔ اگر صنم کے منہ کی طرف اشارہ کیا تو گدی کے بل نیچے آ گیا اور اگر اس کی گدی کی طرف اشارہ کیا تو وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اور

یوں تمام بت زمین بوس ہو گئے۔

آٹھویں مثال: بحیرہ راہب والا مشہور قصہ ہے، اور وہ اس طرح ہے کہ: رسولِ اکرم ﷺ نبوت سے پہلے اپنے چچا ابو طالب اور بعض قریشیوں کے ہمراہ تجارت کے لیے شام کی طرف جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ دورانِ سفر جب بحیرا راہب کے کلیسا کے قریب سے گزرے تو وہاں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ تو اچانک دنیا سے علیحدہ ہو کر گوشے میں بیٹھا ہوا راہب وہاں سے نکل کر ان کے پاس آیا محمد الامین ﷺ کو دیکھ کر قافلہ والوں سے کہنے لگا: ''یہ سید العالمین ہے اور عنقریب نبی بنے گا۔ تو قریش نے کہا: آپ کو اس چیز کا کیسے پتا چلا؟ اس بابرکت راہب نے کہا: جب تم لوگ آئے تھے میں نے دیکھا کہ فضا میں بادل کا ایک ٹکڑا سایہ کر رہا تھا۔ پھر جب تم بیٹھ گئے تو وہ اس محمد الامین ﷺ کی طرف مائل ہو گیا اور اس پر سایہ فگن رہا۔ اور میں نے ایک کیفیت یہ بھی دیکھی کہ گویا پتھر اور درخت اسے سجدہ کر رہے ہیں۔ اور ایسا تو صرف انبیاء کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

یوں ان آٹھ مثالوں کی طرح اَسّی مثالیں موجود ہیں۔ ان آٹھ مثالوں کو جب یکجا کیا جائے تو یہ ایک ایسا محکم سلسلہ بن جائے گا کہ جسے کوئی شبہ نہ توڑ سکتا ہے نہ متزلزل کر سکتا ہے اور معجزات کی یہ قسم یعنی دعوائے نبوت پر دلالت کرنے کے لیے جمادات کا گفتگو کرنا اپنے عموم کے اعتبار سے معنوی تواتر کا حکم رکھتی ہے، اس لیے ان کے قطعی اور یقینی ہونے کا فائدہ دیتی ہے۔ اور ہر مثال مجموعی مثالوں کی قوت سے ایک ایسی قوت حاصل کرتی ہے جو اس کی اپنی قوت سے زیادہ قوی ہے۔

جی ہاں! ایک کمزور ستون کو جب دیگر قوی ستونوں کا سہارا مل جائے تو وہ قوی ہو جاتا ہے، اور ایک کمزور و نادار آدمی جب لشکر کے ساتھ مل جائے تو وہ طاقتور ہو جاتا ہے اور ایک ہزار آدمیوں کو چیلنج دے سکتا ہے۔

بارھواں اشارہ: یہ تین مثالیں ہیں جو گیارھویں اشارے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، لیکن ہیں بڑی اہم۔

پہلی مثال: آیت کریمہ: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ رَمَىٰ﴾ اپنی قطعی نص کے ذریعے اور تمام محقق مفسرین و محدثین کے ذریعے خبر دیتی ہے کہ: رسولِ اکرم ﷺ نے غزوۂ بدر میں مٹی اور کنکریوں کی ایک مٹھی بھری اور اسے کفار کے لشکر کی طرف پھینک دیا اور فرمایا: ''شَاهَتِ الْوُجُوْهُ'' تو جس طرح ''شَاهَتِ الْوُجُوْهُ'' کا لفظ جو کہ ایک کلام ہے، ان لوگوں میں سے ہر ایک کے کان تک پہنچ گیا اسی طرح وہ مشتِ خاک ہر کافر کی آنکھ تک پہنچ گئی اور یوں وہ سب کے سب آنکھیں ملنے میں مصروف ہو گئے اور اچانک شکست کھا گئے جبکہ اس سے پہلے وہ بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔

اسی طرح امام مسلمؒ سمیت دیگر اصحابُ الحدیث یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ حنین میں کفار غزوۂ بدر کی طرح بڑی شدت کے ساتھ حملہ آور ہو رہے تھے۔ وہاں بھی آپ ﷺ نے اُن کی طرف مٹی کی مٹھی بھر کر پھینکی اور فرمایا: ''شَاهَتِ الْوُجُوْهُ'' اور وہ مشتِ خاک باذن اللہ ہر کافر کے چہرے تک پہنچ گئی۔ اسی طرح ''شَاهَتِ الْوُجُوْهُ'' کا لفظ ہر ایک کے کان

تک پہنچ گیا، چنانچہ وہ لوگ آنکھیں ملتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

پس بدر و حنین میں پیش آنے والا یہ واقعہ معمول کے اسباب کے دائرے سے باہر اور بشری طاقت سے کہیں بلند ہے۔ اسی بنا پر قرآنِ معجز بیان کہتا ہے: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ یعنی یہ حادثہ بشری طاقت سے باہر ہے۔ یہ بشری قوت سے نہیں بلکہ کسی مافوق العادت طریقے سے قدرتِ الٰہی کے ذریعے ظہور میں آیا ہے۔

دوسری مثال: کتبِ صحاح کہ جن میں بخاری مسلم سرِ فہرست ہیں، خبر دیتی ہیں کہ ایک یہودی عورت نے بکری بھون کر اور اس میں ایک مہلک قسم کا زہر ملا کر رسولِ اکرم ﷺ کی طرف تحفتاً بھیج دی۔ صحابہ کرامؓ نے اُسے کھانا شروع کر دیا تو اچانک آپ ﷺ نے فرمایا: "اِرْفَعُوا اَيْدِيَكُمْ، اِنَّهَا اَخْبَرَتْنِي اَنَّهَا مَسْمُوْمَةٌ" ۔ یعنی یہ بھونی ہوئی بکری مجھے بتا رہی ہے کہ میں زہر آلود ہوں۔ اس نے مجھے ایسے ہی بتایا ہے۔ تب ہر آدمی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا لیکن ایک صحابی بشر بن براءؓ نے اُس کا ایک لقمہ کھا لیا تھا اس لیے وہ اس زہر کی تاثیر سے فوت ہو گئے تھے۔ تو رسول اکرم ﷺ نے زینب نامی اس عورت کو بلا کر پوچھا: تُو نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس منحوس نے کہا: اس لیے کہ اگر آپ ﷺ نبی ہیں تو یہ آپ ﷺ کو نقصان نہیں دے گی، اگر کوئی بادشاہ ہوئے تو میں لوگوں کو آپ کے چنگل سے رہائی دلا دوں گی"۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے قصاص نہیں لیا تھا اور بعض میں ہے کہ اُس سے قصاص لیا تھا۔ محققین کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بذاتِ خود اس سے قصاص نہیں لیا تھا بلکہ اُسے حضرت بشر بن براءؓ کے ورثاء کے حوالے کر دیا تھا اور انہوں نے اُسے قتل کر دیا۔

اب ذرا بعض ایسے نقاط پر کان دھرو جو اس عجیب و غریب واقعے میں پائے جانے والے اعجازی پہلو پر دلالت کرتے ہیں:

پہلا نقطہ: بعض روایات میں آیا ہے کہ اُس بکری کی ران نے جب آپ ﷺ کو اپنی زہر آلودگی کی خبر دی تو وہ آواز بعض صحابیوں نے بھی سنی تھی۔

دوسرا نقطہ: ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے انہیں زہر کے بارے میں خبر دینے کے بعد فرمایا کہ کہو: "بِسْمِ اللّٰهِ" اور پھر کھالو، اب زہر نقصان نہیں دے گا۔ یہ روایات ابن حجر عسقلانیؒ نے اگرچہ قبول نہیں کی ہیں، لیکن دیگر علماء و محدثین نے قبول کر لی ہیں۔

تیسرا نقطہ: مکار یہودیوں نے جب یہ سازش تیار کی اور رسولِ اکرم ﷺ اور مقرب صحابہ کرامؓ پر دفعتاً ایک ضرب کاری لگانے کا مکروہ ارادہ کیا تو یہ حادثہ ظہور میں آیا اور اچانک وہ سازش ایسے ناکام ہو گئی کہ گویا اس کے بارے میں غیب کی طرف سے خبر دی گئی ہو۔ اور اس واقعے نے اس چیز کی تصدیق کر دی جس کی خبر دی گئی تھی۔ اور رسول اکرم ﷺ نے،

کہ صحابہ کرامؓ کی نظر میں جن کی کوئی بھی خبر کبھی بھی خلاف واقعہ ثابت نہیں ہوئی، فرمایا: ''اس بکری کی ران مجھے بتا رہی ہے کہ یہ زہر آلودہ ہے۔ تو انہیں ایسی قناعت اور ایسا اطمینان حاصل ہو گیا کہ گویا ان میں سے ہر ایک نے بکری کی یہ بات اپنے کانوں سے سُنی ہے''۔

• **تیسری مثال:** اس میں نبی ﷺ کے تین واقعات میں پائے جانے والے وہ معجزات ہیں جو کہ عصائے موسیٰ اور اُن کے یدِ بیضا والے معجزے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

پہلا واقعہ: امام احمد بن حنبلؒ نے یہ حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے اور اسے صحیح بھی کہا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک تاریک اور بارش والی رات میں قتادہ بن نعمانؓ کو لاٹھی دی اور کہا: یہ تمہارے لیے چراغ کی طرح ہر سمت میں دس گز تک روشنی کرے گی۔ اور جب گھر پہنچے گا تو تجھے کسی شخص کا سیاہ سایہ نظر آئے گا، وہ شیطان ہے، اُسے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دینا۔ قتادہؓ نے لاٹھی پکڑی اور چلے گئے، لاٹھی نے جو کہ یدِ بیضاء کی طرح چمک رہی تھی اُن کے لیے راستہ روشن کر دیا اور وہ اپنے گھر پہنچ گئے، وہاں اُنہوں نے اس سیاہ شخص کو دیکھا اور اُسے گھر سے نکال دیا۔

دُوسرا واقعہ: عکاشہ بن محصن اسدیؓ کی تلوار جنگ بدر میں ـ جو کہ سرچشمۂ غرائب ہے ـ مشرکین سے لڑتے ہوئے ٹوٹ گئی تو رسولِ اکرم ﷺ نے اُنہیں تلوار کی بجائے ایک مضبوط لاٹھی پکڑا دی اور فرمایا: اس کے ساتھ لڑو۔ تو وہ لاٹھی اللہ کے حکم سے ایک سفید رنگ کی لمبی سی تلوار بن گئی اور وہ اُس کے ساتھ لڑتے رہے۔ اور وہ تاحیات اُسے اپنے کندھے سے لٹکا کر رکھتے تھے تا آنکہ وہ خود جنگِ یمامہ میں شہید ہو گئے۔

یہ واقعہ بالکل قطعی ہے، کیونکہ عکاشہؓ تمام عمر اس تلوار پر فخر کرتے رہے۔ اُن کی یہ تلوار ''العون'' کے نام سے مشہور ہو گئی۔ پس عکاشہؓ کا اس تلوار پر فخر کرتے رہنا اور ان کی اس تلوار کا ''العون'' کے نام پر مشہور ہونا اس واقعہ کی دو واضح دلیلیں ہیں۔

تیسرا واقعہ: ابن عبد البرؒ جیسا علامۃ العصر کبار محققین سے یہ روایت نقل کرتا ہے اور اسے صحیح بھی کہتا ہے کہ: رسول اکرم ﷺ کی خالہ کے بیٹے عبد اللہ بن جحشؓ کی غزوۂ اُحد میں لڑتے لڑتے تلوار ٹوٹ گئی تو رسول اکرم ﷺ نے انہیں ایک لاٹھی پکڑا دی، تو وہ لاٹھی اُن کے ہاتھ میں تلوار کا روپ دھار گئی اور وہ اس کے ساتھ لڑتے رہے اور معجزے کے نتیجے میں نمودار ہونے والی وہ تلوار باقی رہی۔

مشہور سیرت نگار ابن سید الناس روایت کرتے ہیں کہ: عبد اللہ بن جحشؓ نے وہ تلوار بُغا تر نامی ایک آدمی کو دو سو دینار میں بیچ دی تھی۔

پس یہ دو تلواریں عصائے موسیٰ کی طرح کا معجزہ ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ عصائے موسیٰ کے معجزے کا موسیٰؑ کی

رحلت کے بعد کوئی پہلو باقی نہ رہا، لیکن یہ دونوں معجزاتی تلواریں باقی رہیں۔

تیرھواں اشارہ: معجزاتِ محمدیہ علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک متواتر اور بہت سی مثالوں پر مشتمل نوع وہ ہے جو آپ ﷺ کی پھونک سے مریضوں اور زخمیوں کو شفا دینے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ معجزات محمدیہ علیہ الصلاۃ والسلام کی یہ نوع اپنی نوع کے اعتبار سے متواتر معنوی ہے۔ اور اس کی جزئیات میں سے ایک وہ بھی ہے جو معنوی تواتر کا حکم رکھتی ہے۔ اور دوسری قسم اگرچہ آحادی ہے مگر وہ ایک قسم کی علمی قناعت پیدا کرتی ہے؛ کیونکہ مدقق ائمۂ حدیث نے اس کی تصحیح و تخریج کی ہے۔ ہم اس کی بہترین مثالوں میں سے چند مثالیں ذکر کریں گے۔

پہلی مثال: علامۃ المغرب قاضی عیاض اپنی ''شفاء شریف'' میں سندِ عالی اور متعدد طرق کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ: یکے از عشرہ مبشرہ خادم و قایدِ رسول ﷺ، سپہ سالارِ لشکرِ اسلام، اور سیدنا عمرؓ کے عہدِ خلافت میں فاتحِ ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا: میں غزوۂ اُحد میں رسولِ اکرم ﷺ کے پاس تھا آپ ﷺ نے اس دن کفار پر اتنے تیر چلائے کہ آپ کی کمان ٹوٹ گئی۔ پھر آپ مجھے تیر پکڑا کر کہتے تھے کہ چلاؤ۔ اور مجھے جو تیر پکڑاتے تھے بغیر پر کے ہوتے تھے، یعنی پر اور نوک کے بغیر تھے۔ لیکن مجھے حکم دے کر کہتے کہ: چلاؤ، تو میں چلا دیتا تھا۔ پس وہ پروں والے تیروں کی طرح اُڑتے جاتے اور کفار کے جسموں میں پیوست ہو جاتے ہم اسی کیفیت میں تھے کہ کافروں کی طرف سے ایک تیر قتادہ بن نعمانؓ کی آنکھ پر آ کر لگا۔ اُن کی آنکھ نکل گئی اور ڈھیلا رخسار پر ڈھلکنے لگا تو رسول اکرم ﷺ نے وہ ڈھیلا اپنے شفا بخش مُبارک ہاتھ سے پکڑ کر آنکھ میں لگا دیا۔ تو آنکھ اس طرح شفایاب ہو گئی کہ جیسے اُسے کبھی کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ بلکہ وہ دوسری آنکھ کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا کہ قتادہؓ کا ایک پوتا حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے پاس گیا تو اس نے ان سے اپنا تعارف یہ دو شعر نظم کر کے کروایا:

أَنَا ابْنُ الَّذِیْ سَالَتْ عَلَی الْخَدِّ عَیْنُهٗ

میں اس کا بیٹا ہوں جس کی آنکھ نکل کر رخسار پر ڈھلک گئی تھی۔

فَرُدَّتْ بِکَفِّ الْمُصْطَفٰی أَحْسَنَ الرَّدِّ

لیکن وہ مصطفیٰ ﷺ کی ہتھیلی کے ذریعے بہترین طریقے سے واپس کر دی گئی۔

فَعَادَتْ کَمَا کَانَتْ لِأَوَّلِ أَمْرِهَا

تب وہ بالکل اسی طرح ہو گئی جیسے پہلے تھی۔

فَیَا حُسْنَ مَا عَیْنٍ، وَیَا حُسْنَ مَا رَدَّ

کیا خوبصورت آنکھ تھی اور کیا خوبصورت اسے اس کی جگہ پر واپس لگانا!

اور صحیح روایت کے ساتھ یہ بھی مروی ہے کہ ''یوم ذی قرد'' نامی غزوہ میں ایک تیر حضرت ابوقتادہؓ کے چہرے پر آ کر لگا۔ تو رسول اکرم ﷺ نے ان کے مبارک چہرے پر اپنا دست مبارک پھیر دیا۔ ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ مجھے اس تیر کا قطعاً درد نہ ہوا اور زخم بھی جاتا رہا۔

دوسری مثال: بخاری و مسلم سمیت دیگر کتب صحاح بتاتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے غزوۂ خیبر میں جھنڈا علی حیدرؓ کے ہاتھ میں تھمایا اُس وقت اُن کی آنکھیں دُکھ رہی تھیں لیکن جب رسول اکرم ﷺ نے ان پر اپنا تریاق جیسا لب مبارک لگایا تو بالکل اسی لحظہ میں ٹھیک ہو گئیں۔ چنانچہ آپؓ نے صبح کے وقت خیبر کا انتہائی وزنی آہنی دروازہ اُکھاڑ کر اُسے ڈھال کی طرح ہاتھ میں پکڑ لیا اور قلعہ خیبر فتح کر لیا۔ اس واقعہ میں سلمہ بن اکوعؓ کی پنڈلی کو تلوار لگی اور وہ چر گئی۔ تو رسول اکرم ﷺ نے اس پر پھونک ماری تو ان کا پاؤں دفعتاً ٹھیک ہو گیا۔

تیسری مثال: اصحاب سیر کہ جن میں نسائی سرفہرست ہیں عثمان بن حنیف سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:
ایک نابینا آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''میری بینائی کے لیے دعا فرمائیں تو رسولِ اکرم ﷺ نے اُس سے فرمایا: جاؤ وضو کر کے آؤ پھر دو رکعتیں پڑھو اور کہو: فَانْطَلِقْ وَتَوَضَّأْ ثُمَّ صَلِّ رَكْعَتَيْنِ وَقُلْ ''اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ؛ يَامُحَمَّدُ، اِنِّيْ أَتَوَجَّهُ بِكَ اِلَى رَبِّكَ، اَنْ يَكْشِفَ عَنْ بَصَرِيْ اَللّٰهُمَّ شَفِّعْهُ فِيَّ'' ۔ ''اے اللہ! میں نبی رحمت محمد ﷺ کے وسیلے سے تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہو رہا ہوں۔ اے محمد ﷺ! میں آپ کے وسیلے سے آپ کے رب کی طرف متوجہ ہو رہا ہوں کہ وہ میری بینائی لوٹا دے۔ اے اللہ! میرے بارے میں ان کی سفارش قبول فرما'' اُس نے جا کر اسی طرح کیا جیسے اسے کہا گیا تھا، تو اُس کی بینائی لوٹ آئی۔ اور ہم نے دیکھا کہ وہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

چوتھی مثال: جلیل القدر امام ابنِ وہب روایت کرتے ہیں کہ معوذ بن عفراء جو کہ بدر کے چودہ شہداء میں سے ایک ہیں، ابوجہل ملعون سے لڑ رہے تھے کہ ان کا ایک ہاتھ کٹ گیا۔ تو اُنہوں نے اپنا وہ کٹا ہوا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا اور رسول اکرم ﷺ کے پاس چلے آئے۔ تو رسول اکرم ﷺ نے ان کا وہ ہاتھ اپنی جگہ پر جوڑ کر اُو پر اپنا لعاب مبارک لگایا تو وہ دفعتاً ٹھیک ہو گیا۔ تب وہ دوبارہ میدانِ جنگ میں چلے گئے اور شہید ہونے تک لڑتے رہے۔

ابن وہب یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ اسی غزوے میں خبیبؓ بن یساف کے کندھے پر تلوار لگی تو اس سے اتنا گہرا زخم ہو گیا کہ گویا بازو کا ایک حصہ گر ہی گیا ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے اُن کا بازو اپنے دستِ مبارک سے اُن کے کندھے کے ساتھ جوڑ کر اس پر اپنا لعاب مبارک لگا دیا اور پھونک ماری، تو وہ بھلا چنگا ہو گیا۔

اب یہ دونوں واقعات اگرچہ آحاد طریقے سے خبرِ واحد کی صورت میں روایت کیے گئے ہیں، لیکن جب انہیں

ابن وہب جیسے امام نے صحیح کہا ہے، اور یہ بدر جیسے غزوے میں پیش آئے ہیں جو سر چشمۂ معجزات ہے، اور بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جو ان دو واقعات کا ذکر کرتی ہیں، تو پھر یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ دونوں واقعات قطعی ہیں اور بلا شبہ وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

اور یوں صحیح احادیث سے ثابت شدہ شاید ایسی ہزاروں مثالیں مل جائیں جن سے پتا چلتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا دست مبارک ایسی پریشانیوں کے لیے شفا بن گیا تھا۔

یہ قطعہ اس قابل ہے کہ اسے آبِ زر سے لکھا جائے اور ہیروں سے مزین کیا جائے

جی ہاں؛ ابھی جو بحث ہوئی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کی ہتھیلی میں کنکریوں کا ذکر و تسبیح کرنا۔

☆ فرمانِ گرامی ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى﴾ کی برکت سے آپ ﷺ کی اُسی ہتھیلی میں مٹی اور کنکریوں کا دشمنوں کے مقابلے میں توپ کے گولوں کا کام دینا

☆ فرمان گرامی ﴿وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ کی رُو سے آپ ﷺ کی اُسی ہتھیلی کی اُنگلی سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا

☆ اور وہی ہاتھ جس کی دس انگلیوں سے چشمے کی طرح پانی بہہ نکلنا، آپ ﷺ کا یہ پانی اپنے لشکر کو پلانا

☆ اور عین اُسی ہاتھ کا مریضوں اور زخمیوں کے لیے شفا بن جانا۔ یہ سب کچھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ با برکت ہاتھ قدرتِ الٰہیہ کا کتنا بڑا خارقُ العادت معجزہ ہے۔ تو گویا کہ اُس ہاتھ کی ہتھیلی:

☆ احباب کے درمیان ایک چھوٹا سا سبحانی دائرُ الذکر ہے کہ اس میں کنکریاں بھی چلی جائیں تو ذکر و تسبیح میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اور دشمنوں کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا ربانی اسلحہ خانہ ہے کہ اس میں پتھر اور مٹی چلے جائیں تو گولہ اور بم بن جاتے ہیں

☆ مریضوں اور زخمیوں کے لیے ایک چھوٹی سی رحمانی فارمیسی ہے کہ اگر بیماری کو چُھو جائے تو وہ اُس مریض کے لیے شفا بن جاتی ہے

☆ یہ ہاتھ جب جلال کے ساتھ اُوپر اُٹھتا ہے تو چاند کو دو ٹکڑے کر کے اسے دو کمانوں کے رُوپ میں جلوہ گر کر دیتا ہے

☆ اور جب جمال کے ساتھ التفات کرتا ہے تو آبِ کوثر جاری کر دینے والا دس دھاری چشمۂ رحمت بن جاتا ہے۔

کیا اس طرح کے معزز انسان کا صرف ایک ہاتھ اگر اس طرح کے عجیب و غریب معجزات کا مظہر اور دار و مدار بن جائے تو یہ بات بدیہی طور پر معلوم نہیں ہو جاتی ہے کہ:

☆وہ معزز انسان خالقِ کائنات کے ہاں مقبول ہے

☆وہ اپنے دعوے میں کتنا سچا ہے

☆اور جو اس مبارک ہاتھ پر بیعت کرلیں وہ کتنے سعادت مند ہو جائیں گے

سوال: آپ بہت سے معاملات میں کہتے ہیں کہ یہ متواتر ہے۔ جبکہ بہت ساری باتیں ہم ابھی سن رہے ہیں۔ متواتر چیز تو اس حد تک مخفی نہیں رہ سکتی ہے!

الجواب: علمائے شریعت کے ہاں کچھ ایسے معاملات پائے جاتے ہیں جو متواتر اور بدیہی ہیں لیکن وہ دوسروں کے ہاں مجہول ہیں۔ اور اصحاب الحدیث کے ہاں بہت سی متواتر احادیث ہیں جو دوسروں کے ہاں آحاد میں بھی شامل نہیں ہیں۔ اور اسی طرح۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فن میں تخصص کا درجہ رکھنے والے لوگ ہی اس فن کی بدیہی اور نظری چیزوں کی وضاحت کرتے ہیں، بقیہ لوگ اُس فن کے ماہرین پر اعتماد کرتے ہیں، اُنہی کی بات کو تسلیم کرتے ہیں، یا پھر اُن میں داخل ہو کر انہی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

چنانچہ ہم نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے وہ یا تو حقیقی طور پر یا معنوی طور پر متواتر ہیں، یا تو اللہ کے حکم میں قطعیت کا فائدہ دینے والے ہیں، ان کے متعلق اصحابِ حدیث، اہلِ شریعت، علمائے اصول اور علماء کے اکثر طبقات نے وہی حکم لگایا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ لیکن اگر عام غافل لوگوں کو اور آنکھیں بند کر لینے والے بے علم لوگوں کو اس کا پتا نہیں چلا تو پھر ملامت بھی انہیں کو ہونی چاہیے۔

پانچویں مثال: امام بغوی اپنی تخریج وتصحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ خندق میں کفار کی طرف سے گہری چوٹ کی وجہ سے علی بن حکم کے پاؤں میں موچ آگئی تو رسول اکرم ﷺ نے اسے گھوڑے سے بھی نہیں اُترنے دیا بلکہ اُسی وقت اس کے پاؤں پر ہاتھ پھیرا تو وہ فوراً صحیح ہو گیا۔

چھٹی مثال: اصحاب الحدیث کہ جن میں امام بیہقی سرفہرست ہیں، روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ بہت زیادہ بیمار تھے اور درد سے کراہتے ہوئے دعا کر رہے تھے کہ اچانک رسول اکرم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اشْفِهِ'' اور علیؓ کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور انہیں فرمایا کہ اُٹھ! چنانچہ وہ فوراً ٹھیک ہو گئے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد وہ بیماری کبھی میرے قریب بھی نہیں پھٹکی۔

ساتویں مثال: شرحبیل جعفیؓ والا مشہور قصہ ہے، اور وہ یوں ہے کہ ان کی ہتھیلی میں ایک گلٹی تھی جس کی وجہ سے وہ تلوار کا دستہ اور گھوڑے کی لگام تھامنے سے قاصر تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس گلٹی پر اپنا دستِ مبارک پھیرا اور اس پر مساج کیا تو اُس کا نشان تک مٹ گیا۔

آٹھویں مثال: چھ بچوں کے بارے میں ہے، جن میں سے ہر ایک علیحدہ طور پر کسی نہ کسی معجزۂ محمدیہ کا مظہر بنا ہے:

پہلا: محقق کامل اور مشہور محدث ابن ابی شیبہؒ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے پاس ایک عورت اپنا بچہ لے کر آئی جو کسی بیماری کی وجہ سے بول نہیں سکتا تھا اور کچھ بیوقوف سا تھا۔ تو رسول اکرم ﷺ نے پانی لے کر کلی کی اور اس کے ساتھ اپنے ہاتھ دھوئے۔ پھر وہ پانی اس عورت کو دے دیا اور فرمایا کہ یہ پانی بچے کو پلا دے۔ بچے نے پانی پی لیا تو بالکل ٹھیک ہو گیا اور اس کی بیماری کا نام نشان تک ختم ہو گیا۔ اور ایسا صاحب عقل و کمال بنا کہ بڑے بڑے عقل مندوں سے بازی لے گیا۔

دوسرا: حضرت ابن عباسؓ صحیح روایت کے مطابق فرماتے ہیں: ایک پاگل بچہ رسول اکرم ﷺ کے پاس لایا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس کے سینے پر رکھا تو اُس نے قے کر دی، تو اس کے پیٹ سے چھوٹے سے کھیرے کے برابر کی ایک سیاہ رنگ چیز نکلی اور بچہ ٹھیک ہو کر چلا گیا۔

تیسرا: امام بیہقی اور نسائی صحیح سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ ایک اُبلتی ہوئی ہنڈیا محمد بن حاطب نامی چھوٹے سے بچے کے بازو پر گر گئی اور اس کا تمام بازو جل گیا۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنا لعاب مبارک اس بازو پر مل دیا تو ایک سیکنڈ میں صحیح ہو گیا۔

چوتھا: ایک بڑی عمر کا بچہ لایا گیا جو بول نہیں سکتا تھا۔ تو رسول اکرم ﷺ نے اُسے مخاطب کر کے پوچھا: میں کون ہوں؟ تو اُس گونگے بچے نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور پھر اُس نے بولنا شروع کر دیا۔

پانچواں: امام سیوطیؒ جنہیں بار ہا دفعہ بیداری میں رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہمنشینی کا شرف حاصل ہوا ہے، تخریج و تصحیح کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس مبارک الیمامہ نامی ایک نومولود بچہ لایا گیا رسولِ اکرم ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُس نے بولنا شروع کر دیا اور کہنے لگا: "اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" ۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "بَارَكَ اللّٰهُ" ۔ پھر وہ بچہ معجزۂ محمدیہ اور "بَارَكَ اللّٰهُ" والی دعائے نبوی کے مظہر ہونے کی وجہ سے "مُبَارَكُ الْيَمَامَه" کے نام سے مشہور ہوا۔

چھٹا: رسولِ اکرم ﷺ ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شرارتی ناہنجار بچے نے آپ ﷺ کی نماز توڑ دی اور چلا گیا۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "اَللّٰهُمَّ اقْطَعْ اَثَرَهٗ" ۔ تو وہ بچہ اس کے بعد چل نہ سکا اور یوں اس نے اپنی شرارت کی سزا پائی۔

ساتواں: رسولِ اکرم ﷺ ایک دفعہ کھانا کھا رہے تھے کہ ایک بچوں جیسی طبیعت رکھنے والی بے شرم سی عورت نے آپ ﷺ سے ایک لقمہ مانگا۔ آپ ﷺ نے اسے لقمہ دے دیا تو اُس نے کہا کہ میں وہ لقمہ چاہتی ہوں جو آپ کے منہ

میں ہے۔ تو آپ ﷺ نے وہ بھی دے دیا۔ تو وہ پرلے درجے کی بے حیا عورت وہ لقمہ کھا کر مدینہ کی تمام عورتوں سے بڑھ کر حیادار بن گئی۔

اور یوں اس معجزے کی ان آٹھ مثالوں جیسی اسی نہیں بلکہ آٹھ سو مثالیں پائی جاتی ہیں جن میں سے اکثر سیر واحادیث کی کتابوں میں بیان ہو چکی ہیں۔

جی ہاں؛ رسول اکرم ﷺ کا دستِ مبارک جب لقمان حکیم کی فارمیسی کی شان رکھتا ہو۔

لعابِ مبارک خضرؑ کے آبِ حیات کے چشمے کی تاثیر کا حامل ہو۔

پھونک دمِ عیسیٰ کی طرح شافی اور مددگار ہو۔

اور نوعِ انساں بہت سے مصائب وآلام کی شکار ہو تو پھر بلاشبہ واقعات بھی بہت زیادہ رونما ہوئے ہیں، رسولِ اکرم ﷺ کے پاس بیمار ولاچار، پاگل اور چھوٹے بچے بھی بہت سے آئے ہیں اور سب کے سب شفایاب ہو کر گئے ہیں۔

حتّی کہ ابوعبدالرحمان یمانی جو کہ طاؤس کے نام سے مشہور ہیں، اور جو کبار ائمہٴ تابعین میں سے ہیں، بہت زیادہ صحابہ کرامؓ سے ملے ہیں، جنہوں نے چالیس سال تک عشاء کے وضو کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی ہے اور چالیس حج کیے ہیں۔ قطعی حکم لگا کر روایت کرتے ہیں کہ کوئی ایسا پاگل نہیں جو رسولِ اکرم ﷺ کے پاس آیا ہو اور آپ ﷺ نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا ہو تو وہ مکمل طور پر شفایاب نہ ہوا ہو۔ ایسا کوئی نہیں جسے شفا نہ ملی ہو۔

تو عصرِ سعادت کو پانے والا طاؤس جیسا جلیلُ القدر امام جب اس طرح کا قطعی اور کلی حکم لگا دے تو پھر یہ بات شک وشبہ سے بالا ہو جاتی ہے کہ جو مریض بھی آپ ﷺ کے پاس آیا ہے اس نے شفا پائی ہے اور جب شفا ملی ہے تو پھر بلاشبہ شفا کے مطالبے ہزاروں کے حساب سے رہے ہوں گے۔

چودہواں بلاغی اشارہ: رسولِ اکرم ﷺ کے معجزات کی ایک قسم وہ عظیمُ الشان خارقِ عادت واقعات ہیں جو آپ ﷺ کی دعا کی برکت سے ظہور میں آئے ہیں۔ جی ہاں؛ معجزات کی یہ قسم قطعی اور حقیقی متواتر ہے۔ اس کی جزئیات اور مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ شمار کرنے سے باہر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت ساری مثالیں ہیں کہ وہ بھی متواتر کے درجے تک پہنچ گئی ہیں۔ بلکہ تواتر کے قریب قریب ہونے کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو ایسے ائمہٴ کرام نے نقل کی ہیں کہ مشہور ومتواتر کی طرح قطعی ہونے کا فائدہ دیتی ہیں۔

ہم ان بہت سی مثالوں میں سے بطورِ مثال بعض ایسی مثالیں ذکر کریں گے جو تواتر کے قریب قریب ہیں اور مشہور کے درجے میں ہیں۔ اور اُن میں سے ہر مثال میں اس کی متعدد جزئیات ذکر کریں گے۔

پہلی مثال: بخاری اور مسلم سمیت دیگر ائمہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی بارش طلبی کی دعا ہمیشہ فوراً اور بہت مرتبہ درجہ تواتر میں قبول ہوئی ہے، حتیٰ کہ بعض دفعہ برسرِ منبر بارش کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نیچے کرنے سے پہلے پہلے بارش ہوگئی۔ جس طرح ہم نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا ہے کہ ایک دو بار جب لشکر پیاسا تھا تو آپ ﷺ کی دعا کی برکت سے بادل آئے اور بارش برسی حتیٰ کہ رسولِ اکرم ﷺ کی نبوت سے پہلے بچپن میں آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کے وسیلے سے بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلتے تھے۔ تو آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کی حُرمت کی طفیل بارش نازل ہو جاتی تھی۔ یہ واقعہ حضرت عبدالمطلب کے شعروں کی صورت میں مشہور تھا۔

پھر حضرت عمرؓ نبی ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عباسؓ کے وسیلے سے دعا کیا کرتے تھے اور کہتے تھے: ''اے اللہ! یہ تیرے محبوب کے چچا ہیں، اس لئے ان کے چہرے کی عزت وحرمت کی برکت سے ہمیں بارش عطا کر'' تو بارش نازل ہو جاتی۔

اسی طرح امام بخاری اور امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ سے دعائے استسقاء کے لیے درخواست کی گئی، تب آپ ﷺ نے دُعا فرمائی تو اتنی بارش ہوئی کہ لوگ الاَمان الاَمان پکارتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ: حضور بارش کے تھمنے کی دعا فرمائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور بارش تھم گئی۔

دوسری مثال: یہ بات تقریباً تواتر کی طرح مشہور ہے کہ صحابہ ومومنین کی تعداد جب چالیس سے کم تھی تو وہ چھپ چھپ کر عبادات کرتے تھے۔ تو رسول اکرم ﷺ نے دعا کی اور فرمایا: ''اَللّٰھُمَّ أَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ أَوْ بِعَمْرِوبْنِ ھِشَامٍ'' ۔ اور پھر ایک دو دن بعد ہی عمر بن خطاب ہدایت پا گئے اور اسلام کے اعلان واعزاز کا وسیلہ بن گئے اور یوں انہوں نے ایک بلند پایہ لقب پالیا۔ اور وہ ہے ''فاروق''۔

تیسری مثال: آپ ﷺ نے مختلف مقاصد کے پیشِ نظر بعض صحابہ کے لیے دُعا فرمائی تو آپ کی وہ دعا کچھ ایسی تابناک صورت میں قبول ہوگئی کہ وہ دعائی کرامت معجزے کے درجے کو پہنچ گئی۔

اُن میں سے ایک یہ کہ بخاری اور مسلم سمیت دیگر محدثین بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کے لیے ان الفاظ کے ساتھ دعا فرمائی: ''اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ'' ۔ تو آپ ﷺ کی دعا کچھ اس طرح سے قبول ہوئی کہ ابن عباسؓ ''ترجمان القرآن'' جیسے عظیمُ الشان لقب اور ''حِبرُ الاُمّة '' یعنی علّامۂ اُمت جیسے عالی شان مرتبے پر فائز ہوئے۔ حتیٰ کہ آپ بالکل چھوٹی عمر میں ہی تھے کہ حضرت عمرؓ آپؓ کو علماء اور بزرگ صحابہ کی مجلس میں بٹھاتے تھے۔

اسی طرح کتبِ صحاح والے کہ جن میں امام بخاری سر فہرست ہیں: بیان کرتے ہیں کہ: انسؓ کی والدہ نے رسولِ اکرم ﷺ کے پاس گریہ زاری کرتے ہوئے کہا کہ انس کی اولاد اور مال کے لیے برکت کی دعا فرمائیں! تو آپ ﷺ

نے فرمایا: "اَللّٰهُمَّ اَكْثِرْ مَالَهٗ وَوَلَدَهٗ وَبَارِكْ لَهٗ فِيْمَا اَعْطَيْتَهٗ" ۔ تو انسؓ اپنی آخری عمر میں قسم اُٹھا کر اعلان کرتے تھے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے سو بیٹے دفنائے ہیں ۔ اور مال وثروت کے لحاظ سے میرے جیسی پُر سعادت زندگی کسی نے بھی نہ گزاری ہوگی آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ میرا مال بہت زیادہ ہے اور یہ جان لو کہ یہ سب دعائے نبوی کی برکت سے ہے۔

اسی طرح اصحابُ الحدیث بیان کرتے ہیں، اور ان میں امام بیہقیؒ سرفہرست ہیں ۔ کہ رسول اکرم ﷺ نے عشرہ مبشرہ میں سے عبدالرحمان بن عوفؓ کے لیے برکت اور کثرتِ مال کے لیے دعا فرمائی ۔ چنانچہ انہوں نے اس دعا کی برکت سے اتنی دولت کمائی کہ ایک دفعہ انہوں نے سات سو اونٹ پالانوں سمیت فی سبیل اللہ صدقہ کیے ۔ دعائے نبوی کی اس برکت کو نگاہ میں رکھو اور کہو: "بَارَكَ اللّٰهُ"۔

اسی طرح راویانِ حدیث کہ جن میں امام بخاری سرفہرست ہیں، نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے عروہ بن ابو جعدہؓ کے لیے کاروبار میں برکت اور تجارت میں نفع کی دعا فرمائی ۔ چنانچہ عروہ فرماتے ہیں کہ میں بسا اوقات کوفہ کے بازار میں سودا کرتا تو ایک دن میں چالیس ہزار تک نفع حاصل کر لیتا تھا پھر گھر کو لوٹ آتا تھا ۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں: وہ اپنے ہاتھ میں مٹی بھی پکڑ لیتے تو اس میں بھی نفع پا لیتے۔

اسی طرح آپ ﷺ نے عبداللہ بن جعفرؓ کے لیے برکت اور کثرت مال کی دعا فرمائی، تو عبداللہ بن جعفرؓ دعائے نبوی کی برکت سے جس طرح مال دار ہونے کی وجہ سے مشہور ہوئے اسی طرح اُنہوں نے سخی ہونے کی وجہ سے بھی شہرت پائی۔

اس نوع کے معجزات کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں، لیکن ہم سرِ دست بطورِ مثال انہی چار مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

اسی طرح امام ترمذی بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے سعد بن ابی وقاص کے حق میں دعا فرمائی کہ ان کی دعا قبول ہو جایا کرے، چنانچہ فرمایا: "اَللّٰهُمَّ اَجِبْ دَعْوَتَهٗ" ۔ چنانچہ اس دور میں ہر آدمی ان کی بددعا سے ڈرتا تھا ۔ اور ان کی دعا بڑی مشہور تھی۔

اسی طرح آپ ﷺ نے ابوقتادہؓ سے فرمایا: "اَفْلَحَ اللّٰهُ وَجْهَكَ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهٗ فِيْ شَعْرِهٖ وَبَشَرِهٖ" ۔ یعنی آپ نے دعا فرمائی کہ وہ سدا جوان رہیں ۔ چنانچہ صحیح روایت کے مطابق یہ بات مشہور ہے کہ ابوقتادہؓ جب ستر سال کی عمر کو پہنچ کر فوت ہوئے تو بالکل پندرہ سالہ نوجوان لگتے تھے۔

اسی طرح مشہور شاعر نابغہ کا مشہور قصہ ہے کہ اُس نے رسول اکرم ﷺ کے پاس اپنا یہ شعر پڑھا:

بَلَغْنَا السَّمَاءَ مَجْدُنَا وَسَنَائُنَا

وَاِنَّا نُرِیْدُ فَوْقَ ذٰلِكَ مَظْهَرًا

یعنی ہمارا مجد و شرف آسمان تک جا پہنچا ہے، اور ہم اس سے بھی اُوپر پہنچنا چاہتے ہیں۔ تو رسول اکرم ﷺ نے اُسے ازراہ عنایت فرمایا: "اِلٰی اَیْنَ یَا اَبَالَیْلٰی ؟" ۔ تو اُس نے کہا: "اِلَی الْجَنَّةِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" ۔ یعنی رسول اکرم ﷺ نے ایک لطیف اور دلچسپ بات بنانے کے لیے فرمایا: آسمان سے آگے کون سی جگہ ہے جہاں پہنچنے کا ارادہ تو اپنے شعروں میں کر رہا ہے؟ تو نابغہ نے کہا: ہم آسمانوں کے اُوپر جنت کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ پھر اُس نے اپنے کچھ مزید پُر مغز شعر کہے: تو رسول اکرم ﷺ نے اُس کے لیے ان الفاظ کے ساتھ دعا فرمائی: "لَا یَفْضُضِ اللّٰهُ فَاكَ" ۔ تو دعائے نبوی ﷺ کی برکت سے ایک سو بیس سال کی عمر کو پہنچنے پر بھی نابغہ کا ایک بھی دانت نہ گرا۔ یہاں تک کہ اگر اُس کا کوئی دانت گر بھی جاتا تو اُس کی جگہ پر دوسرا دانت اُگ آتا۔

اسی طرح آپ ﷺ نے صحیح روایت کے مطابق۔

حضرت علیؓ کے لیے دعا کی اور فرمایا: "اَللّٰهُمَّ اكْفِهِ الْحَرَّ وَالْقَرَّ" ۔ یعنی اسے گرمی اور سردی کی مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس دعا کی برکت سے سردی میں گرمی کے اور گرمی میں سردی کے کپڑے پہنتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: اس دعا کی برکت سے مجھ پر سردی اور گرمی کی سختی کا قطعاً اثر نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کے لیے ان الفاظ کے ساتھ دعا فرمائی: "اَللّٰهُمَّ لَا تُجِعْهَا" ۔ یعنی اسے بھوک کے درد کا ذائقہ نہ چکھا۔ چنانچہ فاطمہؓ فرمایا کرتی تھیں: اس دعا کے بعد میں نے بھوک کی تکلیف کبھی نہ دیکھی۔

اسی طرح طفیل بن عمرو نے رسول اکرم ﷺ سے کوئی معجزہ طلب کیا تاکہ وہ اسے لے جا کر اپنی قوم کو دکھائے۔ تو رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ لَهُ" تو ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان سے ایک نور نکلا، پھر وہ نور اُس کی لاٹھی کے پیکان تک جا پہنچا۔ اس بنا پر وہ ذوالنور کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ واقعات جن احادیث میں بیان ہوئے ہیں وہ اگرچہ مشہور کے درجے کی ہیں لیکن قطعی مرتبہ حاصل کر چکی ہیں۔

اسی طرح ابو ہریرہؓ نے رسول اکرم ﷺ سے شکایت کی کہ وہ بھول چوک سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ تو رسول اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ کوئی چیز زمین پر بچھائیں۔ تو انہوں نے رومال جیسی کوئی چیز زمین پر بچھا دی۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی مبارک ہتھیلی کو کچھ اس طرح کا بنایا کہ گویا اس کے ذریعے غیب سے کوئی چیز مٹھی میں بند کر رہے ہوں اور اُس بھری ہوئی مٹھی کو اس رومال میں انڈیل رہے ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ کام دو تین مرتبہ کیا۔ تب آپ ﷺ نے ابو ہریرہؓ سے فرمایا: ''اب رومال کو لپیٹ لو'' ۔ چنانچہ آپؓ نے وہ رومال لپیٹ لیا۔ ابو ہریرہؓ حلف اٹھا کر کہتے ہیں: دعائے نبوی میں پائے جانے والے اس راز کی وجہ سے میں اس کے بعد کبھی کوئی چیز نہ بھولا۔ یہ تمام واقعات مشہور احادیث کے

ذریعے روایت کیے گئے ہیں۔

چوتھی مثال: ہم یہاں متعدد ایسے واقعات بیان کریں گے جو کہ رسول اکرم ﷺ کی سزا کے لیے دی گئی بد دعا کا مظہر بن گئے ہیں۔

پہلی مثال: شاہِ فارس پرویز نے نبی ﷺ کے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا۔ رسول اکرم ﷺ تک اس بات کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ بدُعا کی: "اَللّٰھُمَّ مَزِّقْہُ کَمَا مَزَّقَ کِتَابِیْ"۔ یعنی اللہ اس کو اور اس کی بادشاہت کو اسی طرح پارہ پارہ کر دے جیسے اُس نے میرے خط کو چاک کیا ہے۔ تو اس بد دعا کی تأثیر اس طرح ظاہر ہوئی کہ کسریٰ پرویز کے بیٹے شیرویہ نے اُسے خنجر سے چاک کر دیا اور سعد بن ابی وقاصؓ نے اس کی سلطنت کو چاک کر دیا۔ اور یوں ساسانی حکومت کی شان و شوکت ہر جگہ سے نیست و نابود ہوگئی۔ لیکن قیصر اور دیگر بادشاہوں نے نبی ﷺ کے خط کا احترام کیا اس لیے وہ ہلاک نہ ہوئے۔

دوسری مثال: جو کہ مشہور لیکن تواتر کے قریب قریب ہے اور اس کی طرف قرآنی آیات نے اشارہ کیا ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ رسول اکرم ﷺ آغازِ اسلام میں مسجد الحرام میں نماز پڑھ رہے تھے کہ وہاں رؤسائے قریش ا ہو ہو کر آپ ﷺ کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگے۔ تب آپ ﷺ نے ان کے لیے بد دعا کی۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ جن لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ بدسلوکی کی اور آپ ﷺ نے انہیں سزا دینے کے لیے بدُعا کی، میں نے ایک ایک کر کے اُن کی لاشیں غزوہ بدر میں خود دیکھیں۔

تیسری مثال: عربوں کے بہت بڑے قبیلے مُضَر نے آپ ﷺ کی تکذیب کی تو آپ ﷺ نے ان کے لیے قحط کی بد دعا کی، چنانچہ بارش نہ ہوئی اور قحط و گرانی ظہور میں آگئی۔ پھر قریش نے جو کہ مُضر کی ہی ایک شاخ ہیں۔ رسول اکرم ﷺ سے دعا کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے ان کے لیے بارش کی دعا فرمائی۔ چنانچہ بارش نازل ہوئی اور قحط ختم ہوگیا۔ یہ واقعہ تواتر کے درجے میں مشہور ہے۔

پانچویں مثال: آپ ﷺ کی بد دعا کا خاص اور متعیّن لوگوں کے بارے میں دہشت خیز طریقے سے قبول ہو جانا ہے۔ اس نوع کے معجزات کی بہت سی مثالیں ہیں۔ لیکن ہم اُن میں سے بطور مثال تین قطعی مثالیں ذکر کرتے ہیں:

پہلی مثال: آپ ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کے لیے ان الفاظ کے ساتھ بددعا فرمائی: "اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیْہِ کَلْبًا مِنْ کِلَابِكَ"۔ "یعنی یارب اس کے اوپر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر" پھر ایک دفعہ عتبہ سفر کو نکلا تو اچانک ایک شیر نے اُسے قافلے کے اندر سے ڈھونڈ کر چیر پھاڑ ڈالا۔ یہ واقعہ مشہور ہے اور ائمۂ حدیث نے روایت کیا اور صحیح کہا ہے۔

دوسری مثال: مُحلّم بن جثامہ ہے، اس آدمی نے عامر بن اَضبط کو دھوکے سے قتل کر دیا، حالانکہ عامر بن اَضبط کو رسول

اکرم ﷺ نے قائد بنا کر غزوہ و جہاد کے لیے بھیجا تھا، محلّم بھی ان کے ہمراہ تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کو جب اس غداری کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے غضب ناک ہو کر ان الفاظ کے ساتھ اس کے لیے بددعا فرمائی: "اَللّٰھُمَّ لَا تَغْفِرْ لِمُحَلِّمٍ" ۔ چنانچہ محلّم سات دن کے بعد مر گیا۔ لوگوں نے اسے قبر میں ڈالا تو قبر نے اُسے باہر اچھال دیا۔ اُنھوں نے کافی مرتبہ اُسے قبر میں رکھا لیکن زمین نے اسے قبول نہ کیا پھر انہوں نے مجبوراً دو چٹانوں کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا کر اسے اس طریقے سے زمین میں چھپا دیا۔

تیسری مثال: رسولِ اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا۔ تو آپ ﷺ نے اُسے فرمایا: "کُلْ بِیَمِیْنِکَ" ۔ تو اس نے کہا: "لَا اَسْتَطِیْعُ"، یعنی دائیں سے نہیں کھا سکتا؛ تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "لَا اسْتَطَعْتَ"، یعنی نہیں کر سکو گے، چنانچہ اس کے بعد وہ آدمی اپنا دایاں ہاتھ کبھی بھی نہ اُٹھا سکا۔

چھٹی مثال: ہم رسولِ اکرم ﷺ کی دعا اور آپ ﷺ کے چھونے سے ظہور میں آنے والے بہت سے خارقِ عادت واقعات کا ذکر کریں گے جو کہ قطعیت کے مرتبے میں ہیں۔

پہلا واقعہ: آپ ﷺ نے حضرت خالد سیف اللہ کو اپنے چند بال عطا کیے اور ان کی فتح ونصرت کے لیے دعا فرمائی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے وہ بال اپنی ٹوپی میں محفوظ کر لیے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ جس جنگ میں بھی گئے ان بالوں کی برکت اور دعا کے طفیل سے فتحیاب ہو کر لوٹے۔

دُوسرا واقعہ: سلمان فارسی پہلے یہودیوں کے ہاں غلام تھے۔ اُن کے مالکوں نے انہیں آزاد کرنے کے بدلے میں بہت سی چیزوں کا مطالبہ کیا اور کہا: تین سو پودے لگاؤ، جب وہ بڑے ہو کر پھل دینے لگیں تب تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ یاد رہے کہ اس کے ساتھ ساتھ چالیس اوقیہ سونا بھی ادا کرنا ہوگا۔ تو انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے پاس آ کر تمام ماجرا کہہ دیا۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کے مضافات میں تین سو پودے اپنے دستِ مبارک کے ساتھ لگائے جن میں سے صرف ایک پودا کسی اور نے لگایا۔ تو تمام پودے پھل دار ہوئے سوائے اُس کے جو کسی اور نے لگایا تھا، اُسے ایک بھی پھل نہ لگا۔ چنانچہ رسولِ اکرم ﷺ نے اُس درخت کو اکھاڑ کر اس کی جگہ پر ایک نیا پودا لگا دیا۔

اسی طرح آپ ﷺ نے سلمان فارسیؓ کو مرغی کے انڈے کے برابر سونا عطا فرمایا اور اس پر اپنا لعاب مبارک لگایا، دعا کی اور فرمایا: "جاؤ، اور یہ سونا یہودیوں کو دے دو"۔ چنانچہ انہوں نے جا کر اس سے چالیس اوقیہ یہودیوں کو دے دیا، اور سونا جتنا تھا اتنا ہی رہا۔

پس یہ واقعہ سلمان فارسیؓ کی سوانح عمری کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اور اسے مقبول ثقہ ائمۂ کرام نے روایت کیا ہے۔

تیسرا واقعہ: اُمِ مالک نامی ایک صحابیہ نبیٔ اکرم ﷺ کو ایک کُپّی میں گھی کا تحفہ بھیجا کرتی تھی۔ آپ ﷺ نے ایک

دفعہ اُسے بلایا اور اُسے کپی دیتے ہوئے فرمایا: ''اسے نچوڑ کر خالی نہ کر دینا''۔ تو اُمِ مالکؓ نے وہ کپی لے کر سنبھال لی۔ اس کے بعد اس کے بچے جب بھی گھی مانگتے انہیں اُس کپی سے مل جاتا۔ یہ معاملہ کافی دیر تک ایسے ہی چلتا رہا۔ پھر ایک دن انہوں نے اُسے نچوڑ دیا تو برکت ختم ہوگئی۔

ساتویں مثال: رسول اکرم ﷺ کے دعا کرنے اور چھونے کے ساتھ پانی کے میٹھے، مہک دار اور خوشگوار ہو جانے کے بارے میں بہت سے واقعات پائے جاتے ہیں۔ بطورِ مثال ہم اُن میں سے دو تین واقعات بیان کرتے ہیں:

پہلی: اصحابُ الحدیث کہ جن میں امام بیہقی سرفہرست ہیں، بیان کرتے ہیں کہ ''قباء'' نامی ایک کنویں کا پانی کبھی کبھی سوکھ جایا کرتا تھا۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے اُس میں اپنے وضو کا بچا ہوا پانی پھینکا اور دعا فرمائی۔ چنانچہ اس کے بعد اُس کا پانی کبھی خشک نہ ہوا۔

دوسری: اصحابُ الحدیث کہ جن میں ابُونُعَیم سرفہرست ہیں، ''دلائلُ النبوۃ'' میں خبر دے رہے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت انسؓ کے گھر والے کنویں میں اپنا لعاب مبارک ڈالا تو وہ مدینہ منورہ کا سب سے زیادہ میٹھے پانی والا کنواں بن گیا۔

تیسری: ابن ماجہ میں ہے کہ صحابہ کرامؓ رسول اکرم ﷺ کے پاس آبِ زمزم کا ایک ڈول بھر کر لائے تو آپ ﷺ نے اُس سے تھوڑے سے پانی کا گھونٹ بھر کر اُسے دوبارہ ڈول میں ڈال دیا۔ تو وہ ڈول کستوری کی طرح مہک اُٹھا۔

چوتھی: امام احمد بن حنبلؒ نے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کسی کنویں سے ایک ڈول پانی کا بھر کر رسولِ اکرم ﷺ کے پاس لائے، تو آپ ﷺ نے اپنے دہنِ مبارک کا پانی کلی کر کے ڈول میں ڈال دیا اور ان لوگوں نے وہ پانی کنویں میں ڈال دیا۔ تب کنواں کستوری کی طرح مہک اٹھا۔

پانچویں: حماد بن سلمہ جو کہ مردانِ خدا میں سے ہیں، اور امام مسلم اور علمائے مغرب کی نظر میں مقبول و با اعتماد ہیں، روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے پانی کی ایک مشک بھری اور اس کے منہ میں پھونک مار کر دعا فرمائی۔ اور اس کا منہ باندھ کر اُسے اپنے کسی صحابی کے سپرد کر دیا اور فرمایا: اس کا منہ نہ کھولنا اِسے اس وقت کھولنا جب وضوء کرنا ہوگا۔ صحابہ کرامؓ سفر پر روانہ ہوئے، اور جب انہوں نے وضوء کا ارادہ کیا تو اُس کا منہ کھول دیا۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ مشک میں پانی کی جگہ خالص دودھ ہے اور اُس کے منہ میں مکھن اور گھی ہے۔

پس ان پانچ جزوی مثالوں میں سے بعض تو مشہور حدیث کے درجے کی ہیں اور بعض کو مشہور سر کردہ ائمہٴ کرامؒ نے روایت کیا ہے۔

یہ پانچ مثالیں ان مثالوں کے ساتھ مل کر جن کا یہاں ذکر نہیں ہوا مجموعی طور پر ایک مطلق معجزے کے معنوی تواتر کی

طرح ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔

آٹھویں مثال: بانجھ اور دودھ سے محروم بکریاں رسولِ اکرم ﷺ کی دعا سے اور آپ ﷺ کے چھونے سے دودھ والی ہوگئیں اور اُن کے تھن دودھ سے لبالب بھر گئے۔ اس نوع کے معجزات کی بہت سی قسمیں اور بکھری جزئیات ہیں۔ ہم بطورِ مثال چند ایسی مثالیں ذکر کرتے ہیں جو مشہور اور قطعی ہیں۔

پہلی: سیرت نگاروں کی تمام معتبر کتابیں بیان کرتی ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لے کر ہجرت کی تو راستے میں اُمِ معبد کے گھر اُترے جنہیں عاتکہ بنتِ خالد خزاعی کہا جاتا ہے۔ اُن کے ہاں ایک کمزور سی بانجھ بکری تھی جس کا دودھ سوکھ چکا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اُم معبد سے پوچھا: ''یہ دودھ نہیں دیتی'' تو اُم معبد نے کہا: اس کے جسم میں تو خون بھی نہیں ہے دودھ ہمیں کہاں سے دے گی؟ تب رسولِ اکرم ﷺ نے جا کر اس بکری کے جسم اور تھنوں پر اپنا دستِ مبارک پھیرا اور دعا کی۔ پھر فرمایا: برتن لا کر اس کا دودھ نکالو۔ پس اُنہوں نے دودھ دوہا اور رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مل کر پیا۔ پھر تمام گھر والوں نے سیر ہو کر پیا۔ پس وہ کمزور سی بکری طاقتور ہوگئی اور اسی بابرکت حالت میں بہت دیر تک زندہ رہی۔

دوسری: حضرت ابن مسعودؓ کی بکری کا مشہور قصہ ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ ابن مسعودؓ اسلام لانے سے پہلے کسی کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ ایک دن رسولِ اکرم ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اس جگہ پر گئے جہاں حضرت ابن مسعودؓ کی بکریاں تھیں۔ وہاں جا کر رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت ابن مسعودؓ سے دودھ طلب کیا۔ تو ابن مسعودؓ نے کہا: یہ بکریاں میرا مال نہیں بلکہ کسی اور کا مال ہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس کوئی ایسی بکری لاؤ جس کا دودھ خشک ہو چکا ہو، تو وہ ایک ایسی بکری لے آئے جو دو سال سے بانجھ ہو چکی تھی۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس کے تھنوں پر پھیرا اور دعا فرمائی۔ پھر انہوں نے اُس کا دودھ دوہا، ابن مسعودؓ نے یہ معجزہ دیکھا تو ایمان لے آئے۔

تیسری: رسولِ اکرم ﷺ کی دایہ حلیمہ سعدیہ کا مشہور قصہ ہے اور وہ یوں ہے کہ اس قبیلے میں کچھ قحط سا پڑ گیا تھا اور مویشی کمزور اور دودھ سے خالی تھے اور ان کے پیٹ بھرنے کے لیے چارہ بھی نہیں تھا۔ جب رسولِ اکرم ﷺ وہاں اپنی دایہ کے ہاں چلے گئے تو حلیمہ سعدیہ کی بکری شام کے وقت دوسری بکریوں کے برعکس شکم سیر ہو کر بھرے تھنوں کے ساتھ لوٹتی تھی۔

اس نوع کے معجزات کی سیرت کی کتابوں میں ان مثالوں کی مزید جزئیات بھی ملتی ہیں، تاہم اصل مقصد تک پہنچنے کے لیے یہی مثالیں کافی ہیں۔

نویں مثال: وہ معجزات جن کا ظہور رسولِ اکرم ﷺ کے اپنا دستِ مبارک بعض لوگوں کے سر پر اور چہرے پر

پھیرنے اور دعا کرنے کے بعد ہوا اُن کی بہت سی مشہور جزئیات میں سے بطورِ مثال چند مثالیں بیان کریں گے:

پہلی: آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ عمر بن سعدؓ کے سر پر پھیرا اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ چنانچہ جب وہ اسّی سال کی عمر پا کر فوت ہوئے تو اس دعا کی برکت سے اُن کے سر پر کوئی سفید بال نہیں تھا۔

دوسری: آپ ﷺ نے قیس بن زیدؓ کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور اُن کے لیے دعا کی۔ چنانچہ وہ جب اس دعا کی برکت سے سو سال کے ہو گئے تو ان کے سر کے تمام بال سفید ہو گئے تھے سوائے اُس جگہ کے جہاں آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ رکھا تھا، وہ جگہ آپ ﷺ کے ہاتھ پھیرنے کی تاثیر سے کالی سیاہ رہی۔

تیسری: عبدالرحمان بن زید بن خطابؓ چھوٹے قد کے اور بدشکل تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور اُن کے لیے دعا کی تو وہ اس دعا کی برکت سے طویل قامت اور خوبصورت ہو گئے۔

چوتھی: غزوۂ حنین میں عائذ بن عمروؓ کا چہرہ زخمی ہو گیا تو رسول اکرم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے ان کے چہرے کا لہو پونچھ دیا۔ لیکن جس جگہ پر آپ ﷺ کا ہاتھ لگا وہ جگہ اس قدر روشن ہو گئی کہ محدثین نے اُسے "کَـغُـرَّةِ الْـفَرَسِ" کے جملے سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس جگہ پر رسول اکرم ﷺ کا ہاتھ لگا وہ ایسے چمکتی تھی جیسے گھوڑے کی پیشانی کے سفید بال چمکتے ہیں۔

پانچویں: آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک قتادہ بن سلمانؓ کے چہرے پر پھیرا تو ان کا چہرہ آئینے کی طرح چمکنے لگا۔

چھٹی: اُم المومنین اُمِ سلمہؓ کی بیٹی اور رسول اکرم ﷺ کی سوتیلی بیٹی چھوٹی عمر کی تھیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے لاڈ پیار کرتے ہوئے اُن کے چہرے پر وضو کا پانی چھڑک دیا۔ تو زینبؓ کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا حسن و جمال اُبھر آیا اور اس پانی کے چُھو جانے سے وہ انوکھے حسن و جمال کی مالک بن گئیں۔

اور یوں ان جزئیات جیسی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں جن میں سے اکثر ائمۂ حدیث نے نقل کی ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ علیحدہ علیحدہ طور پر ان میں سے ہر جزئی ضعیف اور خبرِ واحد ہے، تو پھر بھی وہ مجموعی طور پر رسولِ گرامی ﷺ کے ایک ایسے مطلق معجزے پر دلالت کرتی ہیں جو تواترِ معنوی کا حکم رکھتی ہے؛ کیونکہ اگر کوئی واقعہ بہت سی مختلف صورتوں سے نقل کیا جائے تو اصل واقعہ قطعی طور پر ظہور میں آیا ہوتا ہے اس لیے ان میں سے ہر صورت اگر علیحدہ علیحدہ طور پر ضعیف بھی ہو تو وہ اصلِ واقعہ کا اثبات کر ہی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر: ایک دھڑام کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اب ایک نے کہا کہ فلاں گھر منہدم ہو گیا ہے۔ دوسرا بولا: فلاں گھر زمین بوس ہو گیا ہے۔ اسی طرح تیسرے نے کسی اور گھر کے بارے میں کہا اور چوتھے نے کسی اور کے بارے میں ۔۔۔ تو اب یہ تو ممکن ہے کہ ان میں سے ہر روایت خبرِ واحد، خلافِ واقعہ اور ضعیف ہو، لیکن اصل واقعہ بہرکیف قطعی طور پر ثابت ہے، اور وہ یہ کہ کوئی گھر منہدم ہوا ہے۔ اور اس

بات پر سب متفق ہیں۔ جبکہ یہ چھ جزوی واقعات جن کے بارے میں ہم نے بحث کی ہے، صحیح ہیں۔ اور ان میں سے بعض شہرت کے درجے میں ہیں۔ اگر بالفرض ہم ان میں سے ہر جزئی کو ضعیف شمار کر لیں تو وہ بھی جزئیات کے ان مجموعے میں رہتے ہوئے مذکورہ تمثیل میں گھر کے منہدم ہونے والے واقعے کی طرح آپ ﷺ کے مطلق معجزے کے وجود پر دلالت کرے گی۔

تو رسولِ اکرم ﷺ کے تابندہ معجزات ہر نوع میں قطعی طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان کی جزئیات ان مطلق کلی معجزات کی صورتیں یا مثالیں ہیں۔ چنانچہ جس طرح رسولِ گرامی ﷺ کا دستِ مبارک، آپ ﷺ کی انگلیاں آپ ﷺ کا لعاب، آپ ﷺ کی پھونک اور آپ ﷺ کا قول یعنی آپ ﷺ کی دعا بہت سے معجزات کا سر چشمہ ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح رسول اکرم ﷺ کے تمام لطائف، آپ ﷺ کے حواس اور اعضاء و جوارح بہت سے خارقِ عادت واقعات کا دارومدار ہیں، ان خارقِ عادت واقعات کا ذکر سِیَر و تاریخ کی کتابوں نے بڑی وضاحت سے کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت، صورت اور حواس و مشاعر میں نبوت کے بہت سے دلائل ہیں۔

پندرھواں بلاغی اشارہ: جیسے پتھر، درخت، سورج اور چاند آپ ﷺ کو پہچانتے ہیں اور اپنے معجزات کا اظہار کر کے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرتے ہیں، اسی طرح حیوانات، مردگان اور جن و ملائکہ کے گروہ اس بابرکت نبیٔ کریم ﷺ کو پہچانتے ہیں اور اپنے بعض معجزات کا اظہار کر کے آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرتے ہیں، اور اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کو پہچانتے ہیں اور اس بات کا اعلان وہ آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کر کے کرتے ہیں۔

یہ پندرھواں اشارہ تین شعبوں پر مشتمل ہے:

پہلا شعبہ: حیوانات کی جنس رسول اکرم ﷺ کو پہچانتی ہے اور آپ ﷺ کے معجزات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس شعبے میں بہت سی مثالیں ہیں، اس مقام پر ہم بطورِ مثال بعض ایسے واقعات ذکر کریں گے جو مشہور اور متواترِ معنوی کے درجے میں قطعیت کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ یا انہیں محقق ائمۂ کرامؒ نے قبول کیا ہے۔ یا اُمت نے انہیں قبولیت کے درجے میں لیا ہے۔

پہلا واقعہ: مشہور طریق سے لیکن تواترِ معنوی کے درجے میں مروی ہے کہ جب رسولِ اکرم ﷺ ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ کافروں کے تعاقب سے بچنے کے لیے غارِ حراء میں پناہ گزیں ہوئے تو دو کبوتریاں آ کر چوکیداروں کی طرح غار کے دروازے پر بیٹھ گئیں۔ اور مکڑی نے ایک دربان کی طرح معجزانہ طریقے سے موٹا سا جالا بنا دیا۔ حتیٰ کہ اُبی بن خلف جو کہ رؤسائے قریش میں سے ایک تھا اور جو غزوۂ بدر میں رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھوں قتل ہوا، اس نے کہا غار کی طرف دیکھو تو

اُس کے ساتھیوں نے کہا: غار کے اندر جا کر دیکھیں؟ تو اُس نے کہا: غار میں کیسے داخل ہوں؟ اس پر بنا ہوا مکڑی کا جالا تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے کہ محمد کی ولادت سے بھی پہلے کا ہو؟ اور یہ دو کبوتریاں وہاں آرام سے بیٹھی ہوئی ہیں، اگر اس کے اندر کوئی انسان موجود ہو تو یہ وہاں بیٹھ سکتی ہیں؟

ابن وہب نے روایت کیا ہے کہ فتح مکہ والے دن مکّہ مکرمہ کے کبوتروں نے رسول اکرم ﷺ کے سر پر سایہ کر دیا تھا۔

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ صحیح روایت کے مطابق بیان کرتی ہیں کہ: ہمارے گھر میں کبوتری جیسا ایک پالتو پرندہ تھا۔ رسول اکرم ﷺ جب گھر میں ہوتے تو وہ چپ سادھے آرام سے اِدھر اُدھر نہ آتا جاتا اور بالکل آرام سے بیٹھتا۔ اور جب باہر چلے جاتے تو متحرک ہو جاتا، ادھر اُدھر چلتا پھرتا اور آرام سے بالکل نہ بیٹھتا گویا کہ وہ پرندہ رسول اکرم ﷺ کی باتیں سنتا تھا اور آپ ﷺ کی موجودگی میں خاموش ہو کر سکون سے بیٹھا رہتا تھا۔

دوسرا واقعہ: بھیڑیے کا واقعہ جو کہ پانچ چھ طرق سے معنوی تواتر کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ عجیب وغریب قصہ بہت سے طرق کے ساتھ مشہور صحابہ سے مروی ہے، ان میں ابوسعید خدریؓ، سلمہ بن اکوعؓ، ابن ابی وہبؓ، ابو ہریرہؓ اور اس قصے کے راوی اُہبان راعی ہیں،۔ یہ تمام لوگ متعدد طرق سے روایت کرتے ہیں۔

بکریوں کے ریوڑ سے بھیڑیا ایک بکری اُٹھا کر لے گیا، چرواہے نے بھاگ کر وہ بکری اس سے چُھڑوا لی، تو بھیڑیے نے کہا: تُجھے خدا کا خوف نہیں کہ میرا رزق میرے ہاتھ سے چھین رہا ہے؟ چرواہا بولا: حیرانی کی بات ہے، کیا بھیڑیا بولتا ہے؟ تو بھیڑیے نے کہا: حیرت تو تیری حالت پر ہے؛ کیونکہ یہاں سے قریب ہی ایک آدمی تمہیں جنّت کی طرف بلا رہا ہے، اور وہ نبی ہے لیکن تم لوگ اُسے جانتے تک نہیں۔

بھیڑیے کے کلام کرنے پر اگرچہ تمام طرق متفق ہیں لیکن ان سب سے زیادہ قوی وہ طریق ہے جس سے ابو ہریرہؓ کی روایت آئی ہے، چنانچہ ابو ہریرہؓ اپنی روایت میں فرماتے ہیں: چرواہے نے بھیڑیے سے کہا: میں اُس آدمی کے پاس جاتا ہوں، لیکن میری بکریوں کی نگرانی کون کرے گا؟ تو بھیڑیے نے کہا: ان کی نگرانی میں کروں گا۔ چنانچہ چرواہے نے اپنے ریوڑ کی نگرانی بھیڑیے کے سپرد کی اور خود مکہ مکرمہ کی طرف چلا آیا اور وہاں رسولِ اکرم ﷺ کو دیکھتے ہی اُن پر ایمان لے آیا۔ پھر وہ واپس آیا تو دیکھا کہ بھیڑیا بکریوں کی نگرانی کر رہا ہے اور کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ تب اُس نے اس بھیڑیے کے لیے ایک بکری ذبح کی؛ کیونکہ اس نے اس کی رہنمائی کی تھی۔

ایک دیگر طریق میں اس طرح ہے کہ صفوان اور ابوسفیان نے جو کہ رؤسائے قریش میں سے تھے، ایک بھیڑیے کو ہرنی کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ ہرنی بھاگتی ہوئی حرم شریف میں داخل ہوگئی تو بھیڑیے نے کلام کیا اور رسالتِ محمدی ﷺ

کے متعلق بتایا۔ تو ابوسفیان نے صفوان سے کہا: ہمیں یہ واقعہ کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہیے؛ کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ مکہ خالی ہو جائے گا اور تمام لوگ اس کے ساتھ جا ملیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ بھیڑیے والا واقعہ قطعی اور معنوی متواتر حدیث والا اطمینان عطا کرتا ہے۔

تیسرا واقعہ: اُونٹ کا ہے جو کہ نامی گرامی صحابہؓ سے پانچ چھ طرق سے مروی ہے۔

ابو ہریرہؓ، ثعلبہ بن مالکؓ، جابر بن عبداللہؓ، عبداللہ بن جعفرؓ، عبداللہ بن ابی اوفیؓ جیسے متعدد طرق اور ان طرق کے آغاز میں پائے جانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متفقہ طور پر بیان کرتے ہیں کہ ایک اونٹ نے آ کر رسولِ اکرم ﷺ کو تعظیمی سجدہ کیا اور آپ ﷺ کے ساتھ بات کی۔

اور یہ چیز متعدد طرق سے مروی ہے کہ وہ اونٹ کسی باغ میں تھا کہ اچانک بپھر گیا، کسی کو قریب نہیں آنے دیتا تھا اور باغ میں داخل ہونے والے پر حملہ کر دیتا تھا لیکن جب رسولِ اکرم ﷺ داخل ہوئے تو اُس نے آپ ﷺ کو تعظیمی سجدہ کیا اور آپ ﷺ کے پاس بیٹھ گیا، آپ ﷺ نے اسے نکیل سے پکڑ لیا تو اُس نے رسول اکرم ﷺ سے کہا: ان لوگوں نے مجھے انتہائی مشقت والے کاموں میں استعمال کیا ہے اور اب مجھے ذبح کرنے کی نیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں ان پر غضبناک ہو گیا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے اونٹ کے مالک سے پوچھا: کیا ایسے ہی ہے؟ تو اس نے کہا: جی ہاں!

اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی عضباء نامی اونٹنی نے وفاتِ نبوی کے بعد کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تا آنکہ وہ چل بسی۔

اسی طرح ابو اسحاق اسفرائینی جیسے بعض ائمۂ کرام نے روایت کیا ہے کہ اس اونٹنی نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ کسی اہم معاملے میں کلام بھی کیا تھا۔

اسی طرح صحیح روایت کے ذریعے مروی ہے کہ جابر بن عبداللہؓ کی اونٹنی ایک سفر میں بری طرح تھک گئی اور چل نہیں سکتی تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے اُسے معمولی سی چھڑی لگائی تو اُس نے اس التفاتِ محمدی ﷺ سے اس قدر نشاط و سرور حاصل کر لیا کہ تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی لگام کو بھی قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا تھا اور کوئی اونٹ اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جابرؓ نے اسی طرح بتایا ہے۔

چوتھا واقعہ: ائمۂ حدیث کہ جن میں امام بخاریؒ سرفہرست ہیں، بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کے وقت اس طرح کی خبر اُڑا دی گئی کہ گویا باہر سے کوئی دشمن مدینہ منورہ پر حملہ کرنے والا ہے، چنانچہ تمام بہادر شہ سوار شہر سے باہر کی طرف چل دیے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ آگے سے کوئی آدمی آ رہا ہے، انہوں نے غور سے دیکھا تو وہ رسول اکرم ﷺ تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ واپس چلے جاؤ کوئی چیز نہیں ہے۔

آپ ﷺ ابوطلحہؓ کے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی مقدس بہادری کے پیشِ نظر سب سے پہلے باہر نکل آئے تھے اور

معاملے کی تحقیق کر کے واپس جا رہے تھے۔ اس موقع پر آپ نے ابو طلحہؓ سے فرمایا: ''وَجَدْتُ فَرَسَكَ بَحْرًا''۔ یعنی آپؓ کا گھوڑا بہت تیز رفتار ہے لڑکھڑاتا نہیں، صورت حال یہ ہے کہ اُن کا گھوڑا ان سست رفتار گھوڑوں میں سے تھا جنہیں ''قطوف'' کہا جاتا ہے لیکن اس رات کے بعد کوئی گھوڑا تیز رفتاری میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

اسی طرح صحیح روایت کے ساتھ نقل ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک سفر میں نماز کے وقت اپنے گھوڑے سے کہا: رُک جا تو وہ اس طرح رک گیا کہ نماز کے ختم ہونے تک اس نے اپنے کسی بھی حصے کو ہلایا تک نہیں تھا۔

پانچواں واقعہ: خادمِ رسول ﷺ حضرت سفینہؓ نے رسول اکرم ﷺ سے حضرت معاذ بن جبلؓ کی طرف جانے کا پروانہ حاصل کیا جو کہ اس وقت یمن میں تھے چنانچہ وہ روانہ ہوئے تو راستے میں ایک شیر سے ملاقات ہوگئی۔ سفینہؓ نے اس شیر سے کہا: میں رسول اکرم ﷺ کا خادم ہوں۔ پس اتنا سننا تھا کہ شیر نے زور سے دھاڑ ماری اور آپؓ کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر ایک طرف کو چلا گیا۔ ایک دیگر روایت میں اس طرح ہے کہ سفینہؓ واپس آتے وقت راستہ بھول گئے۔ پھر اچانک ایک شیر سے سامنا ہو گیا تو، شیر نے صرف یہی نہیں کہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچایا بلکہ انہیں راستہ بھی دکھا دیا۔

اسی طرح راوی سیدنا عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس ایک اعرابی آیا جس نے ہاتھ میں ایک رینگنے والا جانور پکڑا ہوا تھا جسے گوہ کہا جاتا ہے۔ اُس اعرابی نے کہا: اگر یہ جانور آپ کے حق میں گواہی دے دے تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا وگرنہ نہیں۔ تو رسول اکرم ﷺ نے اس جانور سے پوچھا تو اُس نے فصیح زبان کے ساتھ آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دی۔

ان مثالوں جیسی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جو قطعی طور پر مشہور کے درجے میں ہیں اور ہم متعدد مثالیں بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم ان لوگوں سے جو رسولِ اکرم ﷺ کو پہچانتے نہیں اور آپ ﷺ کی اطاعت نہیں کرتے، کہتے ہیں۔

اے لوگو! عبرت حاصل کرو کہ بھیڑیا اور شیر رسولِ اکرم ﷺ کو پہچانتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں اس لیے یہ لازم ہے، کہ جانور اور بھیڑیے سے بھی نیچے گرنے سے بچنے کے لیے بھرپور کوشش کرو۔

دوسرا شعبہ: یہ ہے کہ جنازوں، جنوں اور فرشتوں کا رسول اکرم ﷺ کو پہچاننا۔ اس شعبے سے متعلق بھی بہت سے واقعات ہیں۔ پہلے ہم بطورِ مثال جنازوں کے ساتھ تعلق رکھنے والی ثقہ اور قابل اعتماد ائمہ کرام کی روایت کردہ چند مشہور مثالیں بیان کرتے ہیں۔ رہے جن اور فرشتے، تو ان کی مثالیں متواتر ہیں اور ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں ہیں۔

مُردوں کے کلام کرنے کی پہلی مثال:

حضرت حسن بصریؒ جو کہ عصرِ تابعین میں علمائے ظاہر و باطن کے سرخیل اور حضرت علیؓ کے اہم سچے شاگرد ہیں، بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ کے پاس ایک آدمی روتا اور ہانپتا کانپتا ہوا آیا اور کہنے لگا: میری ایک چھوٹی سی بچی تھی جو

اس قریبی وادی میں مرگئی ہے، اور میں اُسے وہیں پھینک آیا ہوں۔ تو رسول اکرم ﷺ نے اُس پر ترس کھایا اور اسے فرمایا: چلو وہاں چلتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر رسولِ اکرم ﷺ نے اس مردہ بچی کا نام لے کر آواز دی تو بچی بولی: ''لَبَّیْكَ وَسَعْدَیْكَ''۔ تو رسول اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تو دوبارہ اپنے والدین کے پاس آنا چاہتی ہے؟ تو اس نے کہا: نہیں؛ کیونکہ مجھے یہاں کچھ ایسا مل گیا ہے جو اُن سے بہتر ہے۔

دوسری مثال: امام بیہقیؒ اور ابن عدیؒ جیسے بعض ائمہ کرامؒ انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ایک بوڑھی عورت کا ایک ہی بیٹا تھا جو اچانک ہی موت کے منہ میں چلا گیا۔ تو وہ نیک عورت اس سے بہت دکھی ہوئی اور کہنے لگی: پروردگار! میں یہاں تیری رضا مندی کے لیے اور رسولِ اکرم ﷺ کی بیعت اور اُن کی خدمت کی خاطر ہجرت کر کے آئی تھی۔ پس اس رسول ﷺ کی حُرمت کی طفیل میرا یہ اکلوتا بیٹا مجھے عطا کر دے جو میری اعانت کرے اور میری زندگی میں میری راحت کا سبب بنے۔ انس بن مالکؓ فرماتے ہیں: وہ مردہ آدمی اُٹھ کھڑا ہوا اور ہمارے ساتھ کھانا کھانے لگا۔

امام بوصیری کے ''قصیدۂ بردہ'' کا یہ شعر:

لَوْ نَاسَبَتْ قَدْرَهُ آيَاتُهُ عِظَماً
أَحْيَا اسْمُهُ حِيْنَ يُدْعىٰ دَارِسَ الرِّمَمِ

جو اس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ: اگر آپ ﷺ کی علامات آپ ﷺ کی قدر و قیمت کے مطابق آپ ﷺ کے فضل و کرم اور آپ ﷺ کی بزرگی پر دلالت کرتیں تو آپ ﷺ کے نام کی برکت سے تازہ مردے ہی نہیں بوسیدہ ہڈیاں بھی زندہ ہو جاتیں۔

تیسری مثال: امام بیہقیؒ جیسے ائمہ کرام عبداللہ بن عبیداللہ انصاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: جب ثابت بن قیس بن شماس شہید ہوئے اور ہم نے انہیں قبر میں رکھا۔ اور میں بھی وہاں موجود تھا۔ تو قبر میں اُتارتے وقت ان کے منہ سے آواز نکلی، چنانچہ انہوں نے کہا: ''محمد رسول الله، وابو بكر الصديق، و عمر الشهيد، و عثمان البر الرحيم''۔ پھر ہم نے ان کا کفن ہٹا کر دیکھا تو ان میں روح نہیں تھی۔ چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کی شہادت کی خبر دے رہے تھے جبکہ اس وقت وہ خلیفہ نہیں بنے تھے۔

چوتھا واقعہ: امام طبرانی خبر دیتے ہیں، اور ابو نعیم ''دلائل النبوۃ'' میں نعمان بن بشیر سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن خارجہ اچانک بازار میں گر کر فوت ہو گئے۔ ہم انہیں اُٹھا کر گھر لے آئے۔ تو مغرب اور عشاء کے درمیان عورتیں ان پر رو رہی تھیں کہ اچانک وہ بول پڑے: ''أَنْصِتُوا أَنْصِتُوا'' ۔ پھر فصیح زبان میں کہنے لگے: ''مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ

عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ"۔ چنانچہ اُنہوں نے تھوڑی سی گفتگو کی پھر ہم نے اُن کی طرف دیکھا تو وہ رُوح سے خالی مردہ تھے۔
پس اگر جامد جنازوں نے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی اور زندہ لوگوں نے نہ کی تو پھر بلاشبہ وہ زندہ مجرم جمادات سے زیادہ جامد اور مردوں سے بھی بڑھ کر مردے ہیں۔

رہا فرشتوں کا رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت کرنا، آپ ﷺ کے پاس انسانی صورت میں آنا اور جنوں کا آپ ﷺ پر ایمان لانا اور آپ کی اطاعت کرنا، تو یہ سب کچھ متواتر ہے اور نصِ قرآن کی رُو سے بہت سی آیتوں کے ساتھ ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی نص کے مطابق غزوۂ بدر میں پانچ ہزار فرشتوں نے آپ ﷺ کی خدمت کی اور صحابہ کی طرح سپاہی بن کر آپ کے آگے آگے رہے۔ حتیٰ کہ وہ فرشتے اصحاب بدر کی طرح بزرگی پا کر فرشتوں میں نمایاں مقام حاصل کر گئے۔ اس مسئلے کی دو جہتیں ہیں:

پہلی جہت: جن و ملائکہ کا وجود ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اور وہ حیوانوں اور انسانوں کے گروہوں کی طرح ہمارے ساتھ مناسبت بھی رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کا قطعی اثبات ہم نے انتیسویں مقالے میں دوضربِ دو چار کی طرح کر دیا ہے۔ اس لیے اُن کے وجود کے اثبات کے لیے ہم اسی مقالے کا حوالہ دینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔

دوسری جہت: اُمت کے افراد کا جنوں اور فرشتوں کو دیکھنا اور ان سے گفتگو کرنا رسول اکرم ﷺ کے شرف اور بزرگی کی بدولت ہی ہے، کیونکہ یہ چیز آپ ﷺ کے معجزے کا ہی ایک اثر ہے۔

چنانچہ ائمۂ حدیث کہ جن میں امام بخاری اور مسلم سرفہرست ہیں، نے روایت کیا ہے کہ فرشتہ یعنی جبریلؑ ایک مرتبہ سفید لباس پہنے ہوئے انسانی صورت میں آئے، رسولِ اکرم ﷺ اس وقت اپنے صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے۔ چنانچہ فرشتہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا: "مَا الْإِسْلَامُ وَمَا الْإِيْمَانُ وَمَا الْإِحْسَانُ؟" یعنی ان چیزوں کا تعارف کرائیں کہ یہ کیا ہیں؟ تو رسول اکرم ﷺ نے ان کا تعارف کرایا، یہ سبق وہاں موجود تمام صحابہ نے پڑھا اور اس آدمی کو اچھی طرح دیکھا بھی۔ وہ آدمی کوئی اجنبی مسافر معلوم ہوتا تھا لیکن اس پر سفر کی کوئی علامت بھی نظر نہیں آتی تھی۔ پھر وہ اُٹھا اور پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔ تب رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: جبریلؑ نے یہ انداز تمہیں سکھانے پڑھانے کے لیے اختیار کیا ہے۔

اسی طرح ائمۂ حدیث قطعی صحیح اور معنوی تواتر کے درجے کی روایت کے ذریعے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ بارہا دفعہ جبریلؑ کو رسول اکرم ﷺ کے پاس دحیہ خمیو کی صورت میں دیکھا کرتے تھے۔ دحیہ خمیو غیر معمولی حسن و جمال کے مالک تھے۔

ان میں سے ایک واقعہ جو قطعی طور پر ثابت ہے، یہ ہے کہ سیدنا عمرؓ، ابن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ، حارثؓ، عائشہ

صدیقہؓ اور ام سلمہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم بسا اوقات جبریلؑ کو رسول اکرم ﷺ کے پاس دحیہ خیو کی صورت میں دیکھا کرتے تھے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ یہ معزز لوگ بغیر دیکھے ہی کہہ دیں کہ ہم دیکھتے رہے ہیں۔

اسی طرح فاتح ایران، یکے از عشرہ مبشرہ سعد بن ابی وقاص قطعی صحیح روایت کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ ہم نے غزوۂ خندق میں دو سفید پوش آدمیوں کو رسول اکرم ﷺ کے دونوں پہلوؤں میں محافظ پہرے داروں کی طرح نگرانی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ وہ فرشتے تھے اور ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ وہ جبریلؑ اور میکائیلؑ تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اسلام کا ایک ہیرو یہ کہے کہ ''ہم نے دیکھا ہے''، تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے نہ دیکھا ہو؟

اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے چچازاد ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب صحیح روایت کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ ہم نے غزوۂ بدر میں سفید پوش گھڑ سواروں کو دیکھا جن سے زمین و آسمان کی فضا بھری ہوئی تھی۔

اسی طرح سیدنا حمزہؓ نے رسول اکرم ﷺ سے درخواست کی اور کہا کہ میں جبرائیل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے انہیں کعبہ میں فرشتے کی زیارت کرادی۔ لیکن وہ برداشت نہ کر سکے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

فرشتوں کو دیکھنے کے اس طرح کے واقعات بہت زیادہ ہیں۔ اور یہ تمام واقعات رسول گرامی ﷺ کے ایک نوع کے معجزے پر دلالت کرتے ہیں، اور اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ فرشتے آپ ﷺ کے چراغ نبوت کے پروانے ہیں۔

رہے جن، تو ان کے ساتھ میل جول رکھنا اور ان کا مشاہدہ کرنا صرف صحابہ کرام ہی نہیں بلکہ عوام الناس کو بھی میسّر ہے۔ لیکن ائمۂ حدیث قطعی ترین اور صحیح ترین طریق سے روایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ابن مسعودؓ نے فرمایا: میں نے اُس رات میں جب جنّوں نے ہدایت پائی، بطنِ نخل میں جنّوں کو دیکھا میں انہیں سوڈان کے ایک زطّ نامی گروہ کے طویل القامت لوگوں کے ساتھ تشبیہ دیتا ہوں۔ وہ جن ان لوگوں کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔

ایک اور مشہور واقعہ جو ائمۂ حدیث نے روایت کیا اور اُسے قبول کیا ہے، حضرت خالد بن ولیدؓ کا واقعہ ہے، اور وہ اس طرح سے ہے کہ صحابہ کرامؓ نے جب عزّیٰ نامی بت کو منہدم کیا اُس میں سیاہ رنگ کی ایک عورت کی شکل میں ایک جنّی رہا کرتی تھی۔ خالد بن ولیدؓ نے اُسے کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: عزّیٰ کے بت میں پرستش اس جنّی کی ہوتی تھی۔ پس آج کے بعد اس کی پرستش کبھی نہیں ہوگی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ سے یہ واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ کے پاس تھے کہ وہاں ایک جن لاٹھی ٹیکتا ہوا آ گیا جس کا نام ہامہ تھا۔ وہ آپ ﷺ پر ایمان لایا اور آپ ﷺ نے اسے چند چھوٹی سورتیں بھی

پڑھائیں۔اس نے آپ ﷺ سے وہ سورتیں پڑھیں اور چلا گیا۔

پس اس آخری واقعہ پر اگرچہ بعض ائمۂ حدیث نے تنقید کی ہے لیکن اہم ائمہ نے اسے صحیح کہا ہے۔بہرحال اس نوع کے معجزات کے بارے میں کلام کو طول دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ شیخ جیلانیؒ جیسے ہزاروں اقطاب واَولیاء نے رسول اکرم ﷺ کے نور، آپ کی تربیت اور اتباع کی بدولت جنوں اور فرشتوں سے ملاقات کی ہے، اُن کے ساتھ اکٹھ کیا ہے اور بات چیت کی ہے۔اور یہ واقعہ ایک سو تواتر اور انتہائی کثرت کا حکم رکھتا ہے۔

جی ہاں؛ اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا فرشتوں اور جنوں کے ساتھ بات چیت کرنا اور ان کا اُن کے ساتھ ملاقات کرنا رسول اکرم ﷺ کی تربیت اور آپ ﷺ کی معجزانہ رہنمائی کا تابندہ نقش ہے۔

تیسرا شعبہ: رسولِ اکرم ﷺ حفاظت، سلامتی اور بچاؤ کا ایک تابندہ معجزہ ہیں، اور آیتِ کریمہ: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ کی تابندہ حقیقت، بہت سے معجزات پر دلالت کرتی ہے۔

جی ہاں؛ رسول اکرم ﷺ نے جب ظہور کیا تو کسی ایک گروہ، قوم، بعض اہلِ سیاست یا کسی ایک دین کو ہی نہیں بلکہ بادشاہوں کو اور تمام اہلِ ادیان کو علیحدہ علیحدہ چیلنج کیا۔آپ ﷺ کا چچا آپ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا، آپ ﷺ کی قوم اور قبیلہ آپ ﷺ کے دشمن تھے۔آپ بلا تکلف تیئس سال بغیر کسی چوکیداری اور حفاظتی اقدامات کے رہے۔کئی دفعہ اچانک حملہ کر کے آپ ﷺ کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن آپ ﷺ کمال سعادت کے ساتھ بستر راحت پر فوت ہوئے۔

تو آپ ﷺ کا ملأ اعلیٰ تک جا پہنچنے تک پوری حفاظت اور بچاؤ کے ساتھ رہنا سورج کی طرح اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آیت کریمہ: " وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ " ایک مضبوط حقیقت کا علم دیتی ہے، اور وہ ہے ایک پختہ اور مضبوط نقطۂ استناد۔

ہم یہاں بطورِ مثال چند واقعات ذکر کرتے ہیں جو قطعیت اور یقین کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔

پہلا واقعہ: اہلِ سِیَر واَصحابُ الحدیث بالاتفاق روایت کرتے ہیں کہ قبیلۂ قریش اس بات پر قطعی طور پر متفق ہو گئے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو قتل کرنے کی کوئی تدبیر کی جائے، حتّٰی کہ شیطان ایک انسان کی صورت میں آیا اور اُس کی تدبیر کے مطابق ہر ایک قبیلے سے کم از کم ایک بندے کو شامل کیا تاکہ قریش کے درمیان فتنہ برپا نہ ہو جائے۔تب دو سو کے لگ بھگ آدمیوں نے ابو جہل اور ابولہب کی قیادت میں رسولِ اکرم ﷺ کے بیتِ سعادت پر حملہ کر دیا۔رسول اکرم ﷺ کے پاس اس وقت علیؓ تھے۔آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: آج رات میرے بستر پر سو رہو۔پھر رسولِ اکرم ﷺ نے انتظار

کیا حتیٰ کہ قریش نے آکر تمام اطراف سے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ تب رسول اکرم ﷺ نے گھر سے باہر نکل کر اُن کی طرف تھوڑی سی خاک پھینک دی جس کے نتیجے میں اُن میں سے کوئی بھی آپ ﷺ کو دیکھ نہ سکا۔ اور آپ ﷺ اُن کے درمیان سے نکل کر چلے گئے۔ غارِ حراء میں دو کبوتریوں اور ایک مکڑی نے آپ ﷺ کی چوکیداری کی اور قریش کے مقابلے میں آپ ﷺ کی حفاظت کی۔

دوسرا واقعہ: قطعی واقعات میں سے ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ رؤسائے قریش نے ایک پرلے درجے کے بہادر سُراقہ نامی آدمی کو بہت بھاری رقم کی لالچ دے کر آپ ﷺ اور ابو بکر صدیقؓ کے تعاقب میں بھیجا، کہ وہ اُن کا پیچھا کرے اور ان کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔ تو جب رسول اکرم ﷺ ابو بکر صدیقؓ کے ساتھ غار سے نکل کر مدینہ کی طرف چلے تو دونوں نے دیکھا کہ سراقہ چلا آرہا ہے۔ ابو بکر صدیقؓ یہ منظر دیکھ کر غمگین ہو گئے۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾، جیسے کہ غار میں کہا تھا۔ تب آپ ﷺ نے سراقہ پر نظر ڈالی تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے، اور دھنسے رہے۔ نکلے تو اس نے پھر پیچھا کیا، تب پھر دھنس گئے۔ اور اس کے گھوڑے کے پاؤں جہاں پڑتے تھے وہاں سے دھوئیں کی طرح کی کوئی چیز نکلتی تھی۔ تب اسے علم ہو گیا کہ وہ ہو یا کوئی اور قوم، کوئی بھی آپ ﷺ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لیے اُس نے رسولِ اکرم ﷺ سے امان طلب کر لی۔ آپ ﷺ نے اُسے امان دے دی، لیکن اُس سے فرمایا ایسا انداز اختیار کرو کہ اور کوئی ادھر نہ آئے۔

اس واقعے کی مناسبت سے ہم اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ رُواۃ صحیح طریق سے بتاتے ہیں کہ: ایک چرواہے نے آپ دونوں کو دیکھا تو قریش کو بتانے کے لیے مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ مکہ میں داخل ہوا تو بھول ہی گیا کہ وہ مکہ میں کیوں آیا تھا، بہتیری کوشش کرنے کے بعد بھی اسے یاد نہ آسکا تو واپس چلا گیا پھر اسے پتا چلا کہ یہ بات اُسے اللہ نے بھلائی تھی۔

تیسرا واقعہ: ائمۂ حدیث متعدد طرق سے روایت کرتے ہیں کہ کسی قبیلے کا ایک بہادر جس کا نام غورث تھا، چھپتا چھپاتا رسول اکرم ﷺ کے عین سر پر آ کر کھڑا ہو گیا اور تلوار سونت کر رسولِ اکرم ﷺ کو کہنے لگا: تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ'' پھر آپ ﷺ نے اس طرح سے دُعا فرمائی: ''اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِ بِمَا شِئْتَ'' تب غورث کے کندھوں کے درمیان غیب سے زبردست چوٹ پڑی جس سے تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے وہ تلوار اپنے ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا: ''اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟'' پھر آپ ﷺ نے اُسے معاف کر دیا۔ یہ واقعہ جنگ غطفان اور اَنمار میں پیش آیا۔ وہ آدمی اپنے قبیلے کی طرف لوٹ گیا۔ تمام لوگ اس بہادر آدمی کے ماجرے سے حیران ہوئے اُنہوں نے اس سے پوچھا: تجھے ہوا کیا تھا؟ تو کچھ بھی کیوں نہ کر سکا؟ تو اُس نے اُنہیں تمام

واقعہ سنا دیا اور کہنے لگا: اب میں دنیا کے بہترین انسان کے پاس سے آرہا ہوں۔

اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ غزوۂ بدر میں بھی پیش آیا، اور وہ اس طرح کہ ایک منافق نے آپ ﷺ کی بے خبری میں چھپتے چھپاتے آپ ﷺ کے پیچھے آکر آپ ﷺ پر تلوار سونت لی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اچانک اس کی طرف دیکھا تو وہ کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے زمین پر گر پڑی۔

چوتھا واقعہ: متبحر اہلِ تفسیر اور ائمۂ حدیث تواتر کے قریب پہنچی ہوئی شہرت کا درجہ رکھنے والی حدیث بیان کرتے ہیں اور اکثر مفسّرین کہتے ہیں کہ آیت کریمہ: ﴿إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ﴾ کا شانِ نزول یہ ہے کہ ابوجہل نے قسم اُٹھائی اور کہا کہ اگر میں نے محمد ﷺ کو سجدے میں پڑا ہوا دیکھ لیا تو یہ پتھر اس کو دے ماروں گا۔ پھر ایک بڑا سا پتھر اُٹھایا اور چل پڑا۔ پھر جب اُس نے آپ ﷺ کو سجدے میں پڑا دیکھا اور پتھر مارنے کے لیے ہاتھ اُوپر اُٹھائے تو اُس کے دونوں ہاتھ ہوا میں ہی اُٹھے ہوئے رہ گئے تو رسول اکرم ﷺ نماز ختم کرنے کے بعد اُٹھے تو ابوجہل کے ہاتھ معمول پر آگئے، یا تو اس لیے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا، اور یا اس لیے کہ اب ان کے اُوپر رہنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ابوجہل کے قبیلے کے ایک آدمی ولید بن مغیرہ نے بھی رسولِ اکرم ﷺ کو مارنے کے لیے ایک بڑا سا پتھر اُٹھایا۔ آپ ﷺ سجدے میں گئے اور وہ آپ ﷺ کو مارنے کے لیے چلا تو اس کی آنکھیں اندھی ہوگئیں اور وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہ سکا، چنانچہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کو مسجد الحرام میں دیکھ نہ سکا اور واپس آگیا اور ان لوگوں کو بھی دیکھ نہیں پا رہا تھا جنہوں نے اُسے بھیجا تھا بلکہ صرف ان کی آوازیں سن رہا تھا، تا آنکہ رسولِ اکرم ﷺ نے نماز ختم کر لی۔ پھر جب ضرورت نہ رہی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

اسی طرح ناقلین صحیح نقل کے ذریعے ابوبکر صدیقؓ سے نقل کرتے ہیں ''تَبَّتْ يَدَآ أَبِيْ لَهَبٍ وَتَبَّ'' کے نازل ہونے کے بعد ابولہب کی حَمَّالَةَ الْحَطَبِ یعنی لکڑیاں اُٹھانے والی بیوی ام جمیل ایک پتھر اُٹھا کر مسجد کی طرف چلی آئی جہاں رسولِ اکرم ﷺ ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ اُسے وہاں صرف ابوبکرؓ نظر آئے۔ تو اُس نے اُن سے پوچھا: تمہارا ساتھی کہاں ہے ابوبکر؟ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ اُس نے میری ہجو کی ہے؟ مجھے نظر آگیا تو اس کے منہ پر یہ پتھر دے ماروں گی۔ نبی ﷺ اُن کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے لیکن اُسے نظر نہ آئے۔

بلاشبہ اس جیسی لکڑیاں اُٹھایا کرنے والی عورت کی یہ اوقات نہیں تھی کہ وہ ''لَوْلَاكَ، لَوْلَاكَ '' کی صفت سے موصوف ہستی کے حضور جاتی اور انہیں دیکھ پاتی؛ کیونکہ وہ تو خدا کی پناہ میں تھے۔

پانچواں واقعہ: صحیح روایت سے مروی ہے کہ عامر بن طفیل اور اربد بن قیس متفق ہوکر رسول اکرم ﷺ کو قتل کرنے

کے لیے گئے۔ عامر نے کہا: میں اسے غافل کر دوں گا اور تو قتل کر دینا۔ لیکن پھر اُس نے دیکھا کہ وہ تو کچھ کر ہی نہیں رہا ہے۔ جب دونوں واپس ہوئے تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا: تو اُسے مارتا کیوں نہیں تھا؟ تو اُس نے کہا: مارتا کیسے؟ جب بھی مارنے کی کوشش کرتا درمیان میں تو آجاتا تھا اب بتاؤ کہ تجھے کیسے مار دیتا؟

چھٹا واقعہ: صحیح روایت کے ساتھ مروی ہے کہ شیبہ بن عثمان حبشی جس کے باپ اور چچا کو حضرت حمزہؓ نے قتل کیا تھا، انتقام کی نیت سے غزوۂ احد یا حنین میں خفیہ طریقے سے آگیا، حتی کہ رسولِ اکرم ﷺ تک پہنچ گیا اور آپ ﷺ کے پیچھے سے آپ ﷺ پر تلوار کھینچ لی لیکن اچانک تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی، تو رسول اکرم ﷺ نے اُس کی طرف دیکھا اپنا دستِ مبارک اُس کے سینے پر رکھ دیا۔ شیبہ کہتے ہیں: اُس لمحے دنیا کا کوئی انسان مجھے آپ ﷺ سے زیادہ محبوب نہ تھا۔ چنانچہ وہ ایمان لے آیا۔ تو رسولِ اکرم ﷺ نے اُسے فرمایا: جاؤ اور جنگ کرو شیبہ کہتے ہیں: اس وقت میرا باپ بھی آجاتا تو میں اُسے بھی مارتا۔

اسی طرح فتح مکہ کے دن فضالہ نامی ایک آدمی رسولِ اکرم ﷺ کو دھوکے سے قتل کرنے کے لیے آیا رسول اکرم ﷺ نے اُس کی طرف دیکھ کر تبسّم فرمایا اور کہا: تو نے اپنے دل میں کیا سوچ رکھا تھا؟ پھر آپ ﷺ نے فضالہ کے لیے استغفار کیا۔ فضالہ آپ ﷺ پر ایمان لے آیا۔ فضالہ کہتے ہیں کہ اُس وقت میرے نزدیک دنیا میں کوئی آدمی آپ ﷺ سے بڑھ کر محبوب نہ رہا۔

ساتواں واقعہ: صحیح روایت کے ساتھ نقل ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرم ﷺ کسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ یہودیوں نے آپ ﷺ کو دھوکے سے قتل کرنے کے لیے اُوپر سے ایک بھاری چٹان لڑھکا دی۔ رسول اکرم ﷺ عین اُسی لمحے اس جگہ سے اُٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور نگرانی سے وہ برا ارادہ بے کار رہا۔

ان سات مثالوں جیسی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

ائمہٴ حدیث کہ جن میں امام بخاریؒ اور مسلمؒ سرفہرست ہیں، حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ آیتِ کریمہ: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ نازل ہونے کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے ان لوگوں سے جو کبھی کبھار آپ ﷺ کی نگرانی کرتے تھے؛ فرمایا: ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ انْصَرِفُوا فَقَدْ عَصَمَنِيْ رَبِّيْ عَزَّوَجَلَّ'' مطلب یہ ہے کہ مجھے چوکیداری کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ میرا پروردگار میری حفاظت خود کرتا ہے۔

اس کتاب میں شروع سے لے کر یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہر نوع اور اس کائنات کا ہر عالم رسول اکرم ﷺ کو جانتا ہے اور آپ ﷺ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور آپ ﷺ کے یہ معجزات کائنات کی ہر نوع میں نظر آتے ہیں۔ پس ''احمد'' نامی یہ شخص اللہ تعالیٰ کے ربُّ العالمین اور خالقِ کائنات ہونے کی حیثیت سے

اُس کا مأمور اور رسول ہے۔

جی ہاں؛ جس طرح بادشاہ کے انسپکٹر کی سطح کے کسی بڑے ملازم کی حکومت کے تمام محکموں میں جان پہچان ہوتی ہے اور وہ جس محکمے میں بھی چلا جائے اسے خوش آمدید کہا جاتا ہے اور اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے، کیونکہ وہ سلطانِ معظم کا ملازم ہے۔ لیکن اگر ـ بالفرض ـ وہ صرف عدلیہ کا انسپکٹر ہوتا تو اس کی آؤ بھگت صرف عدلیہ کے محکموں میں ہی ہوتی اور دیگر اداروں میں اس کی کوئی خاص جان پہچان نہ ہوتی۔ اور اگر وہ عسکری ادارے کا انسپکٹر ہوتا تو دیگر حکومتی اداروں میں اس کی کوئی خاطر خواہ جان پہچان نہ ہوتی۔ اسی طرح سلطنتِ الٰہیہ کے تمام اداروں کے تمام گروہ فرشتوں سے لے کر مکھی اور مکڑی تک کے تمام گروہ آپ ﷺ کو پہچانتے اور آپ ﷺ کے بارے میں علم رکھتے ہیں یا انہیں علم دے دیا جاتا ہے۔ پس بلا شبہ آپ ﷺ خاتم الانبیاء اور رسولِ ربُّ العالمین ہیں اور آپ ﷺ کی رسالت علیہم السلام تمام انبیاء کی رسالت کے مقابلے میں عمومیت اور ہمہ گیریت کی حامل ہے۔

سولھواں بلاغی اشارہ: نبوت سے پہلے ظہور میں آنے والے لیکن نبوت کے ساتھ تعلق رکھنے والے خارقِ عادت اور غیر معمولی واقعات جنہیں دوسرے لفظوں میں ''ارہاصات'' کہا جاتا ہے یہ بھی دلائل نبوت میں شامل ہیں۔ ان خوارق کی تین قسمیں ہیں۔

قسمِ اوّل: نبوتِ محمدی ﷺ کے بارے میں وہ پیش گوئیاں جو قرآن کریم کی نص کے مطابق؛ تورات، زبور، انجیل اور دیگر صُحفِ انبیاء میں وارد ہوئی ہیں۔

جی ہاں؛ یہ کتابیں جب آسمانی ہیں اور جن لوگوں پر یہ اُتری ہیں وہ انبیاء تھے، تو پھر یہ بات قطعی اور ضروری تھی کہ یہ ہر حال میں قطعی طور پر اس شخص کے بارے میں بحث کرتیں جو اُن کے ادیان کو منسوخ کر دے گا اور جو کائنات کی شکل تبدیل کر دے گا اور جو اپنے لائے ہوئے نور کے ساتھ کائنات کو روشن کر دے گا۔

جی ہاں؛ وہ کتابیں جو چھوٹے چھوٹے واقعات کی خبر دیتی ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات کی خبر دینے والی یہ کتابیں واقعۂ محمدی کے بارے میں خبر نہ دیں جو کہ انسانی تاریخ میں رونما ہونے والا سب سے بڑا واقعہ ہے؟ اگر بداہتاً اس کے بارے میں خبر دیتی ہیں تو بہر حال یا تو اُس کی تکذیب کریں گی تا کہ اُس صاحبِ حقیقت شخص کی وجہ سے اپنے ادیان کو منہدم ہونے سے اور اپنی کتابوں کو منسوخ ہونے سے بچالیں۔ یا پھر اُس کی تصدیق کریں گی تا کہ ان کے ادیان خرافات سے اور کتابیں تحریفات سے پاک ہو جائیں۔ اور صورتِ حال یہ ہے کہ دوستوں اور دشمنوں کے بالاتفاق کسی بھی کتاب میں تکذیب کی کوئی علامت نہیں ملتی ہے۔ اور جب تکذیب کی کوئی علامت نہیں ملتی تو اس کا مطلب ہے کہ ان میں تصدیق ہی تصدیق ہے۔ اور جب مطلق صورت میں تصدیق ہی پائی جاتی ہے اور اس تصدیق کی موجودگی کا تقاضا کرنے

والی قطعی علت اور اصلی سبب بھی موجود ہے تو پھر ہم اس تصدیق کا اس کے وجود پر دلالت کرنے والی تین قطعی دلیلوں کے ساتھ اثبات کریں گے۔

پہلی دلیل: رسولِ اکرم ﷺ انہیں قرآن کی زبان میں کہتے ہیں: تمہاری کتابوں میں میری تصدیق اور میری صفات پائی جاتی ہیں، اور میں جو کچھ بتا رہا ہوں وہ اُس کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور آپ ﷺ نے انہیں ﴿قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ اور ﴿قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾ جیسی آیات کے ساتھ چیلنج کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ مسلسل اُن کے کانوں پر دستک دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اپنی تورات لاؤ اور پڑھو۔ آؤ ہم اپنے بچوں کو اور اپنے اہل وعیال کو بلا لیتے ہیں اور باری تعالیٰ کے حضور ہاتھ اُٹھاتے ہیں اور جھوٹوں پر لعنت کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی یہودی عالم نے یا نصرانی قسّیس نے آپ ﷺ کی کوئی غلطی نہ پکڑی، اگر آپ ﷺ غلطی کرتے تو حسد اور بغض وعناد سے بھرے یہودی، منافق اور کافر ضرور اُسے لے اُڑتے اور ہر طرف پھیلا دیتے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے اُن سے فرمایا: یا تو میری غلطی کی نشاندہی کر دیا پھر میں تمہارے ساتھ آخری دم تک جہاد کروں گا۔ اس سے پتا چلا کہ انہیں آپ ﷺ کے معاملے میں کوئی غلطی نظر نہ آئی۔ اگر کوئی غلطی ہوتی تو یقیناً واضح کر کے گلوخلاصی کرا لیتے۔

دوسری دلیل: تورات، انجیل اور زبور کی عبارتیں چونکہ قرآن کریم کی طرح معجزہ نہیں ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان کا متعدد بار ترجمہ ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ان میں بہت سے مفسرین کے اقوال، ان کی غلط سلط تاویلات ان آیات کے ساتھ خلط ملط ہو گئی ہیں اور ان میں بہت سے اجنبی الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح ان میں جاہل اور خودغرض لوگوں کی تحریفات بھی راہ پا گئی ہیں جس کی وجہ سے یہ کتابیں تحریفات وتغییرات کا تختۂ مشق بن گئی ہیں۔ حتی کہ علامہ رحمت اللہ ہندی نے یہودی علماء اور عیسائی قسّیسوں کو سابقہ کتب میں ہزارہا تحریفات ثابت کر کے انہیں لا جواب کر دیا اور عصرِ حاضر میں حسین الجسرؒ نے ان تحریفات کے باوجود انہی کتابوں سے نبوتِ محمدی کے حق میں ایک سو دس دلائل کا استنباط کیا اور انہیں اپنی ''الرسالة الحميدية'' نامی کتاب میں جمع کر دیا۔ مرحوم اسماعیل حقی مناسطری نے اس کتاب کا ترکی میں ترجمہ کر دیا ہے جو چاہے اس کی طرف رجوع کر کے دیکھ سکتا ہے۔

اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے بہت سے علماء نے اس بات کا اقرار واعتراف کیا ہے کہ محمد عربی ﷺ کے اوصاف ہماری کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔

جی ہاں؛ اعتراف کرنے والوں میں سرِ فہرست شاہِ روم ہرقل ہے جو غیر مسلم تھا۔ اس نے آپ ﷺ کے بارے میں سنا تو کہا: جی ہاں؛ بلاشبہ عیسیٰ محمد عربی ﷺ کے بارے میں خبر دیتے ہیں۔

اسی طرح حاکمِ مصر مُقوقس، ابن صوریا، ابن اخطب اور اس کا بھائی، کعب بن اسد اور زبیر بن باطیا اور ان جیسے دیگر مشہور علماء و اُمراءِ یہود نے غیر مسلم رہتے ہوئے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا اور کہا: جی ہاں؛ ہماری کتابوں میں آپ ﷺ کے اوصاف پائے جاتے ہیں اور وہ آپ ﷺ کے بارے میں بحث کرتی ہیں۔

اسی طرح یہودیوں کے وہ مشہور علماء اور عیسائیوں کے قساوسہ جو سابقہ کتابوں میں رسالتمآب ﷺ کے اوصاف دیکھ کر دشمنی کا راستہ چھوڑ کر ایمان لے آئے، اُن سب نے تورات و انجیل میں پائے جانے والے آپ ﷺ کے اوصاف کو آشکار کیا اور یہود و نصاریٰ کے دیگر علماء کو لاجواب کر دیا۔

چنانچہ ان میں سے عبداللہ بن سلام، وھب بن منبہ، ابو یاسر اور شامُول کافی مشہور ہے۔ شامُول نامی یہ آدمی یمن کے بادشاہ ''تبّع'' کے دور میں تھا۔ جس طرح تبّع آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ کو دیکھے بغیر آپ ﷺ پر ایمان لے آیا تھا اسی طرح شامُول بھی ایمان لے آیا تھا۔

اُن میں سے اُسید اور ثعلبہ بھی ہیں؛ کیونکہ ہیبان نامی ایک عارف باللہ بعثت سے پہلے بنونضر کے ایک قبیلے میں مہمان بن کر ٹھہرا تھا۔ اُس نے ان لوگوں سے کہا تھا: ''قَرِيبٌ ظُهُورُ نَبِيٍّ هَذَا دَارُ هِجْرَتِهِ ''یعنی'' ایک نبی کے ظاہر ہونے کا وقت بالکل قریب ہے، یہ علاقہ اس کا دارِ ہجرت ہوگا'' یہ کہہ کر وہ وہیں پر فوت ہوگیا۔ پھر جب اُس قبیلے نے رسولِ اکرم ﷺ سے جنگ کی تو اُسید اور ثعلبہ میدان میں آئے اور پکار کر اس قبیلے سے کہنے لگے: ''وَاللّٰهِ هَذَا الَّذِي عَهِدَ إِلَيْكُمْ فِيهِ ابْنُ هَيَّبَانَ ''یعنی ''بخدا'' یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم سے ابن ہیبان نے عہد لیا تھا''۔ یعنی یہ وہی آدمی ہے جس کے بارے میں تمہیں ابن ہیبان نے خبر دی تھی، اس لیے تم اس سے جنگ نہ کرو۔ لیکن انہوں نے ان کی بات نہیں سنی اور اس طرح انہیں ان کی بے پرواہی کی سزا ملی۔

اسی طرح ابنِ بنیامین، مُخیریق اور کعب احبار جیسے بہت سے یہودی علماء اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کے اوصاف دیکھ کر ایمان لے آئے۔

اسی طرح بحیرہ راہب جس کا پہلے ذکر ہوا جو ایک عیسائی عالم تھے، رسولِ اکرم ﷺ بارہ سال کی عمر میں جب اپنے چچا کے ساتھ شام کی طرف سفر پر گئے، تو اس نے رسولِ اکرم ﷺ کی خاطر قافلے والے تمام قریشیوں کی ضیافت کی۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ قافلے کے تمام لوگ اس کے ہاں نہیں آئے بلکہ کچھ لوگ وہیں پہ رہ گئے ہیں، اور بادل کا ایک ٹکڑا سایہ فگن ہے جو اُس کے پاس نہیں آیا۔ تب اُس نے دل میں کہا کہ جسے میں بلانا چاہتا تھا وہ تو نہیں آیا! چنانچہ اس نے ایک آدمی بھیج کر آپ ﷺ کو بھی بُلا لیا۔ اور پھر آپ ﷺ کے چچا ابو طالب سے کہنے لگا: مکہ واپس چلے جاؤ؛ کیونکہ یہودی بڑے حاسد ہیں، اور اس کے اوصاف تورات میں مذکور ہیں۔ اس لیے وہ اس کو دھوکہ دیں گے۔

اسی طرح حبشہ نسطور نامی آدمی نے اور وہاں کے حکمران نجاشی نے اپنی کتابوں میں جب آپ ﷺ کے اوصاف

دیکھے تو آپ ﷺ پر ایمان لے آئے۔

اسی طرح صَغاطِر نامی ایک مشہور عیسائی عالم اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کے اوصاف دیکھ کر ایمان لے آیا۔لیکن اہلِ روم کے سامنے جب اس نے اپنے ایمان کا اعلان کیا تو شہید کر دیا گیا۔اسی طرح حارث بن ابی شمر غسانی یکے اَز رؤسائے دین اور یکے اَز شاہانِ شام (یعنی شاہِ ایلیا)،عیسائیوں کے ہرقل،ابن ناطور اور جارود جیسے کے مشہور سرداروں نے اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کی صفات دیکھیں تو آپ ﷺ پر ایمان لے آئے۔لیکن ہرقل نے دنیاوی سلطنت کی خاطر اپنے ایمان کو ظاہر نہ کیا۔

اسی طرح سلمان فارسیؓ جو کہ انہیں لوگوں کی طرح ایک عیسائی تھے،آپ ﷺ کے اوصاف دیکھ کر آپ ﷺ کی تلاش میں لگ گئے تھے۔اسی طرح تمیم نامی ایک اہم عالم اور رئیسِ حبشہ نجاشی،اور نجران کے اساقفہ سب کے سب بالاتفاق خبر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم نے اپنی کتابوں میں اوصاف نبوی دیکھے تو ہم ایمان لے آئے۔

تیسری دلیل: ہم یہاں بطورِ مثال تورات،انجیل اور زبور سے ایسی متعدد آیات کا ذکر کریں گے جو ہمارے نبی ﷺ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔★

زبور کی ایک آیت کچھ اس طرح کی ہے:"اَللّٰهُمَّ ابْعَثْ لَنَا مُقِيمَ السُّنَّةِ بَعْدَ الْفَتْرَةِ" ۔یہاں مقیم السنّت سے مراد نامِ احمد ﷺ ہے۔

انجیل کی ایک آیت ہے:"قَالَ الْمَسِيحُ: اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى أَبِيْ وَاَبِيْكُمْ لِيَبْعَثَ لَكُمُ الفَارَقْلِيطَا" ۔(حاشیہ:۱)یعنی میں جاتا ہوں تاکہ تمہارے پاس فارقلیط یعنی احمد آ جائے۔

انجیل کی ایک دوسری آیت ہے:"اِنِّيْ اَطْلُبُ مِنْ رَبِّيْ فَارَقْلِيطًا يَكُوْنُ مَعَكُمْ اِلَى الْأَبَدِ" ۔(حاشیہ:۲)یعنی میں اپنے ربّ سے ایسے نبی کا طلب گار ہوں جو حق کو باطل سے علیحدہ کر دے اور وہ تمہارے ساتھ ابد تک رہ پائے۔فارقلیط کا معنی ہے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا بھی ہے۔یہ ان کی کتابوں میں ہمارے نبی ﷺ کا نام ہے۔

تورات کی ایک آیات ہے:"اِنَّ اللّٰهَ قَالَ لِاِبْرَاهِيمَ: اِنَّ هَاجَرَ تَلِدُ وَيَكُوْنُ مِنْ وَلَدِهَا مَنْ يَدُهُ فَوْقَ الْجَمِيعِ

★ ملاحظہ: استاد نورسیؒ نے اس مقام پر عہد نامہ قدیم سے اور عہد نامہ جدید سے جو آیات نقل کی ہیں ہمارے پیشِ نظر نسخوں میں الفاظ میں اگرچہ کافی اختلاف پایا جاتا ہے البتہ معنی قریب قریب وہی ہے جو ان کے پیشِ نظر ہے اس لیے یہ بات ملحوظِ خاطر ہے کہ انہوں نے وہ تمام کی تمام اپنے حافظے کے بل پر نقل کی ہیں۔دوسرے یہ کہ تورات اور انجیل کے متعدد اور متفاوت نسخے ہیں جن میں تحریف کا امکان بھی بہر کیف موجود ہے،اس لیے عین ممکن ہے کہ جو نسخہ ان کے حافظے میں ہو ان میں وہی الفاظ ہوں جو انہوں نے نقل کیے ہیں!اس لیے ہم نے استاد کے نقل کیے ہوئے الفاظ برقرار رکھے ہیں اور جو نصوص انہوں نے عربی میں لکھی ہیں ان کا رواں دواں ترجمہ کر دیا ہے۔مترجم۔

(حاشیہ:۱)یوحنا۔باب 14 آیت 16, 31 (حاشیہ:۲)یوحنا۔باب 14 آیت 16, 31

وَیَدُ الْجَمِیْعِ مَبْسُوْطَةٌ اِلَیْهِ بِالْخُشُوْعِ" ۔(حاشیہ:۱) یعنی حضرت اسماعیل کی والدہ یعنی ہاجرہ صاحب اولاد ہوں گی اور اس کی ایک اولاد ایسی بھی ہوگی جس کا ہاتھ سب کے اُوپر ہوگا اور سب کے ہاتھ اس کی طرف خشوع اور اطاعت کے ساتھ کھلیں گے۔

تورات کی ایک دوسری آیت ہے:"قَالَ یَا مُوْسٰی: اِنِّی مُقِیْمٌ لَهُمْ مِنْ بَنِیْ اِخْوَتِهِمْ مِثْلَكَ وَاُجْرِیْ قَوْلِیْ فِیْ فَمِهٖ وَالرَّجُلُ الَّذِیْ لَا یَقْبَلُ قَوْلَ النَّبِیِّ الَّذِیْ یَتَكَلَّمُ بِاِسْمِیْ اَنَا اَنْتَقِمُ مِنْهُ" ۔(حاشیہ:۲) یعنی میں بنی اسرائیل کے بھائیوں بنی اسماعیل میں سے تجھ جیسا ایک نبی برپا کروں گا اپنا کلام اس کے منہ میں رکھوں گا۔ وہ میری وحی کے ساتھ بولے گا۔ اور جو اُسے قبول نہ کرے گا میں اسے عذاب دوں گا۔

تورات کی تیسری آیت ہے:"قَالَ مُوْسٰی: رَبِّ اِنِّیْ اَجِدُ فِی التَّوْرَاةِ اُمَّةً هُمْ خَیْرُ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ- فَاجْعَلْهُمْ اُمَّتِیْ- قَالَ: تِلْكَ اُمَّةُ مُحَمَّدٍ"۔

تنبیہ: ان کتابوں میں اسم گرامی "محمد" سریانی اور عبرانی زبانوں کی صورت میں وارد ہوا ہے، جیسے "مُشَفَّحْ، مُنحَمَنَّا اور حَمْیَاطَا"؛ وگرنہ صراحتاً اسم "محمد" بہت کم آیا ہے۔ اور جہاں آیا ہے حاسد یہودیوں نے اس میں تحریف کردی ہے۔

زبور کی ایک آیت ہے:"یَادَاوٗدُ! یَاْتِیْ بَعْدَكَ نَبِیٌّ یُسَمّٰی اَحْمَدَ وَ مُحَمَّدًا صَادِقًا سَیِّدًا اُمَّتُهٗ مَرْحُوْمَةٌ"۔

اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ جو کہ عبادلہ سبعہ میں سے ہیں اور جنہوں نے سابقہ کتابوں کو کھنگالا تھا اور عبداللہ بن سلام جو کہ مشاہیر علمائے یہود میں سے سب سے پہلے اسلام لائے۔ اور کعب احبار جو کہ ایک متبحر یہودی عالم تھے، ان سب نے تورات میں_ جو کہ ان دنوں زیادہ تر تحریف کی زد میں نہیں آئی تھی_ پائی جانے والی اس آیت کا اعلان کیا اور اسے آشکار کیا۔ اس آیت کا ایک حصہ یہ ہے، اللہ تعالیٰ موسیٰؑ کے ساتھ مخاطب ہونے کے بعد آنے والے نبی کو مخاطب ہو کر فرماتا ہے: "یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِیْرًا وَحِرْزًا لِلْاُمِّیِّیْنَ اَنْتَ عَبْدِیْ سَمَّیْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَیْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِیْظٍ وَلَا صَخَّابٍ فِی الْاَسْوَاقِ وَلَا یَدْفَعُ بِالسَّیِّئَةِ السَّیِّئَةَ بَلْ یَعْفُوْ وَیَغْفِرُ لَنْ یَّقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتّٰی یُقِیْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ، بِاَنْ یَقُوْلُوْا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"(حاشیہ:۳)

تورات کی ایک دوسری آیت ہے:"مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَوْلِدُهٗ بِمَكَّةَ وَهِجْرَتُهٗ بِطَیْبَةَ وَمُلْكُهٗ بِالشَّامِ وَاُمَّتُهُ الْحَمَّادُوْنَ"

اس آیت میں وارد ہونے والا لفظ "محمد" سریانی زبان میں ٹھیک "محمد" ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

تورات کی ایک اور آیت ہے:"اَنْتَ عَبْدِیْ وَرَسُوْلِیْ سَمَّیْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ" (حاشیہ:۴)۔ چنانچہ اس آیت میں

(حاشیہ:۱) پیدائش۔باب 14 (حاشیہ:۲) استثناء۔باب 18 (حاشیہ:۳) یسعیاہ: باب، 42۔آیت 1 تا 7۔
(حاشیہ:۳) استثناء: باب 18 (حاشیہ:۴) استثناء: 18

اولادِ اسماعیل سے جو کہ بنی اسحاق کے بھائی ہیں موسیٰ کے بعد آنے والے نبی کو مخاطب کررہا ہے۔

تورات کی ایک اور آیت یہ ہے: "عَبْدِی الْمُخْتَارُ، لَیْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِیْظٍ" (حاشیہ:۴)۔ یہاں المختار بمعنی مصطفیٰ ہے اور مصطفیٰ نبی کا نام ہے۔

انجیل میں عیسیٰ کے بعد آنے والے نبی ﷺ کی پہچان کے بارے میں ہے۔ بعض آیات میں عیسیٰ آپ ﷺ کے بارے میں سردارِ عالم کے عنوان سے خوشخبری بھی دیتے ہیں، فرماتے ہیں: "مَعَهُ قَضِیْبٌ مِنْ حَدِیْدٍ یُقَاتِلُ بِهِ وَأُمَّتُهُ کَذٰلِكَ"۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک صاحبِ شمشیر نبی آئے گا جو جہاد کرنے پر مأمور ہوگا۔ قَضِیْبٌ مِنْ حَدِیْدٍ یعنی لوہے کی شاخ سے مراد تلوار ہے۔ اور یہ کہ اس کی امت بھی اُسی طرح صاحبِ شمشیر ہوگی، یعنی جہاد کرنے پر مأمور ہوگی سورۃ الفتح کے آخر والی آیتِ کریمہ: ﴿وَمَثَلُهُمْ فِی الْإِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهِ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ﴾۔ انجیل کی اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور انجیل کی ہمنوا ہو کر اعلان کرتی ہے کہ: محمد ﷺ صاحبِ سیف اور مأمور بالجہاد ہیں۔

توراۃ کی کتاب خامس باب تینتیس میں یہ آیت ہے: "اللہ تعالیٰ طورِ سینا سے آیا، ہم پر کوہِ سعیر سے طلوع ہوا اور کوہِ فاران میں ظاہر ہوا"۔

جس طرح اس آیت کے یہ الفاظ: "حق تعالیٰ طورِ سینا سے آیا" نبوتِ موسوی پر دلالت کرتے ہیں: اسی طرح "حق تعالیٰ کوہِ سعیر سے طلوع ہوا" کے الفاظ نبوتِ عیسویہ پر دلالت کرتے ہیں۔ (حاشیہ:۱)

اسی طرح "حق تعالیٰ کے کوہِ فاران سے ظاہر ہونے" والے الفاظ بہرصورت رسالتِ محمدی علیہ الصلاۃ والسلام پر دلالت کرتے ہیں۔ (حاشیہ:۲)

سورۃ الفتح کے آخر میں پائے جانے والے الفاظ "ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرَاةِ" میں پائے جانے والے حکم کی تورات میں تصدیق ملتی ہے کہ یہ آیت اُس نبی کے ساتھیوں کے بارے میں ہے جو عنقریب فاران کی پہاڑیوں سے ظاہر ہوگا۔ تورات کے الفاظ یہ ہیں: قدسیوں کا جھنڈا ان کے ساتھ اور ان کے دائیں ہاتھوں میں ہوگا۔ چنانچہ تورات ان کو قدسین کے نام کے ساتھ موصوف کرتی ہے۔ "یعنی ان کے صحابی قدسی اور اولیائے صالحین میں سے ہیں"۔

اِشَعْیَا نبی کی کتاب کے چوالیسویں باب میں یہ آیت ہے: "حق تعالیٰ آخری زمانے میں اپنے برگزیدہ بندے کو بھیجے گا اور اس کی طرف جبریل روح الامین کو بھیجے گا جو اسے اللہ کا دین سکھائے گا۔ اور وہ یہ دین لوگوں کو اسی طرح سکھائے

(حاشیہ:۱) سعیر شام میں پہاڑوں کا نام ہے۔ (حاشیہ:۲) فاران حجاز میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔

گا جس طرح جبریل نے اسے سکھایا ہو گا۔ اور وہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ وہ نور ہو گا جو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے گا۔ میں تمہیں ان چیزوں کی خبر ان کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے دے رہا ہوں جو مجھے میرے پروردگار نے بتائی ہیں''۔

یہ آیت نبی آخر الزمان کے اوصاف انتہائی صراحت کے ساتھ بیان کر رہی ہے۔

''میشائیل'' کے نام سے مشہور میخائیل پیغمبر کی کتاب کے چوتھے باب میں یہ آیت ہے: ''آخری زمانے میں امتِ مرحوم اُٹھے گی، وہ لوگ مبارک پہاڑ پر رہائش اختیار کریں گے تاکہ وہاں حق کی پرستش کر سکیں۔ وہاں ہر علاقے سے خلقِ کثیر جمع ہو جائے گی وہ سب ایک پروردگار کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے''

یہ آیت بالکل واضح طور پر جبلِ عرفات کا تعارف کرا رہی ہے جو کہ دنیا کے تمام پہاڑوں سے افضل ہے، اور ہر علاقے سے وہاں پہنچنے والے حجاج کرام کی تکبیروں کا اور ان کی عبادات کا تعارف کرا رہی ہے۔ اور اُمت مرحومہ کے نام سے مشہور و معروف اُمّتِ محمدیہ کا تعارف کرا رہی ہے۔

زبور کے بہترویں (72) باب میں یہ آیت ہے: (حاشیہ) یہ آیت بالکل واضح صورت میں فخرِ عالم ﷺ کے اوصاف بیان کر رہی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا داؤدؑ کے بعد محمد عربی ﷺ کے علاوہ کوئی ایسا نبی آیا جس نے اپنے دین کو مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا ہو؟ جس نے بادشاہوں پر جزیہ عائد کر دیا ہو۔ انہیں اس طرح سے اپنے زیرِ نگین کر لیا ہو کہ گویا وہ آپ ﷺ کے سامنے سجدے میں گرے ہوئے ہوں! ہر روز نوعِ بشر کے پانچویں حصے کے درود و سلام اور ان کی دعائیں ان کے حصے میں آتی ہیں اور جن کے انوار شہر سے جگمگائے؟ آپ ﷺ کے علاوہ کون ہے؟ کوئی آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو سامنے لا بھی کیسے سکتا ہے؟

یوحنا کے ترکی نسخہ کی انجیل کے چودھویں باب کی تیسویں آیت یہ ہے: ''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ

(حاشیہ) ''اس کی سلطنت سمندر سے سمندر تک اور دریائے فرات سے زمین کی انتہا تک ہوگی۔
بیابان کے رہنے والے اس کے آگے جھکیں گے اور اس کے دشمن خاک چاٹیں گے۔
یمن اور جزائر کے بادشاہ اس کو ہدیے بھیجیں گے۔
بلکہ سب بادشاہ اس کے آگے سرنگوں ہوں گے کُل قومیں اس کی مطیع ہوں گی۔
لوگ برابر اس کے حق میں دعا کریں گے۔
وہ دن بھر اُسے دعا دیں گے۔
اس کا نام ہمیشہ قائم رہے گا۔
جب تک سورج ہے اس کا نام رہے گا۔

کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے۔ اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں"

سردار سے مراد فخرِ عالم ہے اور فخرِ عالم محمد عربی ﷺ کا مشہور ترین عنوان ہے۔

یوحنا کی انجیل کے سولہویں باب کی ساتویں آیت یہ ہے: "لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے؛ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا"۔

اب دیکھو کہ رئیسِ عالم کون ہے اور لوگوں کو حقیقتاً تسلی دینے والا سوائے محمد عربی ﷺ کے اور کون ہے؟

جی ہاں؛ وہی فخر عالم ہیں، وہی فانی انسان کے مددگار، تسلی دینے والے اور اُسے ابدی طور پر معدوم ہو جانے سے بچاتے ہیں۔

اسی طرح یوحنا کی انجیل کے سولہویں باب کی آٹھویں آیت ہے: "اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا"۔

اور اب محمد عربی ﷺ کے علاوہ اور کون آیا جس نے آ کر فساد کو اصلاح میں بدل دیا دنیا کو غلطیوں سے اور شرک سے بچایا اور دنیا کی سیاست اور حاکمیت کو تبدیل کر دیا؟

اسی طرح انجیل یوحنا کے سولہویں باب کی گیارہویں آیت ہے۔ "دنیا کے سردار کے آنے کا وقت آ گیا ہے"۔ (حاشیہ)

بلاشبہ دنیا کے سردار سیّد البشر احمد و محمد ﷺ ہی ہیں۔

اسی طرح انجیل یوحنا سولہویں باب کی تیرہویں آیت یہ ہے: "لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا"۔

یہ آیت بالکل صریح ہے۔

پس محمد عربی ﷺ کے علاوہ اور کون ہے جو یکبارگی تمام لوگوں کو حقیقت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی تمام خبریں وحی سے حاصل کرتا ہے، جو کچھ جبریلؑ سے سنتا ہے اُس کا ذکر کرتا ہے اور قیامت اور آخرت کے بارے میں تفصیل سے خبر دیتا ہے؟ آپ ﷺ کے علاوہ کون ہے اور کون ہو سکتا ہے؟

اسی طرح ابنیاء کی کتابوں میں رسول اکرم ﷺ کے سُریانی اور عبرانی زبانوں میں ایسے نام آئے ہیں جو (محمد، احمد

(حاشیہ) جی ہاں! وہ معزز سردارِ عالم ایک ایسا سردار ہے، جس کے ساڑھے تیرہ سو سالوں میں ہر دور میں کم از کم ساڑھے تین سو ملین پیروکار رہے ہیں جو اُس کے اوامر کی کمال تسلیم و انقیاد کے ساتھ اطاعت کرتے ہیں، اور ہر روز اُن پر سلام بھیج کر ان کے ساتھ کی ہوئی اپنی بیعت کی تجدید کرتے ہیں۔ مؤلف۔

اور مختار) کا معنی دیتے ہیں۔ چنانچہ شعیبؑ کے صحیفوں میں آپ ﷺ کا نام "المشفح" ہے جو محمد ﷺ کے معنی میں ہے۔ اسی طرح تورات میں آپ ﷺ کا نام "مُنْحَمَنَّا" ہے جو محمد ﷺ کے معنی میں ہے۔ اسی طرح تورات میں آپ ﷺ کا نام "حمیاطا" بھی ہے جس کا معنی "حامی الحرم" ہے۔ زبور میں آپ ﷺ کا نام "المختار" آیا ہے۔ اسی طرح تورات میں آپ ﷺ کا نام "اَلْخَاتَمُ اَلْخَاتَمُ" آیا ہے اور تورات اور زبور دونوں میں آپ ﷺ کا نام "مُقِيْمُ السُّنَّةِ" آیا ہے۔ صحفِ ابراہیم اور تورات میں "ماذ ماذ" ہے اور پھر تورات میں "اَحِید" آیا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "اِسْمِيْ فِي الْقُرْآنِ مُحَمَّدٌ، وَفِي الْإِنْجِيْلِ اَحْمَدُ وَفِي التَّوْرَاةِ أُحَيْدٌ" ۔ اور اسی طرح انجیل میں نبی ﷺ کے اسمائے گرامی میں سے ایک نام "صَاحِبُ الْقَضِيْبِ وَالْهِرَاوَةِ" بھی ہے، یعنی تلوار اور لاٹھی والا۔

جی ہاں؛ تمام انبیائے کرام میں سے جو نبی صاحبِ سیف ہے اور جسے اپنی اُمت کے ساتھ مل کر جہاد کا حکم دیا گیا ہے وہ رسولِ اکرم ﷺ ہی ہیں۔

اسی طرح انجیل میں آپ ﷺ کو صاحب التاج کہا گیا ہے۔ جی ہاں؛ صَاحِبُ التَّاجِ کا سرنامہ رسول اکرم ﷺ کے لیے ہی خاص ہے؛ کیونکہ تاج کا مطلب ہے عمامہ یعنی سر پر لپٹنے والی چیز۔ قدیم دور میں عمومی اعتبار سے اقوامِ عالم میں عرب ہی سر پر کپڑا لپیٹتے اور باندھتے تھے۔ پس انجیل میں آنے والے لفظ "صَاحِبُ التَّاجِ" سے مراد قطعی طور پر رسول اکرم ﷺ ہی ہیں۔

اسی طرح انجیل میں "اَلْبَارَ قْلِيْط یا اَلْفَارَقْلِيْط" کا لفظ آیا ہے۔ انجیل کی تفاسیر کے مطابق اس کا معنی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ اور یہ اس نبی کا نام ہے جو آخر میں آئے گا اور لوگوں کو حق کی دعوت دے گا۔ انجیل میں ایک اور جگہ پر ہے: "عیسیٰؑ نے کہا: میں جا رہا ہوں تا کہ عالم کا سردار آ جائے"۔ (حاشیہ)

اب دیکھنا یہ ہے کہ عیسیٰؑ کے بعد رسول اکرم ﷺ کے علاوہ ایسا کون آیا ہے جو عالم کا سردار ہو، حق و باطل کے درمیان فرق کرتا ہو؟ ؟ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ شناخت دیتا ہو اور عیسیٰؑ کی جگہ لوگوں کی رہنمائی کرتا ہو؟

پس عیسیٰؑ اپنی اُمت کو دائماً خوشخبری دیتے ہیں اور انہیں خبر دے کر کہتے ہیں کہ اب میری ضرورت نہیں رہی کیونکہ میرے بعد ایک آنے والا آ رہا ہے۔ میں تو اس کا پیش رو اور اس کی خوشخبری دینے والا ہوں جیسا کہ یہ آیتِ کریمہ صراحت کرتی ہے۔ ﴿اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾۔

(حاشیہ) یوحنا، باب 14 آیت: 30۔ اور باب 16 آیت: 11۔ مترجم۔

جی ہاں؛ عیسیٰ انجیل میں اپنی اُمت کو بہت بار یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ دنیا کا سب سے اہم سردار عنقریب آیا ہی چاہتا ہے، اور اس سردار کو اس کے بعض ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

اور بلاشبہ وہ تمام نام سریانی اور عبرانی زبان میں ہیں جو بعض اہلِ تحقیق نے دیکھے بھی ہیں۔ (حاشیہ:۱) اور وہ سب کے سب ''احمد، محمد اور فارق بین الحق والباطل'' ہم معنی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ عیسیٰ بار بار احمد ﷺ، کے آنے کی خوشخبری دے رہے ہیں۔ (حاشیہ:۲)

سوال: اگر تم یہ کہو کہ: عیسیٰ آپ ﷺ کے بارے میں تمام انبیاء سے بڑھ کر خوشخبریاں کیوں دیتے ہیں؟ پھر دوسرے انبیاء تو صرف خبر دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں خوشخبری کم ہی دیتے ہیں؟ یعنی ان کی طرف سے بشارت کی صورت میں پیش گوئی کم ہی ملتی ہے، ایسا کیوں ہے؟

الجواب: اس لیے کہ احمد ﷺ ایک تو عیسیٰ کو یہودیوں کی ہولناک تکذیب اور خوفناک افترا پردازی سے بچاتے ہیں اور دوسرے ان کے دین کو بدصورت اور بے جی تحریفات سے محفوظ کرتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ ایک ایسی شریعت لے کر آئے ہیں جو اپنے احکام کے ذریعے شریعتِ عیسوی میں پائی جانے والی کمیوں کوتاہیوں کی تکمیل کرتی ہے اور بنی اسرائیل۔ جو کہ عیسیٰ کو پہچان نہیں پائے - کی شریعت کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان ہے۔ اسی بنا پر وہ بار بار یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ عالم کا سردار آرہا ہے۔

اور یوں تورات، انجیل، زبور اور انبیاء کے دیگر صحائف میں آخری زمانے میں آنے والے نبی کے بارے میں بہت سی آیات اور اہم بحثیں ملتی ہیں۔ جیسے کہ ہم نے ان میں سے بعض مثالوں کا ذکر کر دیا ہے۔ مزید یہ بھی یاد رہے کہ اس نبی کا ذکر ان کتابوں میں بہت سے ناموں کے ساتھ ہوتا ہے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ سیدنا محمد ﷺ کے علاوہ اور کون نبی آخر الزمان ہو سکتا ہے جس کے بارے میں تمام

(حاشیہ:۱) اولیا چلپی نامی مشہور سیاح نے بذاتِ خود حضرت شمعون صفا کے مزار میں ہرنی کی جلد پر لکھی ہوئی انجیل شریف سے یہ آیت پڑھی جو عیسیٰ پر رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں نازل ہوئی:

''اتیون'' ایک مولود'' آزربیون'' جو ابراہیم کی نسل سے ہوگا۔ ''بورفتون'' وہ نبی ہوگا

لُو غَسْلِیْن: وہ جھوٹا نہیں ہوگا

بیت اَفْرِوْلات: اُس کی جائے پیدائش مکہ ہوگی۔

کنہ کالُوشیر: صلاح کار ہوگا۔

تو نومنین مَوَامیت: ''لفظ ''موامیت'' محرف ہے۔ یہ لفظ اصل میں ''مُمَد'' ہے۔ اور لفظ ''ممد'' اصل میں ''محمد'' تھا۔'' مؤلف۔

(حاشیہ:۲) اس کا مبارک نام احمد، محمد ہوگا۔

لِسفدُ دِس: جو اس کی پیروی کریں گے

تا کر دَلیس: وہ اس عالم کی بنیاد بنیں گے

یسع بیت: اور وہ عالم کا سردار ہوگا۔ مؤلف

اور اگر تم اس طریقے سے بھی نہیں کر سکتے تو پھر قدیم دور کی لکھی ہوئی فصیح و بلیغ کتابوں سے استفادہ کرو، بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی اپنی مدد کے لیے بلالو اور قرآن کی نظیر لے آؤ اور اس طرح کا کوئی شاہکار سامنے لے آؤ۔

اور اگر ایسے بھی نہیں کر سکتے تو پھر تمام قرآن کی نظیر ضروری نہیں اس کی دس سورتوں جیسی دس سورتیں ہی لے آؤ۔

اور اگر تم اس کی دس سورتوں کی صحیح حقیقی نظیر نہیں لا سکتے تو پھر فصاحت و بلاغت پر مشتمل کوئی سا بھی کالم جوڑ لاؤ اگرچہ بے اصل قصوں کہانیوں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو! لیکن یہ ہے کہ وہ نظم و بلاغت میں ان دس سورتوں کا مثیل و نظیر ہو۔ ایسا کر لاؤ!

اور اگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر اس کی ایک سورت جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سورت لمبی ہو، چھوٹی سی بھی ہو سکتی ہے، بس بنا لاؤ۔ وگرنہ تمہارا دین اور تمہاری روحیں، تمہارے اموال اور تمہارے اہل و عیال دنیا و آخرت میں خطرے کی زد میں ہیں۔

یوں قرآنِ حکیم نے تمام جن و انس کو لاجواب کرنے کی شکل میں صرف تیس سال چیلنج نہیں کیا بلکہ ساڑھے تیرہ سو سال سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اُس دور میں اُن کافروں نے اپنے آپ کو، اپنے اموال کو اور اپنے اہل و عیال کو ہلاکت میں ڈالنا گوارہ کر لیا اور جنگ و جدل جیسا خطرناک راستہ اختیار کر لیا اور معارضے و مقابلے جیسا آسان اور مختصر راستہ چھوڑ دیا۔ اس سے پتا چلا کہ معارضے کا راستہ ممکن نہیں تھا۔

تو کیا کوئی عقلمند آدمی اور خاص طور پر جزیرۂ عرب میں رہنے والی قوم اور خاص کر اس دور میں قریش جیسی ذہین قوم یہ آسان اور مختصر راستہ چھوڑ سکتی تھی؟ ان کے لیے یہ کام تو بہت آسان تھا کہ اُن میں سے کوئی ادیب قرآن کی کسی چھوٹی سی سورت جیسی کوئی سورت بنا لیتا اور انہیں قرآن پاک کے حملوں سے محفوظ کر لیتا، اور یوں وہ لوگ یہ مختصر اور آسان راستہ اختیار کر کے اپنے اموال، جانیں اور اپنے اہل و عیال کو بچا لیتے؟ کیا یہ کام مشکل تھا؟ ہرگز نہیں۔

الحاصل، وہ لوگ جب الفاظ و حروف کے ساتھ معارضہ نہ کر سکے تو لاچار ہو کر سیف و سنان لے کر میدان میں اُتر آئے! جیسا کہ جاحظ نے کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: بعض محقق علمائے کرام یہ کہتے ہیں کہ: ''قرآن کریم کی پوری سورت تو رہی ایک طرف ایک آیت کا، بلکہ ایک جملے کا بلکہ ایک کلمے کا معارضہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ایسا ہوا بھی نہیں ہے''۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے اقوال مبالغے سے خالی نہیں اور عقل انہیں قبول نہیں کرتی ہے؛ کیونکہ بشر کے کلام میں ایسے بہت سے جملے پائے جاتے ہیں جو قرآن کے جملوں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔ اس قول کا کیا معنی ہے اور اس میں کیا حکمت ہے؟

الجواب: اعجازُ القرآن کے بارے میں دو مذہب ہیں:

پہلا مذہب: یہ اکثر، غالب اور راجح مذہب ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآن کی بلاغت کے لطائف اور اس کے معانی کی امتیازی خصوصیات بشری طاقت سے باہر ہیں۔

دوسرا مذہب: یہ مذہب مرجوح ہے، اور وہ یہ کہ قرآن کی کسی بھی سورت کا معارضہ بشری طاقت کے دائرے میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت سلب کر لی ہے تاکہ قرآن رسولِ گرامی ﷺ کا معجزہ بن جائے۔ بالکل ایسے کہ جیسے کوئی انسان کھڑا تو ہوسکتا ہو لیکن اگر کوئی نبی اُسے معجزے کا اظہار کرنے کے لیے کہے کہ: تو کھڑا نہیں ہوسکتا، تب وہ کھڑا نہ ہوسکے تو یہ ایک معجزہ ہوگا۔ اس مرجوح مذہب کو ''صرفہ'' کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو قرآن کی کسی سورت جیسی سورت بنانے سے موڑ دیا تھا: یعنی ان کی طاقت سلب کر لی تھی۔ اگر اللہ اُن کی طاقت سلب نہ کرتا تو وہ ایک آدھ سورت لازماً بنا لیتے۔

اس مذہب کی رُو سے اُن علماء کا قول حق ہے جو کہتے ہیں کہ: ''قرآن کے ایک کلمے کا بھی معارضہ نہیں ہوسکتا''۔ کیونکہ اگر اعجاز کا اظہار کرنے کے لیے انہیں اللہ نے ہی روک دیا ہے تو وہ معارضے کے لیے منہ نہیں کھول سکتے۔ اور اگر منہ کھول لیتے تو اللہ کے حکم کے بغیر ایک کلمہ بھی نہ نکال سکتے۔

لیکن پہلا مذہب جو کہ راجح ہے اور اکثر علماء کا اختیار کردہ ہے، اس مذہب کے مطابق بھی اس فکر کا ایک دقیق پہلو ہے، اور وہ یہ ہے کہ: قرآنِ حکیم کے جملے اور کلمات ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، چنانچہ کبھی ایک کلمہ دس جگہوں پر نگاہ جمائے ہوتا ہے اور اس طرح اس میں دسیوں مناسبات اور بلاغت کے دسیوں نکات موجود ہوتے ہیں جیسے کہ ہم نے اپنی ''اشارات الاعجاز'' نامی تفسیر میں سورۂ فاتحہ کے اور ﴿الٓمّٓ ، ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کے بعض جملوں کے درمیان اس کی کچھ مثالیں بیان کر دی ہیں۔

مثال کے طور پر:

ایک عظیم الشان محل جس کے در و دیوار پر انوکھی، خوبصورت و دل آویز مینا کاری اور زیبائش و آرائش کی گئی ہو، اس محل میں ایک ایسا پتھر نصب کرنا ہو جو اُن مختلف اور متعدد نقوش ونگار کے لیے مرکزی حیثیت کا کام دے، اور اُسے ایسی مناسب جگہ پر نصب کرنا ہو جہاں سے وہ تمام نقوش ونگار کو بیک وقت دیکھ سکتا ہو؛ بلاشبہ اس کام کے لیے محل کے تمام در و دیوار اور اُن کے تمام نقوش ونگار کی معرفت ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح انسان کی آنکھ کے ڈیلے میں عین صحیح اور مناسب جگہ پر پتلی کو نصب کرنا اس بات پر موقوف ہے اور اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام جسم کی تمام مناسبتوں کا اور اُس کے عجیب و غریب وظائف کا علم ہو اور آنکھ کے تمام جسم کے

وظائف کے ساتھ تعلق رکھنے والے اوضاع واطوار اور حالات وکیفیات کی پہچان ہو۔

ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر یہ سمجھیں کہ حقائق کے بارے میں بہت آگے نکل جانے والے بعض اہلِ حقیقت نے قرآن کے کلمات کے مابین بہت سی ایسی مناسبات اور بہت سے ایسے روابط کی اور ایسے پہلوؤں کی وضاحت کی ہے جو تمام آیتوں اور جملوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ خاص کر ماہرینِ علم الحروف تو اس ضمن میں بہت آگے نکل گئے ہیں، چنانچہ ان لوگوں نے قرآن کے ایک ایک حرف میں اتنے اسرار و رموز بیان کیے ہیں جو ایک ایک صفحے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اس علم کے ساتھ شغف رکھنے والوں کے لیے انہوں نے یہ حقائق ثابت کر دیے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ قرآن چونکہ ہر چیز کے خالق کا کلام ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ اس کا ہر کلمہ دل اور گٹھلی کا حکم رکھتا ہو۔ اور یوں وہ کلمہ ایک معنوی جسم کے لیے دل کا اور ایک معنوی درخت کے لیے گٹھلی کا حکم رکھتا ہو، یعنی ممکن ہے کہ دل کے ساتھ مشابہت رکھنے والے اس ایک کلمے کے اردگرد اسرار و رموز کا ایک جسم بن جائے، اور گٹھلی کے ساتھ مشابہت رکھنے والے اس ایک کلمے سے اسرار و معانی کا ایک درخت اُگ آئے!

اسی بنا پر یہ ممکن ہے کہ:

ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے کلام میں کچھ کلمات و آیات بلکہ کچھ جملے پائے جاتے ہوں جو قرآنی کلمات کے ساتھ مشابہت رکھتے ہوں! لیکن قرآنی کلمات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسی مناسب جگہ پر اور اس طرح سے فِٹ کر دیے گئے ہیں کہ بہت سی مناسبات کے پیشِ نظر اُن کا کسی ہمہ گیر علم کی رُو سے اس مناسب جگہ پر آنا لازم ہو جاتا ہے۔

تیسرا نکتہ:

ایک وقت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے میرے دل پر یہ احسان کیا کہ قرآنِ معجز بیان کی ماہیت کا خلاصۃ الخلاصہ اجمالی طور پر ایک حقیقی تفکر کی صورت میں عربی زبان میں وارد کر دیا۔

وہ تفکر یہاں پر ہم بعینہٖ عربی زبان میں لکھتے ہیں پھر اس کے معنی کی وضاحت کریں گے اور وہ یہ ہے:

سُبْحَانَ مَنْ شَهِدَ عَلَى وَحْدَانِيَّتِهِ، وَ صَرَّحَ بِأَوْصَافِ جَمَالِهِ وَجَلَالِهِ وَكَمَالِهِ، اَلْقُرْآنُ الْحَكِيْمُ الْمُنَوَّرُ جِهَاتُهُ السِّتُّ، اَلْحَاوِيْ لِسِرِّ إِجْمَاعِ كُلِّ كُتُبِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْاَوْلِيَاءِ وَالْمُوَحِّدِيْنَ الْمُخْتَلِفِيْنَ فِي الْاَعْصَارِ وَالْمَشَارِبِ وَالْمَسَالِكِ، اَلْمُتَّفِقِيْنَ بِقُلُوْبِهِمْ وَعُقُوْلِهِمْ عَلَى تَصْدِيْقِ أَسَاسَاتِ الْقُرْآنِ، وَكُلِّيَّاتِ اَحْكَامِهِ، عَلَى وَجْهِ الْاِجْمَالِ، وَهُوَ مَحْضُ الْوَحْيِ بِإِجْمَاعِ الْمُنْزِلِ وَالْمُنْزَلِ وَالْمُنْزَلِ عَلَيْهِ، وَعَيْنُ الْهِدَايَةِ، وَمَعْدَنُ اَنْوَارِ الْاِيْمَانِ بِالضَّرُوْرَةِ، وَمَجْمَعُ الْحَقَائِقِ بِالْيَقِيْنِ، وَمُوْصِلٌ اِلَى السَّعَادَةِ بِالْعِيَانِ، وَذُو الْاَثْمَارِ الْكَامِلِيْنَ بِالْمُشَاهَدَةِ، وَمَقْبُوْلُ الْمَلَكِ وَالْاِنْسِ وَالْجَانِّ بِالْحَدْسِ الصَّادِقِ، مِنْ تَفَارِيْقِ الْاَمَارَاتِ، وَالْمُؤَيَّدِ بِالدَّلَائِلِ

الْعَقْلِيَّةِ بِاتِّفَاقِ الْعُقَلَآءِ الْكَامِلِيْنَ، وَالْمُصَدَّقُ مِنْ جِهَةِ الْفِطْرَةِ السَّلِيْمَةِ بِشَهَادَةِ اِطْمِئْنَانِ الْوِجْدَانِ، وَالْمُعْجِزَةُ الْاَبَدِيَّةُ الْبَاقِيْ وَجْهُ اِعْجَازِهٖ عَلٰى مَرِّ الزَّمَانِ بِالْمُشَاهَدَةِ، وَالْمُنْبَسِطُ دَائِرَةُ اِرْشَادِهٖ مِنَ الْمَلَاِ الْاَعْلٰى اِلٰى مَكْتَبِ الصِّبْيَانِ، يَسْتَفِيْدُ مِنْ عَيْنِ الدَّرْسِ الْمَلٰٓئِكَةُ مَعَ الصَّبِيِّيْنَ، وَكَذَا هُوَ ذُوْا الْبَصَرِ الْمُطْلَقِ يَرَى الْاَشْيَاءَ بِكَمَالِ الْوُضُوْحِ وَالظُّهُوْرِ، وَيُحِيْطُ بِهَا وَيُقَلِّبُ الْعَالَمَ فِيْ يَدِهٖ، وَيُعَرِّفُهُ لَنَا، كَمَا يُقَلِّبُ صَانِعُ السَّاعَةِ السَّاعَةَ فِيْ كَفِّهٖ، وَيُعَرِّفُ لِلنَّاسِ۔۔۔ فَهٰذَا الْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ الشَّانِ هُوَ الَّذِيْ يَقُوْلُ مُكَرَّرًا:﴿اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔۔۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾۔

ا۔اس عربی تفکر کا ترجمہ اور ماحصل یہ ہے کہ:

قرآن معجز بیان کی جہات ستہ تابندہ وتابناک اور منور ہیں۔اس لیے ان میں اوہام وشبہات بار نہیں پاسکتے؛ کیونکہ اس کی کمر نے ٹیک عرش پر لگائی ہوئی ہے، اور اس جہت میں وحی کا نُور ہے۔اُس کے آگے والی جہت میں اور اس کے ہدف میں سعادتِ دارین ہے، چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ آگے ابد وآخرت کی طرف بڑھایا ہوا ہے۔اور وہاں جنت اور نورِ سعادت ہے۔اس کے اوپر اعجاز کا سِکہّ اور طرّ ائے امتیاز ہے۔اس کے نیچے دلیل و برہان کے ستون ہیں۔اس کا باطن خالص ہدایت ہے۔اس کی دائیں جہت ﴿اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ﴾ کے قول سے عقلوں کو بلواتی ہے اور اُن سے ''صَدَقْتَ'' کہلوا کر انہیں تصدیق کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔وہ اپنی بائیں جہت سے دلوں کو روحانی اذواق عطا کرتا ہے اور وجدان کو گواہ بنا کر اس سے ''بَارَكَ اللّٰهُ'' کہلواتا ہے۔تو پھر اس قرآنِ معجز بیان میں اوہام وشبہات کا چور کس کونے سے داخل ہوگا؟

جی ہاں؛ بلاشبہ قرآن معجز بیان مختلف ادوار کے مختلف مشارب ومسالک کے حامل انبیاء، اولیاء اور موحدین کی کتابوں کو یکجا کرنے والے راز کا جامع ہے؛ مطلب یہ کہ: ان اہلِ دل واہلِ عقل لوگوں نے اپنی کتابوں میں قرآن کی بنیادوں کا اور اس کے اجمالی احکام کا کچھ اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ ان بنیادوں کی تصدیق کر دی ہے اور انہیں قبول کر لیا ہے۔گویا کہ یہ لوگ قرآن کے آسمانی درخت کے لیے جڑوں کا حکم رکھتے ہیں۔

اسی طرح قرآن حکیم وحی کا سہارا لیتا ہے، اور وہ خالص وحی ہے؛ کیونکہ اسے نازل کرنے والا اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ قرآن وحی ہے۔اور اس چیز کا اثبات وہ معجزاتِ محمدیہ کے ساتھ کرتا ہے۔اور نازل کیے جانے والا قرآن بھی اپنے معجزانہ انداز کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ عرش سے نازل ہوا ہے۔اور رسول اکرم ﷺ جن پر یہ نازل ہوا ہے، وحی کے آغاز میں ان پر طاری ہونے والا غم اور گھبراہٹ، اُن کا بے ہوش ہو جانا اور ان کا ہر ایک سے بڑھ کر قرآن کا احترام کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اَزل سے وارد ہونے والی وحی ہے جو مہمان بن کر ان پر اتر رہی ہے۔

اسی طرح یہ قرآن بداہتاً خالص ہدایت ہے، کیونکہ اس کا مخالف مشاہدے کی رُو سے کفر وضلالت ہے۔

اسی طرح قرآن ضرورتاً انوارِ قرآن کا معدن ہے؛ کیونکہ انوارِ ایمان کا عکس قطعی طور پر ظلمات ہیں اور یہ چیز ہم بہت سے مقالات میں ثابت کر چکے ہیں۔

اسی طرح قرآن یقیناً مجمع الحقائق ہے، اس لیے خیالات وخرافات اس میں راہ نہیں پا سکتے اور اُس نے جو حقیقت بدوش عالمِ اسلام کی بنیاد رکھی ہے۔ جو اسلامی شریعت ظاہر کی ہے اور جو بلند پایہ کمالات آشکار کیے ہیں، ان سب کی گواہی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے عالمِ غیب کے ساتھ تعلق رکھنے والے مباحث بھی عین حقائق ہیں، اُن میں خلافِ حقیقت کوئی چیز نہیں، بالکل ایسے جیسے کہ اُس کے وہ مباحث عالمِ شہادت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

اسی طرح قرآن نوعِ بشر کو سعادت دارین تک پہنچا دیتا ہے اسے بلا شبہ سرِ عام دھکیلتا ہوا وہاں تک لے جاتا ہے۔ جسے اس بات میں شبہ ہو وہ ایک دفعہ قرآن پڑھ کر اور سُن کر دیکھ لے۔ پھر دیکھے کہ کیا کہتا ہے؟

پھر قرآن نے جو پھل دیے ہیں وہ مکمل اور زندگی سے بھرپور ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اصل درخت حقیقت میں گڑھا ہوا ہے اور زندگی سے بہرہ ور ہے؛ کیونکہ پھل کا زندہ ہونا اس چیز کی دلیل ہے کہ درخت زندہ ہے۔ چاہو تو اُن اُصفیاء واولیاء پر ایک نظر ڈال سکتے ہو جو قرآن نے زندگی سے بھرپور چمکتے دمکتے پھلوں کی صورت میں ہر دور میں عطا کیے ہیں۔

اسی طرح قرآن لامحدود متفرق علامات سے جنم لینے والی قناعت اور حدسِ صادق کی رُو سے جن وانس وملائک کے ہاں مقبول ومرغوب ہے۔ کیونکہ جب اس کی تلاوت ہوتی ہے تو وہ پروانوں کی طرح اس کے اردگرد اہو جاتے ہیں۔

اسی طرح قرآن وحی ہونے کے ساتھ ساتھ عقلی دلائل کی قوت اور تائید سے بھی مزین ہے۔ جی ہاں؛ عُقلائے کاملین کا اتفاق اس حقیقت کا گواہ ہے۔ کیونکہ ابن سینا اور ابن رشد جیسے متبحر متکلمین وفلاسفہ نے اپنے اصول ودلائل کے ساتھ بالاتفاق قرآنی بنیادوں کو ثابت کر دیا ہے۔

اسی طرح قرآن کی فطرتِ سلیم کی جہت سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی عارضہ یا بیماری رکاوٹ نہ بن رہی ہو تو ہر فطرتِ سلیم اس کی تصدیق کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فطرت سلیم وجدان کے اطمینان کی گواہی کے ذریعے قرآن کی تصدیق کرتی ہے۔

جی ہاں؛ سلیم فطرتیں زبانِ حال سے قرآن کو مخاطب کر کے کہتی ہیں: ہماری فطرت کا کمال آپ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس حقیقت کا اثبات ہم بہت سی جگہوں پر کر چکے ہیں۔

اسی طرح قرآن بالمشاہدہ اور بدیہی طور پر ایک ابدی اور دائمی معجزہ ہے۔ یہ اپنے اعجاز کا اظہار ہمہ وقت کرتا رہتا ہے۔ اور یہ لازوال اور ابدی ہے، دوسرے معجزات کی طرح نہ تو بجھنے پائے اور نہ ہی اس کا وقت ختم ہوگا۔

اسی طرح قرآن کریم کا رہنمائی کرنے میں مرتبہ اتنا وسیع وعریض اور ہمہ گیر ہے کہ اس کے ایک درس میں جبریلؑ ایک نوخیز بچے کے پہلو میں بیٹھتے ہیں اور دونوں بیک وقت وہ درس سنتے ہیں اور دونوں دوش بدوش بیٹھ کر اس درس سے اپنا اپنا حصہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ابن سینا جیسا زیرک ترین فلسفی اور ناظرہ پڑھنے والا ایک سیدھا سادھا آدمی عین وہی درس پڑھتے ہیں اور پہلو بہ پہلو بیٹھ کر اپنا اپنا حصہ لے لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات وہ عام آدمی اپنی قوتِ ایمان اور صفائے ایمان کے لحاظ سے ابنِ سینا سے زیادہ فائدہ اُٹھالیتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں ایک ایسی آنکھ پائی جاتی ہے جو تمام کائنات کو دیکھتی اور اس کا احاطہ کرتی ہے اور کائنات کو اپنے سامنے رکھ کر اس کے تمام طبقات وعوالم کو آشکار کرتی ہے، بالکل ایسے جیسے کسی کتاب کے صفحات الٹا پلٹا کر دیکھے جاتے ہیں۔ جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی الٹا پلٹا کر دیکھتا ہے، اسے کھولتا ہے، اس کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور اس کی جان پہچان کرتا اور کرواتا ہے؛ اسی طرح قرآن کریم نے عالمِ ہستی کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے اور اس کے ساتھ یہی بیوپار کرتا ہے۔ یہی قرآن ہے جو کہتا ہے ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ اور وحدانیت کا اعلان کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْآنَ لَنَا فِي الدُّنْيَا قَرِينًا، وَفِي الْقَبْرِ مُؤْنِسًا، وَفِي الْقِيَامَةِ شَفِيعًا، وَعَلَى الصِّرَاطِ نُورًا وَمِنَ النَّارِ سِتْرًا وَحِجَابًا وَفِي الْجَنَّةِ رَفِيقًا وَإِلَى الْخَيْرَاتِ كُلِّهَا دَلِيلًا وَإِمَامًا۔

اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ قُلُوبَنَا وَقُبُورَنَا بِنُورِ الْإِيمَانِ وَ الْقُرْآنِ وَ نَوِّرْ بُرْهَانَ الْقُرْآنِ بِحَقِّ وَ بِحُرْمَةِ مَنْ أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ. عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مِنَ الرَّحْمَانِ الْحَنَّانِ آمِينَ

☆ ☆ ☆

انیسواں بلاغی اشارہ

سابقہ اشارات میں بلاشبہ قطعی طور پر یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ رسول اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پس محمد عربی ﷺ جن کی رسالت ہزاروں قطعی دلائل کی رُو سے ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، وحدانیتِ الٰہی اور سعادتِ ابدی کی ایک روشن ترین دلیل اور قطعی ترین برہان ہے۔

اس اشارے میں ہم اس روشن و درخشاں دلیل اور ناطقِ صادق برہان کی خلاصۃ الخلاصہ کی شکل میں انتہائی اجمال کے ساتھ تعریف پیش کریں گے؛ کیونکہ اگر وہ دلیل ہے، اور دلیل کا نتیجہ اللہ کی معرفت ہے تو پھر اس دلیل کی پہچان ضروری ہے اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ دلیل دلالت کس طرح کرتی ہے! بنا بریں ہم انتہائی مختصر خلاصے کے ذریعے اس دلیل کی صحت اور اس کی دلالت کے پہلو کی وضاحت کریں گے۔

اور وہ اس طرح کہ رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی اس کائنات کے موجودات کی طرح خالقِ کائنات کے وجود

اور اس کی وحدت پر دلالت کرتی ہے، اور موجودات کی اس دلالت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زبانِ مبارک کے ساتھ اپنی اس ذاتی دلالت کا اعلان کرتے ہیں۔ آپ ﷺ جب ایک دلیل ہیں تو ہم اس دلیل کی صحت و استواری اور اس کی صداقت وحقانیت کی طرف پندرہ بنیادوں کی صورت میں اشارہ کریں گے۔

پہلی بنیاد:

اپنی ذات، زبان اور اپنے حال وقال کی دلالت کے ساتھ صانعِ کائنات پر دلالت کرنے والی یہ دلیل کائنات کی حقیقت کی تصدیق کی وجہ سے ایک صادق ومصدّق دلیل ہے؛ کیونکہ موجودات کی وحدانیت پر دلالتیں وحدانیت کے قائل انسان کے لیے تصدیق کا حکم رکھتی ہیں۔ پس وہ تصدیقِ کائنات کی تصدیق کی بنا پر اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

اسی طرح آپ ﷺ کمالِ مطلق کی حامل وحدانیتِ الٰہیہ کے بارے میں، اور خیرِ مطلق کی حامل ابدی سعادت کے بارے میں جو کچھ بیان کرتے ہیں، اُس بیان میں بالکل سچے ہیں؛ کیونکہ یہ دعویٰ عالم ہستی کے حقائق کے حسن وجمال کے عین مطابق اور اس کے کمال کے بالکل مطابق ہے۔ پس رسول اکرم ﷺ وحدانیت الٰہی اور سعادت ابدی کی ایک ناطق وصادق ومصدّق برہان ہیں۔

دوسری بنیاد:

یہ صادق ومصدّق دلیل چونکہ ہزاروں معجزوں کی، ایک منسوخ نہ ہونے والی شریعت کی اور تمام انبیاء سے بڑھ کر تمام جنّ وانس کے لیے ایک ہمہ گیر دعوی رکھنے والی دلیل ہے؛ اس لیے بلاشبہ وہ ان سب کے سردار ہیں۔ پس اس بنا پر آپ ﷺ تمام انبیاء کے اتفاق اور ان کے معجزات کے اسرار کے جامع ہیں۔ یعنی ان تمام انبیاء کے اِجماع کی قوت اور اُن کے معجزات کی شہادت آپ ﷺ کی صداقت وحقانیت کا اور آپ ﷺ کے دعوے کے درست ہونے کا مرکزی نقطہ ہے۔

پھر آپ ﷺ ان تمام اولیاء کے سردار اور تمام اصفیاء کے استاد ہیں جنھوں نے آپ ﷺ کی عطا کردہ تربیت، رہنمائی اور آپ ﷺ کی شریعت کی روشنی میں کہا اور سنا ہے گویا کہ آپ ﷺ اُن کی کرامتوں کے اور ان کی تحقیقات کی قوّت کے جامع ہیں؛ کیونکہ یہ لوگ عین اسی راستے پر چلے ہیں جو ان کے استاد نے کھولا ہے۔ اور اس نے ان کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے اس لیے وہ حقیقت کو پاگئے ہیں۔

پس ان کی تمام کرامتیں اور ان کے اجماع کی تمام تحقیقات ان کے قدسیت مآب استاد کی صداقت اور حقانیّت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اسی طرح وحدانیت کی یہ برہان بہت سے قطعی یقینی اور واضح معجزات خارق عادت اِرہاصات اور نبوت کے شکوک و

شبہات سے بالاتر دلائل کی حامل ہے۔ جیسا کہ ہم سابقہ اشارات میں دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ دلائل و معجزات آپ ﷺ کی اس طرح کی تصدیق کرتے ہیں کہ تمام کائنات مل کر بھی اس تصدیق کو باطل نہیں کر سکتی۔

تیسری بنیاد:

وحدانیت و یکتائی کی دعوت دینے والا اور ابدی سعادت کی خوشخبری دینے والا ان تابندہ معجزات کا مالک اپنی مبارک ذات میں اخلاقِ عالیہ کا، اپنے وظیفۂ رسالت میں بلند پایہ خوبیوں کا اور اپنے تبلیغ کردہ دین اور شریعت میں ایسے بلند ترین خصائل کا مالک ہے کہ شدید ترین دشمن بھی ان کی تصدیق کرتے ہیں اور انہیں انکار کرنے کی گنجائش نہیں ملتی ہے۔ پس جب اُن کی ذات میں، وظیفے میں اور دین میں بلند ترین وخوبصورت ترین اخلاق، بلند ترین اور کامل ترین خوبیاں اور بلند ترین و خوبصورت ترین عادات و خصائل پائے جاتے ہیں، تو پھر وہ ذات موجودات میں پائے جانے والے تمام کمالات اور اخلاقِ عالیہ کی بہترین مثال ہے، مُمثّل ہے، تمثال ہے اور استاد ہے۔ پس آپ ﷺ کی ذات میں، وظیفے میں اور آپ ﷺ کے دین میں پائے جانے والے یہ کمالات آپ ﷺ کی صداقت وحقانیت کا ایک ایسا نقطۂ استناد ہیں جو کسی بھی جہت سے ڈگمگاتا نہیں۔

چوتھی بنیاد:

وحدانیت اور سعادت کا یہ دعوت گر اور معدنِ کمالات اور اخلاقِ عالیہ کا معلم ہے، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا بلکہ اُس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

جی ہاں؛ اس کی طرف خالقِ کائنات کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ پہلے وہ اپنے استادِ اَزلی سے پڑھتا ہے پھر پڑھاتا ہے۔ کیونکہ خالقِ کائنات نے نبوّت کے ہزاروں دلائل کے ساتھ۔ جن میں سے کچھ سابقہ اشارات میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ اور ان معجزات کو پیدا کرنے کے ساتھ یہ بات ثابت کر دی ہے کہ: اس کا معزز رسول اس کی طرف سے اور اس کے لیے بولتا ہے اور اس کے کلام کو آگے پہنچاتا ہے۔

اسی طرح قرآن جو اس پر نازل ہوتا ہے اپنے ظاہر و باطن کے اعجاز کے چالیس پہلوؤں سے ثابت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ترجمان ہیں۔

اسی طرح وہ خود بھی اپنی ذات مبارکہ میں پائے جانے والے اخلاص، تقویٰ، سنجیدگی، امانت اور اپنے تمام احوال و اطوار کے ساتھ یہ ثابت کرتے ہیں کہ: وہ اپنے شخصی نام سے اور اپنی ذاتی رائے سے نہیں بولتے بلکہ اپنے خالق وآفریدگار کے نام سے بولتے ہیں۔

اسی طرح وہ تمام اہلِ حقیقت جنہوں نے آپ ﷺ کی بات سنی ہے، ان سب نے کشف و تحقیق کے ذریعے

آپ ﷺ کی تصدیق کی ہے، اور یقین کی روشنی میں اس بات کو مان گئے ہیں کہ: وہ اپنی طرف سے نہیں بولتے بلکہ انہیں خالقِ کائنات بلواتا ہے، پڑھاتا ہے اور اس کے ذریعے لوگوں کو پڑھاتا ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی صداقت اور حقانیت ان چار انتہائی مضبوط بنیادوں پر اعتماد کرتی ہے اور ان کے سہارے کھڑی ہے۔

پانچویں بنیاد:

اَزلی کلام کے یہ ترجمان روحوں کو دیکھتے ہیں، فرشتوں کے ساتھ سرگوشی کرتے ہیں اور جن وانس کی رہنمائی کرتے ہیں وہ اپنا علم جن وانس کے عالم کے اُوپر سے نہیں بلکہ عالمِ ارواح اور عالمِ ملائکہ سے بھی اُوپر کے عالم سے حاصل کرتے ہیں وہ ان عوالم سے کہیں اُوپر کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور وہیں سے اطلاع پاتے ہیں۔ آپ ﷺ کے ان مذکورہ معجزات نے، اور آپ ﷺ کے تواتر سے ثابت ہو جانے والے اَطوارِ حیات نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے۔

اس سے پتا چلا کہ کاہن اور ان جیسے دیگر پیش گوئیاں کرنے والے لوگ، جن، روحیں اور مقرب فرشتے بھی آپ ﷺ کی دی ہوئی خبروں میں دخل انداز نہیں ہو سکتے، سوائے جبریلؑ کے جو اکثر اوقات میں آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کبھی جبریل سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔

چھٹی بنیاد:

جن وانس کا یہ سردار کائنات کے درخت کا روشن ترین اور اکمل ترین پھل، رحمتِ الٰہی کی ایک نادر تمثال، محبتِ ربانی کی مثال، روشن ترین بُرہانِ حق، تابندہ ترین چراغِ حقیقت، طلسم کائنات، کشّافِ معنیٔ تخلیق، شارح حکمتِ عالم، رہنمائے سلطنتِ الٰہی، اور صنعتِ ربّانی کے محاسن کا بہترین وصّاف ہے اور ہمہ گیر استعداد وقابلیت کی جہت سے موجودات میں پائے جانے والے کمالات کا کامل ترین نمونہ ہے۔

پس اس کے یہ اوصاف اور اس کی یہ معنوی شخصیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ وہ اس کائنات کی علّتِ غائی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس کائنات کے خالق وآفریدگار نے اس ''سردارِ عالم'' کی طرف دیکھا تو کائنات پیدا کی، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر وہ انہیں پیدا نہ کرتا تو کائنات کو بھی پیدا نہ کرتا۔

جی ہاں؛ وہ قرآنی حقائق اور ایمانی انوار جنہیں وہ جن وانس کی طرف لے کر آئے اور وہ اخلاقِ عالیہ اور کمالاتِ سامیہ جو آپ ﷺ کی ذات میں نظر آتے ہیں، سب کے سب اس حقیقت کے قطعی گواہ ہیں۔

ساتویں بنیاد:

بلاشبہ اس برہانِ حق اور سراجِ حقیقت نے ایک دین اور ایسی شریعت کا اظہار کیا ہے جن میں سعادتِ دارین کی ضمانت دینے والے تمام قوانین ودساتیر پائے جاتے ہیں۔ اور اس دین اور شریعت نے جامع اور ہمہ گیر ہونے کے ساتھ

ساتھ کائنات کے حقائق و وظائف اور اس کے خالق کے اسماء و صفات کو کمال حقانیت کے ساتھ واضح کیا ہے۔ یہ اسلام اور یہ شریعت دونوں ہمہ گیر اور کامل و مکمل ہیں اور وہ کائنات کے ساتھ ساتھ اُس کے خالق کی بھی پہچان رکھتے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ جو ان دونوں کو ذرا گہری نظر سے دیکھے گا قطعی طور پر جان جائے گا کہ یہ دین اور یہ شریعت دونوں ہی اس خوبصورت کائنات کے صانع کا بیان اور اس کی پہچان کا ذریعہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اس کائنات کی پہچان بھی کراتا ہے۔

جیسے کسی محل کو بنانے والا کاریگر اس محل کا ایک مناسب سا تعارف تیار کرتا ہے اور اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی ذات نمایاں کرنے کے لیے ایک کیفیت نامہ بھی لکھ دیتا ہے اسی طرح دینِ محمدی اور شریعتِ محمدی دونوں میں ایک ایسا احاطہ اور ہمہ گیریت، بلندی اور حقیقت نظر آتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان دونوں کا ظہور اس کائنات کے خالق اور مدبّر کی طرف سے ہوا ہے۔ اور یہ کہ جس نے اس کائنات کو خوبصورت نظم وضبط دیا ہے وہی ہے جس نے اس کو بھی خوبصورت نظم وضبط دیا ہوا ہے۔

جی ہاں؛ یہ کامل ترین نظام اسی خوبصورت ترین نظم وضبط کا تقاضا کرتا ہے۔

آٹھویں بنیاد:

محمد عربی ﷺ جو کہ ان مذکورہ صفات سے متصف ہیں اور ہر جہت سے مضبوط قوی نقطہ ہائے استناد پر تکیہ کناں ہیں، عالمِ غیب کی ترجمانی کرتے ہوئے عالمِ شہادت کی طرف متوجہ ہو کر برسرِ جن وانس اعلان کرتے ہیں اور مستقبل میں آنے والے زمانوں کے پیچھے منتظر کھڑی اقوام و مِلَل کو مخاطب کرتے ہیں اور ایسی آواز کے ساتھ منادی کرتے ہیں کہ تمام جن وانس کو، تمام جگہوں پر اور تمام زمانوں میں سنا دیتے ہیں۔ جی ہاں؛ ہم سن رہے ہیں۔

نویں بنیاد:

وہ انتہائی بلند آہنگ مضبوط خطاب کرتے ہیں جسے تمام زمانے سنتے ہیں۔ جی ہاں؛ ہر زمانہ ان کی آواز کی گونج سنتا ہے۔

دسویں بنیاد:

آپ ﷺ کی عادات واطوار سے یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ آپ ﷺ پہلے دیکھ رہے ہیں اور پھر اُسی طرح خبر دے رہے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ خطرناک ترین اوقات میں بلاخوف وتردّد کمال متانت اور سنجیدگی سے بات کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اکیلے تمام دنیا کو چیلنج دیتے ہیں۔

گیارہویں بنیاد:

وہ اپنی تمام قوت کے ساتھ منادی کرتے اور ایسی قوی آواز کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اُن کی آواز پر آدھے کرۂ ارض اور نوعِ بشر کے پانچویں حصے نے لبیک کہہ کر سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہہ دیا ہے۔

بارھویں بنیاد:

وہ پوری سنجیدگی سے دعوت دیتے ہیں اور اتنی مضبوط اور مکمل شکل میں تربیت کرتے ہیں کہ ۔۔۔ دہور کی پیشانیوں پر اور مُلکوں کے پتھروں میں قوانین و دساتیر نقش کر دیتے ہیں اور انہیں زمانوں کے چہروں پر ابدی طور پر ثبت کر دیتے ہیں۔

تیرھویں بنیاد:

وہ جن احکام کی تبلیغ کرتے ہیں ان کی صحت کے بارے میں اتنے وثوق اور بے خوفی سے بولتے اور دعوت دیتے ہیں کہ اگر تمام دنیا والے بھی ا۔۔۔ اہو جائیں تو ان کو اپنے احکام میں سے کسی ایک حکم سے بھی پھیر نہ سکیں اور اس پر انہیں پچھتاوا نہ دلا سکیں۔ اس کی گواہی میں آپ ﷺ کی تمام تاریخ حیات کو اور آپ ﷺ کی بلند پایہ سیرت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

چودھویں بنیاد:

وہ اتنے اعتماد کے ساتھ دعوت دیتے اور اتنے اطمینان کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں کہ کسی کا احسان نہیں لیتے۔ کسی مشکل کے سامنے آتے وقت بغیر خوف و تردد کمال سنجیدگی اور صفائے دل سے ہر ایک سے پہلے عمل کرتے اور قبول کرتے ہیں اور اپنے لائے ہوئے احکام کا اعلان کرتے ہیں۔ اس بات کا گواہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی فانی آرائشوں زیبائشوں کو کبھی خاطر میں نہیں لائے اور دوستوں دشمنوں کے بالاتفاق ان چیزوں سے مستغنی اور کنارہ کش رہے۔

پندرھویں بنیاد:

آپ ﷺ کا اپنے لائے ہوئے دین کے لیے سب سے زیادہ اطاعت گزار رہنا، اپنے خالق و مالک کی بندگی میں سب سے زیادہ مگن رہنا، منہیات سے سب سے بڑھ کر دامن بچا کر رکھنا۔ یہ سب چیزیں قطعی طور پر اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ سلطانُ الازل والابد کے مبلغ اور اس کے پیغمبر ہیں، اس معبودِ برحق کے مخلص ترین بندے ہیں اور کلامِ اَزلی کے ترجمان ہیں۔

ان پندرہ بنیادوں کا حاصل یہ ہے کہ: ان مذکورہ اوصاف سے متصف وہ سردارِ عالم اپنی تمام قوت کے ساتھ اپنی تمام زندگی میں بہ اصرار و تکرار کہتا ہوا ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ وحدانیت کا اعلان کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ عَدَدَ حَسَنَاتِ اُمَّتِهٖ۔

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

اکرامِ الٰہی اور عنایتِ ربانیہ کا ایک نشان

اس اُمید پر کہ میری یہ بات فرمان گرامی ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ کے مضمون کا مصداق بن جائے۔ میں کہتا ہوں: اس کتاب کی تالیف میں حق تعالیٰ کی عنایت ومہربانی اور رحم وکرم کا ایک بہت بڑا نشان ہے۔ میں اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ قارئین کرام اسے پورے اہتمام کے ساتھ دیکھیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا دل میں کبھی خیال تک بھی نہیں گزرا تھا؛ کیونکہ رسالتِ محمدی علیہ الصلوۃ والسلام کے بارے میں انیسویں اورا ریں مقالے میں خاطر خواہ بحث ہو چکی ہے۔

لیکن ایک دن اچانک دل میں اس کتاب کو تالیف کرنے کا خیال وارد ہوا۔ میری قوت حافظہ بھی مصائب وآلام کے تھپیڑوں کی وجہ سے کافی بجھ سی گئی تھی۔

پھر میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اپنے مشرب کے پیشِ نظر اِدھر اُدھر سے نقل کر کے اور قیل وقال کے انداز میں نہیں لکھا ہے۔

پھر میرے پاس حدیث اور سیرت کی کتابیں بھی نہیں تھیں۔

لیکن اس کے باوجود میں نے اللہ پر توکّل کیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ تب توفیقِ خداوندی اس طرح شاملِ حال ہوئی کہ میرے حافظے نے ''قدیم سعید'' کے حافظے سے بھی بڑھ کر میرا ساتھ دیا۔ چنانچہ ہر دو یا تین گھنٹوں میں تیزی کے ساتھ تیس چالیس صفحات سپردِ قلم ہوئے۔ ایک گھنٹے میں پندرہ صفحات لکھ دیے جاتے تھے جن میں سے اکثر بخاری، مسلم، بیہقی، ترمذی اور شفاء شریف ابونعیم، طبری اور ان جیسی دیگر کتابوں سے نقل ہوتے تھے۔ حالانکہ نقل کرنے میں اگر غلطی ہو جائے تو گناہ لازم آتا ہے، کیونکہ حدیث کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ اس لیے میرا دل کانپ کانپ جاتا تھا۔

لیکن پتا چلا کہ عنایتِ الٰہی میرے شامل حال ہے اور ایسی کتاب کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ تمام حدیثیں بالکل صحیح لکھی گئی ہوں۔ ان شاءاللہ۔

پس میں اپنے بھائیوں سے یہ اُمید کرتا ہوں کہ حدیث کے بعض الفاظ میں یا راویوں کے ناموں میں اگر غلطی نظر آئے تو غلطی نظر انداز کر کے تصحیح کر دیں۔

سعید نورسی

جی ہاں؛ ہمارے استاد بولتے جاتے تھے اور ہم مسوّدہ لکھتے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی۔ اور انہوں نے کسی کتاب کی طرف مراجعت بھی نہ کی۔ چنانچہ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ بولتے اور ہم لکھتے تھے۔ ہم دو، تین گھنٹوں میں کم وبیش تیس چالیس صفحات لکھ لیتے تھے۔ چنانچہ ہمارا یہ اعتقاد پختہ ہو گیا کہ یہ کامیابی معجزات نبوی ﷺ کی ایک بہت بڑی کرامت ہے۔

۱۔عبداللہ چاؤش: آپ کا خدمتگار ساتھی

۲۔سلیمان سامی: آپ کا خادم اور مسوّدہ نویس

۳۔حافظ توفیق: مسودہ نویس اور صاف کنندہ

۴۔حافظ خالد: آپ کا اُخروی بھائی اور مسودہ نویس۔

۱۔عبداللہ چاؤش: آپ کا خدمتگار ساتھی

۲۔سلیمان سای: آپ کا خادم اور مسوّدہ نویس

۳۔حافظ توفیق: مسودہ نویس اور صاف کنندہ

۴۔حافظ خالد: آپ کا اُخروی بھائی اور مسودہ نویس۔

۱۔عبداللہ چاؤش: آپ کا خدمتگار ساتھی

۲۔سلیمان سامی: آپ کا خادم اور مسوّدہ نویس

۳۔حافظ توفیق: مسودہ نویس اور صاف کنندہ

۴۔حافظ خالد: آپ کا اُخروی بھائی اور مسودہ نویس۔

بیسواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ

یہ توحیدی جملہ گیارہ کلمات پر مشتمل ہے انہیں فجر اور مغرب کی نماز کے بعد پڑھنے کے بہت سے فضائل ہیں۔ایک صحیح روایت کے مطابق یہ اسمِ اعظم کے مرتبے کا حامل ہے۔اس کے ہر کلمے میں ایک بشارت اور توحیدِ ربوبیت کا ایک مرتبہ اور اسمِ اعظم کے اعتبار سے وحدت کی کبریائی اور وحدانیت کا کمال پایا جاتا ہے۔

اِن عظیمُ الشان بلند پایہ حقائق کی وضاحت چونکہ تمام مقالات میں کردی گئی ہے،اس لیے اس ضمن میں ان مقالات کا حوالہ دینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔اس مقام پر ہم اپنے ایک وعدے کے مطابق اجمال کے ساتھ خلاصے کی صورت میں ایک فہرست پیش کریں گے جو دو مقامات اور ایک مقدمے پر مشتمل ہوگی۔

مقدمہ

یہ بات یقینی طور پر جان لو کہ تخلیق کی بلند ترین غرض وغایت اور فطرت کا بلند ترین نتیجہ ''ایمان باللہ'' ہے۔

اور انسانیت کا بلند ترین مرتبہ اور بشریت کا عظیم ترین مقام ایمان باللہ میں پائی جانے والی معرفت ہے۔

اور جن وانس کی بلند ترین سعادت اور شیریں ترین نعمت اس معرفت میں پائی جانے والی اللہ کی محبت ہے۔

اور روحِ بشر کے لیے سب سے خالص سرور اور قلبِ انسان کے لیے پاکیزہ ترین فرحت اللہ کی اس محبت میں پائی جانے والی روحانی لذت ہے۔

جی ہاں؛ حقیقی سعادت سرورِ خالص لذیذ نعمت اور صافی لذت صرف اللہ کی معرفت اور اس کی محبت میں ہے،اس کے علاوہ کہیں نہیں ہوسکتی۔اس لیے جس نے اللہ کو پہچان لیا اور اس کے ساتھ محبت کی وہ بے شمار نعمتوں،سعادتوں اور انوار و اسرار کا بالفعل یا بالقوۃ مظہر بن جاتا ہے،

اور جو اس کی حقیقی پہچان نہیں کرتا اور اس کے ساتھ حقیقی محبت نہیں رکھتا وہ مادی اور معنوی طور پر لامتناہی بدبختی،بدنصیبی

، آلام ومصائب واوہام میں مبتلا رہے گا۔

جی ہاں؛ اس ذلیل دنیا میں، اس آوارہ نوعِ بشر کے درمیان، بے ثمر اور لا حاصل زندگی میں ایک بے یار و مددگار انسان اگر تمام دنیا کا بادشاہ بھی بن جائے تو اس کی کیا قیمت ہوگی؟

پس اگر انسان اس پریشان اور فانی دنیا میں اس آوارہ نوعِ بشری کے درمیان رہ کر اپنے مالک کو نہ پا سکے تو وہ کتنا بڑا مسکین، مصیبت زدہ اور حیران و پریشان رہتا ہے ہر کوئی جانتا ہے۔لیکن اگر وہ اپنے پروردگار کو پالے گا اور اپنے مالک کو پہچان لے گا تو اس کی رحمت کی پناہ میں آئے گا اور اس کی قدرت کا سہارا لے لے گا۔تب اس کی یہ وحشت خیز دنیا ایک مانوس اور سرسبز وشاداب نزہت کدے میں اور منفعت خیز تجارت کے بازار میں تبدیل ہو جائے گی۔

پہلا مقام

اس توحیدی کلام کے ہر گیارہ کلمات میں سے ہر کلمے میں ایک بشارت ہے، اس بشارت میں شفاء ہے اور اس شفاء میں ایک معنوی لذّت ہے۔

پہلا کلمہ: ہے ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ''۔اور اس میں بشارت اس طرح سے پائی جاتی ہے کہ: روحِ انسانی جو کہ غیر محدود حاجات وضروریات سے دوچار ہے اور لا انتہا دشمنوں کے حملوں کی زد میں ہے، اسے اس کلمے میں ایک ایسا نقطۂ استمداد ملتا ہے جو اس کے لیے اس کی تمام حاجات وضروریات کو بَر لانے والے خزینۂ رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔اور اُسے مطلق قدرت کے مالک خالق ومعبود کی طرف سے ایک ایسا نقطہ استناد ملتا ہے جو اسے اس کے تمام دشمنوں کی شر سے بے خوف کر دیتا ہے اسے اس کے پروردگار کا دیدار کرا دیتا ہے اور دکھا دیتا ہے کہ اس کا مالک کون ہے۔اور اس دیدار کی برکت اس کے دل کو بے پایاں وحشت سے اور اس کی روح کو الم خیز غم سے بچالیتا ہے اور اسے ابدی فرحت اور دائمی سرور سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

دوسرا کلمہ: ''وَحْدَہٗ'' اس کلمے میں ایک شفا بخش اور سعادت مند قسم کی بشارت پائی جاتی ہے، اور وہ اس طرح کہ انسان کی روح اور اس کا دل جن کا کائنات کی اکثر انواع کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اور اس تعلق کی وجہ سے یہ دونوں ذلت اور تنگیوں میں غرق ہو جانے تک جا پہنچے ہیں؛ یہ دونوں ''وَحْدَہٗ'' کے کلمے میں ایک ایسی جائے پناہ اور ایسی جائے نجات پالیتے ہیں جو انہیں ان تنگیوں ترشیوں اور ذلتوں سے نجات دلا دیتی ہے۔

یعنی ''وَحْدَہٗ'' کا لفظ معنوی طور پر انسان سے کہتا ہے: اللہ ایک ہے، کسی اور چیز کی طرف رجوع کر کے اپنے آپ کو تھکانا نہیں۔ان چیزوں کے احسان اُٹھا کر ان کے سامنے ذلیل نہ ہونا۔ان کے سامنے سر جھکا کر ان کی چاپلوسی نہ کرنا۔ان کی پیروی کر کے مشقت نہ اُٹھانا۔ان سے ڈر کر کانپنا نہیں کیونکہ سلطانِ کائنات ایک ہی ہے، اُسی کے پاس ہر چیز کی

چابیاں ہیں اور اُسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی لگام ہے اور اُسی کے اَمر سے ہر چیز کے عُقدے کُھلتے ہیں۔ اسے پالے گا تو اپنے تمام مطالب و مقاصد پالے گا اور بے شمار احسانوں اور خوف سے نجات پا جائے گا۔

تیسرا کلمہ: ''لَا شَرِيكَ لَهُ'' یعنی جیسے اس کا اس کی الوہیت اور سلطنت میں کوئی شریک نہیں؛ کیونکہ اللہ ایک ہوتا ہے متعدد نہیں؛ اسی طرح اس کی ربوبیت میں، احکام صادر کرنے میں، کام کاج نپٹانے میں اور اشیاء کو ایجاد کرنے میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں؛ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ تو ایک ہوتا ہے اور سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوتا، لیکن اُس کے ملازم حکومت کے معاملات اور کام کاج چلانے میں اس کے شریک کار شمار ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک کو دربار میں جانے کی اجازت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ پہلے ہمارے ساتھ رابطہ کرو اور جو چاہتے ہو ہمیں بتاؤ۔ لیکن سلطانُ الازل والابد حق سبحانہ وتعالیٰ اپنی ربوبیت میں بھی احکام واوامر کو نافذ کرنے میں اس قسم کے درباریوں مصاحبوں اور شریک کاروں کا محتاج نہیں۔ اور اس کی سلطنت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے امر، ارادے، طاقت اور قوت کے بغیر کوئی چیز کسی دوسری چیز کے لیے مؤثر نہیں ہو سکتی اس لیے ہر کوئی اپنا سوال اس کے سامنے بغیر کسی واسطے کے پیش کر سکتا ہے۔ اور اس سوالی کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ: اس کا شریک اور مددگار نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا۔

پس یہ کلمہ روح انسانی کو کچھ اس طرح سے ایک بشارت دیتا ہے: کہ

وہ انسانی روح جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو چکی ہے وہ اس جمیلِ ذوالجلال اور قدیرِ ذوالکمال کی حضوری میں بلا روک ٹوک جا سکتی ہے، اور اُس سلطانُ الازل والابد، رحمت کے خزانوں اور سعادت کے دفینوں کے مالک کے حضور ہمہ وقت، ہر جگہ، ہر حالت میں کسی بھی وسیلے اور ممانعت کا سامنا کیے بغیر اپنا ہر مطالبہ پیش کر سکتی ہے اور اس کی رحمت کو حاصل کر کے اور اس کی قدرت کا سہارا لے کر کمال فرح وسرور سے بہرہ ور ہو سکتی ہے!

چوتھا کلمہ: ''لَهُ الْمُلْكُ''

یعنی ملک تمام کا تمام اُس کا ہے، اور تو بھی اس کا مُلک اور مملوک ہے اور اس کے ملک میں کام کرتا ہے۔

یہ کلمہ ایک شفا بخش خوشخبری دیتا اور کہتا ہے:

اے انسان! خود کو اپنا مالک ہرگز نہ سمجھنا؛ کیونکہ تو اپنی ذات کے معاملات نہیں چلا سکتا؛ کیونکہ یہ بوجھ بہت گرانبار ہے اور تو اکیلا اس کی حفاظت نہیں کر سکتا اور یوں مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچ کر اپنی حاجات وضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر پریشان ہو کر بے فائدہ مصیبتیں مت جھیل؛ کیونکہ مُلک کا مالک کوئی اور ہے اور وہ مالک بڑا قدیر ورحیم ہے۔ اس کی قدرت کا سہارا لے اور اس کی رحمت کو الزام نہ دے۔ غم نہ کر، خوش رہا کر، مشقت سے بچ اور صاف دل بن جا۔

اور اگر تم اس طریقے سے بھی نہیں کر سکتے تو پھر قدیم دور کی لکھی ہوئی فصیح و بلیغ کتابوں سے استفادہ کرو، بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی اپنی مدد کے لیے بلالو اور قرآن کی نظیر لے آؤ اور اس طرح کا کوئی شاہکار سامنے لے آؤ۔

اور اگر ایسے بھی نہیں کر سکتے تو پھر تمام قرآن کی نظیر ضروری نہیں اس کی دس سورتوں جیسی دس سورتیں ہی لے آؤ۔

اور اگر تم اس کی دس سورتوں کی صحیح حقیقی نظیر نہیں لا سکتے تو پھر فصاحت و بلاغت پر مشتمل کوئی سا بھی کلام لے آؤ اگرچہ بے اصل قصوں کہانیوں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو! لیکن یہ ہے کہ وہ نظم و بلاغت میں ان دس سورتوں کا مثیل و نظیر ہو، ایسا کر لاؤ!

اور اگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر اس کی ایک سورت جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سورت لمبی ہو، چھوٹی سی بھی ہو سکتی ہے، بس بنا لاؤ، وگرنہ تمہارا دین اور تمہاری روحیں، تمہارے اموال اور تمہارے اہل و عیال دنیا و آخرت میں خطرے کی زد میں ہیں۔

یوں قرآن حکیم نے تمام جن و انس کو لاجواب کرنے کی شکل میں صرف تیئیس سال چیلنج نہیں کیا بلکہ ساڑھے تیرہ سو سال سے کرتا چلا آرہا ہے لیکن اس دور میں ان کافروں نے اپنے آپ کو، اپنے اموال کو اور اپنے اہل و عیال کو ہلاکت میں ڈالنا گوارہ کر لیا اور جنگ و جدل جیسا خطرناک راستہ اختیار کر لیا اور معارضے و مقابلے جیسا آسان اور مختصر راستہ چھوڑ دیا۔ اس سے پتا چلا کہ معارضے کا راستہ ممکن نہیں تھا۔

تو کیا کوئی عقلمند آدمی اور خاص طور پر جزیرۂ عرب میں رہنے والی قوم اور خاص کر اس دور میں قریش جیسی ذہین قوم یہ آسان اور مختصر راستہ چھوڑ سکتی تھی؟ ان کے لیے یہ کام تو بہت آسان تھا کہ ان میں سے کوئی ادیب قرآن کی کسی چھوٹی سی سورت جیسی کوئی سورت بنا لیتا اور انہیں قرآن پاک کے حملوں سے محفوظ کر لیتا، اور یوں وہ لوگ یہ مختصر اور آسان راستہ اختیار کر کے اپنے اموال، جانیں اور اپنے اہل و عیال کو بچا لیتے؟ کیا یہ کام مشکل تھا؟ ہرگز نہیں۔

الحاصل، وہ لوگ جب الفاظ و حروف کے ساتھ معارضہ نہ کر سکے تو لاچار ہو کر سیف و سنان لے کر میدان میں اتر آئے۔ جیسا کہ جاحظ نے کہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بعض محقق علمائے کرام یہ کہتے ہیں کہ: "قرآن کریم کی پوری سورت تو رہی ایک طرف ایک آیت کا، بلکہ ایک جملے کا بلکہ ایک کلمے کا معارضہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ایسا ہوا بھی نہیں ہے۔"

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے اقوال مبالغے سے خالی نہیں اور عقل انہیں قبول نہیں کرتی ہے؛ کیونکہ بشر کے کلام میں ایسے بہت سے جملے پائے جاتے ہیں جو قرآن کے جملوں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔ اس قول کا کیا معنی ہے اور اس میں کیا حکمت ہے؟

الجواب: اعجاز القرآن کے بارے میں دو مذہب ہیں:

پہلا مذہب: یہ اکثر، غالب اور راجح مذہب ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآن کی بلاغت کے لطائف اور اس کے معانی کی امتیازی خصوصیات بشری طاقت سے باہر ہیں۔

دوسرا مذہب: یہ مذہب مرجوح ہے، اور وہ یہ کہ قرآن کی کسی بھی سورت کا معارضہ بشری طاقت کے دائرے میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت سلب کر لی ہے تا کہ قرآن رسولِ گرامی ﷺ کا معجزہ بن جائے۔ بالکل ایسے کہ جیسے کوئی انسان کھڑا تو ہو سکتا ہو لیکن اگر کوئی نبی اُسے معجزے کا اظہار کرنے کے لیے کہے کہ: تو کھڑا نہیں ہو سکتا، تب وہ کھڑا نہ ہو سکے تو یہ ایک معجزہ ہوگا۔ اس مرجوح مذہب کو ''صرفہ'' کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو قرآن کی کسی سورت جیسی سورت بنانے سے موڑ دیا تھا: یعنی ان کی طاقت سلب کر لی تھی۔ اگر اللہ اُن کی طاقت سلب نہ کرتا تو وہ ایک آدھ سورت لازماً بنا لیتے۔

اس مذہب کی رُو سے اُن علماء کا قول حق ہے جو کہتے ہیں کہ: ''قرآن کے ایک کلمے کا بھی معارضہ نہیں ہو سکتا'' ۔ کیونکہ اگر اعجاز کا اظہار کرنے کے لیے انہیں اللہ نے ہی روک دیا ہے تو وہ معارضے کے لیے منہ نہیں کھول سکتے۔ اور اگر منہ کھول لیتے تو اللہ کے حکم کے بغیر ایک کلمہ بھی نہ نکال سکتے۔

لیکن پہلا مذہب جو کہ راجح ہے اور اکثر علماء کا اختیار کردہ ہے، اس مذہب کے مطابق بھی اس فکر کا ایک دقیق پہلو ہے، اور وہ یہ ہے کہ: قرآنِ حکیم کے جملے اور کلمات ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، چنانچہ کبھی ایک کلمہ دس جگہوں پر نگاہ جمائے ہوتا ہے اور اس طرح اس میں دسیوں مناسبات اور بلاغت کے دسیوں نکات موجود ہوتے ہیں جیسے کہ ہم نے اپنی ''اشارات الاعجاز'' نامی تفسیر میں سورۂ فاتحہ کے اور ﴿الٓمٓ ، ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کے بعض جملوں کے درمیان اس کی کچھ مثالیں بیان کر دی ہیں۔

مثال کے طور پر:

ایک عظیم الشان محل جس کے در و دیوار پر انوکھی، خوبصورت و دل آویز مینا کاری اور زیبائش و آرائش کی گئی ہو، اس محل میں ایک ایسا پتھر نصب کرنا ہو جو اُن مختلف اور متعدد نقوش و نگار کے لیے مرکزی حیثیت کا کام دے، اور اُسے ایسی مناسب جگہ پر نصب کرنا ہو جہاں سے وہ تمام نقوش و نگار کو بیک وقت دیکھ سکتا ہو؛ بلاشبہ اس کام کے لیے محل کے تمام در و دیوار اور اُن کے تمام نقوش و نگار کی معرفت ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح انسان کی آنکھ کے ڈھیلے میں عین صحیح اور مناسب جگہ پر پتلی کو نصب کرنا اس بات پر موقوف ہے اور اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام جسم کی تمام مناسبتوں کا اور اُس کے عجیب و غریب وظائف کا علم ہو اور آنکھ کے تمام جسم کے

وظائف کے ساتھ تعلق رکھنے والے اوضاع واطوار اور حالات وکیفیات کی پہچان ہو۔

ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر یہ سمجھیں کہ حقائق کے بارے میں بہت آگے نکل جانے والے بعض اہلِ حقیقت نے قرآن کے کلمات کے مابین بہت سی ایسی مناسبات اور بہت سے ایسے روابط کی اور ایسے پہلوؤں کی وضاحت کی ہے جو تمام آیتوں اور جملوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ خاص کر ماہرینِ علم الحروف تو اس ضمن میں بہت آگے نکل گئے ہیں، چنانچہ ان لوگوں نے قرآن کے ایک ایک حرف میں اتنے اسرار ورموز بیان کیے ہیں جو ایک ایک صفحے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اس علم کے ساتھ شغف رکھنے والوں کے لیے انہوں نے یہ حقائق ثابت کر دیے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ قرآن چونکہ ہر چیز کے خالق کا کلام ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ اس کا ہر کلمہ دل اور گٹھلی کا حکم رکھتا ہو۔ اور یوں وہ کلمہ ایک معنوی جسم کے نلیے دل کا اور ایک معنوی درخت کے لیے گٹھلی کا حکم رکھتا ہو، یعنی ممکن ہے کہ دل کے ساتھ مشابہت رکھنے والے اس ایک کلمے کے اردگرد اسرار ورموز کا ایک جسم بن جائے، اور گٹھلی کے ساتھ مشابہت رکھنے والے اس ایک کلمے سے اسرار ومعانی کا ایک درخت اُگ آئے!

اسی بنا پر یہ ممکن ہے کہ:

ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے کلام میں کچھ کلمات وآیات بلکہ کچھ جملے پائے جاتے ہوں جو قرآنی کلمات کے ساتھ مشابہت رکھتے ہوں! لیکن قرآنی کلمات کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسی مناسب جگہ پر اور اس طرح سے فِٹ کر دیے گئے ہیں کہ بہت سی مناسبات کے پیشِ نظر اُن کا کسی ہمہ گیر علم کی رُو سے اس مناسب جگہ پر آنا لازم ہو جاتا ہے۔

تیسرا نکتہ:

ایک وقت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے میرے دل پر یہ احسان کیا کہ قرآنِ معجز بیان کی ماہیت کا خلاصۃ الخلاصہ اجمالی طور پر ایک حقیقی تفکر کی صورت میں عربی زبان میں وارد کر دیا۔

وہ تفکر یہاں پر ہم بعینہٖ عربی زبان میں لکھتے ہیں پھر اس کے معنی کی وضاحت کریں گے اور وہ یہ ہے:

سُبْحَانَ مَنْ شَهِدَ عَلَى وَحْدَانِيَّتِهِ، وَ صَرَّحَ بِأَوْصَافِ جَمَالِهِ وَجَلَالِهِ وَ كَمَالِهِ، اَلْقُرْآنُ الْحَكِيْمُ الْمُنَوَّرُ جِهَاتُهُ السِّتُّ، اَلْحَاوِىْ لِسِرِّ اِجْمَاعِ كُلِّ كُتُبِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْاَوْلِيَاءِ وَالْمُوَحِّدِيْنَ الْمُخْتَلِفِيْنَ فِى الْاَعْصَارِ وَالْمَشَارِبِ وَالْمَسَالِكِ، اَلْمُتَّفِقِيْنَ بِقُلُوْبِهِمْ وَعُقُوْلِهِمْ عَلَى تَصْدِيْقِ أَسَاسَاتِ الْقُرْآنِ، وَكُلِّيَّاتِ اَحْكَامِهِ، عَلَى وَجْهِ الْاِجْمَالِ، وَهُوَ مَحْضُ الْوَحْيِ بِاِجْمَاعِ الْمُنْزِلِ وَالْمُنْزَلِ وَالْمُنْزَلِ عَلَيْهِ، وَعَيْنُ الْهِدَايَةِ، وَمَعْدَنُ اَنْوَارِ الْاِيْمَانِ بِالضَّرُوْرَةِ، وَمَجْمَعُ الْحَقَائِقِ بِالْيَقِيْنِ، وَمُوْصِلٌ اِلَى السَّعَادَةِ بِالْعِيَانِ، وَذُو الْاَثْمَارِ الْكَامِلِيْنَ بِالْمُشَاهَدَةِ، وَمَقْبُوْلُ الْمَلَكِ وَالْاِنْسِ وَالْجَانِّ بِالْحَدْسِ الصَّادِقِ، مِنْ تَفَارِيْقِ الْاَمَارَاتِ، وَالْمُؤَيَّدِ بِالدَّلَائِلِ

الْعَقْلِيَّةِ بِاتِّفَاقِ الْعُقَلَاءِ الْكَامِلِيْنَ، وَالْمُصَدَّقُ مِنْ جِهَةِ الْفِطْرَةِ السَّلِيْمَةِ بِشَهَادَةِ اِطْمِئْنَانِ الْوِجْدَانِ، وَالْمُعْجِزَةُ الْاَبَدِيَّةُ الْبَاقِي وَجْهُ اِعْجَازِهِ عَلَى مَرِّ الزَّمَانِ بِالْمُشَاهَدَةِ، وَالْمُنْبَسِطُ دَائِرَةُ اِرْشَادِهِ مِنَ الْمَلَاِ الْاَعْلَى اِلَى مَكْتَبِ الصِّبْيَانِ يَسْتَفِيْدُ مِنْ عَيْنِ الدَّرْسِ الْمَلٰئِكَةُ مَعَ الصَّبِيِّيْنَ، وَكَذَا هُوَ ذُوالْبَصَرِ الْمُطْلَقِ يَرَى الْاَشْيَاءَ بِكَمَالِ الْوُضُوْحِ وَالظُّهُوْرِ، وَيُحِيْطُ بِهَا وَيُقَلِّبُ الْعَالَمَ فِيْ يَدِهٖ، وَيُعَرِّفُهُ لَنَا، كَمَا يُقَلِّبُ صَانِعُ السَّاعَةِ السَّاعَةَ فِيْ كَفِّهٖ، وَيُعَرِّفُ لِلنَّاسِ ــ فَهٰذَا الْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ الشَّاْنِ هُوَ الَّذِيْ يَقُوْلُ مُكَرَّرًا: ﴿اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ـــ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾۔

۔ عبارت کا ترجمہ اور ما حصل یہ ہے کہ:

قرآن معجز بیان کی چھ جہات سے تابندہ و تابناک اور منور ہیں۔ اس لیے ان میں اوہام وشبہات بار نہیں پا سکتے؛ کیونکہ اس کی کمر نے ٹیک عرش پر لگائی ہوئی ہے، اور اس جہت میں وحی کا نور ہے۔ اُس کے آگے والی جہت میں اور اس کے ہدف میں سعادت دارین ہے، چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ آگے ابد و آخرت کی طرف بڑھایا ہوا ہے۔ اور وہاں جنت اور نور سعادت ہے۔ اس کے اوپر اعجاز کا سکہ اور طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے نیچے دلیل و برہان کے ستون ہیں۔ اس کا باطن خالص ہدایت ہے۔ اس کی دائیں جہت ﴿اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ﴾ کے قول سے عقلوں کو بلواتی ہے اور اُن سے ''صَدَقْتَ'' کہلوا کر انہیں تصدیق کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی بائیں جہت سے دلوں کو روحانی اذواق عطا کرتا ہے اور وجدان کو گواہ بنا کر اس سے ''بَارَكَ اللّٰهُ'' کہلواتا ہے۔ تو پھر اس قرآن معجز بیان میں اوہام وشبہات کا چور کس کونے سے داخل ہوگا؟

جی ہاں؛ بلاشبہ قرآن معجز بیان مختلف ادوار کے مختلف مشارب و مسالک کے حامل انبیاء، اولیاء اور موحدین کی کتابوں کو یکجا کر دینے والے رازکا جامع ہے؛ مطلب یہ کہ: ان اہل دل واہل عقل لوگوں نے اپنی کتابوں میں قرآن کی بنیادوں کا اور اس کے اجمالی احکام کا کچھ اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ ان بنیادوں کی تصدیق کر دی ہے اور انہیں قبول کر لیا ہے۔ گویا کہ یہ لوگ قرآن کے آسمانی درخت کے لیے جڑوں کا حکم رکھتے ہیں۔

اسی طرح قرآن حکیم وحی کا سہارا لیتا ہے، اور وہ خالص وحی ہے؛ کیونکہ اسے نازل کرنے والا اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ قرآن وحی ہے۔ اور اس چیز کا اثبات وہ معجزات محمدیہ کے ساتھ کرتا ہے۔ اور نازل کیے جانے والا قرآن بھی اپنے معجزانہ انداز کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ عرش سے نازل ہوا ہے۔ اور رسول اکرم ﷺ جن پر یہ نازل ہوا ہے، وحی کے آغاز میں ان پر طاری ہونے والا غم اور گھبراہٹ، اُن کا بے ہوش ہو جانا اور ان کا ہر ایک سے بڑھ کر قرآن کا احترام کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ازل سے وارد ہونے والی وحی ہے جو مہمان بن کر ان پر اتر رہی ہے۔

اسی طرح یہ قرآن بداہتاً خالص ہدایت ہے، کیونکہ اس کا مخالف مشاہدے کی رُو سے کفر وضلالت ہے۔

اسی طرح قرآن ضرور تمام انوار قرآن کا معدن ہے؛ کیونکہ انوار ایمان کا عکس قطعی طور پر ظلمات سے ہیں اور یہ چیز ہم بہت سے مقالات میں ثابت کر چکے ہیں۔

اسی طرح قرآن یقیناً مجمع الحقائق ہے، ایسے حیالات و خرافات اس میں راہ نہیں پا سکتے اور اس لیے کہ جو حقیقتیں بدوش عالمِ اسلام کی بنیاد رکھی ہے، جو اسلامی شریعت ظاہر کی ہے اور جو بلند پایہ کمالات آشکار کیے ہیں، ان سب کی گواہی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے عالمِ غیب کے ساتھ تعلق رکھنے والے مباحث بھی عین حقائق ہیں، ان میں خلافِ حقیقت کوئی چیز نہیں ہے، بالکل ایسے جیسے کہ اس کے وہ مباحث عالمِ شہادت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

اسی طرح قرآن نوعِ بشر کو سعادت دارین تک پہنچا دیتا ہے اسے بلاشبہ سرِ عام ڈھکیلتا ہوا وہاں تک لے جاتا ہے۔ جسے اس بات میں شبہ ہو وہ ایک دفعہ قرآن پڑھ کر اور سن کر دیکھ لے۔ پھر دیکھے کہ کیا کہتا ہے؟

پھر قرآن نے جو پھل دیے ہیں وہ پھل اور زندگی سے بھرپور ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اصل درخت حقیقت میں گڑھا ہوا ہے اور زندگی سے بہرہ ور ہے؛ کیونکہ پھل کا زندہ ہونا اس چیز کی دلیل ہے کہ درخت زندہ ہے۔ لہٰذا تو ان اصفیاء و اولیاء پر ایک نظر ڈال سکتے ہو جو قرآن نے زندگی سے بھرپور چمکتے دمکتے پھلوں کی صورت میں ہر دور میں عطا کیے ہیں۔

اسی طرح قرآن لامحدود و متفرق علامات سے جنم لینے والی قناعت اور حدسِ صادق کی رو سے جن و انس و ملائکہ کے ہاں مقبول و مرغوب ہے۔ کیونکہ جب اس کی تلاوت ہوتی ہے تو وہ پروانوں کی طرح ان کے ارد گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح قرآن وحی ہونے کے ساتھ ساتھ عقلی دلائل کی قوت اور تائید سے بھی مزین ہے۔ جی ہاں؛ عقلائے کاملین کا اتفاق اس حقیقت کا گواہ ہے۔ کیونکہ ابن سینا اور ابن رشد جیسے متبحر متکلمین و فلاسفہ نے اپنے اصول و دلائل کے ساتھ بالاتفاق قرآنی بنیادوں کو ثابت کر دیا ہے۔

اسی طرح قرآن کی فطرتِ سلیم کی جہت سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی عارضہ یا بیماری رکاوٹ نہ بن رہی ہو تو ہر فطرتِ سلیم اس کی تصدیق کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فطرتِ سلیم وجدان کے اطمینان کی گواہی کے ذریعے قرآن کی تصدیق کرتی ہے۔

جی ہاں؛ سلیم فطرتیں زبانِ حال سے قرآن کو مخاطب کر کے کہتی ہیں: ہماری فطرت کا کمال آپ کے بغیر ممکن نہیں۔ اس حقیقت کا اثبات ہم بہت سی جگہوں پر کر چکے ہیں۔

اسی طرح قرآن بالمشاہدہ اور بدیہی طور پر ایک ابدی اور دائمی معجزہ ہے۔ یہ اپنے اعجاز کا اظہار ہمہ وقت کرتا رہتا ہے۔ اور یہ لازوال اور ابدی ہے، دوسرے معجزات کی طرح نہ تو بجھنے پائے اور نہ ہی اس کا وقت ختم ہوگا۔

اسی طرح قرآن کریم کا رہنمائی کرنے میں مرتبہ اتنا وسیع و عریض اور ہمہ گیر ہے کہ اس کے ایک درس میں جبریلؑ ایک نوخیز بچے کے پہلو میں بیٹھتے ہیں اور دونوں بیک وقت وہ درس سنتے ہیں اور دونوں دوش بدوش بیٹھ کر اس درس سے اپنا اپنا حصہ حاصل کرتے ہیں۔ اور ابن سینا جیسا زیرک ترین فلسفی اور ناظرہ پڑھنے والا ایک سیدھا سادھا آدمی عین وہی درس پڑھتے ہیں اور پہلو بہ پہلو بیٹھ کر اپنا اپنا حصہ لے لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات وہ عام آدمی اپنی قوتِ ایمان اور صفائے ایمان کے لحاظ سے ابنِ سینا سے زیادہ فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں ایک ایسی آنکھ پائی جاتی ہے جو تمام کائنات کو دیکھتی اور اس کا احاطہ کرتی ہے اور کائنات کو اپنے سامنے رکھ کر اس کے تمام طبقات و عوالم کو آشکار کرتی ہے، بالکل ایسے جیسے کسی کتاب کے صفحات الٹا پلٹا کر دیکھے جاتے ہیں۔ جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی الٹا پلٹا کر دیکھتا ہے، اسے کھولتا ہے، اس کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور اس کی جان پہچان کرتا اور کرواتا ہے؛ اسی طرح قرآن کریم نے عالمِ ہستی کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے اور اس کے ساتھ یہی بیوپار کرتا ہے۔ یہی قرآن ہے جو کہتا ہے ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ﴾ اور وحدانیت کا اعلان کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْآنَ لَنَا فِي الدُّنْيَا قَرِينًا، وَفِي الْقَبْرِ مُؤْنِسًا، وَفِي الْقِيَامَةِ شَفِيعًا، وَعَلَى الصِّرَاطِ نُورًا وَمِنَ النَّارِ سِتْرًا وَحِجَابًا وَفِي الْجَنَّةِ رَفِيقًا وَإِلَى الْخَيْرَاتِ كُلِّهَا دَلِيلًا وَإِمَامًا۔

اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ قُلُوبَنَا وَقُبُورَنَا بِنُورِ الْإِيمَانِ وَ الْقُرْآنِ وَ نَوِّرْ بُرْهَانَ الْقُرْآنِ بِحَقِّ وَ بِحُرْمَةِ مَنْ أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ. عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مِنَ الرَّحْمَانِ الْحَنَّانِ آمِينَ

انیسواں بلاغی اشارہ

سابقہ اشارات میں بلاشبہ قطعی طور پر یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ رسول اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پس محمد عربی ﷺ جن کی رسالت ہزاروں قطعی دلائل کی رُو سے ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، وحدانیتِ الٰہی اور سعادتِ ابدی کی ایک روشن ترین دلیل اور قطعی ترین برہان ہے۔

اس اشارے میں ہم اس روشن و درخشاں دلیل اور ناطقِ صادق برہان کی خلاصۃ الخلاصہ کی شکل میں انتہائی اجمال کے ساتھ تعریف پیش کریں گے؛ کیونکہ اگر وہ دلیل ہے، اور دلیل کا نتیجہ اللہ کی معرفت ہے تو پھر اس دلیل کی پہچان ضروری ہے اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ وہ دلیل دلالت کس طرح کرتی ہے! بنا بریں ہم انتہائی مختصر خلاصے کے ذریعے اس دلیل کی صحت اور اس کی دلالت کے پہلو کی وضاحت کریں گے۔

اور وہ اس طرح کہ رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی اس کائنات کے موجودات کی طرح خالقِ کائنات کے وجود

اور اس کی وحدت پر دلالت کرتی ہے، اور موجودات کی اس دلالت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زبانِ مبارک کے ساتھ اپنی اس ذاتی دلالت کا اعلان کرتے ہیں۔ آپ ﷺ جب ایک دلیل ہیں تو ہم اس دلیل کی صحت واستواری اور اس کی صداقت وحقانیت کی طرف پندرہ بنیادوں کی صورت میں اشارہ کریں گے۔

پہلی بنیاد:

اپنی ذات، زبان اور اپنے حال وقال کی دلالت کے ساتھ صانعِ کائنات پر دلالت کرنے والی یہ دلیل کائنات کی حقیقت کی تصدیق کی وجہ سے ایک صادق ومصدّق دلیل ہے؛ کیونکہ موجودات کی وحدانیت پر دلالتیں وحدانیت کے قائل انسان کے لیے تصدیق کا حکم رکھتی ہیں۔ پس وہ تصدیقِ کائنات کی تصدیق کی بنا پر اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

اسی طرح آپ ﷺ کمالِ مطلق کی حامل وحدانیتِ الٰہیہ کے بارے میں، اور خیرِ مطلق کی حامل ابدی سعادت کے بارے میں جو کچھ بیان کرتے ہیں، اُس بیان میں بالکل سچے ہیں؛ کیونکہ یہ دعویٰ عالمِ ہستی کے حقائق کے حسن وجمال کے عین مطابق اور اس کے کمال کے بالکل مطابق ہے۔ پس رسول اکرم ﷺ وحدانیتِ الٰہی اور سعادتِ ابدی کی ایک ناطق وصادق ومصدّق برہان ہیں۔

دوسری بنیاد:

یہ صادق ومصدّق دلیل چونکہ ہزاروں معجزوں کی، ایک منسوخ نہ ہونے والی شریعت کی اور تمام انبیاء سے بڑھ کر تمام جن وانس کے لیے ایک ہمہ گیر دعوی رکھنے والی دلیل ہے؛ اس لیے بلاشبہ وہ ان سب کے سردار ہیں۔ پس اس بنا پر آپ ﷺ تمام انبیاء کے اتفاق اور ان کے معجزات کے اسرار کے جامع ہیں۔ یعنی ان تمام انبیاء کے اِجماع کی قوت اور اُن کے معجزات کی شہادت آپ ﷺ کی صداقت وحقانیت کا اور آپ ﷺ کے دعوے کے درست ہونے کا مرکزی نقطہ ہے۔

پھر آپ ﷺ ان تمام اولیاء کے سردار اور تمام اصفیاء کے استاد ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کی عطا کردہ تربیت، رہنمائی اور آپ ﷺ کی شریعت کی روشنی میں کہا اور سنا ہے گویا کہ آپ ﷺ اُن کی کرامتوں کے اور ان کی تحقیقات کی قوت کے جامع ہیں؛ کیونکہ یہ لوگ عین اسی راستے پر چلے ہیں جو ان کے استاد نے کھولا ہے۔ اور اس نے ان کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے اس لیے وہ حقیقت کو پاگئے ہیں۔

پس ان کی تمام کرامتیں اور ان کے اجماع کی تمام تحقیقات ان کے قدسیّت مآب استاد کی صداقت اور حقانیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اسی طرح وحدانیت کی یہ برہان بہت سے قطعی یقینی اور واضح معجزات خارق عادت اِرہاصات اور نبوت کے شکوک و

شہادت سے بالاتر دلائل کی حامل ہے۔ جیسا کہ ہم سابقہ اشارات میں دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ دلائل و معجزات آپ ﷺ کی اس طرح کی تصدیق کرتے ہیں کہ تمام کائنات مل کر بھی اس تصدیق کو باطل نہیں کر سکتی۔

تیسری بنیاد:

وحدانیت و یکتائی کی دعوت دینے والا اور ابدی سعادت کی خوشخبری دینے والا ان تابندہ معجزات کا مالک اپنی مبارک ذات میں اخلاق عالیہ کا، اپنے وظیفۂ رسالت میں بلند پایہ خوبیوں کا اور اپنے تبلیغ کردہ دین اور شریعت میں ایسے بلند ترین خصائل کا مالک ہے کہ شدید ترین دشمن بھی ان کی تصدیق کرتے ہیں اور انہیں انکار کرنے کی گنجائش نہیں ملتی ہے۔ پس جب اُن کی ذات میں، وظیفے میں اور دین میں بلند ترین و خوبصورت ترین اخلاق، بلند ترین اور کامل ترین خوبیاں اور بلند ترین و خوبصورت ترین عادات و خصائل پائے جاتے ہیں تو پھر وہ ذات موجودات میں پائے جانے والے تمام کمالات اور اخلاق عالیہ کی بہترین مثال ہے، ممثل ہے، تمثال ہے اور استاد ہے۔ پس آپ ﷺ کی ذات میں، وظیفے میں اور آپ ﷺ کے دین میں پائے جانے والے یہ کمالات آپ ﷺ کی صداقت و حقانیت کا ایک ایسا نقطۂ استناد ہیں جو کسی بھی جہت سے ڈگمگاتا نہیں۔

چوتھی بنیاد:

یہ وحدانیت اور سعادت کا یہ دعوت گر اور معدن کمالات و اخلاق عالیہ کا معلم ہے، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا بلکہ اُس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

جی ہاں! اس کی طرف خالق کائنات کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ پہلے وہ اپنے استاد ازلی سے پڑھتا ہے پھر پڑھاتا ہے۔ کیونکہ خالق کائنات نے نبوت کے ہزاروں دلائل کے ساتھ۔ جن میں سے کچھ سابقہ اشارات میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ اور ان معجزات کو پیدا کرنے کے ساتھ یہ بات ثابت کر دی ہے کہ: اس کا معزز رسول اس کی طرف سے اور اس کے لیے بولتا ہے اور اس کے کلام کو آگے پہنچاتا ہے۔

اسی طرح قرآن جو اس پر نازل ہوتا ہے اپنے ظاہر و باطن کے اعجاز کے چالیس پہلوؤں سے ثابت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ترجمان ہیں۔

اسی طرح وہ خود بھی اپنی ذات مبارکہ میں پائے جانے والے اخلاص، تقویٰ، سنجیدگی، امانت اور اپنے تمام احوال و اطوار کے ساتھ یہ ثابت کرتے ہیں کہ: وہ اپنے شخصی نام سے اور اپنی ذاتی رائے سے نہیں بولتے بلکہ اپنے خالق و آفریدگار کے نام سے بولتے ہیں۔

اسی طرح وہ تمام اہلِ حقیقت جنہوں نے آپ ﷺ کی بات سنی ہے، ان سب نے کشف و تحقیق کے ذریعے

آپ ﷺ کی تصدیق کی ہے، اور یقین کی روشنی میں اس بات کو مان گئے ہیں کہ: وہ اپنی طرف سے نہیں بولتے بلکہ انہیں خالقِ کائنات بلواتا ہے، پڑھاتا ہے اور اس کے ذریعے لوگوں کو پڑھاتا ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی صداقت اور حقانیت ان چار انتہائی مضبوط بنیادوں پر اعتماد کرتی ہے اور ان کے سہارے کھڑی ہے۔

پانچویں بنیاد:

اَزلی کلام کے یہ ترجمان روحوں کو دیکھتے ہیں، فرشتوں کے ساتھ سرگوشی کرتے ہیں اور جن وانس کی رہنمائی کرتے ہیں وہ اپنا علم جن وانس کے عالم کے اُوپر سے نہیں بلکہ عالمِ ارواح اور عالمِ ملائکہ سے بھی اُوپر کے عالم سے حاصل کرتے ہیں وہ ان عوالم سے کہیں اُوپر کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور وہیں سے اطلاع پاتے ہیں۔ آپ ﷺ کے ان مذکورہ معجزات نے، اور آپ ﷺ کے تواتر سے ثابت ہو جانے والے اَطوارِ حیات نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے۔

اس سے پتا چلا کہ کاہن اور ان جیسے دیگر پیش گوئیاں کرنے والے لوگ، جن، روحیں اور مقرب فرشتے بھی آپ ﷺ کی دی ہوئی خبروں میں دخل انداز نہیں ہو سکتے، سوائے جبریلؑ کے جو اکثر اوقات میں آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کبھی جبریل سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔

چھٹی بنیاد:

جن وانس کا یہ سردار کائنات کے درخت کا روشن ترین اور اکمل ترین پھل، رحمتِ الٰہی کی ایک نادر تمثال، محبتِ ربانی کی مثال، روشن ترین بُرہانِ حق، تابندہ ترین چراغِ حقیقت، طلسمِ کائنات، کشافِ معنیٔ تخلیق، شارحِ حکمتِ عالم، رہنمائے سلطنتِ الٰہی، اور صنعتِ ربانی کے محاسن کا بہترین وصاف ہے اور ہمہ گیر استعداد و قابلیت کی جہت سے موجودات میں پائے جانے والے کمالات کا کامل ترین نمونہ ہے۔

پس اس کے یہ اوصاف اور اس کی یہ معنوی شخصیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ وہ اس کائنات کی علتِ غائی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس کائنات کے خالق و آفریدگار نے اس ''سردارِ عالم'' کی طرف دیکھا تو کائنات پیدا کی، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر وہ انہیں پیدا نہ کرتا تو کائنات کو بھی پیدا نہ کرتا۔

جی ہاں؛ وہ قرآنی حقائق اور ایمانی انوار جنہیں وہ جن وانس کی طرف لے کر آئے اور وہ اخلاقِ عالیہ اور کمالاتِ سامیہ جو آپ ﷺ کی ذات میں نظر آتے ہیں، سب کے سب اس حقیقت کے قطعی گواہ ہیں۔

ساتویں بنیاد:

بلاشبہ اس برہانِ حق اور سراجِ حقیقت نے ایک دین اور ایسی شریعت کا اظہار کیا ہے جن میں سعادتِ دارین کی ضمانت دینے والے تمام قوانین و دساتیر پائے جاتے ہیں۔ اور اس دین اور شریعت نے جامع اور ہمہ گیر ہونے کے ساتھ

ساتھ کائنات کے حقائق ووظائف اور اس کے خالق کے اسماء وصفات کو کمال حقانیت کے ساتھ واضح کیا ہے۔ یہ اسلام اور یہ شریعت دونوں ہمہ گیر اور کامل ومکمل ہیں اور وہ کائنات کے ساتھ ساتھ اُس کے خالق کی بھی پہچان رکھتے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ جو ان دونوں کو ذرا گہری نظر سے دیکھے گا قطعی طور پر جان جائے گا کہ یہ دین اور یہ شریعت دونوں ہی اس خوبصورت کائنات کے صانع کا بیان اور اس کی پہچان کا ذریعہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اس کائنات کی پہچان بھی کراتا ہے۔

جیسے کسی محل کو بنانے والا کاریگر اس محل کا ایک مناسب سا تعارف تیار کرتا ہے اور اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی ذات نمایاں کرنے کے لیے ایک کیفیت نامہ بھی لکھ دیتا ہے اسی طرح دین محمدی اور شریعتِ محمدی دونوں میں ایک ایسا احاطہ اور ہمہ گیریت، بلندی اور حقیقت نظر آتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان دونوں کا ظہور اس کائنات کے خالق اور مدبّر کی طرف سے ہوا ہے۔ اور یہ کہ جس نے اس کائنات کو خوبصورت نظم وضبط دیا ہے وہی ہے جس نے اس کو بھی خوبصورت نظم وضبط دیا ہوا ہے۔

جی ہاں؛ یہ کامل ترین نظام اسی خوبصورت ترین نظم وضبط کا تقاضا کرتا ہے۔

آٹھویں بنیاد:

محمد عربی ﷺ جو کہ ان مذکورہ صفات سے متصف ہیں اور ہر جہت سے مضبوط قوی نقطہ ہائے استناد پر تکیہ کناں ہیں، عالمِ غیب کی ترجمانی کرتے ہوئے عالمِ شہادت کی طرف متوجہ ہو کر برسرِ جن وانس اعلان کرتے ہیں اور مستقبل میں آنے والے زمانوں کے پیچھے منتظر کھڑی اقوام وملل کو مخاطب کرتے ہیں اور ایسی آواز کے ساتھ منادی کرتے ہیں کہ تمام جن وانس کو، تمام جگہوں پر اور تمام زمانوں میں سنا دیتے ہیں۔ جی ہاں؛ ہم سن رہے ہیں۔

نویں بنیاد:

وہ انتہائی بلند آہنگ مضبوط خطاب کرتے ہیں جسے تمام زمانے سنتے ہیں۔ جی ہاں؛ ہر زمانہ ان کی آواز کی گونج سنتا ہے۔

دسویں بنیاد:

آپ ﷺ کی عادات واطوار سے یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ آپ ﷺ پہلے دیکھ رہے ہیں اور پھر اُسی طرح خبر دے رہے ہیں، کیونکہ آپ ﷺ خطرناک ترین اوقات میں بلاخوف وتردّد کمال متانت اور سنجیدگی سے بات کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اکیلے تمام دنیا کو چیلنج دیتے ہیں۔

گیارھویں بنیاد:

وہ اپنی تمام قوت کے ساتھ منادی کرتے اور ایسی قوی آواز کے ساتھ پکارتے ہیں کہ اُن کی آواز پر آدھے کرۂ ارض اور نوعِ بشر کے پانچویں حصے نے لبیک کہہ کر سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہہ دیا ہے۔

بارہویں بنیاد:

وہ پوری سنجیدگی سے دعوت دیتے ہیں اور اتنی مضبوط اور مکمل شکل میں تربیت کرتے ہیں کہ مرورِ دہور کی پیشانیوں پر اور ملکوں کے پتھروں میں قوانین و دساتیر نقش کر دیتے ہیں اور انہیں زمانوں کے چہروں پر ابدی طور پر ثبت کر دیتے ہیں۔

تیرہویں بنیاد:

وہ جن احکام کی تبلیغ کرتے ہیں ان کی صحت کے بارے میں اتنے وثوق اور بے خوفی سے بولتے اور دعوت دیتے ہیں کہ اگر تمام دنیا والے بھی اکٹھے ہو جائیں تو ان کو اپنے احکام میں سے کسی ایک حکم سے بھی پھیر نہ سکیں اور اس پر انہیں پچھتاوا نہ دلا سکیں۔ اس کی گواہی میں آپ ﷺ کی تمام تاریخ حیات کو اور آپ ﷺ کی بلند پایہ سیرت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

چودہویں بنیاد:

وہ اتنے اعتماد کے ساتھ دعوت دیتے اور اتنے اطمینان کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں کہ کسی کا احسان نہیں لیتے۔ کسی مشکل کے سامنے آتے وقت بغیر خوف و تردد کمال سنجیدگی اور صفائے دل سے ہر ایک سے پہلے عمل کرتے اور قبول کرتے ہیں اور اپنے لائے ہوئے احکام کا اعلان کرتے ہیں۔ اس بات کا گواہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی فانی آرائشوں زیبائشوں کو کبھی خاطر میں نہیں لائے اور دوستوں دشمنوں کے بالاتفاق ان چیزوں سے مستغنی اور کنارہ کش رہے۔

پندرہویں بنیاد:

آپ ﷺ کا اپنے لائے ہوئے دین کے لیے سب سے زیادہ اطاعت گزار رہنا، اپنے خالق و مالک کی بندگی میں سب سے زیادہ مگن رہنا، منہیات سے سب سے بڑھ کر دامن بچا کر رکھنا۔ یہ سب چیزیں قطعی طور پر اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ سلطانُ الازل والابد کے مبلغ اور اس کے پیغمبر ہیں، اس معبودِ برحق کے مخلص ترین بندے ہیں اور کلامِ اَزلی کے ترجمان ہیں۔

ان پندرہ بنیادوں کا حاصل یہ ہے کہ: ان مذکورہ اوصاف سے متصف وہ سردارِ عالم اپنی تمام قوت کے ساتھ اپنی تمام زندگی میں بہ اصرار و تکرار کہتا ہوا ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ وحدانیت کا اعلان کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ عَدَدَ حَسَنَاتِ اُمَّتِهٖ۔

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

اکرامِ الٰہی اور عنایتِ ربانیہ کا ایک نشان

اس امید پر کہ میری یہ بات فرمان گرامی ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ کے مضمون کا مصداق بن جائے؛ میں کہتا ہوں: اس کتاب کی تالیف میں حق تعالیٰ کی عنایت، مہربانی اور رحم و کرم کا ایک بہت بڑا نشان ہے۔ میں اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ قارئین کرام اسے پورے اہتمام کے ساتھ دیکھیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا دل میں کبھی خیال تک بھی نہیں گزرا تھا؛ کیونکہ رسالتِ محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں انیسویں اور اکیسویں مقالے میں خاطر خواہ بحث ہو چکی ہے۔

لیکن ایک دن اچانک دل میں اس کتاب کو تالیف کرنے کا خیال وارد ہوا۔ میری قوت حافظہ بھی مصائب و آلام جیسے تھپیڑوں کی وجہ سے کافی بجھ سی گئی تھی۔

پھر میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اپنے مشرب کے مطابق نظر ادھر ادھر سے نقل کر لئے اور قیل و قال کے انداز میں نہیں لکھا ہے۔

پھر میرے پاس حدیث اور سیرت کی کتابیں بھی نہیں تھیں۔

لیکن اس کے باوجود میں نے اللہ پر توکل کیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ تب توفیقِ خداوندی اس طرح شاملِ حال ہوئی کہ میرے حافظے نے "قدیم سعید" کے حافظے سے بھی بڑھ کر میرا ساتھ دیا۔ چنانچہ ہر دو یا تین گھنٹوں میں تیزی کے ساتھ تیس چالیس صفحات سپردِ قلم ہوئے۔ ایک گھنٹے میں پندرہ صفحات لکھ دیے جاتے تھے جن میں سے اکثر بخاری، مسلم، بیہقی، ترمذی اور شفاء شریف ابونعیم، طبری اور ان جیسی دیگر کتابوں سے نقل ہوتے تھے حالانکہ نقل کرنے میں اگر غلطی ہو جائے تو گناہ لازم آتا ہے، کیونکہ حدیث کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ اس لیے میرا دل کانپ کانپ جاتا تھا۔

لیکن پتا چلا کہ عنایتِ الٰہی میرے شامل حال ہے اور ایسی کتاب کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ تمام حدیثیں بالکل صحیح لکھی گئی ہوں۔ ان شاء اللہ۔

پس میں اپنے بھائیوں سے یہ امید کرتا ہوں کہ حدیث کے بعض الفاظ میں یا راویوں کے ناموں میں اگر غلطی نظر آئے تو غلطی نظر انداز کر کے تصحیح کر دیں۔

سعید نورسی

جی ہاں؛ ہمارے استاد بولتے جاتے تھے اور ہم مسودہ لکھتے جاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی اور انہوں نے کسی کتاب کی طرف مراجعت بھی نہ کی۔ چنانچہ وہ انتہائی سرعت کے ساتھ بولتے اور ہم لکھتے تھے۔ ہم دو، تین گھنٹوں میں کم و بیش تیس چالیس صفحات لکھ لیتے تھے۔ چنانچہ ہمارا یہ اعتقاد پختہ ہو گیا کہ یہ کامیابی معجزات نبوی ﷺ کی ایک بہت بڑی کرامت ہے۔

بیسواں مکتوب

باسمہٖ سُبْحَانَہٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ﴾

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَھُوَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ

یہ توحیدی جملہ گیارہ کلمات پر مشتمل ہے انہیں فجر اور مغرب کی نماز کے بعد پڑھنے کے بہت سے فضائل ہیں۔ایک صحیح روایت کے مطابق یہ اسمِ اعظم کے مرتبے کا حامل ہے۔اس کے ہر کلمے میں ایک بشارت اور توحید ربوبیت کا ایک مرتبہ اور اسمِ اعظم کے اعتبار سے وحدت کی کبریائی اور وحدانیت کا کمال پایا جاتا ہے۔

اِن عظیم الشان بلند پایہ حقائق کی وضاحت چونکہ تمام مقالات میں کر دی گئی ہے،اس لیے اس ضمن میں ان مقالات کا حوالہ دینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔اس مقام پر ہم اپنے ایک وعدے کے مطابق اجمال کے ساتھ خلاصے کی صورت میں ایک فہرست پیش کریں گے جو دو مقامات اور ایک مقدّمے پر مشتمل ہوگی۔

مقدمہ

یہ بات یقینی طور پر جان لو کہ تخلیق کی بلند ترین غرض وغایت اور فطرت کا بلند ترین نتیجہ ''ایمان باللہ'' ہے۔

اور انسانیت کا بلند ترین مرتبہ اور بشریت کا عظیم ترین مقام ایمان باللہ میں پائی جانے والی معرفت ہے۔

اور جن وانس کی بلند ترین سعادت اور شیریں ترین نعمت اس معرفت میں پائی جانے والی اللہ کی محبت ہے۔

اور روحِ بشر کے لیے سب سے خالص سرور اور قلبِ انسان کے لیے پاکیزہ ترین فرحت اللہ کی اس محبت میں پائی جانے والی روحانی لذت ہے۔

جی ہاں؛ حقیقی سعادت سرورِ خالص لذیذ نعمت اور صافی لذت صرف اللہ کی معرفت اور اس کی محبت میں ہے،اس کے علاوہ کہیں نہیں ہوسکتی۔اس لیے جس نے اللہ کو پہچان لیا اور اس کے ساتھ محبت کی وہ بے شمار نعمتوں،سعادتوں اور انوار و اسرار کا بالفعل یا بالقوۃ مظہر بن جاتا ہے،

اور جو اس کی حقیقی پہچان نہیں کرتا اور اس کے ساتھ حقیقی محبت نہیں رکھتا وہ مادی اور معنوی طور پر لامتناہی بدبختی،بدنصیبی

،آلام ومصائب واوہام میں مبتلا رہے گا۔

جی ہاں؛ اس ذلیل دنیا میں، اس آوارہ نوعِ بشر کے درمیان، بے ثمر اور لاحاصل زندگی میں ایک بے یار و مدد گار انسان اگر تمام دنیا کا بادشاہ بھی بن جائے تو اس کی کیا قیمت ہوگی؟

پس اگر انسان اس پریشان اور فانی دنیا میں اس آوارہ نوعِ بشری کے درمیان رہ کر اپنے مالک کو نہ پاسکے تو وہ کتنا بڑا مسکین، مصیبت زدہ اور حیران و پریشان رہتا ہے ہر کوئی جانتا ہے۔لیکن اگر وہ اپنے پروردگار کو پالے گا اور اپنے مالک کو پہچان لے گا تو اس کی رحمت کی پناہ میں آئے گا اور اس کی قدرت کا سہارا لے لے گا۔تب اس کی یہ وحشت خیز دنیا ایک مانوس اور سرسبز وشاداب نزہت کدے میں اور منفعت خیز تجارت کے بازار میں تبدیل ہو جائے گی۔

پہلا مقام

اس توحیدی کلام کے ہر گیارہ کلمات میں سے ہر کلمے میں ایک بشارت ہے، اس بشارت میں شفاء ہے اور اس شفاء میں ایک معنوی لذّت ہے۔

پہلا کلمہ: ہے''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ''۔اور اس میں بشارت اس طرح سے پائی جاتی ہے کہ: روحِ انسانی جو کہ غیر محدود حاجات وضروریات سے دوچار ہے اور لاانتہا دشمنوں کے حملوں کی زد میں ہے، اسے اس کلمے میں ایک ایسا نقطۂ استمداد ملتا ہے جو اس کے لیے اس کی تمام حاجات وضروریات کو بَر لانے والے خزینۂ رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے۔اور اُسے مطلق قدرت کے مالک خالق ومعبود کی طرف سے ایک ایسا نقطہ استناد ملتا ہے جو اسے اس کے تمام دشمنوں کی شر سے بے خوف کر دیتا ہے اسے اس کے پروردگار کا دیدار کرا دیتا ہے اور دکھا دیتا ہے کہ اس کا مالک کون ہے۔اور اس دیدار کی برکت اس کے دل کو بے پایاں وحشت سے اور اس کی روح کو الم خیز غم سے بچالیتا ہے اور اسے ابدی فرحت اور دائمی سرور سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

دوسرا کلمہ:''وَحْـدَهٗ''اس کلمے میں ایک شفا بخش اور سعادت مند قسم کی بشارت پائی جاتی ہے، اور وہ اس طرح کہ انسان کی روح اور اس کا دل جن کا کائنات کی اکثر انواع کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اور اس تعلق کی وجہ سے یہ دونوں ذلت اور تنگیوں میں غرق ہو جانے تک جا پہنچے ہیں؛ یہ دونوں''وَحْـدَهٗ''کے کلمے میں ایک ایسی جائے پناہ اور ایسی جائے نجات پالیتے ہیں جو انہیں ان تنگیوں ترشیوں اور ذلتوں سے نجات دلا دیتی ہے۔

یعنی''وَحْـدَهٗ''کا لفظ معنوی طور پر انسان سے کہتا ہے: اللہ ایک ہے، کسی اور چیز کی طرف رجوع کر کے اپنے آپ کو تھکانا نہیں۔ان چیزوں کے احسان اُٹھا کر ان کے سامنے ذلیل نہ ہونا۔ان کے سامنے سر جھکا کر ان کی چاپلوسی نہ کرنا۔ان کی پیروی کر کے مشقت نہ اُٹھانا۔ان سے ڈر کر کانپنا نہیں کیونکہ سلطانِ کائنات ایک ہی ہے، اُسی کے پاس ہر چیز کی

چابیاں ہیں اور اُسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی لگام ہے اور اُسی کے اَمر سے ہر چیز کے عُقدے کُھلتے ہیں۔اسے پالے گا تو اپنے تمام مطالب و مقاصد پالے گا اور بے شمار احسانوں اور خوف سے نجات پا جائے گا۔

تیسرا کلمہ: ''لَا شَرِيكَ لَهُ'' یعنی جیسے اس کا اس کی الوہیت اور سلطنت میں کوئی شریک نہیں؛ کیونکہ اللہ ایک ہوتا ہے متعدد نہیں؛ اسی طرح اس کی ربوبیت میں، احکام صادر کرنے میں، کام کاج نپٹانے میں اور اشیاء کو ایجاد کرنے میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں؛ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ تو ایک ہوتا ہے اور سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوتا لیکن اس کے ملازم حکومت کے معاملات اور کام کاج چلانے میں اس کے شریک کار شمار ہوتے ہیں۔اور ہر ایک کو دربار میں جانے کی اجازت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ پہلے ہمارے ساتھ رابطہ کرو اور جو چاہتے ہو ہمیں بتاؤ۔لیکن سلطانُ الازل والابد حق سبحانہ وتعالیٰ اپنی ربوبیت میں بھی احکام واوامر کو نافذ کرنے میں اس قسم کے درباریوں مصاحبوں اور شریک کاروں کا محتاج نہیں۔اور اس کی سلطنت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔اس کے امر، ارادے، طاقت اور قوت کے بغیر کوئی چیز کسی دوسری چیز کے لیے مؤثر نہیں ہو سکتی اس لیے ہر کوئی اپنا سوال اس کے سامنے بغیر کسی واسطے کے پیش کر سکتا ہے۔اور اس سوالی کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ: اس کا شریک اور مددگار نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا۔

پس یہ کلمہ روحِ انسانی کو کچھ اس طرح سے ایک بشارت دیتا ہے: کہ

وہ انسانی روح جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو چکی ہے وہ اس جمیل ذوالجلال اور قدیر ذوالکمال کی حضوری میں بلا روک ٹوک جا سکتی ہے، اور اُس سلطانُ الازل والابد، رحمت کے خزانوں اور سعادت کے دفینوں کے مالک کے حضور ہمہ وقت، ہر جگہ، ہر حالت میں کسی بھی وسیلے اور ممانعت کا سامنا کیے بغیر اپنا ہر مطالبہ پیش کر سکتی ہے اور اس کی رحمت کو حاصل کر کے اور اس کی قدرت کا سہارا لے کر کمال فرح وسرور سے بہرہ ور ہو سکتی ہے!

چوتھا کلمہ: ''لَهُ الْمُلْكُ''

یعنی ملک تمام کا تمام اُس کا ہے، اور تو بھی اس کا مُلک اور مملوک ہے اور اس کے ملک میں کام کرتا ہے۔

یہ کلمہ ایک شفا بخش خوشخبری دیتا اور کہتا ہے:

اے انسان! خود کو اپنا مالک ہرگز نہ سمجھنا؛ کیونکہ تو اپنی ذات کے معاملات نہیں چلا سکتا؛ کیونکہ یہ بوجھ بہت گرانبار ہے اور تو اکیلا اس کی حفاظت نہیں کر سکتا اور یوں مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچ کر اپنی حاجات وضروریات پوری نہیں کر سکتا۔اگر ایسا ہی ہے تو پھر پریشان ہو کر بے فائدہ مصیبتیں مت جھیل؛ کیونکہ مُلک کا مالک کوئی اور ہے اور وہ مالک بڑا قدیر و رحیم ہے۔اس کی قدرت کا سہارا لے اور اس کی رحمت کو الزام نہ دے۔غم نہ کر، خوش رہا کر، مشقت سے بچ اور صاف دل بن جا۔

اور یہ بھی کہتی ہے کہ: یہ کائنات جس کے ساتھ تُو پیار کرتا ہے، اس کے ساتھ معنوی تعلق رکھتا ہے، اُس کی پراگندگی سے متاثر ہوتا اور دکھ اُٹھاتا ہے اور اس کی اصلاح کرنے سے عاجز ہے؛ یہ ایک قدیر ورحیم کی ملکیت ہے اس لیے بادشاہت کو اس کے مالک کے حوالے کردے اور اس سے اس کے حق میں دستبردار ہو جا۔ اس کی اچھائیاں اختیار کر برائیاں نہیں۔ کیونکہ اس کا مالک حکیم ورحیم ہے اپنی بادشاہت میں جیسے چاہتا ہے تصرّف کرتا ہے اور اس میں جیسے چاہے تبدیلیاں لاتا ہے۔

اگر کبھی اس سے دہشت کھا جائے تو ویسے ہی کہہ جیسے ابراہیم حقی نے کہا تھا:

دیکھتے ہیں مالک کیا کرتا ہے
وہ جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے

اس کائنات کی طرف صرف کھڑکیوں سے جھانکو اس کے اندر گھسنے سے گریز کرو۔

پانچواں کلمہ: "لَهُ الْحَمْدُ"۔

یعنی حمد وثناء اور مدح واحسان اسی کے لیے خاص ہے اور اسی کے شایان شان ہے۔ پس نعمتیں سب اسی کی ہیں اور اس کے خزینے سے نکلتی ہیں، اور خزینہ لازوال اور دائمی ہے۔

پس یہ کلمہ خوشخبری دیکر کہہ رہا ہے:

اے انسان! نعمت کے زائل ہو جانے پر رنجیدہ نہ ہو؛ کیونکہ رحمت کا خزانہ ختم نہیں ہوتا۔ اور لذّت کے زائل ہو جانے کے بارے میں مت سوچ اور اس سوچ فکر سے جنم لینے والے غم واندوہ کی وجہ سے واویلا نہ کر؛ کیونکہ اس نعمت کا پھل لاانتہا رحمت کا پھل ہے۔ اور اس کا درخت باقی ہے تو ایک پھل کے ختم ہو جانے کے بعد دوسرا آجائے گا اور پھل آتے جاتے رہیں گے۔

آپ نعمت کی اس لذت میں رحمت کے التفات کا تصور کر کے اس لذّت کا درجہ سو گنا بڑھا سکتے ہیں اور یوں ایک درجے سے لے کر سو درجے تک لذت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

جیسے ایک شان وشوکت والا بادشاہ آپ کو۔ بطور مثال۔ ایک سیب تحفے میں دیتا ہے تو اس سیب کی لذت میں خصوصی شاہی التفات اور سلطانی توجہّ کے ساتھ آپ کو ایک ایسی لذت کا احساس دلاتا ہے جو خود اس سیب کی لذت سے سو درجے بلکہ ہزار درجے بڑھ کر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح کرتا ہے، وہ آپ کے لیے "لَهُ الْحَمْدُ" کے لفظ کے ساتھ یعنی حمد اور شکر کے ذریعے ایک ایسی معنوی لذّت کا دروازہ کھول دیتا ہے جو اس نعمت سے ہزار درجے بڑھ کر لذیذ ہوتی ہے۔ یعنی وہ نعمت عطا کر کے اس

کے ذریعے نعمت سے نوازنے کا تصور دیتا ہے اور منعم کی پہچان کروا دیتا ہے۔ یعنی وہ تمہارے اندر اپنی رحمت کے ملتفت ہونے، اپنی شفقت کے متوجہ ہونے اور تمہیں ہمیشہ اپنی نعمتوں سے نہال رکھنے کا تصور پیدا کر دیتا ہے۔

چھٹا کلمہ: ''یُحْیِی''

یعنی وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی اس زندگی کو رزق کے ذریعے دوام دیتا ہے اور وہی لوازمِ حیات تیار کرتا ہے۔ اور زندگی کی بلند ترین اغراض و مقاصد اُس کی طرف لوٹتے ہیں، اور اس کے اہم نتائج اسی کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کے ننانوے فیصد ثمرات اس کے لیے ہی ہیں۔

پس یہ **کلمہ** اس فانی انسان کو پکارتا ہے، اسے خوشخبری دیتا ہے اور کہتا ہے اے انسان! اپنے کندھے پر زندگی کی بھاری بھرکم تکالیف اٹھا کر خود کو مشقت میں مت ڈالو زندگی کے فنا ہو جانے کا تصور کر کے غمگین مت ہو۔ اور زندگی کے فقط دنیاوی اور غیر اہم پہلوؤں کا ہی مشاہدہ کر کے دُنیا میں آنے کی وجہ سے پچھتاوے کا اظہار مت کرو کیونکہ وجود کے اس سفینے میں زندگی کی مشینری کا تعلق ''اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' کے ساتھ ہے، اس کے مصارف اور لوازمات کا وہی بندوبست کرتا ہے۔ اور اس زندگی کے نتائج اور اغراض و مقاصد بہت زیادہ ہیں اور وہ اُسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ اور تم اس سفینے میں ایک سپاہی اور اس کے ملاح ہو، اس لیے اپنی ڈیوٹی تندہی سے ادا کرو، مزدوری لو، اپنی راحت و رامش کا خیال رکھو اور اس بات میں دھیان دو کہ زندگی کا یہ سفینہ بہت قیمتی ہے اور خوبصورت فائدوں کا حامل ہے اور اس سفینے کا مالک بڑا رحیم و کریم ہے، اس لیے خوش رہو اور شکر ادا کرتے رہو۔

اور یاد رکھو کہ اگر تم نے اپنی یہ ذمہ داری استقامت کے ساتھ ادا کر لی تو اس سفینے کے برآمد کردہ تمام نتائج ایک لحاظ سے تمہارے اعمال کے دفتر میں منتقل ہو جائیں گے، اور تمہارے لیے باقی رہنے والی زندگی کی ضمانت دیں گے اور تمہیں ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید کر دیں گے۔

ساتواں کلمہ: ''وَیُمِیْتُ''

یعنی موت دینے والا وہی ہے، یعنی تمہیں وظیفۂ حیات سے آزاد کرتا ہے، اس دنیائے فانی سے تمہاری جگہ تبدیل کر دیتا ہے اور تجھے خدمت کی تکلیف سے آزاد کر دیتا ہے، مطلب یہ کہ تمہیں فانی حیات سے باقی زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔ پس یہ کلمہ فانی جنوں اور انسانوں کو پکار کر کہتا ہے: تمہارے لیے خوشخبری ہے؛ کیونکہ موت نیست کرنا نہیں، محروم ہو جانا نہیں، کٹ جانا نہیں، بُجھ جانا نہیں، ابدی فراق نہیں، اتفاقی حادثہ نہیں اور خود بخود بغیر کسی فاعل کے منعدم ہو جانا نہیں بلکہ یہ حکیم و رحیم فاعل کی طرف سے آزادی بخشنے کا، جگہ کی تبدیلی کا، ابدی سعادت کی طرف اور ان کے اصلی وطنوں کی طرف کھینچ کر لے جانے کا نام ہے اور یہ اُس عالمِ برزخ کی طرف کھلنے والا ایک دروازہ ہے جو کہ ننانوے فیصد احباب کا

مجمع ہے۔

آٹھواں کلمہ: "وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ"

یعنی جو دائمی معبود اور لازوال محبوب ہے اُس کے حسن و جمال کا صرف ایک جلوہ ہی تمام محبوباؤں کے جلووں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ وہ موجوداتِ عالم میں نظر آنے والے تمام حُسن و جمال اور کمال و احسان سے بڑھ کر آخری درجے کے بلند ترین جمال و کمال اور احسان کا مالک ہے۔ وہ ایک دائمی، ابدی اور اَزلی زندگی کا مالک ہے جو کہ زوال و فنا کے شائبے سے منزّہ اور نقص و قصور کے عوارضات سے مبرّا ہے۔

پس یہ کلمہ جن و انس، تمام ذی شعور، اور اہلِ محبت و عشق کے لیے اعلان کرتا ہے کہ تمہیں خوشخبری ہو؛ کیونکہ تمہیں ایک ایسا محبوب اور باقی رہنے والا محبوب مل گیا ہے جو تمہاری محبوباؤں کی جدائیوں سے حاصل ہونے والے زخموں کا مداوا اور علاج کرتا ہے۔ جب وہ ہے اور وہ باقی ہے تو پھر دوسروں کو کچھ بھی ہو جائے غمگین نہ ہونا، بلکہ ان محبوباؤں میں پایا جانے والا حسن و جمال اور فضل و کمال جس کی وجہ سے تم اُن کے ساتھ محبت کا دم بھرتے ہو، جو اُس باقی رہنے والے محبوب کے باقی رہنے والے حسن و جمال کے ایک جلوے کے انتہائی ضعیف سائے کا بھی ایک سایہ ہے، جو کہ بہت سے پردوں سے گزر کر آیا ہے، اس لیے ان محبوباؤں کے زوال سے تمہیں کبھی بھی آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے؛ کیونکہ یہ تو فقط آئینے ہیں، اور ان آئینوں میں آنے والی تبدیلی حسن و جمال کی چمک دمک کو نیا پن دیتی رہتی اور سنوارتی رہتی ہے۔ پس جب وہ موجود ہے تو ہر شے موجود ہے۔

نواں کلمہ: "بِيَدِهِ الْخَيْرُ"

مطلب یہ کہ ہر بہتری اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور تمہارے اچھے اعمال اُس کے رجسٹر میں ریکارڈ ہوتے ہیں۔

اور تم جو بھی نیک اعمال کرتے ہو وہ اُس کے ہاں نوٹ کر لیے جاتے ہیں۔

پس یہ کلمہ جن و انس کو منادی کرتا ہوا کہتا ہے:

ارے مسکینو! دنیا چھوڑ کر قبر میں جاتے ہوئے یہ مت کہو کہ: ہائے افسوس! ہمارا گھر تباہ ہو گیا۔ ہماری تگ و دَو بے کار گئی۔ ہم اس خوبصورت وسیع و عریض دنیا کو چھوڑ کر تنگ و تاریک مٹی میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور نا اُمید ہو کر نوحہ خوانی مت کرو؛ کیونکہ تمہارے تمام اموال محفوظ ہیں، تمہارے تمام اعمال لکھ لیے گئے ہیں اور تمہاری تمام خدمات ریکارڈ میں ہیں؛ کیونکہ وہ ربِّ جلیل جس کے ہاتھ میں ہر قسم کی بھلائی ہے اور جو تمہارے ساتھ ہر قسم کی بھلائی کر سکتا ہے اور جو تمہیں تمہاری خدمات کا صلہ دے گا؛ وہ تمہیں وقتی طور پر زمین کے نیچے لے جا کر رکھے گا اور پھر تمہیں اپنے حضور بلوائے گا۔ تمہیں مبارک ہو تم لوگوں نے اپنی خدمات اور اپنی ذمہ داریاں پوری کر لی ہیں، تمہاری آزمائش پوری ہوئی۔ اب تمہیں راحت و رحمت کی

طرف جانا ہے۔ خدمت اور مشقت کے دن ختم ہوئے اور مزدوری لینے کا سفر شروع ہو گیا۔

جی ہاں؛ وہ قدیرِ الجلیل جو کہ اُن بیجوں اور گٹھلیوں کو۔ محفوظ کرتا ہے جو کہ گزشتہ موسمِ بہار کے اعمال کے صحیفے اور اس کی خدمات کے صندوقچے ہیں۔ دُوسرے موسمِ بہار میں پوری شان وشوکت اور پوری آب وتاب کے ساتھ محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اس انداز کے ساتھ نشر کر دیتا ہے کہ وہ اپنی اصل صورت سے بھی سو درجے زیادہ برکت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ وہ قدیرُ الجلیل بہر کیف تمہارے نتائجِ حیات کو اسی طریقے سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری خدمات کا انتہائی گرانقدر طریقے سے بدلہ دے گا۔

دسواں کلمہ: ''وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ''

یعنی وہ واحد ہے اَحَد ہے، ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کے لیے کوئی بھی کام قطعاً مشکل نہیں۔ اس کے لیے موسمِ بہار کو پیدا کرنا ایک پھول کے پیدا کرنے کی طرح آسان ہے اور جنت کو پیدا کرنا اُس کے لیے موسمِ بہار کو پیدا کرنے کی طرح آسان ہے۔ اور اُس کی وہ لامحدود مخلوقات جنہیں وہ ہر روز، ہر سال اور ہر دور میں نُو بنُو صورت میں پیدا کرتا ہے، وہ سب غیر متناہی زبانوں کے ساتھ اُس کی بے پایاں قدرت کی گواہی دیتی ہیں۔

یہ کلمہ بھی خوشخبری دیتا ہے اور کہتا ہے:

اے انسان! تُو جو خدمت اور عبودیت سرانجام دے رہا ہے وہ بے فائدہ اور بے کار نہیں جائے گی۔؛ کیونکہ اُس نے تیرے لیے ایک دارِ مکافات اور محلِ سعادت تیار کر رکھا ہے۔ اور تیری اس فانی دنیا کے بدلے ایک باقی رہنے والی جنّت تیرا انتظار کر رہی ہے۔ اس لیے بے خوف ہو جا اور اس خالقُ الجلیل کے وعدے پر اعتماد رکھ جس کی تو عبادت کرتا ہے اور جسے جانتا پہچانتا ہے، کیونکہ وعدے کی خلاف ورزی کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ اور اس کی قدرت میں کسی بھی جہت سے کوئی کمی نہیں اور اس کے اعمال میں عجز و درماندگی کا عمل دخل نہیں ہے۔ اُس نے جس طرح تیرا یہ باغیچہ پیدا کیا ہے، وہ تیرے لیے جنت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اور اُس نے وہ جنت تیرے لیے پیدا کر دی ہے اور اس کے بارے میں اُس نے تیرے ساتھ وعدہ بھی کیا ہوا ہے۔ اور بے شک وہ اپنے وعدے کے مطابق تجھے اُس میں داخل بھی کرے گا۔

ہم جب اپنے مشاہدے کے ذریعے دیکھتے ہیں کہ وہ سطحِ زمین پر ہر سال کمال انتظام و میزان اور کمال سرعت و سہولت کے ساتھ حیوانات و نباتات کی تین لاکھ سے زائد انواع کو محشور کرتا اور بکھیرتا ہے، تو پھر بلا شک اس طرح کا قدیرُ الجلیل پروردگار اپنے وعدے کو پورا کرنے پر قادر ہے۔

پھر جب وہ قدیرِ مطلق جو ہر سال ہزاروں پہلوؤں سے حشر اور جنت کی مثالیں پیدا کرتا ہے، پھر جب وہ اپنی تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے ابدی سعادت کا وعدہ دیتا ہے اور جنت کی خوشخبری دیتا ہے: جس کے تمام افعال اور

شئون واحوال اپنے دامن میں سچائی اور سنجیدگی لیے ہوئے حق اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ پھر جب وہ تمام کمالات اپنے آثار کی رُو سے اُس کے لاانتہا کمال کی گواہی دیتے ہیں اور اس پر دلالت کرتے ہیں، اور وہ کمالات ہر لحاظ سے نقص وقصور اور کمی کوتاہی سے پاک ہیں؛ اور جب وعدہ توڑنا، اس کی خلاف ورزی کرنا، جھوٹ بولنا اور دھوکہ دینا سب سے بری خصلت اور نقص وقصور ہے تو پھر یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ وہ قدیرِ ذُوالجلال، حکیم ذوالکمال اور رحیم ذُوالجمال عنقریب اپنا وعدہ پورا کرے گا اور ابدی سعادت کا دروازہ کھولے گا اور تمہیں اے مومنو! اُس جنت میں داخل کرے گا جو تمہارے باپ آدم کا اصلی وطن ہے۔

گیارھواں کلمہ: ''وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ''

یعنی جو لوگ دارُالامتحان کی حیثیت رکھنے والی اس دنیا میں تجارت اور خدمت کے ضمن میں بڑی اہم ذمہ داریاں دے کر اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں، وہ اپنی تجارت وذمہ داریاں ختم کر کے اپنی خدمات کی نشوونما کرنے کے بعد اپنے خالق الجلیل کی طرف لوٹ جائیں گے اور اپنے اس مولائے کریم سے جا ملیں گے جس نے انہیں بھیجا تھا۔ یعنی اس دارِ فانی سے گزر کر دارِ باقی میں حضور کبریائی سے مشرّف ہو جائیں گے۔

یعنی وہ اسباب کی گہرائیوں سے اور وسائط کے تاریک پردوں سے جان بچا کر بغیر کسی پردے کے اپنے ربّ رحیم سے اس کی ابدیت کی سلطنت کے پایۂ تخت میں جا ملیں گے۔ ان میں سے ہر کوئی اپنے خالق، معبود، ربّ اور مالک کو جان لے گا اور بغیر کسی توسّط کے اُسے پالے گا۔

پس یہ کلمہ تمام خوشخبریوں سے آگے بڑھ کر ایک بہت بڑی خوشخبری دیتا ہے اور کہتا ہے: اے انسان! کیا تجھے اس بات کا علم ہے کہ تو کہاں جا رہا ہے اور تجھے ہانک کر کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ تو اُس جمیلِ ذوالجلال کے دائرۂ رحمت کی طرف جا رہا ہے جس کے جمال کے دیدار کی یہ حالت ہے کہ سعادتمندیوں سے بھری ہوئی ہزار سالہ دنیاوی زندگی جنت کی زندگی کی ایک گھڑی کے برابر نہیں! اور جنت کی ہزار سالہ زندگی اس کے جمال کے دیدار میں گزاری ہوئی ایک گھڑی کی زندگی کی برابری بھی نہیں کر سکتی ہے۔ جیسے کہ بتیسویں مقالے کے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

اور تُو اس جمیلِ ذوالجلال کی حضوری کے مرتبے پر فائز ہونے کے لیے جا رہا ہے۔

اور تُم سب اُس معبودِ اَزلی اور محبوبِ ابدی کی حضوری کے دائرے کی طرف گام زن ہو کہ تمام دنیاوی موجودات اور مجازی محبوبات جن سے تم دو چار اور جن کی محبت میں گرفتار ہوئے ہو، جن پر تُم فریفتہ ہو اور جن کے تم مشتاق ہو؛ ان سب میں پایا جانے والا حسن و جمال جس کے حسین وجمیل ناموں کا ایک قسم کا جلوہ ہے اور جنت اپنے تمام تر لطائف ولذائذ سمیت جس کی رحمت کا ایک جلوہ ہے۔ اور ہر قسم کا اشتیاق، محبت اور انجذاب وجاذبیت جس کی محبت کی ایک جھلک ہے۔

اور تمہیں اس کے ابدی مہمان خانے یعنی جنت کی طرف بلایا جا رہا ہے جو اس کا ابدی مہمان خانہ ہے۔ پس اگر ایسے ہی ہے تو پھر قبر کے دروازے میں تمہیں روتے ہوئے نہیں بلکہ ہنستے ہوئے داخل ہونا چاہیے۔

اسی طرح یہ کلمہ یہ خوشخبری بھی دیتا ہے اور کہتا ہے: لوگو! وہم کرتے ہوئے یہ مت سمجھو کہ تم فنا، عدم، ظلمات، شکست وریخت ٹوٹنے بکھرنے اور پارہ پارہ ہونے اور کثرت میں غرق ہو جانے کے لیے جا رہے ہو؛ تم فنا کی طرف نہیں بقا کی طرف جا رہے ہو، اور تمہیں عدم کی طرف نہیں بلکہ دائمی وجود کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، اور تم ظلمات میں نہیں بلکہ عالم نور میں داخل ہو رہے ہو۔

اور حقیقی مالک کی طرف چلے جا رہے ہو، سلطانِ ازلی کے دارالخلافہ کی طرف لوٹ کر جا رہے ہو، تم کثرت میں غرق نہیں ہو جاؤ گے بلکہ وحدت کے دائرے میں سانس لو گے، اور تمہارا رخ فراق کی طرف نہیں بلکہ وصال کی طرف ہے۔

دوسرا مقام

اسمِ اعظم کی رُو سے توحید کے اثبات کی طرف ایک مختصر سا اشارہ۔

پہلا کلمہ: ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ '' میں ایک قسم کی توحیدِ اُلوہیت اور معبودیت پائی جاتی ہے۔ توحید کے اس مرتبے کی طرف ہم ایک قوی برہان کے ساتھ اشارہ کریں گے۔ اور وہ یہ ہے کہ:

سطحِ عالم پر اور خاص کر صحیفۂ زمین پر ایک انتہائی درجے کے انتظام پر مشتمل منظم فعالیت نظر آتی ہے، ہم غایت درجے کی حکمت پر مشتمل حکیمانہ خلاّقیت کا مشاہدہ کر رہے ہیں، اور ہم عین الیقین کے ساتھ آخری درجے کے انتظام پر مشتمل فتاّحیت دیکھ رہے ہیں، یعنی ہر شے کی ایک ایسی صورت گری کر دی گئی ہے جو اُس کے لائق ہے اور اُسے ایسی شکل عطا کر دی گئی ہے جو اُس کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ اور ہمیں کرم اور رحمت سے بھرپور وہّابیّت اور احسانات نظر آ رہے ہیں۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پس یہ حالت اور یہ کیفیت ایک فعال، خلاّق، فتاّح اور وہّاب ذاتِ ذوالجلال کے وجودِ واجب اور اس کی وحدانیت کو ثابت کرتا بلکہ اس کا احساس دلاتا ہے۔

جی ہاں؛ موجودات کا ہمیشہ دوامی صورت میں زائل ہونا اور دوبارہ نئی نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو جانا، یہ دونوں چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ موجودات ایک صانعِ قدیر کے ناموں کے جلوے اور اُس کے مقدس ناموں کے انوار کے پرتو ہیں۔ اس کے افعال کے آثار ہیں۔ اس کی تقدیر اور قدرت کے قلم کے نقوش اور صحیفے ہیں اور اس کے جمال کمال کے آئینے ہیں۔

پس وہ پروردگارِ عالم توحید کی اس عظیم الشان حقیقت کا اور اس کے بلند مرتبے کا اپنی تمام کتابوں کے ذریعے اور اپنے

مقدس صحیفوں کے ذریعے اثبات کرتا ہے۔ اسی طرح تمام اہلِ حقیقت اور نوع بشر کے کامل افراد اپنی تحقیقات و کشفیات کے ساتھ توحید کے عین اسی مرتبے کا اثبات کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ کائنات اپنے عجز و فقر کے باوجود صنعت کے معجزات اور قدرت کے خوارق کی گواہی کے ذریعے توحید کے عین اسی مرتبے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

پس وہ شاہدِ ازلی اپنی تمام کتابوں کے ساتھ اور اپنے صحیفوں کے ساتھ۔

اہلِ شہود اپنی تمام تحقیقات و کشفیات کے ساتھ اور عالمِ شہادت اپنے تمام منظم احوال اور حکیمانہ شئون و کیفیات کے ساتھ بالاجماع اس توحیدی مرتبے پر متفق ہیں۔

پس جو اس واحدُ الاحد کو قبول نہیں کرتا وہ یا تو لاانتہا معبودوں کو قبول کرے گا، اور یا پھر احمق سوفسطائی کی طرح خود اپنے اور کائنات کے وجود کا انکار کرے گا۔

دوسرا کلمہ: ''وَحْدَہٗ''

یہ کلمہ توحید کے مراتب میں سے ایک صریح مرتبے کو آشکار کرتا ہے۔ اس مرتبے کا اثبات کرنے والی عظیم الشان قوی ترین برہان کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کریں گے کہ:

ہم جب بھی آنکھیں کھولتے ہیں اور روئے کائنات پر نظریں گاڑھتے ہیں تو سب سے پہلے جو چیز ہماری آنکھوں سے دوچار ہوتی ہے وہ ہے اس میں پایا جانے والا کامل نظامِ عام اور ہمہ گیر حساس میزان۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز ایک دقیق نظام اور حساس میزان اور حساس پیمانے کے تحت چل رہی ہے۔

پھر ہم جب دوسری مرتبہ مزید گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں ایک تنظیم اور توزین کے ساتھ دوچار ہوتی ہیں۔ یعنی کوئی ایک ہستی ہے جو اس نظام میں پورے انتظام کے ساتھ تبدیلیاں لارہی ہے، اور اس میزان کو نہایت جچے تُلے انداز کے ساتھ نت نئی جہتیں دیے جارہی ہے، جس کی وجہ سے ہر چیز ایک ایسا نمونہ اور ماڈل بن گئی ہے جس پر بہت سی منظم اور موزون صورتیں ڈھالی جارہی ہیں۔

پھر اگر مزید گہری نظر سے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ اس تنظیم و توزین کے تحت ایک زبردست حکمت اور عدالت کام کررہی ہے، چنانچہ ہر حرکت میں کسی حکمت اور کسی مصلحت کا خیال رکھا جاتا ہے اور اس میں پے در پے حق اور فائدہ چلا آرہا ہے۔

اور اگر ذرا مزید گہری نظر سے دیکھا جائے تو ہمارے شعور کی نظر قدرت کے ایسے مظاہر سے دوچار ہوتی ہے جن کے اندر حکمت بھری فعّالیت کام کررہی ہے۔ اور ایک ایسے ہمہ گیر علم کے جلوے کارفرما ہیں جو ہر چیز کا اُس کے ہر پہلو سے احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات میں پایا جانے والا یہ نظام اور میزان ہمارے سامنے ہر چیز میں پائی جانے والی ایک ہمہ گیر تنظیم اور توزین کو ظاہر کرتے ہیں، اور یہ تنظیم و توزین ہمارے سامنے ایک حکمتِ عامہ اور عدالت کو ظاہر کرتے ہیں، اور یہ حکمت اور عدالت ایک ہمہ گیر قدرت اور علم کو ظاہر کرتے ہیں۔

پس ان پردوں کے پیچھے سے عقل کو ہر چیز پر قادر اور ہر چیز کا علم رکھنے والی ہستی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

پھر ہم ہر چیز کی اور خاص کر ذی حیات کی ابتدا اور اس کی انتہا کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ان کی ابتدائیں، ان کے اصول اور جڑیں، اور اسی طرح ان کے ثمرات ونتائج محصولات کچھ ایسے انداز پر واقع ہوئے ہیں کہ گویا ان کے بیج، اصول اور جڑیں پروگرام ہیں، فہرستیں ہیں اور تعریفات ہیں جس کے اندر وجود میں آئی ہوئی اس چیز کے تمام آلات وادوات اور کل پرزے موجود ہیں۔ اسی طرح اس موجود چیز کے نتیجے میں اور اس کے پھل میں زندگی سے بہرہ ور ہونے والے اُس وجود کا معنی دوبارہ جمع ہوتا ہے اور ٹپکتا ہے، اور یوں اس میں اپنی تاریخ حیات چھوڑ جاتا ہے گویا کہ زندگی سے بہرہ ور اس وجود کی گٹھلی جو کہ اُس کا اصل ہے، وہ اس کی ایجاد کے قوانین ودساتیر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ رہے اس کے نتائج وثمرات تو وہ اس کی ایجاد کے اوامر کی فہرستوں کا حکم رکھتے ہیں۔

پھر ہم اس زندہ وجود کے ظاہر و باطن کو دیکھتے ہیں تو ہمیں غایت درجے کی حکمت پر مشتمل قدرت کے تصرفات اور نافذ ہونے والے ارادے کی تصویر کشی، صورت گری اور نظم وضبط کی جلوہ آرائیاں نظر آتی ہیں۔ یعنی ایک قوّت اور قدرت اس چیز کو ایجاد کرتی ہیں اور ایک امر وارادہ اس چیز کو صورت عطا کرتے ہیں۔

پس جُوں جُوں ہم کسی بھی وجود والی چیز کو اوّل اور آغاز کے بارے میں گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے بارے میں علم کا شرح نامہ حاصل ہوتا ہے۔ جب اس کے آخر میں غور کرتے ہیں تو ہمیں صانع وقدیر ہستی کے پروگرام اور پیغامات نظر آتے ہیں۔ اس کے ظاہر کو دیکھتے ہیں تو وہ ایک صاحب اختیار وارادہ ہستی کی کاریگری کی ایک خوبصورت پوشاک نظر آتی ہے ایک ایسی پوشاک جس میں کاریگری اور تناسُب کی جھلک ہے۔ اور اس کے باطن کی طرف نظر کرتے ہیں تو وہ چیز ایک قدیر ہستی کی ایک انتہائی منظم مشینری نظر آتی ہے۔

پس یہ حالت اور یہ کیفیت بالضرورت اور بالبداہت اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ کوئی چیز، کوئی وقت اور کوئی مکان اُس ایک ہی صانع جلیل کے قبضۂ قدرت سے باہر اور کوئی چیز اس کی تدبیر اور تصرّف سے خارج نہیں بلکہ ہر ایک چیز اور تمام اشیاء اپنے تمام احوال سمیت ایک صاحبِ قدرت اور صاحبِ ارادہ ہستی کے قبضۂ تصرف میں چلائی جاتی ہیں، اور کسی رحمان ورحیم کے لطف وکرم سے اس کی آرائش وزیبائش کی جاتی ہے اور کسی حنّان ومنّان ہستی کی آرائش وزیبائش سے بنائی، سنواری اور مزیّن کی جاتی ہے۔

جی ہاں؛ اس کائنات میں اور ان موجودات میں پایا جانے والا یہ نظام و میزان اور تنظیم و تزین ایک صاحب شعور اور دانا و بینا آدمی کو ایک واحد، اَحد، فرد، قدیر، مُرید اور علیم و حکیم ذات کو مرتبۂ وحدانیت میں دکھاتا ہے۔

جی ہاں؛ بے شک ہر چیز میں وحدت پائی جاتی ہے اور وحدت واحد پر دلالت کرتی ہے۔ مثال کے طور پر: دنیا کا چراغ یعنی سورج ایک ہے، مطلب یہ کہ دُنیا کا مالک ایک ہے اور جس طرح ہوا پانی اور آگ _ جو کہ سطحِ زمین تمام جانداروں کے خادم ہیں _ ایک ہیں۔ مطلب یہ کہ جو ان چیزوں کو ہماری خدمت پر لگاتا ہے اور انہیں ہمارے لیے مسخر کرتا ہے، وہ بھی ایک ہے۔

تیسرا کلمہ: ''لَا شَرِيْكَ لَهٗ''

بتیسویں مقالے کے پہلے مقام میں اس کلمے کا اثبات انتہائی تابناک صورت میں اور انتہائی زوردار انداز سے کر دیا گیا ہے؛ اس لیے ہم یہاں اُس کا حوالہ کافی سمجھتے ہیں؛ کیونکہ اس سے بڑھ کر مزید وضاحت نہیں ہوگی، اور اس کے علاوہ کسی وضاحت کا حوالہ ضروری نہیں اور اس سے بڑھ کر وضاحت ہو بھی نہیں سکے گی۔

چوتھا کلمہ: ''لَهُ الْمُلْكُ''

یعنی زمین و آسمان، دنیا و آخرت اور فرش سے لے کر عرش تک اور ثری سے لے کر ثریا تک اور ذروں سے لے کر سیاروں تک اور ازل سے لے کر ابد تک ہر موجود اس کی بادشاہت ہے۔ اور وہ توحیدِ اعظم کی صورت میں عظیم ترین مالکیت کے مرتبے کا مالک ہے۔

مالکیت کے مراتب میں سے اس مرتبۂ عظمیٰ کے لیے، توحید کے مقامات میں سے اس عظیم ترین مقام کے لیے، ایک لطیف وقت میں اور ایک لطیف واردات کی صورت میں عربی زبان میں اس عاجز کے دل پر ایک حُجّتِ کُبریٰ کا القا ہوا۔ ہم اس لطیف واردات کو بعینہٖ عربی زبان میں لکھیں گے اور پھر اس کا مطلب بیان کریں گے۔ اور وہ یہ ہے:

"لَهُ الْمُلْكُ، لِأَنَّ ذَاكَ الْعَالَمَ الْكَبِيْرَ كَهٰذَا الْعَالَمِ الصَّغِيْرِ، مَصْنُوْعاً قُدْرَتِهٖ، مَكْتُوْباً قَدَرِهٖ اِبْدَاعُهٗ لِذَاكَ صَيَّرَهٗ مَسْجِدًا، اِيْجَادُهٗ لِهٰذَا صَيَّرَهٗ سَاجِدًا اِنْشَاؤُهٗ لِذَاكَ صَيَّرَ ذَاكَ مُلْكًا اِيْجَادُهٗ لِهٰذَا صَيَّرَهٗ مَمْلُوْكًا صَنْعَتُهٗ فِيْ ذَاكَ تَظَاهَرَتْ كِتَابًا، صِبْغَتُهٗ فِيْ هٰذَا تَظَاهَرَتْ خِطَابًا قُدْرَتُهٗ فِيْ ذَاكَ تُظْهِرُ حِشْمَتَهٗ، رَحْمَتُهٗ فِيْ هٰذَا تُنَظِّمُ نِعْمَتَهٗ حِشْمَتُهٗ فِيْ ذَاكَ تَشْهَدُ هُوَ الْوَاحِدُ، نِعْمَتُهٗ فِيْ هٰذَا تُعْلِنُ هُوَ الْاَحَدُ سِكَّتُهٗ فِيْ ذَاكَ، فِي الْكُلِّ وَالْاَجْزَاءِ خَاتَمُهٗ فِيْ هٰذَا، فِي الْجَسْمِ وَ الْاَعْضَاءِ"۔

پہلا فقرہ: " ذَاكَ الْعَالَمَ الْكَبِيْرَ"الخ۔

یعنی عالَمِ اکبر جسے کائنات کہا جاتا ہے، اور عالَمِ اصغر جسے انسان کہا جاتا ہے، اور جو کہ عالَمِ اکبر کا ایک چھوٹا سا نمونہ

ہے۔ یہ دونوں قدرت اور قُدرت کے قلم سے لکھی ہوئی آفاقی وانفسی وحدانیت کے دلائل کو ظاہر کرتے ہیں۔

جی ہاں؛ انسان کے اندر ایک چھوٹے سے پیمانے پر کائنات میں پائی جانے والی منظم صنعت کا نمونہ پایا جاتا ہے چنانچہ جیسے اس دائرۂ کُبریٰ میں پائی جانے والی صنعت صرف ایک صانع پر دلالت کرتی ہے اُسی طرح انسان میں چھوٹے سے پیمانے پر پائی جانے والی دقیق صنعت بھی اُس صانع کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس کی وحدت پر دلالت کرتی ہے۔

اور پھر جس طرح یہ انسان ایک پُر معانی ربانی مکتوب اور ایک منظم تقدیری قصیدہ ہے اسی طرح کائنات بھی ایک منظم تقدیری قصیدہ ہے جو کہ بعینہٖ اُسی تقدیر کے قلم کے ساتھ بڑے پیمانے پر لکھا گیا ہے، تو کیا اس واحدُ الاحد کے علاوہ کسی چیز کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اس انسان کے چہرے میں پائے جانے والے وحدت کے سکّے میں دخل اندازی کر سکے؟ وہ سکّہ جو غیر محدود امتیازی علامات کے ساتھ تمام لوگوں کی طرف دیکھتا ہے۔ یا کائنات پر لگی ہوئی وحدانیت کی مہر میں دخل اندازی کر سکے جس نے تمام موجودات کو شانہ بشانہ، دست بدست اور سر بسر باہمدِگر معاون بنا دیا ہے۔

دوسرا فقرہ: "اِبْدَاعُهُ لِذَاكَ"۔۔۔ الخ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ صانع الحکیم نے اس عالمِ اکبر کو ایک انوکھی صورت پر پیدا کیا ہے اور اس پر اپنی آیات کچھ اس انداز سے نقش کر دی ہیں کہ اس کائنات کو ایک بہت بڑی مسجد بنا دیا ہے اور اُس نے انسان کو اسے عقل سے بہرہ ور کر دیا ہے۔ اور اُسے اس عقل کی بدولت اپنی صنعت کے معجزات اور اپنی قدرت کے عجائب کے سامنے حیرت کے عالم میں سجدہ کروایا ہے۔ اُسے اپنی کبریائی کی آیات پڑھائی ہیں، اس کی فطرت میں عبودیت رکھ کر اُسے اِس مسجدِ کبیر میں سجدے کرنے والا عبادت گزار بنا دیا ہے۔

تو کیا یہ کسی بھی لحاظ سے ممکن ہوسکتا ہے کہ اس مسجدِ کبیر میں ساجدین و عابدین کے لیے اُس واحدُ الاحد سبحان کے علاوہ کوئی اور معبودِ حقیقی ہو؟

تیسرا فقرہ: "اِنْشَاءُهُ لِذَاكَ"۔۔۔ الخ

اس کا مطلب یہ ہے کہ مالکُ الملک ذُوالجلال نے اس عالمِ اکبر کو اور خاص کر روئے زمین کو کچھ اس انداز سے پیدا کیا اور ایجاد کیا ہے کہ یہ غیر محدود متداخل دائرے کا رُوپ دھار گیا ہے۔ اور ان میں سے ہر دائرہ ایک کھیتی کا حکم لے چکا ہے۔ چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً، موسم بموسم اور عہد بعہد اس کھیتی کو بوتا اور کاشتا رہتا ہے اور اس کی محصولات حاصل کرتا رہتا ہے۔ اور اس طرح وہ ہمیشہ اپنی بادشاہت کو مصروفِ عمل رکھتا اور اس میں تصرّف کرتا ہے۔

اور اُس نے اس عالمِ ذرّات کو یعنی دائرۂ کُبریٰ کو ایک کھیتی بنایا ہے اور اس میں فصل بوتا رہتا ہے اور ہمہ وقت اور ہر زمان اس سے اپنی قدرت اور حکمت کے ساتھ کائنات کے برابر محصولات حاصل کرتا رہتا ہے، ان محصولات کو وہ عالمِ

شہادت سے عالمِ غیب کی طرف اور قدرت کے دائرے سے علم کے دائرے کی طرف بھیجتا رہتا ہے۔

پھر اُس نے روئے زمین کو بھی جو کہ متوسط دائرہ ہے۔ بعینہٖ اُسی طرح کی کھیتی بنا دیا ہے جس میں وہ موسم بموسم دیگر انواع کو بوتا کاٹتا اور اٹھاتا ہے اور ان کے معنوی محصولات کو بھی غیبی، اُخروی، مثالی اور معنوی عوالم کی طرف بھیجتا ہے۔

پھر وہ ایک باغیچے کو۔ جو کہ چھوٹا سا دائرہ ہے۔ سو دفعہ بلکہ ہزار دفعہ قدرت کے ساتھ بھرتا ہے اور اسے حکمت کے ساتھ خالی کرتا ہے۔

اور پھر وہ ایک درخت اور انسان جیسے زندہ وجود سے۔ جو کہ ایک چھوٹا سا دائرہ ہے۔ خود اس زندہ وجود سے سو گنا زیادہ محصولات حاصل کرتا ہے۔

پس اُس مالکُ الملک ذوالجلال نے ہر چھوٹی بڑی اور جزئی اور کلّی چیز کو ایک ماڈل کی صورت میں بنایا ہے چنانچہ وہ اُسے سینکڑوں طریقوں سے نت نئے نقوش و نگار کے ساتھ اپنی صنعت کے منقش پارچہ جات پہناتا رہتا ہے اور ان کے ذریعے اپنے ناموں کے جلووں کا اور اپنی قدرت کے معجزات کا اِظہار کرتا ہے۔

اور اُس نے اپنی بادشاہت میں ہر چیز اس صورت شکل میں پیدا کی ہے کہ وہ ایک صحیفے کا حکم رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ ہر صحیفے میں سینکڑوں طریقوں سے معانی پر دلالت کرنے والے اپنے سینکڑوں معنی خیز مکتوب لکھتا ہے اور اپنی حکمت کا اور اپنی آیات کا اظہار کرتا ہے اور وہ آیتیں اپنی ذی شعور مخلوقات سے پڑھواتا ہے۔

جس طرح اس نے اِس عالمِ اکبر کو اپنی بادشاہت کی صورت میں پیدا کیا ہے، اسی طرح اُس نے اس اِنسان کو بھی پیدا کیا ہے اور اُسے اُعضاء و آلات سے، حواس و احساسات سے، اور خاص کر نفس و ہوا اور احتیاج و اشتہا اور حرص و طلب سے نواز کر ایک ایسا مملوک بنا دیا ہے جو اس وسیع و عریض بادشاہت میں تمام بادشاہت کا محتاج ہے۔

اب کیا یہ بات ممکن ہے کہ اُس ملِکُ الملکُ ذوالجلال کے علاوہ کوئی اس بادشاہت میں تصرّف کر سکے اور اس مملوک کا آقا بن سکے؟ وہ مالکُ الملک کہ جس نے عالم ذرّات جیسے بہت بڑے عالَم سے لے کر ایک چھوٹی سی مکھی تک تمام موجودات کو بادشاہت اور ایک کھیت بنا دیا ہے اور اس ''چھوٹے سے انسان'' کو مملوک، عبادت گزار، دلاّل، تاجر، کاشتکار، دریافت کنندہ اور اس بڑی بادشاہت کو دیکھنے والا بنا دیا ہے۔ اور اس انسان کو ایک قابلِ احترام مہمان اور محبوب مخاطَب بنا دیا ہے۔

چوتھا فقرہ: ''صَنْعَتُهُ فِيْ ذَاكَ'' --- الخ

اس کا مطلب یہ ہے کہ: عالمِ اکبر میں پائی جانے والی صانعُ الجلیل کی صنعت اتنے فراواں معانی کی حامل ہے کہ یہ صنعت ایک انوکھی کتاب کا روپ دھار گئی ہے، اور اس نے اِس کائنات کو ایک اتنی بڑی کتاب بنا دیا ہے کہ جس سے عقلِ

انسانی نے نیچرل سائنس اور حقیقی حکمت کی ایک لائبریری حاصل کر لی ہے اور اسے اسی کے مطابق لکھتی چلی جا رہی ہے۔
پس حکمت کی یہ کتاب حقیقت کے ساتھ اِس طرح سے جڑی ہوئی اور اُس سے اس طرح کشید کی گئی ہے کہ اس کا اِعلان قرآن حکیم کی شکل وصورت میں کیا گیا ہے جو کہ کتابِ مبین کا ایک نسخہ ہے۔

کائنات میں پائی جانے والی اس کی صنعت نے جس طرح اپنے کمال انتظام کی وجہ سے کتاب کی شکل اختیار کر لی ہے، اسی طرح انسان میں پائی جانے والی اس کی حکمت کے رنگ ونقش نے خطاب کا پھول کھلا دیا ہے۔

یعنی یہ صنعت اتنی مفید حسّاس اور خوبصورت ہے کہ اُس نے اِس جاندار مشین میں پائے جانے والے آلات کو بُلوا دیا ہے اور وہ گراموفون کی طرح بول پڑے ہیں۔

اور اسے احسنِ تقویم میں پیدا کر کے ایسا رنگ عطا کر دیا ہے کہ اُس سے اِس مادی، جسمانی، جامد کھوپڑی میں بیان و خطاب کا ایک معنوی غیبی اور زندہ وجاوید پھول کِھل جاتا ہے۔

اور انسان کے سر میں پائے جانے والے اس نطق و بیان کی قابلیت کو ایسی عالی شان استعداد اور ایسے آلات عطا کر دیے ہیں کہ اُس قابلیت کو بلندیوں پر پہنچا دیا اور اُسے ایسے مقام پر جلوہ گر کر دیا کہ جہاں وہ سلطانِ ازلی کے خطاب کی اہل بن جاتی ہے۔ یعنی انسانی فطرت میں پائے جانے والے ربانی رنگ نے خطاب الٰہی کا پھول کھلا دیا ہے۔

تو کیا الواحدُ الاَحد کے علاوہ کسی کے لیے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ تمام موجودات میں پائی جانے والی کتاب کے درجے تک پہنچ جانے والے اس رنگ میں دخل اندازی کر سکے؟ حاشا

پانچواں فقرہ: ”قُدْرَتُهُ فِيْ ذَاكَ“۔۔۔ الخ

اِس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ”قدرتِ اِلٰہیہ عالم اکبر میں اپنی ربوبیت کی حشمت کا اِظہار کرتی ہے۔ اور رحمتِ ربانیہ انسان میں جو کہ عالمِ اصغر ہے۔ نعمتوں کی تنظیم کرتی ہے۔

یعنی صانع کی قدرت نے کائنات کو کبریاء وجلال کے نقطۂ نظر سے ایک عالی شان محل کی صورت میں پیدا کیا ہے۔
چنانچہ اِس قدرت نے سورج کو بجلی کا ایک بہت بڑا چراغ بنا دیا، چاند کو قندیل بنا دیا اور ستاروں کو مشعلوں کا روپ دے کر اُن کے ساتھ روئے آسمان کو روشن کر دیا اور اس کے پھلوں کے ساتھ اسے سنہرا بنا دیا۔ اور روئے زمین کو ایک دسترخوان، ایک کھیتی، ایک دلفریب باغیچہ اور ایک قالین بنا دیا اور پہاڑوں کو میخیں، گودام اور قلعے بنا دیا ہے۔ یوں اس نے تمام اَشیاء کو ایک بہت بڑے پیمانے پر اس عالی شان محل کے ساز وسامان کی شکل عطا کر دی ہے، جس سے وہ ایک تابناک صورت میں اس کی ربوبیت کی شان وشوکت کا اظہار کرتی ہے۔

جیسے کہ اس کی رحمت بھی جمال کے نقطۂ نظر سے صغیر ترین جاندار تک تمام ذی ارواح کو اس کی انواع واقسام کی

نعمتوں سے نہال کرتی ہے، اور اسے نعمتوں کے ذریعے کائنات کو اول سے لے کر آخر تک منظم و مزیّن اور لطف و کرم سے آراستہ و پیراستہ کرتی ہے۔ اور جمالِ رحمت کے نغمات گانے والی ان چھوٹی چھوٹی زبانوں کو جلالِ حشمت کے نغمات گانے والی بہت بڑی زبان کے مقابلے میں رکھ دیتی ہے۔۔۔ یعنی سورج اور عرش جیسے بڑے بڑے اجرام زبانِ حشمت کے ساتھ یا جلیل، یا کبیر، یا عظیم کہتے ہیں، تو مکھی اور مچھلی جیسے یہ چھوٹے چھوٹے حیوانات زبانِ رحمت کے ساتھ کہتے ہیں: یا جمیل، یا رحیم یا کریم! اور یوں وہ ان لطیف نغمات کو اُس عظیم الشان موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتی ہے اور ان میں مزید مٹھاس پیدا کر دیتی ہے۔

تو کیا اس جلیل ذو ای ل اور جمیلِ ذُوالکمال کے علاوہ کسی کے لیے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ ایک علیحدہ حیثیت سے تخلیق و ایجاد کی رُو سے اس عالمِ اکبر اور عالمِ اصغر کے معاملات میں دخل اندازی کر سکے؟ حاشا وکلّا!

چھٹا فقرہ: "حِشْمَتُهُ فِيْ ذَاكَ" ۔۔۔الخ

اس کا مطلب یہ ہے کہ: مجموعی طور پر عام کائنات میں آشکار ربوبیت کی شان و شوکت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اثبات کرتی ہے اور اس پر دلالت کرتی ہے جیسے کہ نعمتِ ربانی جو کہ تمام ذی حیات کی جزئیات تک کو اُن کا قانونی رزق عطا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کی احدیت کا اثبات کرتی ہے اور اس پر دلالت کرتی ہے۔

واحدیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام کی تمام موجودات ایک ہی صانع کی ملکیت ہیں، ایک صانع کی ایجاد ہیں اور ایک ہی صانع کی طرف دیکھتی ہیں۔

احدیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کے خالق کے تمام اسماء ہر چیز میں جلوہ گر ہیں۔

مثال کے طور پر: سورج کی روشنی - تمام سطحِ زمین کا احاطہ کرنے کی حیثیت سے - واحدیت کی مثال پر دلالت کرتی ہے۔

اور سورج کی روشنی کا وجود، اس کی حرارت اور اُس کی روشنی میں پائے جانے والے سات رنگ، اور ہر شفاف جزء میں اور پانی کے ہر قطرے میں سورج کے کسی نہ کسی پرتو کا پایا جانا؛ احدیّت کی مثال واضح کرتا ہے۔

اسی طرح ہر چیز میں اور خاص کر ہر جاندار چیز میں اور خصوصی طور پر انسان میں پائی جانے والی اُس صانع کے اکثر اسماء کی تجلی احدیت کی مثال کو واضح کرتی ہے۔

پس یہ فقرہ ربوبیت کی اس عظمت اور شان و شوکت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کائنات میں تصرّف کناں ہے اور جس نے اس عظیم الشان سورج کو سطحِ زمین کے جانداروں کے لیے دہکتا ہوا روشن چراغ اور خادم بنا دیا ہے۔ اور اس ضخیم کرۂ ارض کو اُن کے لیے ایک جھولا، منزل، قیام گاہ اور تجارت گاہ بنا دیا ہے۔

آگ کو ہر جگہ پر حاضر و دستیاب دوست اور باورچی بنا دیا ہے۔

بادل کو صافی، چھلنی اور دایہ بنا دیا ہے۔

پہاڑوں کو مخزن اور گودام بنا دیا، ہوا کو جانداروں کے لیے سانسیں اور پنکھے بنا دیا۔

پانی کو زندگی میں نئے سرے سے داخل ہونے والوں کو دودھ پلانے والی ماں اور پانی پلانے والا ساقی بنا دیا جو انہیں آبِ حیات پلاتا ہے۔

پس یہ الٰہی ربوبیت انتہائی واضح صورت میں الٰہی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔

جی ہاں؛ اس خالق الواحد کے علاوہ اور کون ہے جو اس سورج کو ساکنانِ زمین کے لیے خادم اور مسخر بنا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اور کون ہے جو ہوا کو اپنے ہاتھ میں تھام کر رکھتا ہے اور اس کے ذمے بہت سی ذمہ داریاں لگا کر اُسے سطحِ زمین پر ایک جلد باز اور تیز رفتار خادم بنا سکتا ہے؟ اس واحدُ لا حد کے علاوہ اور کون ہے جو آگ کو باورچی بنا سکتا ہے اور اس کا دیا سلائی کے سرے جیسے ایک ذرّے کو ٹنوں کے حساب سے وزنی چیزوں کو نگل جانے کی طاقت دے دیتا ہے؟۔۔۔اور یوں ہر چیز، ہر عنصر اور اجرامِ سماویہ میں سے ہر جرم اس پُر حشمت ربوبیت کی حیثیت سے اس واحدِ ذُوالجلال کی ہستی پر دلالت کرتا ہے۔

تو جس طرح جلال وحشمت کے اعتبار سے واحدیت کا مشاہدہ ہوتا ہے، اُسی طرح نعمت واحسان جمال ورحمت کے اعتبار سے احدیتِ الٰہیہ کا اعلان کرتے ہیں، کیونکہ اس درجے کی جامع اور ہمہ گیر صنعت کے مابین ذی حیات مخلوقات میں اور خاص کر انسان میں ایسے آلات اور کل پُرزے پائے جاتے ہیں جو انواع واقسام کی غیر محدود نعمتوں کی سمجھ رکھتے ہیں۔ گویا قبول کرتے ہیں اور طلب کرتے ہیں کہ یہ جاندار مخلوقات اور انسان تمام کائنات میں تجلّی بکھیرنے والے تمام اسمائے حسنیٰ کے جلووں کا مظہر بن گئے ہیں۔ اس حد تک کہ گویا یہ اپنی ماہیت کے آئینے کے اعتبار سے تمام اسمائے حُسنیٰ کو آشکار کر کے اَحدیّت الٰہیہ کا اعلان کرنے والے مرکزی نقطے کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں

ساتواں فقرہ: "سِكَّتُهُ فِيْ ذَاكَ، فِي الْكُلِّ وَالْأَجْزَاءِ، خَاتَمُهُ فِيْ هَذَا فِي الْجِسْمِ وَالْأَعْضَاءِ"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ: جس طرح صانع الجلیل کا بحیثیت مجموعی عالم اکبر میں عظیم الشان سکہ پایا جاتا ہے اسی طرح اس نے اس کائنات کے تمام اجزاء پر اور اس کی تمام انواع پر اپنی وحدت کے سکّے نقش کر دیے ہیں۔

اور جس طرح اُس نے انسان۔ جو کہ عالم اصغر ہے۔ کے جسم پر اور اس کے چہرے پر وحدانیت کی مہریں ثبت کی ہوئی ہیں، اسی طرح اس کے ہر عضو میں وحدت کے طرّ ہائے امتیاز کام کر رہے ہیں۔

جی ہاں؛ اُس قدیرِ ذُوالجلال نے کلّیات وجزئیات میں، کواکب وذرّات میں، غرضیکہ ہر چیز میں وحدت کے سکّے

نقش کیے ہوئے ہیں جو اس کی گواہی دیتے ہیں اور وحدانیت کے طرّوں کی مہر لگا دی ہے جو کہ اس تک پہنچنے کے لیے دلیل راہ بنتے ہیں۔

بائیسویں، تیسویں مقالے میں اور تینتیسویں مکتوب میں اس حقیقتِ عظمیٰ کی وضاحت اور اس کا اثبات چونکہ آخری درجے کی قطعی اور تابناک صورت میں کر دیا گیا ہے، اس لیے اس حقیقت کے لیے ہم ان مقالات کا اور مکتوب کا حوالہ کافی سمجھتے ہیں اور اس مقام پر سر دست اسی بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

پانچواں کلمہ: "لَهُ الْحَمْدُ"

یعنی موجودات میں پائے جانے والے وہ تمام کمالات جو مدح وثنا کا سبب بنتے ہیں، سب کے سب اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔ لہٰذا حمد بھی اس اکیلے کے لیے خاص ہے۔ پس ازل سے لے کر ابد تک جو بھی حمد وثنا صادر ہوتی ہے، جس سے بھی صادر ہوتی ہے اور جس پر بھی واقع ہوتی ہے، اُسی اکیلے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے؛ کیونکہ نعمت واحسان اور کمال وجمال جیسی جو بھی چیز مدح کا سبب اور حمد وثنا کا دارومدار ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ اُسی کے لیے ہے اور اسی کی طرف لوٹتی ہے۔

جی ہاں؛ تمام موجودات کی طرف جو چیزیں دائمی اور استمراری صورت میں درگاہِ الٰہی تک پہنچتی ہیں، وہ ہیں عبودیت، تسبیح، سجدہ، دعا اور حمد وثنا وغیرہ؛ جیسے کہ قرآنی آیات سے پتا چلتا ہے۔

ہم یہاں اس توحیدی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ایک عظیم ترین برہان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہم جب اس کائنات کی طرف دیکھتے ہیں تو یہ ہمیں ایک ایسے باغ کی شکل میں نظر آتی ہے جس کی چھت بلند ستاروں سے آراستہ کر دی گئی ہے۔ اور اس کی زمین خوبصورت مزیّن موجودات سے آباد کر دی گئی ہے۔ پس اس باغ میں پائے جانے والے تمام منظم نورانی علوی اجرام اور حکمت بھری سفلی موجودات اپنی مخصوص زبانوں کے ساتھ کہتی ہیں: ہم قدیرِ ذُو الجلال کی قدرت کے معجزات ہیں خالقِ حکیم وصانعِ قدیر کی وحدت کی گواہی دیتے ہیں۔

پھر جب ہم اس جہان کے باغ میں پائے جانے والے کرۂ ارض کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں ایک باغیچے کی صورت میں نظر آتا ہے جس میں گروہ در گروہ رنگا رنگ کی خوبصورت آراستہ پیراستہ نباتات بچھا دی گئی ہیں اور انواع واقسام کے لاکھوں حیوانات بکھیر دیے گئے ہیں۔ پس زمین کے اس باغیچے میں پائی جانے والی یہ منقّش نباتات اور یہ مزیّن حیوانات اپنی منظم صورتوں اور موزوں شکلوں کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ: ہم ایک حکمت والے صانعِ واحد کی صنعت کے خوارق ومعجزات اور اس کی وحدانیت کے گواہ اور راہنما ہیں۔

اسی طرح ہم اس باغ کے درختوں کی چوٹیوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں غایت درجے کے لطف وجمال اور کرم وعلم وحکمت

کی روشنی میں پیدا کیے گئے مختلف صورتوں شکلوں کے پھل اور پھول نظر آتے ہیں۔ یہ پھل پھول اَز اوّل تا آخر بیک زبان یہ اعلان کرتے ہیں کہ:

ہم رحمٰنِ ذوا ی ل اور رحیمِ ذوالکمال کے معجز نما تحفے اور حیرت نما احسانات ہیں۔ پس کائنات کے اس باغ میں اَجرام اور دیگر موجودات ہیں، اور کرۂ ارض کے باغیچے میں جو نباتات وحیوانات ہیں، اور درختوں اور نباتات کی چوٹیوں پر جو پھول اور پھل ہیں۔ یہ سب آخری درجے کی بلند آواز کے ساتھ گواہی دیتے، اِعلان کرتے اور کہتے ہیں۔

ہمارا خالق، مصور اور ہمیں تحفوں کی صورت میں پیش کرنے والا قدیرِ ذُوا ی ل، حکیمِ بے مثال اور کریمِ کثیرُ النوال ہر چیز پر قادر ہے، اُس پر کوئی چیز مشکل اور گراں نہیں اور کوئی چیز اس کے دائرۂ قدرت سے باہر نہیں۔ اور ذرّات وکواکب اس کی قدرت کے آگے یکساں ہیں۔ ایک مضبوط طریقے سے بنی ہوئی چھوٹی چیز بڑی چیز کے برابر ہے، بلکہ چھوٹی چیز صنعت وکاریگری کے لحاظ سے بڑی چیز سے بڑی ہے۔ کلی جزئی کی طرح آسان ہے اور جزء کل کی طرح قیمتی ہے۔

پس گزرے ہوئے تمام زمانوں کے واقعات جو اُس کی قدرت کے عجائبات ہیں، اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ قدیرِ مُطلق مستقبل کے زمانوں میں بھی ممکنہ عجائبات کو بروئے کار لانے پر قادر ہے۔ اور جس نے گزرا ہوا کل فراہم کیا ہے وہ آنے والا کل بھی مہیا کرے گا۔ اسی طرح جس نے ماضی کو پیدا کیا ہے وہ مستقبل بھی پیدا کرے گا۔ اور جس صانع الحکیم نے دنیا کو پیدا کیا ہے وہ آخرت کو بھی پیدا کرے گا۔

جی ہاں؛ جس طرح وہ قدیرِ ذوالجلال یکہ وتنہا معبودِ برحق ہے وہی یکہ وتنہا محمود علی الِا طلاق ہے اور جس طرح عبادت صرف اسی کے لیے خاص ہے اسی طرح حمد وثنا بھی اسی کے لیے خاص ہے۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ زمین وآسمان کو پیدا کرنے والا ایک صانع الحکیم اُس انسان کو چھوڑ دے جو زمین وآسمان کا اہم ترین نتیجہ اور ماحصل اور کائنات کا کامل ترین پھل ہے؟ اُسے بے کار چھوڑ کر اسباب اور اتفاقات کے حوالے کر دے اور اپنی آشکارا حکمت کو عبث وبے کاری میں تبدیل کر دے؟ حاشا وکلّا!

اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ حکیمِ علیم ایک درخت کو پیدا کرے، غایت درجے کے اہتمام کے ساتھ تدبیر کرے، آخری درجے کی حکمت کے ساتھ اس کی نشو ونما کرے، لیکن اس کے پھل جو کہ اُس کی غرض وغایت اور اس سے حاصل ہونے والا اصل فائدہ ہے؛ اُن پھلوں کی طرف دیکھے بھی نہیں اور ان کی طرف توجہ ہی نہ دے، اور یوں وہ پھل چوروں کے ہاتھوں میں اور بے کار جگہوں میں پراگندہ ہو کر ضائع ہو جائے؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ ان پھلوں کی طرف دیکھے نہیں اور ان کا اہتمام نہ کرے؛ کیونکہ درخت کا اہتمام اس کے پھل کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔

پس اس کائنات کا ذی شعور اور کامل ترین پھل، نتیجہ اور اس کی غرض وغایت انسان ہے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس

کائنات کا صانعِ حکیم حمد وعبادت اور شکر ومحبت جیسے ثمرات - جوکہ شعور والے ثمرات کے بھی ثمرات ہیں - اس انسان کے علاوہ کسی اور کو عطا کر دے؟ اور یوں اپنی حکمتِ عالیہ کو ضائع کر دے اور اسے عدم کے گھاٹ اُتار دے؟ یا اپنی بے پایاں قدرت کو عجز و درماندگی میں تبدیل کر دے؟ یا اپنے علمِ محیط کو جہل و بے علمی میں بدل دے؟ ہزار بار حاشا وکلا!۔

اور کیا یہ ممکن ہے کہ شکر اور عبادت اس محل کے بانی کے علاوہ کسی اور کی طرف پہنچ جائے، وہ شکر اور عبادت جن کا اظہار کائنات کے اس محل کی بناوٹ میں مقاصد ربانیہ کا دارومدار بن جانے والے تمام ذی شعور کرتے ہیں، اور خاص کر وہ نوعِ انسان جو ان کو ملنے والی نعمتوں کے مقابلے میں ان تمام ذی شعور سے زیادہ افضل ہے؟ یا وہ صانعِ الجلیل اس شکر اور عبادت کو - جو کہ غایتُ الغایات ہیں - کسی اور کی طرف جانے کی اجازت دے دے؟

اسی طرح کیا یہ ممکن ہے کہ وہ صانع اپنی ذات کو اپنی انواع واقسام کی بے حد وشمار نعمتوں کے ذریعے ذوی شعور کا محبوب بنائے اور اپنی صنعت کے لاانتہا معجزات کے ذریعے انہیں اپنا تعارف کروائے، اور پھر ان کا شکر، ان کی عبادت، ان کی حمد وثناء، ان کی محبت، ان کی احسان شناسی، رضامندی اور معرفت کو اسباب اور نیچر کے حوالے کر دے اور ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دے، اور اس طرح اپنی مطلق اور بے پایاں حکمت کا انکار کر دے اور اپنی ربوبیت کی سلطنت کو عدم کے گھاٹ اُتار دے؟ ہرگز نہیں! ہزار بار حاشا وکلا!

اور کیا یہ ممکن ہے کہ جو روئے زمین پر ایک موسمِ گل پیدا نہ کرسکتا ہو، ہمہ قسم کے پھل ایجاد نہ کرسکتا ہو، ایک جیسی علامتوں اور متحد مہروں والے تمام سیب پیدا نہ کرسکتا ہو؛ کیا ممکن ہے کہ وہ ان پھلوں جیسا ایک چھوٹا سا سیب پیدا کر کے اُسے ایک نعمت کی صورت میں کسی کو کھلا دے اور اس کے شکریے کا مستحق بن جائے؟ اور حمد وثنا میں اس محمودِ مطلق ہستی کا شریک بن جائے؟ حاشا وکلا! ہرگز نہیں؛ کیونکہ جس نے ایک سیب کو پیدا کیا ہے وہی دنیا میں آنے والے تمام رن کو پیدا کرتا ہے؛ کیونکہ سکہ اور علامت ایک ہے۔ اور جس نے تمام رن کو پیدا کیا ہے وہی اُن تمام دانوں اور پھلوں کو پیدا کرتا ہے جو تمام دنیا میں رزق کا دارومدار ہیں۔

پس جو سب سے چھوٹے جاندار کو سب سے چھوٹی نعمت عطا کرتا ہے وہی کائنات کا خالق ہے اور وہی رزّاق الجلیل ہے۔ اس لیے شکر وحمد کا مستحق وہی ہے۔ اور حقیقتِ کائنات ہمیشہ زبانِ حق سے کہہ رہی ہے: "لَهُ الْحَمْدُ مِنْ كُلِّ اَحَدٍ، مِنَ الْاَزَلِ اِلَى الْاَبَدِ"

چھٹا کلمہ: "يُحْيِیْ"

مطلب یہ ہے کہ زندگی عطا کرنے والا صرف وہی ہے جب ایسا ہی ہے تو پھر ہر چیز کا خالق بھی وہی ہے؛ کیونکہ کائنات کی روح، اس کا نور، اس کا ضمیر، اس کی بنیاد، اس کا نتیجہ، ماحصل اور خلاصہ "زندگی" ہے۔ پس جس نے زندگی عطا

کی ہے وہی تمام کائنات کا خالق ہے اور وہی زندگی دینے والا اور حیّ قیوم ہے۔

اس پہلو سے اجاگر ہونے والی توحیدی مرتبے کی ایک عظیم الشان برہان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں: اور وہ یہ ہے کہ: ہم دیکھ رہے ہیں کہ سطحِ زمین پر جانداروں کے ایک پُرشکوہ لشکرِ جرار کے خیمے نصب کر دیے گئے ہیں۔

جی ہاں؛ ہم ہر فصلِ عمل میں دیکھتے ہیں کہ ''الحی القیوم'' کے غیر محدود لشکروں میں سے ایک نیا لشکر غیب سے میدان میں وارد ہوتا ہے اور نئے سرے سے اپنا اسلحہ اور دیگر ساز و سامان سنبھال لیتا ہے۔

اس لشکر کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نباتات کی دو لاکھ سے زائد مختلف قسم کی متنوع اقوام اور حیوانات کی ایک لاکھ سے زائد ملتیں نظر آتی ہیں۔

تو جس کے پاس آنکھ ہے وہ مشاہدے کے ساتھ دیکھ لے گا اور جس کے پاس دل ہے وہ عینُ الیقین کے ساتھ تصدیق کرے گا کہ ایک سپہ سالارِ اعظم ہے جو اُن میں سے کسی کو بھولتا نہیں، انہیں باہم خلط ملط نہیں کرتا اور اُن کی خدمات کی جو مدت مقرر ہے اُسے موَخر نہیں کرتا۔ اِن تین لاکھ سے زائد انواع و اقسام کی تمام مختلف ملتوں اور گروہوں کو کمال انتظام اور تمام میزان کے ساتھ مناسب اور مقررہ وقت میں اُن کے رزق روزینے، کپڑے اور اسلحہ مہیّا کرتا ہے، انہیں مختلف مشقوں سے گزارتا اور ان کی نشو ونما کرتا ہے اور مختلف اور متباین اَوقات میں انہیں ان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیتا ہے۔ اور یہ تمام کام وہ اپنی غیر محدود قُدرت و حکمت، اپنے لا انتہا علم و ارادے، اپنی بے پایاں رحمت اور اپنے ختم نہ ہونے والے خزانے سے سرانجام دیتا ہے۔ حالانکہ ہر ملّت اور ہر گروہ کے کپڑے اور سامان ہائے رزق مختلف ہیں، ان کی مشقیں اور سبکدوشیاں متفاوت ہیں، اُن کا اسلحہ اور ٹریننگ کے اوقات متباین ہیں۔ جیسے کہ یہ بات کسی دیگر مقالے میں ثابت کر دی گئی ہے۔

اب کیا کسی کے لیے بھی یہ ممکن ہے کہ وہ زندگی دینے میں، تدبیر و انتظام میں تعلیم و تربیت میں اور سامان رزق کے فراہم کرنے میں کوئی دخل اندازی کر سکے اور اُس کا نظم و نسق چلا سکے یا حصہ دار بن سکے؟ سوائے اس علمِ محیط کی مالک ہستی کے جس کے علم نے اس لشکر کا اور لشکر کے تمام معاملات کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ سوائے اس مطلق قدرت کی مالک ہستی کے، جو قدرت اس لشکر کو اُس کے تمام لوازمات سمیت چلا رہی ہے۔

لاکھوں بار حاشا وکلّا!

اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ کسی فوج کے دستے میں اگر دس مختلف قومیں ہوں تو ہر قوم کو مختلف انداز کے ساتھ تیار کرنا دس دستوں کو تیار کرنے کے برابر مشکل ہوگا، اسی لیے عاجز لوگ ضرورت کے تحت ان سب کو ایک ہی انداز میں تیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جبکہ ''الحی القیوم'' اپنے اِس پُرشکوہ لشکر میں پائے جانے والی تین لاکھ سے زائد اقوام و ملل کو

زندگی سے بھرپور مختلف ساز وسامان سے آراستہ کرتا ہے اور انہیں یہ ساز وسامان بڑے نظم وضبط اور حکمت کے ساتھ بغیر کسی مشکل، تکلیف اور محنت مشقت کے انتہائی آسان شکل اور معمولی طریقے سے عطا کر دیتا ہے۔ اور اس عظیم الشان لشکر جرار کو بیک زبان ﴿هُوَ الَّذِیْ یُحْیِیْ﴾ بلواتا ہے، اور کائنات کی اِس مسجد میں اس جماعتِ عظمیٰ سے فرمانِ گرامی: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ پڑھواتا ہے۔

ساتواں کلمہ: ''وَیُمِیْتُ''

مطلب یہ ہے کہ وہی موت دیتا ہے۔ یعنی: جس طرح زندگی دینے والا وہی ہے اسی طرح زندگی کو قبض کرنے والا اور موت دینے والا بھی وہی ہے۔

جی ہاں؛ موت تخریب کاری، ویرانی، پھٹ جانے اور پراگندہ ہو جانے کا نام نہیں کہ اسے اسباب کی طرف منسوب کر دیا جائے اور نیچر کے حوالے کر دیا جائے! بلکہ جیسے مٹی کے نیچے دبا ہوا ایک بیج بظاہر تو خراب ہو جاتا اور مر کے گل سڑ جاتا ہے لیکن بباطن ایک بالی کا خمیر تیار کر کے اسے زندگی سے آشنا کرنے کے لیے رواں دواں رہتا ہے یعنی وہ بیج کی جزئی زندگی سے بالیوں کی کلی زندگی کی طرف چلتا رہتا ہے۔

اس طرح موت بھی بظاہر پارہ پارہ ہو کر پراگندہ ہو جانے اور بجھ جانے کا نام ہے، لیکن درحقیقت وہ انسان کی بقا و استمرار والی زندگی کا سرِ آغاز، مقدمہ اور عنوان ہے۔ پس وہ قدیرِ مطلق جو زندگی عطا کرتا اور اس کی تدبیر کرتا ہے، بلاشبہ وہی موت کو بھی پیدا کرتا ہے۔

ہم اس کلمے میں اِس پہلو سے پائے جانے والے توحید کے عظیم ترین مرتبے کی طرف ایک برہانِ اعظم کے ذریعے اشارہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ تینتیسویں مکتوب کے چوبیسویں دریچے میں بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ: یہ موجودات ارادۂ الٰہیہ کے ساتھ بہتی چلی جا رہی ہیں۔ اور یہ کائنات امرِ ربانی کے ساتھ رواں دواں ہے اور یہ مخلوقات زمانے کی نہر میں بالا ستمرار جاری وساری ہے انہیں عالمِ غیب سے اِرسال کیا جاتا ہے اور عالمِ شہادت میں ان کو ظاہری وجود کا لباس پہنا دیا جاتا ہے۔ پھر انہیں اذنِ الٰہی سے نظم وضبط کے ساتھ عالمِ غیب پر اُتار دیا جاتا ہے اور یہ امرِ الٰہی کے ساتھ دائمی صورت میں مستقبل سے آتی ہیں اور حال پر سے گزرتی ہیں، اس میں سانس لیتی ہیں اور پھر ماضی میں انڈیل دی جاتی ہیں۔

پس اِن مخلوقات کا انتہائی پرحکیمانہ انداز میں رحمت واحسان کے دائرے میں بہتے جانا۔

اور ان کا انتہائی علیمانہ اسلوب کے ساتھ حکمت وانتظام کے دائرے میں رواں دواں رہنا،

اور ان کا رحیمانہ انداز سے شفقت اور میزان کے دائرے میں جاری وساری رہنا اول سے لے کر آخر تک حکمتوں، مصلحتوں، غایتوں اور نتیجوں کا باعث بنتا ہے۔

پس اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک قدیرِ ذُوالجلال اور حکیمِ ذُوالکمال تسلسل کے ساتھ اپنی قدرت کے ذریعے موجودات کے گروہوں کو ان تمام گروہوں میں پائی جانے والی جزئیات کو اور ان گروہوں سے متشکل ہونے والی کائنات کو زندگی سے بہرہ ور کر رہا ہے۔ پھر پوری حکمت کے ساتھ ان پر موت طاری کر کے اُنہیں عالمِ غیب کی طرف بھیج دیتا ہے اور انہیں قدرت کے دائرے سے نکال کر علم کے دائرے میں منتقل کرتا جارہا ہے۔

پس جو اس کائنات کا مجموعی طور پر انتظام و انصرام کرنے پر قادر نہ ہو، اور جس کا حکم تمام زمانوں میں لاگو نہ ہو اور جس کی قدرت تمام کائناتوں کو فردِ واحد کی طرح زندگی اور موت سے ہمکنار نہ کر سکتی ہو، جو موسم ہائے بہار کو زندگی سے بہرہ ور کر کے اُنہیں زمین پر براجمان کر کے انہیں موت سے ہمکنار نہ کر سکتا ہو، کیا وہ موت و حیات کا مالک ہو سکتا ہے؟

جی ہاں؛ یہ ضروری ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے جاندار کی موت بھی اُس جاندار کی زندگی کی طرح ہو، یعنی اُس رَبِّ ذوالجلال کے قانون اِذن، امر، قوت اور علم کے مطابق ہو جس کے ہاتھ میں زندگی کے تمام حقائق اور موت کی تمام انواع و اقسام ہیں۔

آٹھواں کلمہ: "وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ"

مطلب یہ کہ اُس کی زندگی دائمی، ازلی اور ابدی ہے، موت، فنا اور عدم وزوال سے دوچار نہیں ہوتی؛ کیونکہ زندگی اُس کی ذاتی ہے اور ذاتی چیز زائل نہیں ہوتی۔

جی ہاں؛ جو اَزلی ہو وہ قطعی طور پر ابدی ہوتا ہے، اور جو قدیم ہو وہ قطعی طور پر باقی ہوتا ہے۔ اور واجبُ الوجود قطعی طور پر سرمدی ہوتا ہے۔

جی ہاں؛ وہ زندگی کہ تمام وجود اپنے تمام انوار سمیت جس کا پرتو ہے، اس زندگی پر عدم کیسے طاری ہو سکتا ہے؟

جی ہاں؛ ایک زندگی کہ واجبُ الوجود جس کا لازمہ اور خاصہ اور عنوان ہو، اس پر کسی بھی جہت سے عدم و فنا قطعی طور پر طاری نہیں ہو سکتا۔

جی ہاں؛ ایک زندگی کہ جس کے جلوؤں کے ساتھ زندگی کی تمام انواع و اقسام ظہور میں آتی ہیں اور کائنات کے تمام حقائقِ ثابتہ یعنی بدیہی حقائق جس کے سہارے کھڑے ہیں اور اُسی کی وجہ سے قائم ہیں۔ اس پر کسی بھی جہت سے قطعی طور پر فنا وزوال طاری نہیں ہو سکتا۔

جی ہاں؛ ایک زندگی کہ جس کے جلوؤں کی ایک کرن زوال و فنا سے دوچار ہونے والی بہت سی اشیاء کو وحدت کی لڑی میں پرو کر انہیں بقا کا مظہر بنا دیتی ہے، انہیں پارہ پارہ ہونے سے بچاتی ہے اور اس کے وجود کو محفوظ کر کے ایک قسم کے بقا و دوام کا مظہر بناتی ہے؛ یعنی یہ کہ زندگی کثرت کو وحدت عطا کرتی ہے اور اُسے باقی رکھتی ہے اگر زندگی چلی جائے تو کثرت

پارہ پارہ ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ پس اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا ہے کی یہ واجبی زندگی کہ زندگی سے بھرپور یہ غیر محدود کرنیں جس کا ایک جلوہ شمار ہوتی ہیں، زوال وفنا ایسی زندگی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے ہیں۔

اس حقیقت کا قطعی گواہ اس کائنات کا زائل اور فنا ہو جانا ہے، یعنی یہ موجودات جس طرح اپنے وجود اور اپنی زندگی کے ساتھ اُس حیّ لایموت کی زندگی پر اور اس زندگی کے وجود کے واجب ہونے پر دلالت کرتی اور اُس کی گواہی دیتی ہیں (حاشیہ)، اسی طرح اپنی موت اور زوال کے ساتھ اس زندگی کے بقا ودوام اور اُس کی سرمدیت پر دلالت کرتی اور اس کی گواہی دیتی ہیں؛ کیونکہ یہ موجودات جب سُوئے عدم روانہ ہو جاتی ہیں تو اُن کی جگہ پر اُن جیسی دیگر آ جاتی ہیں اور اُنہیں کی طرف زندگی کا مظہر بن جاتی ہیں، اور یوں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ایک دائمی زندہ ہستی موجود ہے جو نئے نئے سرے سے زندگی کے جلووں کو نمایاں کرتی چلی جا رہی ہے۔ تو جس طرح ایک رواں دواں نہر میں سطحِ آب پر ابھرنے والے بُلبلے سورج کے سامنے چمکتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، اسی طرح ان کے بعد میں آنے والے بلبلے عین اُسی چمک دمک کو نمایاں کرتے ہیں، چنانچہ وہ پے در پے گروہ در گروہ آتے ہیں، چمکتے ہیں، بجھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اور اس بجھنے اور چمکنے کی کیفیت سے ایک بلند وبالا دائمی سورج کے وجود کے دوام پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح زندگی اور موت کا ان چلتی پھرتی موجودات کے درمیان باہمی تبدیلی اور ایک دوسرے کی جگہ آتے جاتے رہنا ایک زندہ جاوید ہستی کے بقا ودوام پر دلالت کرتا ہے۔

جی ہاں؛ یہ موجودات آئینے ہیں، لیکن جس طرح تاریکی اس حیثیت سے روشنی کا آئینہ ہوتی ہے کہ تاریکی جتنی شدید ہوگی روشنی اسی حساب سے زیادہ ہوگی، اِسی طرح یہ موجودات ضِدّیت کی حیثیت سے بہت زیادہ پہلوؤں سے آئینوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

جس طرح موجودات اپنی عاجزی ودرماندگی کی جہت سے صانع کی قدرت کا اور اپنے فقر کی جہت سے اس کے غِنا کا آئینہ بن جاتی ہیں، اسی طرح یہ اپنے فنا ہو جانے کی جہت سے اس کے بقا ودوام کا آئینہ بن جاتی ہیں۔

جی ہاں؛ موسمِ سرما میں سطحِ زمیں کا اور اس پر پائے جانے والے درختوں کا فقر میں مبتلا ہو جانا، اور موسمِ گل میں ان کا تابدار ثروت وغنا سے ہمکنار ہونا، یہ دونوں صورتیں قدیرِ مطلق کی قدرت کا اور غنیِ مطلق کی رحمت کا آئینہ بن جاتی ہیں۔

جی ہاں؛ ایسے لگتا کہ جیسے موجودات تمام کی تمام اویس قرنی کی طرح مناجات کرتی ہیں اور زبانِ حال سے کہتی ہیں:

(حاشیہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ بحث وتکرار کے وقت ''مارنے اور زندہ کرنے'' سے منتقل ہو کر طلوع وغروبِ آفتاب کی طرف آ جانا، جُزوی طور پر مارنے اور زندہ کرنے سے کلی طور پر مارنے اور زندہ کرنے کی طرف منتقل ہونا اور ایک قسم کی ترقی ہے۔ یعنی اس دلیل کے وسیع ترین اور روشن ترین دائرے کا اظہار کرتا ہے۔ یہ انداز مخفی دلیل کو چھوڑ کر ظاہر دلیل کو اختیار کرنے کا نہیں جیسے کہ بعض مفسرین کہتے ہیں۔ مؤلف۔

''اے ہمارے معبود!

تو ہی ہمارا پروردگار ہے؛ کیونکہ ہم بندے ہیں اور اپنے نفس کی تربیت کرنے سے عاجز ہیں۔ پس تو ہی تو ہماری تربیت کرتا ہے۔

اور تو ہی ہمارا خالق ہے؛ کیونکہ ہم مخلوق ہیں۔

اور ہم پیدا کیے جاتے ہیں۔

اور تو ہی رزّاق ہے؛ کیونکہ ہم رزق کے محتاج ہیں اور وہ ہماری دسترس سے باہر ہے۔ پس تو ہی ہے جو ہمیں پیدا کرتا اور رزق دیتا ہے۔

اور تو ہی مالک ہے؛ کیونکہ ہم مملوک ہیں ہم میں ہمارے علاوہ کوئی اور تصرّف کر رہا ہے۔ پس تو ہی ہمارا مالک ہے۔

اور تو عزیز ہے، صاحبِ عزّت وعظمت ہے، اور ہماری نظر اپنی ذلّت پر ہے، لیکن ہم پر عزت کے جلوے بھی سایہ فگن ہیں۔ پس ہم تیری عزّت کے آئینے ہیں۔

اور تو ہی غنیِ مطلق ہے؛ کیونکہ ہم فقراء ہیں، ہمارے فقر کے ہاتھ کو وہ تونگری و دولتمندی عطا کر دی جاتی ہے جسے وہ خود حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ پس تُو ہی غنی اور تُو ہی عطا کرنے والا ہے۔

اور تُو ہی زندہ و جاوید اور باقی رہنے والا ہے؛ کیونکہ ہم مرتے ہیں اور اپنی موت اور زندگی میں زندگی دینے والی ایک دائمی ہستی کے جلوے دیکھتے ہیں۔ اور تو ہی باقی رہنے والا ہے؛ کیونکہ ہمیں اپنے فنا و زوال میں تیرے بقا و دوام کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

تو ہی پکار کا جواب دینے والا اور عطا کرنے والا ہے، کیونکہ ہم تمام موجودات اپنی زبانِ حال اور زبانِ قال کے ساتھ ہمیشہ پکارتی، طلب کرتی، گڑگڑاتی اور گریہ زاری کرتی رہتی ہیں، اور ہماری آرزوئیں پوری ہو رہی ہیں اور ہمارے مقاصد پورے کیے جا رہے ہیں۔ پس تو ہی مجیب ہے''۔

اور یوں تمام موجودات کلّی اور جزوی طور پر ''اویس قرنی'' کی طرح ایک طرح کی معنوی مناجات میں مصروف ہیں اور اپنے عجز و فقر و کوتاہی کے ساتھ قدرتِ الٰہیہ کا اور کمالِ ربانی کا اعلان کرتی ہیں۔

نواں کلمہ: ''بِيَدِهِ الْخَيْرُ''

یعنی تمام بہتریاں اُس کے ہاتھ میں ہیں اور تمام بھلائیاں اس کے رجسٹر میں ہیں اور تمام نعمتیں اس کے خزانے میں ہیں۔ اس لیے جو بہتری چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ اس سے مانگے، جسے بھلائی چاہیے اُسے چاہیے کہ اس کے سامنے روئے گڑگڑائے۔

اس کلمے کی حقیقت کو قطعی صورت میں واضح کرنے کے لیے ہم علمِ الٰہی کے بے پایاں دلائل میں سے ایک وسیع و عریض علامتوں اور اس کی تابندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

اپنے نظر آنے والے افعال کے ذریعے کائنات میں تصرّف کرنے والا مُوجد اور صانع مُحیط اور ہمہ گیر علم کا مالک ہے۔ اور یہ علم اس کی ذات کا ایک ایسا لازمی اور ضروری خاصہ ہے کہ جس کا علیحدہ ہونا محال ہے۔ کیونکہ جیسے یہ ممکن نہیں کہ یہ سورج بغیر روشنی کے موجود رہے، اِسی طرح ہزاروں درجے بڑھ کر یہ بات ناممکن ہے کہ اس کائنات کے موجد کا علم اُس سے جُدا ہو جائے۔ اور جس طرح یہ علمِ محیط اُس ذات کے لیے ایک لازم ہے، اسی طرح تعلق کی رُو سے یہ علم ہر چیز کے لیے لازم ہے۔ یعنی یہ ممکن نہیں کہ کوئی چیز کسی بھی حال میں اس پر مخفی رہے۔ جیسے زمین پر بغیر کسی پردے کے سورج کے سامنے پائی جانے والی اشیاء کے لیے ممکن نہیں کہ وہ سورج سے پوشیدہ رہیں؛ اسی طرح یہ بات بھی اس سے ہزار درجے بڑھ کر ناممکن اور محال ہے کہ اُس علیمِ ذوالجلال کے علم کے نور کے سامنے والی چیزیں اُس سے اوجھل ہو جائیں؛ کیونکہ حضوری پائی جاتی ہے۔ یعنی ہر چیز اُس کے دائرۂ نظر اور دائرۂ شہود میں اس کے رُوبرو ہے اور ہر چیز میں اس کا تصرف ہے۔

پس یہ جامد آفتاب اور یہ عاجز انسان اور اس الیکٹرک مشین کی شعور سے عاری شعاع اور انوار کی مالک ان جیسی دیگر اشیاء، اِن اشیاء کے انوار جب حادث، ناقص اور عارضی ہونے کے باوجود اپنے سامنے والی چیزوں کو دیکھتے ہیں اور اُن میں نفوذ کر جاتے ہیں؛ تو پھر یہ بات کسی بھی شک وشبہے سے بالاتر ہے کہ اُس واجب، ہمہ گیر، ذاتی اور اَزلی علم کے نور سے کوئی بھی چیز قطعی طور پر اوجھل اور اُس سے باہر نہیں ہے۔ کائنات کی لاتعداد و غیر محدود آیات وعلامات ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہم اُن میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

تمام موجودات میں پائی جانے والی وہ تمام حکمتیں جو مشاہدے میں آرہی ہیں، اس علمِ محیط کی طرف اشارہ کر رہی ہیں؛ کیونکہ جو حکمت کے ساتھ کام سرانجام دیتا ہے، ضروری ہے کہ وہ جانتا ہو اور علم کے مطابق کام کرتا ہو۔

اِسی طرح دقیق میزان کے ذریعے تمام موزوں اور منظّم موجودات میں سے ہر موجود اور اس کی نظم وضبط میں نپی تلی تمام کیفیات میں سے ہر کیفیت اس علمِ محیط کی طرف اشارہ کرتی ہے؛ کیونکہ کسی بھی کام کو منظّم طریقے سے کرنا علم کے ذریعے ہی ممکن ہے اور جو کسی کام کو نپے تلے انداز میں ماہرانہ طریقے سے سرانجام دے رہا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کسی قوی علم کی بنیاد پر ہی وہ کام سرانجام دے رہا ہے۔

اسی طرح تمام موجودات میں مشاہدے میں آنے والی منظّم مقداریں یعنی ماپنے تولنے اور شمار کرنے کے پیمانے، حکمتوں اور مصلحتوں کی روشنی میں بنائی ہوئی شکلیں، قضا کے دستوروں کی اور قدر کے ضابطوں سے ترتیب دی گئیں نتیجہ خیز کھکس اور بارآور حالتیں علمِ محیط پر دلالت کرتی ہیں۔

جی ہاں؛ ہر چیز کی مختلف منظم صورتوں میں تصویر کشی کرنا اور اُسے اُس کے ساتھ خصوصیت رکھنے والی، اُس کے وجود کے ساتھ اور اس کی زندگی کی مصلحتوں کے ساتھ میل کھانے والی شکل میں ڈھالنا صرف علمِ محیط کی روشنی میں ہی ممکن ہوسکتا ہے، کسی بھی دوسری صورت میں ممکن نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح ذی حیات مخلوقات میں سے ہر مخلوق کو اس کے ساتھ مناسبت رکھنے والے انداز کے ساتھ عین مناسب وقت میں ایسی جگہ سے رزق عطا کرنا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو، صرف علمِ محیط کی روشنی میں ہی ممکن ہے؛ کیونکہ جو رزق دیتا ہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رزق کی محتاج مخلوقات کا علم رکھتا ہو، انہیں پہچانتا ہو، رزق کا وقت جانتا ہو اور ان کی ضرورتوں کا ادراک رکھتا ہو۔ پھر مناسب طریقے سے انہیں رزق دے سکتا ہو۔

اسی طرح تمام ذی حیات کی موت اور اُن کی اِبہام کے عنوان کے تحت تعیّن کے قانون میں بندھے ہوئے قوت کے اوقات علمِ محیط پر دلالت کرتے ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر گروہ کے افراد کے موت کے اوقات کا وقتِ معیّن اگرچہ بظاہر نظر نہیں آرہا ہے تاہم اس گروہ کی موت کا وقت دو حدّوں کے درمیان محدود وقت میں معیّن ہے۔ پس اُس کی موت کا وقت اس چیز کے ختم ہوجانے کے بعد اُس کے وظیفے کو دوام دینے والے اُس کے نتیجے، پھل اور گٹھلی کی حفاظت کرنا اور ان چیزوں کو نئی زندگی سے آشنا کردینا بھی اُس علمِ محیط پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح تمام موجودات کے لیے ہمہ گیر اور ہر موجود کے شایانِ شان صورت میں رحمت کی لطافتیں وسیع وعریض رحمت کے ضمن میں علمِ محیط پر دلالت کرتی ہیں؛ کیونکہ مثال کے طور پر جو جانداروں کے بچوں کو دودھ کے ذریعے اور پانی کی محتاج نباتات کو بارش کے ذریعے سامانِ زندگی فراہم کرتا ہے، بلاشک وہ بچوں کو پہچانتا ہے اور ان کی ضروریات کا علم رکھتا ہے، نباتات کو دیکھ رہا ہے اور ان کے لیے بارش کے لازمہ ہونے کا ادراک رکھتا ہے اور پھر بارش برسا بھی دیتا ہے۔ یوں اُس کی حکیمانہ وکریمانہ رحمت کے بے حد وحساب جلوے علمِ محیط پر دلالت کرتے ہیں۔

اسی طرح اشیاء کی ایجاد وابداع میں کمال سہولت کا پایا جانا ایک کامل ترین علم پر دلالت کرتا ہے؛ کیونکہ کسی بھی کام اور وضع قطع میں سہولت کا وجود علم ومہارت کے درجے کی مناسبت سے ہوتا ہے، یعنی جتنا اُس کا علم زیادہ ہوگا کام اُسی قدر زیادہ آسان ہوگا۔

پس اس راز کو سامنے رکھ کر ہم اُن موجودات کی طرف دیکھتے ہیں جن میں سے ہر ایک صنعت کا کوئی نہ کوئی معجزہ ہے، تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ تھوڑے سے عرصے میں بغیر کسی تکلیف اور دشواری کے سہولت کے حیرت انگیز درجے میں معجزانہ صورت میں پیدا کی جارہی ہیں۔ پس اس سے پتا چلتا ہے کہ چونکہ علم کا وجود ہے اس لیے یہ موجودات بے حد سہولت کے ساتھ پیدا کی جارہی ہیں۔۔۔

ان مذکورہ علامات کی طرح ہزاروں ایسی سچی علامات پائی جاتی ہیں جو اس کائنات میں تصرّف کرنے والے ایسے پروردگار پر دلالت کرتی ہیں جو ہمہ گیر علم کا مالک ہے، ہر چیز کو اس کے تمام معاملات سمیت جانتا ہے اور پھر اُسے تیار کرتا ہے۔

پس اِس کائنات کا پروردگار جب اس طرح کے علم کا مالک ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمام لوگوں کو اور ان کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے کہ انسان کون سی چیز کا سزاوار ہے اور کون سی چیز کا مستحق ہے۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ حکمت اور رحمت کے مطابق معاملہ کرتا ہے اور آئندہ بھی حکمت اور رحمت کا معاملہ ہی کرے گا۔

پس اے انسان! ہوش میں آ عقل سے کام لے اور ذرا سوچ کہ وہ عظیم ہستی کون ہے جو تجھے جانتی بوجھتی ہے اور تجھ پر نظر رکھتی ہے! اس کی جان پہچان حاصل کر اور ہوش کے ناخن لے!

اگر کہا جائے کہ: اس ضمن میں صرف علم ہی کافی نہیں بلکہ ارادے کی بھی ضرورت ہے لہٰذا ارادے کے بغیر علم کافی نہیں؟ تو

جواب یہ ہے کہ:

موجودات تمام کی تمام جس طرح ایک محیط اور ہمہ گیر علم پر دلالت کرتی ہیں اور اس کی گواہی دیتی ہیں، اسی طرح اس علمِ محیط کے مالک کے کلّی ارادے پر بھی دلالت کرتی ہیں:

اور وہ اس طرح کہ ہر چیز کو اور خاص کر ہر ذی حیات کو بہت سے مخلوط و پراگندہ احتمالات کے مابین ایک معین احتمال کے ذریعے، بہت سے بانجھ، بے نتیجہ اور بے ثمر راستوں کے مابین ایک نتیجہ خیز راستے کے ذریعے ایک غایت درجے کا منظم تشخص عطا کر دینا۔ جبکہ وہ بہت سے امکانات کے مابین متردّد تھا۔ بے حد وحساب جہتوں سے کلّی ارادے پر دلالت کرتا ہے؛ کیونکہ ہر چیز کے وجود کا احاطہ کرنے والے بے حد وحساب امکانات واحتمالات کے مابین، بانجھ اور بے ثمر راستوں میں سیلِ رواں کی طرح بے لگام بہتے ہوئے مخلوط اور جامد عناصر سے غایت درجے کے حسّاس پیمانے، لطیف میزان، دقیق انتظام اور رقیق نظام کے ساتھ ہر چیز کو جو ایک موزوں شکل وصورت اور منظم تشخص عطا کیا جاتا ہے، ضرورت، بداہت بلکہ مشاہدے کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کسی کلّی ارادے کا شاہکار ہیں؛ کیونکہ غیر محدود اوضاع واطوار کے درمیان سے ایک ایک معیّن وضع قطع کا انتخاب کر لینا صرف تخصیص وترجیح اور قصد وارادہ کے ساتھ ہی ممکن ہو سکتا ہے، اور اس کا تعلق قصد وطلب کے ساتھ ہی ہوگا! پس اس میں کوئی شک نہیں کہ تخصیص مخصص کا تقاضا کرتی ہے اور ترجیح چاہتی ہے کہ کوئی مرجّح ہو، اور مخصّص ومرجّح ہے "ارادہ"۔ مثال کے طور پر انسان جیسے مختلف قسم کے سینکڑوں آلات وادوات پر مشتمل مشینری والے بدن کو پانی کے ایک نطفے سے اور مختلف اعضاء کے حامل پرندے کو ایک سادہ سے انڈے سے ایجاد کرنا۔

اور مختلف سینکڑوں اقسام پر منقسم درخت کو ایک سادہ سی گٹھلی سے پیدا کرنا جس طرح قدرت اور علم پر دلالت کرتا ہے اسی طرح غایت درجے کے قطعی اور ضروری طریقے سے ان چیزوں کے صانع میں کلّی ارادے کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اس ارادے کے ساتھ اس چیز کے تمام حالات کو خاص کر دیتا ہے اور اس ارادے کے ساتھ ہر جزء کو، ہر عضو کو اور اس کی ہر قسم کو کوئی خاص شکل عطا کر دیتا ہے اور اُسے ایک دیگر وضع قطع کا جامہ پہنا دیتا ہے۔

حاصلِ کلام:

جیسے۔ مثال کے طور پر۔ اَساس ونتائج کی رُو سے حیوانات کے اہم اعضاء کا ایک دوسرے کے مشابہ اور موافق ہونا اور ان کا وحدت کے سکّوں میں سے ایک ہی سکے کا اظہار کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمام حیوانات کا خالق ایک اور یگانہ و یکتا ہے؛ اسی طرح اُن کی پیشانیوں میں پائے جانے والے مختلف تشخّصات، حکیمانہ تعیّنات اور باہمدگر مخالف تمیّزات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کا صانعِ واحد، فاعلِ مختار اور صاحبِ اِرادہ ہے، جو چاہے کرتا ہے اور جو نہ کرنا چاہے نہیں کرتا؛ اور جو کرتا ہے قصد وارادے کے تحت کرتا ہے۔

اب جبکہ علمِ الٰہی اور ارادۂ ربّانیہ پر موجودات کی تعداد کے برابر بلکہ ان کی شئون وکیفیات کی تعداد کے برابر دلالت وشہادات پائی جاتی ہیں، تو پھر بعض فلاسفہ کا ارادۂ الٰہیہ کا انکار کرنا، بعض اہلِ بدعت کا تقدیر کا انکار کرنا بعض اہلِ ضلالت کا یہ دعوٰی کہ اُسے جزئیات کا علم نہیں اور بعض نیچر پرستوں کا بعض موجودات کی نسبت نیچر اور اسباب کی طرف کر دینا خود موجودات کی تعداد سے دوگنا بڑھ کر جھوٹ ہے اور موجودات کی شئون وکیفیات سے دوگنا زیادہ گمراہی کا پاگل پن ہے؛ اُس کی وجہ یہ ہے کہ جو ان غیر محدود سچی گواہیوں کو جھٹلاتا ہے وہ غیر محدود جھوٹ کا ارتکاب کرتا ہے۔

پس ایسے انسان کا اللہ تعالٰی کی مشیّت سے وجود میں آنے والے امور کے بارے میں جانتے بوجھتے ہوئے ''ماشاء اللہ ، ماشاء اللہ'' کی بجائے ''نیچری'' کہہ دینا بالکل غلط اور خلافِ حقیقت ہے، کتنی غلط اور خلافِ حقیقت ہے، اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

دسواں کلمہ: ''وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ''

یعنی اس پر کوئی چیز گراں نہیں، چنانچہ امکان کے دائرے میں جتنی بھی چیزیں پائی جاتی ہیں وہ اُن چیزوں کو انتہائی سہولت کے ساتھ وجود کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ اور یہ کام اس کے لیے بالکل سہل اور آسان ہے۔ گویا کہ وہ تو فقط امر کرتا ہے اور تمام چیزیں ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا... الخ﴾ میں پائے جانے والے راز کی رُو سے بنتی چلی جاتی ہیں۔

تو جس طرح ایک غایت درجے کا ماہر کاریگر جیسے ہی اپنا ہاتھ چیز کو لگاتا ہے تو وہ ایک مشین کی طرح آسانی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اس سرعت اور مہارت کے بارے میں اس طرح کہا جاتا ہے کہ یہ کام اور صنعت اس آدمی

کے لیے مسخر کردی گئی ہے کہ تمام کام اس کے حکم سے انجام پاتے ہیں اور صنعتیں اس کے فقط چھونے سے ہی وجود میں آتی ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے فرمان ﴿اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ میں اشارتاً بتاتا ہے کہ تمام اَشیاء اس قدیرِ ذوالجلال کی قدرت کے سامنے انتہائی درجے کی مسخر اور اطاعت گزار ہیں۔اور یہ قدرت بغیر کسی تکلیف کے اور آخری درجے کی سہولت کے ساتھ عمل کرتی ہے۔ہم پانچ نکتوں میں اس حقیقتِ عظمیٰ کے غیر محدود اسرار میں سے پانچ اسرار بیان کریں گے۔

پہلا نکتہ: قدرتِ الٰہیہ کے لیے بڑی سے بڑی چیز چھوٹی سے چھوٹی چیز کی طرح آسان ہے، چنانچہ کسی ایک نوع کو اس کے تمام افراد سمیت ایجاد کرنا فردِ واحد کی طرح بغیر تکلیف کے بالکل آسان ہے۔ایک وسیع وعریض باغ کو پیدا کرنا اُس کے لیے پورے موسم بہار کی طرح آسان ہے اور ایک موسمِ بہار کو ایجاد کرنا ایک پھول کی طرح آسان ہے۔اس چیز کا اثبات تمثیلوں کے ساتھ رسالۂ حشر نامی دسویں مقالے کے آخر میں دوسرے مقصد کی تیسری بنیاد میں کر دیا گیا ہے جو کہ حشر کے مضمون پر مشتمل ہے اور ملائکہ، حشر اور بقائے روح کے بارے میں بحث کرتا ہے۔اور وہ چھ تمثیلیں یہ ہیں:

نورانیت کا راز

شفافیت کا راز

موازنے کا راز

انتظام کا راز

اطاعت کا راز

مقابلے کا راز

اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قدرتِ الٰہیہ کے سامنے ستارے اور ذرّے سہولت کے ضمن میں ایک برابر ہیں اور یہ قدرت غیر محدود افراد، فردِ واحد کی طرح انتہائی سہولت کے ساتھ بغیر تکلیف کے پیدا کرتی ہے۔

اِن اسرارِ ستّہ کی وضاحت چونکہ ان دو مقالوں میں بخوبی ہو چکی ہے، اس لیے یہاں اختصار سے کام لیتے ہیں اور تفصیل کے لیے ان دو مقالوں کی طرف رجوع کے لیے کہتے ہیں۔

دُوسرا نکتہ: یہ بات کہ قدرتِ الٰہیہ کے سامنے ہر چیز برابر ہے، اس بات کی دلیلِ قاطع اور برہانِ ساطع یہ ہے کہ:

حیوانات و نباتات کی ایجاد کے ضمن میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ حیوانات و نباتات کی ایجاد میں غیر محدود کثرت، سخاوت اور فیاضی میں آخری درجے کی مضبوطی، کاملیت اور حسنِ صنعت کارفرما ہے۔

اسی طرح انتہائی درجے کے امتزاج واختلاط میں آخری درجے کا امتیاز اور تفریق نظر آ رہی ہے۔

اسی طرح انتہائی درجے کی بہتات، فراوانی اور وسعت میں آخری درجے کی صنعت وکاریگری کی بیش قیمتی اور تخلیق کی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔

پھر جن چیزوں کی پیدائش کے لیے بہت زیادہ وقت اور بہت سے آلات درکار ہیں، وہ چیزیں اتنی غایت درجے کی سہولت اور سرعت کے ساتھ صنعت وکاریگری کا بہترین نمونہ لیے پیدا کی جارہی ہیں کہ گویا صنعت وکاریگری کے یہ معجزات عدم سے دفعتاً وجود میں آتے جارہے ہیں۔

پس سطحِ زمیں پر ہر موسمِ گل میں ہم اس قدرت کی فعالیت کا جو مشاہدہ کرتے ہیں، اس بات پر قطعی دلالت کرتا ہے کہ اُس قدرت کے لیے جو ان افعال کا سرچشمہ ہے بڑی سے بڑی چیز چھوٹی سی چھوٹی چیز کی طرح معمولی اور آسان ہے۔ اور غیر محدود افراد کو پیدا کرنا اور ان کی ادارت ومنصوبہ بندی اور بندوبست کرنا ایک فرد کے ایجاد کرنے اور اس کی ادارت کرنے کی طرح آسان ہے۔

تیسرا نکتہ: بلاشبہ بڑے سے بڑا ''کُل'' چھوٹے سے چھوٹے ''جزء'' کے برابر آسان ہے۔ اور کثیرُ الافراد کُلّی کو ایجاد کرنا ایک جزئی کی طرح معمولی اور آسان ہے۔ اور ایک ادنیٰ ترین جزئی کی نسبت اس کے صانع قدیر کی قدرت کی طرف ہونے کی وجہ سے اس میں اس کی صناعی اور کاریگری کی بلند ترین قیمت نظر آرہی ہے جو صانع اپنے ان مشہود افعال و تصرّفات کے ذریعے اس کائنات میں حکمرانی کررہا ہے۔

اس حقیقت کی حکمت میں پائے جانے والے راز کا چشمہ تین سرچشموں سے پھوٹتا ہے:

اوّلاً: واحدیّت کی امداد سے

ثانیاً: وحدت کی آسانی سے

ثالثاً: احدیّت کی تجلّی سے

پہلا سرچشمہ: واحدیت کی اِمداد

اور وہ یہ ہے کہ ایک شئے اور تمام اشیاء جب ایک مالک کی ملکیت ہوں گی تب وہ واحدیت کی جہت سے ایک شئے کے پیچھے تمام اَشیاء کی قوت کو لگا سکتا ہے اور تمام اشیاء کی ادارت ایک شئے کی طرح بالکل سہولت کے ساتھ کرسکتا ہے۔ اس راز کو ہم تمثیل کے ساتھ قریبُ الفہم بنانے کے لیے کہتے ہیں:

مثال کے طور پر جس طرح کسی سلطنت کا ایک ہی حکمران ہو تو وہ وحدتِ سلطنت کے قانون کی جہت سے ہر ایک سپاہی کے پیچھے ایک لشکر کی بے پناہ معنوی قوت لگا سکتا ہے اور اس طرح وہ ایک سپاہی اپنے حکمران کے نام سے کسی بادشاہ کو قید کرسکتا ہے اور اس پر اپنا حکم چلا سکتا ہے؛ اسی طرح سلطنت کی واحدیت کے راز کی رُو سے وہ تمام لشکر اور تمام ملازموں

کی بالکل ایسے ہی ادارت کرتا ہے جیسے ایک سپاہی سے کام لیتا اور اس کی ادارت کرتا ہے، گویا کہ سلطنت کی واحدیت کی رُو سے وہ کسی بھی فرد کی اِمداد کے لیے ہر چیز کو بھیج سکتا ہے اور اپنی رعیت کے ہر فرد کو تمام افراد کے برابر کی قوت فراہم کر سکتا ہے۔ یعنی وہ فرد تمام افراد سے مدد لے سکتا ہے۔

لیکن سلطنت کی اس واحدیت کی رسیاں جب کُھل جائیں اور معاملہ بدنظمی تک جا پہنچے تو پھر ہر سپاہی غیر محدود قوت کھو بیٹھے گا اور نفوذ کے بلند مقام سے ایک عام انسان کے مقام پر گر جائے گا۔ تب اُن کی ادارت اور ان کا بندوبست کرنا اور اُن سے کام لینا افراد کی تعداد کے برابر مشکل ہو جائے گا۔

بعینہٖ اسی طرح۔ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی۔ اس کائنات کا صانع واحد ہونے کی وجہ سے اپنے اُن تمام اَسماء کو جن کا رُخ تمام اشیاء کی طرف ہے ایک چیز کے بالمقابل جمع کرتا ہے اور اس چیز کو انتہائی بیش قیمت صورت میں پیدا کرتا ہے۔ اور جب کبھی لازم ہو تو تمام اَشیاء کے ذریعے ایک چیز کی طرف دیکھتا ہے اور ان چیزوں کا رُخ اس کی طرف کر دیتا ہے اور اُن کے ذریعے اُسے مدد دیتا ہے اور اسے مضبوط اور مکمل صورت میں پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام اشیاء کو بھی واحدیت کے راز کی رو سے ایک چیز کی طرح پیدا کرتا ہے اس میں تصرف کرتا ہے اور اس کی ادارت کرتا ہے۔

واحدیّت کی امداد کے اس راز کی رُو سے اس کائنات میں انتہائی درجے کی سخاوت، فیّاضی اور ارزانی و فراوانی میں صنعت اور قیمت کی جہت سے انتہائی درجے کی بلند عالی شان کیفیت نظر آ رہی ہے۔

دُوسرا سرچشمہ: وحدت کی آسانی۔

اور وہ یہ ہے کہ اُمور و معاملات جب وحدت کے اسلوب کے ساتھ، ایک مرکز میں، ایک ہاتھ سے اور ایک قانون کے ذریعے انجام پاتے ہیں تو غایت درجے کی سہولت کے ساتھ سرانجام پاتے ہیں، اور جب متعدد مراکز میں، متعدّد قوانین میں اور متعدّد ہاتھوں میں متفرق ہو جائیں تو مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

اگر لشکر کے تمام افراد کا ساز و سامان ایک مرکز میں، ایک قانون کے تحت اور ایک ہی سپہ سالار کے حکم سے تیار کیا جائے تو فردِ واحد کے سامان کی طرح آسان ہو جائے گا۔ لیکن اگر ان کے ساز و سامان متعدد کارخانوں میں اور مختلف مراکز میں تیار کیے جائیں تو ایک فرد کے ساز و سامان کے لیے وہ تمام عسکری کارخانے لازم آئیں گے جو ایک لشکر کے ساز و سامان کے لیے ضروری ہیں۔ پس اگر وحدت کی طرف نسبت کی جائے تو ایک لشکر ایک فرد کی طرح آسان ہو جاتا ہے۔ اور اگر وحدت نہ ہو تو ایک فرد ساز و سامان کی جہت سے ایک لشکر کے برابر مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی درخت کے پھلوں کو کسی ایک مرکز کے بھروسے پر اور ایک قانون اور ایک اصل کی روشنی میں وحدت کی جہت میں مادۂ حیات مہیا کر دیا جائے تو ہزاروں پھل ایک پھل کی طرح آسان ہو جائیں گے۔ اور جب ہر پھل کا تعلق

کسی دوسرے مرکز کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور اس کی طرف زندگی کا دیگر مواد ارسال کر دیا جائے تو ہر پھل ہر درخت کے برابر مشکل ہو جائے گا؛ کیونکہ زندگی پر مشتمل مواد جو کہ ہر درخت کے لیے ضروری ہے وہ ہر پھل کے لیے بھی ضروری ہے۔

پس ان دو مثالوں کی طرح ـ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی ـ اس کائنات کا صانع چونکہ واحد و احد ہونے کی وجہ سے ''وحدت'' کے ساتھ کام سرانجام دیتا ہے اس لیے تمام اشیاء ایک شئے کی طرح آسان ہو جاتی ہیں۔ اور وہ انتہائی بیش قیمت صورت میں مشاہدے میں آنے والی اس غیر محدود فراوانی اور لا انتہاء ارزانی کی زبان کے ساتھ اپنی مطلق اور غیر محدود جود و سخا اور لا انتہا خلاقیت کا اظہار کرتا ہے۔

تیسرا سرچشمہ: احدیّت کی تجلّی

یعنی صانعِ ذُوالجلال کا جسم اور جسمانی نہ ہونے کی وجہ سے زمان اور مکان اس کو قید نہیں کر سکتے اور کون و مکان اس کے شہود و موجودگی میں مداخلت نہیں کر سکتے اور وسائط و اَجرام اُس کے افعال کے آگے حجاب نہیں بن سکتے اُس کی توجہّ میں کوئی تجزّ ء اور انقسام نہیں۔ کوئی چیز کسی دُوسری چیز کو روک نہیں سکتی۔ اور وہ غیر محدود افعال کو ایک فعل کی طرح سرانجام دے لیتا ہے اور اس طرح ایک پورے عالم کو فردِ واحد میں مندرج کر دیتا ہے جیسے کہ معنوی طور پر ایک گرانڈیل درخت کو ایک گٹھلی میں مندرج کر دیتا ہے تمام عالم کو اپنے دستِ قدرت میں فردِ واحد کی طرح گھماتا ہے۔

پس۔ جیسے کہ کئی دیگر مقالات میں اس راز کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں:

سورج کی کسی حد تک بے قید صورت اپنی نورانیت کے اعتبار سے ہر چمکدار شفاف چیز میں داخل ہو جاتی ہے چنانچہ جب ہزاروں لاکھوں آئینے اس کے نُور کے بالمقابل آئیں گے تو اس کا مثالی جلوہ منقسم ہوئے بغیر ان تمام آئینوں میں ایسے ہی پایا جائے گا جیسے کہ وہ ایک ہی آئینہ ہو۔ چنانچہ اگر آئینے میں استعداد ہو تو سورج اپنی عظمت کے باوجود اس میں اپنے آثار کا اظہار کر سکتا ہے اور کوئی چیز کسی چیز کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتی اور ہزاروں آئینے ایک آئینے کی حیثیت رکھیں گے اور سورج ہزاروں جگہوں میں ایک ہی جگہ کی طرح انتہائی سہولت کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے اور ہر جگہ ہزاروں جگہوں کے برابر اس سورج کے جلوے کا مظہر بن جاتی ہے۔

پس ـ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی ـ اس کائنات کا صانع ذوالجلال اپنی تمام نورانی صفات اور تمام نورانی اسمائے حسنیٰ کے ساتھ احدیت کی توجہ میں پائے جانے والے راز کی رُو سے، ایک ایسی تجلّی کا مالک ہے اور اس کی توجہّ میں انقسام نہیں بلکہ وہ ایک آن میں، ہر جگہ میں بغیر کسی تکلیف اور مزاحمت کے کسی بھی جگہ میں نہ ہونے کے باوجود ہر جگہ حاضر و ناظر ہے جو چاہے کرتا ہے۔

پس اس واحدیت کی امداد، وحدت کی آسانی اور احدیت کی تجلّی کے راز کی رُو سے:

ان تمام موجودات کی نسبت اگر صرف ایک صانع و کردگار کی طرف کر دی جائے تو یہ تمام موجودات ایک موجود کے برابر آسان ہو جائیں گی۔ اور ہر موجود حُسنِ صنعت کی رُو سے تمام موجودات کے برابر بیش قیمت اور عالی قدر ہو جائے گی جیسے کہ موجودات میں بے حد کثرت اور فراوانی کے باوجود وجود رکھنے والی ہر چیز میں صنعت د کاریگری کے بے حد وحساب دقائق کا پایا جانا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن اگر ان تمام موجودات کی نسبت براہِ راست صرف ایک صانع کی طرف نہ جائے تو پھر ہر موجود تمام موجودات کے برابر مشکل ہو جاتا اور تمام موجودات کی قیمت گر کر صرف ایک موجود کی قیمت کے برابر ہو جاتی۔ اور اگر ایسا ہوتا تو پھر یا تو کوئی بھی چیز وجود میں نہ آتی، یا پھر اگر وجود پذیر ہو جاتی تو بالکل بے قیمت اور بے وقعت رہتی۔

یہی وہ راز ہے جس کی رُو سے سوفسطائیوں نے ۔ جو کہ قدیم ترین فلاسفہ ہیں ۔ چونکہ جادۂ حق سے منہ پھیر کر اپنی نظریں کفر و ضلالت کی راہ پر لگا دی ہیں، اس لیے انہیں نظر آیا کہ شرک کا راستہ حق و توحید کے راستے سے لاکھ درجہ مشکل، پیچیدہ اور انتہائی غیر معقول ہے۔ اس بنا پر انہوں نے ہر چیز کے وجود کا انکار کر دیا اور مجبور ہو کر عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

چوتھا سر چشمہ:

اس کائنات میں شہود اور نظر آنے والے افعال کے ذریعے تصرف کرنے والی قدیر ہستی کی قدرت کی بنسبت ایک باغ کو ایجاد کرنا ایک موسم بہار کے برابر آسان ہے، اور موسم بہار کو ایجاد کرنا ایک پھول کے برابر آسان ہے۔ اور ایک پھول میں پائی جانے والی نادرِ روز گار صنعت د کاریگری کے محاسن اور اس کی تخلیق کے لطائف ایک موسمِ گل کے محاسن و لطائف کے برابر لطیف اور قیمتی ہو سکتے ہیں۔۔۔ اس حقیقت کا راز تین چیزیں ہیں

پہلی: صانع میں تجرُّد کے ساتھ ساتھ پایا جانے والا وجوب۔

دُوسری: عدمِ تقیُّد کے ساتھ ساتھ اس ماہیت کا تبایُن۔

تیسری: عدمِ تجزّی کے ساتھ ساتھ عدمِ تحیُّز۔

پہلا راز: یہ ہے کہ وجوب اور تجرُّد میں غیر محدود آسانی اور لا انتہا سہولت پائی جاتی ہے۔

یہ راز غایت درجے کا دقیق اور عمیق ہے۔ اس راز کو ہم ایک تمثیل کے ساتھ قریبُ الفہم بنائیں گے، اور وہ اس طرح ہے کہ:

وجود کے مراتب مختلف اور موجودات کے عوالم متفاوت ہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر وجود میں مضبوط گڑھی ہوئی موجودات کے طبقے کا ایک ذرّہ اس سے کم مضبوط طبقے کے پہاڑ کی برابری کرتا ہے اور اس پہاڑ کا احاطہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

انسان میں پائی جانے والی قوّتِ حافظہ جو کہ عالمِ شہادت کی ایک رائی کے برابر ہے۔ عالمِ معنی کی ایک لائبریری کے برابر کے وجود کا احاطہ کرتا ہے۔

اور خارجی عالم کا ایک ناخن کے برابر کا آئینہ عالمِ مثال کے وجود کے طبقے کے ایک بہت بڑے شہر کو اپنے اندر سموئے ہوتا ہے۔

پس خارجی عالم کے ساتھ تعلق رکھنے والا یہ آئینہ اور قوّتِ حافظہ اگر شعور اور قوّتِ ایجاد کے مالک ہوتے تو اپنے ذرے کے برابر کے خارجی وجود کی قوّت کے ساتھ اس معنوی اور مثالی وجود میں غیر محدود تصرّف اور تحوّل برپا کر سکتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وجود جتنا زیادہ راسخ ہوتا جائے گا اس کی قوّت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ تب ایک تھوڑی چیز زیادہ کا حکم لے لے گی، اور خاص کر اس وقت جب وجود مجرّد عنِ المادۃ ہو، بے قید ہو اور رسوخ تام حاصل کر چکا ہو، تب اس کا ایک معمولی سا جلوہ بھی عالمِ وجود کے تمام مخفی طبقات کے بہت سے عوالم میں اور تبدیلیاں لا سکتا ہے۔

پس ـ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ـ اس کائنات کا صانع ذوالجلال واجبُ الوجود ہے، یعنی اس کا وجود ذاتی ازلی اور ابدی ہے اس کا عدم ممتنع اور زوال محال ہے اور اس کا وجود رسوخ اور بنیاد کے لحاظ سے وجود کے تمام طبقات سے زیادہ شدید، قوی اور کامل ہے۔ اور اس کے وجود کے مقابلے میں دیگر طبقاتِ وجود ایک انتہائی کمزور سائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور واجب کا وجود اتنا راسخ اور حقیقی، اور ممکنات کا وجود اتنا خفیف و ضعیف ہے کہ محی الدین ابن عربیؒ جیسے بہت سے اہلِ تحقیق نے وجود کے دیگر طبقات کو اوہام و خیال کا مرتبہ دے دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ: ''لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا هُوَ''۔ یعنی انہوں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ دیگر اشیاء کے لیے وجود کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہیے، اور وہ اشیاء واجبُ الوجود کے مقابلے میں اس قابل ہی نہیں ہیں کہ انہیں وجود کا عنوان دیا جائے!

پس ان موجودات کا حادث اور عارضی وجود اور ممکنات کا بے قرار و بے قوّت ثبوت، دونوں ہی واجبُ الوجود کی ذاتی واجبی قدرت کے مقابلے میں انتہائی درجے میں قطعی طور پر آسان اور ہلکے پھلکے ہیں۔ اور حشرِ اعظم میں تمام ارواح کو زندہ کرنا اور ان کا محاکمہ کرنا اس قدرت کے لیے موسمِ گل میں بلکہ ایک باغ میں، بلکہ ایک درخت میں پتوں پھولوں اور پھلوں کو دوبارہ پیدا کر کے پھیلا دینے کی طرح آسان ہے۔

دُوسرا راز:

ماہیت کا مباین اور بے قید ہونا سہولت کا سبب بنتا ہے، اور وہ اس طرح کہ: کائنات کا صانع و آفریدگار کائنات کی جنس سے نہیں ہے اور اس کی ماہیت کسی بھی ماہیت کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی ہے۔ اس بنا پر دائرہ کائنات میں جتنی بھی

رکاوٹیں ہیں اس کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتی ہیں اور اس کے احکام کو مقید نہیں کر سکتی ہیں۔ چنانچہ وہ تمام کائنات میں یکبارگی تصرّف کر سکتا ہے اور ایک ہی آن میں اس کی تدبیر و ادارت کر سکتا ہے۔

چنانچہ کائنات میں نظر آنے والے افعال و تصرّفات اگر کائنات کے حوالے کر دیے جاتے تو اتنے اختلاط اور اتنی مشکلات پیدا ہو جاتیں کہ نہ تو کوئی نظم و ضبط باقی رہتا اور نہ ہی کوئی چیز وجود میں رہتی، بلکہ وجود میں کوئی چیز آ ہی نہیں سکتی۔

مثال کے طور پر باہم گر پیچیدہ قبّوں کی بناوٹ اگر ان قبّوں کے پتھروں کی طرف کر دی جائے اور فوجی دستے کے آفیسر کی تنظیمی ذمہ داری اگر افراد کی طرف کر دی جائے تو پھر یا تو کوئی چیز سرے سے وجود میں ہی نہیں آئے گی، یا پھر بہت سے اختلاط و مشاکل کی زد میں ایک غیر منظم کیفیت اختیار کر لے گی۔ جبکہ اسی صنعت و کاریگری کی نسبت اگر ایسے صانع اور کاریگر کی طرف کر دی جائے جو پتھروں کی جنس سے نہیں ہے تا کہ وہ ان قبّوں میں لگنے والے پتھروں کی صورت گری کر سکے۔ اور دستے کے سپاہیوں کے نظم و ضبط کی ذمہ داری ایسے آفیسر کی طرف کر دی جائے جو مرتبے کے اعتبار سے قیادت کی ماہیت کا اہل ہو چکا ہے، تو صنعت آسان ہو جائے گی اور تدبیر و ادارت کا کام بھی مشکل نہیں رہے گا؛ کیونکہ پتھر اور دستے کے سپاہی ایک دوسرے کے آڑے آتے ہیں، لیکن صانع اور آفیسر کی نظر ہر جہت کی طرف ہوتی ہے اور بغیر کسی رکاوٹ کے تدبیر و ادارت کرتے ہیں۔

اسی طرح ـ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ـ واجب الوجود کی قدسی ماہیت ممکنات کی ماہیات کی جنس میں سے نہیں ہے بلکہ کائنات کے تمام تر حقائق اسم گرامی ''الحق'' کی شعاعیں ہیں جو کہ اس ماہیت کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے۔

پس جب اُس کی مقدّس ماہیت واجب الوجود، مجرّد عن المادۃ اور تمام ماہیتوں کے برعکس ہے اور اس کا مثل مثیل اور مثال نہیں ہے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس ذات ذوالجلال کی ازلی قدرت کے لیے تمام کائنات کی تدبیر و ادارت ایک موسمِ گل کی طرح بلکہ ایک درخت کی طرح آسان ہے۔ اور حشرِ اعظم، دارِ آخرت اور جنت و جہنم اُس قدیرُ الجلیل کی اَزلی قدرت کے لیے فصلِ خزاں میں مر جانے والے درختوں کو فصلِ بہار میں نئے سرے سے زندہ کر دینے کی طرح آسان ہے۔

تیسرا راز:

عدمِ تحیّز اور عدمِ تجزّء انتہائی درجے کی سہولت کا سبب ہیں۔ اس میں راز یہ ہے کہ: صانع القدیر چونکہ مکان یعنی ایک جگہ پر براجمان رہنے سے پاک ہے اس لیے اپنی قدرت کے ساتھ قطعی طور پر ہر جگہ میں حاضر ناظر شمار ہوتا ہے۔

اور چونکہ وہ تجزّء اور انقسام سے پاک ہے اس لیے وہ اپنے تمام تر اسماء کے ساتھ قطعی طور پر ہر شے کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔

اور چونکہ وہ ہر جگہ حاضر ہے اور ہر چیز کی طرف متوجہ ہے، اس لیے موجودات و وسائط و اجرام اس کے افعال کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتے اور انہیں روک نہیں سکتے۔ بلکہ اگر لازم ہونا فرض کرلیا جائے۔ اور لزوم قطعاً فرض نہیں۔ تو یہ اشیاء بجلی کی تاروں کی طرح، درختوں ٹہنیوں کی طرح اور انسان کے پٹھوں کی طرح تسہیل کے وسائل، زندگی تک پہنچنے کے وسائط اور افعال کو تیز تر طریقے سے سرانجام دینے کے اسباب بن جائیں گی۔ بلکہ رکاوٹ پیدا کرنا، مقیّد کرنا، روکنا، باز رکھنا اور دخل اندازی کرنا تو دور کی بات ہے وہ آسانی پیدا کرنے کا وسیلہ، تیز تر کرنے کا ذریعہ اور زندگی تک پہنچانے کا آلہ بن جاتی ہیں۔ تو گویا کہ بالفرض اگر کبھی ضرورت آپڑے تو بھی یہ تمام چیزیں آسانی اور سہولت کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ لیکن ضرورت ہے نہیں۔

الحاصل:

صانع القدیر ہر چیز کو انتہائی سرعت اور سہولت کے ساتھ، بغیر کسی تکلیف اور محنت مشقت کے عین اس انداز میں پیدا کرتا ہے جو اس چیز کے شایانِ شان ہے، کلیات کو جزئیات کی طرح انتہائی آسانی کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور جزئیات کو کلّیات کی سی صنعت سے پیدا کرتا ہے۔

جی ہاں؛ جس نے کلّیات کو اور ارض وسماوات کو پیدا کیا، بلاشبہ وہی ہے جس نے زمین و آسمان میں پائی جانے والی جزئیات کو اور ذی حیات کے افراد کو بھی پیدا کیا ہے، اس کے علاوہ یقیناً اور کوئی نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات ان کلّیات کے ثمرات گٹھلیاں اور چھوٹی چھوٹی مثالیں ہیں۔ اسی طرح جس نے ان کلّیات کو ایجاد کیا ہے اُسی نے زمین اور آسمانوں کو اور جزئیات کا احاطہ کرنے والے عناصر کو پیدا کیا ہے؛ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جزئیات کلیات کے مقابلے میں ان کلّیات کی گٹھلیوں اور ان کے چھوٹے چھوٹے نسخوں کا حکم رکھتی ہیں۔ پس یہ ضروری ہوا کہ زمین و آسمان اور عناصرِ کلّیہ اس ہستی کے ہاتھ میں ہوں جس نے جزئیات کو پیدا کیا ہے تاکہ وہ ان ہمہ گیر کُلّی موجودات کے خلاصہ جات کو، اُن کے معانی کو اور ان کی مثالوں کو ان جزئیات میں مندرج کردے جو اُس کی حکمت کے دساتیر اور علم کے موازین کی رُو سے چھوٹی چھوٹی مثالوں کا حکم رکھتی ہیں۔

جی ہاں! جزئیات صنعت و کاریگری کے عجائب اور تخلیق کے غرائب کی جہت سے کلیات سے کم نہیں ہیں، اور پھول ستاروں سے فروتر اور گٹھلیاں درختوں سے کم تر نہیں ہیں۔ بلکہ گٹھلی میں پایا جانے والا معنوی درخت جو کہ تقدیر کا نقش ہے، پارک میں پائے جانے والے اُس مجسّم درخت سے زیادہ عجیب وغریب ہے جو قدرت کے ذریعے بُنا گیا ہے۔ اور انسان کی تخلیق کائنات کی تخلیق سے زیادہ تعجب خیز ہے۔

چنانچہ اگر ایتھر کے ذرّات کے ساتھ کسی فرد کے جوہر پر قرآنِ حکمت لکھا جائے تو وہ اُس قرآنِ عظمت سے زیادہ

اہمیت کا حامل ہوگا جو سطحِ آسمان پر ستاروں سے لکھا گیا ہو۔

اسی طرح کچھ چھوٹی چھوٹی ایسی جزئیات پائی جاتی ہیں جو صنعت کے معجزات کی جہت سے کلّیات سے کہیں زیادہ بلند ہیں۔

پانچواں نکتہ:

اپنے سابقہ بیانات میں ہم نے کسی حد تک مخلوقات کی ایجاد میں نظر آنے والی غیر محدود آسانی کے اسرار و رموز، غایت درجے کی سُرعت، افعال میں پائی جانے والی لانہایت تیز رفتاری اور اشیاء کی ایجاد میں پائی جانے والی لا انتہاء سہولت کی وضاحت کر دی ہے۔ اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی بعض حکمتیں بھی بیان کر دی ہیں۔

پس اشیاء کا اس بے انتہا سرعت کے ساتھ اور غیر محدود سہولت کے ساتھ پایا جانا اہلِ ہدایت کو ایک طرح کی قطعی قناعت مہیا کر دیتی ہے کہ خالق المخلوقات کی قدرت کے لیے آیتِ کریمہ: ﴿مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾ کی رُو سے باغات کو پیدا کرنا موسم ہائے گل کی طرح آسان ہے اور موسم ہائے گل باغیچوں کے برابر آسان ہیں، اور باغیچے پھولوں کی طرح آسان ہیں۔ اور نوعِ بشر کو اکٹھا کرنا اور بکھیرنا اس کے لیے ایسے ہی آسان ہے جیسے نفسِ واحدہ کو مارنا اور اُسے زندہ کرنا۔

اِسی طرح حشرِ اعظم کے دن تمام لوگوں کو زندہ کرنا آیتِ کریمہ: ﴿إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ﴾ کے مضمون کی رُو سے ایسے ہی آسان ہے جیسے کہ استراحت کی غرض سے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے سپاہیوں کو بگل کی ایک ہی آواز کے ساتھ اکٹھا کرنا آسان ہے۔

پس یہ غیر محدود سرعت اور لا انتہا سہولت صانع کے کمالِ قدرت پر اور اس قدرت کے لیے ہر چیز کے آسان ہونے پر ایک قطعی دلیل اور یقینی برہان ہے۔ حالانکہ صانع کی قدرت کے ساتھ اشیاء کو اتنی آسانی کے ساتھ شکل وصورت دینا اور ایجاد کرنا کہ وہ آسانی وجوب کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے، یہ چیز اہلِ ضلالت کی نظر میں التباس کا سبب بن گئی ہے۔ یعنی اشیاء کا صانع کی قُدرت کے ساتھ درجۂ وجوب تک پہنچی ہوئی آسانی کے ساتھ تشکیل پا جانا اور اشیاء کا خود بخود شکل پذیر ہو جانا جو کہ ہزار درجہ محال ہے، یہ چیز اہلِ ضلالت پر خلط ملط ہوگئی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ جب دیکھتے ہیں کہ بعض معمول کی اشیاء انتہائی سہولت کے ساتھ وجود میں آ رہی ہیں تو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ کسی کے بنائے نہیں بنتیں بلکہ خود بخود بنتی جا رہی ہیں۔

اب یہ انتہائی درجے کی حماقت ملاحظہ کرو کہ وہ لا انتہا قدرت کی دلیل کو اس کے نہ ہونے پر دلیل بناتے ہیں اور اس طرح لا انتہا محالات کا دروازہ کھول دیتے ہیں؛ کیونکہ اس صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ ہر مخلوق کے ہر ذرے کو وہ کمال کے

اوصاف عطا کر دیے جائیں جو صانعِ عالم کے لیے لازم ہیں، جیسے بے پایاں قدرت اور ہمہ گیر علم۔ تاکہ وہ بذاتِ خود اپنی شکل سازی کر سکے۔

گیارھواں کلمہ: "وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ"

یعنی تم لوگ عنقریب دارِ فانی سے کوچ کر کے دارِ باقی کی طرف لوٹ جاؤ گے اور ابدی ٹھکانے کی طرف سفر کر جاؤ گے، القدیمُ الباقی کی سلطنت کے ٹھکانے کی طرف، اور تم کثرتِ اسباب سے الواحد ذُوالجلال کی قدرت کے دائرے میں چلے جاؤ گے، اور دنیا سے آخرت کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔ تمہارا مرجع اور ٹھکانہ اُس کی چوکھٹ ہے اور تمہاری پناہ گاہ اُس کی رحمت ہے۔

اور یوں اس کلمہ میں بیان کیے گئے ان حقائق جیسے بہت سے حقائق پائے جاتے ہیں۔

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ جو بتاتی ہے کہ تم لوگ عنقریب جنت اور سعادتِ ابدی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے، تو اس کا اثبات "دسویں مقالے میں بارہ عدد قطعی یقینی دلائل و براہین کے ساتھ اور "انتیسویں مقالے" کی بہت سے قطعی دلائل پر مشتمل چھ بنیادوں میں کر دیا گیا ہے۔ یہ اثبات اتنے قطعی طریقے سے کیا گیا ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی؛ کیونکہ ان دو مقالوں نے قطعیت کے درجے میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح غروب ہونے والا سورج اگلے دن پھر طلوع ہوگا، اسی طرح یہ زندگی جو کہ اس دنیا کا معنوی آفتاب ہے یہ بھی دنیا کے تباہ ہو جانے پر غروب ہو جانے کے بعد صبحِ حشر میں باقی رہنے والی صورت میں دوبارہ طلوع ہو جائے گی۔ اور بعض جن اور انسان ابدی سعادت مندی کا مظہر بن جائیں گے اور بعض دیگر ابدی بدبختی کا۔

دسویں اور انتیسویں مقالے میں چونکہ اس حقیقت کا مکمل طور پر اثبات کر دیا گیا ہے، اس لیے اس ضمن میں جو بات ہو سکتی ہے وہ انہی دو مقالوں کے حوالے کرتے ہیں اور اس مقام پر سرِ دست اتنا ہی کہتے ہیں کہ:

اس کائنات کا حکیم صانع اور ان لوگوں کا رحیم خالق جو کہ لاانتہا علمِ محیط کا، غیر محدود ارادۂ کلیہ کا اور لانہایت بے قید قدرت کا مالک ہے۔ جیسے کہ سابقہ بیانات میں قطعی طور پر ثابت کر دیا گیا ہے۔ اُس نے اپنی تمام آسمانی کتابوں کے ذریعے نوعِ بشر میں سے تمام اہلِ ایمان کے ساتھ جنت اور ابدی سعادت کا وعدہ کیا ہے اب اُس نے وعدہ کیا ہے تو پھر بہر صورت اُسے پورا کرے گا؛ کیونکہ اس کے لیے اپنے وعدے کی خلاف ورزی ناممکن ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ وعدہ خلافی ایک گھناؤنا عیب ہے اور کاملِ مطلق ہر عیب سے منزّہ اور مقدس ہے؛ وعدہ خلافی یا تو اُس کی لاعلمی سے جنم لے گی یا اس کی عجز و درماندگی سے، اور قدیرِ مطلق اور عَلِيمٌ بِكُلِّ شَيْءٍ ہستی کا لاعلم اور عاجز و درماندہ ہونا چونکہ محال ہے، اس لیے وعدہ خلافی بھی محال ہے۔

پھر تمام انبیاء علیہم السلام کہ جن میں فخرِ عالم ﷺ سرفہرست ہیں، اور تمام اولیاء واصفیاء اور اہلِ ایمان اُس رحیم و کریم کے در پر روتے گڑگڑاتے رہتے ہیں اور اس سے ابدی سعادت طلب کرتے رہتے ہیں۔ وہ یہ ابدی سعادت اُس سے اُس کے تمام اسمائے حسنیٰ کے وسیلے سے مانگتے ہیں؛ کیونکہ اس کے تمام اسمائے حسنیٰ جیسے ربّ اور اللہ وغیرہ اور اُس کی ربوبیت اور سلطنت، اور اُن اسماء میں سرفہرست اسم گرامی الرحمٰن، الرحیم، العادل، الحکیم ہے، اور اس کی شفقت ورحمت اور عدالت وحکمت۔ یہ تمام چیزیں آخرت کا تقاضا کرتی ہیں، ابدی سعادت کو مستلزم ہیں اور اس کے متحقق ہونے کا تقاضا کرتی ہیں اور اس پر دلالت کرتی ہیں۔ بلکہ تمام تر موجودات اپنے تمام تر حقائق کے ساتھ دار آخرت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، جیسے کہ دسویں مقالے میں ثابت کر دیا گیا ہے۔

پھر قرآنِ حکیم جیسا منشورِ اعظم اس حقیقت کو کھول کر بیان کرتا ہے اور اپنی ہزاروں واضح ترین آیات اور قطعی صحیح اور سچے دلائل وبراہین کے ساتھ اس کی تعلیم دیتا ہے۔

پھر حبیب اکرم ﷺ فخرِ انسانیت نے اس حقیقت کو خود دیکھا اور دوسروں کو اس کا درشن کرایا اور اپنی تمام زندگی میں اپنے ہزاروں تابندہ معجزات کے ساتھ پوری قوت سے اس کا اثبات کیا، اعلان کیا اور اس کا درس دیا۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فِى الْجَنَّةِ وَاحْشُرْنَا وَنَاشِرَهُ وَرُفَقَاءَهُ وَصَاحِبَهُ سَعِيْدًا وَوَالِدَيْنَا وَاِخْوَانَنَا وَاَخَوَاتِنَا تَحْتَ لِوَائِهٖ وَارْزُقْنَا شَفَاعَتَهُ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔ آمین آمین

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ﴾

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾

﴿وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

بیسویں مکتوب سے دسویں مقالے کی ذیلی بحث

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ۔۔۔ الخ﴾

سوال: آپ نے بہت سی جگہوں پر کہا ہے کہ: بلاشبہ وحدت میں انتہائی درجے کی سہولت ہے اور کثرت اور شرک میں غایت درجے کی مشکلات ہیں، اور آپ یہ کہتے ہیں کہ: وحدت میں وجوب کے درجے کی سہولت ہے اور شرک میں امتناع کے درجے کی صعوبت پائی جاتی ہے، حالانکہ آپ نے جو جو مشکلات اور محالات بیان کیے ہیں وہ وحدت میں بھی پائے جاتے ہیں! مثال کے طور پر آپ کہتے ہیں کہ: اگر یہ ذرّات ماً مور نہ ہوں تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ ہر ذرّے میں یا ہمہ گیر علم پایا جاتا ہو یا مطلق اور بے پایاں قدرت پائی جاتی ہو اور یا پھر غیر محدود آلات، مشینیں اور چھاپہ خانے پائے جاتے ہوں۔ اور یہ سو دفعہ محال ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر یہ ذرے الٰہی ماً مورات ہوں تو بھی یہ لازم آتا ہے کہ یہ ان اُمور کا مظہر ہوں تاکہ اپنے غیر محدود منظم وظائف ادا کر سکیں۔۔۔ ہمیں اس اشکال کا حل چاہیے۔

الجواب: ہم نے بہت سے مقالات میں یہ ثابت کیا ہے کہ:

ان تمام موجوزات کی نسبت اگر صرف ایک صانع و کردگار کی طرف کر دی جائے تو یہ موجودِ واحد کی طرح آسان ہو جاتی ہیں۔ اور اگر اُن کی نسبت نیچر یا متعدد اسباب کی طرف کی جائے تو ایک مکھی کا پیدا کرنا بھی آسمانوں کی تخلیق کے برابر، ایک پھول پورے موسمِ بہار کے برابر اور ایک پھل پورے باغیچے کے برابر دشوار ہو جاتا ہے۔

یہ مسئلہ چونکہ بہت سے مقالات میں پوری وضاحت سے بیان ہو چکا ہے، اس لیے اسے اُنہیں مقالات کے سپرد کرتے ہیں۔ البتہ اس مقام پر اس حقیقت کے بالمقابل تین اشارات کے ذریعے تین تمثیلیں بیان کرتے ہیں جو اطمینانِ قلب کا باعث بنیں گی۔

پہلی تمثیل:

ایک تابدار شفاف ذرّہ ذاتی طور پر دیا سلائی کے سرے جتنا نور بھی اپنے دامن میں نہیں سما سکتا اور علیحدہ طور پر اُس کا سرچشمہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ممکن ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک جزوی ذرے کی طرح اپنے جرم اور ماہیت کی مقدار کے

حساب سے کچھ نور کا مالک ہو۔ لیکن یہی ذرّہ جب سورج کی طرف منسوب ہو جائے اور اس کے سامنے ہو کر اپنی آنکھ کھولے اور اُسے دیکھتا رہے تو اس عظیم الشان سورج کو اس کی روشنی، سات رنگوں، اس کی حرارت حتیٰ کہ اس مسافت سمیت اپنے گھیرے میں لے سکتا ہے اور اس کی عظیم ترین تجلّی کا ایک مظہر بن سکتا ہے پس اگر یہ ذرہ اپنی ذات تک محدود ہے تو پھر صرف ایک ذرّے کے برابر ہی کام کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ مامور ہو جائے، منسوب ہو جائے اور سورج کے لیے آئینہ بن جائے تو پھر وہ سورج کے اعمال وافعال کے بعض جزوی نمونوں کو آشکار کر سکتا ہے۔

اسی طرح -وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى- ہر موجود شے بلکہ ہر ذرّے کی نسبت اگر خود اُس کی طرف، شرک، کثرت، اسباب اور نیچر کی طرف کر دی جائے تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ یا تو ہر ذرّہ اور ہر موجود شے علم محیط اور مطلق و بے پایا قدرت کی مالک ہو، یا پھر اُس کے اندر بہت سے معنوی آلات، مشینریاں اور چھاپہ خانے موجود ہوں۔ تاکہ وہ ان عجیب وغریب وظائف کو ادا کر سکے جو اس کے ذمہ لگائے گئے ہیں۔ لیکن اگر ان ذرّات کی نسبت الواحدُ لا حد کی طرف کی جائے تو پھر ہر ساختہ پرداختہ چیز اور ہر ذرّہ اُس کی طرف منسوب ہو جائے گا اور اس کا ایک طرح کا خادم اور مأمور ہو جائے گا۔ یہ انتساب اُسے تجلّی کا مظہر بنا دے گا۔ اور اس مظہریت اور انتساب کی بنا پر وہ لاانتہا اور بے پایاں علم اور قدرت کا سہارا لے گا اور اس انتساب واستناد میں پائے جانے والے راز کی رُو سے وہ اپنے خالق کی قوّت کے بل پر ایسے افعال اور وظائف ادا کرے گا جو اُس کی ذاتی قوّت سے لاکھوں گنا بڑھ کر ہوں گے۔

دوسری تمثیل:

دو بھائی ہیں۔ ایک اُن میں سے بہادر ہے اپنی ذات پر اعتماد کرتا ہے، اور دوسرا وطن پرست اور جوشیلا ہے۔ اب خود پر اعتماد کرنے والا جنگ کے دنوں میں حکومت کی طرف اپنی نسبت نہیں کرتا اور علیحدہ رہ کر بذات خود ہی کارنامے سرانجام دینا چاہتا ہے بنابریں وہ اپنی قوّت کے سرچشموں کو اپنی کمر پر لادے پھرتا ہے اور اپنا اسلحہ اور ساز وسامان اپنی قوّت کے مطابق خود اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے، بنابریں وہ دشمن کی فوج کے ایک لانس نائیک کے مقابلے میں لڑ سکتا ہے، اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا ہے۔

دوسرا بھائی جو اپنی ذات پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ خود کو عاجز ولاچار سمجھتا ہے بنابریں وہ سُلطان کی طرف منسوب ہو گیا اور فوج میں شامل ہو گیا، اور اس انتساب کی وجہ سے ایک بہت بڑا لشکر اس کا نقطۂ استناد اور تکیہ گاہ بن گیا اور یوں اس یقین پر کہ اس کے پیچھے سلطان کا بہت بڑا لشکر جمع ہے، وہ اس لشکر کی معنوی قوّت کے سہارے پر بے جگری سے لڑتا ہے اور مغلوب دشمن کے بہت بڑے فیلڈ مارشل سے جا ٹکراتا ہے اور اسے پکڑ کر سلطان کے نام پر قید کر کے اپنے لشکر میں لے آتا ہے۔

اس حالت میں پایا جانے والا راز اور حکمت یہ ہے کہ:

پہلا آزاد رو اور بے مہار آدمی اپنی قوت اور اسلحہ وغیرہ کا بوجھ خود اُٹھانے پر تھا اس بنا پر صرف ایک آخری درجے کا جزوی سا کارنامہ سرانجام دے سکا۔ اور سرکاری ملازم اپنی قوت کے سرچشمہ کا بار خود اٹھانے پر مجبور نہیں تھا بلکہ اس کی ذمہ داری لشکر اور سلطان پر تھی اور یہ آدمی خود کو اس انتساب کی وجہ سے اس بے پایاں قوت کے ساتھ باندھے ہوئے تھا، بالکل ایسے جیسے کوئی اپنی مشینری کو ایک چھوٹی سی تار کے ذریعے سرکاری بجلی اور ٹیلیفون کی تار کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

اِسی طرح۔وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی ۔جب ہر مخلوق اور ہر ذرّے کو براہِ راست الواحدُ الا حد کا سہارا دے دیا جائے اور اس کی نسبت اس کی طرف کر دی جائے تو پھر اس انتساب کی وجہ سے ایک چیونٹی بھی فرعون کے محل کو زمین بوس کر سکتی ہے۔ اور ایک مچھر نمرود کو قتل کر سکتا ہے اور اُسے جہنم رسید کر سکتا ہے، اور ایک جرثومہ کسی ظالم ترین انسان کو قبر میں اتار سکتا ہے اور صنوبر کی ایک گندم کے دانے کے برابر کی گٹھلی صنوبر کے پہاڑ جیسے درخت کے کارخانے اور اُس کی مشینری کا حکم لے سکتی ہے۔

اور ہوا کے ذرّے اس انتساب کی برکت سے اور اپنے مالک کی طاقت اور قوت کے بل پر تمام پھولوں پھلوں کی تشکیل وصورت سازی کے ضمن میں اپنے مختلف اعمال پورے نظم وضبط کے ساتھ انتہائی لطیف طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

پس یہ تمام سہولت ۔بالبداہت۔ انتساب اور تسخیر سے جنم لیتی ہے۔ لیکن اگر معاملہ بدنظمی و بدانتظامی میں تبدیل ہو جائے اور اسے خود اُس کے اسباب کے اور کثرت کے سپرد کر دیا جائے اور شرک کا راستہ اختیار کیا جائے تو پھر ہر چیز اپنے قد کاٹھ اور اپنے شعور کے حساب سے عمل سرانجام دے گی۔

تیسری تمثیل:

دو دوست ہیں، دونوں ہی کسی ایسے علاقے کی جغرافیائی مردم شماری کے بارے میں رپورٹ لکھنا چاہتے ہیں جسے انہوں نے بالکل دیکھا ہی نہیں ہے۔ اب ان میں سے ایک تو اس علاقے کے حکمران کے ساتھ رابطے میں آجاتا ہے اور خط وکتابت اور ٹیلیگراف وغیرہ کا میدان اختیار کر لیتا ہے اور اپنے ٹیلیفون کا کنکشن تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے حکومت کی ٹیلیفونک ایکسچینج کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور اس طرح رابطے میں رہ کر ہر جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے اور یوں جغرافیائی اعداد وشمار کے باب میں ایک بیش قیمت، منظم اور مکمل قسم کی علمی بحث لکھ لیتا ہے۔

لیکن دوسرا آدمی یا تو مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے پچاس سال تک مسلسل سیر وگردش میں رہے گا، ہر جگہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور ہر واقعہ اپنے کانوں سے سنے گا، یا پھر لاکھوں روپے صرف کر کے سلطان کی حیثیت تک پہنچے گا اور حکومت کی بجلی اور ٹیلیفون کے نظام کی تاروں کے برابر بجلی اور ٹیلیفون کا مالک بنے گا تاکہ پہلے آدمی کی طرح ایک مکمل کتاب لکھ سکے۔

اسی طرح۔وَلِلّٰہِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی -اِن غیر محدود مخلوقات کی نسبت اگر الواحدُ الاحد کی طرف کردی جائے تو ہر چیز اس ارتباط کی وجہ سے انتساب کا مظہر بن جائے گی، اور اس ازلی آفتاب کی تجلی کا عکس بن جانے کی وجہ سے اس کی حکمت کے قوانین، اس کے علم کے دساتیر اور اس کی قدرت کے قوانین کے ساتھ ربط واتصال فراہم کرے گی۔تب ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طاقت اور قدرت کے ساتھ ربانی جلوے کا ایک مظہر بن کر اُس کی ایک ایسی آنکھ کی حیثیت اختیار کرلے گی جو ہر چیز کو دیکھتی ہے، اس کے اس چہرے کا روپ دھار جائے گی، جو ہر جگہ کو نگاہ میں رکھتا ہے اور اس کا وہ کلام جو ہر چیز میں نافذ ہو جاتا ہے۔

اگر یہ انتساب منقطع ہو جائے تو وہ چیز بھی تمام اشیاء سے کٹ جائے گی اور اپنے جرم کے برابر چھوٹے پن میں منحصر ہو کر رہ جائے گی۔تب اس حالت میں ضروری ہے کہ وہ مطلق الوہیت کی مالک ہوتا کہ ان اعمال کو بخوبی ادا کر سکے جو پہلی وضع قطع میں ادا کرتی تھی۔

الحاصل:

وحدت اور ایمان کے راستے میں وجوب کے درجے میں سہولت اور آسانی پائی جاتی ہے۔اور شرک اور اسباب میں اتنی مشکل اور صعوبت پائی جاتی ہے کہ امتناع کے درجے میں جا پہنچتی ہے؛ کیونکہ فردِ واحد بہت سی اشیاء کو ایک خاص کیفیت پر ترتیب دیتا ہے اور ان سے بغیر تکلیف کے نتیجہ حاصل کرتا ہے۔لیکن اگر اس کیفیت کو اختیار کرنے اور اس نتیجے کو حاصل کرنے کا کام ان بہت سی اشیاء کے سپرد کر دیا جائے تو اس کیفیت کا اختیار کرنا اور اس نتیجے کا حاصل کرنا بہت زیادہ تکلّفات وصعوبات اور حرکات کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر: جیسے کہ تیسرے مکتوب میں ذکر کیا گیا ہے، ستاروں کے لشکروں کا شمس وقمر کی قیادت میں آسمانوں کے میدان میں گردش کرنا اور رواں دواں رہنا۔

ہر رات کو اور ہر سال کو ذکر وتسبیح کے لیے ایک خوبصورت دیدہ زیب منظر اور پرکشش اور مانوس کن وضع قطع عطا کر دینا: موسموں کو تبدیل کرنا اور ان جیسے بلند پایہ حکیمانہ زمینی مصالح ونتائج کو بروئے کار لانا۔۔۔ یہ تمام افعال اگر وحدت کی طرف منسوب کیے جائیں تو وہ سلطانِ اَزلی اس کیفیت اور اس نتیجے کی خاطر انتہائی سہولت کے ساتھ کرۂ ارض جیسے کسی فرد کو اجرامِ عُلویہ کا قائد بنا دیتا ہے۔تب زمین امر پا لینے کے بعد خدمت کے نشے سے سرشار رومی مولوی کی طرح ذکر وسماع کے لیے اُٹھتی ہے، اور یوں تھوڑے سے خرچے کے ساتھ یہ خوبصورت کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ اہم نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر زمین سے یہ کہا جائے کہ: ''رُک جا اور معاملے میں دخل اندازی مت کر''، اور اس نتیجے کا حصول اور اس کیفیت کا حصول آسمانوں کے سپرد کر دیا جائے اور وحدت کا راستہ چھوڑ کر کثرت اور شرک کا راستہ اپنایا جائے، تو پھر یہ لازم

آئے گا کہ زمین سے ہزاروں گنا بڑے لاکھوں ستارے چلیں اور ہر روز اور ہر سال چوبیس گھنٹوں میں کئی بلین سالوں مسافت طے کرلیں۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ: قرآن اور اہل ایمان غیر محدود مصنوعات کو صانع واحد کے سپرد کر دیتے ہیں اور ہر چیز کی نسبت براہِ راست اس کی طرف کر دیتے ہیں اور اس طرح درجۂ وجوب تک پہنچے ہوئے آسان راستے میں گام زن ہوتے ہیں اور دوسروں کو اس میں کھینچ لاتے ہیں۔

اور اہلِ شرک وطغیان ایک مصنوع چیز کو غیر محدود اسباب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور درجۂ امتناع تک پہنچے ہوئے دشوار راستے میں چلتے ہیں۔ پس اس حالت میں ضلالت کے راستے میں ایک مصنوع چیز قرآن کے راستے میں تمام موجودات کے مساوی ہوگی۔ بلکہ تمام اشیاء کا صدور ایک ذات سے ہونا، ایک چیز کے غیر محدود اشیاء سے صادر ہونے سے کئی درجے زیادہ معمولی اور آسان ہے: جس طرح کہ؛ ایک افسر ایک ہزار سپاہی کی فردِ واحد کی طرح آسانی کے ساتھ تدبیر کرتا ہے، لیکن اگر فردِ واحد کی تدبیر ایک ہزار سپاہیوں کے سپرد کر دی جائے تو یہ ایک ہزار سپاہیوں سے بھی بڑھ کر دشواری اور نزاع کا سبب بنے گی۔

پس یہ عظیم الشان آیت کریمہ اہلِ شرک کے سروں پر ضربِ کاری لگاتی ہے اور انہیں پاش پاش کر دیتی ہے اور کہتی ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَجُلاً فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلاً سَلَماً لِرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّامَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ بِعَدَدِ ذَرَّاتِ الْكَائِنَاتِ وَعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ اَجْمَعِينَ، آمِينَ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

اَللّٰهُمَّ يَا اَحَدُ يَا وَاحِدُ يَا صَمَدُ، يَامَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ! يَا مَنْ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ! يَا مَنْ يُحْيِى وَيُمِيتُ وَيَا مَنْ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَيَامَنْ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ يَا مَنْ اِلَيْهِ الْمَصِيرُ! بِحَقِّ اَسْرَارِ هٰذِهِ الْكَلِمَاتِ اِجْعَلْ نَاشِرَ هٰذِهِ الرِّسَالَةِ وَرُفَقَاءَهُ وَصَاحِبَهَا "سَعِيدًا" مِنَ الْمُوَحِّدِينَ الْكَامِلِينَ وَمِنَ الصِّدِّيقِينَ الْمُحَقِّقِينَ وَمِنَ الْمُؤْمِنِينَ الْمُتَّقِينَ۔ آمین۔۔۔

اَللّٰهُمَّ بِحَقِّ سِرِّ اَحَدِيَّتِكَ اِجْعَلْ نَاشِرَ هٰذَا الْكِتَابِ نَاشِراً لِاَسْرَارِ التَّوْحِيدِ وَقَلْبَهُ مَظْهَرًا لِاَنْوَارِ الْاِيْمَانِ وَلِسَانَهُ نَاطِقًا بِحَقَائِقِ الْقُرْآنِ۔

آمین آمین آمین

☆ ☆ ☆

اکیسواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا﴾

اے وہ غافل انسان کہ جس کے گھر میں اُس کی بوڑھی ماں یا بوڑھا باپ ہے، یا اُس کے اقرباء میں سے یا اس کے مومن بھائیوں میں سے کوئی عاجز یا بیمار آدمی ہے! اس آیتِ کریمہ کو گہری نظر سے دیکھ کہ کس طرح یہ مختلف صورتوں اور متعدد شکلوں میں بوڑھے والدین کے لیے رحمت وشفقت کی پانچ قسمیں مہیّا کر رہی ہے۔

جی ہاں؛ دنیا میں سب سے بلند ترین حقیقت اولاد کے لیے ان کے والدین کی شفقت ہے، اور بلند ترین حق اس شفقت کے مقابلے میں ان کا احترام ہے؛ کیونکہ والدین اپنی زندگی کمال لذت کے ساتھ اپنی اولاد کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور انہیں کے لیے صرف کر دیتے ہیں۔ بات جب یہی ہے تو ہر وہ بیٹا جس کی انسانیت گر نہیں گئی اور وہ درندہ نہیں بن گیا ہے تو اس کا یہ فرض ہے کہ وہ ان قابلِ احترام، فداکار، جاں نثار اور سچے دوستوں کا پورے خلوص کے ساتھ احترام کرے، صمیم قلب سے ان کی خدمت کرے، ان کی رضا مندی حاصل کرے اور اُن کے دلوں کو خوش کرے۔ پس چچا اور پھوپھی باپ کا حکم رکھتے ہیں اور ماموں اور خالہ ماں کا حکم رکھتے ہیں۔ پس ان بابرکت بوڑھوں کے وجود کو بوجھ سمجھنا اور ان کی موت کی تمنا کرنا کس قدر کمینگی، چھوٹا پن اور بے حسی ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ جاؤ۔

جی ہاں؛ اچھی طرح سمجھ جاؤ کہ جو تمہاری زندگی کے لیے اپنی زندگی قربان کر دیتا ہے اس کی زندگی کے زوال کی آرزو کرنا کس قدر بدترین ظلم اور بے حسی ہے۔

پس اے غمِ روزگار میں مبتلا انسان! برکت کا ستون، رحمت کا وسیلہ اور مصیبت کا دفعیہ تمہارے گھر میں یہی بوڑھا آدمی، یا تمہارے گھر میں رہنے والا تمہارا وہ قریبی ہے جسے تم بوجھ سمجھتے ہو۔ خبردار ایسے مت کہنا کہ میں معیشت کی تنگی کا شکار ہوں اس لیے خرچہ برداشت نہیں کر سکتا؛ کیونکہ اگر ان کی وجہ سے نازل ہونے والی برکت نہ ہوتی تو تمہاری معیشت اس سے بھی زیادہ تنگ ہوتی۔ پس مجھ سے یہ حقیقت مضبوط ہاتھوں سے پکڑ و اور اس کا اعتقاد رکھو؛ کیونکہ میرے پاس اس کے

قطعی دلائل ہیں اور میں تمہیں اس ضمن میں مطمئن کر سکتا ہوں۔لیکن اختصار سے کام لے رہا ہوں تا کہ بات لمبی نہ ہو جائے اس لیے میری اس بات پر بھروسا کرو اور مطمئن ہو جاؤ۔اور میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ حقیقت اس درجے کی قطعی حقیقت ہے کہ میرا نفس اور میرا شیطان بھی اس کے سامنے زیر ہو گئے ہیں۔اس لیے جس حقیقت نے میرے نفس کی ضد توڑی اور میرے شیطان کو لاجواب کیا ہے، ضروری ہے کہ وہ تمہیں بھی مطمئن کر دے۔

جی ہاں؛ بے شک وہ خالقِ ذُوالجلال جو کہ کائنات کی گواہی کے مطابق انتہائی درجے میں لطیف و کریم ہے، جیسے بچوں کو اس دنیا میں بھیجتا ہے تو انتہائی لطیف صورت میں ان کے پیچھے ہی ان کا رزق بھی ارسال کر دیتا ہے اور اُسے پستانوں کی نالیوں کے ذریعے ان کے مونہوں تک پہنچاتا ہے، اسی طرح وہ اُن بوڑھوں کے لیے بھی جو بچوں جیسے ہو گئے ہیں، قابلِ رحم ہیں اور بچوں سے بڑھ کر شفقت و مہربانی کے محتاج ہیں، وہ ان کا رزق بھی ان تک برکت کی صورت میں پہنچاتا ہے اور ان کے نان نفقہ کی ذمہ داری لالچی اور کنجوس لوگوں کے کندھوں پر نہیں ڈالتا۔اور تمام جاندار مخلوقات اپنی زبانِ حال سے اس حقیقت کا ذکر کرتی اور اس کی منادی کرتی ہیں جو آیتِ کریمہ میں پائی جاتی ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾

اور جو اس آیت کریمہ میں پائی جاتی ہے:

﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ دَآبَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ﴾

صرف قریبی بوڑھوں کا ہی نہیں بعض حیوانات بھی ایسے ہیں جن کا رزق برکت کی صورت میں آتا ہے، جیسے بلّیاں جو کہ انسان کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں، کہ ان کا رزق انسان کے رزق میں رکھ کر بھیج دیا جاتا ہے۔میں یہاں ایک آنکھوں دیکھی مثال ذکر کرتا ہوں جو اس حقیقت کی تائید کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

میرے قریبی دوست یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج سے دو تین سال پہلے میری خوراک صرف آدھی روٹی تھی، اور اس گاؤں کی روٹی بھی چھوٹی سی ہوتی تھی جو کہ بسا اوقات میرے لیے کافی بھی نہیں ہوتی تھی۔۔۔پھر میرے ہاں چار بلیاں مہمان بن کر آئیں، اور پھر وہی روٹی نہ صرف مجھے اور اُن بلّیوں کو کافی ہو جاتی تھی بلکہ بسا اوقات بچ بھی جاتی تھی۔

یہ صورتِ حال اتنی دفعہ پیش آئی کہ اس نے مجھے مطمئن کر دیا کہ میں بلیوں کی برکت سے ہی فائدہ اٹھا رہا ہوں اور اب میں اس بات کا قطعی طور پر اعلان کرتا ہوں کہ وہ بلیاں مجھ پر بوجھ نہیں تھیں، اور یہ کہ وہ میرے زیر بار احسان نہیں تھیں بلکہ خود میں ان کے زیرِ بار احسان تھا۔

اے انسان! اگر درندے کی صورت رکھنے والا ایک حیوان انسان کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو خیر و برکت کا محور بن جاتا ہے، تو پھر انسان کے بارے میں کیا خیال ہے جو کہ اکرمُ المخلوقات ہے؟ اور پھر صاحبِ ایمان جو کہ کامل ترین انسان

ہے۔اور پھر وہ جو اہلِ ایمان میں سے بیمار بوڑھے اور لاچار ہیں، جو کہ احترام و مرحمت کے زیادہ سزاوار ہیں؟ اور پھر وہ اقرباء جو ان بیماروں بوڑھوں اور لاچاروں میں سے شفقت، خدمت اور مہر ومحبت کے زیادہ حق دار و سزاوار ہیں۔ اور پھر وہ والدین جو ان اُقرباء میں سے مخلص ترین دوست اور صادق ترین محب ہیں، اور یہ لوگ بڑھاپے کی عمر میں جب کسی گھر میں موجود ہوں تو آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ حدیث شریف ''لَوْ لَا الشُّيُوخُ الرُّكَّعُ لَصُبَّ عَلَيْكُمُ الْبَلَاءُ صَبًّا'' کی رُو سے برکت کا کیسا وسیلہ، رحمت کا کیسا ذریعہ اور دفعِ مصیبت کا کیسا سبب بن جائیں گے؟ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے خمیدہ کمر بوڑھے نہ ہوں تو تم پر مصیبتیں سیلاب کی طرح اُمڈ آئیں۔

پس اے انسان! ہوش کے ناخن لے؛ کیونکہ اگر تُو مرا تو بوڑھا تو ضرور ہو گا۔ اس لیے اگر تو نے اپنے والدین کا احترام نہ کیا تو تیری اولاد بھی ''اَلْجَزَاءُ مِنْ جِنْسِ الْعَمَلِ'' کی رُو سے تجھے احترام نہیں دے گی اور تیری خدمت نہیں کرے گی۔

اس بنا پر اگر تجھے اپنی آخرت کے ساتھ پیار ہے تو ایک بیش ترین دفینہ تیرے ہاتھوں میں ہے، اور وہ یہ ہے کہ اپنے والدین کی خدمت کر اور ان کی رضامندی حاصل کر۔ اور اگر تجھے اپنی دنیا کے ساتھ پیار ہے تو تُو بھی انہیں خوش رکھ اور اُن کا شکر گزار رہ تاکہ تیری زندگی سکھ چین سے گزر جائے اور تیرا رزق برکت والا ہو جائے۔

لیکن اگر تو نے ان کے وجود کو بوجھ سمجھا اور اُن کی موت کی آرزو کرنے لگ گیا اور ان کے نرم و نازک، حسّاس اور غم سے بہت جلد متاثر ہونے والے دلوں کو دکھ دینے لگ گیا تو ''خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ'' کا مظہر بن جائے گا۔

اور اگر رحمان کی رحمت چاہتا ہے تو پھر اپنے گھر میں موجود رحمان کی اُن ودیعتوں اور امانتوں کے ساتھ رحمت و شفقت و مہربانی کا برتاؤ کر۔

میرے اُخروی بھائیوں میں سے ''مصطفیٰ چاؤش'' نامی ایک بھائی تھا۔ اور میں اُسے دین و دنیا میں کامیاب دیکھ رہا تھا، لیکن اس چیز کا راز میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پھر اس کامیابی کی وجہ میری سمجھ میں یہ آئی کہ وہ فاضل بھائی اپنے بوڑھے والدین کے حقوق خوب پہچانتا تھا اور ان حقوق کا پورا پورا خیال رکھتا تھا۔ اس لیے وہ ان دونوں کی برکت سے راحت و رحمت پا گیا۔ اور مجھے امید ہے کہ اُس نے اپنی آخرت بھی آباد کر لی ہے۔ ان شاء اللہ۔

جو آدمی سعادت مندی اور فیروز بختی چاہتا ہے اُسے اس جیسا بن جانا چاہیے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَى مَنْ قَالَ: ''اَلْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ'' وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾

بائیسواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

[یہ مکتوب دو مباحث پر مشتمل ہے، پہلے مبحث میں اہلِ ایمان کو اخوت اور محبت کی دعوت دی گئی ہے]

المبحث الأول:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (حاشیہ:۱)

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ (حاشیہ:۲)

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (حاشیہ:۳)

وہ چیز جو اہلِ ایمان کے مابین نفاق وشقاق اور ناچاقی و نااتفاقی کی صورت میں ضد، حسد، اور آپس کی دوریوں کا سبب بنتی ہے، اور وہ چیز جو ان کے سینوں میں بغض، کینے اور دشمنی کو ہوا دیتی ہے، وہ چیز بنیادی طور پر قابلِ نفرت اور ناقابلِ قبول ہے، اسے حقیقت قبول نہیں کرتی، اسے حکمت قبول نہیں کرتی اور اسے وہ اسلام بھی کسی صورت قبول نہیں کرتا جو کہ اعلیٰ انسانیت کی روح ہے۔ حقیقت، حکمت اور اسلام ان چیزوں کو جنم دینے والے اسباب کو ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ دشمنی وہ ظلم ہے جو انسان کی انفرادی، اجتماعی اور روحانی زندگی کا ستیاناس کر دیتا ہے، بلکہ یہ چیز انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کے بہت سے پہلو ہیں، اور ہم ان میں سے صرف چھ پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

پہلا پہلو:

حقیقت کی نگاہ میں برسرِ عداوت رہنا سراپا ظلم ہے۔

ارے اپنے مومن بھائی کے لیے اپنے سینے کو کینے، حسد اور دشمنی کے جذبات سے پُر رکھنے والے! ارے ...

(حاشیہ:۱)(الحجرات:۱۰)''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو''

(حاشیہ:۲)(فصلت:۳۴)''تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے''

(حاشیہ:۳)(آل عمران:۱۳۴)''جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں، ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں''

انصاف! فرض کرو کہ تم ایک کشتی میں یا ایک گھر میں ہو اور تمہارے ساتھ نو شخص بے قصور اور ایک مجرم ہے، اچانک تم دیکھتے ہو کہ ایک آدمی کشتی کو ڈبونے یا اس گھر کو گرانے کی کوشش میں ہے، تو لامحالہ تم ایسے حالات میں پوری قوت کے ساتھ چلا چلا کر اُس قبیح ظلم کے خلاف احتجاج کرو گے جس کا ارتکاب وہ شخص کر رہا ہے؛ کیونکہ تم یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ایسے میں کوئی بھی ایسا قانون نہیں ہے جو کسی ایسی کشتی کو ڈبونے کی اجازت دیتا ہو جس میں کچھ مجرم بیٹھے ہوئے ہوں جب تک کہ اس میں ایک بے قصور شخص بھی موجود ہو۔

تو جس طرح ایسی کشتی کو ڈبونا بدترین ظلم اور ذلیل ترین غداری ہے، اسی طرح اگر تمہارے دل میں کسی مومن کے بارے میں دشمنی اور کینہ پل رہا ہو تو یہ چیز تمہیں لازماً اس بات پر بھڑکائے گی کہ تم اس کے وجود کی کشتی کو غرق کر دو یا اس کے جسم کی عمارت کو نذرِ آتش کر دو۔ اور یہ چیز بدترین ظلم اور ذلیل ترین غداری ہے۔ حالانکہ یہ مومن بھی ایک ربّانی عمارت اور الٰہی کشتی ہے، یعنی اس کی تخلیق کا شاہکار ہے اور تم صرف اس کی ایک ایسی بری عادت کی وجہ سے اسے تباہ نہیں کر سکتے جو تمہیں ناپسند ہے یا تمہیں تکلیف دیتی ہے، جبکہ اس میں ایمان، اسلام اور تمہاری اچھی ہمسائیگی وغیرہ جیسی نو دیگر اچھی صفات پائی جاتی ہیں۔

دوسرا پہلو:

عداوت اور نفرت حکمت کی رو سے سراسر ظلم ہے؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ عداوت اور محبت ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہ دونوں تو گویا اندھیرے اور روشنی کی طرح ہیں جو حقیقی معنوں میں کبھی بھی ا ب نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جب محبت کے اسباب ا ب ہو جائیں اور پھر وہ دل میں اپنی بنیادیں مضبوطی کے ساتھ استوار کر لیں، تو عداوت کی نہ صرف یہ کہ ایک ظاہری صورت ہی رہ جائے گی، بلکہ وہ شفقت اور مہربانی کی شکل اختیار کر لے گی؛ کیونکہ مومن اپنے بھائی کے ساتھ پیار کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ پیار محبت رکھنا اس کے لیے ضروری بھی ہے۔ اس لیے اُس کی طرف سے صادر ہونے والی کسی بھی معیوب حرکت سے اُسے دکھ ہوتا ہے اور وہ پوری سنجیدگی، شفقت، نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ اس ضمن میں اسے طاقت کا استعمال کرنے یا بزور بازو حکم چلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ حدیث شریف میں کچھ اس طرح آیا ہے: (حاشیہ)

"کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑ رکھے، اس طرح کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے آئیں تو یہ اپنا منہ ادھر پھیر لے اور وہ ادھر، اور ان دونوں میں سے زیادہ اچھا وہ ہے جو پہلے سلام

(حاشیہ) "لا يَحِلُّ لِمُسلم أن يهجُرَ أخاه فوقَ ثلاث لَيال يَلتقيانِ فيُعرِضُ هذا ويُعرِضُ هذا وخَيرُهما الذى يَبدأُ بِالسَّلام" صحیح بخاری حدیث نمبر ۶۲۳۷، صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۵۶۰، عن ابی ایوب الانصاری۔

کہہ دے"۔

لیکن جب بُغض وعداوت کے اسباب غالب آجائیں اور دل میں گھر کر جائیں تو ایسی حالت میں محبت بناوٹ، تصنّع اور خوشامد کا لبادہ اوڑھ کر صرف ظاہری شکل میں باقی رہ جاتی ہے۔

اس لیے اے بے انصاف انسان! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ ایک مومن آدمی کا اپنے بھائی کے لیے بغض وعداوت کے جذبات سے بھرے رہنا بدترین ظلم ہے۔ اگر تم چھوٹی چھوٹی معمولی کنکریوں کو تعظیم دو اور یہ کہو کہ یہ کنکریاں کعبہ شریف سے زیادہ بلند مرتبہ اور جبلِ اُحد سے زیادہ عظمت کی حامل ہیں، تو تم بلاشبہ ایک شرمناک قسم کی حماقت کا مظاہرہ کرو گے۔ اِسی طرح یہ چیز بھی اِسی طرح کی حماقت ہوگی کہ آپ اپنے مومن بھائی کی چھوٹی موٹی غلطیوں اور معمولی کوتاہیوں کو۔ جو کہ چھوٹی چھوٹی کنکریوں کی طرح ہیں۔ اتنا بڑا سمجھنا شروع کر دیں کہ اُنہیں اُس ایمان پر ترجیح دے دیں کہ جس کا مقام کعبہ کی طرح بلند ہے، اور پھر اُنہیں اُس اسلام پر بھی ترجیح دے دیں کہ جس کی عظمت اُحد پہاڑ کی طرح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا اپنے بھائی کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی بجائے اُنہیں اِس طرح نمایاں کرنا کہ اُن کے سامنے اُس کی وہ باقی تمام خوبصورت اسلامی صفات ماند پڑ جائیں جن سے وہ مزیّن ہے۔ تمہارا یہ رویہ یقیناً ایسا بڑا ظلم، بے انصافی اور بے وقوفی ہے کہ جس کا احساس ہر اس آدمی کو ہو جاتا ہے جس کے پاس تھوڑی سی بھی عقل ہے۔

جی ہاں؛ بے شک ایمان کی توحید حتمی طور پر اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ اس عقیدے کو ماننے والے تمام لوگوں کے دل ایک دل کی صورت اختیار کر جائیں۔ عقیدے کی یہ وحدت اور یکسانیت پورے معاشرے کی وحدت کا تقاضا کرتی ہے جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔

آپ اُس آدمی کے ساتھ ایک قسم کے رابطے کا شعور رکھتے ہیں جو آپ کے ساتھ ایک بٹالین میں رہ رہا ہے، اور اس آدمی کے ساتھ دوستی کے تعلق کا شعور بھی رکھتے ہیں اگر آپ دونوں ایک کپتان کے ماتحت کام کر رہے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ اخوت اور بھائی چارے کے تعلق کا شعور بھی رکھتے ہیں اگر آپ دونوں ایک ہی شہر میں رہ رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے۔ اور واقعتاً ایسا ہی ہے۔ تو ایمان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جو تمہیں وہ نور اور وہ شعور عطا کرتا ہے جس کی وجہ سے وحدت کے بہت سے تعلقات، اتفاق واتحاد کے متعدد رابطے اور اخوت و بھائی چارے کے اتنے وافر رشتے سامنے آتے ہیں کہ جن کی تعداد اسمائے حسنیٰ کی تعداد کے برابر جا پہنچتی ہے؟ مثال کے طور پر یہ ایمان تمہیں یہ راہنمائی دیتا ہے کہ:

تمہارا خالق ایک ہے، تمہارا مالک ایک ہے، تمہارا معبود ایک ہے، تمہارا رازق ایک ہے۔۔۔ اور اس طرح ایک ایک کر کے یہ چیزیں ہزار تک پہنچ جاتی ہیں جو تم دونوں میں مشترک ہیں۔ پھر تم دونوں کا نبی ایک ہے، تمہارا دین ایک ہے، تمہارا قبلہ ایک ہے۔۔۔ اور اس طرح ایک ایک کر کے یہ چیزیں سو تک پہنچ جاتی ہیں جو تم دونوں میں مشترک ہیں۔ پھر یہ

کہ تم دونوں ایک گاؤں میں، ایک حکومت کے زیر سایہ ایک ہی ملک میں زندگی گزار رہے ہو۔۔۔اور اس طرح ایک ایک کر کے یہ چیزیں دس تک پہنچ جاتی ہیں جو آپ دونوں میں مشترک ہیں۔

تو اگر اس مقدار میں ایسے روابط موجود ہیں جو وحدت، توحید، ہم آہنگی، اتفاق، اتحاد، محبت اور اخوت کا تقاضا کرتے ہیں، اور ان روابط میں وہ روحانی قوت بھی پائی جاتی ہے جو اس کائنات کے بڑے بڑے سیاروں کو ایک بندھن میں باندھ سکتی ہے، تو پھر کس قدر ظالم ہے وہ آدمی جو ان تمام چیزوں سے منہ پھیرتا ہے اور مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور اسباب کو ان پر اہمیت دیتا ہے! وہ اسباب جو نفاق، شقاق، کینہ، بغض اور عداوت کو جنم دیتے ہیں! جس سے اس کے سینے میں اپنے مومن بھائی کے خلاف نفرت، کینہ اور کھوٹ کی آگ بھڑکتی رہتی ہے! کیا یہ روش ان اسباب و روابط کی توہین نہیں ہے جو وحدت اور یگانگت پیدا کرتے ہیں؟ اور ان اسباب کی ناقدری نہیں ہے جو محبت کا موجب ہیں؟ اور ان تعلقات پر ظلم نہیں ہے جو اخوت کو فرض کرتے ہیں؟ تمہارے دل میں اگر زندگی کی کوئی رمق موجود ہے اور تمہاری عقل کی چنگاری ابھی راکھ نہیں ہوئی ہے تو اس راز کا ادراک اچھی طرح کر لو گے۔

تیسرا پہلو:

یہ آیتِ کریمہ: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ﴾ (حاشیہ:۱)

خالص عدل و انصاف کی وضاحت کر رہی ہے، یعنی یہ کہ کسی انسان کو دوسرے انسان کی غلطی کی سزا نہیں دی جا سکتی ہے، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم، شریعت کے دوسرے مآخذ و مصادر، اہلِ حقیقت اور اسلامی فلسفہ کے آداب و اخلاق سب کے سب خبردار کرتے ہیں کہ:

کسی مومن کے بارے میں دل میں نفرت اور کینے کے جذبات پال کر رکھنا ظلم عظیم ہے؛ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی تمام معصومانہ صفات کو محض اس لیے رد کر دیا جائے کہ اس میں ایک ﴿رانہ خامی پائی جاتی ہے۔ اور پھر اس ایک بدعادت یا صفت کی وجہ سے __ جسے تم نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہو__ اس نفرت، کینے اور عداوت کے دائرے کو اس کے عزیز و اقارب تک بڑھا دینا تو بہت بڑا ظلم ہے، جیسے کہ قرآن کریم نے اس چیز کو بڑے زوردار الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ﴾ (حاشیہ:۲)

تو کیا اس کے بعد بھی تم اپنے لیے جواز ڈھونڈو گے اور خود کے حق پر ہونے کا دعویٰ کرو گے؟

یاد رکھو کہ وہ برائیاں، خرابیاں اور بداطواریاں جو نفرت، بغض اور عداوت کا سبب بنتی ہیں، وہ سب کی سب حقیقت کی

(حاشیہ:۱) (الانعام:۱۶۴) ''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا''۔

(حاشیہ:۲) (ابراہیم:۳۴) ''بے شک انسان بہت بڑا ظالم ہے۔''

نظر میں مٹی کی طرح کثیف ہیں۔اور خود برائی بھی اسی طرح کثیف ہی ہے۔اور کثیف چیز کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ تو کسی دوسری چیز میں سرایت کرتی ہے اور نہ اس میں منعکس ہوتی ہے۔البتہ اُس برائی کا معاملہ الگ ہے جسے انسان دوسرے سے سیکھ لے۔جبکہ نیکی، احسان اوراس جیسی دوسری چیزیں جو محبت کو جنم دیتی ہیں وہ محبت کی طرح روشن ہیں اور روشنی لطیف ہوتی ہیں، اور لطیف اور روشن چیز کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری چیز میں سرایت کرتی ہے اوراس میں منعکس ہوتی ہے۔یہیں سے یہ الفاظ ضرب المثل بن گئے ہیں کہ:''دوست کا دوست بھی دوست ہوتا ہے''۔اور آپ دیکھیں گے کہ لوگ اکثر یہ الفاظ دہراتے رہتے ہیں کہ:''لأجلِ عَينٍ ألفُ عَينٍ تُكرَم''''ایک آنکھ کی وجہ سے ہزار آنکھوں کی عزت کی جاتی ہے''۔

پس اے بے انصاف انسان!اگر حقیقت تک رسائی چاہتے ہو تو حقیقت یہی ہے۔اس لئے تمہارا اُس آدمی کے رشتے داروں کے ساتھ برسرِ پیکار رہنا جس میں پائی جانے والی کسی ایک صفت کو تم ناپسند کرتے ہو،اور پھر اس کے دوستوں کے ساتھ اوران لوگوں کے ساتھ دشمنی رکھنا جن سے اس کو پیار ہے،حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔

چوتھا پہلو:

تمہارا مومن آدمی کے بارے میں نفرت اور عداوت کا رویہ رکھنا شخصی زندگی کی حیثیت سے بھی واضح ظلم ہے، چاہتے ہو تو میں تمہارے سامنے چند دستور رکھتا ہوں جو اس چوتھے پہلو کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں،انہیں غور سے سنو اور سمجھو۔

پہلا دستور:

آپ کو جب اس بات کا علم ہو جائے کہ آپ اپنے فکر و عمل میں حق پر ہیں،تو آپ کے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ:''میرا مسلک حق ہے یا میرا مسلک سب سے اچھا ہے۔''لیکن آپ کے لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ:''صرف میرا ہی مسلک حق ہے اور بس''؛ کیونکہ تمہاری غیر منصف نظر اور پست سوچ،اور اندھی فکر دوسرے مسلکوں کو پرکھنے اور انہیں غلط ثابت کرنے والی کسوٹی کسی بھی صورت میں نہیں بن سکتی ہے۔بہت پہلے ایک شاعر نے کہا تھا:

وَعَينُ الرِّضَا عَن كُلِّ عَيبٍ كَلِيلَةٌ

وَلَكِنَّ عَينَ السُّخطِ تُبدِي المَسَاوِيَا(حاشیہ)

''رضامندی کی آنکھ ہر عیب سے اندھی ہوتی ہے،لیکن غصے کی آنکھ برائیاں ظاہر کرتی رہتی ہے۔''

(حاشیہ) یہ شعر عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کا ہے۔(ادب الدنیا والدین ص:٣٧)اوراس کی نسبت امام شافعیؒ کی طرف بھی کی جاتی ہے۔(دیوان الشافعی ص:٩١)طبع دار النور بیروت۔اس میں دوسرا مصرعہ یوں مروی ہے:كما أنّ عين السخط تبدي المساويا (مترجم)۔

دوسرا دستور:

تم پر یہ بات تو لازم ہے کہ اپنی ہر بات میں حق کہو، لیکن یہ لازم نہیں کہ تم جتنے بھی حقائق ہیں، سب بول ڈالو۔ اسی طرح تم پر یہ تو لازم ہے کہ اپنی ہر بات میں سچ بولو، لیکن یہ لازم نہیں کہ جتنے بھی سچ دنیا میں پائے جاتے ہیں وہ ضرور بول ڈالو اور بولتے رہو؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نیت اگر خالص نہ ہو تو مدِ مقابل نصیحتیں سن کر بھڑک اٹھتا ہے اور نتیجہ بالکل الٹا برآمد ہوتا ہے۔

تیسرا دستور:

اگر تم کسی کے ساتھ عداوت رکھنا ہی چاہتے ہو تو اپنے دل میں پائی جانے والی عداوت کے ساتھ عداوت رکھو، اس کی آگ بجھانے اور اسے جڑ سے اُکھاڑنے کی کوشش کرو۔ اور اپنے سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے بدترین دشمن یعنی اپنے اُس نفس کے ساتھ دشمنی مول لو۔ اگر عداوت رکھنا ہی چاہتے ہو تو پھر کافروں اور زندیقوں کے ساتھ رکھو۔ جو کہ بہت زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ اور یہ بات یاد رکھو کہ محبت کی صفت بذاتِ خود محبوب ہے اور اس قابل ہے کہ اس سے محبت رکھی جائے۔ اسی طرح عداوت کی خصلت اس بات کی مستحق ہے کہ کسی بھی چیز سے پہلے اُس کے ساتھ عداوت رکھی جائے۔

اور اگر اپنے دشمن پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو پھر اس کی طرف سے صادر ہونے والی برائی کا دفاع اچھائی کے ساتھ کرو۔ یہ واحد طریقہ ہے جس سے دشمنی کی آگ سرد پڑ جاتی ہے۔ لیکن اگر تم اس کی طرف سے صادر ہونے والی برائی کا جواب اُسی طرح برائی سے دو گے تو لڑائی اور عداوت بڑھے گی، حتی کہ اگر وہ بظاہر مغلوب بھی ہو جائے تو بھی اس کے دل میں تمہارے خلاف غصہ بھڑکتا رہے گا۔ نیتجتاً نفرت اور دشمنی دوام پائے گی اور کینہ جاری رہے گا۔ جبکہ اس کی برائی کے مقابلے میں حسن وخوبی کے برتاؤ سے اسے ندامت ہوگی بلکہ وہ آپ کا بہترین دوست بھی بن سکتا ہے؛ کیونکہ مومن کی تو شان ہی یہ ہے کہ وہ نیک دل، کریم اور فیاض ہوتا ہے۔ اس لیے اگر آپ اُس کی عزت کریں گے تو وہ تمہارا اپنا قریبی اور بھائی بن جائے گا۔۔۔ حتی کہ اگر چہ وہ بظاہر کمینہ ہی ہو لیکن ایمان کی حیثیت سے تو وہ معزز ہی ہے نا۔ شاعر کہتا ہے:

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيمَ مَلَكْتَهُ وَإِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيمَ تَمَرَّدَا (حاشیہ)

''اگر تم معزز آدمی کی عزت کرو گے تو اُس کے گویا کہ مالک ہی بن جاؤ گے، لیکن اگر تم کسی نگا کی عزت کرو گے تو وہ سرکش اور نافرمان ہو جائے گا''۔

جی ہاں؛ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اگر آپ کسی برے آدمی سے بار بار یہ کہیں کہ: ''آپ بہت اچھے اور فاضل آدمی ہیں''، تو آپ کے یہ الفاظ بسا اوقات اُسے اچھا بننے پر آمادہ کریں گے۔ اور اِسی طرح اگر آپ کسی اچھے آدمی کو بار بار کہیں کہ: ''تم

(حاشیہ) یہ شعر متنبی کا ہے۔ دیکھیں دیوان المتنبی مع شرح البرقوقی: ۲/۱۱ (مترجم)۔

بہت برے اور غلط آدمی ہو'، تو یہ الفاظ ہوسکتا ہے واقعتاً اُسے برائی کے راستے پر گامزن کر دیں۔
بنا بریں، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو ہمیشہ مدِنظر رکھیں:

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (حاشیہ:۱)

﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (حاشیہ:۲)

اور اس طرح کے دیگر مقدس قرآنی دستور جن میں انسان کے لیے توفیق، کامیابی، سعادت اور امن وسلامتی کا سامان موجود ہے۔

چوتھا دستور:

وہ لوگ جن کے سینے اپنے مومن بھائیوں کے خلاف حقد اور کینے سے بھرے ہوئے ہیں وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، اپنے بھائیوں پر ظلم کرتے ہیں اور رحمتِ خداوندی پر ظلم کرتے ہیں، اور وہ اس طرح کہ ایسا آدمی کینے اور عداوت کے جذبات سے مغلوب ہو کر خود کو عذابِ الیم میں ڈال لیتا ہے، چنانچہ وہ جب بھی دیکھتا ہے کہ اس کے دشمن کو کوئی نعمت حاصل ہوئی ہے، جل بھن کر دردناک عذاب جھیلتا ہے اور اس وجہ سے مبتلائے الم رہتا ہے۔ اور اگر اس دشمنی کا سرچشمہ حسد ہو تو پھر اس عذاب کی المناکی دو چند ہو جاتی ہے؛ کیونکہ حسد جو ہے وہ محسود یعنی جس آدمی کے ساتھ حسد کیا جائے اُس کی بہ نسبت حاسد کو زیادہ مبتلائے عذاب کرتا اور نقصان دیتا ہے، اور اسے اپنے شعلوں سے بھسم کر ڈالتا ہے۔ لیکن جہاں تک محسود کا تعلق ہے، تو اُسے حسد کا نقصان یا تو مطلق ہوتا ہی نہیں ہے، یا پھر کبھی ہو بھی تو معمولی سا ہوتا ہے۔

حسد کا علاج:

حسد کا علاج یہ ہے کہ حاسد اُن چیزوں کے انجام پر غور کرے جو حسد کا باعث بنتی ہیں، تاکہ اسے اِس چیز کا ادراک ہو جائے کہ اس کے محسود کو حسن و مال و دولت اور قوت و منصب وغیرہ جیسی جو چیزیں بھی حاصل ہوئی ہیں وہ زوال پذیر اور فانی ہیں، ان کا فائدہ بہت کم اور ان کو حاصل کرنے اور ان سے حاصل ہونے والی مشقت بہت زیادہ ہے۔

لیکن اگر حسد کا باعث اُخروی اُمور یعنی آخرت کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں، تو پھر تو حسد سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا ہے۔ اور اگر ان امور سے حسد والی آگ کبھی بھڑکے بھی تو حاسد یا تو ریاکار ہے جو اپنی اُخروی نیکیاں دنیا میں ہی برباد کر رہا ہے، یا پھر وہ اپنے محسود کو ریاکار سمجھ کر بر بنائے حسد اس پر ظلم کر رہا ہے۔

پھر حسد میں ایک اور شامت یہ بھی ہے کہ حاسد اپنے اس حسد کے ذریعے اللہ کی تقدیر پر ناراضگی کا اظہار کرتا ہے، کیونکہ

(حاشیہ:۱) (الفرقان:۷۲) "اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں"۔
(حاشیہ:۲) (التغابن:۱۴) "اور اگر تم عفو و درگزری سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور رحیم ہے"

وہ اپنے مخالف پر اللہ کے فضل و رحمت کا نزول دیکھ کر غم میں مبتلا ہوتا ہے، اور اگر اس پر مصائب نازل ہوں تو خوشی سے بغلیں بجاتا ہے۔ یعنی ایسا لگتا ہے جیسے وہ تقدیرِ الٰہی پر تنقید اور اس کی وسیع رحمت پر اعتراض کر رہا ہو۔ اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ تقدیر کو نشانہ بنانے والے کی مثال تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی ہتھوڑے کے ساتھ ٹکرا رہا ہو۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی رحمت پر اعتراض کرے گا وہ اُس سے لامحالہ محروم ہو جائے گا۔

کیا آپ اسے انصاف کی بات سمجھتے ہیں کہ محض ایک معمولی اور چھوٹی سی بات پر۔ جو کہ ایک دن کی دشمنی کے برابر بھی نہ ہو۔ ایک مومن آدمی کا سینہ اپنے مومن بھائی کے خلاف پورے ایک سال کے لیے کدورت سے بھرا رہے؟ یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ جو غلطی تمہارے بھائی سے صادر ہوئی ہے اسے صرف اسی کے سر نہیں مڑھنا چاہیے؛ اس لیے کہ:

اولاً:۔ اس معاملے میں تقدیرِ الٰہی کا بھی حصہ ہے، اس لیے آپ پر لازم ہے کہ تقدیرِ الٰہی کے اس حصے کو نکال کر اس مقررہ حصے کو تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کریں۔

ثانیاً:۔ اس معاملے میں نفس اور شیطان کا بھی حصہ ہے۔ اگر آپ اس حصے کو بھی نکال دیں تو پھر آپ کے سامنے اپنے اس بھائی کے لیے عداوت کی بجائے شفقت اور مہربانی کے جذبات ابھر آئیں گے؛ کیونکہ اس وقت آپ یہ بات سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بیچارا شیطان اور اپنے نفس کے ہاتھوں مغلوب ہے، اس لیے آپ اس کے بعد اُس کے اپنے کیے پر پشیمان ہونے اور دوبارہ راہِ راست پر آنے کا انتظار کرتے ہیں۔

ثالثاً:۔ اس معاملے میں آپ بھی اپنی غلطیوں پر نظر رکھیں، آپ کی وہ غلطیاں جنھیں آپ دیکھتے ہی نہیں یا دیکھنا چاہتے ہی نہیں۔ اس لیے سابقہ دو حصوں کے ساتھ ساتھ اگر آپ اپنی اس عادت کا حصہ نکال دیں تو آپ دیکھیں گے کہ اب جو حصہ باقی بچا ہے وہ اتنا معمولی ہے کہ اس کا سامنا آپ اپنی عالی حوصلگی اور بلند ہمتی یعنی عفو و درگزر ی کے ساتھ کر کے کسی پر ظلم ڈھانے یا اُس کو دکھ پہنچانے سے بچ سکتے ہیں۔

لیکن اگر آپ نے اس کی طرف سے سرزد ہونے والی غلطی کے مقابلے میں دائمی کینہ اور ختم نہ ہونے والی عداوت کی روش اختیار کی اور اس معاملے میں صرف اپنے دنیاوی مفاد کو سامنے رکھا۔ گویا کہ آپ نے اس دنیا میں ہمیشہ بیٹھ رہنا ہے۔ تو پھر تو لامحالہ آپ ''ظَلُومًا جَهُولًا'' والی صفت پر پورے اتریں گے، اور اس طرح آپ اُس دیوانے یہودی کے مشابہ ہوں گے جس نے شیشے کے معمولی ٹکڑوں اور لمحوں میں ختم ہو جانے والے برف کے بلوریں گالوں کو ہیرے سمجھ کر زرِ کثیر صرف کر کے خرید لیا۔

ہم نے آپ کے سامنے ان نقصانات کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے جو انسان کی شخصی زندگی میں نفرت اور دشمنی کے سبب سے جنم لیتے ہیں۔ اب اگر آپ کو اپنی ذات کے ساتھ پیار ہے تو کوئی ایسا دریچہ کھلا نہ رکھنا جس سے یہ عداوت اور

انتقام کی سوچ تمہارے دل میں داخل ہو سکے۔اور اگر یہ تمہارے دل میں داخل ہو کر جگہ بنا چکی ہے تو پھر اس کی آواز پر کبھی کان نہ لگانا بلکہ اس کی بجائے حافظ شیرازیؒ کی بات پر کان دھرنا، حافظ شیرازیؒ جو حقیقت تک رسائی کر جانے والی بصیرت کا مالک ہے۔وہ کہتا ہے:

دنیا نہ متاعیستی کہ ارزد بنزاعی

یعنی یہ پوری دنیا کوئی ایسی متاع نہیں کہ جس کے لیے کھینچا تانی کرتے رہیں۔(حاشیہ)

تو اگر اتنی بڑی دنیا اپنے تمام مال ومتاع سمیت اتنی بے قیمت ہے تو پھر اس کے ایک چھوٹے سے جزوی حصے کی کیا حیثیت ہوگی؟ حافظ ہی کا ایک اور قول سنیں:

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرفست

با دوستاں مروّت با دشمناں مدا را

یعنی دو جہانوں میں راحت اور سلامتی کے حصول کے راز کی وضاحت یہ دو کلمے کرتے ہیں:

۱۔دوستوں کے ساتھ مروت اور انسانیت کا برتاؤ۔

۲۔اور دشمنوں کے ساتھ صلح کارانہ معاملہ۔

سوال: اگر تم کہو کہ یہ بات میرے بس میں نہیں ہے؛ کیونکہ نفرت میری فطرت میں رچ بس گئی ہے اور میری ہستی میں گھر کر گئی ہے۔اس لیے حافظ والے اس اصول پر چلنا میرے اختیار سے باہر ہے، اور خاص کر اس وقت جب کہ لوگوں نے میرے جذبات مجروح کیے ہوں اور مجھے تکلیفیں پہنچائی ہوں۔ایسی صورتِ حال میں میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا ہوں۔

جواب: تو میں جواباً کہوں گا کہ بداخلاقی کے اثرات جب جاری نہ رہیں، اور اس کے تقاضوں پر عمل نہ کیا جائے اور ایسے آدمی کو اپنی کمی کوتاہی کا شعور ہو جائے تو کوئی پریشانی والی بات نہیں اور اس سے کوئی بہت بڑا نقصان بھی ظہور میں نہیں آتا ہے، جیسے مثال کے طور پر غیبت ہے۔تو جب تک آپ اس معاملے میں بے اختیار ہیں اور ان نفرت اور دشمنی کے جذبات سے گلوخلاصی نہیں کرا سکتے تو آپ کو اس بات کا شعور ہو جاتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں جو اس عادت کو اپنائے ہوئے ہوں۔اور آپ کو اس بات کا ادراک ہو جائے کہ میں اس معاملے میں حق پر نہیں ہوں۔تو یہ دو چیزیں آپ کو اس نفرت کے نقصان سے

(حاشیہ) تلاش بسیار کے بعد یہ مصرعہ دیوان جامی سے ملا۔مکمل شعر اس طرح ہے:

دنیا نہ متاعیست کہ ارزد بہ نزاعی   با خصم مدارہ کن و با دوست مواسا

دیکھیں دیوان عبدالرحمٰن جامی، 1/191۔مقدمہ وتصحیح اعلا خان افصح زاد۔مطبوعہ تہران۔مترجم۔

بچالیں گی جو آپ کے دل میں گھر کیے بیٹھی ہیں؛ کیونکہ یہ روش معنوی پشیمانی، مخفی توبہ اور ضمنی استغفار کی شکل ہوگی۔ اور ہم نے یہ مبحث قلمبند کیا ہی اس لیے ہے تاکہ اس کے دامن میں معنوی استغفار بھی سمٹ آئے اور اس طرح ایک مرد مومن پر حق اور باطل گڈمڈ نہ ہو سکے۔ اور وہ اپنے اس مدمقابل پر۔ جو حق پر ہے۔ ظالم ہونے کا الزام نہ لگا پائے۔

ایک قابل توجہ واقعہ:

ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک آدمی جو بظاہر عالم فاضل لگ رہا تھا، محض سیاسی نقطۂ نظر میں اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے عالم دین کی اس قدر مذمت کر رہا تھا کہ اسے کافر بنانے تک پہنچ گیا تھا۔ جبکہ میں نے اسی اثنا میں اسے ایک ایسے منافق کی تعریف کرتے ہوئے پایا جو سیاسی میدان میں اس کا ہمنوا تھا۔ میں سیاست کے ان برے اثرات سے لرزہ براندام ہو کر رہ گیا کہ سیاست اس بری حالت تک پہنچ گئی ہے! میں نے اس سے اللہ کی پناہ مانگی اور کہا: ''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ وَالسِّيَاسَةِ''، میں شیطان اور سیاست سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں اسی دن سے سیاسی زندگی کے میدان سے باہر آ گیا۔

پانچواں پہلو:

یہ پہلو اس چیز کی وضاحت کرتا ہے کہ عناد اور طرف داری سے اجتماعی زندگی کو کتنا نقصان پہنچتا ہے۔

سوال: اگر کہا جائے کہ:

ا۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے ''اِخْتِلَافُ أُمَّتِيْ رَحْمَةٌ'' (حاشیہ)

حالانکہ اختلاف تفرق اور طرف داری کا تقاضا کرتا ہے؟

ب۔ مزید یہ کہ اس تفرق اور اختلاف کی بیماری میں کمزور اور غریب عوام کے لیے ایک گونہ رحمت کا پہلو پایا جاتا ہے؛ کیونکہ اگر کسی گاؤں یا قصبہ وغیرہ میں سربرآوردہ ظالم لوگوں کے درمیان اتفاق ہو جائے تو وہ مسکینوں اور بے کسوں پر جبر کرتے اور ظلم ڈھاتے ہیں، لیکن اگر ان لوگوں میں اختلاف اور گروہ بندی ہو تو مظلوم ایک گروہ کی حمایت اور پناہ میں آ کر

(حاشیہ) سخاوی نے کہا ہے: بیہقی نے یہ حدیث منقطع سند کے ساتھ بیان کی ہے۔ طبرانی اور دیلمی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ زرکشی اور ابن حجر نے اسے نصر مقدسی کی نسبت سے مرفوع بیان کیا ہے لیکن اس کی سند بیان نہیں کی ہے۔ عراقی نے اسے آدم بن ابی ایاس کی طرف منسوب کیا ہے لیکن اس کی سند بیان نہیں کی ہے۔ ملا علی قاری نے ''الموضوعات'' میں سیوطی کا قول نقل کیا ہے کہ: ''یہ حدیث نصر مقدسی نے ''الحجۃ'' میں، اور بیہقی نے ''الرسالۃ الاشعریۃ'' میں بغیر سند کے روایت کی ہے۔ حلیمی، قاضی حسین اور امام الحرمین وغیرہ نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے۔ ممکن ہے حفاظ حدیث کی بعض ایسی کتابوں میں اس کی تخریج کر دی گئی ہو جو ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ (کشف الخفاء: ۱/۶۴) سے اختصار کے ساتھ۔ نیز دیکھیں: ''تمییز الطیب'' ص: ۱۱ (مترجم)۔

اپنی جان بچالیتا ہے۔

ج۔مزید یہ کہ افکار کے تصادم، آراء کے جدل و مناقشے اور عقلوں کے باہمی اختلافات سے حقیقت واضح طور پر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔تو اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ اختلاف اچھی چیز ہے؟

جواب: پہلے سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

حدیث شریف میں جس اختلاف کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد، مثبت اختلاف ہے نہ کہ منفی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے مسلک کی ترویج واشاعت، اپنے مذہب کے صحیح ہونے اور اپنے نقطۂ نظر کے درست ہونے کا اظہار کرنے کے لیے کوشش کرے، لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ دوسروں کے مسالک کو منہدم کرنے، ان کے نقطۂ نظر پر طعن ملامت کرنے اوران کے مذاہب کو باطل ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس کی کوشش حتی المقدور کمی کوتاہی کو پورا کرنے، ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرنے اور اصلاح کاری کے لیے ہو۔

اور منفی اختلاف یہ ہے کہ ہر آدمی دوسروں کے مسلک کو منہدم اور برباد کرنے کی کوشش میں لگ جائے۔اس اختلاف کا باعث حقد، بغض اور عداوت ہوتا ہے۔حدیث کی رو سے اختلاف کی یہ قسم یکسر مردود ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے اختلاف ونزاع کا شکار لوگ کوئی بھی مثبت کام کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔

اور دوسرے سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

اگر تفرق اور گروہ بندی حق کے لیے اور حق کے نام پر ہو تو بسا اوقات یہ چیز اہل حق کے لیے پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے، لیکن وہ تفرقہ واختلاف جس کا مشاہدہ ہم کر رہے ہیں، وہ ذاتی اغراض اور نفسِ امّارہ کی خواہشات کے زیر اثر رونما ہو رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ چیز ظلم کیشوں کا مرجع و مرکز بن گئی ہے۔اور ان لوگوں کے تصرّفات میں ظلم واضح طور پر نظر آتا ہے۔اور یہ لوگ اس روش میں اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کے پاس شیطان آئے اور اس کی رائے کے ساتھ موافقت کرتا ہوا اس کا تعاون کرے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ شیطان کی تعریف کر رہا ہے اور اس کے بارے میں ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے، لیکن اگر مخالف صف میں کوئی فرشتہ سیرت انسان بھی ہو تو یہ اُسے ملعون کہنے کی حد تک چلا جائے گا۔

تیسرے سوال کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

حق کے لیے اور حقیقت تک رسائی کے راستے میں جو آراء وافکار میں تصادم اور مناقشہ کا ظہور ہوا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ بنیادی اہداف و مقاصد میں اتفاق ہونے کے باوجود وسائل وذرائع میں اختلاف کا واقع ہونا ہے۔اس قسم کا اختلاف حقیقت کا انکشاف اور اس کے ہر زاویے کی بہترین صورت میں وضاحت کر سکتا ہے۔لیکن تصادم افکار اور مناقشہ

اگر ظرف داری اور دوسروں پر غلبہ و تسلّط کے اظہار، فرعونی نفسیات کا پیٹ بھرنے اور حصولِ شہرت اور نام نمود کی محبت یا کسی اور غرض کے لیے ہو تو افکار و آراء کے اس قسم کے پھیلاؤ میں حقیقت کی کوئی کرن نہیں چمک سکتی ہے، ہاں البتہ فتنہ و فساد کے شعلے ضرور بھڑک سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ایسے لوگوں کے درمیان مقصد اور غرض و غایت میں اتفاق نظر نہیں آئے گا۔

جی ہاں؛ پورے کرۂ ارض میں ان کے افکار و نظریات میں ایک نقطے پر بھی اتفاق نہیں پایا جاتا ہے؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کا اختلاف حق کی خاطر نہیں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا اختلاف انتہا پسندی پر مبنی اور حدود نا آشنا ہوتا ہے، جو ایسے گہرے زخم چھوڑتا ہے کہ جو مندمل نہیں ہو پاتے ہیں۔ دنیا کی موجودہ حالت اس کی جیتی جاگتی گواہی ہے۔

خلاصۂ کلام

مردِ مومن کے تصرّفات اور اس کی حرکات و سکنات اگر اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ وَالْحُكْمُ لِلّٰهِ میں پائے جانے والے اعلیٰ دستوروں کے مطابق نہ ہوں''، اور وہ اپنے تمام امور میں فیصلہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق نہ کرے تو نفاق و شقاق سر اٹھاتے ہیں۔ جی ہاں؛ بے شک وہ آدمی جو اَلْبُغْضُ فِي اللّٰهِ وَالْحُكْمُ لِلّٰهِ جیسے دستوروں کی روشنی میں نہیں چلتا ہے وہ عین اس وقت ظلم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے جس وقت وہ عدل کے ارادے سے کوئی کام سر انجام دینا چاہتا ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ:

ایک اسلامی غزوے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لڑائی کے دوران مشرکوں کے ایک بہادر آدمی پر قابو پا لیا اور اسے پچھاڑ لیا، اور جب اس کا کام تمام کرنے لگے تو اس نے آپ کے چہرے پر تھوک دیا۔ تب آپؓ اُسے چھوڑ کر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ مشرک آپؓ کی اس حرکت پر حیران رہ گیا۔ اس نے آپؓ سے پوچھا: آپ نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا؟ آپ نے کہا: میں تمہیں اللہ کی رضا کی خاطر قتل کرنے جا رہا تھا، لیکن جب تم نے یہ حرکت کی تو مجھے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ تمہیں قتل کرنے میں کہیں میرا ذاتی انتقام شامل نہ ہو جائے۔ اس لیے میں نے تمہیں اللہ کے لیے چھوڑ دیا۔ کافر نے جواب دیا: میری اس حرکت سے تو تمہیں اور بھی مشتعل ہو کر مجھے فوراً قتل کر دینا چاہیے تھا! تم جیسے لوگ اگر اُس دین کے پیروکار ہیں جس میں رواداری اور درگزری کی تعلیم اس آخری حد تک دی گئی ہے تو وہ دین یقیناً سچا ہے۔

ایک اور واقعہ:

ایک مسلمان حاکم نے اپنے جج کو صرف اس لیے معزول کر دیا کہ اس نے دیکھا کہ جب وہ چور کا ہاتھ کاٹ رہا تھا تو اس میں غصے اور شدت کے آثار نمایاں تھے۔ اس لیے جو آدمی اللہ کا حکم نافذ کر رہا ہے اسے ملزم یا محکوم کے خلاف اپنے ذاتی جذبات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اسے انسانی جان ہونے کی وجہ سے اس کی حالت پر ترس آنا چاہیے۔ البتہ اللہ

کے احکام کے نفاذ کے ضمن میں اسے نرمی یا سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ ذاتی جذبات کا فیصلے میں شامل ہو جانا چونکہ خالص عدل وانصاف کے منافی ہے اس لیے حاکم نے اپنے جج کو معزول کر دیا۔

ایک خطرناک معاشرتی بیماری اور افسوسناک اجتماعی حالت جو امتِ اسلامیہ کو لاحق ہوئی ہے اور جس پر اسلام کا دل خون کے آنسو روتا ہے:

انتہائی پسماندہ قبائل بھی اپنے اوپر منڈلانے والے خطرات کا ادراک رکھتے ہیں، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی بیرونی دشمن ان پر حملہ آور ہوتا ہے وہ اپنے اندرونی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر اور چھوٹی موٹی دشمنیاں بھول کر فوراً متحد ہو جاتے ہیں۔ جب یہ پسماندہ قبائل اپنی سماجی مصلحت کا اس قدر اندازہ رکھتے ہیں اور اسے اتنی اہمیت دیتے ہیں تو پھر اُن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جنھوں نے خدمتِ اسلام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہوئی ہے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں؟ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ آپس کی چھوٹی چھوٹی دشمنیاں نہیں چھوڑتے؟ بلکہ ان چھوٹی موٹی د ں اور ذاتی رنجشوں کی وجہ سے اپنے لاتعداد دشمنوں کے لیے اپنے اوپر حملے کی راہ ہموار کرتے ہیں! جبکہ حالت یہ ہے کہ دشمن چاروں طرف سے ان پر حملہ کرنے کے لیے صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ یہ حالت ایک خوفناک تنزل اور کربناک انحطاط کی حالت ہے اور اسلام کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے حق میں بدترین خیانت۔

ایک سبق آموز واقعہ:

موقع کی مناسبت سے میں یہاں ایک سبق آموز واقعہ بیان کرتا ہوں: ''حسنان'' نامی بدومی خاندان کے دو قبیلوں کے درمیان ایسی خونی لڑائی برپا تھی کہ پچاس سے زیادہ لوگ اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ لیکن جونہی انہیں بیرونی قبائل ''سبکان'' یا ''حیدران'' کی طرف سے خطرہ درپیش ہوتا وہ اپنے داخلی اختلافات کلی طور پر بھلا کر دشمن کا راستہ روکنے کے لیے فوراً یکجان ہو کر ایک دوسرے کے معاون ومددگار بن جاتے۔

اے اہلِ ایمان! تم جانتے ہو کہ دشمنوں کے کتنے قبیلے اہل ایمان کے قبیلے پر غارتگری کے لیے تیار کھڑے ہیں؟ سو سے بھی زیادہ ہیں اور وہ باہم متداخل حلقوں کی طرح مسلمانوں کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ لیکن ایسے حالات میں جبکہ چاہیے یہ تھا کہ مسلمان ان میں سے ہر ایک کا راستہ روکنے کے لیے شیر وشکر ہو جاتے، ہوا یہ کہ ہر آدمی اپنی ذاتی اغراض کی خاطر دوسرے سے دشمنی مول لیے ہوئے اپنی الگ راہ ناپ رہا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے وہ اپنی اس روش سے دشمنوں کے لیے حملے کی راہ ہموار کر رہا ہے اور ان کے لیے دروازہ کھول رہا ہے تاکہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے اسلام کے پُرامن حرم میں داخل ہو سکیں۔ کیا یہ روش امتِ مسلمہ کے شایانِ شان ہے؟ اگر آپ اُن دائروں اور حلقوں کی تعداد جاننا چاہتے ہیں جو اسلام کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں تو یاد رکھیں کہ اہلِ ضلالت اور اہلِ الحاد سے لے کر عالمِ کفر، دنیا کے آلام

ومصائب اوراس کے ناگفتہ بہ حالات تک، یہ سب کے سب وہی دائرے ہیں جو باہمدیگر پیوستہ ہیں اور جن کی تعداد ستر تک پہنچ جاتی ہے۔اور یہ سب کے سب تمہارے خلاف غیظ وغضب سے بھرے ہوئے انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ اندریں حالات دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی مؤثر ہتھیار، سکون بخش خندق اور محفوظ قلعہ ہے، اور وہ ہے ''اسلامی اخوت'' پس اے مسلمان! ہوش میں آ اور جان لے کہ معمولی اور حقیر دلائل اور واہیات اسباب کی بنیاد پر جو کہ زندہ احساس اور وجدان کے یکسر خلاف ہوں، اسلام کے محفوظ قلعے کی دیواروں کو ہلانا اسلام کی مصلحت کے کلی طور پر منافی ہے۔اس لیے ہوش میں آ اور خبردار ہوجا!

کچھ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ: سفیانی اور دجال جیسے خوفناک اور مضرت رساں لوگ آخری زمانے میں منافقوں اور زندیقوں کی باگ ڈور سنبھال لیں گے۔ یہ لوگ مسلمانوں اور عام لوگوں کے باہمی اختلاف اور حرص وہوا کو استعمال کر کے معمولی طاقت کے بل بوتے پر دنیا کو ہلاک کر کے امتِ مسلمہ کو پابندِ سلاسل کرلیں گے۔

اے اہلِ ایمان!

اگر تم واقعتاً باعزت زندگی چاہتے ہو اور ذلت، پستی اور رسوائی کی بیڑیوں سے رہائی چاہتے ہو تو اس غفلت کی نیند سے بیدار ہوجاؤ، ہوش کے ناخن لو اور اُس مقدس قلعے میں پناہ گزیں ہوجاؤ جس کی نشاندہی یہ آیت کریمہ کررہی ہے۔ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (الحجرات:١٠) ''بے شک مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں''۔اور اس طرح اپنے آپ کو ان ظالموں کے ہاتھوں سے محفوظ کرلو جو تمہارے داخلی اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔۔۔ یادرکھو کہ اگر ایسا نہ کرسکے تو نہ صرف یہ کہ تم اپنے حقوق کا دفاع نہیں کرسکو گے بلکہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے؛ کیونکہ یہ بات تو ڈھکی چھپی نہیں کہ آپس میں کشتی کرتے ہوئے دو پہلوانوں کو ایک چھوٹا سا بچہ بھی مارسکتا ہے! اور ایک چھوٹی سی کنکری ایک پلڑے کو جھکا اور دوسرے کو اٹھاسکتی ہے، اگرچہ دونوں میں برابر وزن کے دو پہاڑ رکھے ہوئے ہوں!

پس اے اہلِ ایمان!

تمہاری قوت تمہاری حرص وہوا اور تمہاری جانب دارانہ گروہ بندی کی وجہ سے منتشر ہورہی ہے۔اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب کوئی انتہائی قلیل قوت بھی تمہیں ذلت اور ہلاکت کے عذاب سے دوچار کرسکتی ہے۔پس اگر تم حقیقی طور پر ملتِ اسلامیہ کے ساتھ وابستہ ہو تو مندرجہ ذیل فرمانِ نبوی سے رہنمائی حاصل کرو اور اسے دستورِ حیات بنالو:

''المومنُ لِلمومنِ كالبُنيانِ الْمَرْصُوْصِ يَشُدُّ بَعضُهٗ بَعْضًا''(حاشیہ)

''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایک سیسہ پلائی عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط

(حاشیہ) صحیح بخاری حدیث نمبر ٤٨١، ٢٤٤٦، ٦٠٢٧، صحیح مسلم حدیث نمبر ٢٥٨٥، ٢٦٢٧، (جاری)

کرتا ہے''۔

صرف یہی ایک صورت ہے، جس سے تم دنیا میں ذلت اور آخرت میں بدبختی سے بچ سکتے ہو۔

چھٹا پہلو:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخلاص عذاب سے نجات اور گلو خلاصی کا وسیلہ ہے۔ آپس کی نفرت اور دشمنی اور ہٹ دھرمی چونکہ مومن کی روحانی زندگی کو ہلا کر رکھ دیتی ہے اس لیے اللہ کے لیے اس کی خالص بندگی کو اُس وقت نقصان پہنچتا ہے جب اِخلاص ختم ہو جاتا ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ عناد پرست آدمی جو صرف اپنی رائے پر ڈٹا رہتا ہے اس کے سامنے صرف ایک ہی ہدف ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کا وہ مدِّ مخالف جو نیکی کے کام کر رہا ہے، یہ اس پر فوقیت حاصل کر لے۔ اس بنا پر وہ خالص اللہ کی راہ کے لیے کام کرنے کی توفیق سے نہیں نوازا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ عدل وانصاف کی توفیق سے بھی محروم رہتا ہے، اور وہ صرف اس بنا پر کہ وہ اپنے احکام ومعاملات میں اپنے ہمنواؤں کو دوسروں پر بہر طور ترجیح دیتا ہے۔ اور اس طرح جھگڑے، نفرت اور دشمنی کی وجہ سے وہ بنیادی رکن منہدم ہو جاتے ہیں جن پر نیکی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یعنی ''اخلاص اور عدل وانصاف''۔ اس پہلو پر سیر حاصل گفتگو کے لیے بہت زیادہ وقت درکار ہے، لیکن یہاں چونکہ طویل گفتگو کے لیے گنجائش نہیں ہے اس لیے سرِ دست اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

(حاشیہ گزشتہ صفحہ) ترمذی مع تحفۃ الاحوذی حدیث نمبر ۱۹۹۳۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔ اور مسند احمد: ۴/۴۰۴، نسائی: ۵/۷۹، شرح السنۃ للبغوی حدیث نمبر ۳۴۶۱، ابوالشیخ، حدیث نمبر ۳۰۰، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۱/۲۱ اور کتاب الایمان حدیث نمبر ۹۰۔ ان سب نے یہ حدیث ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے۔ مترجم۔

المبحث الثانی

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾

﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾

اے اہل ایمان!

سابقہ صفحات سے آپ کو اس بات کا تو بخوبی پتہ چل گیا ہے کہ بغض و عداوت کتنے بڑے بڑے نقصانات کا باعث بنتے ہیں۔ اب یہ یاد رکھیں کہ حرص بھی ایک بہت بڑی بیماری ہے، بلکہ یہ اسلامی زندگی کے لئے سب سے زیادہ نقصان دہ اور خطرناک بیماری ہے۔ جی ہاں؛ حرص بذات خود ناکامی و نامرادی کا سبب، مہلک بیماری اور ذلت ورسوائی ہے، اور یہی چیز پستی اور حرماں نصیبی کا باعث ہے۔

حرص کے بارے میں اس حکم کی قطعی شہادت یہودیوں کو ان کے دنیا کے متاعِ غرور پر مر مٹنے کی وجہ سے کسی بھی امت کے مقابلے میں زیادہ پہنچنے والی ذلت، مسکنت، رسوائی، پستی اور سرنگونی ہے۔

حرص اپنی بری تاثیر کائنات کی ذی حیات مخلوق کے وسیع دائرہ سے شروع کرتی اور جہانِ رنگ و بُو کے آخری چھوٹے سے چھوٹے فرد تک میں چھوڑتی ہے، جبکہ رزق کے لئے توکل سے مزین سعی و عمل راحت و اطمینان کا باعث ہے اور توکل کی یہ روش اپنی نفع بخش تاثیر ہر جگہ چھوڑتی ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ نباتات اور پھل دار درخت جو کہ رزق کے محتاج ہیں اور ان کا شمار بھی ذی روح یا ذی حیات مخلوقات میں ہوتا ہے، ان کا رزق ان کی طرف بھاگتا چلا آتا ہے، جبکہ یہ خود اپنی جگہ پر توکل اور قناعت کی علامت بنے ہوئے پورے وقار کے ساتھ کھڑے ہیں، ان کی طرف سے کبھی بھی لالچ لوبھ کا مظاہرہ نہیں ہوتا بلکہ اپنی نسل (پھل پھول وغیرہ) کی افزودگی اور اس کی تربیت کے معاملے میں یہ حیوانات سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ جبکہ حیوانات اپنا رزق بڑی جدوجہد اور مشقت کے ساتھ حاصل کرتے ہیں، اور وہ بھی تھوڑی سی کیت میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رزق کے پیچھے باؤلے ہوکر پڑے ہوئے ہیں اور اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، حتیٰ کہ خود حیوانات کی اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بچے جو زبانِ حال سے اپنے ضعف و عجز اور توکل کا اظہار کرتے ہیں، ان تک ان کا ضروری رزق رحمتِ الٰہیہ کے خزانے سے مکمل صورت میں پہنچتا ہے، اور یہ صورت حال اتنی گہری ہے کہ سمجھ سے باہر ہے، جبکہ چیرنے پھاڑنے والے درندے جو کہ شدید حرص کی وجہ سے اپنے شکار کا تیاپانچہ کر دیتے ہیں، بہت زیادہ محنت مشقت اور تلاش و جستجو کے بعد اپنا ضروری رزق حاصل کر پاتے ہیں۔

یہ دونوں حالتیں بڑی وضاحت سے بتاتی ہیں کہ حرص ولالچ محرومی کا سبب ہے اور توکل اور قناعت رحمت واحسان کا نتیجہ ہیں۔

عالمِ انسانیت میں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے، یہودی جو کہ زندگی کے سب لوگوں سے زیادہ حریص ہیں اور آخرت کے مقابلے میں اس زندگی کو ترجیح دیتے ہیں، بلکہ اس دنیاوی زندگی کے وہ اس قدر روالہ وشیدا ہیں کہ اس میدان میں تمام امتوں کو مات دے گئے ہیں؛ ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کی گئی، یہ دوسری امتوں کے ہاتھوں متعدد بار قتل وغارتگری کی زد میں آئے۔ یہ سب کچھ ایک ہی چیز کا نتیجہ تھا، اور وہ یہ کہ یہ لوگ طویل مشقت کے بعد سود کے ذریعے ناجائز اور حرام دولت اکھٹی کرتے ہیں اور خرچ اس میں سے انتہائی قلیل مقدار میں کرتے ہیں۔ جیسے کہ ان کی ڈیوٹی صرف یہی ہے کہ دولت اِ ن کر کر کے اس سے تجوریاں بھرتے رہیں اور بس۔۔۔ یہ حالت ہمیں بڑی وضاحت سے بتاتی ہے کہ حرص عالم انسانیت میں ذلت، خست اور خسارے کا سرچشمہ ہے۔

کتنے ہی ایسے واقعات ہیں جو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ حریص آدمی ہمیشہ خسارے کی زد میں رہتا ہے، حتیٰ کہ یہ محاورہ زبان زدعام ہوگیا اور لوگوں کی نظروں میں ایک مسلمہ حقیقت بن گیا ہے کہ: ”اَلْحَرِيصُ خَائِبٌ خَاسِرٌ “یعنی حریص ناکام ونامراد اور خسارہ پانے والا ہے۔

یہ حقیقت جب سامنے آگئی ہے تو اگر تم مال ودولت کے ساتھ بہت محبت رکھتے ہو تو اسے حرص کے ساتھ نہیں بلکہ قناعت کے ساتھ طلب کرو تمہیں بہت ملے گا۔

قناعت پسند اور حریص آدمی کی تشبیہ آپ دو ایسے شخصوں کے ساتھ دے سکتے ہیں جو کسی عظیم آدمی کے مہمان خانے میں وارد ہوئے، ان میں سے ایک آدمی دل کی گہرائی سے یہ خواہش کرتا ہے کہ: کاش صاحب خانہ مجھے صرف گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دے تاکہ میں باہر پڑنے والی سردی سے بچ سکوں! میرے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے اس کے بعد وہ اگر مجھے گھر میں کسی ادنیٰ جگہ پر بیٹھنے کی اجازت دے دے تو یہ اس کا مجھ پر مزید احسان ہوگا۔ لیکن دوسرا آدمی ایسے تصرف کرتا ہے جیسے کہ اس کا دوسروں پر حق ہے اور جیسے کہ لوگ اس بات پر مجبور ہیں کہ جب وہ ان کے سامنے جائے تو سب اس کے احترام میں کھڑے ہو جائیں، اس لیے وہ اپنے دل میں فخر وغرور سے کہتا ہے: صاحبِ خانہ کے لیے لازم ہے کہ وہ میرے لیے خصوصی طور پر نمایاں اور اونچی جگہ پر نشست کا اہتمام کرے۔ اب وہ دل میں یہی ارمان لے کر کوٹھی میں داخل ہوتا ہے اور مجلس میں بلند جگہ پر بیٹھنے کا امیدوار ہوتا ہے، لیکن صاحب خانہ اس کی توقعات کے برعکس اسے عام سی جگہ پر بٹھا دیتا ہے۔ اب اس کا سینہ صاحبِ خانہ کے خلاف غیظ وغضب سے پھٹا جارہا ہے اور عین اس وقت کہ جب اسے صاحب خانہ کے لیے شکریے کے الفاظ ادا

کرنے چاہئیں تھے، وہ اس پر تنقید شروع کر دیتا ہے۔ اب اس کا وجود صاحب خانہ کے لیے بوجھل سا ہو جاتا ہے۔ جبکہ یہی آدمی اس بے نوا کو مرحبا کہتا ہے جس کی خواہش صرف یہاں تک ہے کہ اسے اس بہت بڑی کوٹھی میں صرف داخل ہونے کی اجازت مل جائے، جو سراپا تواضع ہے، جہاں بھی اُسے بٹھایا جائے بیٹھ جائے گا؛ کیونکہ صاحب خانہ کو اس آدمی کی قناعت نے بہت متاثر کیا، وہ اس کی تشکرانہ طبیعت سے بہت خوش ہوا، اسے محسوس ہوا کہ یہ آدمی اندر سے پھول کی طرح کھلا ہوا اور ہر چیز کے بارے میں اچھا نظریہ رکھنے والا ہے، اس لیے اس نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اسے بہترین جگہ پر بٹھایا اور اس کے ساتھ اچھے سے اچھا سلوک کرتا رہا اور اسے بلند سے بلند مقام پر فائز کرتا رہا۔ اور یہ شکر اور قناعت بھرا آدمی اس کی اس بندہ نوازی کے انداز سے جوں جوں بلند مراتب پر جاتا رہا سراپا شکر و رضا بنا اور احسان مندی کے جذبات سے سرشار ہوتا رہا۔

دنیا کی حالت بھی یہی ہے، یہ خدائے رحمان کا مہمان خانہ ہے، روئے زمین اس کی چاروں طرف پھیلی ہوئی رحمت کا دستر خوان ہے اور یہاں رزق کے درجے اور نعمتوں کے مرتبے ان درجہ بدرجہ نشستوں کی طرح ہیں۔

حرص کی بری تاثیر اور اس کے تباہ کن انجام کے بارے میں ہر آدمی جان سکتا ہے، حتیٰ کہ انتہائی چھوٹے چھوٹے اور جزوی اُمور میں بھی اس کی تباہ کاریوں کا پتہ چلانا بہت ممکن ہے۔

مثال کے طور پر ایک حرص بھرا آدمی کسی سے سوال کرتے وقت ضد، ہٹ اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا ہے، تو وہ آدمی اپنے دل میں اس کے خلاف ایک ناگوار قسم کا بوجھ اور نفرت محسوس کرتا ہے، حتیٰ کہ اسے کچھ بھی دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن یہی آدمی ایک دوسرے مانگنے والے کے لیے اپنے دل میں مہر و محبت کے جذبات اور نرم گوشہ رکھتا ہے اور جتنا کچھ اس سے ہو سکے اسے دے بھی دیتا ہے، صرف یہ دیکھتے ہوئے کہ سوال کرنے والا خاموش اور قناعت شعار ہے۔

یا مثال کے طور پر اگر کسی رات آپ کی کسی وجہ سے نیند خراب ہو گئی اور آپ سونا چاہتے ہیں لیکن نیند نہیں آ رہی تو اگر آپ نیند کا دل سے خیال نکال کر بالکل بے پرواہ ہو جائیں تو آپ دھیرے دھیرے غیر شعوری طور پر نیند کی وادی میں اتر جائیں گے۔ لیکن اگر آپ پریشان ہو جائیں اور یہ بات سر پر سوار کر لیں اور بڑبڑانا شروع کر دیں کہ نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟ پتا نہیں میں کب سو سکوں گا؟ آج پتہ نہیں نیند کہاں اڑ گئی ہے؟ وغیرہ، یعنی اگر آپ نیند کی حرص میں مبتلا ہو جائیں گے تو پھر اس سے کلیتاً محروم ہو جائیں گے۔

یا مثال کے طور پر آپ بڑی بے صبری سے کسی کا انتظار کر رہے ہیں، کہ کسی اہم کام کے سلسلے میں آپ نے اسے وقت دیا ہوا ہے، لیکن آپ پریشان ہو کر کہنا شروع کر دیتے ہیں: ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ کیا وجہ ہے دیر کیوں کر رہا

ہے؟ وغیرہ اور پھر اخیر میں حرص تمہارا صبر کافور کر دیتی ہے اور تمہیں وہ جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے جہاں تم اس کا انتظار کر رہے ہوتے ہو، لیکن اچانک آپ دیکھتے ہیں کہ چند لمحوں کے بعد وہ آدمی آ پہنچا۔ لیکن یہ سب کچھ ویسے نہیں ہوا جیسے آپ کو امید تھی۔ ایسے حوادث اور واقعات میں جو حکمت اور راز پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ:

جس طرح روٹی کا وجود کچھ ایسے اعمال سے ترتیب پاتا ہے جو کھیت، کھلیان، چکی اور تندور وغیرہ کے وجود سے سلسلہ وار پورے ہوتے ہیں، اسی طرح کائنات کی تمام اشیاء کسی خاص حکمت کے تحت آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ اور دھیرے دھیرے ترتیب پاتی ہیں۔ لیکن حریص آدمی اپنی حرکات وسکنات میں اس ترتیب، دھیرے پن اور معنوی درجات ومراتب کا خیال نہیں رکھتا جو اشیائے کائنات کی ترتیب میں جاری وساری ہیں، وہ یا تو چھلانگ لگاتا ہے اور گر پڑتا ہے، اور یا پھر کسی ایک درجے یا مرتبے کو ادھورا چھوڑ کر یا اسے پھلانگ کر آگے جانے کی کوشش کرتا ہے، جس کی وجہ سے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پاتا۔

اے میرے غمہائے روزگار میں الجھے ہوئے اور دنیا کی حرص میں اٹے ہوئے بدحواس بھائیو! حرص کے پنجوں میں گرفتار ہو کر تم اپنے لئے ذلت اور رسوائی کیونکر گوارہ کر رہے ہو؟ حالانکہ اس چیز میں بے شمار نقصانات اور مصائب ہیں اور حلال وحرام کی تمیز کی پرواہ کئے بغیر ہر مال ودولت پر دیوانہ وار کیوں لپکتے ہو؟ اس راہ میں تم ایسی اہم قیمتی اشیاء کو قربان کیوں کر رہے ہو جو کہ اخروی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں؟ حتیٰ کہ تم حرص ولوبھ کی اس راہ میں چلنے کے لئے ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن یعنی ''زکوٰۃ'' کو بھی پس پشت ڈال دیتے ہو! حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ زکوٰۃ ایک ایسا دروازہ ہے جس کے ذریعے ہر فرد کے لیے برکتیں آتی ہیں اور اس سے آفات ومصائب دور ہوتے ہیں؟! پس وہ لوگ جو اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہیں وہ لامحالہ اتنی مقدار کے مال سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور اسے یا تو فضول اور بے کار کاموں میں اڑا دیتے ہیں یا پھر ان پر کوئی ایسی بلا نازل ہو جاتی ہے جو ان کے ہاتھوں سے وہ مال چھین لیتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے پانچویں سال میں ایک حقیقی قسم کے خیالی خواب میں مجھ سے سوال ہوا کہ:

امتِ اسلامیہ جس فقر وفاقہ میں اس وقت مبتلا ہے اس میں، اور ان کے مال ومتاع واسباب کے تلف ہونے اور ان پر پے در پے نازل ہونے والے آلام ومصائب میں کیا راز ہے؟ میں نے اس سوال کا اپنے خواب میں مندرجہ ذیل جواب دیا:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو مال عطا کیا ہے اس مال کی ایک قسم وہ ہے جس میں اس نے ہم پر عشر یعنی دسواں حصہ فرض کیا ہے، اور ایک دوسری قسم وہ ہے جس میں چالیسواں یعنی چالیس میں سے ایک حصہ فرض کیا ہے، مطلب یہ ہے

کہ یہ دسواں اور چالیسواں حصہ ہم غریبوں مسکینوں کو دیں گے تاکہ وہ ہمیں ان کے دلوں سے نکلنے والی خالص دعاؤں کا مستحق بنا دے اور ان کے سینوں میں ہمارے خلاف جنم لینے والے حسد اور بغض و کینے سے ہمیں محفوظ رکھے۔لیکن ہم نے مال کی حرص میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور زکوۃ ادا نہ کی، تو اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ کئی سالوں سے جمع ہو جانے والی زکوۃ چالیس میں سے ایک کی بجائے تیس حصے اور دس میں سے ایک کی بجائے آٹھ حصوں کے حساب سے وصول کر لی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ہم سے مطالبہ کیا کہ ہم اس کے لیے روزہ رکھیں اور اس کی راہ میں بھوک برداشت کریں۔ اور اس میں اتنی حکمتیں اور فائدے ہیں جو ستر تک جا پہنچتے ہیں۔اس چیز کا مطالبہ اس نے ہم سے اس طرح سے کیا تھا کہ ہم ہر سال میں ایک مہینہ اس پر عمل پیرا ہوں، لیکن ہمیں اپنی جانیں بڑی عزیز محسوس ہوئیں، ان پر ترس آ گیا اور انہیں تھوڑے سے وقت کے لیے انتہائی مفید بھوک سے دوچار کرنا ہمارے لیے مشکل ہو گیا۔تو اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسے مصائب سے دوچار کر کے دیا جو ستر کے قریب جا پہنچے اور جنہوں نے ہمیں ایسی بھوک سے دوچار کر دیا جو روزے کی ہی ایک قسم بن گئی۔اور ہمیں کم و بیش پانچ سال تک یہ بھوک برداشت کرنے پر مجبور کیے رکھا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ کیا کہ ہم اس کی کچھ پاکیزہ، بابرکت، بلند مرتبہ نورانی اور ربانی تعلیمات و اوامر کو نافذ کرنے کا اہتمام کریں، نافذ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ نکال کر انہیں ادا کریں، لیکن ہم نے ان نمازوں، دعاؤں اور ذکر اذکار کے معاملے میں سستی کا مظاہرہ کیا، اور اس طرح اس ایک گھنٹے کو دیگر تئیس گھنٹوں کے ساتھ ضائع کر دیا، تو اس کا بدلہ اس نے ہمیں اس طرح دیا کہ ہم سے صادر ہونے والی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کو تو نظر انداز کر دیا، لیکن مسلسل پانچ سال تک ہمیں ٹریننگ، حملہ آوری، بھاگ دوڑ، غارتگری اور ان جیسی دوسری تعلیمات کے لئے مجبور کر دیا۔۔اور ہم نہ چاہنے کے علی الرغم نماز اور بندگی کی یہ قسم ادا کرتے رہے۔

یہ تھا وہ جواب جو میں نے اپنے اس خواب میں دیا۔پھر میں بیدار ہو گیا اور غور و فکر میں ڈوب گیا۔کافی غور و فکر کے بعد میں ایک بہت بڑی حقیقت تک پہنچ گیا جو اس خواب کی تہ میں پوشیدہ تھی، اور وہ یہ کہ:

نوع انسانی کی اجتماعی زندگی میں بلند روحانی اخلاق کو جتنا بھی زوال آیا ہے، اور اعلیٰ انسانی قدریں جتنی بھی تنزل اور انحطاط کا شکار ہوئی ہیں، سب کا سرچشمہ دو باتیں ہیں۔اور انسانی معاشرے میں در آنے والے انواع و اقسام کے قلق و اضطراب کا باعث بھی یہی دو باتیں ہیں۔ان دو باتوں کو ہم ''پچیسویں مقالے'' میں بیان کر چکے ہیں جہاں ہم نے جدید تہذیب اور قرآنی احکام کے مابین موازنہ منعقد کیا ہے۔وہ دو باتیں یہ ہیں:

پہلی بات: میرا پیٹ بھر گیا ہے تو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ دوسرا کوئی بھوک سے مر رہا ہے۔

دوسری بات: تو کمائی کر، تا کہ میں کھاؤں۔ اور تو تھک، تا کہ میں راحت پاؤں۔ اور ان دو باتوں کو جو چیز زندہ اور قائم رکھتی ہے وہ ہے سود کا پھیلاؤ اور عدمِ ادائے زکوٰۃ۔

زکوٰۃ کا کردار:

ان دونوں اجتماعی بیماریوں کا کامیاب اور شافی علاج یہ ہے کہ معاشرے میں زکوٰۃ کا نظام ایک فرضِ عام کی حیثیت سے عام کیا جائے اور سود کو کلیتًا حرام قرار دیا جائے؛ کیونکہ زکوٰۃ کی اہمیت صرف چند معین اشخاص یا جماعتوں میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی زندگی کو سعادت آشنا کرنے اور اس کے سکھ چین اور رفاہِ عامہ کے لیے ایک رکنِ رکین کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ یہ وہ اصلی ستون ہے جس کے ساتھ انسانیت کی حقیقی زندگی کے بقا و دوام کی طنابیں بندھی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالمِ انسانیت دو طبقوں پر مشتمل ہے: طبقۂ عوام اور طبقۂ خواص، اور زکوٰۃ کا کردار یہ ہے کہ یہ خواص کی طرف سے عوام کے لیے شفقت، مہربانی اور احسان کے جذبات منتقل کرتی ہے اور عوام کی طرف سے خواص کے لیے احترام اور اطاعت کا یقین مہیا کرتی ہے۔ اور ایسا نہ ہو تو خواص کی طرف سے عوام کے سروں پر ظلم و تسلط کے ہتھوڑے برستے رہیں اور عوام کی طرف سے خواص کے لیے اس بغض و کینہ اور عصیان و طغیان کا مظاہرہ ہوتا رہے جس کی آگ عام طور پر عوام کے دلوں میں مالداروں کے خلاف بھڑکتی ہی رہی ہے۔ اور یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والی سرد جنگ میں مبتلا رہیں اور آپس میں اختلاف و نزاع کا میدان گرم کیے رکھیں، حتیٰ کہ معاملہ بتدریج عمل اور رأس المال کے گرد گھومتا ہوا حقیقی محاذ اور میدانِ کارزار کا روپ دھار لے، جیسے کہ روس میں ہوا۔

اس لیے اے اہلِ کرم و اصحاب وجدان، اور اے اہلِ سخاء و اہلِ احسان! وہ احسانات جو تم مال وغیرہ دے کر دوسروں پر کرتے ہو، اگر وہ احسانات کرتے وقت تم زکوٰۃ کی نیت نہ رکھو گے، اور وہ مال زکوٰۃ کے نام پر نہ کرو گے، تو یاد رکھو کہ اس پر تین قسم کے نقصانات مرتب ہوں گے، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بے کار اور بے فائدہ چلا جائے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تم وہ مال اللہ کی راہ میں اور اس کے نام پر نہیں دو گے تو تم بلا شک اپنی طرف سے ایک قسم کا احسان جتلانے کا مظاہرہ کرو گے، اور اس فقیر کو احسان و ممنونیت کی بیڑیوں میں جکڑ دو گے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم اس فقیر کی خالص اور مقبول دعا سے محروم ہو جاؤ گے، اس پر مزید یہ کہ تم خود کو اس مال کا مالک سمجھ کر نعمت کے منکر ٹھہرو گے؛ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ تم اس مال کے مالک نہیں ہو بلکہ یہ مال اللہ کا ہے اور تم اسے اس کے بندوں میں تقسیم کرنے پر مأمور ہو۔ لیکن اگر تم نے اللہ کے راستے میں کیے جانے والا احسان بطورِ زکوٰۃ کیا، تو پھر تم ثوابِ عظیم کے مستحق ٹھہرو گے اور بہت بڑا اجر پاؤ گے؛ کیونکہ یہ احسان اب تم نے اللہ کی راہ میں کیا ہے اور تم اپنے اس عمل کے

ذریعے ان نعمتوں کے شکر کا اظہار کر رہے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر انعام کی ہیں۔ اب اس فقیر، نادار اور محتاج سے تمھیں وہ خالص دعا ملے گی جسے دعائے مقبول کہا جاتا ہے؛ کیونکہ اب وہ نہ تو تمہاری چاپلوسی کرنے کے لیے تمھیں دعائیں دے رہا ہے اور نہ تمہارے ڈر سے، بلکہ اسے اپنی عزت اور خودداری کے تحفظ کا احساس ہوا ہے، اس لیے اب اس کی طرف سے صادر ہونے والی دعا خالص ہوگی۔

جی ہاں؛ وہ اموال جو لوگوں میں زکوۃ کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ صورت میں لوگوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں، اور وہ نیکیاں اور احسانات جو مختلف صورتوں میں لوگوں کے ساتھ کئے جاتے ہیں، اور وہ صدقات وخیرات جو ریاکاری، شہرت، نیک نامی، لوگوں پر احسان رکھنے اور انہیں اپنا ماتحت بنانے اور ان جیسے دیگر ایسے مقاصد کے حصول کے لیے کئے جاتے ہیں جن کے گھمبیر نقصانات کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہے؛ یہ تمام اعمال زکوۃ کی ادائیگی، اللہ کی راہ میں احسان کرنے کی نیت، اللہ کے عائد کردہ فرائض میں سے کسی فریضے کی ادائیگی اور اسی سے ثواب کی امید، اخلاص اور دعائے مستجاب جیسے جواہرات کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ بظاہر دونوں غریب نوازی اور بندہ پروری کے مظاہر ہیں لیکن دونوں کے درمیان فاصلہ بے حد وحساب ہے۔

﴿ سُبْحٰنَكَ لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّامَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ الَّذِیْ قَالَ:

''اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ الْمَرْصُوْصِ يَشُدُّ بَعْضَهُ بَعْضاً'' وَ قَالَ: اَلْقَنَاعَةُ كَنْزٌ لَايَفْنٰى ''(حاشیہ) وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ آمِين

(حاشیہ) القناعة كنز لا يفنى۔ رواه أبو نعيم في الحلية ص: ٤٦٩٩، وأورده السيوطي في تمييز الطيب، ص: ١٨٨، وفي الأحاديث المشكلة، ص: ١٨٩، وسنده ضعيف۔ قاله الذهبي۔(مترجم)

خصوصی طور پر غیبت سے متعلق اختتامیہ

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

پچیسویں مقالے کے پہلے شعلے کی پہلی شعاع کے پانچویں نقطے کی مثالوں میں سے ''ذَمّ وزَجر'' کے مقام کی مثال میں ذکر کی گئی آیت کریمہ میں چھ جہتوں سے معجزانہ صورت میں غیبت سے نفرت دلائی گئی ہے۔ اور اس بات کو مکمل طور پر آشکار کیا گیا کہ غیبت قرآن کی نظر میں ایک انتہائی بڑا اور قابلِ نفرت کام ہے، اور یہ چیز اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ مزید کسی بیان کی حاجت باقی نہیں رہی۔

جی ہاں؛ قرآن کے بیان کے بعد نہ کوئی بیان ہے اور نہ کسی بیان کی ضرورت رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ﴾

اس آیتِ کریمہ میں درجہ بدرجہ چھ درجات پر اور چھ طریقوں سے غیبت کی مذمت کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

یہ آیتِ کریمہ چھ درجات و مراتب پر غیبت سے منع کرتی ہے اور اس کے بارے میں شدت اور سختی کے ساتھ ڈانٹ پلاتی ہے۔ آیتِ کریمہ میں مخاطب چونکہ غیبت کرنے والے لوگ ہیں، اس لیے اس انداز کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا معنی کچھ یوں ہوگا:

آیت کے شروع میں جو ہمزہ ہے استفہامِ انکاری کے لیے ہے۔ اور اس کا حکم پانی کی طرح بہتا ہوا بعد میں آنے والے تمام کلمات میں سرایت کر رہا ہے، اور اس طرح ان میں سے ہر کلمہ ایک اضافی حکم کا حامل ہو گیا ہے۔

''الف'': پہلے لفظ میں آیتِ کریمہ ''ہمزہ'' کے ساتھ یوں خطاب کر رہی ہے: کیا تم عقل نہیں رکھتے ہو؟ یہ انداز سوال اور جواب دونوں کے لیے ہے، تاکہ یہ نازیبا کردار اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

''ب'': دوسرے لفظ ''یُحِبُّ'' میں آیت کریمہ مخاطب کر کے کہہ رہی ہے: کیا تمہارے دل میں۔ جو کہ محلِ حُبّ و نفرت ہے ۔ اس قدر بگاڑ آ گیا ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو پسند کرنے لگا ہے جو کہ سب سے زیادہ ناپسند اور سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہیں؟

''ج'': تیسرے لفظ ''اَحَدُکُمْ'' میں آیت کریمہ اس طرح خطاب کر رہی ہے: تمہاری اجتماعی زندگی۔ اس کا دارومدار جماعتی زندگی پر ہے۔ کو کیا ہو گیا ہے؟ اور تمہاری تہذیب وثقافت کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نے اس روش کو پسند کر لیا ہے جو

تمہاری زندگی میں زہر بھردے اور تمہاری شفافیت کو گدلا کردے؟

''د'': چوتھے لفظ ''أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ'' میں آیت کریمہ اس طرح مخاطب ہورہی ہے: تمہاری انسانیت کو کیا روگ لگ گیا ہے کہ تم نے اپنے جگری دوست کو درندوں کی طرح دانتوں سے چیرنا پھاڑنا شروع کردیا ہے؟

''ھ'': پانچویں لفظ ''أَخِيهِ'' میں آیت کریمہ اس طرح خطاب کررہی ہے: تمہارے دل میں اپنے ابنائے جنس کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے؟ تمہارے درمیان رشتہ داری اور اپنائیت کا کوئی ایسا بندھن نہیں ہے جو تمہیں اُن کے ساتھ باندھ دے؟ تم یہاں تک پہنچ گئے ہو کہ انہیں لوگوں پر حملہ آور ہورہے ہو جو کئی جہتوں سے تمہارے بھائی ہیں؟ اور ان کی مظلوم معنوی شخصیت کو ظالمانہ طریقے سے نوچ رہے ہو۔ کیا تمہارے پاس کچھ بھی عقل نہیں ہے کہ تم پاگلوں کی طرح اپنے ہی جسم کے اعضاء کو کاٹ کھائے جارہے ہو؟

''و'': چھٹے لفظ ''مَيْتًا'' میں آیتِ کریمہ اس طرح سے مخاطب ہورہی ہے: تمہارا شعور اور وجدان کہاں چلا گیا ہے؟ تمہاری فطرت اِس حد تک مسخ ہوگئی ہے کہ تم انتہائی قابلِ نفرت اور بدترین چیزوں کا ارتکاب کرنے لگے ہو؟ اور وہ ہے تمہارا اپنے بھائی کا ایسے وقت میں گوشت کھانا جبکہ وہ مکمل عزت واحترام کا حق دار ہو؟

اس آیت کریمہ اور اس کے الفاظ وکلمات سے متعلق ہمارے ذکر کردہ وضاحتی دلائل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ غیبت عقلی، قلبی، انسانی، وجدانی، فطری، قومی اور ملّی، ہر لحاظ سے مذموم ہے۔ پس اس آیت پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ کس طرح بلند پایہ معجزانہ اور انتہائی مختصر انداز کے ساتھ چھ درجات میں غیبت جیسے جرم کے ارتکاب سے روک رہی ہے۔ واقعتاً غیبت ایک کمینہ اور ذلیل ہتھیار ہے جسے لڑنے جھگڑنے والے حاسد اور ہٹ دھرم قسم کے لوگ استعمال کرتے ہیں؛ کیونکہ باوقار روح کے مالک ایسے ذلیل ہتھیار کو استعمال میں لانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ گزرے دور کا ایک شاعر کہتا ہے:

وأُكبِرُ نَفسِي عَن جَزاءٍ بِغِيبَةٍ
فَكُلُّ اغْتِيَابٍ جُهدُ مَن لَا لَهُ جُهدُ (حاشیہ)

''میں خود کو اس سے بلند سمجھتا ہوں کہ اپنا بدلہ کسی کی غیبت کرکے چکاؤں؛ کیونکہ غیبت ہر اس آدمی کا حیلہ اور کوشش ہے جو اس کے علاوہ اور کوئی کوشش نہیں کرسکتا۔''

غیبت یہ ہے کہ آپ اپنے بھائی کی کسی ایسی بات کا تذکرہ کریں جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اگر وہ برائی جس کا آپ ذکر کررہے ہیں واقعتاً اس میں ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ برائی اس میں نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔ یعنی یہ کہ دوگنا گناہ کمایا۔

(حاشیہ) یہ شعر متنبی کا ہے، دیکھیں۔ دیوان المتنبی مع شرح البرقوقی ۹۵/۲۔ (مترجم)

یاد رہے کہ غیبت حرام ہونے کے باوجود بعض مخصوص حالات میں جائز ہے۔ وہ مخصوص حالات کچھ اس طرح کے ہیں:

ا: ظلم کے خلاف شکایت یا فریاد: مظلوم کے لیے جائز ہے کہ وہ دادخواہی کے لیے کسی ذمہ دار آدمی کے سامنے ظالم کے ظلم کی شکایت کرے تاکہ وہ اس کی دادرسی کر کے اس پر کی گئی زیادتی کا ازالہ کر سکے۔

ب: مشورہ طلبی: جب کوئی آدمی آپ سے کسی دوسرے کے ساتھ کسی کام میں شراکت وغیرہ سے متعلق مشورہ مانگے اور آپ کسی بھی ذاتی غرض سے بالاتر ہو کر محض مصلحت کے لیے اس کو اچھا مشورہ دینا چاہیں تو آپ کے لیے اس قسم کی بات کہنا جائز ہے: ''اس کے ساتھ تمہارا معاملہ چل نہ سکے گا، گھاٹا پاؤ گے اور نقصان اٹھاؤ گے، وغیرہ''۔

ج: تعارف کے لیے تحقیر کے لیے نہیں: کسی شخص کا کوئی امتیازی وصف ذکر کر دیا جائے لیکن اس سے مقصود صرف اس کا تعارف یا امتیازی علامت کا ذکر کرنا ہو، اس کی تنقیص نہیں، جیسے کسی کے متعلق کہہ دینا کہ: ''وہ لنگڑا اور آوارہ گرد فلاں جگہ گیا ہے وغیرہ''

د: اگر کوئی آدمی فاسق ہو اور علانیہ فسق و فجور کا مظاہرہ کر رہا ہو، یعنی برائی سے تنگ ہونے کی بجائے اپنی برائیوں پر فخر کرتا اور دوسروں پر ظلم کر کے لذت گیر ہوتا ہو۔

پس یہ ہیں وہ مخصوص حالات جن میں خالص مصلحت کے پیش نظر غیبت جائز ہے، شرط یہ ہے کہ ایسے میں خواہش نفس اور ذاتی اغراض کا قطعاً کوئی عمل دخل نہ ہو۔ اور ایسے حالات میں اس کی اجازت صرف اس لیے دی گئی ہے تاکہ حقیقت تک رسائی ہو سکے، وگرنہ غیبت تو وہ بری بلا ہے جو اعمالِ صالحہ کا ستیاناس کر دیتی ہے اور انہیں اس طرح کھا جاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

انسان جب غیبت کا ارتکاب کرے یا برضا و رغبت اسے سنے تو اسے یہ دعا مانگنی چاہیے: "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلِمَنِ اغْتَبْنَا"، ''اے اللہ! ہمیں اور اس آدمی کو بخش دے جس کی ہم نے غیبت کی ہے''۔ پھر ملاقات یا سامنا ہونے پر اس شخص سے معافی مانگ کر اپنا دامن صاف کر لے جس کی اُس نے غیبت کی تھی۔

الباقی هو الباقی

سعید نورسی

تیئیسواں مکتوب

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَبَدًا بِعَدَدِ عَاشِرَاتِ دَقَائِقِ عُمْرِكَ وَذَرَّاتِ وُجُوْدِكَ۔

میرے غیّور، سنجیدہ، حقیقت پسند خالص اور ذہین وفطین بھائی!

زمان ومکان کا اختلاف ہمارے جیسے حقیقت پسند اور آخرت کے بھائیوں کی بات چیت اور اُنس ومحبت کے آگے رکاوٹ نہیں ڈالتا، چنانچہ اگر ایک آدمی مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں، ایک ماضی میں ہو دوسرا مستقبل میں، ایک دُنیا میں ہو دوسرا آخرت میں، تو عین ممکن ہے کہ وہ ا شمار ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرتے ہوں، اور خاص کر ایک ہی مقصد کے تحت ایک ہی کام کرنے والے لوگوں میں سے ایک آدمی عین دوسرے آدمی کے حکم میں ہوتا ہے۔

میں تم لوگوں کو صبح کو یاد کرتا ہوں اور اپنی کمائی کا تیسرا حصّہ تم لوگوں کی نذر کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول کرے۔ تم لوگ دعائے خیر میں ''عبدالمجید اور عبدالرحمان'' کے ساتھ ہوتے ہو اور اپنا حصہ ہمیشہ وصول کرتے رہتے ہو۔ ان شاء اللہ۔

تمہاری بعض دنیاوی مشکلات مجھ پر اثر انداز ہوئی ہیں جس کی وجہ سے مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ لیکن دنیا چونکہ باقی رہنے والی نہیں ہے، اور اس کی مصیبتوں میں ایک قسم کی بہتری بھی ہے، اس لیے تمہاری بجائے میرے دل میں یہ بات وارد ہوئی کہ: یہ حالت بھی گزر ہی جائے گی اور میں نے ''لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَة'' میں غور کیا اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ﴾ کی تلاوت کی اور کہا: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ﴾۔ اور یوں مجھے تمہارے بغیر کچھ تسلی ہوگئی؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے پیار کرتا ہے تو اس پر دنیا ناراض کر دیتا ہے اور اُسے اس کی نظروں میں بدصورت کر کے دکھاتا ہے اور آپ۔ان شاء اللہ۔ اللہ کے ان محبوب لوگوں میں سے ہیں۔ اور مقالات کی نشر واشاعت کے ضمن جور کاوٹیں پیش آ رہی ہیں ان کی وجہ سے غمگین نہ ہونا، کیونکہ جتنے رسائل آپ نے اب تک نشر کیے ہیں وہ جب رحمت کا مظہر بن جائیں گے تو یہ نوری گٹھلیاں با برکت صورت میں بہت سے پھول کھلا دیں گی۔ ان شاء اللہ۔

آپ لوگ کچھ سوال کر رہے ہیں۔ عزیز بھائی! تألیف کردہ اکثر مقالات ومکتوبات دل پر دفعتاً بے ساختہ وارد ہوتے تھے، اس بنا پر وہ بڑے گہرے اور لطیف بن جاتے تھے۔ لیکن اگر میں ''قدیم سعید'' کی طرح قوّتِ علمی کے بل بوتے پر اپنے اختیار سے متفکر بن کر جواب دوں، تو وہ جامد اور ناقص ہوگا۔ ایک عرصے سے قلبی واردات موقوف ہو چکی ہیں اور قوّتِ حافظہ کا شعلہ بجھ گیا ہے۔ لیکن اس اندیشے سے کہ یہ سوالات بغیر جوابات کے رہ جائیں گے، ہم انتہائی اختصار کے ساتھ

جوابات سپردِ قلم کرتے ہیں۔

آپ کا پہلا سوال: ایک مومن کا اپنے مومن بھائی کے لیے دُعا کرنا سب سے اچھی دُعا کیونکر ہوسکتی ہے؟

الجواب: اس طرح کہ وہ دُعا قبولیت کے اسباب کے دائرے کے اندر ہو؛ کیونکہ دعا بعض شرطوں کے ساتھ قبول ہوتی ہے، اور شرطوں کے اجتماع اور فراوانی کے حساب سے اُس کی قبولیت کے دائرہ کا گراف بڑھتا جاتا ہے۔ ان شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ:

دعا مانگنے والا دعا مانگتے وقت استغفار کے ذریعے معنوی طور پر خود کو پاک صاف رکھے۔

پھر درود شریف پڑھ کر اسے سفارشی بنائے جو کہ بذاتِ خود بھی ایک دعا ہے۔ اور آخر میں بھی درود پڑھے؛ کیونکہ دُعا دو مقبول دعاؤں کے درمیان قبول ہو جاتی ہے۔

پھر یہ ہے کہ اپنے بھائی کے لیے اس کی عدم موجودگی میں دعا کرے۔

پھر یہ کہ قرآن وحدیث میں وارد ہونے والی ماثور اور جامع دعائیں مانگے، مثال کے طور پر:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ لِیْ وَلَهٗ فِی الدِّیْنِ وَالدُّنْیَا وَالآخِرَةِ"

"رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

پھر یہ کہ وہ خلوص، خشوع اور حضورِ قلب کے ساتھ دعا کرے اور نمازوں کے بعد دعا کرے، خاص کر صبح کی نماز کے بعد۔

پھر بابرکت جگہوں میں دعا کرے، خاص کر مسجدوں میں، جمعہ کے دن، اور خاص کر قبولیت کی گھڑی میں، اور رجب، شعبان اور رمضان کے تین بابرکت مہینوں میں، اور خاص کر رمضان کی مشہور راتوں میں، اور خصوصاً لیلۃ القدر میں۔

ان شروط کی موجودگی میں دعا کی جائے گی تو اُمید واثق ہے کہ قبول ہوگی۔

اب اس قبول ہو جانے والی دعا کے اثرات یا تو بعینہٖ دنیا میں نظر آجائیں گے؛ یا جس کے لیے مانگی گئی ہے اُس کی آخرت اور ابدی زندگی کے لیے قبول ہو جائے گی۔

پس اگر دعا کے ذریعے عین وہی چیز نہ ملے جو مقصود ومطلوب تھی تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ دعا قبول نہیں ہوئی، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ دعا خوبصورت ترین صورت میں قبول ہوگئی ہے۔

آپ کا دوسرا سوال: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ کسی اور کو رضی اللہ عنہ ـ خود اسی معنی میں ـ کہنا جائز ہے؟

الجواب: جی ہاں کہا جا سکتا ہے؛ کیونکہ "رضی اللہ عنہ" کا جملہ صحابہ کرام کا خصوصی شعار نہیں ہے جیسے کہ "علیہ الصلاۃ والسلام" کا جملہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص ہے۔ بلکہ ائمۂ اَربعہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی اور امام ربانی جیسے

لوگوں کو ''رضی اللہ عنہ'' کہنا لازم ہے جو کہ مقامِ رضا پر فائز ہیں اور صحابہ کرام کی طرح وراثتِ نبوت جیسی ولایتِ کبریٰ کا مرتبہ پا گئے ہیں۔لیکن علماء کے ہاں صحابہ کرام کے لیے ''رضی اللہ عنہ'' تابعین اور تبع تابعین کے لیے ''رحمہ اللہ''، بعد والے ائمہ کرام کے لیے ''غفرہُ اللہ'' اور اَولیائے کرام کے لیے ''قُدِّس سِرّہٗ'' کے الفاظ کہے جاتے ہیں۔

آپ کا تیسرا سوال: کیا ائمہ مجتہدینِ عظام افضل ہیں یا تصوف کے برحق سلسلوں کے شیوخ واَقطاب؟

الجواب: تمام مجتہدین نہیں، بلکہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم: یہ اقطاب وسلاطینِ اولیاء سے بلند مرتبے پر ہیں۔

لیکن شیخ جیلانی جیسے بعض غیر معمولی اَقطاب خصوصی فضائل میں ایک لحاظ سے زیادہ تابناک مقام کے مالک ہوتے ہیں۔البتہ کلی فضیلت بہر کیف ائمہ کرام کے لیے ہی ہے۔

اسی طرح بعض شاہانِ طریقت مجتہد بھی ہیں، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عام مجتہدین اقطاب اولیاء سے افضل ہیں۔البتہ یہ کہا جائے گا کہ: اَئمہ اربعہ،صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مہدی رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے افضل ہیں۔

آپ کا چوتھا سوال: اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی ﴿اِنَّ اللّٰـهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ میں کون سی حکمت اور غرض وغایت پائی جاتی ہے؟

الجواب: اللہ تعالیٰ نے اسمِ گرامی ''الحکیم'' کے تقاضے کے تحت اشیاء کے وجود میں سیڑھی کے زینوں کی طرح ایک ترتیب رکھی ہوئی ہے۔اب جو انسان صبر نہیں کرتا اور اپنی حرکات وسکنات میں آہستگی اور دھیرج سے کام نہیں لیتا وہ یا تو اِن زینوں پر چھلانگ لگائے گا اور گر پڑے گا۔یا پھر انہیں پورا نہیں کرے گا اور اپنے مقصود کی چھت پر نہیں چڑھ سکے گا۔اسی بنا پر حرص حرماں نصیبی کا باعث ہے اور صبر مشکلات کو حل کرنے کی چابی ہے۔یہیں سے اہلِ عرب کا یہ قول ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گیا:

''اَلْحَرِيْصُ خَائِبٌ خَاسِرٌ وَالصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ '' ۔اس سے یہ پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور توفیق صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے؛ کیونکہ صبر کی تین قسمیں ہیں: **پہلی قسم:** معصیت سے بچ کر رہنے پر صبر کرنا، اس کا دوسرا نام تقویٰ ہے۔یہ صبر انسان کو فرمان گرامی ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ میں پائے جانے والے راز کا مظہر بنا دیتا ہے۔

دوسری قسم: مصیبتوں پر صبر کرنا، اسے دوسرے لفظوں میں توکل وتسلیم کہتے ہیں۔ یہ صبر صابر انسان کو فرمان گرامی ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾ کا مظہر بنا دیتا ہے۔

رہا عدم صبر، تو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں شکوے شکایت سے عبارت ہے۔اور اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال پر تنقید کرنا، اس کی رحمت پر تُہمت زنی کرنا اور اُس کی حکمت کو پسند نہ کرنا۔

جی ہاں؛ ایک عاجز و ضعیف انسان پر مصیبت کی ضرب پڑتی ہے تو وہ شکوے کی صورت میں روتا ہے، لیکن شکوہ اللہ سے نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے حضور ہونا چاہیے۔ اور ویسے ہی ہونا چاہیے جیسے کہ یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ﴾ ۔یعنی اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصیبت کا شکوہ اللہ کے حضور کرے نہ کہ انسانوں کے سامنے ہائے وائے اور اُف اُف کرے اور کہے کہ میں نے کیا کیا ہے کہ مجھ پر یہ مصیبت نازل ہوئی ہے گویا کہ وہ لوگوں کے سامنے اللہ کی شکایت کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ عاجز و درماندہ لوگوں کے سامنے شکوہ کر کے اُن کے جذبات اور رقتِ قلبی کو اُبھار رہا ہے۔ اور یہ چیز سراسر نقصان ہے اور ایسا کرنا بالکل بے معنی ہے۔

تیسری قسم: عبادت پر صبر کرنا۔ یہ صبر انسان کو محبوبیت کے مقام پر پہنچاتا ہے اور اُسے کشاں کشاں کامل عبودیت کی طرف لے جاتا ہے جو کہ سب سے اُونچا مقام ہے۔

آپ کا پانچواں سوال: پندرہ سال کی عمر انسان کو مکلف کرنے کی عمر شمار ہوتی ہے؛ تو نبی ﷺ بعثت سے پہلے عبادت کیسے کیا کرتے تھے؟

الجواب: دینِ ابراہیم کی باقی ماندہ شکل کے مطابق عبادت کرتے تھے جو کہ بلادِ عرب میں بہت سے پردوں میں لپٹی ہوئی بچی چلی آ رہی تھی تاہم یہ عبادت فرض و واجب کی صورت میں نہ تھی بلکہ جواز و اختیار کی صورت میں تھی۔ یہ حقیقت بہت طویل ہے، اس لیے سرِ دست اسے مختصر ہی رہنا چاہیے۔

آپ کا چھٹا سوال: نبی ﷺ کو چالیس سال کی عمر کے مکمل ہو جانے کے بعد ہی بعثت کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اور آپ ﷺ کی عمر مبارک تریسٹھ سال ہونے میں کیا حکمت ہے؟

الجواب: اس میں بہت سی حکمتیں ہیں:

ایک یہ کہ نبوت ایک غایت درجے کی عظیم اور بوجھل ذمہ داری ہے۔ اس گرانبار ذمہ داری کو کماحقہٗ اُٹھانا عقلی ملکات کے منکشف ہو جانے اور قلبی استعدادات کے مکمل ہو جانے پر ہی ممکن ہے۔ اور استعدادوں اور صلاحیتوں کی تکمیل چالیس سال کی عمر میں ہوتی ہے۔

اسی طرح مردانگی اور جوانی کا وقفہ جو کہ نفسیاتی ہوسناکیوں کا زمانہ، حرارتِ غریزی کے ابلنے اور جوش کھانے کا وقت اور دنیاوی حرصوں کے اُچھلنے اور بے قابو ہونے کا دَور ہوتا ہے ۔۔۔ یہ وقفہ نبوّت کے اُن وظائف کے ساتھ بالکل مَیل نہیں کھاتا جو کہ محض الٰہی، اُخروی اور قدسی وظائف ہیں؛ کیونکہ انسان چالیس سال کی عمر سے پہلے کتنا بھی سنجیدہ اور مخلص کیوں نہ ہو شہرت کے طلبگاروں کے ذہن میں بدگمانی آ ہی جاتی ہے، اور وہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ شاید یہ آدمی دنیا اور دنیاوی عزت و جاہ کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے! چنانچہ وہ آسانی کے ساتھ اُن کی تہمتوں سے بچ نہیں سکتا۔ لیکن چالیس

سال بعد ڈھلتی عمر میں وہ چونکہ قبر کی جانب اُترنا شروع ہو جاتا ہے اور اُسے دُنیا کے مقابلے میں آخرت زیادہ نظر آنا شروع ہو جاتی ہے؛ اس لیے وہ اس اہتمام سے بچ جاتا ہے اور اپنے اُخروی اعمال و حرکات میں فوراً توفیق سے نواز دیا جاتا ہے۔ اور لوگ سوءِ ظن سے خلاصی پا کر بچ جاتے ہیں۔

رہا آپ ﷺ کی عمر کا تریسٹھ سال ہونا، تو اس کی بہت سی حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اہلِ ایمان رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ انتہائی درجے کی محبت رکھنے، آپ ﷺ کا احترام کرنے، آپ ﷺ کے کسی چیز سے نفرت نہ کرنے، آپ ﷺ کی ہر حالت کو حسین وجمیل کہنے کے مکلف ہیں۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو ساٹھ سال کی عمر کے بعد والے بڑھاپے میں نہیں چھوڑتا جو کہ محنت، مشقت اور مصیبت کا دور ہوتا ہے، بلکہ اُنہیں تریسٹھ سال کی عمر میں ملاءِ اعلیٰ کی طرف بھیجتا اور اپنے ساتھ کر لیتا ہے جو کہ اس اُمت کی غالب عمر ہے جس کے آپ ﷺ امام ہیں اور اس طرح یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ ﷺ ہر چیز میں امام ہیں۔

آپ کا ساتواں سوال:

سوال: "خَيْرُ شَبَابِكُمْ مَنْ تَشَبَّهَ بِكُهُولِكُمْ وَشَرُّ كُهُولِكُمْ مَنْ تَشَبَّهَ بِشَبَابِكُمْ" "تمہارا بہترین جوان وہ ہے جو تمہارے بوڑھوں کے مشابہ ہے اور تمہارا بدترین بوڑھا وہ ہے جو تمہارے جوانوں کے مشابہ ہے" (حاشیہ)

کیا یہ حدیث نبوی ہے؟ اور اگر حدیث شریف ہے تو اس کا مطلب کیا ہے؟

جواب: میری شنید کے مطابق یہ حدیث نبوی ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ تو وہ یہ ہے کہ:

"بہترین نوجوان وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غفلت برتنے میں حد سے نہیں بڑھتے ہیں، بلکہ بوڑھوں کی طرح موت کو یاد کرتے رہتے ہیں، اپنی آخرت کی عمر کے لیے تگ ودو کرتے ہیں اور جوانی کی خوا رن اور ہولناکیوں کی زنجیروں سے خود کو آزاد رکھتے ہیں۔ اور بدترین بوڑھے وہ ہیں جو اللہ سے غافل ہیں اور ان کے سروں میں جوانی کی غفلتوں اور ہولناکیوں کا سودا سمایا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ بچوں کی طرح اپنی خوا رن اور ہولناکیوں میں ان نوجوانوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ میں نے اپنی دیوار پر اپنے سر کے برابر سامنے ایک لوح آویزاں کر رکھی ہے جس میں حکمت و دانائی کی چند باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ میں اسے صبح وشام دیکھتا ہوں اور اس سے عبرت حاصل کرتا ہوں۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ:

اگر تجھے کوئی دوست درکار ہے تو وہ اللہ ہی کافی ہے۔

اگر وہ تمہارا دوست بن گیا تو ہر چیز تمہاری دوست ہو جائے گی۔

(حاشیہ) ابو یعلیٰؒ نے مسند میں اور طبرانیؒ نے الکبیر میں حضرت واثلہؓ سے روایت کیا ہے اسی طرح بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ اور ابن عباسؓ سے اور ابن عدیؒ نے الکامل میں ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ عراقی نے احیاء العلوم کی تخریج میں اسے ضعیف کہا ہے، ابن جوزیؒ کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ سیوطیؒ نے اشارتاً اسے حسن کہا ہے۔ دیکھئے احیاء العلوم: 62/3، فیض القدیر: 487/3۔

اگر تجھے کسی مونس اور ہمدم کی ضرورت ہے تو اس کے لیے قرآن ہی کافی ہے؛ کیونکہ اس کے ذریعے تم انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کے ہمراہ رہو گے اور یہ لوگ بہترین ساتھی اور ہمسفر ہیں۔

اگر تو مال چاہتا ہے تو قناعت جیسا بڑا خزانہ ہی تیرے لیے کافی ہے؛ اور وہ اس لیے کہ قناعت پسند آدمی میانہ روی اختیار کرتا ہے اور میانہ رو آدمی برکت سے مالا مال رہتا ہے۔

اگر کوئی دشمن چاہتے ہو تو اس کے لیے تمہارا نفس ہی کافی ہے؛ کیونکہ ایک خود پسند آدمی لامحالہ صعوبتوں سے دوچار اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے۔ جبکہ ایک متواضع آدمی خوشی، سرور، راحت اور رحمت سے نہال رہتا ہے۔

اگر وعظ ونصیحت چاہتے ہو تو اس کے لیے موت ہی کافی ہے۔ بے شک جو موت کو یاد رکھتا ہے وہ حُبِ دنیا سے نجات پا جاتا ہے اور ہمہ تن اپنی آخرت کے لیے سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے۔

★اس مقام پر میں آپ کے اس ساتویں مسئلے کے ساتھ آٹھواں مسئلہ بھی ملائے دیتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ:

ایک دو دن پہلے کسی حافظ نے سورۂ یوسف کی کچھ آیات تلاوت کیں، جب وہ ﴿تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ پر پہنچا تو آناً فاناً دل پر ایک نکتہ وارد ہوا۔

قرآن وایمان کے ساتھ تعلق رکھنے والی ہر چیز بیش قیمت ہے، وہ بظاہر کتنی بھی چھوٹی کیوں نہ ہو، قیمت میں بڑی ہے۔

جی ہاں؛ سعادتِ ابدی کے لیے تعاون کرنے والی کوئی بھی چیز چھوٹی نہیں اس لیے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ چھوٹا سا نکتہ اِس وضاحت کا اور اس اہتمام کا سزاوار نہیں۔

پس بلاشبہ ایسے مسائل کا اوّلیں طالب اور مخاطب ابراہیم خلوصی ہے جو اس طرح کے مسائل سننا چاہتا ہے اور ایسے قرآنی نکتوں کی کماحقّہ قدر کرتا ہے۔ اسے غور سے سنو!

یہ اَحسنُ القصص کا ایک لطیف نکتہ ہے۔

اِن تمام پُرسعادت اور خوشگوار قصوں کے آخر میں زوال وفراق کی خبروں کا دَرد والم پایا جاتا ہے جس سے قصّے سے حاصل ہونے والی خیالی لذت مکدّر ہو جاتی ہے اور کم پڑ جاتی ہے۔ اور خاص کر اس وقت جب قِصہ عین فرح و سعادت کے عالم میں موت وفراق کی خبر دیتا ہے، تب یہ صورتِ حال سامعین کے لیے زیادہ دَرد والم اور آہ وزاری کا باعث بن جاتی ہے۔

پس یہ آیت کریمہ یوسفؑ کی عین اُن لمحات میں خبر دیتی ہے جب وہ دنیا میں سب سے زیادہ سعادت مند اور خوش و خرّم تھے، اور اُن کے قصّے کا یہ حِصہ سب سے زیادہ تابناک ہے، اور یہ وہ وقت ہے جب آپ عزیزِ مصر بن گئے تھے، اپنے

والدین کے ساتھ ملاقات کر چکے، اپنے بھائیوں کی جان پہچان اوران کے ساتھ مہر ومحبت کا برتاؤ کر چکے تھے۔ پس آیت ان کے بارے میں اس پہلو سے خبر دیتی ہےاور کہتی ہے:

یوسفؑ نے خود اللہ تعالیٰ سے اپنی وفات طلب کی تھی تا کہ اس فرح وسعادت کی حالت سے زیادہ پُر سعادت اور تابندہ حالت کا مظہر بن جائیں۔ اور فوت ہو گئے اور اس سعادت مندی وفیروز بختی کا مظہر بن گئے۔ مطلب یہ کہ قبر کے اُس طرف اِس دنیاوی لذیذ سعادت سے بڑھ کر پر کشش لذیذ سعادت مندی اور خوشی پائی جاتی ہے۔ اسی بنا پر یوسفؑ جیسے عارفِ حقیقت نے اس لذیذ ترین دنیاوی کیفیت میں ہوتے ہوئے المناک موت کی طلب کی، تا کہ ایک دیگر سعادت مندی کا مظہر بن جائیں۔

پس قرآن حکیم کی اس بلاغت پر نظر کرو کہ اُس نے یوسفؑ کے قصے کے اختتام کی کس انداز سے خبر دی ہے یہ خبر دے کر وہ سامعین میں دکھ درد اور افسوس کے اثرات نہیں چھوڑتا بلکہ اس کے ساتھ خوشی وخوشخبری جوڑ دیتا ہےاور یہ کہتا ہوا رہنمائی کرتا ہے کہ:

اس دنیا کے لیے عمل کرو جو قبر کے بعد آنے والی ہے؛ کہ وہ حقیقی لذت وسعادت سے بھرپور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یوسفؑ کی بلند پایہ صدیقیت کو آشکار کرتا ہےاور کہتا ہے:

دنیا کی تابندہ و درخشندہ ترین اور خوشیوں سے بھرپور حالت انہیں غفلت، سستی اور فتنے میں نہیں ڈال سکی اور وہ ہمیشہ آخرت کے طلبگار رہے۔

الباقی ھو الباقی

سعید نورسی

چوبیسواں مکتوب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾

سوال: اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ''الـرحیم'' جس مشفقانہ تربیت کا، اسم ''الـحکیم'' جس مصلحت آمیز تدبیر کا اور اسم ''الـودود'' جس لطف ومحبت کا تقاضا کرتا ہے۔۔۔ ان اسماءِ حسنٰی کے مقتضیات موت، عدم، زوال وفراق اور مصائب و مشقات جیسے ہیبت ناک اور وحشت خیز مناظر کے ساتھ میل کیونکر کھا سکتے ہیں؟ تسلیم! کہ انسان کو موت کے راستے میں چلنے کو بطیبِ خاطر قبول کرنا چاہیے؛ کیونکہ وہ ابدی سعادت کی طرف جا رہا ہے لیکن ان انواع واقسام کے درختوں، جڑی بوٹیوں اور ان کے ہنستے مسکراتے لطیف زندہ پھولوں کو، اور وجود کے سزاوار، زندگی کے عاشق اور بقا ودوام کے مشتاق ان حیوانات کے گروہوں کو ان میں سے کسی کو بھی مہلت دیے بغیر باصرار وتکرار تسلسل کے ساتھ فنا کرتے جانے میں، انہیں آنکھیں کھولنے کا موقع دیے بغیر انتہائی سرعت کے ساتھ معدوم کرتے جانے میں، انہیں جی بھر کر سانس لینے کی مہلت دیے بغیر پُر مشقت انداز میں استعمال کرتے رہنے میں، انہیں راحت ورامش کا موقع مہیا کیے بغیر مصائب وآلام کے ذریعے تبدیلی کی زد میں رکھنے میں، اُن میں سے کسی کو استثناء دیے بغیر موت کے منہ میں دھکیلتے جانے میں، ان میں سے کسی کو ٹھہرنے کا موقع دیے بغیر زوال پذیر کرتے جانے میں اور اُن میں سے کسی کی رضامندی کے بغیر انہیں فراق کے گھاٹ اُتارتے جانے میں کون سی شفقت، کون سی مہربانی، کون سی حکمت، اور کون سی مصلحت لطافت رحمت اور مہر ومحبت پائی جاتی ہے؟

الجواب: اس سوال کو حل کرنے کے لیے ہم اس بہت ہی وسیع وعریض، بلند پایہ اور عظیم ترین حقیقت پر دُور سے نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے، یہ نظر اس داعیے اور تقاضے کو آشکار کرنے والی پانچ رمزوں پر اور غایات ومقاصد وفوائد کو ہویدا کرنے والے پانچ اشاروں پر مشتمل ہوگی۔

پہلا مقام: پانچ رمزیں

پہلی رمز:

ہم نے چھبیسویں مقالے کے اختتام پر ذکر کیا ہے کہ ایک ماہر صنعتکار اپنے بیش قیمت لباس کی نمائش کے لیے کسی مسکین فقیر آدمی کو مناسب اُجرت پر ماڈل بنا لیتا ہے، اور اس کی وضع قطع کے حساب سے لباس کی کٹنگ کرتا ہے۔ پھر اپنی

صنعت اور مہارت کے اظہار کے لیے اس لباس کو چھوٹا بڑا کرتا ہے، اُس آدمی کو کبھی بٹھاتا ہے اور کبھی اُٹھاتا ہے اور اُسے مختلف پہلوؤں میں تبدیل کرتا ہے۔

تو اب کیا اُس مسکین کا یہ حق بنتا ہے کہ وہ اس صنعتکار سے کہے کہ: مجھے زینت بخشنے والے ان کپڑوں کو آپ بار بار تبدیل کیوں کر رہے ہیں؟ اور مجھے بار بار اُٹھا بٹھا کر آپ میرا سکون برباد کیوں کر رہے ہیں؟

بعینہٖ اِسی طرح اُس صانعِ ذُوالجلال نے موجودات کی ہر نوع کی ماہیت کو ایک ماڈل بنایا ہوا ہے، چنانچہ وہ اپنے اسمائے حُسنیٰ کے نقوش کے ساتھ مرصّع کی ہوئی صفت کے کمالات کا اظہار کرنے کے لیے ہر چیز کو اور خاص کر ہر جاندار چیز کو حواس سے مرصّع کیے ہوئے بدن کا لباس پہنا کر اس پر قضا و قدر کے قلم کے ساتھ نقش و نگار کر کے اس طرح اپنے اسمائے حسنیٰ کے جلووں کو آشکار کرتا ہے اور ہر موجود کو اس کے شایانِ شان کمال لذت اور فیض عطا کرتا ہے اور یہ چیز اس کے لیے اُجرت کی حیثیت رکھتی ہے۔

اب اُس ''مَالِكُ الْمُلْكِ يَتَصَرَّفُ فِي مُلْكِهِ كَيْفَ يَشَاءُ '' کے راز کو آشکار کرنے والے صانعِ ذوالجلال کے سامنے کیا کوئی بھی چیز یہ بات کا کہنے کا حق رکھتی ہے کہ: ''تو مجھے تکلیف دے رہا ہے اور میرا آرام و سکون برباد کر رہا ہے؟ حاشا وکلّا!

جی ہاں؛ موجودات کو کسی بھی پہلو سے واجبُ الوجود کے سامنے ایسا دعویٰ کرنے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ بلکہ ان کا حق تو یہ ہے کہ وہ اُن کو عطا کیے گئے وجود کے مراتب کا حق ادا کرنے کے لیے ہمیشہ شکر و ثنا ادا کرتی رہیں؛ کیونکہ وجود کو جو مراتب عطا کر دیے گئے ہیں وہ واقع ہو چکے ہیں اور علتوں کا تقاضا کرتے ہیں، لیکن جو مراتب عطا نہیں کیے گئے وہ اِمکانات ہیں اور امکانات معدوم ہیں اور اُن کی کوئی انتہا نہیں، اور اعدام علتوں کا تقاضا نہیں کرتے۔ اور جس چیز کی کوئی انتہا نہ ہو اس کی کوئی علّت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر:

معدنیات کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ شکوہ کریں اور کہیں کہ ہم نباتات کیوں نہ ہوئیں؟ بلکہ ان کا حق یہ ہے کہ وہ اپنے فاطر و آفریدگار کا شکر ادا کرتی رہیں کیونکہ انہیں معدنی وجود کا مظہر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اور حیوان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شکوہ کرے اور کہے کہ: میں انسان کیوں نہ بنا؟ بلکہ اس کا حق یہ ہے کہ وہ شکر ادا کرتا رہے کہ اُسے زندگی اور وجود کے ساتھ ساتھ ایک بیش قیمت رُوح کے جوہر سے بھی نواز دیا گیا ہے۔۔۔ دیگر اشیاء کو اسی پر قیاس کر لیں۔

پس اے شکوہ سنج انسان!

تُو معدوم نہیں رہا ہے؛ بلکہ وجود کی نعمت کی پوشاک زیب تن کیے ہوئے ہے، تُو جامد نہیں رہا بلکہ زندگی کے مزے لے رہا ہے اور حیوانی سطح پر زندگی نہیں گزار رہا ہے۔

اور تو اسلام کی نعمت سے بہرہ وَر ہوا گمراہی کی دلدل میں نہیں پھنسا۔

اور صحت وسلامتی کی نعمت سے ہمکنار ہے اور اسی طرح۔۔۔

پس اے نعمت کے ناشکر گزار! اس کے بعد تجھے حق کہاں ملے گا؟ اللہ نے جو تجھے وجود کے مراتب دیے ہیں اور جو محض نعمت ہی نعمت ہیں، اُن پر تو اس کا شکر ادا نہیں کرتا، بلکہ باطل حرص وآز کی وجہ سے تُو اللہ کی بارگاہ میں محض اس بنا پر شکوہ کناں رہتا ہے کہ کچھ اِمکانی اور عدمی قسم کی بلند پایہ نعمتیں تیرے ہاتھ نہیں لگ سکیں جن کا تُو اہل نہیں تھا!

تعجب اُس شخص پر جو ایک بلند مینارے پر چڑھنے کی طرح کوئی بہت بڑا مقام حاصل کر لے اور بہت سے بلند پایہ درجات کے حامل کسی مرتبے پر فائز ہو جائے، اور ہر درجے میں کوئی نہ کوئی عظیم نعمت حاصل کر لے۔۔۔لیکن وہ ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کا شکر یہ ادا نہ کرے اور یہ کہتا ہوا شکوہ کرتا رہے کہ:

میں اس مینارے سے کسی اُونچی جگہ تک کیوں نہ جا سکا؟ اور یوں وہ روتا اور تڑپتا ہے۔

پاگل لوگ بھی جانتے ہیں کہ وہ کتنے غلط کاموں کا اِرتکاب کر رہا ہے، کتنی نعمتوں کی ناشکری کر رہا ہے اور کتنے بڑے پاگل پن میں مبتلا ہے؟

پس اے قناعت سے محروم حریص اور کفایت شعاری سے محروم مسرف اور ناحق شکوہ کناں غافل انسان! قطعی طور پر جان لے کہ قناعت ایک تجارت والی شکر گزاری ہے، حرص ایک خسارے والی ناشکری ہے، کفایت شعاری نعمت کے لیے ایک نفع بخش اور خوبصورت احترام ہے اور اسراف نعمت کے مقابلے میں نقصان دہ بدصورت اور نفرت خیز ناقدری ہے۔

اس لیے اگر تھوڑی بہت عقل رکھتا ہے تو پھر قناعت کرنا سیکھ، راضی اور خوشی رہنے کی کوشش کر۔ اور اگر معاملہ برداشت سے باہر ہو جائے تو یـا صبور کا وِرد کر اور صبر مانگ اور اپنے حق پر راضی رہ اور شکوہ مت کر۔ اور اس بات کا علم رکھ کہ تو کس کا شکوہ کر رہا ہے اور کس سے کر رہا ہے؟ اور اس بات کا پتا چل جائے تو خاموش ہو جا۔ لیکن اگر تو ہر حال میں شکوہ کرتا ہی رہنا چاہتا ہے تو پھر اللہ کے حضور خود اپنے نفس کا شکوہ کر کیونکہ کمی کوتاہی اِسی میں ہے۔

دوسری رمز:

اٹھارہویں مکتوب کے آخری مسئلے کے اختتام پر ہم نے ذکر کیا ہے کہ: خالقِ ذُوالجلال کے موجودات کو اپنی ربوبیت کی فعّالیت کے ساتھ حیرت انگیز و دہشت خیز صورت میں مسلسل اور پے در پے تبدیل کرتے رہنا اور انہیں تجدید کے عمل سے گزارتے رہنے کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ: مخلوقات میں پائی جانے والی حرکت اور فعّالیت کا سرچشمہ اشتہا، اشتیاق اور لذت ومحبت ہے، حتیٰ کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر فعّالیت میں لذّت کی ایک نوع ہے، بلکہ ہر فعّالیت بذاتِ خود لذّت کی ایک نوع ہے، اور لذت بھی کمال کی جانب متوجّہ ہے بلکہ کمال ہی کی ایک نوع ہے۔

پس جب فعالیت کمالِ لذّت اور جمال کی طرف اشارہ کرتی ہے، اور واجبُ الوجود کمالِ مطلق اور کامل ذوا آل اپنی ذات وصفات وافعال میں کمالات کی تمام اَنواع واقسام کا جامع ہے، تو پھر بلاشبہ وہ ذاتِ واجبُ الوجود بے حد وحساب مقدّس شفقت کا، لانہایت پاکیزہ محبت کا مالک ہے، لیکن جو اس کے وجود کے وجوب اور اس کی قدسیّت کے شایانِ شان ہے، اور ایسی صورت میں جو اُس کے ذاتی استثناء کے مطابق ہے اور ایسی شکل میں جو اُس کی ذاتی پاکیزگی اور مطلق کمال کے سزاوار ہے۔

اور بلاشبہ وہ بے حد وحساب مقدّس شوق کا مالک ہے جو اس مقدّس شفقت اور پاکیزہ محبت سے جنم لیتا ہے۔

اور وہ بے حد وحساب مقدّس سرور کا مالک ہے جو اس مقدّس شوق سے جنم لیتا ہے۔

وہ بے حد وحساب لذت کا - اگر یہ تعبیر جائز ہو تو - مالک ہے جو اس سرور سے جنم لیتی ہے۔

اور بلاشبہ وہ اس مقدس لذت کے ساتھ ساتھ بے حد وحساب مقدّس امتنان اور بے حد وحساب مقدّس افتخار کا مالک ہے - اگر یہ تعبیر جائز ہو تو - جس کا مرجع الرحمٰن الرحیم ہے اور سرچشمہ اُس کی مخلوقات کا امتنان اور ان کے وہ کمالات ہیں جو اُن کی صلاحیتوں سے پیدا ہوتے ہیں، اُس وقت جب یہ صلاحیتیں اُس کی غیر محدود رحمت کے زیرِ سایہ اُس کی قدرت کی فعالیت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہیں اور پھر غیر محدود صورت میں غیر محدود فعالیت کا تقاضا کرتی ہیں۔

اور یہ غیر محدود فعالیت بھی غیر محدود تبدیلی، تغیر، تحویل وتخریب کی مقتضی ہوتی ہے۔

اور یہ غیر محدود تغییر وتبدیل بھی موت، عدم اور زوال وفراق کی مقتضی ہے۔

ایک دور میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ انسانی حکمت ان مصنوعات کے جو اغراض ومقاصد بیان کرتی ہے بالکل لایعنی اور بے قیمت ہے۔ اور اس وقت مجھے اس بات کا بھی علم ہوا کہ یہ بالآخر عبث وبیکاری تک پہنچا دیتی ہے۔ اسی بنا پر پہلے درجے کے فلاسفر یا تو

نیچر کی گمراہی میں سرگرداں رہتے ہیں

یا سوفسطائی بن جاتے ہیں

یا صانع کے اختیار اور علم کے منکر ہو جاتے ہیں

یا خالق کو "مُوجِب بالذات" کا نام دے دیتے ہیں

تب رحمتِ الٰہیہ نے میری مدد کے لیے اسمِ گرامی "الحکیم" کو بھیجا، اس اسم نے مجھے ان مصنوعات کے عظیم الشان اغراض ومقاصد سے روشناس کرایا مطلب یہ کہ ہر مصنوع وساختہ پرداختہ چیز ایک ربّانی مکتوب ہے جس کا مطالعہ تمام اصحابِ شعور کرتے ہیں۔ یہ غرض وغایت مجھے ایک سال کے لیے کافی رہی۔ پھر مجھ پر اس صنعت کے دیگر خوارق کا

انکشاف ہوا تو یہ غایت کافی نہ رہی۔تب مجھے اس سے بہت بڑی ایک دیگر غایت کا دیدار کروا دیا گیا، یعنی ہر مصنوع وساختہ چیز کے اَغراض ومقاصد اپنے صانع کی طرف دیکھتے ہیں، اور مجھے اس بات کا علم ہو گیا کہ ہر مصنوع اپنے صانع کی صنعت کے کمالات، اُس کے اسمائے حسنیٰ کے نقوش ونگار، اُس کی بیش قیمت حکمت کے مُرصَّع شہہ پارے اور اُس کی رحمت کے تحفے اس کی نظروں کے سامنے پیش کرے اور وہ اس کے جمال وکمال کا آئینہ بن جائے۔۔۔یہ غرض وغایت بھی ایک عرصہ تک میرے لیے کافی رہی۔

پھر اشیاء کی ایجاد اور کاریگری میں پائی جانے والی حیرت انگیز فعّالیت کے ضمن میں غایت درجے کے تیز رفتار تغیّر وتبدّل میں مجھے قدرت کے معجزات اور ربوبیت کی شئون وکیفیات نظر آئیں۔تب یہ غرض وغایت بھی مجھے ناکافی محسوس ہوئی۔اور مجھے اس بات کا علم ہوا کہ کسی ایسے داعیے اور تقاضے کا ہونا بہت ضروری ہے جو اس غرض وغایت کی برابری کرتا ہو۔تب مجھ پر اس دوسری رمز میں پائے جانے والے تقاضے اور آنے والے اشاروں میں پائی جانے والی غایتیں آشکار ہوئیں۔

اور مجھے اس بات کا یقینی علم دے دیا گیا کہ کائنات میں پائی جانے والی فعّالیت کی قدرت اور اشیائے کائنات کی سیر و گردش کا کوئی مطلب ضرور ہے، اور وہ اس طرح کہ صانع الحکیم اس فعّالیت کے ذریعے کائنات کی انواع واقسام کو بلواتا اور ان سے کلام کرواتا ہے، گویا کہ اَرض وسما کی حرکات اور اُن کی متحرک موجودات اُس بولی کے کلمات ہیں، اور اُن کی سیر وگردش گفتگو کرنا اور بولنا ہے۔مطلب یہ کہ فعّالیت سے جنم لینے والی حرکات اور زوال صرف تسبیحی کلمات ہیں اور کائنات میں موجود فعّالیت تمام کائنات کا اور اس کی انواع واقسام کا بغیر آواز کے بولنا اور بلوانا ہے۔

تیسری رمز:

اشیاء زوال وعدم کی طرف نہیں جاتیں بلکہ قُدرت کے دائرے سے نکل کر علم کے دائرے میں، اور عالمِ شہادت سے سے نکل کر عالمِ غیب میں چلی جاتی ہیں اور عالمِ تغیّر وفنا سے عالمِ نُور وبقا کا رُخ کر لیتی ہیں۔اور اشیاء میں پائے جانے والے جمال وکمال کا سرچشمہ حقیقت کے زاویۂ نگاہ میں اسمائے الٰہیہ، ان اسماء کے نقوش اور اُن کے جلوے ہیں۔

پس اسماء اگر باقی رہنے والے ہیں، ان کے جلوے اگر دائمی ہیں، تو پھر بلاشبہ ان کے نقوش متجدّد ہوتے رہتے ہیں، متبدّل ہوتے رہتے ہیں اور حُسن وجمال میں ڈھلتے رہتے ہیں اور عدم وفنا کے گھاٹ نہیں اُترتے بلکہ فقط اُن کے فرضی تعیّنات تبدیل ہوتے ہیں۔اور اُن کے حقائق، ان کی ماہیات اور اُن کی مثالی ہُویات جو کہ حُسن وجمال کا مدار اور فیض و کمال کا مظہر ہیں، باقی رہتی ہیں۔

پس غیر ذی اَرواح اشیاء کے حسن وجمال کا سرچشمہ براہِ راست اسمائے الٰہیہ ہیں، شرف انہیں اسماء کے لیے ہے اور

مدح وثنا انہیں کے لیے ہے؛ کیونکہ حسن دراصل انہیں کا ہے اور محبت انہیں کی طرف رواں دواں ہے۔ اس لیے ان آئینوں میں رونما ہونے والی تبدیلی ان اسماء کے لیے ضرر رساں نہیں۔

لیکن اگر اشیاء ذی اَرواح اور غیر ذوی العقول ہوں، تو اُن کا زوال وفراق عدم اور فنا نہیں، بلکہ اس زوال وفراق کے ذریعے وہ جسمانی وجود سے اور وظیفۂ حیات کے گرداب سے نجات پا جاتے ہیں، اور اپنے اس وظیفۂ حیات کے کمائے ہوئے ثمرات اپنی باقی رہ جانے والی روحوں کو سونپ دیتے ہیں۔ پس ان اشیاء کی باقی رہنے والی روحیں بھی اسمائے الٰہیہ کے سہارے پر دوام حاصل کر لیتی ہیں، بلکہ اپنی شایانِ شان سعادت مندی کے راستے پر چل پڑتی ہیں۔

اور اگر یہ ذی ارواح جاندار ذوی العقول ہوں تو ان کا جانا ابدی سعادت اور مادی ومعنوی کمالات کے حامل عالمِ بقاء کی طرف رواں ہو جانا اور سفر کرنا ٹھہرے گا اور اُس صانع الحکیم کے عالمِ برزخ، عالمِ مثال اور عالمِ ارواح جیسے دیگر منازل وممالک کی طرف روانگی اور سفر کرنا ٹھہرے گا جو کہ اس دنیا سے کہیں زیادہ خوبصورت اور پُر نور ہیں۔ یہ سیر وسفر موت، عدم اور زوال وفراق نہیں بلکہ کمالات کے ساتھ ہم کنار ہونا ہے۔

الحاصل:

جب صانعِ ذُوالجلال موجود اور باقی ہے، اور اسی طرح اُس کے اَسماء وصفات بھی دائمی اور سرمدی ہیں تو پھر بلا شبہ ان اسماء کے جلوے اور نقوش معنوی بقاء میں جدید ہوتے رہتے ہیں، اس لیے وہ تخریب وفنا اور اِعدام وزوال نہیں ہیں۔

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ انسان انسانیت کے ناطے اکثر موجودات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور ان کی سعادت سے لذت یاب ہوتا اور ان کی ہلاکت سے دُکھ اُٹھاتا ہے۔ اور خاص کر وہ ذی حیات کے ساتھ، اور پھر خاص کر نوعِ بشر کے ساتھ، اور پھر خصوصی طور پر اُن اہلِ کمال کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، جنہیں وہ پسند کرتا ہے اور اچھا سمجھتا ہے۔ اور جن کے آلام ومصائب کی وجہ سے بہت زیادہ دکھی ہوتا ہے اور اُن کی سعادتوں سے بہت زیادہ سعادت مند ہوتا ہے، اس حد تک کہ ایک شفیق ماں کی طرح ان کی سعادت کے لیے اپنی سعادت وراحت کو قربان کر دیتا ہے۔

بنا بریں، ہر مومن آدمی تمام موجودات کی سعادت، ان کی بقاء، عدم کی نجات اور ان کے بیش قیمت ربانی مکتوبات ہونے کی برکت سے اپنے درجے کے حساب سے سعادت مند ہو سکتا ہے، دنیا کے برابر نور سے بہرہ وَر ہو سکتا ہے اور ہر انسان نورِ قرآن اور رازِ ایمان کی برکت سے اپنے درجے کے حساب سے اس نور سے مستفید ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر وہ اہلِ ضلالت میں سے ہوگا تو تمام موجودات کی ہلاکت سے، اُن کے فنا ہو جانے، ظاہری طور پر معدوم ہو جانے اور اگر وہ موجودات ذوی ارواح ہوں گی تو اپنے مصائب وآلام کے ساتھ ساتھ ان کے مصائب وآلام کی وجہ سے دُکھی ہوگا۔ یعنی اس کا کفر اُس کی دنیا کو عدم سے بھر دے گا اور اس دنیا کو اس کے سر پر دے مارے گا، جس کی وجہ سے وہ جہنم

رسید ہونے سے پہلے ہی جہنم کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

چوتھی رمز:

جیسے کہ ایک بادشاہ کے نظم وضبط کے بہت سے مختلف اور متغایر محکمے ہوتے ہیں جو سلطان، خلیفہ، حاکم اور قائد جیسے مختلف عناوین واوصاف سے جنم لیتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی انواع واقسام کی بے حدّ وحساب تجلیات ہیں اور مخلوقات کا یہ تنوّع اور اختلاف ان تجلیات کے تنوّع سے جنم لیتا ہے، جیسے کہ ہم نے متعدد جگہوں پر ذکر کیا ہے۔

پس اس راز کی رُو سے کہ ہر صاحبِ جمال وکمال فطری طور پر اپنے جمال وکمال کو دیکھنا چاہتا ہے اور انہیں آشکار کرنا چاہتا ہے؛ یہ مختلف اسماء بھی دائمی اور سرمدی ہونے کی وجہ سے دائمی صورت میں باہمی ظہور کا تقاضا کرتے ہیں، یعنی اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنے نقوش کا مشاہدہ کریں، یعنی اپنے جمال کا جلوہ اور اپنے کمال کا انعکاس دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں اور اس جمال وکمال کو اپنے نقوش کے آئینوں میں آشکار کرنا چاہتے ہیں؛ یعنی کائنات کی کتاب کبیر اور موجودات کے مختلف مکتوبات کی پے دَر پے تجدید کا تقاضا کرتے ہیں؛ یعنی لحظہ بہ لحظہ ایک معنیٰ دار کتابت کا تقاضا کرتے ہیں؛ یعنی ایک صفحے میں مختلف قسم کے ہزاروں مکتوبات لکھنے کا تقاضا کرتے ہیں؛ اور ہر مکتوب کو تمام ذی شعور کی نظرِ مطالعہ اور نظرِ قرأت کے لیے پیش کرنے کا تقاضا کرتے ہیں اور اِس کے ساتھ ساتھ وہ اُس مکتوب کو ذاتِ مقدّس اس مسمّیٰ اَقدس کی نظرِ شہود کے لیے ظاہر کرتے ہیں۔

حقیقت پر مشتمل یہ شعر دیکھیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

کتابِ عالم کے صفحات ۔۔۔ یہ بے شمار انواع

اس کے حروف وکلمات ۔۔۔ یہ غیر محدود افراد

حقیقت کی لوحِ محفوظ کے کارخانے میں لکھا گیا ہے کہ ہر موجودِ عالم ایک معنیٰ دار لفظِ مجسّم ہے (حاشیہ)

اور یہ شعر:

تَأَمَّلْ سُطُوْرَ الْكَائِنَاتِ فَإِنَّهَا ۔۔۔ مِنَ الْمَلَأِ الْأَعْلَى إِلَيْكَ رَسَائِلُ

پانچویں رمز: دو نکتوں پر مشتمل ہے۔

پہلا نکتہ:

جب حق تعالیٰ موجود ہے تو پھر ہر شے موجود ہے۔ اور جب واجبُ الوجود کی طرف انتساب پایا جائے تو پھر ہر شے

(حاشیہ) ترکی زبان میں اصل شعر یہ ہیں:

کتابِ عالَمِک یَابَرَ الْفُلرِیَ، انواع نا معدود ۔۔۔ حروف اِیلہ کلماتی دخِی، افراد نامحدود

یا زِ لِمِش دستگاہِ لوحِ محفوظ حَقِیقتدَہ ۔۔۔ مُجسَّم لفظِ معنِیدار درِ عالَمْدَہ ھر موجود ۔ مترجم۔

کے لیے تمام اشیاء پائی جاتی ہیں؛ کیونکہ ہر موجود چیز رازِ وحدت کی رُو سے واجبُ الوجود کی طرف منسوب ہوجانے کی بنا پر تمام کائنات کے ساتھ جُڑ جاتی ہے۔

پس ہر موجود چیز جسے واجبُ الوجود کی طرف اپنے انتساب کا علم ہے یا اُس کے اس انتساب کا علم ہو چکا ہے، وہ رازِ وحدت کی رُو سے واجبُ الوجود کی طرف منسوب تمام چیزوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔

اور انتساب کے اس نقطے میں ہر چیز کا غیر محدود وجود کے انوار کا مظہر ہونا ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ انتساب نہ ہو تو پھر اس نقطے میں فراق ہے نہ زوال۔۔۔

پس زندگی کا تیزی کے ساتھ گزر جانے والا ایک لمحہ بے حد وحساب وجود کے انوار کا دارو مدار ہے۔ لیکن اگر یہ انتساب نہ ہو اور اس کا علم بھی نہ ہو تو یہ ایک لمحہ انواع واقسام کے بے حدّ وحساب فراق وزوال اور عدم کا دارو مدار بنے گا؛ کیونکہ اس صورت میں وہ چیز ہر اُس چیز کے مقابلے میں فراق وافتراق وزوال کا شکار رہے گی جس کے ساتھ اُس کا میل جول ہونا ممکن ہے، مطلب یہ کہ اس کے شخصی وجود پر انواع واقسام کے بے حد وحساب عدم وفراق لاد دیے جائیں گے۔ پس وہ چیز بغیر انتساب کے اگر لاکھوں سال وجود میں رہے تو یہ لاکھوں سال انتساب میں گزرے ہوئے ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ اسی بنا پر اہلِ حقیقت کہتے ہیں:

''مُنوّر وجود کا ایک لمحۂ گزران ابتر وجود کے ایک ملین سال پر بھاری ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ واجبُ الوجود کی طرف انتساب کی صورت میں وجود کا ایک لمحہ انتساب سے خالی وجود کے ملین سالوں پر بھاری ہے۔ اسی راز کی روشنی میں اہلِ تحقیق یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''وجود کے انوار واجبُ الوجود کی معرفت پر موقوف ہیں''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حالت میں کائنات وجود کے انوار میں گھری ہوئی ملائکہ، روحانیات اور ذوی شعور سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر واجبُ الوجود کی پہچان نہ ہو پائے تو ہر موجود چیز عدم کی تاریکیوں میں اور زوال وفراق کے آلام میں گھر جائے گی اور دنیا اُس انسان کی نظر میں فارغ، خالی اور وحشت کے مسکن کی صورت میں نظر آئے گی۔

جی ہاں؛ جس طرح ایک درخت کے ہر پھل کا اس درخت پر لگے تمام درختوں کے ساتھ تعلّق ہے اور وہ ان پھلوں کی تعداد کے برابر عارضی وجودوں کا مالک ہے؛ کیونکہ وہ ان نسبتوں اور تعلقات کی وجہ سے بہت سے بھائیوں اور دوستوں کا مالک ہے، اس لیے اس درخت کا جب ایک پھل توڑا جائے گا تو وہ ہر پھل سے جُدا ہوگا اور فراق وزوال کا دُکھ اُٹھائے گا اور اُس کے لیے ہر پھل نہ ہونے کے برابر ہو جائے گا، اور وہ خارجی عدم کی تاریکی کا شکار ہو جائے گا، اسی طرح اُس اَحد

الصّمد کی طرف انتساب کے لحاظ سے ہر چیز کے لیے تمام اشیاء موجود ہیں، لیکن اگر یہ انتساب نہ ہو تو ہر چیز تمام اشیاء کی تعداد کے برابر خارجی عدموں کا شکار ہو گی۔

پس اس رمز کی روشنی میں ایمان کے انوار کی عظمت کا نظارہ کرو اور گمراہی کی وحشتناک تاریکیوں کا مشاہدہ کرو۔

تو پتا چلا کہ ایمان نفسُ الامر میں اس بلند پایہ ثابت شدہ حقیقت کا عنوان ہے جو اس رمز میں بیان کی گئی ہے۔ اور ایمان کے طفیل اس حقیقت سے فائدہ اُٹھانا بہت ممکن ہے۔

لیکن اگر ایمان نہ ہو تو ایک بے ایمان آدمی کے لیے ہر چیز معدوم اور تاریک ہو گی، بالکل ایسے کہ جیسے اندھے، بہرے اور گونگے پاگل کے لیے ہر چیز معدوم ہے۔

دوسرا نکتہ: دنیا کے تین چہرے ہیں:

پہلا چہرہ: اسمائے الٰہیہ کی طرف دیکھتا ہے، یعنی یہ رُخ ان اسماء کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ رُخ زوال، فراق اور عدم سے دوچار نہیں ہوتا، بلکہ اس میں دم بدم جدّت آتی رہتی ہے۔

دوسرا چہرہ: آخرت اور عالمِ بقاء کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ رُخ آخرت کے لیے کھیتی کا حکم رکھتا ہے۔ اس میں ہمیشہ رہنے والے ثمرات وفواکہ پکائے جاتے ہیں۔ یہ بقاء کی خدمت کرتا ہے اور فانی اُمور کو باقی کے حکم میں لاتا ہے۔ اس رُخ میں بھی موت اور زوال کا وجود نہیں بلکہ اس میں حیات وبقاء کے جلوے ہیں۔

تیسرا چہرہ: فانیوں کی طرف یعنی ہماری طرف دیکھتا ہے۔ چنانچہ یہ چہرہ فانیوں کا اور ہوس پرستوں کا معشوق، اہلِ شعور کی تجارت گاہ اور مأموروں، ملازموں کا میدانِ امتحان ہے۔

اس تیسرے چہرے میں پائے جانے والے فنا وزوال اور موت وعدم کے دکھوں کے علاج کے لیے خود اسی چہرے کے باطن میں بقاء وحیات کے جلوے موجود ہیں۔

الحاصل:

یہ سیّال موجودات اور رواں دواں سیّار مخلوقات واجبُ الوجود کی اِیجاد و وجود کے انوار کی تجدید کے لیے متحرّک آئینے اور تبدّل آشنا مظاہر ہیں۔

دوسرا مقام

ایک مقدمے اور پانچ اشاروں پر مشتمل ہے

پہلا مبحث:

آنے والے ان پانچ اشاروں میں ربوبیت کے شؤون و احوال کی نگرانی کے لیے چھوٹی چھوٹی معمولی قسم کی دُوربینوں کی قبیل سے بعض تمثیلیں ذکر کریں گے۔ یہ تمثیلیں ربوبیت کے شؤون واحوال کا مکمل طور پر نہ تو احاطہ کرتی ہیں اور نہ ہی ان کا اندازہ کرنے کے لیے پیمانہ بن سکتی ہیں، البتہ ان کی طرف دیکھنے کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ پھر ان تمثیلات میں اور سابقہ رموز میں پائی جانے والی وہ تعبیریں جو ذاتِ اقدس کے شؤون واحوال کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی ہیں، اُن کا تعلق ان تمثیلوں میں پائی جانے والی کمی کوتاہی کے ساتھ ہے۔

مثال کے طور پر: لذت وسرور اور خوشی کے وہ معانی جو ہمارے ہاں مشہور و معروف ہیں، وہ مقدّس شؤون واحوال کی مکمل تعبیر نہیں کر سکتے ہیں بلکہ فقط یادداشت کے لیے عنوان اور تفکر کے لیے رصدگاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح یہ تمثیلیں ایک چھوٹی سی مثال میں اس ربوبیت کے شؤون واحوال کے ایک عظیمُ الشان ربّانی قانون کی حقیقت کا اثبات کرتی ہیں، اور وہ اس طرح کہ یہ ایک چھوٹی سی مثال میں اس ہمہ گیر قانون کے ایک جزء کا اظہار کر دیتی ہیں۔

مثال کے طور پر: ایک پھول وجود سے چلا جاتا ہے، لیکن وہ اپنی جگہ پر ہزاروں وجود چھوڑ کر جاتا ہے۔ اس طرح وہ ربوبیت کے قوانین سے ایک عظیمُ الشان قانون کا اثبات کرتا ہے۔ اور یہ قانون تمام موسمِ بہار میں، بلکہ دنیا میں پائی جانے والی تمام موجودات میں چلتا ہے۔

جی ہاں؛ جس قانون کے ذریعے خالقُ الرحیم ایک پرندے کے پروں کا لباس تبدیل کرتا اور انہیں جدت عطا کرتا ہے، وہی صانعُ الحکیم عین اُسی قانون کے ذریعے ہر سال کرۂ ارض کا لباس تبدیل کرتا ہے، عین اسی قانون کے ساتھ ہر دور میں دنیا کی شکل میں اور کائنات کی صورت میں تغیر و تبدّل رونما کرتا ہے، اور عین اسی قانون کے ساتھ انہیں قیامت کے وقت تبدیل کرے گا۔

اسی طرح جس قانون کے ساتھ وہ ایک ذرّے کو مریدِ رُومی کی طرح حرکت میں لاتا ہے، عین اُسی قانون کے ساتھ

(حاشیہ) میں پکارتا ہوں: ''یا حق یا موجود۔ یا حی یا معبود، یا حکیم یا مقصود۔ یا رحیم یا ودود، تا آنکہ نفس سمندر کی طرح وسیع ہو جاتا ہے، پنجرہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور یہ آواز منقطع ہو جاتی ہے''۔

وہ کرۂ ارض کو رقص وسماع کے لیے اُٹھنے والے مجذوب مرید رومی کی طرح گھماتا ہے اور جہانوں میں تبدیلیاں رونما کرتا ہے اور اسی قانون کے ساتھ نظامِ شمسی کو رواں دواں رکھتا ہے۔

اسی طرح جس قانون کے ساتھ وہ تمہارے بدن میں خلیوں کی تجدید کرتا ہے، انہیں آباد کرتا ہے اور ان کی تحلیل کرتا ہے۔ عین اسی قانون کے ساتھ وہ ہر سال تمہارے باغیچے کی تجدید کرتا ہے اور ہر موسم میں اُس کی کئی مرتبہ تجدید کرتا ہے، عین اسی قانون کے ساتھ وہ ہر فصلِ گل میں رُوئے زمین کی تجدید کرتا ہے اور اس پر نئے سرے سے چادر بچھا دیتا ہے۔

اسی طرح وہ صانع القدیر جس قانونِ حکمت کے تحت ایک کلی کو زندگی عطا کرتا ہے اُسی قانون کے تحت ہر موسمِ گل میں ہمارے سامنے والے اس چنار کے درخت کو زندہ کرتا ہے۔ اور اس قانون کے تحت وہ اُسی موسمِ گل میں کرۂ ارض کو بھی زندگی بخشتا ہے اور عین اسی قانون کے تحت وہ حشر کے دن مخلوقات کو زندہ کرے گا۔ چنانچہ قرآن کریم اس راز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿مَاخَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ اور اسی پر قیاس کرو۔

پس ربوبیت کے اس قانون جیسے بہت سے قوانین ہیں جو ذرّے سے لے کر مجموعی عالم تک رواں دواں ہیں۔ ربوبیت کی فعالیت میں پائے جانے والے ان قوانین کی عظمت میں نظر دوڑاؤ، ان کی وسعت میں غور کرو اور ان میں پائے جانے والے وحدت کے راز میں تأمل کرو۔ اور اس بات سے آگہی حاصل کرلو کہ ہر قانون وحدت کی ایک برہان ہے۔

جی ہاں؛ یہ بہت سے عظیم الشان قوانین واحد اور ہمہ گیر ہونے کی بنا پر صانع کی واحدانیت، اس کے علم اور ارادے کا انتہائی قطعی انداز میں اثبات کرتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ ان میں سے ہر قانون علم وارادے کا ایک تابندہ جلوہ ہے۔

پس اکثر مقالات میں وارد ہونے والی زیادہ تر تمثیلیں جزوی مثالوں کے ذریعے اس طرح کے قوانین کے کچھ اجزاء بیان کر کے بطورِ مدّعا عین اسی قانون کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

پس جب تمثیل کے ذریعے کسی قانون کا متحقق ہونا واضح ہو جائے، تو مدّعا منطقی برہان کی طرح یقینی صورت میں ثابت ہو جائے گا۔ مطلب یہ کہ مقالات میں وارد ہونے والی اکثر تمثیلات میں سے ہر تمثیل ایک یقینی برہان اور قطعی حجت کا حکم رکھتی ہے۔

دوسرا مبحث:

دسویں مقالے کی دسویں حقیقت میں ذکر کیا گیا ہے کہ ہر پھل اور پھول کی خود اُس درخت کے پھلوں اور پھولوں جتنی اغراض وغایات اور حکمتیں ہیں، اور یہ حکمتیں تین طرح کی ہیں:

ایک قسم صانع وکردگار کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے نقوش کو آشکار کرتی ہے۔

ایک قسم ذوی شعور کی طرف دیکھتی ہے،ان کی نظروں میں یہ موجودات قیمتی مکتوبات اور مفید کلمات ہیں۔

اور ایک قسم خود اپنی طرف،اپنی زندگی کی طرف اور اپنی بقاء کی طرف دیکھتی ہے۔اس کی بھی انسان کے منافع جات کے حساب سے بہت سی حکمتیں ہیں۔

میں ایک دفعہ ہر موجود چیز میں پائے جانے والے اسی طرح کے بہت سے اغراض و مقاصد کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک دل پر یہ چند فقرے وارد ہوئے جو کہ اُن کلّی غایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔انہیں میں نے عربی اسلوب میں اور آنے والے پانچ اشاروں کی بنیادوں کے لیے ایک نوٹ بک کی صورت میں قلمبند کیا ہے:

"وَهٰذِهِ الْـمَـوْجُوْدَاتُ الْحَلِيَّةُ مَظَاهِرُ سَيَّالَةٌ وَ مَرَايَا جَوَّالَةٌ لِتَجَدُّدِ تَجَلِّيَاتِ اَنْوَارِ اِيْجَادِهٖ سُبْحَانَهٗ بِتَبَدُّلِ التَّعَيُّنَاتِ الْاِعْتِبَارِيَّةِ

اَوَّلًا: مَعَ اسْتِحْفَاظِ الْمَعَانِي الْجَمِيْلَةِ وَالْهُوِيَّاتِ الْمِثَالِيَّةِ

وَثَانِيًا: مَعَ اِنْتَاجِ الْحَقَائِقِ الْغَيْبِيَّةِ وَالنُّسُوْجِ اللَّوْحِيَّةِ

وَثَالِثًا: مَعَ نَشْرِ الثَّمَرَاتِ الْاُخْرَوِيَّةِ وَالْمَنَاظِرِ السَّرْمَدِيَّةِ

وَرَابِعًا: مَعَ اِعْلَانِ التَّسْبِيْحَاتِ الرَّبَّانِيَّةِ وَاِظْهَارِ الْمُقْتَضَيَاتِ الْاَسْمَائِيَّةِ

وَخَامِسًا: لِظُهُوْرِ الشُّئُوْنَاتِ السُّبْحَانِيَّةِ وَالْمَشَاهِدِ الْعِلْمِيَّةِ

ان پانچ فقروں میں ان اشاروں کی بنیادیں پائی جاتی ہیں جن کے بارے میں ہم ابھی بحث کریں گے۔

جی ہاں؛ ہر موجود اور خاص کر ذی حیات موجود مختلف حکمتوں اور غایتوں کے پانچ طبقوں پر مشتمل ہے۔جیسے ایک پھل دار درخت کی اُوپر تلے والی تمام شاخیں پھل دیتی ہیں،اسی طرح ہر جاندار پانچ مختلف طبقات کی حکمتوں اور غایتوں پر مشتمل ہے۔

پس اے فانی انسان!اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیری ایک جزوی گٹھلی کا حکم رکھنے والی حقیقت ایک باقی رہنے والے پھل دار درخت میں تبدیل ہو جائے اور تو اس کے پانچ اشاروں میں ذکر کیے گئے پھلوں کے دس طبقات اور ان کے دس قسم کے اغراض و مقاصد کو حاصل کر لے،تو پھر حقیقی ایمان حاصل کر،وگرنہ تو اسی گٹھلی میں محصور ہو کر رہ جائے گا،اور ان تمام ثمرات و غایات سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ گل سڑ جائے گا۔

پہلا اشارہ:[اَوَّلًا: بِتَبَدُّلِ التَّعَيُّنَاتِ الْاِعْتِبَارِيَّةِ مَعَ اِسْتِحْفَاظِ الْمَعَانِيْ الْجَمِيْلَةِ وَالْهُوِيَّاتِ الْمِثَالِيَّةِ]

یہ فقرہ بتاتا ہے کہ ہر موجود وجود سے چلے جانے کے بعد بظاہر خود تو عدم اور فنا کی طرف چلا جاتا ہے لیکن اس کے عطا کیے ہوئے معانی باقی اور محفوظ رہتے ہیں۔اسی طرح اس کی مثالی ہُوِیّت،شکل وصورت اور ماہیت بھی عالمِ مثال میں اور

عالمِ اقبال کے نمونوں میں یعنی الواحِ محفوظہ میں اور الواحِ محفوظہ کے نمونوں میں یعنی حافظہ کی قوتوں میں محفوظ رہے ہیں۔

مطلب یہ کہ وہ موجود ظاہری صورت میں ایک وجود کھوتا ہے اور سینکڑوں طرح کے معنوی اور علمی وجود پالیتا ہے۔

مثال کے طور پر: ایک معیّن صفحے کی طباعت کے لیے مطبعہ کے حروف کو ایک خاص وضع قطع اور ترتیب دی جاتی ہے، اور وہ حروف صفحے کی طباعت کا دارومدار ہوتے ہیں اور وہ صفحہ متعدد مطبوعہ اَوراق کو اپنی شکل صورت اور ہویّت عطا کر دیتا ہے اور ان کے معانی بہت سی عقلوں تک پھیلا دیتا ہے۔ پھر جب ضرورت باقی نہیں رہتی تو مزید صفحات طبع کرنے کے لیے وہ وضع قطع اور ترتیب تبدیل کر دی جاتی ہے۔

بعینہٖ اسی طرح زمینی موجودات اور خاص کر نباتاتی موجودات کو تقدیرِ الٰہی کا قلم ایک ترتیب اور وضع قطع عطا کرتا ہے، چنانچہ قدرت انہیں موسمِ گل کے صفحے میں ایجاد کرتی ہے تو یہ موجودات اپنے خوبصورت معانی ادا کر دیتی ہیں اور ان کی شکل وصورت اور ہُویت عالمِ مثال جیسے عالمِ غیب کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

اسی بنا پر حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ وضع قطع تبدیل کر دی جائے تا کہ اس میں آنے والے موسمِ گل کا صفحہ لکھا جا سکے اور وہ بھی اپنے معانی ادا کر سکے۔

دوسرا اشارہ: [وَثَانِيًا: مَعَ اِنْتَاجِ الْحَقَائِقِ الْغَيْبِيَّةِ وَالنُّسُوْجِ اللَّوْحِيَّةِ]

یہ فقرہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہر چیز_ جزئی ہو یا کلّی_ اور خاص کر جب ذی حیات ہو، وجود سے چلے جانے کے بعد مثالی الواح میں_ جو کہ عالمِ مثال کے رجسٹر ہیں_ اپنی زندگی کے اطوار کی تعداد کے برابر صورتیں چھوڑ جانے کے ساتھ ساتھ بہت سے غیبی حقائق کو جنم دیتی ہے۔ تب ان صورتوں سے اُن کی ایک مفید سوانح حیات لکھی جاتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں ''مقدراتِ حیات'' کہا جاتا ہے۔ اور یہ وجود سے چلے جانے کے بعد رُوحانیات کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔

مثال کے طور پر جیسے ایک پھول وجود سے چلا جاتا ہے لیکن وجود میں اپنے ہزاروں بیج اور ان بیجوں میں اپنی ماہیات چھوڑ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اپنی ہزاروں صورتیں چھوٹی چھوٹی الواحِ محفوظ میں اور الواحِ محفوظہ کے چھوٹے چھوٹے نمونوں میں یعنی حافظے کی قوتوں میں چھوڑ جاتا ہے اور یوں اصحابِ شعور کو وہ ربانی تسبیحات اور اسمائے الٰہیہ کے نقوش پڑھاتا ہے جو اس نے اپنی زندگی کے مختلف اطوار کے ذریعے نمایاں کیے ہوتے ہیں، اور پھر چلا جاتا ہے۔

اسی طرح زمین کے اس گلستان میں آنے والا خوبصورت مصنوعات سے منقّش و مزین موسمِ بہار بھی ایک پھول ہے جو بظاہر زائل ہو کر عدم کو روانہ ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے بجائے وجود میں بیجوں کی تعداد میں عطا کیے ہوئے غیبی حقائق، اپنے پھولوں کی تعداد کے برابر بکھیر دینے والی مثالی ہویات اور اپنی موجودات کی تعداد کے برابر ظاہر کر دینے والی ربانی حکمتیں

چھوڑ جاتا ہے اور پھر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور یوں چلے جانے والا یہ موسم بہار اپنے جیسے بہار کے موسموں کے لیے جگہ خالی کرتا ہے تاکہ وہ آئیں اور اپنی ذمہ داری ادا کریں۔ تو گویا کہ وہ موسم بہار اپنا ایک ظاہری وجود اُتار لیتا ہے اور ہزاروں معنوی وجود زیب تن کر لیتا ہے۔۔۔

تیسرا اشارہ: [وَثَالِثًا: مَعَ نَشْرِ الثَّمَرَاتِ الْأُخْرَوِيَّةِ وَالْمَنَاظِرِ السَّرْمَدِيَّةِ]

یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ یہ دنیا آخرت کے بازار کے ساتھ مناسبت رکھنے والی محصولات کی پیداوار کی ایک کھیتی اور کارخانہ ہے۔

یہ بات ہم کئی ایک مقالات میں ثابت کر چکے ہیں کہ جیسے جنّوں اور انسانوں کے اعمال آخرت کے بازار میں بھیجے جاتے ہیں، اسی طرح دنیا کی تمام موجودات آخرت کے کھاتے میں بہت سے وظائف ادا کرتی اور وافر مقدار میں محصولات دیتی ہیں، بلکہ کرۂ ارض اسی کی خاطر محوِ سفر ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ربانی سفینہ اسی چیز کی خاطر ایک سال میں چوبیس ہزار سال کی مسافت طے کرتا ہے اور میدان حشر کے گرد گھوم رہا ہے۔

مثال کے طور پر اہلِ جنت قطعی طور پر دنیا کے واقعات کا ذکر کرنے کی تمنا کرتے ہیں اور یہ واقعات ایک دوسرے تک نقل کرتے ہیں، بلکہ وہ ان واقعات کی لوحیں اور اس طرح کی دیگر اشیاء دیکھنے کے لیے تاک جھانک کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ سینما سکرین پر دیکھنے کی طرح ان الواح و واقعات کا مشاہدہ کر لیتے ہیں تو بلاشبہ بہت زیادہ لذت گیر ہوتے ہیں۔۔۔ بات جب ایسے ہی ہے کہ دنیا کے واقعات کے بارے میں باہمی گفتگو اور اس میں رونما ہونے والے حادثات کے مناظر فرمان گرامی: ﴿عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ میں پائے جانے والے اشارے کی روشنی میں منزلِ سعادت اور دارِ لذت جیسی جنت کے سرمدی مناظر میں بہر حال پائے جائیں گے!

پس ان موجودات کا آنِ واحد میں غائب ہو جانا اور ظاہر بھی رہنا، اور پے در پے آنا اور چلے جانا، نظر آتا ہے کہ یہ عمل سرمدی مناظر کو تشکیل دینے کے لیے کسی کارخانے کے کُل پُرزوں کا حکم رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر:

جیسے شہر کے لوگ خوبصورت اور عجیب منظروں کی تصویریں فنا پذیر مناظر اور اَوضاع و اَطوار کو ایک قسم کی بقاء کے لیے اور انہیں مستقبل کے لوگوں کو تحفہ دینے کے لیے، ان خوبصورت اور عجیب و غریب اَوضاع و اَطوار اور مناظر کو محفوظ کرتے اور سینما سکرین کی وساطت سے وہ چیزیں مستقبل کو تحفے میں دیتے ہیں اور اس طرح وہ حال اور استقبال میں ماضی کی یاد تازہ کرتے ہیں اور ماضی کو حال و استقبال کے دامن میں سمو دیتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح یہ بہاری اور دنیاوی موجودات جب اپنی چھوٹی سی زندگی پوری کر لیتی ہیں تو اُن کا صاحب حکمت صانع ان کے عالمِ بقاء کے ساتھ تعلق رکھنے والے اغراض و مقاصد کو اس عالم میں مقیّد کر دیتا ہے۔

مزید یہ کہ ان موجودات نے اپنی زندگی کے اطوار میں عالمِ ابدی میں سرمدی مناظر کے ضمن میں جو سبحانی معجزات اور زندگی سے بھرپور وظائف ادا کیے ہیں وہ اسمِ گرامی ''الحکیم، الرحیم اورالودود'' کا تقاضا ہیں۔۔۔

چوتھا اشارہ:[وَرَابِعًا: مَعَ اِعْلَانِ التَّسْبِيحَاتِ الرَّبَّانِيَّةِ وَاِظْهَارِ الْمُقْتَضَبَاتِ الْاَسْمَائِيَّةِ]۔

یہ جملہ بتا تا ہے کہ موجودات اپنے اطوارِ حیات کے ذریعے انواع واقسام کی ربانی تسبیحات ادا کرتی ہیں اور ان حالات کو آشکار کرتی ہیں جن کا اسمائے الٰہیہ تقاضا کرتے ہیں اور جن کا آشکار کرنا لازم ہے۔

مثال کے طور پر: اسم گرامی ''الرحیم'' ''شفقت کے فعل کا اور اسم ''الرزاق'' ''رزق عطا کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اسم ''اللطیف'' ''نازک مزاجی اور نرم رویے کو مستلزم ہے۔۔۔ اور یوں ہی فرداً فرداً تمام اسماء کے کچھ تقاضے ہیں۔ چنانچہ ہر ذی حیات اپنی زندگی اور اپنے وجود کے ساتھ ان اسماء کے تقاضوں کو آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی مشینری کے پرزوں کی تعداد کے برابر صانع الحکیم کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر: جس طرح انسان کوئی لطیف پھل کھاتا ہے تو بظاہر وہ پھل اس کے معدے میں پارہ پارہ ہو کر، پگھل جاتے اور فنا ہو جاتے ہیں؛ لیکن اس کے منہ اور معدے کے علاوہ بدن کے تمام خلیوں میں فعالیّت کی رُو سے ایک قسم کا ذائقہ اور لذت چھوڑ جاتے ہیں۔ اور مزید یہ کہ وہ پھل وجود کی تربیت اور بدن کے تمام حصوں میں پائی جانے والی زندگی کو دوام دینے والی بہت سی حکمتوں کے وجود کا سبب بنتے ہیں۔ اور خود وہ طعام نباتاتی وجود سے ترقی کر کے انسانی زندگی کے مرتبے تک جا پہنچتا ہے۔

اسی طرح یہ موجودات جب زوال کے پردے میں چھپ جاتی ہیں تو اس کی جگہ پر ان میں سے ہر ایک کی بہت سی تسبیحات باقی رہ جاتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اسمائے الٰہیہ کے بہت سے نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور اپنے تقاضوں کو ان اسماء کے ہاتھوں میں تھما دیتی ہیں، یعنی انہیں باقی رہنے والے وجود کے سپرد کر کے خود چلی جاتی ہیں۔۔۔

پس اس صورتِ حال میں کہ جب ایک فانی اور عارضی وجود کے چلے جانے کے بعد اُس فانی وجود کی جگہ پر ایک قسم کی بقاء کے مظہر کی حیثیت سے ہزاروں وجود باقی رہ جاتے ہیں؛ تو اس صورتِ حال میں یہ کہنا صحیح رہے گا کہ: افسوس کہ وہ عبث و بے کار چلی گئی! یا یہ کہ یہ محبوب مخلوق زائل کیوں ہوگئی ہے! کیا اس بات کا شکوہ بھی کیا جا سکتا ہے؟ نہیں، بلکہ رحمت، حکمت اور محبت کا تقاضا اس کے حق میں یہی ہے، اور اُسے بہر صورت اسی طرح ہونا چاہیے، وگرنہ صرف ایک نقصان سے بچاؤ کی خاطر ہزاروں منافع جات کو ترک کر دینا لازم ہو جائے گا، اور اس صورت میں ہزاروں نقصانات لازم آئیں گے۔

پس اسمائے گرامی ''الرحیم، الحکیم اور الودود'' زوال و فراق کے معارض نہیں بلکہ انہیں مستلزم ہیں اور ان کے متقاضی ہیں۔

پانچواں اشارہ:[وَخَامِسًا: لِظُهُورِ الشُّئُونَاتِ السُّبْحَانِيَّةِ وَالْمَشَاهِدِ الْعِلْمِيَّةِ]

یہ فقرہ بتا تا ہے کہ موجودات اور خاص کر ذوی حیات موجودات اپنے ظاہری وجود کے زائل ہو جانے کے بعد خود آگے چلی جاتی ہیں اور بہت سی باقی رہنے والی چیزیں چھوڑ جاتی ہیں- جیسے کہ دوسری رمز میں بیان کیا گیا ہے- اور ذاتِ واجب الوجود کے شؤون واحوال میں غیر محدود محبت، لا انتہا شفقت، بے غایت افتخار، بے حد مقدّس امتنان وسرور اور- اگر یہ تعبیر جائز ہو تو- بے پایاں قُدسی لذت اور پاکیزہ خوشی پائی جاتی ہے، اور یہ تمام اوصاف- اگر تعبیر درست ہے تو- اس کی قدسیّت اور اس کے کمالِ استغناء کے موافق، اور اس کی ذات کے شایانِ شان صورت میں ہیں، اسی وجہ سے ان کے آثار مشاہدے میں نظر آتے ہیں- اور یہ شئوون واحوال جس چیز کا تقاضا کرتے ہیں، یہ ہے کہ ان موجودات کو تبدیلی وتغیّر و زوال وفنا کے عمل سے گزار کر انتہائی سرعت کے ساتھ حیران کُن فعّالیت میں کھینچ لایا جائے، چنانچہ ان موجودات کو دوامی صورت میں عالمِ شہادت سے عالمِ غیب کی طرف روانہ کیا جاتا ہے-

اور یہ مخلوقات ان شئوونات کے جلووں کے تحت دائمی سیر وسیلان اور حرکت وجولان کی موجوں کے درمیان ہچکولے کھاتی رہتی ہیں- اور یہ اہلِ غفلت کے کانوں میں زوال وفراق کے بھیانک نوحے اُنڈیلتی اور اہلِ ہدایت کے کانوں میں ذکر وتسبیح کے نغمات کا رَس گھولتی ہیں-

اس راز کی رُو سے ہر موجود وجود میں کچھ ایسے معانی، کیفیات اور حالات چھوڑ جاتا ہے جو واجبُ الوجود کے ہمیشہ باقی رہنے والے شئوون واحوال کو آشکار کرنے کا وارومدار ہوتے ہیں- اور ایسا کرنے کے بعد وہ خود چلا جاتا ہے-

اسی طرح وہ موجود اپنی تمام مدتِ حیات میں بتائے ہوئے احوال واطوار کو وجود میں چھوڑ کر جاتا ہے، جو اُس نے تمام مدّتِ حیات میں گزارے ہوتے ہیں، اور ایک مفصّل وجود بھی چھوڑ جاتا ہے جو اُس کے خارجی وجود کی نمائندگی کرتا ہے- ان تمام چیزوں کو وہ ''الامام المبین'' ''الکتاب المبین'' اور ''اللوح المحفوظ'' جیسے اُن علمی دوائر میں چھوڑ جاتا ہے جو علمِ اَزلی کے عناوین ہیں-

پس ہر فنا ہونے والا موجود ایک وجود کو تو چھوڑ جاتا ہے، لیکن خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ہزاروں باقی رہ جانے والے وجود پالیتا ہے-

مثال کے طور پر:

جب کسی عادی اور معمولی مواد کو کسی غیر معمولی کارخانے کی مشین میں ڈال دیا جائے تو وہ اس میں عملِ احتراق سے گزر کر بظاہر معدوم ہو جاتا ہے، لیکن اس کارخانے کے کیمیاوی برتنوں میں بہت سی دوائیں اور قیمتی کیمیاوی مواد اس کارخانے کے پائپوں کی تہوں میں بیٹھ جاتا ہے اور یوں اس کارخانے کی تمام مشینری اور پہیے اس مواد سے اور اس کے بخارات کی قوّت سے گھومتے ہیں- چنانچہ یہ مواد ایک طرف قیمتی کپڑوں کی بناوٹ کا محور بنتا ہے، دوسری طرف اس کے

کچھ حصے سے کتابیں طبع ہوتی ہیں، اور کچھ حصہ شکر سازی اور اس طرح کی قیمتی اشیاء تیار کرنے کے کام آتا ہے وغیرہ۔۔۔

مطلب یہ کہ اس عادی مواد کے جل جانے اور بظاہر فنا ہو جانے سے ہزاروں اشیاء وجود میں آتی ہیں۔

یعنی ایک عادی وجود زائل ہو جاتا ہے اور بہت سے بلند پایہ وجودوں کو جنم دے جاتا ہے۔

تو کیا اس حالت میں یہ کہا جائے گا: ہائے افسوس اس معمول کے عادی مواد پر! اور کیا اس بات کی شکایت کی جائے گی کہ کارخانے کے مالک کو دُکھ کیوں نہ ہوا کہ اس نے محبوب مواد کو جلا کر تباہ کر دیا؟

بعینہٖ اسی طرح -وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَى- وہ خالق الحکیم الرحیم الودود اپنی رحمت، حکمت اور مودّت کے تقاضے کے تحت کائنات کے اس کارخانے کو حرکت میں رکھتا ہے اور ہر فانی وجود کو بہت سے باقی رہنے والے وجودوں کے لیے گٹھلی بنا دیتا ہے اور اُسے اپنے ربّانی مقاصد کا دارومدار، اپنے سُبحانی شئوون واحوال کا مظہر بنا دیتا ہے، اپنی تقدیر کے قلم کی روشنائی بنا دیتا ہے اور اپنی قدرت کی بافتوں کے لیے شٹل بنا دیتا ہے، اور یوں کائنات کو اپنی قدرت کی فعّالیت کے ساتھ دیگر ایسے عالی شان غایات ومقاصد ادا کرنے کے قابل بنا دیتا ہے جو ہمارے علم میں نہیں ہیں، چنانچہ وہ ذرّات کو جولانی، موجودات کو روانی، حیوانات کو سیلانی اور سیارات کو گردش کے لیے برانگیختہ کر دیتا ہے، انہیں آپس میں بلواتا اور بغیر آواز کے اپنی آیات پڑھاتا اور ان کو لکھواتا ہے۔

ربوبیت کی جہت سے اس نے زمینی مخلوقات میں سے ہوا کو اپنے امر وارادے کے لیے ایک طرح کا عرش بنا دیا ہے۔

اپنے علم وحکمت کے لیے نور کے عنصر کو ایک دوسری طرح کا عرش، اپنی رحمت واحسان کے لیے پانی کو ایک اور طرح کا عرش اور اپنی حفاظت کرنے اور زندہ کرنے کی صفت کے لیے مٹی کو ایک دیگر نوع کا عرش بنا دیا ہے اور اُن عرشوں میں سے تین کو زمینی مخلوقات کے اُوپر رواں دواں رکھتا ہے۔

پس ان پانچ رمزوں میں اور پانچ اشاروں میں بیان کی گئی بلند پایہ چمکدار حقیقت کے بارے میں قطعی طور پر جان لو کہ یہ حقیقت قرآن کے نور کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے اور ایمان کی قوّت کے ساتھ ملکیت میں آتی ہے۔ وگرنہ اس باقی رہنے والی حقیقت کی جگہ پر غایت درجے کی ہولناک تاریکیاں چھا جائیں گی اور دنیا اہلِ ضلالت کے لیے انواع واقسام کے فراق وزوال اور عدم سے پُر ہو جائے گی اور کائنات ان کے لیے جہنم کا رُوپ دھار جائے گی اور غیر محدود عدم اپنے ایک آن کے وجود کے ساتھ ہر چیز کو گھیر لے گا۔ اور اُن کے لیے ماضی ومستقبل کے تمام زمانے ظلماتِ عدم سے بھر جائیں گے اور گمراہ انسان کو صرف حال کے تھوڑے سے وقفے میں ایک غمگین نور کا وجود میسّر آئے گا۔

لیکن قرآن کے راز اور ایمان کے نور سے اَزل سے اَبد تک وجود کا نور نظر آتا ہے اور انسان اس نور کے ساتھ تعلق جوڑ

لیتا ہے اوراس کی برکت سے اپنی ابدی سعادت کی ضمانت لے لیتا ہے۔

الحاصل:

ہم نیازی مصری کی طرح کہتے ہیں:

دَرِیا اُولُنحه نَفَس پاره لَنِنحه قَفَص تا گِسلِنحَهٔ بُو سَس

چاغیرِ پَرم: یا حق! یا موجود! یاحیّ!

یا معبود! یا حکیم! یامقصود! یا رحیم! یا ودود! (حاشیہ)

اور میں با آواز بلند کہتا ہوں:

لَا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَادِقُ الْوَعْدِالْاَمِيْن۔

اور پورے ایمان سے اس بات کا اثبات کرتا ہوں کہ:

اِنَّ الْبَعْثَ بَعْدَ الْمَوْتِ حَقٌّ ☆ وَالْجَنَّةَ حَقٌّ وَالنَّارَ حَقٌّ ☆ وَاِنَّ السَّعَادَةَ الْاَبَدِيَّةَ حَقٌّ ☆ وَاِنَّ اللّٰهَ رَحِيْمٌ حَكِيْمٌ وَدُوْدٌ ☆ وَاِنَّ الرَّحْمَةَ وَالْحِكْمَةَ وَالْمَحَبَّةَ مُحِيْطَةٌ بِجَمِيْعِ الْاَشْيَاءِ وَشُئُوْنَاتِهَا

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِىَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ۔ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّامَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِيْنَا اَوْاَخْطَأْنَا﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تَكُوْنُ لَكَ رِضَاءً وَلِحَقِّهٖ اَدَاءً، وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلِّمْ، آمِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

سُبْحَانَ مَنْ جَعَلَ حَدِيْقَةَ اَرْضِهٖ مَشْهَرَ صَنْعَتِهٖ ، مَحْشَرَ خِلْقَتِهٖ ، مَظْهَرَ قُدْرَتِهٖ، مَدَارَ حِكْمَتِهٖ، مَزْهَرَ رَحْمَتِهٖ مَزْرَعَ جَنَّتِهٖ مَمَرَّ الْمَخْلُوْقَاتِ، مَسِيْلَ الْمَوْجُوْدَاتِ، مَكِيْلَ الْمَصْنُوْعَاتِ۔

فَمُزَيَّنُ الْحَيْوَانَاتِ، مُنَقَّشُ الطُّيُوْرَاتِ، مُثَمَّرُ الشَّجَرَاتِ، مُزَهَّرُ النَّبَاتَاتِ۔

مُعْجِزَاتُ عِلْمِهٖ، خَوَارِقُ صُنْعِهٖ هَدَايَاءُ جُوْدِهٖ بَرَاهِيْنُ لُطْفِهٖ۔

دَلَائِلُ الْوَحْدَةِ لَطَائِفُ الْحِكْمَةِ شَوَاهِدُ الرَّحْمَةِ

(حاشیہ) میں پکارتا ہوں: "یاحق یا موجود۔ یاحی یا معبود، یاحکیم یامقصود۔ یارحیم یاودود، تا آنکہ نفس سمندر کی طرح وسیع ہو جاتا ہے، پنجرہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور یہ آواز منقطع ہو جاتی ہے"۔

تَبَسُّمُ الْأَزْهَارِ مِنْ زِيْنَةِ الْاَثْمَارِ

تَسَجُّعُ الْأَطْيَارِ فِي نَسْمَةِ الْأَسْحَارِ

تَهَذُّجُ الْأَمْطَارِ عَلَى خُدُوْدِ الْأَزْهَارِ

تَزَيُّنُ الْاَزْهَارِ تَبَرُّجُ الْاَثْمَارِ فِيْ هٰذِهِ الْجِنَانِ تَرَحُّمُ الْوَالِدَاتِ عَلَى الْاَطْفَالِ الصِّغَارِ فِيْ كُلِّ الْحَيْوَانَاتِ وَالْإِنْسَانِ

تَعَرُّفُ وَدُوْدٍ

تَوَدُّدُ رَحْمٰنٍ

تَرَحُّمُ حَنَّانٍ

تَحَنُّنُ مَنَّانٍ لِلْجِنِّ وَالْإِنْسَانِ وَالرُّوْحِ وَالْحَيَوَانِ وَالْمَلَكِ وَالْجَانِ۔

ذیلِ اوّل

بِاسْمِهٖ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ﴾

اس آیت کریمہ کے پانچ نکات پر غور کریں جن کا مفہوم یہ ہے کہ: ”[اے لوگو! اگر تمہاری دعا نہ ہو تو تمہاری کیا قیمت ہے؟“۔

پہلا نکتہ:

دعا عبودیت کے ساتھ تعلق رکھنے والا ایک گہرا راز ہے، بلکہ دعا عبودیت کی رُوح کا حکم رکھتی ہے۔ اور دُعا جیسے کہ ہم نے بہت سی جگہوں پر ذکر کیا ہے، تین قسم کی ہے:

دعا کی پہلی قسم:

دعا بزبانِ استعداد، چنانچہ تمام دانے اور بیج فاطر الحکیم سے زبانِ استعداد کے ساتھ یہ دعا کرتے ہیں کہ: ”ہمیں نشو ونما عطا کر اور ہماری چھوٹی سی حقیقت کو بار آور بنا دے اور اسے حقیقتِ کبریٰ میں تبدیل کر دے تا کہ ہم تیرے نقوش و آثار کو تفصیل کے ساتھ آشکار کر سکیں“۔

زبانِ استعداد کے ساتھ تعلق رکھنے والی اور اسباب کے اس اجتماع کا مطلب ہے مُسبّب کو ایجاد کرنے کے لیے دعا کرنا، مطلب یہ کہ اسباب ایک ایسی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں جو ”زبانِ حال“ کا حکم لے لیتی ہے اور قدیرِ ذوالجلال سے مسبّب کی طلب گار ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر:

پانی، حرارت، مٹی اور روشنی گٹھلی کے اردگرد زبانِ دُعا کی سی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں، وہ کیفیت کہتی ہے: ”اے ہمارے خالق! اس گٹھلی کو درخت بنا دے“؛ کیونکہ وہ درخت جو کہ قدرت کا ایک خارق عادت معجزہ ہے، اُس کا معاملہ کسی بھی طور بسیط جامد اور بے شعور مواد کے سپرد نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ اُسے اس کے سپرد کرنا بالکل محال ہے۔ پس اسباب کا اکٹھا ہو جانا دعا کی ہی ایک قسم ہے۔

دعا کی دوسری قسم:

فطری ضرورت کی زبان کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ یہ دعا کی وہ قسم ہے جس میں خالق سے یہ دعا کی جاتی ہے کہ وہ تمام ذی حیات کو مناسب وقت میں ان کی وہ تمام حاجات وضروریات جو اُن کے اقتدار واختیار میں نہیں ہیں، انہیں ایسی جگہ سے عطا کردے جہاں سے انہیں گمان بھی نہ ہو؛ کیونکہ حکیم ورحیم اُن کی اشیائے ضروریہ کو جو اُن کے اقتدار واختیار سے اور ان کی دسترس سے باہر ہیں، انہیں اُن تک عین مناسب وقت میں ایسی جگہ سے پہنچا دیتا ہے جس کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں ہوتا، پس یہ احسان دعا کا نتیجہ ہے۔

الحاصل: دُعا ہی ہے جو تمام کائنات میں سے بارگاہِ خداوندی میں بار پاتی ہے، چنانچہ اسباب اللہ تعالیٰ سے مسبّبات کی طلب کرتے ہیں۔

دعا کی تیسری قسم:

ضرورت واحتیاج کے دائرے میں ذی شعور کی دُعا ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

اگر یہ اضطرار کے درجے تک پہنچ جائے، یا فطری احتیاج کے ساتھ مکمل مناسبت رکھتی ہو، یا زبانِ استعداد کے قریب تر پہنچ گئی ہو، یا صاف اور خالص دِل کی زبان سے نکلی ہو تو مطلق اکثریت کی صورت میں مقبول ہے۔

پس نوعِ انسانی کے اکتشافات وایجادات اور اس کی ترقیات کا بڑا حصہ دعا کی ایک قسم کا نتیجہ ہیں۔ اور وہ چیزیں جنہیں یہ لوگ تہذیب وتمدّن کے معجزات کا نام دیتے ہیں اور جنہیں اپنی ایجادات کے افتخار کا دارومدار سمجھتے ہیں، سب کی سب معنوی دعا کا نتیجہ ہیں؛ کیونکہ یہ چیزیں استعداد وقابلیت کی خالص زبان کے ساتھ مانگی گئیں تو انہیں عطا کردی گئیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ استعداد اور فطری ضرورت کی زبان کے ساتھ مانگی گئی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے بشرطیکہ شرائط کے دائرے میں ہو اور اُسے کسی رکاوٹ کا سامنا نہ ہو۔

دعا کی دوسری قسم وہی جو مشہور عام ہے اور جسے ہم سب جانتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

فعلی اور قولی

مثال کے طور پر کھیتی باڑی ایک فعلی دعا ہے؛ کیونکہ یہ مٹی سے رزق نہیں مانگتی بلکہ خود مٹی رحمت کے خزینے کا دروازہ ہے، اور کھیتی ہل کے ذریعے یہ دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔

بقیہ تمام اقسام کی تفصیلات سے پہلو تہی کر کے ہم آنے والے نکات میں صرف قولی دعا کے کچھ اسرار ذکر کریں گے۔

دُوسرا نکتہ:

دعا کی تاثیر بڑی عظیمُ الشان ہے، خاص کر اُس وقت جب دعا کلی شکل اختیار کر کے دوام پکڑے، ایسی صورت میں

دعا غالباً بلکہ ہمیشہ نتیجہ دیتی ہے۔حتیٰ کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ: دعا تخلیقِ عالم کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے؛ یعنی کائنات کی تخلیق کے بعد سرِ فہرست نوعِ بشر کی دعا، اوراس میں سرِ فہرست عالمِ اسلام ہے، اوراس میں سرفہرست محمد عربی ﷺ کی یہ دعائے معظّم تخلیقِ عالم کا ایک سبب ہے؛ مطلب یہ کہ خالقِ عالم نے تخلیقِ عالم سے پہلے یہ جان لیا تھا کہ یہ معزز انسان نوعِ بشر کی بلکہ تمام موجودات کی ترجمانی کرتا ہوا ابدی سعادت اور اَسمائے الٰہیہ کی مظہریت کی طلب کرے گا؛ چنانچہ اس نے اُس کی یہ آگے آنے والی دُعا قبول کر لی اور کائنات کو پیدا کر دیا۔

پس دُعا اگر اس درجے کی وسعت اور عظیم الشان قیمت کی حامل ہے تو پھر کیا یہ ممکن ہے کہ تین سوملین نوعِ بشر کی، جن وانس میں سے بے حد وحساب نیکوکار لوگوں کی، ملائکہ اور روحانیات کی محمد ﷺ کی ذات گرامی کے حق میں مقصود و مطلوب اورابدی سعادت اور عظیم الشان رحمتِ الٰہیہ کے حصول کے لیے بالاتفاق ہمہ وقت ساڑھے تیرہ سو سال کے عرصے میں مانگی گئی دعائیں قبول نہ ہوں؟ ان کی دعائیں کیونکر قبول نہ ہوں گی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ان کی دعائیں ردّ ہو جائیں؟

یہ دعائیں جب اس درجے کی کلی حیثیت، وُسعت اور دوام کے درجے تک پہنچ چکی ہیں تو پھر یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ وہ رسول کریم محمد عربی ﷺ دعا کے نتیجے کی حیثیت سے ایسے مرتبے پر فائز ہیں کہ اگر تمام عقلیں ا وہ ہو کر ایک عقل کا رُوپ دھار جائیں تو بھی اس مقام کا بتمامہ احاطہ نہ کر سکیں۔

پس اے مردِ مسلمان! محشر کے دن تمہیں اس طرح کا شافع میسّر ہے، اس لیے شافع محشر کی شفاعت حاصل کرنے کے لیے اس کی سنت کی اتباع کرو۔

اگر تم کہو کہ: وہ جب اللہ کے حبیب ہیں تو پھر انہیں اس قدر صلوات و دعا کی کیا ضرورت ہے؟

الجواب: ان کا اپنی امت کی سعادتمندی وفیروزبختی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، اور اُمت کے افراد انواع واقسام کی جو بھی سعادتیں حاصل کرتے ہیں ان میں ان کا معتدبہ حصہ ہے۔اسی طرح وہ ان پر نازل ہونے والے آلام ومصائب سے دُکھی بھی ہوتے ہیں۔

اب اگرچہ آپ ﷺ کے اپنے کمال وسعادتمندی کے مرتبے تو بے حد وحساب ہیں، لیکن وہ اپنی غیر محدود اُمت کے لیے غیر محدود زمانوں تک غیر محدود سعادتمندیوں کی بڑی دردمندی سے تمنا رکھتے ہیں اوران کی غیر محدود بدبختیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔اس لیے بلاشبہ وہ بے حد وحساب صلاتوں، دعاؤں اور رحمتوں کے حق دار اور ضرورت مند ہیں۔

اگر آپ یہ کہیں کہ:

دعا کبھی تو ایسے اُمور کے لیے مانگی جاتی ہے جو قطعی طور پر واقع ہو جاتے ہیں، جیسے خسوف وکسوف کی نماز میں مانگی جانے والی دُعا، اور کبھی ایسے اُمور کے لیے مانگی جاتی ہے جن کا واقعہ ہونا ممکن ہی نہیں ہوتا؟

الجواب: دعا ایک عبادت ہے، چنانچہ عبادت گزار انسان دعا کے ذریعے اپنے عجز وفقر کا اظہار کرتا ہے۔ رہے ظاہری مقاصد، تو وہ اس دُعا کے اور اس دعائیہ عبادت کے اوقات ہیں اس کے حقیقی نتائج وفوائد نہیں؛ کیونکہ عبادت کے فائدے کی نظر آخرت کی طرف ہے اس لیے اگر دنیاوی مقاصد نہ بھی حاصل ہوں تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ دُعا قبول نہیں ہوئی، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ دعا کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا؛ جیسے کہ ہم نے دیگر مقالات میں واضح کیا ہے۔

اسی طرح کیا یہ ممکن ہے کہ اہلِ ایمان کو وہ ابدی سعادت عطا نہ کی جائے جسے وہ کمال خلوص، اشتیاق اور دعا کے ذریعے تمام زمانوں میں ہمیشہ مانگتے ہیں، اور وہ کریم مطلق اور رحیم مطلق جس کی رحمت کی۔ تمام کائنات کی گواہی کے مطابق۔ کوئی حد ہی نہیں ہے، ان سب کی دعائیں قبول نہ کرے اور وہ ابدی سعادت وجود میں ہی نہ آئے؟

تیسرا نکتہ:

اختیاری قولی دعا کے قبول ہونے کی دو صورتیں ہیں۔

یا تو اس طرح قبول ہوگی کہ بعینہ وہی چیز حاصل ہو جائے جو مانگی گئی ہے۔

یا پھر مطلوبہ چیز سے اچھی چیز مل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی اللہ سے بیٹا مانگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے لڑکی دے دیتا ہے، جیسے کہ مریمؑ کے معاملے میں ہوا؛ تو ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ دُعا قبول نہیں ہوئی، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ بہتر طریقے سے قبول ہوگئی ہے۔ اسی طرح بسا اوقات وہ اپنی دنیا کی بہتری وسعادتمندی کی دعا کرتا ہے لیکن اس کی دعا اُس کی آخرت کے لیے قبول کر لی جاتی ہے؛ اس صورت میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ دعا رد ہو گئی ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ زیادہ نفع بخش صورت میں قبول ہوگئی ہے۔۔۔

پس حق سبحانہ وتعالیٰ جب حکیم مطلق ہے، اور ہم اُس سے مانگتے ہیں اور وہ ہماری مانگ کا جواب دیتا ہے، لیکن ہمارے ساتھ معاملہ اپنی حکمت کے حساب سے کرتا ہے، تو پھر مریض کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ طبیب کی حکمت پر تہمت نہ لگائے؛ جیسے کہ مریض شہد مانگے تو ماہر طبیب اس کے بخار کی وجہ سے اُسے کونین دے دے تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ طبیب نے میری سنی نہیں، بلکہ اس نے اس کی طلب کی بجائے اس کی چیخ وپکار پر دھیان دیا ہے، اُس کی سُنی بھی ہے اور جواب بھی دیا ہے لیکن فیصلہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر کیا ہے جو زیادہ بہتر ہے۔

چوتھا نکتہ:

دعا کا بہترین، خوبصورت ترین، لطیف ترین، لذیذ ترین اور تیز ترین پھل اور نتیجہ یہ ہے کہ دعا کرنے والا یہ بات جانتا ہے کہ کوئی ہے جو اُس کی پکار سنتا ہے، اس کے درد کا مداوا کرتا ہے، اس پر رحم کھاتا ہے اور اُسی کا دستِ قدرت ہر چیز تک پہنچ رکھتا ہے، اور یہ کہ وہ دنیا کی اس بہت بڑی سرائے میں اکیلا نہیں ہے بلکہ ایک صاحب کرم پروردگار موجود ہے جو

اس پر نگاہِ کرم رکھتا ہے اور اس کے ساتھ مانوسیت کا اظہار کرتا ہے اور اس کی غیر محدود حاجات وضروریات کو پورا کر سکتا ہے اور اس کے غیر محدود دشمنوں سے اس کا دفاع کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ خود کو رب کریم کی حضوری میں تصور کرتا ہے اور اس تصور سے اُسے ایک طرح کے فرح وسرور اور انشراحِ صدر کا احساس ہوتا ہے۔ اس تصوّر اور احساس سے وہ اپنے اُوپر دُنیا کے برابر لدے ہوئے بوجھ پرے پھینک دیتا ہے اور کہتا ہے:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ

پانچواں نکتہ:

دعا عبودیت کی رُوح اور خالص ایمان کا نتیجہ اور ماحصل ہے؛ کیونکہ دعا کرنے والا اپنی دعا کے ذریعے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ: کوئی ہے جو تمام کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ چنانچہ میرے گہرے سے گہرے معاملات کا علم اور اطلاع رکھتا ہے اور وہ میرے آخری درجے کے مقاصد پورے کرنے پر قادر ہے، میرے تمام حالات پر نظر رکھتا ہے اور میری آواز کو سنتا ہے۔

اگر یہی بات ہے تو وہ تمام موجودات کی تمام آوازیں سنتا ہے اور اس بنا پر وہ میری آواز بھی سنتا ہے۔ اور وہ تمام کام سرانجام دیتا ہے اس لیے میں بھی اس سے اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے انجام پانے کی توقّع رکھتا ہوں، اور اپنے تمام اُمور ومعاملات اُسی سے طلب کرتا ہوں۔

اب ذرا اِس دعا کی عطا کردہ خالص توحید کی وسعت وہمہ گیری اور اس کے آشکار کردہ ایمان کے نور وصفا کی طرف نظر کرو اور فرمان گرامی: "قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡلَا دُعَآؤُکُمۡ" میں پایا جانے والا راز سمجھ جاؤ۔ اور فرمان گرامی: ﴿وَقَالَ رَبُّکُمُ ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ﴾ میں پائے جانے والے "امر" کو غور سے سنو کہ: "اگر وہ دینا نہ چاہتا تو مجھ میں طلب کرنے کی خواہش بھی پیدا نہ کرتا"۔ جیسے کہ کہا گیا ہے:

"گر نہ خواہی داد، نہ دادی خواہ"۔

﴿سُبۡحَانَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ مِنَ الۡاَزَلِ اِلَى الۡاَبَدِ، عَدَدَ مَا فِيۡ عِلۡمِ اللّٰهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحۡبِهِ وَسَلِّمۡ۔

وَسَلِّمۡنَا وَسَلِّمۡ دِيۡنَنَا، آمِيۡنَ

وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ

دوسرا ذیل

(معراج نبوی کے بارے میں)

بِاسْمِهٖ

﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى ۔۔۔ اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشَى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى لَقَدْ رَأَى مِنْ آیَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى﴾

میلادِ نبوی کے بارے میں لکھے گئے قصے میں معراج کے ساتھ تعلق رکھنے والے مضمون کے بارے میں ہم پانچ نکتوں کی وضاحت کریں گے۔

پہلا نکتہ: جناب سلیمان صاحب اپنے میلادِ نبوی کے بارے میں لکھے ہوئے قصے میں جنت سے لائی گئی براق کے غمگین عشق کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ اور بلاشبہ وہ اس طریقے سے ایک حقیقت ہی بیان کرتے ہیں؛ کیونکہ وہ اللہ کے ولی تھے اور اُنہوں نے اس قصے کی بنیاد روایت پر رکھی ہے، اس لیے اُن کا بیان کردہ قصہ بہر کیف حقیقت ہی ہوگا۔ اور وہ حقیقت یہ ہے:

عالمِ بقا کی مخلوقات کا رسول اکرم ﷺ کے نُور کے ساتھ گہرا تعلق ہے؛ کیونکہ آپ ﷺ کے لائے ہوئے نور کے طفیل ہی جنت اور دارِ آخرت کو جن وانس سے آباد کیا جائے گا۔ یہ نور نہ ہوتا تو اَبدی سعادت بھی نہ ہوتی، جنّت آباد نہ ہوتی اور وہاں کسی بھی رہائشی کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے بالکل ویران ہوتی!

ہم نے چوبیسویں مقالے کی چوتھی شاخ میں ذکر کیا ہے کہ:

ہر نوع سے ایک بلبل کو خطیب کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے، جو اپنے گروہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور ان خطیبوں کے ہراول دستے میں گلاب کی عاشق بلبل ہے۔ تاکہ وہ خزینۂ رحمت سے آنے والے اور حیوانات کے رزق کو اُٹھا کر لانے والے نباتات کے قافلے کے سامنے حیوانات کے گروہوں کی حیوانات کے ساتھ تعلق رکھنے والی ضرورتیں بیان کرے، وہ شدید ضرورتیں جو عشق کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں اور عشق کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔۔۔ اِن بلبلوں کے جمیل ترین درختوں کی چوٹیوں پر گائے جانے والے نغمات گویا کہ ان نباتات کو مرحبا کہنے کے لیے تسبیح وتہلیل سے بھرپور حسنِ استقبال

اور تالیاں بجانا ہیں!

بعینہٖ اسی طرح محمدِ عربی ﷺ جو کہ افلاک کی پیدائش کا سبب اور سعادتِ دارین کا وسیلہ اور ربُّ العالمین کے حبیب ہیں؛ جس طرح نوعِ ملائکہ میں سے جبریلؑ آپ ﷺ کی کمال محبت کے ساتھ خدمت کرتے ہیں اور ملائکہ کی اطاعت و انقیاد اور ان کے آدمؑ کو سجدہ کرنے کا راز آشکار کرتا ہے؛ اِسی طرح اہلِ جنت بلکہ جنت کے جانوروں کا بھی رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جناب سلیمان صاحب نے اس تعلقِ خاطر کی تعبیر عشق و محبت کے اُن احساسات سے کی ہے جن کا اظہار اس بُراق نے کیا تھا جس پر آپ ﷺ سوار ہوئے تھے۔

دوسرا نکتہ:

معراج نبوی کے قصوں میں سے ایک قصہ یہ ہے کہ سلیمان صاحب نے اللہ تعالیٰ کی منزّہ اور بے لاگ محبت کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے کہا: ''میں تیرا عاشق ہوں''۔

اِس طرح کی تعبیریں معروف معنی میں واجبُ الوجود کی قدسیّت اور ذاتی استغناء کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی ہیں۔ لیکن سلیمان صاحب چونکہ اہلِ ولایت واہلِ حقیقت سے ہیں؛ کیونکہ ان کا یہ قصہ عوامُ الناس میں قبولِ عام پا چکا ہے، اس لیے اُنھوں نے اِن الفاظ سے جو معنی مراد لیا ہے صحیح ہے، اور وہ معنی یہ ہے کہ: ذاتِ واجبُ الوجود غیر محدود اور بے پایاں جمال وکمال کی مالک ہے؛ کیونکہ تمام کائنات میں تقسیم کیے گئے ہر قسم کے جمال دکمال اُس کے جمال وکمال کی نشانیاں ہیں، اُن کے اشارے اور علامات ہیں۔

تو جس طرح کوئی جمال وکمال کا مالک بالبداہت اپنے جمال وکمال کے ساتھ ہر حال میں محبت کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے جمال کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتا ہے ایسی محبت جو اس ذات کے شایانِ شان ہے۔

اسی طرح وہ اپنے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ محبت کرتا ہے جو کہ اس کے حُسن و جمال کی شعاعیں ہیں۔

اور اگر وہ اپنے اسماء کے ساتھ محبت کرتا ہے تو پھر بلا شبہ وہ اپنی صنعت و کاریگری کے ساتھ بھی محبت کرتا ہے جو اس کے اسماء کے حسن و جمال کو آشکار کرتی ہے۔

تب وہ اپنی مصنوعات کے ساتھ بھی محبت کرتا ہے جو کہ اس کے جمال وکمال کا آئینہ ہیں۔

اور اگر وہ اُس چیز کے ساتھ محبت کرتا ہے جو اُس کے جمال وکمال کا اظہار کرتی ہے تو پھر بلا شبہ وہ اپنی مخلوقات کے اُن محاسن کے ساتھ بھی محبت کرتا ہے جو اُس کے اسماء کے جمال وکمال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ قرآن کریم اپنی آیات کے ذریعے محبت کی ان پانچوں اقسام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پس رسول اکرم ﷺ جب مصنوعات کے مابین کامل ترین فرد اور مخلوقات کے مابین ممتاز شخصیت ٹھہرے اور وہ

صنعتِ الٰہی کی قدر بھی کرتے ہیں اور ذکر و تسبیح کی گونج دار آواز کے ساتھ اس کی تشہیر بھی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ہی قرآن کی زبان کے ذریعے اسمائے الٰہیہ میں پائے جانے والے جمال و کمال کے خزانوں کے منہ کھولے ہیں، وہی قرآن کی زبان کے ساتھ قطعی تابناک صورت میں کائنات کی خود اُن کے صانع پر دلالت کرنے والی تکوینی آیات پر دلالت کرنے والی دلیلوں کی وضاحت کرتے ہیں اور اپنی کُلّی عبودیت کے ساتھ اسمائے الٰہیہ کے آئینے کا کردار ادا کرتے ہیں اور اپنی جامع ماہیت کے ساتھ اسمائے الٰہیہ کا مکمل مظہر بن گئے ہیں۔

اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ:

وہ جمیلِ ذُوالجلال اپنے حسن و جمال کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے محمد عربی ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے جو کہ اُس حُسن و جمال کا کامل ترین باشعور آئینہ ہیں۔

اسی طرح وہ اپنے اَسمائے حسنٰی کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے محمد عربی ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے جو کہ ان اسماء کا اُجلا اور تابندہ ترین آئینہ ہیں۔

اسی طرح وہ محمد عربی ﷺ کے ساتھ مشابہت رکھنے والوں سے بھی اُن کے درجات کے مطابق محبت رکھتا ہے۔

اسی طرح وہ اپنی صنعت کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے محمد عربی ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے جو اس صنعت کو تمام کائنات میں بلند آواز کے ساتھ نشر کرتے ہیں اور ذکر و تسبیح کے ساتھ اتنی اُونچی پُکار کے ساتھ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ آسمانوں کے کان گونج اُٹھتے ہیں اور بحر و بر میں جذب و شوق برپا ہو جاتا ہے۔۔۔اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ بھی محبت رکھتا ہے۔

اسی طرح وہ اپنی صنعت کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے محمد عربی ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے جو کہ بالاتفاق تمام لوگوں سے زیادہ کامل انسان ہیں، یعنی اُن لوگوں سے جو ذوی شعور مخلوقات میں سے کامل ترین ہیں، وہ ذوی شعور جو تمام ذوی حیات سے زیادہ کامل ہیں، وہ ذوی حیات جو اس کی تمام مصنوعات میں سے سب سے زیادہ کامل ہیں۔

اسی طرح وہ اپنی مخلوقات کے محاسنِ اخلاق کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے محمد عربی ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے جو کہ محاسنِ اخلاق میں بالاتفاق بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔۔۔اور وہ محاسنِ اخلاق میں آپ ﷺ کے ساتھ مشابہت رکھنے والوں کے ساتھ بھی اُن کے درجات کے مطابق محبت رکھتا ہے۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت نے اُس کی رحمت کی طرح تمام کائنات کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

اسی لیے غیر محدود محبوبوں کے ضمن میں ذکر کردہ مذکورہ پانچ پہلوؤں میں سے ہر پہلو میں سب سے اعلیٰ مقام محمد عربی ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ اور اسی بنا پر آپ ﷺ کو "حبیب اللہ" کا لقب عطا ہوا ہے۔

سلیمان محترم نے محبوبیت کے اس مقام کی تعبیر ''میں تیرا عاشق ہوگیا ہوں'' کے الفاظ سے کی ہے۔ یہ تعبیر تفکر کی کمین گاہ اور بہت دُور سے اس حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے۔

تاہم پھر بھی یہ تعبیر چونکہ ایسے معنی کے وہم میں ڈال دیتی ہے جو شانِ ربوبیت کے سزاوار نہیں، اس لیے اس تعبیر کی بجائے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ:

''میں تجھ سے راضی ہوگیا''۔

تیسرا نکتہ:

معراج سے متعلقہ حصے میں ذکر کردہ قصے ان پاکیزہ مقدس حقائق کی تعبیر ہمارے ہاں کے معروف معانی کے ساتھ کرنے سے عاجز ہیں، بلکہ وہ تمام گفتگوئیں تو فقط دیکھنے بھالنے کے عناوین اور تفکّر و تأمّل کی رصدگاہیں، ان بلند و بالا گہرے حقائق کے اشارات، ایمان کے بعض حقائق کے لیے تنبیہات اور بعض ایسے معانی کے لیے کنایات ہیں جن کی تعبیر و وضاحت ممکن نہیں۔

اس لیے یہ قصہ اُن معانی کے ساتھ نقل نہیں ہوا ہے جو ہمارے ہاں معلوم و معروف ہیں اور ہم اُن گفتگوؤں سے اپنے خیال کے مطابق حقائق اَخذ نہیں کر سکتے ہیں بلکہ ہم اپنے دلوں کے ساتھ ایک جذبات انگیز ایمانی ذوق اور نورانی رُوحانی سرخوشی و سرمستی حاصل کر سکتے ہیں؛ کیونکہ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کوئی نظیر و شبیہ و مثل و مثیل نہیں ہے، اسی طرح اس کی ربوبیت کے شئون و احوال میں اُس کی مثل نہیں ہے۔

چنانچہ جس طرح اس کی صفات مخلوقات کی صفات کے مشابہ نہیں ہیں، اسی طرح اُس کی محبت بھی ان کی محبت کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی ہے۔

اس لیے ہم ان تعبیروں کو متشابہات میں شمار کر کے قبول کر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی محبت کی طرح کے۔ بعض اور بھی شئون و احوال ہیں جو اُس کے وجود کے وجوب اور اس کی قدسیّت کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور وہ ایسی صورت میں ہیں جو اس کے ذاتی استغنا کے اور کمالِ مطلق کے موافق ہیں۔۔۔ یہ قصیدہ ان شئون و احوال کا ذکر معراج کے واقعات کی صورت میں کرتا ہے۔

اکتیسویں مقالے میں جو کہ معراج نبوی کے بارے میں ہے۔ معراج کے کچھ حقائق اصولِ ایمان کے دائرے میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں، اس لیے اُسی پر اکتفا کرتے ہوئے اِس مقام پر اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔

چوتھا نکتہ:

یہ عبارت کہ: ''آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو ستر ہزار پردوں کے پیچھے سے دیکھا''؛ بُعدِ مکان کی خبر دے رہی ہے،

حالانکہ واجبُ الوجود منزّہ عنِ المکان اور ہر چیز کے ہر چیز سے زیادہ قریب ہے؛ اس عبارت کا کیا مطلب ہے؟

الجواب: یہ حقیقت ا رپں مقالے میں دلائل و براہین کے ساتھ پوری تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔ اس مقام پر صرف اسی قدر کہتے ہیں کہ:

بے شک اللہ تعالیٰ ہم سے انتہائی قریب ہے اور ہم اُس سے انتہائی دُور۔

جیسے سورج ہمارے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آئینے کی وساطت سے ہم سے انتہائی قریب ہے اور زمین پر پائی جانے والی ہر شفاف چیز سورج کے لیے ایک قسم کا عرش اور منزل بن جاتی ہے؛ چنانچہ اگر سورج شعور کا مالک ہوتا تو ہمارے آئینے کی وساطت سے ہمارے ساتھ گفتگو کر سکتا۔ لیکن ہم تو اُس سے چار ہزار سال کی مسافت کے حساب سے دُور ہیں!

اسی طرح وہ شمسِ ازلی۔ بلا تشبیہ و تمثیل۔ ہر چیز کے ہر چیز سے زیادہ قریب ہے؛ کیونکہ وہ واجبُ الوجود ہے اور منزّہ عنِ المکان ہے اور کوئی بھی چیز اُس کے آگے حجاب نہیں بن سکتی۔ جبکہ ہر چیز اس سے انتہائی دور ہے:

یہی وہ راز ہے جس سے معراج میں پائی جانے والی طویل مُسافت جنم لیتی ہے، حالانکہ آیتِ کریمہ: ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ بتاتی ہے کہ مسافت کا وجود ہی نہیں ہے۔

اسی طرح اس سے رسول اکرم ﷺ کا اپنے سَیر و سلوک میں ایک آن میں طویل مسافت طے کرتے ہوئے چلے جانے اور واپس آ جانے کا راز جنم لیتا ہے۔

پس رسولِ اکرم ﷺ کا معراج آپ ﷺ کا سیر و سلوک اور آپ ﷺ کی ولایت کا عنوان ہے؛ چنانچہ جس طرح اہلِ ولایت روحانی سیر و سلوک کے ذریعے ترقی کرتے ہوئے چالیس دن سے چالیس سال کے عرصے میں ایمان کے درجات میں سے حق الیقین کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں، اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ جو کہ تمام اُولیاء کے سردار ہیں، معراج پر صرف قلب و روح کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے جسم اور حواس و لطائف کے ساتھ گئے چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے معراج کے ذریعے جو کہ آپ ﷺ کی ولایت کی کرامت کُبریٰ ہے۔ چالیس سال کی بجائے صرف چالیس سیکنڈ میں ایک جادۂ کُبریٰ کا افتتاح کر دیا اور ایمانی حقائق کے بلند ترین مراتب کی جانب گامزن ہو گئے اور معراج کی سیڑھی کے ذریعے عرش تک جا پہنچے، اور آپ ﷺ نے ''قابَ قوسین'' کے مقام میں اپنی آنکھ کے ساتھ عینُ الیقین کی صورت میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت جیسے عظیم ترین ایمانی حقائق کا مشاہدہ کر لیا، جنت میں داخل ہوئے، سعادتِ ابدی کو آنکھوں سے دیکھا اور جس جادۂ کُبریٰ کو کھولا تھا اُسے اس معراج کے دروازے پر کھلا چھوڑ آئے۔ اب آپ ﷺ کی اُمت کے تمام اُولیاء اپنے اپنے درجات کے حساب سے اس معراج کے سائے میں رُوحانی اور قلبی صورت میں سیر و سلوک کی منزلیں طے کرتے رہتے ہیں۔

پانچواں نکتہ:

''میلادِ نبوی'' کو ''معراج نامے'' کے ساتھ ملا کر تلاوت کرنا ایک خوبصورت، انتہائی سودمند اور قابلِ قدر اسلامی عادت ہے۔ بلکہ یہ اسلام کی معاشرتی زندگی میں ایک غایت درجے کی شیریں، چمکدار اور لطیف ترین صحبت کا دارومدار ہے، بلکہ یہ ایمانی حقائق کی یاددہانی کے لیے ایک انتہائی میٹھا اور پاکیزہ درس ہے، بلکہ یہ ایمان کے حقائق کو آشکار کرنے کے لیے، اللہ کی محبت اور عشق نبوی کو متحرک اور برانگیختہ کرنے کے لیے ایک انتہائی طاقتور اور مؤثر ترین وسیلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس عادت کو ابد تک قائم دائم رکھے اور جنابِ سلیمان جیسے میلاد لکھنے والے لوگوں پر رحم کرے اور اُن کا جنت الفردوس میں ٹھکانا بنائے۔۔۔ آمین

خاتمہ

اس کائنات کا خالق جب ہر نوع میں ایک ممتاز، مکمل اور جامع قسم کا فرد پیدا کرتا ہے اور اُسے اس نوع کے فخر و کمال کا دارومدار بنا دیتا ہے، تو پھر یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ وہ اپنے اسمائے حسنیٰ میں سے اسمِ اعظم کی تجلی کے ذریعے تمام کائنات کی نسبت سے ایک ممتاز اور مکمل فرد پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح اس کے اسمائے گرامی میں ایک اسمِ اعظم ہے اسی طرح اس کی مصنوعات میں ایک کامل ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ کائنات میں پھیلے ہوئے تمام کمالات اس فرد میں ا کر دیتا ہے اور اُسے اپنی نگاہِ کرم کا دارومدار بناتا ہے۔

اس کامل ترین فرد کا تعلق بہر حال ذوی حیات سے ہوتا ہے؛ کیونکہ کائنات کی مکمل ترین انواع ذی حیات ہیں۔ اور وہ فرد ذی حیات انواع کے درمیان بہر حال ذی شعور ہوگا؛ کیونکہ ذی حیات انواع میں کامل ترین افراد وہ ہیں جو شعور رکھتے ہیں۔ اور وہ فرد بہر حال انسان ہوگا؛ کیونکہ ذی شعور مخلوقات کے مابین غیر محدود ترقیات کے لیے مستعد مخلوق صرف انسان ہی ہے؛ اور انسانوں کے مابین وہ فرد حتمی طور پر محمد ﷺ ہی ہیں؛ کیونکہ آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کوئی بھی تاریخ قطعی طور پر آپ ﷺ جیسا فرد برآمد نہیں کر سکی اور آئندہ بھی نہیں کر سکے گی؛ کیونکہ اس معزز فرد نے نصف کرۂ ارض کو اور نوعِ بشر کے پانچویں حصے کو اپنی معنوی سلطنت میں محصور کر رکھا ہے اور اُسے کمال رُعب و احتشام کے ساتھ ساڑھے تیرہ سو سال سے قائم دائم رکھا ہے۔ اور آپ ﷺ انواع و اقسام کے تمام حقائق میں تمام اہلِ کمال کے لیے اُستاذُ الکل بنے اور دوستوں دشمنوں کے بالاتفاق آپ ﷺ بلند ترین اخلاق کے مالک ٹھہرے۔ اپنی دعوت کے آغاز میں آپ ﷺ نے علیحدہ علیحدہ تمام دنیا کو چیلنج دیا اور اُس معجز بیان قرآن کو ظاہر کیا جو ہر لمحے ایک ارب سے زائد لوگوں کے وردِ زبان ہے۔

پس آپ ﷺ جیسا انسان ہی وہ ممتاز فرد ہو سکتا ہے آپ ﷺ کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آپ ﷺ اس کائنات کی گٹھلی ہیں اور آپ ﷺ ہی پھل۔

عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ بِعَدَدِ أَنْوَاعِ الْكَائِنَاتِ وَ مَوْجُودَاتِهَا۔

پس یہ بات اچھی طرح سمجھ جاؤ کہ اس جیسے معزز فرد کے میلاد اور معراج کو سننا، یعنی آپ ﷺ کی ترقیوں کی ابتدا و انتہا کے متعلق سُننا اور آپ ﷺ کی معنوی سوانح حیات کی پہچان حاصل کرنا اُن اہلِ ایمان کے لیے ایک بلند پایہ دینی، لذیذ اور ذوق و فکر و نور و مستی سے بھرپور جشن ہے جو اُس معزز فرد کو اپنے لیے ایک رئیس، سردار، امام اور شفاعت کنندہ کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔

اے پروردگار! بحرمتِ حبیب اکرم ﷺ اور بحق اسمِ اعظم اس کتاب کی نشر واشاعت کرنے والوں کے دلوں کو ایمانی انوار کا مظہر بنادے اور اُن کے قلموں کو قرآنی انوار کے نشر کرنے کی توفیق دے اور انہیں صراطِ مستقیم پر استقامت سے بہرہ ور فرما۔۔۔آمین۔

﴿سُبۡحَانَكَ لَا عِلۡمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا إِنَّكَ أَنۡتَ الۡعَلِيمُ الۡحَكِيمُ﴾

اَلۡبَاقِیۡ هُوَ الۡبَاقِیۡ

سعید نورسی

پچیسواں مکتوب

رحمتِ الٰہی سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ یہ مکتوب سورۂ یٰس کی پچیس آیات کے پچیس نکات پر مشتمل ہو، لیکن اس کا وقت نہ آیا، اس لیے تالیف نہ کیا گیا۔۔۔مؤلف

چھبیسواں مکتوب

پہلا مبحث

بِاسۡمِهٖ سُبۡحَانَهٗ

﴿وَاِنۡ مِنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ﴾

یہ چھبیسواں مکتوب چار مباحث پر مشتمل ہے، ان میں سے ہر مبحث ایک دوسرے کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق رکھتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطَانِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ﴾

شیطان اور اُس کے گروہ کے خلاف قرآن کی حجت

یہ پہلا مبحث جو کہ ابلیس کو لاجواب کرتا ہے، شیطان کا ناطقہ بند کرتا ہے، سرکشوں کی زبان بند کرتا ہے، قرآن کی شیطان اور اس کی پارٹی کے خلاف حجت ہے؛ دراصل ایک جانب دارانہ عقلی بحث کے دوران پیش آنے والا سچا واقعہ ہے۔ جو قطعی صورت میں شیطان کی ہولناک سازش کا منہ توڑ جواب ہے۔

اس واقعے کا ایک حصہ میں نے آج سے دس سال پہلے اجمال کے ساتھ ''لمعات'' میں قلم بند کر دیا تھا۔۔۔

اور وہ اس طرح ہے کہ میں اس کتاب کی تالیف سے گیارہ سال پہلے جامع بایزید ''استنبول'' میں رمضان کے مہینے میں حفاظ کرام سے قرآن مجید سن رہا تھا کہ اچانک ایک غیبی آواز کان میں پڑی۔ مجھے پکارنے والے کا جسم تو نظر نہ آیا لیکن خیال یہی ہوا کہ میں کوئی معنوی آواز سن رہا ہوں۔ چنانچہ اُس آواز نے میرا ذہن اپنی طرف پھیر لیا تب میں نے خیالی طور پر سنا اور دیکھا کہ وہ مجھے کہہ رہا ہے: ''تو قرآن کو بہت بلند پایہ اور تابناک سمجھتا ہے، لیکن اس کے بارے میں ذرا غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھو۔ مطلب یہ کہ اسے بشر کا کلام فرض کر لو اور پھر دیکھو کہ تمہیں وہ امتیازی خوبیاں نظر آتی ہیں کہ نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ میں اس بات سے دھوکا کھا گیا اور فرض کر لیا قرآن بشر کا کلام ہے اور اُسے اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ میں اتھاہ اندھیروں میں گھر گیا ہوں؛ کیونکہ قرآن کی درخشندہ روشنیاں اچانک بجھ گئی تھیں اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا، بالکل ایسے جیسے اگر کوئی مسجد سلطان ''بایزید'' کی بجلی کا بٹن بند کر دے تو تمام علاقہ اندھیرے میں ڈوب جائے۔ اسی طرح جب میں نے قرآن کو بشر کا کلام فرض کیا تو اس کے تابندہ درخشندہ انوار او جھل ہونے شروع ہو گئے تب مجھے پتا چلا کہ یہ باتیں میرے ساتھ شیطان کر رہا تھا اور وہ مجھے تباہی کے گھاٹ اُتارتا جا رہا تھا۔

پس میں نے قرآن سے مدد مانگی تو اچانک میرے دل میں ایک نور وارد ہوا اور اس نے مجھے ایک حتمی قسم کی دفاعی قوت مہیا کر دی۔تب میں نے درج ذیل انداز میں شیطان کے ساتھ مناظرہ شروع کیا میں نے اس سے کہا:

اے شیطان! غیر جانبدار ہو کر بحث کر کے فیصلہ صادر کرنے کا مطلب ہے کہ دونوں طرفوں کے درمیان میں رہا جائے اور کسی ایک طرف کو جھکاؤ نہ رکھا جائے۔لیکن وہ غیر جانبدارانہ محاکمہ جس کے بارے میں تُو اور تیرے انسانی چیلے کہہ رہے ہیں اس کا مطلب ہے مخالف جانب پر ڈٹ جانا، اِسے غیر جانبداری نہیں کہتے بلکہ یہ تو وقتی اِلحاد و زندیقیت کی ہی ایک صورت ہے؛ کیونکہ قرآن کریم کو اس نظر سے دیکھنا کہ وہ بشر کا کلام ہے اور پھر اس کی روشنی میں اُسے زیرِ بحث لا کر کوئی حکم صادر کرنا طرفِ مخالف کو بنیاد بنانا اور باطل پر ڈٹ جانا ہے۔اسے غیر جانبداری نہیں کہتے بلکہ یہ باطل کی جانبداری ہے۔

شیطان نے کہا: تو پھر آپ اسے نہ اللہ کا کلام کہیں نہ بشر کا، بلکہ اسے دونوں کے درمیان کوئی درجہ دے دیں!

تو میں نے کہا:

ایسا بھی نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ اگر کسی مال کے بارے میں تنازع ہو جائے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اگر اس کے دونوں دعوے دار باہم قریب قریب ہوں، اور اُن کے درمیان قربِ مکانی پایا جائے تو وہ مال اُن دونوں کے علاوہ کسی تیسرے آدمی کے حوالے کیا جائے گا یا پھر ایسی جگہ رکھ دیا جائے گا جہاں دونوں کی دسترس میں ہو۔پھر ان دونوں میں سے جو اپنی ملکیت ثابت کر لے گا وہ لے جائے گا۔

لیکن اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دُور ہوں، جیسے ایک مشرق میں اور دوسرا مغرب میں ہو، تو پھر وہ مال جس کی دسترس میں اور جس کے زیرِ تصرّف ہو گا، قاعدے کے مطابق اُسی کے پاس رہنے دیا جائے گا؛ کیونکہ ان دونوں کے درمیان والی کسی جگہ پر رہنے دینا ممکن نہیں ہو گا۔

پس قرآن ایک بیش قیمت سامان ہے، اب اللہ کے کلام اور بشر کے کلام کے درمیان جتنی دوری ہو گی، ان دونوں طرفوں کے درمیان فاصلہ بھی اُسی قدر بڑھے گا، بلکہ یہ فاصلہ بے حد و حساب ہوتا جائے گا؛ اس لیے اس قیمتی سامان کو ان دونوں طرفوں کے درمیان رکھنا ممکن ہی نہیں جو پروین اور پاتال کی طرح ایک دوسرے سے دُور ہیں اور دونوں کا کوئی درمیان بھی نہیں ہے؛ کیونکہ دونوں وجود و عدم کی طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں؛ اس لیے دونوں کے درمیان والی کوئی جگہ ممکن ہی نہیں۔

اب قرآن کی دسترس والی طرف، طرفِ الٰہی ہے، اس لیے یہ بات قبول کر لی جائے گی کہ یہ اسی کے زیرِ تصرّف ہے اور دلیلوں کا اثبات اسی کی روشنی میں کیا جائے گا۔اِلّا یہ کہ دوسری طرف اس کے کلام اللہ ہونے کی ایک ایک کر کے تمام

دلیلیں توڑ دے ایسا ہو جائے تو پھر وہ یہ دوسری طرف اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا سکتی ہے، وگرنہ نہیں۔ اور ایسا کبھی ہوگا نہیں!

ایسا جراُتمند وہ کون سا ہاتھ ہو سکتا ہے جو عرشِ اعظم پر ہزاروں قطعی دلائل و براہین کی میخوں کے ساتھ جڑے ہوئے اس عظیم الشان ہیرے کی تمام میخیں اُکھاڑ دے اور مضبوط ستونوں کو توڑ دے اور اس ہیرے کو نیچے گرا دے؟

پس اے شیطان!- تیری مرضی کے برعکس- اہلِ حق و انصاف ایسے معاملات میں محاکمے کا یہی انداز اپناتے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی دلیل سے ان کا قرآن پر ایمان مزید بڑھ جاتا ہے۔

لیکن وہ طریقہ جو تو اور تیرے چیلے بتلاتے ہیں، یعنی یہ کہ -اگر چہ ایک ہی دفعہ ہو- قرآن کو بشر کا کلام فرض کر لیا جائے، اور یوں عرش کے ساتھ بندھے ہوئے اس عظیم الشان موتی کو زمین پر گرا دیا جائے، تو پھر اُسے زمین سے اُٹھا کر معنوی عرش میں نصب کرنے کے لیے ایک ایسی برہان درکار ہوگی جس میں ان تمام میخوں کی قوت اور بہت سی براہین کی طاقت پائی جاتی ہو، تاکہ وہ اس موتی کو زمین سے اُٹھا کر معنوی عرش میں نصب کر دے، تاکہ یہ کفر کی تاریکیوں سے نجات پا جائے اور ایمان کے انوار سے بہرہ ور ہو جائے۔

اس طریقے سے نجات پانا ایک بہت مشکل کام ہے، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بہت سے لوگ تیرے غیر جانب دار عقلی محاکمے کے نام سے تیار کی گئی سازش کی وجہ سے ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں۔

شیطان نے ایک اور اعتراض کیا اور کہا: قرآن انسانی کلام کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور اسی اسلوب اور اندازِ گفتگو کا حامل ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ بشر کا کلام ہے؛ کیونکہ اگر اللہ کا کلام ہوتا تو اس کا اسلوب اس کے شایانِ شان ہر جہت سے غیر معمولی ہوتا؛ کیونکہ جس طرح اُس کی صنعت بشر کی صنعت کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی، اُسی طرح یہ ضروری ہے کہ اُس کا کلام بھی بشر کے کلام کے ساتھ مشابہت نہ رکھتا ہو!

تو میں نے جواب میں کہا:

جس طرح ہمارے نبی ﷺ اپنے معجزات اور خصائص کے علاوہ اپنے افعال واحوال واطوار میں بشریت کے جامے میں ہی رہے اور الٰہی عادات اور تکوینی اوامر کی اطاعت کرتے رہے اور ایک بشر کی طرح اُن کے فرمانبردار رہے، سردی گرمی اور دُکھ درد سے متاثر ہوتے رہے، اور انہیں ان کے تمام احوال واطوار میں کسی خارقِ عادت کیفیت سے نہیں نوازا گیا تاکہ وہ اپنے اعمال وافعال میں امام بنیں، اپنے طور طریقوں میں اُمت کے رہنما بنیں اور اپنی تمام حرکات و سکنات میں اُمت کے لیے کوئی سبق چھوڑیں لیکن اگر آپ اپنے احوال واطوار میں کوئی غیر معمولی انسان ہوتے تو وہ اپنی ذات میں ہمہ جہتی امام نہ ہوتے۔

بعینہٖ اسی طرح قرآنِ حکیم اہلِ شعور کا امام، جن وانس کا مرشد، اہلِ کمال کا ہادی و رہنما اور اہلِ حقیقت کا معلم ہے، اس لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ وہ قطعی طور پر انسانوں کی بات چیت کے انداز میں اور انہی کے اسلوب پر ہو؛ کیونکہ جن وانس اس سے اپنی مناجات کا اقتباس کرتے ہیں، اس سے اپنی دعائیں سیکھتے ہیں، اس کی زبان میں اپنے مسائل پیش کرتے ہیں، اس سے اپنے آدابِ معاشرت سیکھتے ہیں اور یوں ہر ایک اسے اپنا مرجع بناتا ہے۔

اس لیے اگر یہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے اس اسلوب میں ہوتا جو موسیٰ نے طور سینا پر سنا تھا تو اس کلام کا پوری توجہ اور دلجمعی سے سننا انسان کی برداشت سے باہر ہو جاتا اور وہ اسے اپنا مرجع نہ بنا سکتا۔

پس سیدنا موسیٰ صاحبِ عزم پیغمبر ہونے کے باوجود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کلام کے چند کلمات ہی برداشت کر سکے؛ پھر انہوں نے کہا: أَهَكَذَا كَلَامُكَ؟ قَالَ اللّٰهُ: ''لِيْ قُوَّةُ جَمِيْعِ الْأَلْسِنَةِ''

''آپ کا کلام اسی طرح کا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے پاس تمام زبانوں کی قوت ہے''۔

تب شیطان نے دوبارہ کہا:

بہت سے لوگ کچھ ایسے دینی مسائل بیان کرتے ہیں جو قرآنی مسائل کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، تو کیا کسی انسان کے لیے دین کے نام پر قرآن جیسی کوئی چیز بنا لینا ناممکن ہے؟

تو میں نے قرآن کی روشنی میں اُسے جواب دیا:

اوّلاً: ایک دین دار آدمی دینی محبت کے جذبے کے تحت کہتا ہے: حق اس طرح ہے، حقیقت یہ ہے اور اللہ کا حکم یہ ہے وغیرہ یعنی وہ اللہ کو اپنی خواہش کے مطابق نہیں بلواتا، اور اپنی حد سے بہت زیادہ آگے گزر کر اُس کی تقلید میں خود اس کی جگہ نہیں بولتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمانِ گرامی ﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ﴾ کے دستور سے کپکپا اُٹھتا ہے۔

ثانیاً: یہ بات کسی بھی طور ممکن نہیں کہ کوئی بشر اس طرح کا کام کرے اور توفیق سے بھی نوازا جائے اور کامیاب بھی ہو جائے، بلکہ یہ چیز سو مرتبہ محال ہے؛ کیونکہ ایک دوسرے کے قریبی لوگوں کے لیے ایک دوسرے کی تقلید کرنا ممکن ہے، اور جو ایک دوسرے کی جنس سے ہوں اُن کے لیے ایک دوسرے کی صورت میں داخل ہو جانا ممکن ہے۔ باہمدگر قریب لوگوں کے لیے حسبِ مرتبہ ایک دوسرے کی تقلید میں ایک دوسرے کا قائم مقام ہو جانا ممکن ہے: اس لیے یہ لوگوں کو وقتی طور پر غافل کر سکتے ہیں؛ لیکن ان میں سے کوئی بھی لوگوں کو ہمیشہ کے لیے غافل نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے اطوار و احوال میں پائے جانے والے تصنّعات اور تکلّفات اس کے فریب کو ظاہر کر دیں گے اور اس کا جھوٹ آشکار ہو جائے گا۔ اس لیے باریک بین لوگوں کی نظروں میں اس کا یہ حیلہ کسی بھی طور زیادہ دیر تک نہیں چل سکے گا۔

لیکن تصنّع اور تکلّف کے ساتھ تقلید کے لیے تگ ودَو کرنے والا آدمی اگر دوسرے آدمی سے بہت زیادہ دُور ہو گا، جیسے

یہ کہ کوئی عام آدمی علم میں ''ابن سینا'' جیسے عبقری انسان کی تقلید کرنا شروع کر دے اور کوئی چرواہا بادشاہ کا رُوپ دھار لے؛ تو وہ کسی کو تو دھوکہ نہیں دے سکے گا بلکہ خود مسخرہ بن کر رہ جائے گا اور اس کا اُنگ اُنگ پکارے گا کہ یہ بناوٹی اور دھوکے باز ہے۔

پس اگر۔ ہزار بار حاشا وکلا۔ قرآن کریم کو بشر کا کلام فرض کر لیا جائے، تو جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک جگنو اہلِ رصد اور ماہرین فلکیات کو ایک ہزار سال تک بغیر تکلف کے حقیقی ستارہ نظر آتا رہے۔

اور جس طرح یہ محال ہے کہ ایک مکھی اہلِ بصارت کے سامنے بغیر تصنّع کے ایک ہزار سال تک مور کا مظہر اختیار کیے رکھے، اور جس طرح یہ محال ہے کہ ایک عام سپاہی مدتِ مدید تک کسی مشہور فیلڈ مارشل کا بھیس بنائے رکھے اور اس کی جگہ کام کرتا رہے، اور اس کا مکر وفریب کسی پر ظاہر نہ ہو پائے؛ اور یہ کہ کوئی جھوٹا افترا پرداز اور بے ایمان آدمی اپنی تمام عمر ایک اعلیٰ پائے کے سچے ایمان دار اور راسخ العقیدہ آدمی کے طور اطوار اپنائے رکھے اور اپنے ان طور اطوار کا بغیر کسی خوف وخطر کے دُور رَس نظروں کے سامنے بَر ملا اظہار بھی کرتا پھرے، اور پھر اُس کی یہ بناوٹ اور فریب کاری دانا و بینا لوگوں پر مخفی بھی رہے۔۔۔

تو جس طرح یہ چیزیں سو درجے محال دَر محال ہیں، اور کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ہونا ممکن ہے، بلکہ ان کا ہونا فرض کرنا بھی کسی بدیہی طور پر محال چیز کے واقع ہو جانے کو مان لینے کی طرح ہذیان و بیہودہ پن ہے، بعینہٖ اسی طرح اگر قرآن کو بشر کا کلام فرض کر لیا جائے تو پھر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ:

نجمِ حقیقت بلکہ شمسِ کمالات جیسی کتابِ مبین کی ماہیت جو کہ دائمی طور پر حقائق کے انوار نشر کرتی ہے اور عالمِ اسلام کے آسمان میں چمکتی دمکتی ہے، جیسے کہ مشاہدے میں آ رہا ہے۔۔۔ یہ لازم آئے گا کہ اس چمکدار نور کو کسی بشر کا جگنو کی روشنی جیسا تھوڑا سا ٹمٹماتا ہوا بناوٹی اور خانہ ساز خرافاتی نور شمار کیا جائے۔ ہزار بار حاشا وکلا!

اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کے قریب تر لوگ اور اسے گہری نظر سے دیکھنے والے اس کا اِدراک نہ کر پائیں اور اسے ایک بلند پایہ ستارہ اور حقائق کا سرچشمہ سمجھیں۔ اور یہ چیز سو مرتبہ محال ہے!

اور اس کے سو درجے محال ہونے کے ساتھ ساتھ مزید یہ کہ تُو اے شیطان! اگر اپنی شیطانیت میں اس سے بھی سو درجے آگے چلا جائے، تو بھی اِس محال کو ممکن نہیں کر سکے گا اور فاسد نہ ہونے والی عقلِ سلیم کو دھوکہ نہیں دے سکے گا۔۔۔

تُو زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ ستارے کو بہت دور سے جگنو کے رُوپ میں دِکھا کر لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے!

ثالثاً: قرآن کریم کو اگر بالفرض بشر کا کلام مان لیا جائے تو پھر یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس بلند پایہ امتیازی خصوصیات سے مرصّع و مزیّن، سعادت مند بنانے والے، زندگی پھیلانے والے، قوی ترین رُوح، بلند ترین حقیقت۔ اور مشاہدے

کے مطابق عالمِ انسانیت پر سب سے زیادہ ہمہ گیر آثار و تاثرات و نتائج مرتب کرنے والے اِس فرقانِ معجز بیان کی مخفی حقیقت یہ ہے کہ اِسے کسی اکیلے، بے علم اور بے یار و مددگار انسان نے۔ حاشا وکلّا۔ اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے!

اور یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کے قریبی ذہین فطین، بیدار مغز اور اس کے حالات کا سراغ لگانے والوں کو کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی جہت سے اس میں تقلید و تصنّع اور دھوکہ و فریب کی قطعاً کوئی علامت نظر نہ آئے بلکہ انہیں ہمیشہ اس میں اخلاص و ثبات، پختگی و سنجیدگی اور عزم و وفا کی جھلک نظر آئے۔ اور یہ چیز سو درجے محال ہے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ انسان جس نے تمام عمر اپنے احوال و اقوال و حرکات میں امانت، ایمان، امن، اخلاص اور صدق و استقامت جیسی اعلیٰ اور تابندہ ترین خصلتوں کا اظہار کیا، اور ان بلند پایہ صفات کی روشنی میں صدیقوں کی تربیت کی اور انہیں اس راہ پر لگایا۔۔۔ اگر ایسا فرض کر لیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ ایسے آدمی کو ایک ناقابلِ بھروسا، غیر مخلص اور بے ایمان آدمی مان لیا جائے۔۔۔ اور یہ چیز ایک امرِ واقعی کو دوگنا محال سمجھنے کے مترادف ہے، اور ایک ایسا فکری ہذیان ہے جس سے خود شیطان بھی شرمندہ ہوتا ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے کا درمیان ہے ہی نہیں؛

کیونکہ اگر قرآن کریم۔ بفرضِ محال۔ اللہ کا کلام نہ ہوتا تو یہ عرشِ اعظم سے گر کر سیدھا زمین پر آتا اور راستے میں کہیں نہ اٹکتا اور یوں مجمع الحقائق ہونے کے باوجود مجمع الخرافات بن کر رہ جاتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ وہ انسان جس نے اس غیر معمولی منشور کا اظہار کیا، وہ انسان اگر رسول نہ ہو۔ حاشا وکلّا ثُم حاشا وکلّا۔ تو پھر یہ لازم آئے گا کہ وہ اعلیٰ علّیین سے اسفل سافلین میں اور سرچشمۂ کمالات کے درجے سے مکّاریوں، فریب کاریوں کے درجے میں گر جاتا اور درمیان میں کہیں بھی اٹک نہ سکتا؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنے والا اور اس کے نام کی آڑ میں افترا پردازی کرنے والا سب سے نیچے والے درجے میں جا گرتا ہے۔

اگر مکھی کو ہمیشہ مور سمجھتے رہنا اور مور کے بلند پایہ اوصاف کا مشاہدہ مکھی میں کرنا محال ہے، تو پھر یہ مسئلہ بھی اسی طرح محال ہے۔ اس مسئلے کا احتمال صرف اسی آدمی کے ذہن میں آسکتا ہے جو فطری طور پر پاگل، مدہوش اور بے عقل ہو!

رابعاً: پھر قرآن کو اگر بشر کا کلام فرض کر لیا جائے تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ قرآن کریم جو اُمتِ محمدیہ کا مقدس قائد ہے۔ وہ اُمتِ محمدیہ جو کہ بنی آدم کا پُر حشمت لشکر ہے۔۔۔ تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ اسے پاس سے گھڑ لیا گیا ہے اور یہ بالکل بے اصل، بے قیمت اور عاجز و درماندہ ہے۔ ہزار بار حاشا وکلّا! جبکہ اس قرآن نے اس عظیمُ الشان لشکرِ جرار کو منظّم کیا اور کنٹرول کیا اور اسے مادی و معنوی آلات و ادوات سے مسلّح کیا۔

اور وہ۔ مشاہدے کے مطابق۔ لشکر کے تمام افراد کو اپنے پختہ قوانین، اساسی دساتیر اور نفوذ کر جانے والے اوامر کے ذریعے۔ ان کے حسبِ درجات۔ اُن کو کچھ اس انداز سے تعلیم دیتا ہے، اور ان کے دلوں کی اس طرح سے تربیت کرتا ہے،

ان کی رُوحوں کو اس طرح تسخیر کرتا، ان کے وجدان کی اس طرح تطہیر کرتا، ان کے اعضاء و جوارح کو استعمال کرتا اور اُن سے خدمت لیتا ہے کہ وہ لشکرِ جرار دنیا و آخرت کو فتح کر سکتا ہے۔

اب اگر اِسے بشر کا کلام فرض کر لیا جائے تو پھر یہ لازم آئے گا کہ یہ ایک - حاشا وکلا - خود ساختہ، بے سہارا، درماندہ، غیر اہم اور بے اصل کلام ہے! یعنی ہمیں سو محالات قبول کرنا پڑیں گے۔

اس پر مزید یہ کہ ایک ایسے معزز انسان کا فرض کرنا لازم آتا ہے جو اپنے انداز سے عالم کو ولولہ آشنا کرنے والے شئون و احوال کی بنا پر تمام نوعِ بشر کے لیے بلکہ تمام کائنات کے لیے واقعتاً فخر کا دار و مدار ہو، جو اپنے سنجیدہ افعال کے ذریعے بنی آدم کو حق کے قوانین کا درس دیتا ہے۔ اور اپنے پختہ افعال کے ساتھ نوعِ بشر کو حقیقت کے دساتیر کی تعلیم دیتا ہے۔ جو اپنی تمام سوانح حیات کی گواہی کے مطابق اپنی مدتِ حیات میں اپنے خالص معقول اقوال کے ساتھ سعادت و استقامت کے اصول کا اظہار کرتا رہا اور ان کی بنیادیں استوار کرتا رہا، اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرتا رہا ہو اور ساڑھے تیرہ سو سال کمال شان و شکوہ کے ساتھ نوعِ بشر کے پانچویں حصے کی اور نصف کرۂ ارض کی قیادت کرتا رہا ہو۔۔۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے تو پھر یہ لازم آئے گا کہ وہ نہ تو اللہ سے ڈرتا، نہ اسے پہنچانتا ہے، نہ جھوٹ سے بچتا ہے اور نہ اپنی عزت کی پہچان رکھتا ہے۔۔۔ اور یہ فرض کر لینے سے ایک ہی مرتبہ ناممکن و محال کے سو درجوں کا اِرتکاب کرنا پڑے گا؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے کی درمیانی منزل کوئی نہیں؛ کیونکہ اگر قرآن بفرضِ محال اللہ کا کلام نہ ہو اور عرش کی بلندی سے گر جائے تو درمیان میں نہیں رہے گا، بلکہ یہ لازم ہے کہ اسے اس حیثیت سے قبول کیا جائے کہ یہ زمین میں سب سے بڑے کذاب کا مال ہے۔

اور یہ چیز اے شیطان! اگر تُو اپنی شیطنت میں سو درجے بھی بڑھ جائے، تو بھی اپنے حربوں سے کسی صحیح سالم عقل کو دھوکہ نہیں دے سکتا اور قلبِ مستقیم کو مطمئن نہیں کر سکتا!

تب شیطان نے دوبارہ کہا: دھوکہ کیوں نہیں دے سکتا؟ جبکہ میں بہت سے لوگوں کو اور مشہور اہلِ عقل کو دھوکہ دے چکا ہوں، اور انہیں "قرآن اور محمد ﷺ" کے انکار پر آمادہ کر چکا ہوں۔

الجواب: اوّلاً: بہت زیادہ فاصلے سے دیکھا جائے تو بڑی سے بڑی چیز بھی چھوٹی سے چھوٹی نظر آئے گی، حتیٰ کہ ستارے کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ "لالٹین" ہے۔

ثانیاً: تقلیدی اور سطحی نظر سے دیکھا جائے تو ممکن ہے کہ آخری درجے کی محال چیز بھی ممکن نظر آئے چنانچہ روایت ہے کہ ایک بوڑھے آدمی نے رمضان کا چاند دیکھنے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا تو اچانک اس کی پلکوں کا ایک سفید بال اس کی آنکھ کے سامنے آ گیا، اس نے اس بال کو چاند سمجھا اور شور مچا دیا کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے!! اب یہ بات تو محال ہے کہ

وہ سفید بال چاند ہو،لیکن اس کا قصد چونکہ بالذات چاند کو دیکھنے کا ہی تھا اور وہ بال بالتبع اور ثانوی طور پر نظر آنا شروع ہو گیا تھا،اس لیے وہ محال ممکن ہو گیا۔

ثالثاً: کسی چیز کو قبول نہ کرنا اور چیز ہے اور اس کا انکار کر دینا اور چیز، چنانچہ عدم قبول کا مطلب ہے بے پرواہی، چشم پوشی اور جہالت کے ساتھ مشابہت رکھنے والا منفی فیصلہ ہے۔ اور اس صورت میں بہت سے محال اُمور پوشیدہ رہ سکتے ہیں اور اس کی عقل ان اُمور میں مصروف نہیں ہوتی۔

لیکن انکار عدمِ قبول نہیں بلکہ عدم کو قبول کر لیتا ہے، اور یہ ایک سوچ بچار والا فیصلہ ہے جس میں وہ اپنی عقل کو استعمال کرنے کے لیے مجبور ہے تب تیرے جیسا کوئی شیطان اس حالت میں اس کی عقل چھین لیتا ہے اور پھر اس کے منہ میں انکار ڈال دیتا ہے۔

پھر تُو نے اے شیطان! انسانوں کی شکلوں میں ان بد بخت حیوانات کو اپنی، ضلالت، سفسطہ، عناد، مغالطہ آفرینی، مکابرہ، تقلید، غفلت اور سینہ زوری جیسی، باطل کو حق کی صورت میں دکھانے والی اور محال کو ممکن بنانے والی دسیسہ کاریوں کے ساتھ بہت سے محالات کو جنم دینے والے کفر و انکار پر آمادہ کر دیا ہے۔

رابعاً: پھر قرآن کو اگر بشر کا کلام فرض کر لیا جائے تو یہ بھی لازم آتا ہے کہ کسی ایسی کتاب کا تصور کیا جائے جو مشاہدے کے مطابق عالمِ انسانیت کے آسمان پر ستاروں جیسے چمکنے والے اَقطاب و صدیقین و اصفیاء کی رہنمائی کرے، اور اہلِ کمال کے تمام طبقات کو۔ بالبداہت۔ ہمیشہ حق و حقانیت، صدق و صداقت اور امن و امان کی تعلیم دے اور ارکانِ ایمان کے حقائق اور اسلامی ارکان کے دساتیر کے ذریعے سعادتِ دارین کی گارنٹی دے اور یہ چیز بالضرورت لازم آتی ہے کہ وہ اپنے ان کارناموں کے پیشِ نظر خالص حق، خالص حقیقت، آخری حد تک سچی اور غایت درجے کی سنجیدہ کتاب ہو۔۔ اگر ایسا فرض کر لیا جائے تو اس طرح کی کتاب کے بارے میں یہ تصوّر کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ اس کا دامن ایسی صفات سے بھرا پڑا ہے جو اُس کے ان اوصاف و انوار و تاثیرات کے بالکل برعکس ہیں۔ اور اُسے اِس نظر سے دیکھنا لازم آئے گا کہ یہ۔ حاشا و کلّا۔ دروغ بافیوں اور افترا پردازیوں کا پلندہ ہے اور یہ ایک ایسا گھناؤنا کفری ہذیان ہے جس سے سوفسطائی بھی بلکہ شیاطین بھی کانپتے اور منہ چھپاتے ہیں۔

مزید یہ کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے تو پھر ایک ایسے انسان کو فرض کرنا لازم ہو جاتا ہے جو اپنے لائے ہوئے دین اور اپنی ظاہر کردہ شریعت کی شہادت کے مطابق، اپنی صاف اور خالص عبودیت کے اور اپنے اُس غیر معمولی تقوے کی دلالت کے مطابق جس کا اظہار اُس نے بالاتفاق اپنی مدتِ حیات میں کیا ہے، اور اپنے ان اَخلاقِ حسنہ کے تقاضے کی رُو سے جن کا مشاہدہ بالاتفاق اُس میں کیا گیا ہے اور جن کی تصدیق تمام اہلِ حقیقت نے اور اُس کے تربیت یافتہ انسانوں نے کی ہے

ان سب چیزوں کے مطابق وہ ایک صادق، امین، صاحبِ ایمان اور راسخ العقیدہ انسان ہے۔۔۔ ایسا فرض کر لینے سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے انسان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ ایک بے عقیدہ اور غیر مومن اور نا قابلِ بھروسا انسان تھا جسے نہ خدا کا خوف تھا اور نہ وہ جھوٹ بولنے سے ہچکچاتا تھا۔۔۔ لاکھ بار حاشا وکلا! اور اس طرح محالات کی ایسی صورت کا ارتکاب لازم آتا ہے جو زیادہ قبیح، گھناؤنی اور مکروہ ہے، اور ایسی گمراہی کا اِرتکاب بھی لازم آتا ہے جس میں زیادہ ظلم ہے اور جو زیادہ سخت تاریکیوں پر مشتمل ہے!

الحاصل:

جس طرح عوام الناس جو صرف سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ: قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ جو- جہاں تک میں نے سنا ہے- دنیا میں پائی جانے والی تمام کتابوں میں سے کسی کتاب کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی ہے اور ان میں سے کوئی بھی کتاب اس کے درجے میں نہیں ہے۔

قرآن کریم یا تو ان تمام کتابوں سے نیچے ہے، اور یا پھر ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

پہلی شِق یعنی اس کا سب کتابوں سے نیچے ہونا جہاں ایک محال اَمر ہے وہاں یہ بات دشمن بھی- حتیٰ کہ خود شیطان بھی نہیں کہہ سکتا- اور نہیں مان سکتا اس لیے کہ قرآن اِن سب کتابوں سے اُوپر ہے، اور نتیجہ یہ نکلا کہ یہ معجزہ ہے، جیسے کہ انیسویں مکتوب کے اٹھارہویں اشارے میں ذکر کیا گیا ہے۔

بعینہٖ اسی طرح ہم بھی اُصول فقہ اور علمِ منطق کی ''السّبر والتقسیم'' (حاشیہ) جیسی قطعی حُجت کی روشنی میں کہتے ہیں:

اے شیطان اور شیطان کے شاگردو!

قرآنِ کریم! اللہ کا عرشِ اعظم یا اسمِ اعظم سے نازل ہونے والا کلام ہے، اور یا پھر حاشا وکلا ثم حاشا وکلا لاکھ بار حاشا وکلا! یہ زمین میں رہنے والے کسی ایسے شخص کی افترا پردازی ہے جس کا نہ تو کوئی عقیدہ تھا، نہ اُسے خدا کا خوف تھا اور نہ ہی اُسے خدا کی پہچان تھی! اور یہ بات تُو اے شیطان! سابقہ دلیلوں کے مقابلے میں نہیں کہہ سکا ہے، اور کبھی کہہ بھی نہیں سکے گا! تو اِس سے پتا چلا کہ قرآن بہر طور اور بے شک وشُبہ خالقِ کائنات کا کلام ہے؛ کیونکہ اس کا درمیان نہیں ہے؛ اور اس لیے بھی کہ یہ محال اور غیر ممکن ہے۔ جیسے کہ ہم نے قطعی صورت میں ثابت کیا ہے، اور آپ نے خود دیکھ سُن بھی لیا ہے۔

اسی طرح محمد عربی ﷺ یا تو اللہ کے رسول ہیں، تمام رسولوں میں سے کامل ترین ہیں اور تمام مخلوقات سے افضل

(حاشیہ) کسی حکم کی علت جب نص یا اجماع سے ثابت نہ ہو سکے تو مجتہد ان تمام اَوصاف کو اکٹھا کرے گا جو اس حکم کی علت بن سکتے ہیں۔ پھر اُن میں غور فکر کرے گا۔ یہ ''سبر'' ہے۔ اور غور فکر کرنے کے بعد ان میں کانٹ چھانٹ کرتا جائے گا۔ یہ تقسیم ہے تا آنکہ آخر میں صرف وہی ایک وصف رہ جائے گا جس میں علت بننے کی صلاحیت ہوگی۔ مترجم۔

ہیں۔۔۔اور یا پھر یہ فرض کر لینا لازم ہے کہ وہ۔ہزار بار حاشا وکلا۔ایسے انسان ہیں جس کا اللہ پر بھی اعتقاد نہیں، اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، اللہ پر جھوٹ باندھتا رہا، اللہ کی مطلق پہچان نہیں رکھتا تھا اور نہ اللہ کے عذاب سے ڈرتا تھا۔ اور ایسا کرتا ہوا اسفل سافلین میں جا گرا!!!! (حاشیہ)

اور یہ بات اے ابلیس! تُو بھی نہیں کہہ سکتا اور تیرے یورپ کے فلاسفر اور ایشیا کے فلاسفر بھی نہیں کہہ سکتے جن کے بل پر تو پھولا نہیں سما رہا ہے۔ اور وہ کبھی کہہ بھی نہیں سکیں گے؛ کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی بھی نہیں ہے جو تجھ سے یہ بات سُن لے اور اسے آنکھیں بند کر کے اُس کی تصدیق بھی کرے اور اسے قبول بھی کر لے!

اِسی بنا پر بدترین فلاسفہ اور بدترین قسم کے بے ضمیر اور بد ذوق قسم کے منافقین بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ محمد عربی ﷺ بہت زیادہ عقل مند اور بہترین اخلاق کے مالک تھے۔

پس اگر یہ مسئلہ صرف دو شقوں پر ہی مشتمل ہے، اور دوسری شق قطعی طور پر محال ہے اور اس کا کوئی دعوے دار بھی نہیں ہے۔ اور ہم یہ بات قطعی دلائل کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ اس مسئلے کا کوئی درمیان بھی نہیں ہے؛ تو پھر یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ محمد عربی ﷺ شیطان اور حزب الشیطان کے علی الرغم بالضرورت اللہ کے رسول ہیں۔ اور بالبداہت اور بحق الیقین تمام رسولوں سے زیادہ کامل اور تمام مخلوقات سے زیادہ افضل ہیں۔

عَلَیْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ
بِعَدَدِ الْمَلَكِ وَالْإِنْسِ وَالْجَانِّ

☆ ☆ ☆

شیطان کا دوسرا چھوٹا سا اعتراض

ایک دفعہ سورۂ ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ﴾ پڑھتے وقت جب میں ان آیات پر پہنچا: ﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ ذٰلِكَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِیْدٌ لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ وَقَالَ قَرِیْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ اَلْقِیَا فِیْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِیْدٍ﴾؛

تو شیطان نے کہا:

(حاشیہ) تعبیر کے یہ انداز میں نے مجبور ہو کر اختیار کیے ہیں، اور میں لکھتے وقت تھر تھر کانپ رہا ہوں۔ فرضِ محال کی یہ صورت اختیار کرتے وقت میرے پیشِ نظر ایک تو یہ چیز ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اہلِ ضلالت کی سوچ فکر کلیتاً محال ہے، دوسرے یہ چیز واضح کرنا مقصود ہے کہ ان کے کافرانہ افکار سرے سے باطل ہیں۔ اس ضمن میں میرا تمام تر بھروسا اُس انداز پر ہے جو قرآن کریم نے کافروں کی کفریات اور غلیظ تعبیرات کا ابطال کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ مؤلف۔

آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی فصاحت کا اہم ترین پہلو اس کی سلاست و وضاحت میں ہے، حالانکہ ان آیات میں تو وہ کہاں سے کہاں تک منتقل ہوتا چلا جارہا ہے؛ چنانچہ وہ سکراتِ موت سے چھلانگ لگا کر قیامت تک جا پہنچتا ہے، اور نفخ صور سے منتقل ہو کر محاسبے کے اختتام تک جا پہنچتا ہے اور وہاں سے جہنم میں گرا دینے کی بات شروع کر دیتا ہے۔۔۔ سوال یہ ہے کہ اتنے عجیب وغریب انتقالات میں کون سی سلاست اور روانی باقی رہ جاتی ہے؟ اور قرآن کا یہ عام اُسلوب ہے کہ وہ اکثر جگہوں پر ان جیسے ایک دوسرے سے دور کے اور لاتعلق مسائل کو اکٹھا کر دیتا ہے؛ تو ایسے میں اس طرح کی غیر مناسب صورتِ حال میں سلاست وفصاحت کہاں رہ جاتی ہے؟

الجواب: بلاغت کے بعد قرآن کے اِعجاز کی اہم ترین بنیاد ''ایجاز'' ہے، ایجاز قرآن کے اعجاز کی ایک محکم ترین اور اہم ترین بنیاد ہے۔ اور یہ معجزانہ ایجاز قرآن حکیم میں اتنی کثرت سے پایا جاتا ہے اور اتنا لطیف ہے کہ اہلِ تدقیق اس کے سامنے حیرت میں گم کھڑے ہیں!

مثال کے طور پر: اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾

چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں اُس طوفان کے عظیم الشان حادثے کے بارے میں اور اس کے نتائج کے بارے میں خبر دے رہا ہے اور اس کی ایسے معجزانہ ایجاز کے ساتھ وضاحت کررہا ہے کہ بہت سے اہلِ بلاغت اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

اسی طرح مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا﴾

قومِ ثمود کے اہم اور عجیب وغریب حادثات اُن حادثات کے نتائج اور ان کے بُرے انجام کے متعلق بتاتا ہے۔ اور یہ بیان چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں، معجزانہ ایجاز کے ساتھ اور اتنے سلیس اور واضح انداز کے ساتھ ہے کہ بغیر کسی خلل کے سمجھ آجاتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾

اس میں ﴿اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْہِ﴾ سے لے کر ﴿فَنَادٰی فِی الظُّلُمَاتِ﴾ تک، ان کلمات میں بہت سے جملے لپٹے ہوئے ہیں، لیکن یہ غیر مذکورہ جملے فہم وتفہیم میں خلل انداز نہیں ہوتے اور سلاست کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں۔ چنانچہ یونس کے قصے کی اہم بنیادیں بیان کر دیں اور بقیہ کو عقل کے حوالے کر دیا۔

اِسی طرح سورۂ یوسف میں ﴿فَاَرْسِلُوْنِ﴾ اور ﴿یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ﴾ کے درمیان ایجاز کے ساتھ سات آٹھ جملے لپیٹ دیے ہیں؛ اوران سے قطعی طور پر نہ تو فہم وتفہیم میں خلل آتا ہے اور نہ سلاست کو نقصان پہنچتا ہے۔

اس معجزانہ ایجاز کے قرآن پاک میں بہت زیادہ اور انتہائی لطیف نمونے ملتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ ''ق'' کی آیات ہیں، ان آیات میں پایا جانے والا ''ایجاز'' بڑا عجیب وغریب اور معجزانہ حیثیت کا حامل ہے؛ کیونکہ یہ کافر کے مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہیں، وہ بڑا ہولناک اور بہت زیادہ طویل مستقبل جس کا ایک دن پچاس ہزار سال کا ہے، اوران اہم ترین اور ہولناک قسم کے اَلمناک حادثات پر ایک ایک کر کے انگلیاں رکھتی ہیں جو کافر کو مستقبل کے ہولناک انقلابات میں پیش آنے والے ہیں۔ اور یوں وہ فکر کو اِن ہیبت ناک حوادث پر بجلی کی سی رفتار میں رواں دواں رکھتا ہے اور اُس بہت زیادہ طویل زمانے کو نظر کے سامنے ایک صفحے کی طرح حاضر رکھتا ہے اور غیر مذکور حوادث کو خیال کے حوالے کرتا ہے اور انہیں بلند پایہ سلاست کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾

اب اے شیطان! تو کوئی اور بات کہنا چاہتا ہے تو کہہ ڈال۔۔۔

شیطان کہتا ہے: میں ان بیانات کا نہ تو مقابلہ کر سکتا ہوں اور نہ ان کے سامنے ٹھہر سکتا ہوں۔ البتہ بہت سے احمق ایسے موجود ہیں جو میری بات سنتے ہیں، اور انسانوں کی صورت میں بہت سے شیاطین میری اعانت کرتے ہیں، اور بہت سے فرعون قسم کے فلاسفہ مجھ سے ایسے مسائل کا درس لیتے ہیں جو اُن کے تکبر کو برانگیختہ کرتے ہیں اور تیرے اس جیسے اقوال کے سامنے سدِّ راہ بن کر انہیں پھیلنے نہیں دیتے ہیں۔ اس لیے میں تمہارے سامنے ہتھیار نہیں پھینکوں گا!

﴿سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ﴾

دوسرا مبحث

یہ مبحث اس حیرت کے پیش نظر لکھا گیا ہے جو ہمہ وقت میری خدمت میں رہنے والے لوگوں پر میرے عجیب وغریب اور متضاد اخلاق واطوار کو دیکھ کر طاری ہوتی ہے۔

اسی طرح اس حد سے بڑھے حسنِ ظن کو اعتدال میں لانے کی غرض سے لکھا گیا ہے جس کا میں حق دار نہیں ہوں اور جو میرے دوشاگرد میرے بارے میں رکھتے ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآن حکیم کے حقائق کے بعض کمالات کو ان وسائل ووسائط کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے جو ان حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور یہ بہت بڑی غلطی ہے؛ کیونکہ مصدر ومأخذ کی قُدسیّت کچھ ایسی تأثیر چھوڑتی ہے جو بہت سی براہین سے کہیں زیادہ قوی ہوتی ہے۔

عوامُ الناس کی اکثریت کو صرف اِسی قدسیّت کی وجہ سے احکام کا پابند کیا جاتا ہے۔

لیکن جب داعی، رہنما یا وکیل اپنے وجود کو نمایاں کرے، یعنی لوگ جب حقائق کی بجائے اُس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو پھر اس مأخذ میں پائی جانے والی قُدسی تأثیر غائب ہو جائے گی۔ اسی راز کو سامنے رکھ کر میں اپنے اُن بھائیوں کے لیے ایک حقیقت کی وضاحت کرتا ہوں جو میری طرف میری حد سے بڑھ کر بہت زیادہ توجہ کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ:

کسی بھی انسان کے لیے متعدّد شخصیات کا حامل ہونا ممکن ہے۔ اور یہ متعدد شخصیات مختلف قسم کے اخلاق کا اظہار کرتی ہیں، مثال کے طور پر:

ایک بڑے افسر کی ایک شخصیت تو وہ ہے جب وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا ہو، اس وقت اس کی شخصیت عزت ووقار کا تقاضا کرتی ہے اور اس کے لیے ایسے طور اطوار لازم ہو جاتے ہیں جو اُس کے اس معزز مقام کی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ بطور مثال وہاں بیٹھ کر ہر ملاقاتی کے لیے تواضع اور تذلّل کا اِظہار کرنا اس مقام کو گرانے کے مترادف ہوگا۔

لیکن اس کی شخصیت گھر میں اس مقام کے برعکس کچھ اور قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتی ہے، چنانچہ وہ جتنی زیادہ تواضع کا اظہار کرے گا اتنا ہی اچھا ہوگا، اور اگر وقار کا تھوڑا سا بھی اظہار کرے گا تو وہ تکبّر ہوگا!۔۔۔

تو پتا چلا کہ کسی بھی انسان کی ایک شخصیت وہ ہے جو اس کی ملازمت اور ذمہ داری کے حساب سے ہوتی ہے، اور وہ بہت سے نقاط میں اس کی حقیقی شخصیت کے خلاف ہوتی ہے۔ پس اگر وہ ملازم حقیقت میں اُس ملازمت کے قابل ہو اور اس کے لیے مکمل طور پر تیار ہو تو یہ دونوں شخصیتیں باہمِ دگر قریب ہوں گی، لیکن اگر وہ اس ملازمت کے لائق نہ ہو، جیسے مثال کے طور پر ایک عام سپاہی کو فیلڈ مارشل کے عہدے پر بٹھا دیا جائے تو یہ دو شخصیتیں ایک دوسرے سے دُور دُور ہوں گی؛

کیونکہ ایک عام سپاہی کے چھوٹے موٹے عام اور معمولی خصائل اِن اَخلاقِ واطوار کے ساتھ مَیل نہیں کھاتے ہیں جن کا تقاضا فیلڈ مارشل کا مقام ومرتبہ کرتا ہے۔

اسی طرح یہ سمجھو کہ تمہارے اس فقیر بھائی میں بھی تین شخصیات پائی جاتی ہیں، اور ان میں سے ہر شخصیت ایک دوسرے سے بہت زیادہ دُور ہے۔

پہلی: ایک وقتی اور عارضی شخصیت ہے جو خصوصی طور پر صرف قرآن کی خالص خدمت کے لیے وقف ہے، اس حیثیت سے میں قرآنِ حکیم کے بیش قیمت خزینوں کی نشاندہی کرنے والا ہوں۔ یہ شخصیت ایسے بہت سے بلند پایہ اخلاق کا اظہار کرتی ہے جن کا تقاضا قرآن کی طرف دعوت دینے اور رہنمائی کرنے کا منصب کرتا ہے۔ پس یہ اخلاق میرے ذاتی نہیں ہیں اور نہ میں ان کا مالک ہوں، بلکہ یہ وہ خوبیاں ہیں جن کا تقاضا یہ مقامِ بلند اور یہ وظیفۂ عالیہ کرتا ہے۔ اس لیے اس نوع کے جو اخلاق تم لوگوں کو مجھ میں نظر آتے ہیں وہ میرے نہیں ہیں۔ اس لیے مجھے ان کی روشنی میں مت دیکھو؛ کیونکہ وہ اس مقام ومنصب کے ہیں۔

دُوسری شخصیت:

یہ شخصیت مجھے حق سبحانہ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اس وقت عطا ہوتی ہے جب میں پرستش کے وقت بارگاہِ خداوندی کی طرف متوجہ ہو کر روتا گڑگڑاتا ہوں۔ یہ شخصیت کچھ اثرات چھوڑتی ہے، یہ اثرات ان نقاط سے جنم لیتے ہیں جو عبودیّت کے معنی کے لیے بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور وہ بنیادیں یہ ہیں کہ انسان اپنی کمی کوتاہی کی پہچان کر لے، اپنے عجز وفقر کا ادراک کر لے اور بارگاہِ خداوندی میں ذلت وانکساری کے ساتھ پناہ ڈھونڈے اور میں خود کو اس شخصیت کی رُو سے سب سے زیادہ بد بخت، عاجز، فقیر اور کوتاہ سمجھتا ہوں۔ چنانچہ اگر تمام دنیا میری مدح سرائی کرے اور میری تعریف میں مگن رہے تو مجھے اس بارے میں مطمئن نہیں کر سکے گی کہ میں کوئی فاضل یا صاحبِ کمال آدمی ہوں۔

تیسری شخصیت:

میری حقیقی شخصیت ہے، مطلب یہ کہ میری ایک ایسی شخصیت ہے جو ''قدیم سعید'' کی باقیات میں سے ہے۔ اور وہ ''قدیم سعید'' سے وراثت میں ملی ہوئی کچھ رگیں ہیں۔ جن کی وجہ سے اُس میں کبھی ریاکاری اور حُبِّ جاہ کا میلان پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں حسب ونسب کے لحاظ سے بھی کسی بڑے خاندان کا چشم وچراغ نہیں ہوں، اس لیے اس میں کنجوسی کی حد تک کفایت شعاری کے ساتھ ساتھ بہت سے پست اور کمینہ اخلاق بھی نظر آتے ہیں۔

پس اے میرے بھائیو!

میں اپنی اس شخصیت کے حالات زیادہ کھول کر نہیں بتاتا اور اس کی پوشیدہ برائیوں کو بَر ملا نہیں کہتا تاکہ آپ لوگ

کہیں مجھ سے کُلی طور پر نفرت نہ کھا جائیں۔

میرے بھائیو!

میری یہ شخصیت اَخلاقِ عالیہ سے اور ان آثار و مظاہر سے بہت دور ہے جو دعوت و تبلیغ و عبودیت کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں مجھ میں پائے جاتے ہیں؛ کیونکہ اس مقام و مرتبے کے نہ تو میں قابل ہوں اور نہ ہی مجھ میں اتنی استعداد ہے۔ بس اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح اپنے رحم و کرم سے:

دادِ حق را قابلیت شرط نیست (حاشیہ)

والے قاعدے کے تحت مجھ میں اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے اور وہ میری اس شخصیت کو قرآنی اسرار و رموز کو واشگاف کرنے کی خدمت کے لیے ایک چھوٹے سے سپاہی کی حیثیت سے استعمال کر رہا ہے، وہ خدمت جو کہ فیلڈ مارشل کے بلند درجے کی حیثیت رکھتی ہے

پس اس کا لاکھوں بار شکر ہے

کیونکہ نفس سب سے اُدنی ہے اور ذمہ داری سب سے اَعلیٰ ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ

(حاشیہ) مولانا روم کے شعر کا ایک مصرعہ۔۔۔ مکمل شعر اس طرح ہے:

چارۂ آں دل عطائے مبدل ست | دادِ حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت دادِ اُوست | دادِ لُبّ و قابلیت ہست پوست

مثنوی: دفتر پنجم۔ مترجم۔

تیسرا مبحث

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَ اُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾

یعنی: لِتَعَارَفُوْا مُنَاسَبَاتِ الْحَيَاةِ الْاِجْتِمَاعِيَّةِ فَتَعَاوَنُوْا عَلَيْهَا لَا لِتَنَاكَرُوْا فَتَخَاصَمُوْا

یعنی: اے لوگو!

میں نے تمہیں گروہوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں اس لیے پیدا کیا کہ تم آپس میں سماجی زندگی کے تعلقات کی پہچان کر کے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو؛ نہ اس لیے کہ تم ایک دوسرے سے ناواقف بن کر رہو اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہو!

یہ مبحث سات مسائل پر مشتمل ہے۔

پہلا مسئلہ: یہ آیتِ کریمہ جس عالی شان حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے میں اُس حقیقت قرآنِ عظیم الشان کی خدمت کے مقصد کے پیشِ نظر اور ظالمانہ حملوں کے آگے دفاعی بند باندھنے کی نیت سے، سماجی زندگی سے کنارہ کش ہو جانے والے ''جدید سعید'' کی زبان سے نہیں بلکہ اسلام کی اجتماعی زندگی کے ساتھ مناسبت رکھنے والے ''قدیم سعید'' کی زبان سے لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں؛ کیونکہ اس حقیقت کا تعلق سماجی اور معاشرتی زندگی کے ساتھ ہے۔

دوسرا مسئلہ: تعارف و تعاون کے جس دستور کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے اس کی وضاحت میں ہم کہتے ہیں:

ایک لشکر کو بریگیڈوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، بریگیڈوں کو ڈویژنوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ڈویژنوں کو دستوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور دستوں کو پھر کمپنیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور کمپنیوں کو مزید چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، تاکہ ہر فرد کے مختلف اور متعدد تعلقات کی پہچان ہو جائے اور ان تعلقات کی روشنی میں ہر فرد کی ذمہ داریوں کا علم ہو جائے، اور تاکہ لشکر کے تمام سپاہی تعاون کے دستور کے تحت اپنی حقیقی عمومی ڈیوٹی ادا کرے اور ان کی اجتماعی زندگی دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تفریق و انقسام اس لیے نہیں ہوتی ہے کہ ایک دستہ دوسرے دستے سے ٹکرا جائے اور ایک کمپنی دوسری کمپنی سے لڑنا بھڑنا شروع کر دے اور ایک ڈویژن دوسری ڈویژن کے خلاف سرگرمِ عمل ہو جائے۔

بعینہٖ اسی طرح اسلامی معاشرہ بھی ایک بہت بڑا لشکر ہے جو گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم ہے۔ لیکن اس معاشرے کی وحدت کے لحاظ سے ایک ہزار ایک جہت ہے؛ چنانچہ ان کا خالق ایک ہے، ان کا رازق ایک ہے، ان کا نبی ایک ہے، ان کا

قبلہ ایک ہے، ان کی کتاب ایک ہے اور اُن کا وطن ایک ہے۔۔۔ اور یوں وحدت کی ہزاروں جہتیں بن جاتی ہیں، اور یہ وحدتیں اخوت، محبت اور وحدت کا تقاضا کرتی ہیں۔

تو اس سے پتا چلا کہ قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم ہونا صرف تعارف اور تعاون کے لیے ہے نہ کہ تناکُر وتخاصُم کے لیے، جیسے کہ اس آیت نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا۔

تیسرا مسئلہ: قو کے کے مسئلے نے اس دور میں کافی سر اُٹھایا ہوا ہے، اور خاص کر یورپ کے ظالم سازشی لوگ مسلمانوں کے درمیان اس سوچ فکر کو منفی انداز سے ہوا دے رہے ہیں تا کہ ان کے درمیان تفرقہ ڈال کر انہیں آسانی سے نِگل سکیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ قو کے کی سوچ فکر چونکہ ایک نفسیاتی ذوق، غافل کُن لذت اور منحوس قوّت ہے، اس لیے اس دور میں سماجی زندگی کے دلدادگان کو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ: قو کے کے نظریے سے دستبردار ہو جاؤ!

لیکن قو کے کا نظریہ دو قسم کا ہے:

ایک قسم سلبی، منفی، منحوس اور نقصان دہ ہے۔ یہ قومیت دوسروں کو نگل کر پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے، اپنے علاوہ سب کے ساتھ دشمنی رکھ کر دوام حاصل کرتی ہے اور بڑے محتاط رویّے کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترتی ہے۔ یہ باہمی دشمنی اور اختلاف کا سبب بنتی ہے۔ اِسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے حدیث شریف میں کچھ اِس طرح فرمایا ہے:

"اَلْاِسْلَامُ یَجُبُّ مَا کَانَ قَبْلَهُ" (حاشیہ) اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَکِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَهُمْ کَلِمَةَ التَّقْوٰی وَکَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَکَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا﴾

یہ حدیث شریف اور یہ آیت کریمہ منفی قسم کی نسلی اور قومی سوچ فکر قطعی طور پر قبول نہیں کرتی؛ کیونکہ اسلام کی مقدّس مُثبت حمیت اس چیز کی ضرورت باقی نہیں چھوڑتی ہے۔

جی ہاں؛ دنیا میں وہ کون سی جنس یا نسل ہے جس کی تعداد ساڑھے تین سوملین ہے اور اسلام کے بجائے کون سی ایسی قومی فکر ہے جو اپنے ماننے والے کو اس تعداد میں ہمیشہ رہنے والا بھائی چارہ مہیا کر سکے؟

جی ہاں؛ تاریخ میں اس منفی قومیت کے بہت سے نقصانات سامنے آئے ہیں، مثال کے طور پر:

اُمویوں نے قو کے کے نظریے کو اپنی سیاست کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا اور اس طرح انہوں نے عالمِ اسلام کو غیظ و غضب میں مبتلا کر دیا تھا، اور خود اُنہیں بھی بہت سی مُہلک آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

(حاشیہ) "اَلْاِسلام یجب۔۔۔ ما کان قبله" "اسلام اپنے سے پہلے والے ہر عقیدے اور رواج وغیرہ کو کاٹ پھینکتا ہے" مسند احمد 66/4 305,304 مترجم۔

اسی طرح یورپی اقوام نے اِس دور میں اس نسلی سوچ فکر کو بہت آگے بڑھایا ہے، جس کے نتیجے میں عالمی جنگ کے ہولناک واقعات نے نوعِ بشر کو منفی قومیت کے ہاتھوں لاحق ہونے والے نقصانات کو برملا ثابت کر دیا ہے۔ اور جرمنی اور فرانس کے درمیان جنم لینے والی منحوس ابدی دشمنی اس پر مستزاد ہے۔

اب یہی صورتِ حال ہمارے اندر پیدا ہوگئی ہے، چنانچہ عہدِ حریّت کے آغاز میں پناہ گزینوں کی ''کلبوں'' کے نام پر مختلف قوم پرستوں کی منفی قومیت کی نیت سے بہت سی تنظیمیں تشکیل پا گئیں جو دلوں میں جدائیاں ڈالنے کا سبب بن گئیں، جن میں روی اور ارمنی سرفہرست ہیں۔ اور یہ بالکل ویسے ہی ہوا جیسے کہ '' ں بابل'' کے انہدام کے وقت اقوام اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں اور اس بنا پر فرقوں میں بٹ گئی تھیں جسے اضطرابِ اقوام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اُن میں سے بکھر جانے والے لوگ جواب تک اغیار کا لقمہ بن کر رہ گئے ہیں، ان کے حالات بتاتے ہیں کہ منفی قو کے کے نتائج اور نقصانات کتنے بھیانک ہیں!

اور اب ان دنوں قو کے کے اس نظریے کی وجہ سے اسلام کے خاندانوں اور قبیلوں کے مابین باہمی دشمنی اور منافرت یقیناً اتنی بڑی مصیبت ہے کہ بیان سے باہر ہے؛ حالانکہ یہ خاندان اور قبیلے غیروں کے ظلم وستم کا شکار ہونے اور ان کے زیرِ دست ومحکوم ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے زیادہ محتاج ہیں، ایک دوسرے سے زیادہ پست اور ذلیل ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھ کر فقیر اور ضرورت مند ہیں۔ اس لیے ان کی آپس کی دشمنی اس آدمی کے پاگل پن کے مشابہ ہے جو مچھروں سے بچاؤ کے لیے تو بہت زیادہ اہتمام کرے لیکن خطرناک زہریلے سانپوں سے پہلو تہی کرتا رہے؛

کیونکہ یورپ جو کہ بڑے بڑے اژدھوں کا حکم رکھتا ہے، ان لوگوں کو نگلنے کے لیے اپنا منہ کھولے ہوئے ہے اور اپنی سیر نہ ہونے والی حرص وآز کے پنجے کھولے بیٹھا ہے، اور یہ لوگ نہ صرف یہ کہ ان کا کوئی بندوبست نہیں کر رہے ہیں لیکن معنوی طور پر اس کا تعاون بھی کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ''مشرقی ریاستوں'' (حاشیہ) میں رہنے والے اپنے ہم وطنوں اور ''جنوب'' میں رہنے والے اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں اور ان کے مقابلے میں منفی نسلی نظریات کا پرچار کرتے ہیں؛ اور یہ چیز بلاشبہ بہت زیادہ مہلک اور نقصان دہ ہے! حالانکہ ''جنوب'' کے رہنے والے افراد دشمن نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ کیا جائے، بلکہ جنوب کی سمت سے تو اسلام کی روشنی آتی ہے اور قرآن کا نور آیا ہے، جو وہاں بھی موجود ہے اور ہمارے درمیان بھی، بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔

(حاشیہ) یاد رہے کہ مکۃ مکرمہ ترکی کے جنوب میں واقع ہے، جیسے ہمارے ہاں پاک وہند میں مغرب کی سمت منہ کرنے سے مراد قبلہ ہوتا ہے، اسی طرح ترکی میں جنوب کی طرف منہ کرنے سے مراد قبلہ رُخ ہوتا ہے۔ اس لیے جنوب سے مراد سرزمین حجاز لی جائے گی۔ اور مشرق سے مراد ترکی ہی کے مشرقی علاقے دیار بکر، تصیبتن، ماردین، بتلیس، وان، تھوان، بیزان، اخلاط اور سرت وغیرہ ہیں جن میں اکثریتی آبادی کردوں کی ہے۔ استاد نورسی بتلیس کے ضلع ہیزان کے ایک چھوٹے سے گاؤں نورس میں پیدا ہوئے۔ مترجم۔

پس اِن دینی بھائیوں کے ساتھ دشمنی رکھنے کا نقصان اسلام کو ہے اور اسلام کو نقصان پہنچنے سے قرآن کو نقصان پہنچے گا۔ اور اسلام اور قرآن کے ساتھ دشمنی رکھنا ایک قسم کی ان تمام اہلِ وطن کی دنیاوی اور اُخروی زندگی کے ساتھ دشمنی ہے۔

اس لیے غیرت و حمیّت کے نام پر سماجی زندگی کی خدمت کی نیّت سے ان دونوں زندگیوں کے بنیادی ارکان کو منہدم کر دینا حماقت ہے نہ کہ حمیت۔

چوتھا مسئلہ: ایجابی یا مُثبت قومیت اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی داخلی ضرورت سے پھوٹتی اور پروان چڑھتی ہے، اور یہ باہمی تعاون و تساند کا سبب بنتی ہے، نفع بخش قوّت کی ضمانت دیتی ہے اور اسلامی اخوت کے لیے بہت زیادہ تائید کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

قو کے کے اِس مُثبت نظریے کے لیے ضروری ہے کہ یہ اسلام کی خدمت کرے اور اس کے لیے ایک محفوظ قلعے کا اور اس کے اِردگرد ایک مضبوط فصیل اور شہرِ پناہ کا کام دے نہ یہ کہ خود اس کی جگہ پر براجمان ہو جائے اور اس کا قائم مقام بن جائے؛ کیونکہ جو اخوت اسلام عطا کرتا ہے اس کے دامن میں ایک ہزار اخوت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ اخوت عالمِ بقاء اور عالمِ برزخ میں باقی رہتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قومی اخوت - خواہ کتنی بھی مضبوط کیوں نہ ہو - اسلامی اخوت کے آگے ایک پردہ بن جاتی ہے۔ اس قومی اخوت کو اسلام کا قائم مقام بنا دینا ایسا احمقانہ جرم ہے جیسے قلعے کے اندرون والے ہیروں کے خزانے میں پتھر رکھ دیے جائیں اور ان ہیروں کو اُٹھا کر قلعے سے باہر پھینک دیا جائے!

پس اے قرآن کو ماننے والے میرے ابنائے وطن!

تم نے چھ سال سے نہیں بلکہ ایک ہزار سال سے یعنی عباسی دورِ خلافت سے تمام جہان والوں کو چیلنج کیا اور قرآن کا جھنڈا بلند کر کے اس کا پرچار کیا اور تم نے اپنی قومیت کو قرآن اور اسلام کا محفوظ قلعہ بنایا اور تمام عالم کو لاجواب کر دیا۔ حتی کہ تم آیاتِ کریمہ: ﴿يَـأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کا خوبصورت مصداق بن گئے۔

اس لیے اب بچنا، مُحتاط رہنا اور یورپ کی اور افرنگ زدہ منافقوں کی چال بازیوں، سازشوں اور دسیسہ کاریوں کے پیچھے نہ لگنا، وگرنہ اس آیت کے پہلے حصّے کے مصداق بن جاؤ گے۔ (حاشیہ)

ایک قابلِ توجہ صورتِ حال:

ترکی قوم تعداد میں اسلام کے ساتھ تعلق رکھنے والی دیگر اقوام سے زیادہ ہے، اور اتراک دنیا کے تمام علاقوں میں

(حاشیہ) آیت کا پہلا حصہ یہ ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ---﴾ مترجم۔

جہاں بھی پائے جاتے ہیں مسلمان ہیں، یعنی یہ دیگر اقوام کی طرح مسلم اور غیر مسلم میں تقسیم نہیں ہیں، چنانچہ ترکوں کا کوئی گروہ جہاں بھی پایا جائے گا مسلمان ہوگا، جبکہ دوسری اقوام میں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اور جو اتراک اسلام سے نکلے ہیں یا مسلمان ہوئے ہی نہیں، وہ ترکیت'' سے بھی نکل گئے ہیں جیسے کہ 'ہمنگرین'' ہیں۔ جبکہ دیگر چھوٹی چھوٹی اقوام میں بھی مسلمان اور غیر مسلم کی تقسیم موجود ہے۔

اس لیے اے میرے ترک بھائی!

ہوشیار و خبردار! کیونکہ تیری قومیت اسلامیت میں اس قدر رچ بس گئی ہے کہ اس سے جدا نہیں ہو سکتی اگر تو اِسے اُس سے جدا کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا اور تیرے وہ گزشتہ تمام قابلِ فخر کارنامے بھی ختم ہو جائیں گے جو اسلام کے کھاتے میں لکھے جا چکے ہیں۔ یہ قابلِ فخر کارنامے کسی بھی زمینی قوت کے ذریعے نہیں مٹائے جا سکتے ہیں، اس لیے تو انہیں اپنے دل سے شیاطین کے وسوسوں اور ان کی دسیسہ کاریوں کے ذریعے مٹانے کے درپے نہ ہو۔

پانچواں مسئلہ: ایشیا کی بیدار ہونے والی قومیں تو کے کے مسئلے کو اپنا رہی ہیں اور اس ضمن میں وہ ہر جہت سے عین بعین یورپ کی تقلید کر رہی ہیں، اس حد تک کہ اس راہ میں وہ اپنی مقدسات تک کو قربان کرتی چلی جا رہی ہیں۔

جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہر قوم کی ایک قیمت ہے اور اُس کی قیمت کا قد و قامت ایک علیحدہ لباس کا تقاضا کرتا ہے، حتیٰ کہ کپڑا اگر چہ ایک ہی جنس کا ہو تو بھی نوعیت اور تراش خراش اور ڈیزائن میں اختلاف لازمی ہے، چنانچہ کسی عورت کو سپاہی کا لباس نہیں پہنایا جاتا اور کسی عمر رسیدہ عالمِ دین کو آوارہ عورت کا لباس نہیں پہنایا جاتا۔

اس لیے اندھی تقلید عام طور پر جگ ہنسائی کا سبب بھی بن جاتی ہے؛ کیونکہ:

اوّلاً: یورپ اگر ایک دوکان اور فوجی چھاؤنی ہے تو ایشیا ایک کھیتی اور جامع مسجد کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دوکاندار تو کبھی تھیٹر دیکھنے کے لیے چلا جاتا ہے لیکن کسان نہیں۔ اسی طرح جامع مسجد اور فوجی چھاؤنی کی اہمیت ایک سی نہیں۔

اسی طرح اکثر انبیاء کا ظہور ایشیا میں اور اغلب حکماء وفلاسفہ کے یورپ میں وارد ہونے میں تقدیرِ ازلی کی یہ رمز اور یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ ایشیا کی اقوام کو بیدار کرنے، انہیں ترقی کی راہ پر لگانے اور اُن کی تدبیر و ادارت کرنے کی ذمہ داری دین اور دل پر ہے۔ رہے فلسفہ وحکمت، تو ان کا کام دین و دل کا تعاون کرنا ہے ان کی جگہ لینا نہیں۔

ثانیاً: دینِ اسلام کو عیسائیت پر قیاس کرنا اور یورپ کی طرح دین سے بے نیاز ہو جانا بہت بڑی غلطی ہے؛ کیونکہ یورپ اپنے دین کا مالک ہے اور اسے سینے سے لگائے ہوئے ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یورپ کے اکابرین جن میں ''ولسن''، ''لوئڈ جارج'' اور ''وینز لاس'' سرفہرست ہیں، اپنے دین کے بارے میں اُسی طرح متعصب ہیں جیسے پوپ متعصب ہے۔

یہ چیز اس بات کی گواہ ہے کہ یورپ اپنے دین کا مالک ہے، بلکہ اس کے لیے متعصب ہے۔

ثالثاً: اسلام کو عیسائیت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اور یہ قیاس باطل ہے؛ کیونکہ یورپ جب اپنے دین کے بارے میں متعصب تھا متمدّن نہیں تھا، پھر اس نے تعصّب چھوڑا تو متمدّن ہو گیا۔

پھر یہ بھی ہے کہ دین نے اُن کے درمیان تین سو سال تک داخلی جنگ برپا کیے رکھی، اور ظالم حکّام نے عوام الناس، فقراء اور اہلِ فکر لوگوں کو ظلم کی چکی میں پیسنے کے لیے دین کو وسیلہ بنایا، جس کی وجہ سے عوام الناس کے دلوں میں دین کے خلاف غصے کی لہر دوڑ گئی۔

لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، تو تاریخ گواہ ہے کہ وہ ایک دفعہ کے علاوہ داخلی جنگ وجدال کا سبب نہیں بنا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی دین کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھا، اس دور کی بہ نسبت ترقی کی معراج پر پہنچے، اور اس حقیقت کی سب سے بڑی گواہ اندلس کی اسلامی حکومت ہے جو کہ یورپ کی سب سے بڑی استاد ہے۔ لیکن مسلمانوں نے جب اپنے دین سے بے پرواہی برتی، تب وہ پیچھے رہ گئے اور قعرِ مذلت میں جا گرے۔

پھر یہ بھی ہے کہ اسلام ہمیشہ فقراء کا اور اہلِ علم کا ملجاو ماویٰ رہا ہے، اور وہ اس طرح کہ اسلام زکوٰۃ کو فرض کر کے اور سود کو حرام کر کے اور اس طرح کے دیگر ہزاروں شفقت بھرے مسائل کے ذریعے فقراء کی، عوام الناس کی، اور اہلِ علم کی حفاظت کرتا ہے، اور اپنے ﴿اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ... اَفَلَا يَتَفَكَّرُوْنَ ... اور اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ﴾ جیسے کلمات کے ذریعے عقل اور علم کو گواہ بناتا ہے، انہیں بیدار کرتا ہے اور اہلِ علم کی حفاظت کرتا ہے۔ اس لیے اسلام کے خلاف غصّے ناراضگی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام اور عیسائیت سمیت دیگر ادیان میں بنیادی فرق اور اس فرق میں پائی جانے والی حکمت میں راز یہ ہے کہ:

اسلام کی بنیاد خالص توحید پر ہے۔ چنانچہ اسلام حقیقی تاثیر کی نسبت اسباب و وسائط کی طرف نہیں کرتا ہے اور خلق و ایجاد کی حیثیت سے انہیں کوئی قیمت نہیں دیتا ہے۔

لیکن عیسائیت چونکہ ولدیّت کا نظریہ قبول کر چکی ہے، اس لیے اسباب و وسائط کو بڑی قیمت اور اہمیت دیتی ہے۔ اور ایسا کر کے وہ تکبّر کو توڑتی نہیں بلکہ احبار و رُہبان کی طرف ربوبیتِ الٰہیہ کا ایک بڑا حصہ منسوب کر دیتی ہے۔ اور اس طرح یہ احبار و رُہبان اللہ تعالیٰ کے فرمانِ گرامی ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کا مصداق بن گئے۔

یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں میں دنیاوی لحاظ سے اعلیٰ مراتب پر فائز ہو جانے والے لوگ متکبر اور مغرور رہتے ہوئے دین داری میں متعصب ہوتے ہیں، جیسے امریکا کا سابق صدر ''وِلسن''، لیکن اسلام میں جو کہ خالص توحید کا دین ہے، اس

میں اس طرح کا دنیاوی منصب دار آدمی یا تو کبر وغرور سے دستبردار ہو جاتا ہے، اور یا پھر کسی حد تک دینداری کو خیر باد کہہ دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے میں کچھ لوگ تو دین کے معاملے میں بے عملی اور لاپرواہی کی زندگی گزارتے ہیں، اور کچھ بالکل ملحد اور بے دین بن جاتے ہیں۔

چھٹا مسئلہ: منفی قوم کے اور نسل پرستی کے نظریے میں انتہا پسندی سے کام لینے والوں کو ہم کہتے ہیں:

اولاً: اس دنیا کی سطح اور خاص کر ہمارے یہ علاقے قدیم زمانے سے ہی بہت زیادہ ہجرتوں کی زد میں رہے ہیں، اور بہت سی اقوام پتنگوں کی طرح اسی سرزمین کے اردگرد گھومتی رہی ہیں۔ اور پھر جب یہ خطہ اسلامی حکومت کا مرکز بن گیا تو انہوں نے خود کو یہیں گرا دیا اور اسے اپنا وطن بنا لیا۔ اب ان حالات میں ان آپس میں گھل مل جانے والی قوموں اور نسلوں کے حقیقی عناصر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ لوحِ محفوظ کو کھول کر اس میں دیکھا جائے!

اس سے پتا چلتا ہے کہ حقیقی نسل پرستی کے نظریے کی بنیاد پر کسی منصوبے کی یا کسی جمعیت کی عمارت استوار کرنا بے معنی بھی ہے اور بہت زیادہ نقصان دہ بھی۔ اسی بنا پر ہمارا ایک سیکولر قسم کا قوم پرست اور نسل پرست لیڈر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ:

"دین اور زبان ایک ہوں تو قوم ایک ہی ہے"

بات جب ایسے ہی ہے تو پھر حقیقی قومیت یا نسلیت کی طرف نہیں دیکھا جائے گا بلکہ زبان، دین اور وطن کی یکسانیت کو دیکھا جائے گا۔ یہ تینوں جب ایک ہوں تو ان تینوں کا مجموعہ بذاتِ خود مضبوط قوم ہے، اور اگر اُن میں سے کوئی ایک چیز کم ہو گئی تو وہ بھی قومیت کے دائرے میں ہی رہے گی۔

ثانیاً: ہم یہاں بطورِ مثال ان سینکڑوں فوائد میں سے صرف دو فائدوں کا ذکر کریں گے جو مقدس اسلامی حمیّت نے اس وطن کے سپوتوں کی سماجی زندگی کے لیے حاصل کیے ہیں:

پہلا: اس اسلامی ملک کا کہ جس کی آبادی دو سے تین کروڑ تک تھی، یورپ کے تمام بڑے بڑے ملکوں کے مقابلے میں جس چیز نے تحفظ کیا وہ اس ملک کی فوج کا قرآن کی روشنی میں پروان چڑھنے والا یہ اعتقاد تھا کہ: "اگر میں مر جاؤں تو شہید اگر مار دوں تو غازی"۔ چنانچہ ہر سپاہی نے اس یقین کے تحت والہانہ ذوق وشوق اور عشق ومحبت کے ساتھ آگے بڑھ کر ہنستے مسکراتے ہوئے موت کا استقبال کیا اور یورپ کو ہمیشہ لرزہ براندام رکھا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا میں ایسی کون سی چیز پیش کی جا سکتی ہے جو سادہ لوح، سادہ سوچ اور صاف دل لوگوں کی روحوں میں اس طرح کی فداکاری اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا کر دے؟ وہ کون سی حمیّت ہے جو اس کے قائم مقام ہو سکتی ہے اور انہیں بطیبِ خاطر اپنی زندگی اور اپنی دنیا فدا کر دینے پر آمادہ کر سکتی ہے؟

دُوسرا: یورپ کے اژدھوں نے اور اس کے طاقتور بڑے ملکوں نے جب بھی اسلامی مملکت پر ضرب کاری لگائی ہے تو اس سے ساڑھے تین کروڑ مسلمان آبدیدہ ہوئے اور مہر و محبت کے جذبات سے بھر گئے۔ اسلامی دنیا کی تشویش سے ان سامراجی طاقتوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنے اُٹھے ہوئے ہاتھ کھینچ لیے اور انہیں تکلیف دینے سے باز رہے تاکہ کہیں تمام مسلمانوں کے جذبات بے قابو نہ ہو جائیں!

میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی دیگر ایسی قوت ہے جو اس عظیمُ القدر روائی معنوی اور غالب رہنے والی قوت کی جگہ لے سکے تو اسے پیش کیا جائے!

جی ہاں؛ اس عظیمُ الشان معنوی قوت کو منفی قوم پرستی اور دین سے بے نیاز حمیّت کے ذریعے ناراض نہیں کرنا چاہیے!

ساتواں مسئلہ: ہم ان لوگوں سے جو منفی قومیت کے ضمن میں غیرت و حمیّت کا مظاہرہ کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ:

تم لوگ اگر واقعتاً اس قوم سے محبت رکھتے ہو اور اس پر ترس کھاتے ہو تو پھر ایسی حمیت کی طرف بلاؤ جو اس اُمت کی اکثریت کے لیے مہر و محبت سے بھرپور ہو، وگرنہ چند غفلت خوردہ لوگوں کی عارضی اجتماعی زندگی کی خدمت کے لیے ـ جنہیں شفقت اور مہر و محبت کی چنداں ضرورت بھی نہیں ـ کچھ اِس طرح سے سرگرمِ عمل ہو جانا جس سے اِکثریت ظلم و جبر کا شکار ہے؛ کسی بھی طرح حمیّت نہیں کہلائی جا سکتی ہے۔

کیونکہ منفی نسل پرستی کے جذبے کے تحت پروان چڑھی ہوئی حمیّت آٹھ میں سے دو آدمیوں کو وقتی فائدہ تو دے سکتی ہے اور وہ اس حمیّت کی شفقت سے بہرہ وَر ہو سکتے ہیں جس کے وہ قابل ہی نہیں ہیں، لیکن ان آٹھ میں سے چھ لوگ یا تو بوڑھے ہوں گے، یا بیمار، یا مصیبت زدہ، یا بچے، یا انتہائی کمزور، اور یا پھر آخرت کے بارے میں سوچتے رہنے والے متقی پرہیزگار ہوں گے۔۔۔ اور یہ لوگ دنیاوی زندگی کے مقابلے میں برزخی اور اُخروی زندگی کی طرف زیادہ متوجہ رہنے کی وجہ سے نور، شفقت اور تسلّی کے طلب گار ہیں اور حمیّت اور شفقت بھرے بابرکت ہاتھوں کے محتاج ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کون سی غیرت و حمیّت ہے جو اِن لوگوں کی اُمید کی روشنی کو بجھانے اور ان کی تسلّی کے سامان کو برباد کرنے کے درپے ہے؟ اس میں قوم کے لیے شفقت اور مہر و محبت کہاں ہے؟ قوم کے لیے سرفروشی کا جذبہ کہاں ہیں؟

رحمتِ الٰہیہ کی رحمت سے نا اُمید ہونے کی کوئی وجہ نہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِن ہم وطنوں سے ایک ہزار سال سے قرآن کی خدمت لی ہے اور انہیں اِس کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے متعین کر دیا ہے۔ اس لیے ہم پُر امید ہیں کہ وہ اُن سے اِس پُر حشمت لشکر کو اور عظیمُ الشان جماعت کو وقتی اور عارضی قسم کی رُکاوٹوں کی وجہ سے پراگندہ نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ نئے سرے سے اس نور کو تابناک بنائے گا اور ان کی اس مقدس ذمہ داری کو دوام بخشے گا۔ ان شاء اللہ۔

چوتھا مبحث: تنبیہ: جیسے چھبیسویں مکتوب کے چاروں مبحثوں کے درمیان کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی، اسی طرح اس

چوتھے مبحث میں بیان کردہ دس مسائل کے درمیان بھی کوئی مناسبت نہیں ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی مناسبت تلاش نہ کی جائے؛ کیونکہ یہ مسائل بعینہٖ اُسی طرح قلم بند کر دیے گئے ہیں جیسے وارد ہوئے ہیں۔ یہ مسائل اُس کے اس خط کا ایک جزء ہیں جو اُس کے ایک اہم شاگرد نے اُس کی طرف لکھا تھا اور اس شاگرد کے پانچ چھ سوالوں کے جوابات ہیں۔

پہلا مسئلہ:

ثانیاً: آپ اپنے خط میں کہتے ہیں کہ مفسرین نے ﴿رَبُّ الْعَالَمِیْن﴾ کی تفسیر و تعبیر میں کہا ہے کہ یہ اٹھارہ ہزار عالم ہیں؛ ہمارا سوال یہ ہے کہ اس تعداد میں کون سی حکمت پائی جاتی ہے؟

میرے بھائی! میں اب اس تعداد کی حکمت تو نہیں جانتا، البتہ اس مقام پر یہ کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ:

قرآنِ حکیم کے جملے صرف متعدد معانی میں ہی منحصر نہیں ہیں، بلکہ قرآن کریم چونکہ نوعِ بشر کے عمومی طبقات سے خطاب کرتا ہے، اس لیے ایک ایسی کُلّی کا حکم رکھتا ہے جو ہر طبقے کے لیے متعدد معانی پر مشتمل ہے۔ اور جو معانی بیان ہو چکے ہیں وہ اس قاعدۂ کلیہ کی جزئیات کا حکم رکھتے ہیں چنانچہ ہر مفسّر اور ہر عارف اس کلّی کی کسی ایک جزئی کا ذکر کر دیتا ہے اور اس میں وہ اپنے کشف کا، اپنی دلیل کا یا اپنے مشرب کا سہارا لیتا ہے اور اس طرح کسی نہ کسی معنی کو ترجیح دے دیتا ہے۔

اس آیت میں بھی ایک گروہ نے کسی ایسے معنی کا انکشاف کیا ہے جو اس عدد کے مطابق ہے۔ مثال کے طور پر: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ﴾

کے جملے میں کہ جس کا ذکر اکثر اہلِ ولایت کرتے ہیں اور اپنے اوراد و اذکار میں جسے بڑے اہتمام کے ساتھ دہراتے ہیں؛ اسی معنی و مفہوم کے دائرۂ الوجوب اور دائرۂ الامکان میں بحرِ ربوبیت اور بحرِ عبودیت سے لے کر دنیا و آخرت کے دو سمندروں، عالمِ غیب اور عالمِ شہادت کے دو سمندروں، مشرق و مغرب، جنوب و شمال میں پائے جانے والے بحرہائے محیط تک، بحرِ روم اور بحرِ فارس تک بحرِ اَبیض اور بحرِ اَسود اور ان دونوں کی اس تنگنائے تک جہاں سے ''مرجان'' نامی مچھلی نکلتی ہے، اور بحرِ اَبیض، بحرِ احمر اور نہرِ سویز تک، اور میٹھے اور کھارے سمندروں تک، اور میٹھے اور طبقۂ تراب کے نیچے متفرق پانی کے سمندروں تک، اور میٹھے اور اس طبقۂ تراب کے اُوپر متصل سمندروں تک، دجلہ، فرات اور نیل جیسے بڑے بڑے دریاؤں تک۔ جن کو چھوٹے چھوٹے میٹھے سمندر کہا جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ مخلوط ہونے والے بڑے بڑے نمکین دریاؤں تک۔۔۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ تمام معانی مراد اور مقصود ہیں، اور اُسی آیت کے حقیقی اور مجازی معانی میں سے ہیں۔

اِسی طرح ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کا جملہ بھی بہت سے حقائق پر مشتمل ہے؛ بنابریں اہلِ کشف و حقیقت نے ان حقائق کو اپنے اپنے کشف کے حساب سے مختلف معانی میں بیان کیا ہے۔

اور میری سمجھ میں اس آیت سے یہ بات آتی ہے کہ:

آسمانوں میں ہزاروں عوالم ہیں، بعض ستارے ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا ایک مستقل عالم ہونا ممکن ہے۔ زمین میں پائی جانے والی مخلوقات کی ہر جنس بھی ایک عالم ہے حتی کہ ہر انسان بھی عالمِ صغیر ہے۔ پس ﴿رَبُّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کی تعبیر کا معنی یہ ہے کہ: ہر عالم کی بغیر کسی واسطے کے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ذریعے اِدارت ہوتی ہے، منصوبہ سازی کی جاتی ہے، اس کی نشو ونما ہوتی ہے اور اُسے پروان چڑھایا جاتا ہے۔

ثالثاً: رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے "اِذَا اَرَادَاللّٰهُ بِقَوْمٍ خَيْرًا اَبْصَرَهُمْ بِعُيُوْبِ اَنْفُسِهِمْ" (حاشیہ)

قرآن حکیم میں حضرت یوسفؑ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾

جی ہاں؛ جو شخص کبر و ناز اور خود بینی کا شکار ہو جائے اور خود پر اعتماد کرنا شروع کر دے وہ بد بخت ہے۔ اور جس نے اپنے عیب دیکھ لیے وہ سعادت مند ہے، اس لیے آپ سعادت مند ہیں۔

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نفسِ امّارہ، نفسِ لوّامہ یا نفسِ مطمئنہ میں منقلب ہو جاتا ہے لیکن اپنا اسلحہ اور دیگر آلات و اعضاء اعصاب کے حوالے کر دیتا ہے، تب رگیں اور اعصاب تمام عمر یہ ذمہ داری نبھاتے رہتے ہیں۔ اور یوں نفسِ امّارہ کے آثار نظر آتے رہتے ہیں، حالانکہ وہ عرصۂ دراز سے مر چکے ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے عظیم الشان اصفیاء اور اَولیاء نفسِ اَمارہ کا شکوہ کرتے رہے ہیں، حالانکہ وہ نفسِ مطمئنہ کے مالک تھے۔ اور وہ امراضِ قلب کے خلاف مدد مانگتے رہے اور فریاد کرتے رہے ہیں، حالانکہ وہ انتہائی درجے کے صحیح سالم اور روشن دل کے مالک تھے! اس لیے یاد رکھیں جو کچھ ان فضلاء میں پایا جاتا ہے وہ نفسِ امارہ نہیں ہے بلکہ وہ نفس کا وہ وظیفہ جو اعصاب کو سونپ دیا گیا اور جہاں تک مرض کا تعلق ہے تو وہ قلبی نہیں بلکہ خیالی ہے۔

اس لیے برادرِ عزیز! جو چیز آپ پر حملہ آور ہو رہی ہے وہ ان شاء اللہ تیرا نفس اور تیرے دل کے امراض نہیں ہیں، بلکہ جیسے کہ ہم نے ذکر کیا ایک حالت ہے جو بشری تقاضے کے تحت مجاہدے کو آخری عمر تک برقرار رکھنے کے لیے اَعصاب کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اور یہی حالت دائمی ترقیوں کا سبب بنتی ہے۔

دوسرا مسئلہ:

وہ تین مسئلے جن کے بارے میں ایک کہنہ مشق عالم دین نے پوچھا ہے، اُن کی وضاحتیں چونکہ رسائلِ نور میں جا بجا ہو چکی ہیں، اس لیے اِس مقام پر اُن کے بارے میں اِجمالی سے اِشارے پر اِکتفا کیا جاتا ہے۔

پہلا سوال: محی الدین ابن عربیؒ نے اپنے خط میں امام رازیؒ سے کہا ہے: ''اللہ کی معرفت اُس کے وجود کی معرفت

(حاشیہ) اس مفہوم کی بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے: "اِذَا اَرَادَاللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا فَقَّهَهُ فِی الدِّيْنِ وَزَهَّدَهُ فِی الدُّنْيَا وَبَصَّرَهُ بِعُيُوْبِهِ"

سے علیحدہ کوئی اور چیز ہے"۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

اوّلاً: بائیسویں مقالے کے مقدمے میں توحیدِ حقیقی اور توحیدِ ظاہری کے درمیان فرق بتاتے ہوئے جو مثال اور تمثیل سے کام لیا گیا ہے اور جسے آپ پڑھ چکے ہیں، مقصد برآری کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح بتیسویں مقالے کے مقاصد اور اس کا دوسرا اور تیسرا موقف اس مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔

ثانیاً: عقائد اور واجبُ الوجود کے وجود اور اس کی توحید کے بارے میں ائمۂ اصولِ دین اور علمائے علم الکلام نے جو کچھ لکھا ہے وہ محی الدین ابن عربیؒ کے نزدیک کافی نہیں، اسی لیے انہوں نے امام رازی کو- جو کہ علم الکلام کے ائمہ میں سے ہیں- ایسے کہا۔

جی ہاں؛ علم الکلام کے ذریعے سے حاصل کی گئی معرفتِ الٰہیہ کامل معرفت اور کامل حضوری پیدا نہیں کرتی ہے۔ لیکن یہی چیز قرآنِ معجز بیان کے اسلوب کے ذریعے حاصل کی جائے تو معرفتِ تامہ اور کامل ترین حضورِ قلب عطا کر دیتی ہے۔۔۔ ان شاء اللہ رسائلِ نور کے تمام اجزاء بھی قرآن معجز بیان کے اس روشنی سے جگمگاتے راستے میں بجلی کے چراغوں کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

پھر وہ معرفت جو امام رازیؒ نے علمُ الکلام کے ذریعے حاصل کی ہے، کیسی بھی نظر کیوں نہ آئے وہ ابن عربیؒ کے نزدیک بہر کیف ناقص ہی ہے۔ اسی طرح تصوف کے ذریعے حاصل ہونے والی معرفت اُس معرفت کے مقابلے میں اَز بس ناقص ہے جو انبیاء کے وارث براہِ راست قرآن حکیم سے حاصل کرتے ہیں؛ کیونکہ محی الدین ابن عربیؒ کا مسلک یہاں تک جا پہنچا کہ وہ دائمی حضورِ قلب کے حصول کے لیے کائنات کے وجود کا انکار کر گئے اور کہہ اُٹھے: لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا هُوَ ۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی دائمی حضوری کو حاصل کرنے کی خاطر ایک عجیب انداز اختیار کیا ہے، چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ: "لَا مَشْهُوْدَ اِلَّا هُوَ" اور اس طرح انہوں نے کائنات کو مُطلق نسیان میں محصور کر دیا۔

لیکن قرآن حکیم سے حاصل ہونے والی معرفت دائمی حضوری کو جنم دیتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ کائنات کو معدوم بھی نہیں کہتی ہے اور اسے نسیانِ مطلق کے کھاتے میں بھی نہیں ڈالتی ہے۔ بلکہ اسے بدنظمی اور لاقانونیت سے نکال کر اللہ کے نام پر استعمال کرتی ہے۔ اور یوں ایک بیدار چشم شخص کی نظر میں ہر چیز معرفت کا آئینہ بن جاتی ہے اور صانع کی معرفت کا ایک نیا دروازہ کھول دیتی ہے۔ جیسے کہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے:

در نظرِ ہوشیار ہر ورقے
دفتریست از معرفت کردگار

"ہوشیار آدمی کی نظر میں ہر پتا خالقِ کائنات کی معرفت کا ایک رجسٹر ہے"

ہم نے بعض مقالات میں علم الکلام کے علماء کے مسلک اور قرآن کریم سے کشید کردہ حقیقی منہاج کے درمیان فرق کو تمثیل سے واضح کیا ہے، اور وہ اس طرح کہ:

کچھ لوگ پانی کے لیے پہاڑ کے نیچے گڑھا کھودتے ہیں اور پھر پائپوں کے ذریعے دور سے پانی کھینچ کر لاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ کنواں کھودتے ہیں اور ہر جگہ سے پانی نکال لیتے ہیں۔

پہلے طریقے سے پانی مہیا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، چنانچہ یہ راستے میں کہیں بند بھی ہو جاتا ہے اور منقطع بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن کنواں کھود کر پانی نکالنے والے کسی مشقت کا سامنا کیے بغیر ہر جگہ پانی پا لیتے ہیں۔

بعینہٖ اسی طرح ماہرینِ علم الکلام دور اور تسلسل کی وجہ سے کائنات کی انتہا پر اسباب کا سلسلہ منقطع کر دیتے ہیں اور پھر اس کے ذریعے واجب الوجود کے وجود کا اثبات کرتے ہیں، اور یوں ایک لمبے راستے میں چلتے رہتے ہیں۔ لیکن قرآنِ حکیم کا حقیقی منہج ہر جگہ پر پانی پا لیتا ہے اور اُسے برآمد کر لیتا ہے۔ اور قرآن کی ہر آیت عصائے موسیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، جہاں بھی ضرب لگائے گی وہیں سے آبِ حیات برآمد کر دے گی، اور ہر شے کو مندرجہ ذیل دستور پڑھا دے گی۔

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ
تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ

پھر یہ بھی ہے کہ ایمان صرف علم سے حاصل نہیں ہوتا ہے؛ کیونکہ ایمان میں بہت سے لطائف کے حصے ہیں، چنانچہ جس طرح جب کھانا معدے میں داخل ہوتا ہے تو مختلف صورتوں میں مختلف پٹھوں میں تقسیم ہوتا اور بٹ جاتا ہے، اسی طرح علم کے ذریعے عقل کی طرف وارد ہونے والے ایمانی مسائل جب عقل کے معدے میں داخل ہو جاتے ہیں تو روح و قلب وسرّ ونفس اور ان جیسے دیگر تمام لطائف ان مسائل سے اپنا اپنا حصہ لیتے ہیں اور اپنے اپنے درجات کے حساب سے انہیں چوس لیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ لطائف اپنا مناسب حصہ نہ پائیں تو ایمان ناقص رہ جاتا ہے۔

پس ابن عربیؒ امام رازیؒ کی توجہ اسی نقطے کی طرف مبذول کرا رہے ہیں۔

تیسرا مسئلہ: آیتِ کریمہ: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ﴾ اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ میں مطابقت کی کیا صورت ہے؟

الجواب: گیارہویں اور تیسویں مقالے میں، اور چوبیسویں مقالے کی پانچویں شاخ کے دوسرے پھل میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ اس میں پائے جانے والے راز کا اجمالی طور پر بیان یہ ہے کہ:

جنابِ حق اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ ایک چیز سے بہت سی اشیاء کو پیدا فرماتے ہیں، اور ایک چیز کے ساتھ بہت سے کام سرانجام دیتے ہیں اور ایک صفحے میں ایک ہزار کتاب لکھ دیتے ہیں۔

اسی طرح اُس نے انسان کو ایک ایسی نوع کی صورت میں پیدا کیا ہے جو بہت سی انواع کا مجموعہ ہے، یعنی یہ بہت سی انواع کا بدل بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کا ارادہ یہ ہوا کہ وہ نوعِ انسان کے ذریعے وہ تمام کام سرانجام دے جو حیوانات کی تمام اَنواع و اقسام کے لیے مختلف درجات میں سرانجام دیے جاتے ہیں۔ اسی لیے اس نے انسان کی قوتوں کو اور اس کے احساسات کو فطری طور پر محدود نہیں کیا اور انہیں کسی فطری قید و بند میں پابند نہیں کیا اور انہیں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس دوسرے حیوانات کی قوتیں اور ان کے احساسات محدود اور فطری قید کے ماتحت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی قوّتوں میں سے ہر قوت غیر متناہی جانب میں ایسے چلتی جاتی ہے جیسے کسی غیر محدود مسافت میں جولانیاں کر رہی ہو؛ کیونکہ انسان خالقِ کائنات کے اسمائے حسنیٰ کی غیر متناہی تجلیات کا آئینہ ہے، اس لیے اس کی قوتوں کو لاانتہا قسم کی استعداد سے نواز دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر: اگر انسان کو تمام دنیا بھی دے دی جائے تو بھی حرص کی وجہ سے کہے گا: "هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ؟" اسی طرح وہ اپنی خود پسندی کی وجہ سے اپنی ذاتی مصلحت کی خاطر ہزاروں انسانوں کو نقصان پہنچانا قبول کر لیتا ہے! اسی طرح برے اخلاق میں بھی اُس کے سامنے غیر محدود درجات کا انکشاف ہوتا ہے، وہ نمرودوں اور فرعونوں کے درجے تک جا پہنچتا ہے اور ظلم میں اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ اُس کے لیے عام لفظ ظالم نہیں بلکہ مبالغہ کا صیغہ ''ظلوم'' استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یہ اچھے اخلاق میں غیر محدود ترقیوں کا مظہر بن جاتا ہے اور انبیاءؑ و صدیقینؒ کے درجات تک ترقی کر جاتا ہے۔

اِسی طرح انسان غیر محدود اشیاء کے مقابلے میں جاہل ہے، اس کے برعکس حیوان جب دنیا میں آتا ہے تو تھوڑی سی چیزوں کا محتاج ہوتا ہے، اور جتنی چیزوں کا محتاج ہوتا ہے ان کے بارے میں مہینے دو مہینے میں بلکہ ایک دو دن میں معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ بلکہ کبھی تو اپنی زندگی کے تمام لوازم ایک دو گھنٹوں میں سیکھ لیتا ہے، گویا کہ وہ کسی اور دنیا میں مکمل ہو کر آیا ہے۔ لیکن انسان مشکل سے اپنے قدموں پر سال دو سال میں کھڑا ہوتا ہے اور نفع و نقصان میں فرق پندرہ سال کی عمر میں پاتا ہے۔ پس مبالغے کا صیغہ ''جھول'' اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

چوتھا مسئلہ:

آپ لوگ "جَدِّدُوْا اِيْمَانَكُمْ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" (حاشیہ)

کی حکمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

اس کی حکمت بہت سے مقالات میں ذکر ہو چکی ہے۔ اس میں پائی جانے والی حکمت کا ایک راز یہ ہے کہ انسان کی اپنی شخصیت اور اس کا جہاں؛ دونوں ہی ہر زمان جدید ہوتے رہتے ہیں، اس لیے وہ ہر زماں ایمان کی تجدید کا محتاج رہتا

(حاشیہ) جَدِّدُوْا اِيْمَانَكُمْ قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ كَيْفَ نُجَدِّدُ اِيْمَانَنَا؟ قَالَ: اَكْثِرُوْا مِنْ قَوْلِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (احمد، حاکم، نسائی عن ابی ھریرۃ بسند حسن)

ہے؛ کیونکہ ہر انسانی فرد معنوی طور پر بہت سے افراد پر مشتمل ہے۔ چنانچہ وہ اپنی عمر کے سالوں کی تعداد کے حساب سے بلکہ اپنی عمر کے دنوں کی بلکہ گھنٹوں کی تعداد کے لحاظ سے دیگر افراد شمار ہوتا ہے؛ کیونکہ وہ زمان کے تحت ہوتا ہے۔ اور یوں فردِ واحد ایک پیمانے کا حکم لے لیتا ہے اور ہر دن کسی نئے فرد کی شکل اختیار کرتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ جیسے انسان میں یہ تعدُّد اور تجدّد پایا جاتا ہے، اِسی طرح جس جہاں میں وہ رہائش رکھے ہوئے ہے وہ بھی سیار ہے، ایک حالت میں نہیں رہتا، ایک جاتا ہے تو اس کی جگہ پر دوسرا آجاتا ہے، اور ہمیشہ انواع و اقسام میں بٹتا ہے اور کسی دوسرے عالم کی جانب دروازہ کھولتا ہے۔

پس ایمان اس شخص میں پائے جانے والے ہر فرد کی زندگی کا نور ہے اور اس عالم کی روشنی ہے جس میں وہ فرد داخل ہوتا ہے۔ اور "لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ" اس نور کو کھولنے والی چابی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ نفس وہوا اور وہم وشیطان انسان میں حکم چلاتے ہیں اور اس کی غفلت سے بہت فائدہ اُٹھاتے ہیں، چنانچہ اس کے ایمان کو مجروح کرنے کی سازش کرتے ہیں اور شبہات اور وساوس کے ذریعے اس کا نورِ ایمان چھین لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ بعض ائمہ کے مطابق ایسے کلمات اور حرکات وسکنات کی کمی نہیں ہے جو شریعت کے ظاہر کے خلاف ہیں بلکہ کفر کے درجے تک پہنچا دینے کی تاثیر رکھتے ہیں۔۔۔ اس لیے ان چیزوں کے پیشِ نظر انسان ہر وقت، ہر دن اور ہر گھڑی ایمان کی تجدید کرنے کا محتاج ہے۔

سوال: متکلمین اِس جہان کو اجمالی طور پر "اِمکان وحدوث" کا لقب دیتے ہیں، چنانچہ وہ ذہنی طور پر اس پر غلبہ پا لیتے ہیں اور پھر "وحدانیت" کا اثبات کرتے ہیں۔

اور بعض اہلِ تصوّف کہتے ہیں۔

"لَا مَشْهُوْدَ اِلَّاهُوَ" اور اس طرح وہ توحید میں حضورِ تام حاصل کرنے کے لیے کائنات کو بھلا دیتے ہیں اور اُسے طاقِ نسیان پر رکھ دیتے ہیں اور اس طرح حضورِ تام سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

اور بعض ان میں سے توحیدِ حقیقی اور حضورِ تام کو پانے کے لیے کہہ دیتے ہیں:

"لَا مَوْجُوْدَ اِلَّاهُوَ"

اور کائنات کو وہم وخیال کہہ کر عدم کے گھاٹ میں پھینک دیتے ہیں اور یوں حضورِ تام سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

لیکن آپ ان تینوں مسلکوں کے خلاف چلتے ہیں اور قرآن کریم سے ایک دیگر جادۂ کبریٰ کو آشکار کرتے ہیں اور اس کا شعار یہ جملہ بناتے ہیں:

"لَا مَعْبُوْدَ اِلَّاھُوَ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا ھُوَ"؟

اس لیے آپ اس منہج سے خصوصی طور پر توحید پر دلالت کرنے والی ایک دلیل اور ایک مختصر سا راستہ مہیا کر دیں۔

الجواب: تمام مقالات اور تمام مکتوبات اس جادۂ کبریٰ کی وضاحت کرتے ہیں۔ تاہم اس مقام پر ہم آپ کی خواہش کے مطابق انتہائی اختصار کے ساتھ اس کی ایک عظیم الشان اور وسیع وطویل حجت بیان کریں گے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ:

کائنات میں پائی جانے والی ہر شے تمام اشیاء کی نسبت اپنے خالق کی طرف کرتی ہے۔ دنیا میں پایا جانے والا ہر اثر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمام آثار اُس کے مؤثر کے آثار ہیں۔ کائنات میں پایا جانے والا ہر ایجادی فعل اس بات کا اثبات کرتا ہے کہ تمام اِیجادی افعال اس کے فاعل کے اَفعال ہیں اور موجودات پر تجلّی ریز ہونے والا ہر اسم اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ تمام اسماء اُسی کے مسمّٰی کے اسماء وعناوین ہیں۔۔۔ تو گویا کہ ہر شے براہِ راست وحدانیت کی برہان ہے اور معرفتِ الٰہیہ کی طرف کھلنے والی ایک کھڑکی ہے۔

جی ہاں؛ ہر اثر- اور خاص کر جب وہ ذی حیات ہو- کائنات کا ایک چھوٹا سا نمونہ، اس جہان کی گٹھلی اور کرۂ ارض کا پھل ہے۔ پس جس نے اس چھوٹی سی مثال کو اور اس گٹھلی کو اور اس پھل کو ایجاد کیا ہے اُسی نے بہر حال تمام کائنات کو ایجاد کیا ہے؛ کیونکہ پھل کا مُوجِد اس پھل کے درخت کے موجد کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ پس ہر اثر تمام آثار کو اُس کے مؤثر کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسی طرح ہر فعل بھی تمام افعال کو اپنے فاعل کی طرف منسوب کرتا ہے؛ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فعل اُس قانونِ خلّاقیت کا ایک جزء نظر آتا ہے جو ذرے سے لے کر کہکشاؤں تک پھیلا ہوا ہے اور اتنا وسیع وعریض ہے کہ اکثر موجودات کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو اس جزوی سے ایجادی فعل کا مالک ہے ضروری ہے کہ وہ اُن تمام افعال کا فاعل ہو جو اس ''قانونِ'' کلّی کے ساتھ وابستہ ہیں جو تمام موجودات کا اِحاطہ کرنے والا ہے اور جو ذرّے سے لے کر آفتابوں تک پھیلا ہوا ہے۔

جی ہاں؛ جو ایک مکھی کو زندہ رکھتا ہے، وہی ہے جو تمام کیڑوں مکوڑوں کو اور دیگر چھوٹے موٹے جانداروں کو پیدا کرتا ہے اور کرۂ ارض کو زندگی بخشتا ہے اور جو ایک ذرے کو رومی درویش کی طرح گھماتا ہے ضروری ہے کہ وہ عین وہی ہو جو تمام موجودات کو حتی کہ سورج کو اس کے تمام سیاروں سمیت ایسے گھمائے جیسے کہ یہ ایک باہمدگر پیوستہ زنجیر ہو؛ کیونکہ موجودات میں جاری وساری یہ قانون ایک زنجیر ہے اور تمام اَفعال اُس کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے ہر اثر تمام آثار کو اپنے مؤثر کی طرف منسوب کرتا ہے اور ہر ایجادی فعل تمام افعال کی نسبت اپنے فاعل کی طرف کرتا ہے، بعینہ اسی طرح کائنات میں تجلّی ریز ہونے والا ہر اسم تمام اسماء کی نسبت اپنے مسمّٰی کی طرف

کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ یہ اسماء اس کے عنوانات ہیں؛ کیونکہ کائنات میں جلوہ بکھیرنے والے اسماء تمام کے تمام ایک دوسرے میں ایسے ہی داخل ہیں جیسے متداخل دائرے اور روشنی کے ساتھ رنگ ایک دوسرے میں داخل ہوتے ہیں۔ تمام اسماء ایک دوسرے کی اعانت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے اثر کی تکمیل کرتے اور اُسے زینت دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر: اسم گرامی ''المحی'' جب کسی چیز پر جلوہ ریز ہوگا اور اسے زندگی عطا کرے گا تو عین اُسی لمحے اسم گرامی ''الحکیم'' بھی جلوہ بکھیرے گا اور اس جاندار کے جسد کو حکمت کے ساتھ منظم کرے گا جو کہ اس جاندار کا گھونسلا ہے۔ اور عین اُسی حالت میں اسم گرامی ''الکریم'' بھی جلوہ ریز ہو جائے گا اور اس کے گھونسلے کی تزیین و آرائش کرے گا۔ اور پھر عین اُسی وقت اسمِ گرامی ''الرحیم'' کی تجلی بھی آشکار ہو جائے گی اور وہ نہایت شفقت کے ساتھ اس جسد خاکی کی حاجات وضروریات کا سامان کرے گا، پھر عین اُسی وقت اسمِ گرامی ''الرزّاق'' جلوہ فشاں ہوگا اور اس جاندار کی بقاء کے لیے جس مادی اور معنوی رزق کی ضرورت ہوگی اُسے ایسی جگہ سے اور ایسے انداز سے عطا کرے گا کہ اُس کے سان گمان بھی نہ ہوگا!! اور یوں معاملہ رواں دواں رہے گا۔۔۔

تو اس سے یہ پتا چلا کہ جس کا نام ''المُحی'' ہے۔

اسی کا نام ''الحکیم'' بھی ہے جو کائنات میں جگمگا رہا ہے۔ اور تمام مخلوقات کی انتہائی شفقت کے ساتھ پرورش کرنے والا اور انہیں پروان چڑھانے والا نام ''الرحیم'' بھی اُسی کا ہے۔ اور اسمِ گرامی ''الرزّاق'' جو تمام ذی حیات کو اپنے فضل وکرم سے رزق پہنچا رہا ہے۔ اسی کا نام اور اسی کا عنوان ہے۔۔۔

اور اسی طرح مطلب یہ ہے کہ ہر اسم، ہر فعل اور ہر اثر وحدانیت کی ایک برہان، وحدت کا طرّہ امتیاز اور احدیت کی مہر ہے جو اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ وہ تمام کلمات جنہیں موجودات کہا جاتا ہے اور جو کائنات کے صحیفوں میں اور زمانوں کی سطروں میں لکھے ہوئے ہیں، اُن کے کاتب کے قلم کے نقوش ہیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مَنْ قَالَ: "اَفْضَلُ مَا قُلْتُ اَنَا وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ قَبْلِيْ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلِّمْ

پانچواں مسئلہ:

ثانیا: اپنے خط میں آپ لوگ ایک اور بات بھی پوچھ رہے ہیں، اور وہ یہ کہ: کیا صرف ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کافی ہے؟ یعنی یہ کہ اگر کوئی اس کے ساتھ ''مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' نہ لگائے تو کیا وہ نجات پا لے گا؟

اس سوال کا جواب طویل ہے، لیکن سرِ دست ہم صرف اسی قدر کہیں گے کہ:

شہادت کے یہ دو جزء ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کا اثبات کرتے ہیں اور دونوں

ایک دوسرے کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں، ایک جزء دوسرے کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

نبی ﷺ چونکہ خاتم الأنبیا اور تمام انبیاءؑ کے وارث ہیں، اس لیے بلاشبہ وہ وصول الی اللہ کے تمام راستوں کے مقدّمے میں اور سرے پر ہیں اور حقیقت اور نجات کا کوئی راستہ آپ ﷺ کے جادۂ کبریٰ سے باہر نہیں ہے۔ اور تمام اہلِ معرفت واہلِ تحقیق کے ائمہ وپیشوا شیخ سعدیؒ کی طرح کہتے ہیں:

محالست سعدی براہ صفا
ظفر بُردن جز درپے مصطفی

اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہیں:

"كُلُّ الطُّرُقِ مَسْدُوْدٌ إِلَّا الْمِنْهَاجُ الْمُحَمَّدِيُّ"

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ جادۂ محمدیہ میں چلتے تو ہیں لیکن جانتے نہیں کہ یہ جادۂ محمدیہ ہے یا ایسا راستہ ہے جو جادۂ محمدیہ میں داخل ہوجاتا ہے۔

اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ نبی ﷺ کو تو نہیں جانتے ہوتے، لیکن جس راستے میں چل رہے ہوتے ہیں وہ جادۂ محمدیہ کا ہی ایک جزء ہوتا ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے وہ کسی مجذوبی کیفیت، استغراقی حالت گزینی اور بادیہ نشینی کی صورتِ حال میں ہونے کی وجہ سے جادۂ محمدیہ کے بارے سوچ بچار نہیں کرسکتے، اس لیے انہیں صرف "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کافی ہوجاتا ہے۔

لیکن بایں ہمہ ان معاملات میں اہم بات یہ ہے کہ:

عدمِ قبول ایک علیحدہ چیز ہے اور عدم کو قبول کرلینا علیحدہ چیز، اس لیے اس طرح کے مجذوب اور گوشہ نشین لوگ، اور وہ لوگ جنہوں نے نبی ﷺ کے بارے میں سُنا ہی نہیں، انہیں جانتے پہچانتے نہیں، ان کے بارے میں ایسے انداز سے سوچتے ہی نہیں کہ جس کے نتیجے میں اُنہیں قبول کرلیں، اور یوں اس نقطے میں جہالت کا شکار رہتے ہیں اور معرفتِ خداوندی کے ضمن میں فقط "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه" کے بارے میں ہی علم رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کو اہلِ نجات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

لیکن جن لوگوں نے نبی ﷺ کے بارے میں سُنا ہے، اور آپ ﷺ کی دعوت کے بارے میں جان لیا ہے، وہ اگر آپ ﷺ کی تصدیق نہیں کرتے تو وہ اللہ کی معرفت حاصل نہیں کرپائیں گے، اور صرف "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه" اُنہیں اُس توحید سے ہمکنار نہیں کرے گا جو نجات کا سبب ہے؛ کیونکہ یہ حالت جہالت کی وجہ سے عدمِ قبول کی حالت نہیں ہے جو کسی حد تک عذر بن سکتی ہے، بلکہ یہ انکار ہے اور عدم کو قبول کرنا ہے۔

پس جس نے محمد ﷺ کا انکار کر دیا جو کہ اپنے معجزات و آثار کی بنا پر کائنات کا فخر اور نوعِ بشر کے شرف کا دارومدار ہیں، وہ کسی قسم کے نور کا مظہر نہیں ہوگا، اور کسی بھی طرح کسی بھی جہت سے اللہ کی معرفت حاصل نہیں کرے گا۔

بہر کیف سرِ دست اتنا ہی کافی ہے۔

چھٹا مسئلہ:

ثالثاً: پہلے مبحث میں ''شیطان کے مناظرہ'' کے نام پر شیطان کے مسلک کے ساتھ تعلق رکھنے والی بعض تعبیروں میں کچھ سختی برتی گئی ہے، حالانکہ ''حاشا وکلا۔۔حاشا وکلا'' اور ''بفرضِ محال'' کے جملوں کے ذریعے ان میں کچھ میانہ روی اور نرمی کردی گئی ہے، مگر اس کے باوجود میں لرزہ براندام ہوں۔

اور وہ حصہ جو تمہیں بھیجا گیا ہے اس میں کچھ ہلکی پھلکی تبدیلیاں کی گئی ہیں، کیا تم لوگوں نے اُس کی روشنی میں اپنے نسخے کی تصحیح کرلی ہے؟ میں یہ کام آپ لوگوں کے سپرد کر رہا ہوں، اس لیے آپ ان میں سے جو تعبیر غیر ضروری سمجھیں اُسے حذف کرنے کے مجاز ہیں۔

میرے بھائی! وہ مبحث بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ زندیقوں کا اُستاد شیطان ہے، اس لیے اگر شیطان کو لاجواب نہ کیا گیا تو اس کے مقلدین مطمئن نہیں ہوں گے۔ مجھے جرأت اس چیز سے ملی کہ قرآن کریم نے کفار کا رَدّ کرنے کے لیے خود انہیں کی سخت اور ناگوار قسم کی تعبیریں ذکر کی ہیں، چنانچہ میں نے کانپتے ہوئے حزب الشیطان کی اُن احمقانہ تعبیروں کو استعمال کرلیا جنہیں وہ اپنے مسلک کے تقاضے کے تحت قبول کرنے پر مجبور ہیں، اور جنہیں وہ بوقت ضرورت اپنے مسلک کی زبان میں معنوی طور پر استعمال کریں گے اور میں نے جنہیں شیطانی مسلک کی خرابی کو کلّی طور پر آشکار کرنے کے لیے فرضِ محال کی صورت میں استعمال کیا ہے۔

لیکن ہم نے انہیں استعمال کر کے ان لوگوں کو کنویں کی تہہ میں محصور کر دیا ہے اور میدان کو اوّل سے لے کر آخر تک جیت کر قرآن کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ اور ان کی باطنی کوتاہیوں کو آشکار کر دیا ہے۔

اس فتح و نصرت کو آپ ایک مثال سے سمجھیں: فرض کریں کہ ایک بہت ہی اُونچا مینارہ ہے جس کا سرا آسمان کو چھُو رہا ہے، اس کے عین نیچے زمین کے مرکز تک ایک کنواں کھودا گیا ہے۔ اب وہاں دو گروہ اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ ایک آدمی تمام علاقوں میں تمام لوگوں کو اذان سنانا چاہتا ہے تو وہ مینارے کی چوٹی سے لے کر کنویں کی تہہ تک کہاں کھڑا ہوگا؟

ایک گروہ کہتا ہے کہ: مؤذن مینارے کی چوٹی سے اذان بلند کر رہا ہے کیونکہ ہم اس کی اذان سن رہے ہیں۔ اور وہ زندہ اور بہت بلند ہے۔ اُسے اگرچہ اُس کے اس بلند مقام میں کسی نے نہیں دیکھا ہے لیکن ہر ایک اُسے اپنے اپنے درجے کے حساب سے کسی نہ کسی مقام اور کسی نہ کسی زینے پر دیکھ رہا ہے؛ کیونکہ وہ اُوپر چڑھتا اور نیچے اُترتا ہے۔ اور اس سے پتا

چلتا ہے کہ وہ سب سے اُوپر تک چڑھتا ہے اور اس دوران میں وہ جہاں بھی ہوگا بلند مقام کا مالک ہوگا۔

اور دوسرا احمق شیطانی گروہ کہتا ہے:

ہرگز نہیں، مؤذن مینارے کے آخری سرے پر نہیں ہے، بلکہ وہ جہاں سے بھی نظر آئے بہرکیف ہوگا کنویں کہ تہہ میں ہی۔ حالانکہ کسی نے بھی اُسے کنویں کی تہہ میں قطعاً نہیں دیکھا ہے اور کبھی دیکھے گا بھی نہیں۔ البتہ ایک صورت میں اُسے وہاں دیکھا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ ایک بے ارادہ اور بے اختیار بھاری بھرکم پتھر ہو اور کنویں کی تہہ میں پڑا رہے، تب اُسے ہر کوئی دیکھ سکے گا!

اب ان دونوں گروہوں کا میدان جنگ منارے کے سرے سے لے کر کنویں کی تہہ تک کی طویل مسافت پر پھیلا ہوا ہے۔

پس جماعتِ اہلِ نور جسے "حزبُ اللہ" کہا جاتا ہے، وہ بلند نظر لوگوں کو اور جن کی نظر وہاں تک پہنچتی ہے، دکھاتے ہیں کہ مؤذن مینارے کی چوٹی پر ہے، اور کوتاہ نظر والوں کو اور جن کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچتی، دکھاتے ہیں کہ وہ عظیمُ الشان مؤذن ان لوگوں کے درجات کے حساب سے کسی نہ کسی زینے پر ہے۔ اور اس طرح ان کے لیے یہ بات ثابت کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی نشانی ہی کافی ہے کہ وہ شخص پتھر کی طرح کوئی جامد جسم نہیں ہے بلکہ ایک کامل انسان ہے، جب چاہے اُوپر جاکر اذان دیتا ہوا نظر آسکتا ہے۔

لیکن دوسرا گروہ جسے حزبُ الشیطان کہا جاتا ہے وہ کہتے ہیں کہ: یا تو تم لوگ ہر ایک کو دکھا دو کہ وہ مینارے کی چوٹی پر ہے، اور اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر اس کا مقام کنویں کی تہ میں ہے۔ اور یوں وہ پرلے درجے کی حماقت کے ساتھ اس طرح کا فیصلہ سنا دیتے ہیں، لیکن اپنی حماقت کی وجہ سے اتنی سی بات بھی نہیں جانتے کہ اُسے ہر آدمی کو مینارے کی چوٹی پر اس لیے نہیں دکھایا جاسکتا کہ ہر ایک کی نگاہ وہاں تک پہنچ نہیں سکتی! پھر یہ بھی ہے کہ وہ مغالطہ دے کر مینارے کی چوٹی کے علاوہ تمام مسافت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں!

تب ان دونوں گروہوں کے درمیان جھگڑا چکانے کے لیے ایک آدمی میدان میں نکلتا ہے اور حزبُ الشیطان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"اے منحوس جماعت! اگر اُس عظیمُ الشان منحوس مؤذن کا ٹھکانا کنویں کی تہہ میں ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ پتھر کی طرح جامد، بے جان اور بے قوت ہو اور یہ بھی لازم ہے کہ وہ مینارے یا کنویں کے کسی بھی زینے میں نظر نہ آئے لیکن تم لوگ چونکہ اسے ہر جگہ پر دیکھ رہے ہو، اس لیے وہ کسی بھی طرح جامد، بے قوت اور بے حقیقت نہیں ہوسکتا! اور مینارے کی چوٹی ہی بہرکیف اس کا ٹھکانا ہے۔ بات جب یہی ہے تو پھر اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں:

یا تو تم اُسے کنویں کی تہہ میں ٹھہرا ہوا دکھا دو؛ لیکن یہ چیز تم کسی بھی طور ثابت نہیں کر سکتے اور نہ کسی کے کانوں تک یہ آواز پہنچا سکتے ہو کہ وہ وہاں ہے۔

اور یا پھر چپ ہو جاؤ؛ کیونکہ تمہارا دفاعی میدان کنویں کی تہہ میں منحصر ہے۔ اور جہاں تک بقیہ میدان اور طویل مسافت کا تعلق ہے، تو وہ اس بابرکت گروہ کا میدان ہے؛ کیونکہ ان لوگوں نے اس شخص کو کنویں کی تہہ کے علاوہ جہاں بھی دکھا دیا، اپنے دعوے میں کامیاب ہو جائیں گے''۔

پس شیطانی مناظرے والا مبحث اس تمثیل کی طرح ''حزبُ الشیطان'' سے عرش سے لے کر فرش تک کی لمبی مسافت چھین لیتا ہے اور حزب الشیطان کو مجبور کرتا ہے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا ہے، انہیں ایسی ادنیٰ سی جگہ میں لا بٹھاتا ہے جو محال، قابلِ نفرت اور غیر معقول ہے، اور انہیں ایسے تنگ سوراخ میں گھسیڑ دیتا ہے جس میں کوئی بھی داخل نہیں ہو سکتا ہے، اور قرآن کریم کے نام سے اس تمام مسافت پر قابض ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہاری قرآن کے بارے میں کیا رائے ہے؟

تو وہ کہتے ہیں: یہ ایک لطیف ترین انسانی کتاب ہے جو اخلاقِ حسنہ کا درس دیتی ہے۔

تب ان سے کہا جاتا ہے کہ پھر تو وہ اللہ کا کلام ہوا، اور اس طرح تم لوگ اسے قبول کرنے پر مجبور ہو؛ کیونکہ تم اپنے مسلک کے مطابق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بہت اچھی ہے۔

اسی طرح جب ان سے کہا جاتا ہے کہ: تم لوگ نبی ﷺ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟

تو وہ کہتے ہیں: وہ ایک بہت زیادہ عقل منداور بہترین اخلاق کے مالک انسان ہیں تب ان سے کہا جاتا ہے: تو پھر ایمان لے آؤ؛ کیونکہ اگر وہ عقل منداور با اخلاق آدمی ہیں تو بہر صورت اللہ کے رسول ہیں؛ کیونکہ یہ خوبصورت بات جو تم کر رہے ہو تمہارے مسلک کے مطابق تمہاری حدود سے باہر ہے، تم اس طرح کی بات نہیں کر سکتے!

اور اس طرح حقیقت کی تمام جہتوں کا تمثیل کے بقیہ اشارات پر انطباق کیا جا سکتا ہے۔

تو اسی راز کی بنا پر:

یہ پہلا مبحث جن میں شیطان کے ساتھ مناظرہ کیا گیا ہے، اہلِ ایمان کو اپنا ایمان بچانے کے لیے معجزاتِ محمدیہ کی معرفت حاصل کرنے اور ایمان کے قطعی دلائل کو سیکھنے کی ضرورت نہیں باقی رہنے دیتا؛ کیونکہ ایک ادنیٰ سی علامت اور چھوٹی سی دلیل اُن کے ایمان کو بچا لیتی ہے۔

پس ہر احمدی حالت، ہر محمدی خصلت اور ہر نبوی طور طریقہ ایک ایسا معجزہ بن جاتا ہے جو ثابت کرتا ہے کہ اس کا ٹھکانہ کنویں کی تہہ میں نچلے طبقات میں نہیں بلکہ اعلیٰ علّیین میں ہے۔

ساتواں مسئلہ:

ایک مسئلہ جو عبرت کا دارومدار ہے، اور میں اسی ضمن میں قرآن کریم کی خدمت کے ساتھ تعلق رکھنے والے اکرامِ ربّانی اور حمایتِ الٰہی کو بیان کرنے کے لیے مجبور ہوں، اور یہ بیان سات علامتوں کے ساتھ ہوگا جو ان دوستوں کی معنوی قوّت کی تائید کرے گا جو شکوک وشبہات واَوہام کا شکار ہوگئے ہیں اور سستی و کسلمندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور یہ سب کچھ بیان کرنا اس لیے ضروری ہے کہ میں اپنے ان ضعیف الاعصاب دوستوں کو بچا سکوں۔

ان سات نشانیوں میں سے چار نشانیاں اُن چار لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں جو پہلے دوست تھے لیکن بعد میں دشمنوں کا رُوپ دھار گئے، لیکن ان کی دشمنی میرے ساتھ ذاتی دشمنی نہیں تھی بلکہ اس لیے تھی کہ میں قرآن کی خدمت کر رہا ہوں۔ اور انہوں نے دشمنی کا یہ لبادہ بھی صرف چند دنیاوی مقاصد کے لیے اوڑھا تھا۔ لیکن اس وجہ سے اُنہوں نے اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے کی بجائے ایک بھرپور طمانچے کا مزہ چکھا۔

رہیں باقی تین نشانیاں، تو ان کا تعلق ان افراد کے ساتھ ہے جو مخلص دوست تھے اور ہیں، لیکن اُنہوں نے اہلِ دنیا کی توجہ اور اس طرح بعض دنیاوی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اور ان لوگوں کے ظلم وجور سے محفوظ رہنے کے لیے بوقتِ ضرورت اس مروّت اور مردانگی کا مظاہرہ نہ کیا جو دوستی کا تقاضا تھا لیکن بصد افسوس کہ میرے یہ تینوں دوست اپنے مقاصد سے ہمکنار ہونے کی بجائے بعض مصیبتوں سے دوچار ہوئے۔

پہلا آدمی: ان چار لوگوں میں سے ہے جو پہلے بظاہر دوست تھے لیکن بعد میں دشمنوں کا روپ دھار گئے، یہ ایک ڈائریکٹر تھا جس نے الحاح وزاری کے ساتھ اور بہت سے وسائل کے ذریعے مجھ سے ''دسویں مقالے'' کا ایک نسخہ مانگا، تو میں نے دے دیا لیکن اُس نے میری دوستی چھوڑ کر دشمنی کا طور طریقہ اپنا لیا اور وہ نسخہ ترقی کے لالچ میں گورنر کو دے دیا اور میرے خلاف اس کے کان بھرے۔ لیکن قرآنی خدمت کے ضمن میں اکرامِ الٰہی کی تاثیر اس طرح سامنے آئی کہ وہ ترقی پانے کی بجائے اپنے عہدے سے معزول کر دیا گیا!

دوسرا آدمی: ایک دیگر ڈائریکٹر ہے، یہ دوست تھا لیکن رقیب اور دشمن کا رُوپ دھار گیا، میری ذاتی شخصیت کے لیے نہیں بلکہ میری قرآنی خدمت کی وجہ سے اس کا مطمحِ نظر بھی اپنے افسروں کی رضاجوئی اور اہلِ دنیا کی توجہ کا حصول تھا۔ لیکن اس نے اپنے مقصد کے برعکس طمانچہ کھایا اور کسی معمولی سے کیس میں اڑھائی سال کے لیے جیل چلا گیا۔

پھر اس نے ایک خادمِ قرآن سے دعا کے لیے کہا تب اس کے لیے دعا کر دی گئی اور اب امید ہے کہ چھوٹ جائے گا۔

تیسرا آدمی: ایک سکول ٹیچر تھا جو کہ بظاہر دوست ہی نظر آتا تھا، اور میں بھی اُسے دوست کی نظر سے ہی دیکھتا تھا۔ لیکن

اس نے ''بارلا'' میں منتقل ہونے اور وہاں رہائش اختیار کرنے کے لیے اچانک دشمنی کا رُوپ دھار لیا تب اس نے اپنے مقصد کے برعکس طمانچہ کھایا۔ اور وہ اس طرح کہ اسے محکمۂ تعلیم سے نکال کر فوج میں بھرتی کر دیا گیا اور ''بارلا'' سے کہیں اور بھیج دیا گیا۔

چوتھا آدمی: بھی ایک سکول ٹیچر تھا جسے میں حافظِ قرآن اور دین دار آدمی سمجھتا تھا، جس کی وجہ سے میں نے اُس کے لیے بھرپور دوستی کا اظہار کر دیا تھا، اس نیت سے کہ یہ دوستی کی وجہ سے میرے ساتھ قرآن کی خدمت میں مصروف رہے گا۔ لیکن اُس نے ایک افسر کی کسی ایک ہی بات سے اہلِ دنیا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہم سے بیزاری و دستبرداری اور بزدلی اور سرد مہری کا انداز اختیار کر لیا۔ لیکن اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی بجائے اس نے تأدیبی طمانچہ کھایا، انسپکٹر نے اسے سخت سزا دی اور وہ نوکری سے نکال دیا گیا۔

اِن چار لوگوں نے قرآن کی خدمت کے مقابلے میں دشمنی کا رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے تأدیبی طمانچہ کھایا۔

رہے باقی تین لوگ جو میرے حقیقی دوست تھے، تو وہ تأدیبی طمانچوں سے تو بچے رہے، البتہ حقیقی دوستی اور وفاداری کے شایانِ شان مروّت کا مظاہرہ نہ کرنے کی وجہ سے انہیں تنبیہ ضرور کی گئی۔ ان میں سے:

پہلا آدمی: میرا ایک قابلِ احترام محنتی اور حقیقی شاگرد ہے۔ یہ آدمی بالاستمرار ''مقالات'' لکھتا اور طبع کرواتا تھا۔ پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ اُس نے ایک بہت بڑے ہنگامہ خیز اور فتنہ پرور قسم کے آفیسر کے آجانے اور ایک خصوصی واقعے کے رونما ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر رسائل کی کتابت چھوڑ دی تاکہ اِن اہلِ دنیا کی وجہ سے کسی مشقت سے دوچار اور کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے اور ان کی شر سے محفوظ رہے۔

جبکہ اس وقتی طور پر قرآن کی خدمت کو معطّل کرنے کی وجہ سے آزمائش اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی، اور وہ اس طرح کہ اس قرآنی خدمت کو وقتی طور پر چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اس پر پورے ایک سال تک ایک ہزار لیرہ جرمانہ عائد کر دیا گیا۔ لیکن جب اس نے لکھنے کی نیت کر لی اور پھر سے پرانے طور طریقے کو اپنا لیا، تو مقدمہ جیت گیا اور کیس سے بری ہو گیا اور۔ وللہ الحمد۔ کہ ایک ہزار لیرہ جرمانے سے بچ گیا؟ کیونکہ وہ ایک غریب آدمی تھا۔

دوسرا آدمی: میرا ایک پانچ سالہ پرانا محنتی، بہادر، وفادار اور قابلِ احترام شاگرد ہے، یہ میرا پڑوسی بھی تھا۔ اس نے اہلِ دنیا کی اور آنے والے نئے افسر کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اور ان لوگوں کے حسنِ ظن سے ہمکنار ہونے کے لیے بلا سوچے سمجھے مجھے نظر انداز کیے رکھا اور ملنے سے گریز کیا، حتی کہ رمضان میں اور عید کے موقع پر بھی نہ ملا۔ لیکن گاؤں کا مسئلہ حل ہو گیا اور افسر کا اثر و نفوذ اور رعب داب باقی نہ رہا اور یہ بیچارہ اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا۔

تیسرا آدمی: ایک حافظِ قرآن تھا جو میرے ساتھ ہفتے میں ایک دو دفعہ ملاقات کیا کرتا تھا۔ پھر اُسے کسی جگہ امامت مل

گئی تو اس نے دستار بندی کی ترنگ میں مجھے بالکل چھوڑ دیا، اس حد تک کہ اس نے مجھے عید پر بھی ملنا گوارہ نہ کیا۔ تب خلافِ اُمید، خلافِ معمول اور اس کے مقصود و مطلوب کے برعکس اس کی دستار بندی نہ ہو سکی، حالانکہ وہ سات آٹھ مہینے تک امامت کرا چکا تھا!

ان جیسے اور بھی بہت سے واقعات ہیں لیکن میں اس لیے ذکر نہیں کرتا کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔

اور ایسے واقعات سے انفرادی طور پر اگرچہ کمزوری علامتیں محسوس ہوتی ہیں، لیکن اجتماعی صورت میں قوت کا احساس دلاتے ہیں اور اطمینان کا باعث بنتے ہیں۔

یہیں سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے اور یہ عقیدہ مضبوط ہو جاتا ہے کہ ہم یہ قرآنی خدمت اپنی ذاتی شخصیت کے لیے نہیں اکرامِ الٰہی اور حمایتِ ربانی کے زیرِ سایہ سرانجام دے رہے ہیں؛ کیونکہ میں اپنی ذات کو کسی بھی عزت افزائی کے قابل نہیں سمجھتا ہوں بلکہ جو کچھ بھی ہے صرف اور صرف قرآن کی خدمت کی برکت سے ہے۔

اس لیے میرے دوستوں کو اس چیز کا خاص خیال رکھنا چاہیے اور شبہات واوہام کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں جو عزت مل رہی ہے وہ چونکہ قرآن کی خدمت کی وجہ سے ہے، اور یہ چیز فخر کی بجائے شکر کا تقاضا کرتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا

﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾

کی صورت میں فرمان بھی موجود ہے، اس لیے میں اس راز کو سامنے رکھ کر خصوصی طور پر اپنے دوستوں کو اس سے آگاہ کر دیتا ہوں۔

آٹھواں مسئلہ:

یہ ستائیسویں مقالے میں اجتہاد کے لیے رکاوٹیں بننے والے اسباب میں سے پانچویں سبب کے دوسرے نقطے کی تیسری مثال کا حاشیہ ہے۔

ایک اہم سوال: بعض اہلِ تحقیق کہتے ہیں: ''قرآنی اور ذکری الفاظ اور تمام تسبیحات، اِن میں سے ہر ایک کئی جہتوں سے انسان کے معنوی لطائف کو منوّر کرتا ہے اور انہیں معنوی غذا مہیا کرتا ہے۔ لیکن اگر الفاظ کے معانی نہ سمجھے جائیں تو اکیلے الفاظ کوئی فائدہ نہیں دیتے اور کفایت نہیں کرتے۔ اور یہ کہ لفظ تو لباس ہے، اس لیے اگر لباس تبدیل کر لیا جائے اور ہر قوم اِن معانی پر اپنی زبان کے الفاظ پہنا دے تو کیا یہ کام زیادہ فائدہ بخش نہیں ہوگا؟۔

الجواب: قرآنی الفاظ اور تسبیحاتِ نبویہ کے الفاظ جامد لباس کی نہیں بلکہ جسم کی زندہ کھال کی سی حیثیت رکھتے ہیں، بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ کھال ہی بن چکے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ لباس تو تبدیل ہو جاتا ہے لیکن کھال کو تبدیل

کیا جائے تو جسم کو نقصان پہنچتا ہے۔ بلکہ یہ مبارک الفاظ نماز اور اذان میں اپنے عرفی معانی کے لیے اعلام اور اسماء بن چکے ہیں، اور اسم اور علم تبدیل نہیں کیے جاتے۔

میں اس حقیقت تک خود اپنے اُوپر وارد ہونے والی حالت میں سوچ بچار کرنے اور اس کا بار بار تجربہ کرنے کے بعد پہنچا۔ اور وہ اس طرح ہے کہ:

میں عرفہ کے دن سینکڑوں مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھا کرتا تھا، اس وقت میں نے دیکھا کہ میرے بعض معنوی حواس بار بار کی تکرار سے اپنی اپنی غذا لے لیتے ہیں اور پھر اُکتا جاتے ہیں اور منہ پھیر کر رُک جاتے ہیں اور میری قوتِ تفکر ایک عرصے تک معنی کی طرف متوجہ رہتی ہے اور پھر اپنا حصہ حاصل کر کے وہ بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ اور دل اس سے کچھ ایسے مفاہیم حاصل کر لیتا ہے جو معنوی ذوق کا دار و مدار ہوتے ہیں، اور پھر وہ بھی خاموش ہو جاتا ہے۔۔۔ قرأت کی مسلسل پابندی اور تکرار سے میں نے دیکھا کہ اس تکرار میں کچھ لطائف بچ رہتے ہیں اور انتہائی سست روی سے اُکتاہٹ سے دو چار ہوتے ہیں اور اس کے بعد معنی اور تدقیق کے محتاج نہیں رہتے ہیں، اور غفلت جیسے قوتِ تفکیر کو نقصان پہنچاتی ہے انہیں نقصان نہیں پہنچاتی ہے اور انہیں لفظ اور اُس کا پُر مغز معنی و مفہوم ہی کافی ہوتا ہے، اسی طرح انہیں وہ عرفی معنی ہی کافی ہو جاتا ہے جس کے لیے الفاظ اسم اور علم بن گئے ہیں۔ یہ اگر اس وقت معنی کا لحاظ کریں گے تو وہ معنی نقصان دہ اُکتاہٹ کا باعث ہو گا۔

اور یہ لطائف جن کو دوام حاصل ہے تعلّم و تفہّم کے نہیں بلکہ تذکّر، توجہ اور شوق و رغبت کے محتاج ہوتے ہیں۔

اس لیے ان کے الفاظ جو کھال کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں اُن کے لیے کافی ہوتے ہیں اور معنی کا وظیفہ ادا کرتے رہتے ہیں اور دائمی فیضان کا دار و مدار ہوتے ہیں، خاص کر اس وقت جب یہ بات بھی یاد رہے کہ یہ عربی زبان کے الفاظ اللہ کا کلام اور اس کی گفتگو ہیں۔

پس یہ حالت جس کا میں نے خود تجربہ کیا ہے باور کراتی ہے کہ اذان، نماز کی تسبیحات، سورۂ الفاتحہ اور سورۃ الاخلاص جیسے ہمیشہ دہرائے جانے والے حقائق کو کسی اور زبان میں ادا کرنا انتہائی نقصان دہ ہے؛ کیونکہ الٰہی اور نبوی الفاظ جو کہ دائمی سرچشمے کی حیثیت رکھتے ہیں، جب یہ غائب ہو جاتے ہیں تو ان دائمی لطائف کا دائمی حصہ غائب ہو جاتا ہے اور یہ اپنے حصے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اور اس طرح ہر ایک حرف کے بدلے میں کم از کم دس نیکیوں کے ثواب سے محروی اور غفلت کے وقت ترجمے کی وساطت سے ادا ہونے والی بشری تعبیروں کی وجہ سے قلب و روح میں تاریکی چھا جانے کی طرح کے بہت سے نقصان ہو جاتے ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک کو تمام نماز میں ہمیشہ حضورِ قلب حاصل نہیں رہتا ہے۔

جی ہاں؛ جیسے کہ امام اعظم نے فرمایا ہے کہ: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' توحید کا علم اور اسم ہے، ہم بھی کہتے ہیں:
تسبیحی اور ذکری کلمات اور خاص کر اذان اور نماز کے کلمات چونکہ علم اور اسم کا حکم لے چکے ہیں اس لیے اب علَم کی طرح ان کے لغوی معنی سے زیادہ ان کے عُرفی اور شرعی معنی کو دیکھا جائے گا۔ بنا بریں انہیں تبدیل کرنا شرعی طور پر بالکل ممکن نہیں۔

رہے ان کے وہ مجمل معانی یعنی مختصر سے مطالب و مفاہیم جن کا سمجھنا ہر صاحبِ ایمان کے لیے ضروری ہے، تو انہیں ایک عام آدمی بھی فوراً سمجھ لیتا ہے، چہ جائیکہ وہ لوگ جو اپنی تمام عمریں اسلام میں گزار دیتے ہیں اور ہزاروں قسم کے لایعنی مسائل کے ساتھ اپنے دماغوں کو بھر لیتے ہیں! ایسے لوگ اگر ان بابرکت کلمات کے اجمالی معانی و مطالب کا علم حاصل نہ کریں اور ان کی جانکاری کے لیے تھوڑا سا وقت بھی نکالنے کی کوشش نہ کریں جو ان کی ابدی زندگی کی کنجی ہیں اور جو ایک دو ہفتے میں سیکھے جا سکتے ہیں؛ تو انہیں معذور کیونکر سمجھا جا سکتا ہے؟ وہ مسلمان کیونکر ہو سکتے ہیں؟ انہیں عقل مند کیسے کہا جا سکتا ہے؟

اور یہ بات قرینِ عقل بھی نہیں ہے کہ ان جیسے چند سُست لوگوں کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے اس نور کے سرچشموں کے ستور کی حیثیت رکھنے والے ان لفظوں کو تبدیل کر دیا جائے!

پھر یہ بھی ہے کہ کسی بھی قوم کا جو آدمی جب ''سبحان اللہ'' کہتا ہے، وہ یہ بات جانتا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیس بیان کر رہا ہے۔۔۔ کیا یہ مقدار کافی نہیں؟

لیکن اگر وہ اپنی خاص زبان میں اس کے معنی کی طرف متوجہ ہو گیا تو اپنی عقل و فکر کے لحاظ سے صرف ایک دفعہ اس معنی کا علم حاصل کر لے گا اور اُسے سمجھ جائے گا، حالانکہ اسی کلمے کو وہ روزانہ سینکڑوں دفعہ دہرا لیتا ہے۔ پس اس لفظ کا اجمالی معنی جو لفظ میں سرایت کر گیا ہے اور اس کے ساتھ ممزوج ہو گیا ہے وہ اس معنی کے علاوہ بھی کہ جس کا علم عقل نے سینکڑوں دفعہ دہرانے کی صورت میں حاصل کیا ہے، بہت سے انوار و فیوض کا دار و مدار ہے۔ اور خاص کر اس لفظ کی اہمیت اس وقت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جب وہ لفظ کلامِ الٰہی ہونے کی وجہ سے قدسیّت حاصل کر لیتا ہے اور اس قدسیّت سے پھوٹنے والے انوار و فیوض کا سرچشمہ بن جاتا ہے!۔۔۔

الحاصل: یہ قدسی الفاظ جو دینی ضروریات کا سرچشمہ ہیں، کوئی چیز ان کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ اور اگر دیگر کوئی چیز وقتی طور پر ان سے حاصل ہونے والی غرض ادا کر بھی دے تو بھی ہمیشہ کے لیے وہ بلندی اور قدسیّت عطا کر نہیں کر سکتی۔۔۔
رہے ضروریاتِ دینیہ کے علاوہ دیگر دینی اُمور، تو ان کے الفاظ کو تبدیل کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ یہ ضرورت وعظ و نصیحت اور تعلیم و تدریس جیسے دیگر اُمور سے پوری ہو جاتی ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ نحو صرف والی اس عربی زبان کی جامعیت اور قرآنی الفاظ کا اعجازی پہلو، کچھ اس انداز سے واقع ہوئے ہیں کہ ان کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ یہ چیز بالکل محال ہے۔ اس بات میں اگر کسی کو شک ہو تو وہ اعجاز القرآن کے بارے میں لکھے گئے پچیسویں مقالے کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

رہی وہ چیز جسے یہ لوگ ترجمہ کہتے ہیں، تو وہ انتہائی ناقص اور مختصر قسم کا مفہوم ہے، اس قسم کے ناقص ترین مفہوم و مطلب اور بہت سی جہتوں سے زندہ و پائندہ اور بھرپور آیات کے حقیقی معانی کا کیا مقابلہ ہے؟

نواں مسئلہ: ولایت کے ایک اہم راز کا انکشاف کرنے والا ایک خصوصی مسئلہ

اہلِ حق و استقامت کا ایک عظیم گروہ جسے عالمِ اسلام میں ''اہل السنہ ولجماعۃ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اِن لوگوں نے استقامت کے دائرے میں رہ کر سنت کی مکمل طور پر اتباع کرتے ہوئے قرآنی اور ایمانی حقائق کی حفاظت و نگہداشت کی ہے۔ اور اہلِ ولایت کی مطلق اکثریت اسی دائرے سے نکلی ہے۔ لیکن کچھ اولیاء ایسے بھی نظر آئے ہیں جو اہل السنہ ولجماعۃ کے بعض دساتیر سے باہر ہیں اور ایسے راستے میں گام زن ہیں جو ان کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اب ان اولیاء کی طرف دیکھنے والے دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں:

پہلا گروہ:

ان لوگوں نے تو اُن کی ولایت کا ہی انکار کر دیا ہے؛ کیونکہ یہ اہلِ سنت کے اصولوں کے خلاف چلے ہیں بلکہ بعض نے تو ان میں سے بعض کو کافر تک کہہ دیا ہے!

دوسرا گروہ: یہ لوگ اُن کی پیروی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: حق صرف اہلِ سنت کے مسالک میں ہی منحصر نہیں ہے؛ کیونکہ یہ لوگ اُن کی ولایت کے قائل ہیں۔ اور یوں ان لوگوں نے اہلِ بدعت کا ایک علیحدہ فرقہ تشکیل دے دیا ہے اور گمراہی کے راستے میں گام زن ہیں؛ ان لوگوں کو یہ پتا نہیں چل رہا ہے کہ ہر ہادی مہدی نہیں ہوتا، اس لیے ان کا شیخ تو معذور ہے، کیونکہ وہ مجذوب ہے، لیکن یہ لوگ معذور نہیں ہیں!

متوسط طبقہ:

یہ لوگ ان کی ولایت کے منکر نہیں ہیں، لیکن ان کا منہج اور مسلک قبول نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں: ان کے وہ اقوال جو اصول کے خلاف ہیں، یا تو غلبۂ حال کی وجہ سے صادر ہوئے ہیں اس لیے وہ غلطی کر گئے ہیں، یا پھر متشابہات کے ساتھ مشابہت رکھنے والی بے معنی اور سمجھ میں نہ آنے والی باتیں ہیں جنہیں شطحات کہا جاتا ہے۔

افسوس کہ پہلی قسم کے لوگ اور خاص کر علمائے ظاہر اہلِ سُنت کے مسلک کی حفاظت کی نیّت سے بڑے اہم قسم کے عظیم الشان اولیاء کا انکار کرنے پر بلکہ انہیں گمراہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

اور دُوسری قسم کے لوگوں یعنی ان کے پیروکاروں نے حق کا مسلک چھوڑ دیا ہے جس کی بنا پر وہ ان مشائخ کے بارے میں کچھ زیادہ حسنِ ظن کی وجہ سے بدعت اور گمراہی میں جا گرے ہیں۔

اِسی راز کی رُو سے مجھ پر بھی ایک ایسی حالت طاری ہوئی جس نے ایک عرصے تک میرے ذہن کو مشغول کیے رکھا۔ جس کی وجہ سے میں نے ایک دور میں اور ایک اہم وقت میں ان گمراہ لوگوں پر قہر ٹوٹنے کی بد دعا کر دی تھی، تو میری اس بد دعا کے مقابلے میں ایک دہشت خیز معنوی قوّت بر آمد ہوئی اور میری بد دُعا کو پیچھے دھکیلنے لگی اور مجھے روکنے لگی۔ پھر میں نے دیکھا کہ گمراہوں کے اس گروہ کے پیروکار اُن کے پیچھے پیچھے کھنچے چلے آتے ہیں اور معنوی قوّت اُن کے لیے کچھ آسانیاں پیدا کر دیتی ہے اس لیے وہ اس خلافِ حق کرداروں اور کاروائیوں میں رواں دواں رہتے ہیں، لیکن اس لیے نہیں کہ یہ لوگ عوام کو اپنے پیچھے چلنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ پیروکاری کی یہ خواہش ان میں ولایت کی قوت سے جنم لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ اہلِ ایمان اس خواہش سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور اس بنا پر اُسے کچھ زیادہ برا نہیں سمجھتے بلکہ اچھا کہتے ہیں۔

مجھے جب ان دو رازوں کا احساس ہوا تو دہشت زدہ سا ہو گیا اور میں نے حیرانی کے عالم میں کہا: ''سبحان اللہ''! کیا راہِ حق کے علاوہ بھی کہیں ولایت کا وجود ہے؟ اور کیا خاص طور پر اہلِ حقیقت اس طرح کی ہولناک گمراہی کے دامن کے ساتھ چمٹے رہیں گے؟

پھر میں نے عرفہ کے ایک بابرکت دن میں سورۂ الاخلاص پڑھی، اور خوبصورت اسلامی عادت کے مطابق اسے سینکڑوں بار دہراتا رہا۔ تب اس کی برکت سے رحمتِ الٰہیہ کی طرف سے میرے عاجز دل پر ایک اہم ترین سوال کے جواب کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت وارد ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ: کچھ اولیاءِ کرام بظاہر تو بڑے مجذوب سے نظر آتے ہیں لیکن عقل منداور دانشور اور بڑی پُر مغز اور حکیمانہ منطقی محاکے کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کچھ دوسرے لوگ نظر تو صحو، ہوشمندی اور عقل کے دائرے میں آتے ہیں، لیکن کبھی کبھار ان پر ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے جو عقل اور منطقی محاکے کے دائرے سے خارج ہوتی ہے۔ جیسے کہ سلطان محمد فاتح کے دور میں ''جبالی بابا'' کا مشہور و معروف، پُر مغز اور عبرت خیز واقعہ ہے۔ (حاشیہ)

(حاشیہ) کہتے ہیں کہ ''قسطنطنیہ'' میں اللہ کا ایک نیک بندہ رہتا تھا جو ''جبالی بابا'' کے نام سے مشہور تھا: اُسے شہر کے عیسائیوں کے ساتھ اور بالخصوص ان کے بچوں کے ساتھ بڑا پیار تھا، اور وہ سب بھی اس کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے سلطان محمد فاتح نے جب شہر کا محاصرہ کر لیا تو بابا دعا کرنے لگا کہ سلطان کے طرف سے پھینکے جانے والے پتھر کام نہ کریں اور اللہ ان معصوم بچوں کو محفوظ رکھے۔ اور واقعتاً شہر کی فتح مؤخر ہو گئی تب سلطان نے اپنے شیخ اور وقت کے ولی ''آق شمس الدین'' سے مشورہ کیا۔ اب آق شمس الدین فتح و نصرت کی دعا کرتے تھے اور بابا جی شکست کی جتی۔ کہ آق شمس الدین نے بابا جبالی کی ہلاکت کے دعا کر دی تب جبالی بابا وفات پا گئے اور قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔ مترجم۔

اس قسم کے اولیاء میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جن پر معاملہ خلط ملط ہو جاتا ہے اور وہ فرق وامتیاز کھو بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ وہ سکر کی حالت میں نظر آنے والے واقعات کو صحو کی حالت پر منطبق کرتے ہیں اور غلطی کر جاتے ہیں اور جان نہیں پاتے کہ وہ غلطی کر رہے ہیں۔

پس مجذوبوں کی ایک قسم اللہ کے ہاں محفوظ ہوتی ہے، اس لیے وہ گمراہی کے راستے میں نہیں چلتے ہیں۔

لیکن ان مجذوبوں کی ایک دوسری قسم محفوظ نہیں ہے، اس لیے وقتی یا دائمی طور پر حالتِ جذب میں رہنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ بدعتی اور گمراہ گروہوں میں نظر آئیں، بلکہ اس بات کا بھی احتمال موجود ہے کہ وہ کافروں کے دائرے میں ہوں!

پس یہ لوگ چونکہ وقتی یا دائمی طور پر مجذوب ہیں، اس لیے معنوی طور پر یہ بابرکت حواس باختہ مجنوں کے حکم میں ہیں۔

اور چونکہ یہ بابرکت مجنون ہیں، اس لیے آزاد رَو ہیں اور شرعی احکام کے پابند نہیں ہیں۔

اور چونکہ شرعی طور پر مکلّف اور پابند نہیں ہیں اس لیے اُن کا مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا۔

یہ لوگ اہلِ بدعت وضلالت کے دامن کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور انہیں کی دوستی کا دَم بھرتے ہیں اور کسی حد تک انہیں کے مسلک کو رواج دیتے ہیں، اور اس طرح بعض اہلِ ایمان اور اہلِ حق کے اس مسلک میں داخل ہو جانے کا منحوس سبب بن جاتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ان کی اپنی مجذوب ولایت بہر کیف محفوظ رہتی ہے۔

دسواں مسئلہ:

بعض دوستوں نے اس طرف توجہ دلائی کہ ملاقاتیوں کے لیے کوئی دستور وضع کر دیا جائے، اس کے پیشِ نظر لکھا گیا کہ:

یہ بات سب کے علم میں ہونی چاہیے کہ جو آدمی بھی ہم سے ملنے کے لیے آتا ہے وہ یا تو اِس دنیاوی زندگی کی جہت سے آتا ہے، تو یہ دروازہ بند ہے۔

اور یا پھر وہ اُخروی زندگی کی جہت سے آتا ہے، تو اس جہت میں دو دروازے ہیں:

یا تو وہ مجھے کوئی بابرکت اور صاحبِ مقام ہستی سمجھ کر آتا ہے تو یہ دروازہ بھی بند ہے؛ کیونکہ میں اپنی شخصیت کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ اور میں اس آدمی کو بھی پسند نہیں کرتا جو میرے بارے میں اس طرح کی غلط فہمی کا شکار ہے۔ اللہ کا بہت بہت شکر ہے کہ اُس نے مجھے میری ذات پر فریفتہ نہیں ہونے دیا!

رہی دوسری جہت، اور وہ یہ کہ میں صرف قرآنِ حکیم کا خادم، اُس کی طرف رہنمائی کرنے والا اور اس کی طرف بلانے والا ہوں، دیگر ہیچ؛ تو اس دروازے سے داخل ہونے والوں کو بسر وچشم قبول کرتا ہوں۔

اور اس جہت سے آنے والے لوگ بھی تین طرح کے ہیں: آنے والا یا دوست ہوگا، یا بھائی یا طالب علم۔ تو دوست کی خصوصیت اور شرط یہ ہے کہ وہ ہماری ''مقالات'' اور قرآنی انوار کے ساتھ تعلق رکھنے والی خدمت کے ساتھ قطعی طور پر مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہے اور دل سے باطل وضلالت اور بدعتوں کی طرف میلان نہ رکھے، اور خود اپنی ذات کو بھی فائدہ دینے کی کوشش کرتا رہے۔

اور بھائی کی خصوصیت اور شرط یہ ہے کہ وہ فرض نمازوں کو پابندی سے ادا کرے، کبائر سبعہ سے مجتنب رہے اور مقالات کی نشر واشاعت کے سلسلے میں حقیقی تگ ودو کرتا رہے۔

اور شاگرد کی خصوصیت اور شرط یہ ہے کہ وہ ''مقالات'' کے بارے میں یہ ذہن رکھے کہ یہ اُسی کا مال ہے اور انہیں اُسی نے تالیف کیا ہے، اس لیے وہی ان کا مالک ہے۔ اور یہ چیز بھی یاد رکھے کہ اس کی زندگی کی سب سے اہم ذمہ داری ان کی نشر واشاعت اور ان کی خدمت کرنا ہے، پس یہ تین طبقات میری شخصیت کی تین جہتوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں:

دوست میری ذاتی شخصیت کے ساتھ ذاتی مناسبت رکھتا ہے۔

بھائی میری عبدیّت وعبودیت والی شخصیت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

اور شاگرد میرے قرآن کریم کی طرف رہنمائی کرنے کی جہت سے تدریسی خدمات میں میری شخصیت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

اور میرے ساتھ اس ملاقات کے تین پھل ہیں:

پہلا پھل: مجھ سے قرآنی جواہر پاروں کا یا مقالات کا درس لینا، اگرچہ ایک درس ہی کیوں نہ ہو!

دوسرا پھل: عبادت کے اعتبار سے وہ میری اُخروی کمائیوں کا حصہ دار بنے۔

تیسرا پھل: ہم ایک ساتھ بابِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوں اور یوں اپنے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرکے قرآنِ حکیم کی خدمت کے میدان میں ایک دوسرے کا سہارا بنیں اور اس سے توفیق اور ہدایت مانگیں۔

پس اگر وہ شاگرد ہے تو وہ میرے ہاں ہمیشہ صبح وشام اپنے نام کے ساتھ اور کبھی کبھی اپنے خیال کے ساتھ بھی حاضر رہے گا اور حصے دار بنے گا۔

اور اگر بھائی ہے تو وہ میری دعا میں اور میری کمائیوں میں کئی بار اپنے خاص نام کے ساتھ اور اپنی صورت کے ساتھ حاضر ہوگا اور حصے دار بنے گا پھر عام بھائیوں میں شریک ہو جائے گا، اور میں اُسے رحمتِ الٰہیہ کے سپرد کر دوں گا۔ اور جب میں دعا کے وقت کہوں گا: ''وہ میرے بھائیو اور بہنو!'' تو وہ ان کے درمیان ہی کہیں ہوگا؛ ایسے لوگ اگر میرے علم میں نہ بھی ہوں تو رحمتِ الٰہیہ کے علم میں بھی ہیں اور نظر میں بھی۔

اور اگر وہ دوست ہے، فرائض کو قائم کرتا ہے اور کبائر سے کنارہ کش رہتا ہے، تو وہ بھائیوں کی عموم قی کی رُو سے میری دعا میں داخل ہے، بس ایک شرط ہے، اور وہ یہ کہ یہ تینوں طبقے مجھے اپنی دعاؤں میں اور معنوی کمائیوں میں داخل کر لیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مَنْ قَالَ: "اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ الْمَرْصُوْصِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا" وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلِّمْ

﴿سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ﴾

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾

اَللّٰھُمَّ یَا مَنْ أَجَابَ نُوْحًا فِیْ قَوْمِہٖ

وَیَا مَنْ نَصَرَ إِبْرَاھِیْمَ عَلٰی أَعْدَائِہٖ!

وَیَا مَنْ أَرْجَعَ یُوْسُفَ إِلٰی یَعْقُوْبَ

وَیَا مَنْ کَشَفَ الضُّرَّ عَنْ أَیُّوْبَ!

وَیَا مَنْ اَجَابَ دَعْوَۃَ زَکَرِیَّا

وَیَا مَنْ تَقَبَّلَ یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی!

نَسْئَلُکَ بِاَسْرَارِ اَصْحَابِ ھٰذِہِ الدَّعْوَاتِ الْمُسْتَجَابَاتِ، اَنْ تَحْفَظَنِیْ وَتَحْفَظَ نَاشِرِیْ ھٰذِہِ الرَّسَائِلِ، وَرُفَقَائِھِمْ مِنْ شَرِّ شَیَاطِیْنِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ وَانْصُرْنَا عَلٰی أَعْدَائِنَا، وَلَا تَکِلْنَا اِلٰی اَنْفُسِنَا، وَاکْشِفْ کُرْبَتَنَا وَکُرْبَتَھُمْ، وَاشْفِ أَمْرَاضَ قُلُوْبِنَا وَقُلُوْبِھِمْ آمِیْنَ آمِیْنَ آمِیْنَ

ستائیسواں مکتوب

یہ مکتوب انتہائی خوبصورت اور لطیف خطوط اور عین الحقیقت پر مشتمل ہے، یہ خطوط مؤلفِ ’رسائل نور‘‘ نے اپنے شاگردوں کی طرف لکھے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ خطوط بھی ہیں جو رسائلِ نور کے شاگردوں نے اپنے اُستاد کی طرف لکھے ہیں اور کبھی کبھار شاگردانِ رسائلِ نور نے آپس میں ایک دوسرے کی طرف لکھے ہیں۔ ان خطوط میں ان شاگردوں نے ان تابناک فیوضات کا اظہار کیا ہے جو اُنھوں نے رسائلِ نور کے مطالعہ سے حاصل کیے ہیں۔ چنانچہ اس مکتوب کا حجم ان خطوط کی وجہ سے مکتوبات کے اس مجموعے سے تین چار گنا بڑھ گیا ہے اس بنا پر اسے اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا گیا۔ بلکہ اسے بارلا، قسطمونی اور امیر داغ کے ملاحق کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔

مُولف اور اس کے نشر و اشاعت کرنے والے شاگرد

اٹھائیسواں مکتوب

یہ مکتوب آٹھ مسائل پر مشتمل ہے

پہلا مسئلہ جو کہ پہلا خط ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ﴿اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُوْنَ﴾

۔۔۔**ثانیا:** اب آپ مجھ سے اپنے ایک پرانے خواب کی تعبیر چاہتے ہیں جس کی تعبیر اُس وقت تین دن کے بعد کھل کر سامنے آ گئی تھی جب آپ کی آج سے تین سال پہلے میرے ساتھ ایک مجلس ہوئی تھی۔ تو کیا وہ خوبصورت، بابرکت اور خوشخبری دینے والا خواب جس کا معنی ظاہر ہو چکا ہے اور اس پر ایک عرصہ بیت گیا ہے، اس خواب کے بالمقابل مجھے یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا ہے کہ:

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلامِ آفتابم ہمہ زآفتاب گویم

اور یہ کہ:

آں خیالاتے کہ دامِ اولیاست
عکسِ مہر دیانِ بستانِ خداست

(حاشیہ)

جی ہاں؛ میرے بھائی!

ہم آپ کے ساتھ خالص حقیقت کا مذاکرہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، اس لیے خواب کے بارے میں کہ جس کے دروازے چوپٹ کھلے ہیں، کوئی تحقیقی بحث کرنا علم و تحقیق کے مسلک کے ساتھ بالکل میل نہیں کھاتا ہے۔ البتہ نیند جو کہ موت کی بہن ہے اس میں پیش آنے والے اس جزوی سے حادثے کی مناسبت سے ہم چھ عدد ایسے نکتے بیان کریں گے جو خاص طور پر نیند کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور بتائیں گے کہ درحقیقت یہ چیز کیا ہے!

پہلا نکتہ: ﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ جیسی بہت سی آیات نیند اور خواب میں پائے جانے والے بہت سے مستور حقائق پر دلالت کرتی ہیں۔ جیسے کہ یوسفؑ کا خواب سورۂ یوسف کی ایک اہم بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا نکتہ: اہلِ تحقیق قرآن کے ساتھ فال نکالنے کی اور خواب پر اعتماد کرنے کی تائید نہیں کرتے ہیں؛ کیونکہ قرآن

(حاشیہ) مثنوی مولانا روم دفتر اول

حکیم کفار کو بہت زیادہ اور شدید قسم کی ڈانٹ پلاتا ہے، اس لیے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فال لینے والے کا سامنا ان آیتوں سے ہو جاتا ہے جن میں کافروں کو جھڑکا گیا ہوتا ہے، تب وہ آیتیں اُسے بدفالی میں مبتلا کر دیتی ہیں اور اس کے دل میں اضطراب پیدا کر دیتی ہیں۔

یہی صورتِ حال خواب کی ہے، چنانچہ خواب کبھی بہت اچھا ہوتا ہے لیکن بُرا لگتا ہے؛ کیونکہ بسا اوقات وہ کسی چیز کو حقیقت کے برعکس دکھا دیتا ہے اور اس طرح انسان کو نا اُمیدی کا شکار بنا دیتا ہے، اس کی معنوی قوت شکستہ کر دیتا ہے اور اُسے سوءِ ظن میں مبتلا کر دیتا ہے۔

بہت سے خواب ایسے ہیں جن کی ظاہری صورت دہشت خیز، نقصان دہ اور نفرت انگیز ہوتی ہے لیکن اس کی تعبیر اور مفہوم بہت اچھا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان خواب کی شکل وصورت اور اس کے معنی کی حقیقت کے درمیان پائی جانے والی مناسبت کا ادراک نہیں کر سکتا، اس لیے پریشان، نا اُمید اور غمگین ہو جاتا ہے۔

پس صرف اسی چیز کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے آغاز میں امامِ ربانی اور اہلِ حقیقت کی طرح کہہ دیا ہے:

نہ شبم نہ شب پرستم

تیسرا نکتہ: صحیح حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ (حاشیہ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ سچا خواب حق ہے اور اس کا نبوت کے وظائف کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

یہ تیسرا مسئلہ بہت طویل عمیق اور بڑا اہم ہے اور اس کا نبوّت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس لیے اسے کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں، اور سرِ دست اس کا دروازہ نہیں کھولتے۔

چوتھا نکتہ: خواب کی تین قسمیں ہیں: ان میں سے دو تو قرآنی تعبیر کے مطابق ''اَضغاث اَحلام'' میں داخل ہیں، اور کوئی معنی ومفہوم رکھتے ہوئے بھی وہ ناقابلِ تعبیر اور بے قیمت ہوتی ہیں؛ کیونکہ یا تو قوتِ خیال کسی آدمی کے انحرافِ مزاج کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماری کے حساب سے کوئی تصویر بنا لیتی ہے اور مختلف چیزوں کو ترکیب دیتی ہے، یا پھر خیال کچھ ایسے اثر انداز ہونے والے واقعات کو یاد کرنا شروع کر دیتا ہے جو دن کے وقت یا اس سے پہلے حتی کہ سال دو سال پہلے عین اسی وقت پیش آئے تھے، چنانچہ خیال اُن واقعات کو بناتا سنوارتا ہے۔ ان کی صورت گری کرتا ہے اور انہیں کوئی اور شکل دے دیتا ہے۔

خواب کی یہ دونوں قسمیں ''اَضْغَاثُ الْاَحْلَام'' ہیں اور تعبیر کے قابل نہیں۔

(حاشیہ) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ أَرْبَعِیْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ'': اسے خطیب بغدادی نے ''الموضح'' 2/333 میں روایت کیا ہے۔ البتہ بخاری، مسلم، ابوداود، ابن ماجہ اور مسند الفردوس میں چالیسویں حصے کی بجائے چھیالیسواں حصہ آیا ہے: ''رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِیْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ'' مترجم۔

حکیم کفار کو بہت زیادہ اور شدید قسم کی ڈانٹ پلاتا ہے، اس لیے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فال لینے والے کا سامنا ان آیتوں سے ہو جاتا ہے جن میں کافروں کو جھڑکا گیا ہوتا ہے، تب وہ آیتیں اُسے بدفالی میں مبتلا کر دیتی ہیں اور اس کے دل میں اضطراب پیدا کر دیتی ہیں۔

یہی صورتِ حال خواب کی ہے، چنانچہ خواب کبھی بہت اچھا ہوتا ہے لیکن بُرا لگتا ہے؛ کیونکہ بسا اوقات وہ کسی چیز کو حقیقت کے برعکس دکھا دیتا ہے اور اس طرح انسان کو نا اُمیدی کا شکار بنا دیتا ہے، اس کی معنوی قوت شکستہ کر دیتا ہے اور اُسے سوءِ ظن میں مبتلا کر دیتا ہے۔

بہت سے خواب ایسے ہیں جن کی ظاہری صورت دہشت خیز، نقصان دہ اور نفرت انگیز ہوتی ہے لیکن اس کی تعبیر اور مفہوم بہت اچھا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر انسان خواب کی شکل وصورت اور اس کے معنی کی حقیقت کے درمیان پائی جانے والی مناسبت کا ادراک نہیں کر سکتا، اس لیے پریشان، نا اُمید اور غمگین ہو جاتا ہے۔

پس صرف اسی چیز کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے آغاز میں امامِ ربانی اور اہلِ حقیقت کی طرح کہہ دیا ہے:

نہ شمم نہ شب پرستم

تیسرا نکتہ: صحیح حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ (حاشیہ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ سچا خواب حق ہے اور اس کا نبوت کے وظائف کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

یہ تیسرا مسئلہ بہت طویل عمیق اور بڑا اہم ہے اور اس کا نبوت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس لیے اسے کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں، اور سرِ دست اس کا دروازہ نہیں کھولتے۔

چوتھا نکتہ: خواب کی تین قسمیں ہیں: ان میں سے دو تو قرآنی تعبیر کے مطابق ''اَضغاث اَحلام'' میں داخل ہیں، اور کوئی معنی ومفہوم رکھتے ہوئے بھی وہ نا قابلِ تعبیر اور بے قیمت ہوتی ہیں؛ کیونکہ یا تو قوتِ خیال کسی آدمی کے انحرافِ مزاج کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماری کے حساب سے کوئی تصویر بنا لیتی ہے اور مختلف چیزوں کو ترکیب دیتی ہے، یا پھر خیال کچھ ایسے اثر انداز ہونے والے واقعات کو یاد کرنا شروع کر دیتا ہے جو دن کے وقت یا اس سے پہلے حتی کہ سال دو سال پہلے عین اسی وقت پیش آئے تھے، چنانچہ خیال اُن واقعات کو بنا تا سنوارتا ہے۔ ان کی صورت گری کرتا ہے اور انہیں کوئی اور شکل دے دیتا ہے۔

خواب کی یہ دونوں قسمیں ''اَضْغَاثُ الْاَحْلَام'' ہیں اور تعبیر کے قابل نہیں۔

(حاشیہ) حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ أَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ": اسے خطیب بغدادی نے ''الموضح'' 2/333 میں روایت کیا ہے۔ البتہ بخاری، مسلم، ابوداود، ابن ماجہ اور مسند الفردوس میں چالیسویں حصے کی بجائے چھیالیسواں حصہ آیا ہے: "رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ" مترجم۔

رہی تیسری قسم، تو اُسے ''رؤیائے صادقہ'' یعنی سچا خواب کہتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ: انسانی ماہیت میں پایا جانے والا ربانی لطیفہ عالمِ شہادت کے ساتھ بندھے ہوئے اور اس میں گھومنے پھرنے والے حواس کا رشتہ منقطع کر کے اور ان حواس کے رُک جانے کے بعد عالمِ غیب کے ساتھ ایک طرح کی مناسبت حاصل کر لیتا ہے اور اس کی جانب ایک راستہ کھول لیتا ہے، اور اس راستے سے ربانی لطیفہ ان واقعات کو دیکھ لیتا ہے جو واقع ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ لوحِ محفوظ کے ساتھ تعلق رکھنے والے کسی جلوے اور تقدیر کی تحریروں کے نمونوں سے دوچار ہو جاتا ہے اور بعض حقیقی واقعات کا مشاہدہ کر لیتا ہے لیکن بسا اوقات ''خیال'' ان واقعات میں تصرّف کر دیتا ہے اور انہیں تصویر کے لبادے پہنا دیتا ہے۔

خواب کی یہ قسم بہت سی انواع و اقسام اور طبقات پر مشتمل ہے، چنانچہ کبھی تو واقعہ بعینہٖ اُسی طرح واقع ہو جاتا ہے جیسے دیکھا ہوتا ہے، اور کبھی دقیق اور مہین سے پردے کے تحت واقع ہوتا ہے، اور کبھی ایک موٹے پردے میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ وحی کے آغاز میں رسولِ اکرم ﷺ جو بھی خواب دیکھا کرتے تھے وہ سچ مچ روزِ روشن کی طرح واضح طور پر اُسی طرح رونما ہو جاتے تھے۔

پانچواں نکتہ: رؤیائے صادقہ ''احساسِ قبل الوقوع'' (حاشیہ:۱) کے زیادہ منکشف ہونے کا نام ہے۔ اور یہ اِحساس جزوی یا کلّی طور پر ہر انسان میں حتیٰ کہ حیوانات میں بھی موجود ہے۔

مجھ پر۔ کسی دور میں۔ اس بات کا سائنٹیفک انداز سے انکشاف ہوا تھا کہ انسان اور حیوان میں ان مشہور ظاہری اور باطنی حواس کے علاوہ دیگر حواس بھی پائے جاتے ہیں، یہ قوتِ سامعہ اور قوتِ باصرہ کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں اور انہیں ''قوتِ سائقہ'' اور قوتِ شائقہ کہا جاتا ہے۔ (حاشیہ:۲)

محرّک اور ہیجان خیز قوت: یعنی دھکیلنے اور آمادہ کرنے والی اور شوق اور رغبت دلانے والی قوتیں۔

گمراہ اور فلسفی قسم کے لوگ غلطی اور حماقت سے ان غیر مشہور قوتوں کو ''فطری آمادگی'' کا نام دیتے ہیں (حاشیہ:۳)

۔۔۔ جبکہ یہ فطری آمادگی ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کا فطری الہام ہے جس کے ذریعے تقدیرِ الٰہی انسان اور

(حاشیہ:۱) احساسِ قبل الوقوع۔ یعنی کسی پیش آنے والے واقعہ کا پیشگی احساس ہو جانا اور خطرے کی گھنٹی بج جانا۔ جدید نفسیات کی زبان میں اسے ''premonition'' یا pre sage کہا جا سکتا ہے۔

(حاشیہ:۲) قوتِ سائقہ: ہانکنے یا دھکیلنے والی قوت: impellent power

قوتِ شائقہ: شوق دلانے والی: stimulus power

(حاشیہ:۳) فطری و جبلی آمادگی یا وجدانی انگیخت: ''Natural unstinect''

حیوان کو ہانکتی اور دھکیلتی ہے۔

مثال کے طور پر بلی اور اس جیسے دیگر جانور جب اندھے ہو جاتے ہیں تو اس ''تقدیری آمادگی'' کے تحت کوئی معیّن جڑی بوٹی تلاش کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں، اُسے آنکھوں پر ملتے ہیں اور بیماری ٹھیک ہو جاتی ہے۔

اسی طرح گِدھ کی نسل کے گوشت خور جانور کہ جن کی حیثیت محکمۂ صحت کے ملازموں کی سی ہے اور جنہیں خشکی کے جانوروں کے مردہ اجسام کو اُٹھا کر سطحِ زمین کو صاف کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، انہیں اِس تقدیری اور الٰہی آمادگی اور ''احساس قبل الوقوع'' کی بنا پر ایک دن کی مسافت سے اس مردہ جانور کا الہام ہو جاتا ہے۔

اسی طرح شہد کی مکھی کا نومولود بچہ صرف ایک دن کی عمر میں ہی اس تقدیری اور الٰہی آمادگی کے الہام کے طفیل ہوا میں اُڑتا ہوا ایک دن کی مسافت تک دُور جا سکتا ہے، اس کے نقوشِ پا ہوا میں تحلیل نہیں ہوتے، اس لیے وہ انہیں نقوشِ پا کے سہارے اپنے چھتے تک واپس آ جاتا ہے۔

یہ واقعہ تو ہر انسان کے ساتھ بارہا دفعہ پیش آ چکا ہو گا کہ جب بھی اُس نے کسی شخص کو یاد کیا، اچانک دروازہ کھلا اور بالکل غیر متوقع طور پر وہ شخص اندر آ گیا۔ کردی زبان کی ایک کہاوت ہے:

ناف گر بینہ پالاندار لی ور بنہ

یعنی جب بھیڑیے کے بارے میں گفتگو کرو تو اُسے مارنے کے لیے لاٹھی تیار رکھو کیونکہ وہ آیا ہی چاہتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ربانی لطیفے کو حسِ قبل الوقوع یا پیشگی احساس کی وجہ سے اس انسان کے آنے کا اجمالی طور پر احساس ہو جاتا ہے، لیکن عقل کا شعور چونکہ اس کا احاطہ نہیں کر رہا ہوتا اس لیے وہ بغیر قصد و اختیار کے اس شخص کے متعلق گفتگو کرنا شروع کر دیتا ہے۔

اہلِ فراست بسا اوقات اس چیز کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُس شخص کا آنا کرامت کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔

میرے اندر اس قسم کی حساسیت کسی دور میں بہت زیادہ تھی تو میں نے چاہا کہ اس حالت کو کسی کے لیے کوئی قاعدہ ضابطہ بنا کر اسے ایک دستور میں ڈھال دوں، لیکن اس حالت کے اور دستور کے درمیان کوئی مناسبت پیدا کرنے میں ناکام رہا اور کوئی قاعدہ ضابطہ نہ بن سکا، البتہ ''پیشگی احساس'' کی اس قوت کا نیک لوگوں میں اور خاص کر اولیائے کرام میں بہت زیادہ انکشاف ہوتا رہتا ہے اور وہ کرامت کے ساتھ ملتے جلتے آثار کو ظہور میں لاتی ہے۔

پس سچے خوابوں کے ذریعے عوام الناس کو بھی ایک طرح کی ولایت کا درجہ حاصل ہے؛ کیونکہ اس طرح سچے خوابوں کے ذریعے وہ بھی اولیائے کرام کی طرح غیب کے اور مستقبل کے کچھ واقعات کو دیکھ لیتے ہیں۔

جی ہاں؛ نیند جس طرح رویائے صادقہ کی رُو سے عوام الناس کے لیے ولایت کے ایک مرتبے کی حیثیت رکھتی ہے،

اسی طرح یہ لوگوں کے لیے ایک انتہائی خوبصورت اور پرشکوہ نمائش گاہ ہے جس میں سینما کے مناظر کی طرح ربّانی واقعات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

بس اتنا ہے کہ ایک خوبصورت اخلاق والا انسان خوبصورت سوچ فکر کا مالک ہوتا ہے، اس لیے اُسے اچھے مناظر نظر آتے ہیں۔ اور بداخلاق انسان کا چونکہ تصوّر بُرا ہوتا ہے اس لیے اُسے بُرے مناظر ہی نظر آئیں گے۔

اسی طرح نیند ہر ایک کے لیے عالمِ شہادت میں ایک ایسی کھڑکی کا حکم رکھتی ہے جس سے عالمِ غیب کی طرف دیکھا جاتا ہے۔

اسی طرح نیند اس مقیّد فانی انسان کے لیے ایک کھلے میدان اور ایک قسم کی بقاء کے مظہر اور نمائش گاہ کا حکم رکھتی ہے، جس میں ماضی اور مستقبل حال کا حکم رکھتے ہیں۔

اسی طرح نیند اِن ذی اَرواح کے لیے جائے استراحت کا حکم رکھتی ہے جو محنت مشقت اُٹھاتے ہیں اور تکالیفِ حیات کی چکّی میں پسے جارہے ہیں۔

کچھ اسی طرح کے اسرار و رموز ہیں جن کے پیشِ نظر قرآن حکیم

﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾

جیسی آیات کے ذریعے بڑے اہتمام کے ساتھ نیند کی حقیقت کا درس دیتا ہے۔

چھٹا نکتہ: اور یہ سب سے اہم ہے۔

میرے لیے یہ بات حقّ الیقین کے درجے تک پہنچ چکی ہے اور میرے بہت سے تجربات کے ذریعے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سچا خواب اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ تقدیرِ الٰہی ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

جی ہاں؛ یہ خواب- خاص کر گزشتہ چند سالوں میں- اس قطعی اور یقینی حد تک جا پہنچا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ مثال کے طور پر کل مجھے جو چھوٹے موٹے واقعات پیش آنے والے ہیں اور جن معاملات سے میں دوچار ہونے والا ہوں، حتی کہ جو عام قسم کی باتیں میں کرنے والا ہوں وہ سب کی سب وقوع میں آنے سے پہلے مکتوب اور معیّن ہیں اور میں انہیں رات کے وقت دیکھ کر اپنی زبان کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی آنکھوں کے ساتھ پڑھ لیتا ہوں۔

مجھے اس بات کا تجربہ ایک دفعہ یا سو دفعہ نہیں بلکہ ہزار دفعہ ہو چکا ہے، چنانچہ میں رات خواب میں ایسے اشخاص دیکھتا جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہوتا تھا، اور ایسے مسائل دیکھتا جو میرے گمان میں بھی نہ ہوتے تھے، لیکن اُسی رات کی صبح ہوتے ہی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ وہ اشخاص نظر آنے لگتے اور وہ مسائل میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا جزوی واقعہ بھی ظہور میں آنے سے پہلے تقدیرِ الٰہی میں مکتوب اور مقیّد ہے۔ اس

لیے جو کچھ ہو رہا ہے اتفاقاً نہیں ہو رہا ہے۔ اور یہ حوادث واتفاقات کا نتیجہ یا الکل اور بے لگام اور غیر منظم نہیں ہے۔

ساتواں نکتہ: آپ کے لطیف، بابرکت اور خوشخبری سے بھرے ہوئے خواب کی تعبیر ہمارے لیے اور قرآنی خدمت کے لیے بہت اچھی ہے وقت نے خود ہی اس کی تعبیر کر دی ہے اور کر رہا ہے، اور ہمارے لیے تعبیر کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ اور اس کی تعبیر کا کچھ حصہ تو بہت لطیف صورت میں ظہور میں آیا ہے، آپ غور کریں تو سمجھ میں آ جائے گا۔ البتہ ہم اس کے صرف ایک دو نقطوں کی طرف اشارہ کریں گے، یعنی اس کی ایک حقیقت بیان کریں گے۔ پس تمہارے اس خواب کی قبیل کے حوادث وواقعات اُس حقیقت کے تمثّلات ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ:

وہ کھلا میدان عالمِ اسلام ہے۔ اس کے آخری کنارے پر جو مسجد ہے وہ ''اسپارٹا'' کی حکومت ہے۔ اور وہ پانی جو ہر طرف سے گدلا اور متعفّن ہو چکا ہے وہ دور حاضر اور اس میں سر اُٹھانے والی بدعات، اس کی سفاہت، رذالت اور بے کاری کا کیچڑ اور دلدل ہے اور آپ کا آلودہ ہوئے بغیر تیزی کے ساتھ صحیح سلامت مسجد تک پہنچ جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ سب لوگوں سے پہلے قرآنی انوار کے مالک بن گئے ہیں، آپ صحیح سالم اور محفوظ رہ گئے، آپ کے دل میں خرابی نہیں آئے گی۔

رہی مسجد میں نظر آنے والی چھوٹی سی جماعت، تو ''حقی، خلوصی، صبری، سلیمان، رُشدی، بکر، مصطفیٰ، علی، زہدی، لطفی، خُسرَو اور رأفت جیسے لوگ ہیں جو ''مقالات'' کو اپنا چکے ہیں۔

اور رہی وہ چھوٹی سی کُرسی، تو وہ ''بارلا'' جیسی کوئی چھوٹی سی بستی ہے۔ اور وہ بلند آواز ''مقالات'' میں پائی جانے والی قوّت اور سرعتِ انتشار کی طرف اشارہ ہے۔

اور وہ جگہ جو آپ کے لیے پہلی صف میں خاص کی گئی ہے وہ ''عبدالرحمان'' والی جگہ ہے جو اس کے جانے کے بعد خالی ہوئی تھی اور آپ کو دی گئی ہے۔ اور وائرلیس کے آلات کے ساتھ مشابہت رکھنے والی جماعت سے وہ جماعت مراد ہے جو اس ایمانی درس کو تمام عالم میں پھیلانا چاہتی ہے اور سنانا چاہتی ہے۔ پس اس خواب کا اشارہ اور اس کی پوری حقیقت مستقبل میں ظاہر ہوگی، ان شاء اللہ! کیونکہ اس کے افراد فی الحال اگرچہ چھوٹی چھوٹی گٹھلیوں کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن مستقبل میں توفیق خداوندی سے بلند و بالا سایہ دار درختوں کا روپ دھار جائیں گے اور نشر واشاعت کا مرکز بن جائیں گے۔

پگڑی والے نوجوان سے ایسے نوجوان کی طرف اشارہ ہے جو طلبہ اور ناشرین میں داخل ہوگا اور ''خلوصی'' کا ہم دوش بنے گا بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے بھی آگے بڑھ جائے! میرا خیال ہے کہ وہ انہیں میں سے کوئی ایک ہوگا۔ لیکن قطعی فیصلہ نہیں کر رہا ہوں وہ نوجوان عنقریب ولایت کی قوّت سے مزیّن ہو کر میدان میں نکلے گا۔

خواب کے بقیہ نقاط کی تعبیر میری بجائے آپ خود کر لیں۔

آپ جیسے دوستوں کے ساتھ طویل تر گفتگو کرنا بڑی لذیذ، سودمند اور مقبول ہے، اس لیے میں نے اس چھوٹے سے مسئلے میں سلسلۂ کلام کو ذرا دراز کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے میں نے اسراف سے کام لیا ہو، لیکن بات شروع چونکہ اس نیت سے کی تھی کہ نیند کے ساتھ تعلق رکھنے والی قرآنی آیات کی طرف کچھ اشارہ ہو جائے، اس لیے اُمید ہے کہ اس اسراف سے درگزر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔ یا ہوسکتا ہے کہ اسے اسراف سمجھا ہی نہ جائے!

دُوسرا مسئلہ جو کہ دوسرا خط ہے

یہ مسئلہ ایک حدیث شریف پر وارد ہونے والے اشکال کو حل کرنے اور اس کے بارے میں جنم لینے والے مناقشے کو ختم کرنے کے لیے لکھا گیا ہے، جس حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت عزرائیلؑ کی آنکھ پر تھپڑ دے مارا تھا۔

میں نے سنا ہے کہ ''اگریدر'' میں کوئی علمی بحث مباحثہ ہوا ہے۔ خاص طور پر اِن موجودہ حالات میں اس طرح کی بحثیں کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔

مجھ سے بھی پوچھا گیا تھا۔ جبکہ میں اس طرح کی بحثیں کرنا نہیں جانتا ہوں۔ اور ان لوگوں نے حدیث کی ایک قابلِ اعتماد کتاب سے مجھے ایک حدیث بھی دکھائی تھی جس کے آخر میں ''ق'' کا رمزی اشارہ کیا تھا جس کا مطلب ہے کہ یہ بخاری مسلم کی متفق علیہ حدیث نبوی ہے اور پوچھا گیا کہ یہ حدیث ہے یا نہیں؟

تو میں نے کہا: جی ہاں؛ یہ واقعتاً حدیث ہے، اور جس نے اس طرح کی معتبر کتاب میں یہ حکم لگایا ہے کہ اس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں نے متفقہ طور پر روایت کیا ہے، اس پر تم لوگوں کو اعتماد کرنا چاہیے۔۔۔ بس یہ بات ذہن میں رکھیں کہ جس طرح قرآن کریم میں کچھ آیتیں متشابہ ہیں اسی طرح کچھ احادیث بھی متشابہات کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، ان کے گہرے معانی کا ادراک صرف خواص علماء ہی کر سکتے ہیں۔

میں نے یہ بھی کہا: اس بات کا احتمال موجود ہے کہ اس حدیث کا ظاہر بھی ''مشکلات الحدیث'' کی طرح متشابہات کی قسم میں آتا ہو۔

مجھے اگر اس حدیث کے بارے میں ہونے والے بحث مباحثے کا علم ہوتا تو میں صرف اس مختصر سے جواب پر ہی اکتفا نہ کرتا بلکہ میرا جواب کچھ اس طرح کا ہوتا:

اوّلاً: اس قسم کے مسائل میں بحث ومناقشے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ضد وتعصب سے کنارہ کش رہا جائے، انصاف سے کام لیا جائے اور نیت یہ ہو کہ حق واضح ہو جائے، بحث ومناقشہ ایسے لوگوں میں چلے جن میں اس چیز کی قابلیت ہو اور یہ کہ وہ غلط فہمی اور بدآموزی کا سبب نہ بنے۔ پس مناقشہ کی یہی ایک صورت ہے جس میں بحث ومناقشہ کی اجازت ہے۔

اور اس بات کی دلیل کہ وہ بحث ومناقشہ حق تک پہنچنے کے لیے ہے، یہ ہے کہ:

حق اگر مدِّ مخالف کے ہاتھ سے ظاہر ہو جائے تو غمگین نہ ہو بلکہ خوشی کا اظہار کرے کیونکہ اسے ایک ایسی چیز کا علم ہو گیا ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ اور اگر وہ حقیقت اُس کے ہاتھ سے ظاہر ہو جاتی تو اُس کے علم میں اضافہ نہ ہوتا بلکہ ہو سکتا ہے وہ غرور میں مبتلا ہو جاتا!

ثانیاً: بحث و مناقشے کا موضوع اگر حدیث شریف بنی ہے تو پھر حدیث کے مراتب کی معرفت اور ''وحی ضمنی'' کے درجات اور کلام نبوی کی اقسام کا ادراک ہونا چاہیے؛ اور عوام الناس کے سامنے مشکلات الحدیث کے بارے میں بحث و مناقشے کا ماحول بنانا اور ایک وکیل کی طرح اپنی فضیلت کا اظہار کرنے کی صورت میں، اپنی ذات کو حق و انصاف پر ترجیح دینے کی صورت میں اپنے دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لیے دلائل ڈھونڈنا جائز نہیں۔

لیکن مسئلے کا دروازہ چونکہ کھل گیا ہے اور بحث و مناقشے کا دارومدار بن چکا ہے، اس لیے اس کی بُری تاثیر ان عوام الناس کے ذہنوں پر بہر کیف ضرور پڑے گی جو اس طرح کی متشابہ حدیثوں کا استیعاب نہیں کر سکتے ہیں؛ کیونکہ اگر وہ اپنی عقل کی محدودیت کی وجہ سے اس طرح کی متشابہ احادیث کا انکار کر دے گا تو ایک خطرناک دروازہ کھول بیٹھے گا، یعنی ان قطعی احادیث کے انکار کا راستہ بھی کھول دے گا جو اس کی چھوٹی سی عقل میں سما نہیں پا رہی ہوں گی۔ اور اگر حدیث کا ظاہری مفہوم لے لے گا اور اس کا پرچار کرنا شروع کر دے گا، تو اہلِ ضلالت کے اعتراضات کا دروازہ کھول دے گا اور انہیں یہ کہنے کا موقع دے گا کہ: یہ سب خرافات ہیں۔

اور اب چونکہ گہری نظر غیر ضروری طور پر اور نقصان دہ صورت میں اس متشابہ حدیث کی طرف متوجہ ہو گئی ہے، اور اس طرح کی احادیث ہیں بھی بہت زیادہ؛ اس لیے ایسی ''حقیقت'' کی وضاحت کرنا ضروری ہو گیا ہے جو شبہات کا ازالہ کر دے، خواہ یہ حدیث قطعی طور پر ثابت ہو یا نہ ہو، پس اس حقیقت کی وضاحت کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔

اس مقام پر ہم اس حقیقت کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کریں گے اس حقیقت کی تفصیلات چونکہ ہم رسائل نور میں بیان کر چکے ہیں، جیسے کہ چودھویں مقالے کے ''بارہ اصولوں'' کی ''تیسری اور چوتھی شاخ'' میں ہے، اور انیسویں مکتوب کے مقدّمے کی اُس بنیاد میں ہے جہاں وحی کی اقسام کا ذکر ہے؛ اس لیے اس مقام پر ہم اس کی طرف ایک اجمالی سا اشارہ کرنا ہی کافی سمجھیں گے، اور وہ یہ ہے کہ:

فرشتے انسان کی طرح ایک ہی صورت میں منحصر نہیں ہوتے۔ اور جب وہ متشخّص ہوں تو ایک کلّی کے حکم میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ عزرائیلؑ جو کہ اُن فرشتوں کے نگران ہیں جن کی ڈیوٹی ارواح کو قبض کرنے پر لگی ہوئی ہے، کیا وہ ہر ایک کی روح کو بذاتِ خود قبض کرتے ہیں، یا اُن کے معاونین؟ اس بارے میں تین مسلک ہیں:

پہلا مسلک: عزرائیلؑ ہی ہر ایک کی رُوح قبض کرتے ہیں، اور کوئی کام دوسرے کام میں رُکاوٹ نہیں بنتا؛ کیونکہ وہ نورانی ہیں۔ اور جو نورانی ہو غیر محدود جگہوں میں بذاتہٖ موجود ہوتا ہے اور غیر محدود آئینوں کی وساطت سے وہاں متمثّل ہوتا

ہے۔نورانی کے تمثّلات اس نورانی شخص کے خواص کے مالک ہوتے ہیں اور عین بعین وہی شمار ہوتے ہیں اس کے غیر نہیں۔

تو جس طرح آئینوں میں نظر آنے والی سورج کی مثالی صورتیں سورج کی روشنی اور اس کی حرارت کو ظاہر کرتی ہیں، اسی طرح ملائکہ جیسے رُوحانیوں کی وہ صورتیں جو عالمِ مثال کے مختلف آئینوں میں ہیں، عین بعین وہی ہیں اوران کے خواص کو ظاہر کرتی ہیں، صرف یہ ہے کہ ان کا یہ تمثّل یعنی مثالی جسم آئینوں کی قابلیت کے حساب سے ہوتا ہے؛ جیسے کہ جبریلؑ ایک ہی وقت میں اور عین اُس لمحے جب وہ صحابہ کے درمیان ''دحیہؓ'' کی صورت میں نظر آرہے ہوتے ہیں، مختلف صورتوں میں ہزاروں جگہوں میں موجود ہوتے ہیں، اور اپنے مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلے ہوئے ہیبت ناک وسیع پردں کے ساتھ عرشِ اعظم کے سامنے سجدہ کررہے ہوتے ہیں۔گویا کہ وہ ہر جگہ پر اس جگہ کی قابلیت کے حساب سے اپنی مثالی صورت کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اوران کی یہ موجودگی آنِ واحد میں ہزاروں جگہ پر ہوتی ہے۔

پس اس مسلک کی روشنی میں یہ بات قطعاً محال، خلافِ معمول اور غیر معقول نہیں کہ انسان کی رُوح کے قبض ہوتے وقت انسان کے سامنے ملکُ الموت کی مثالی شکل نے ہی۔جو کہ ایک جزوی انسانی مثال ہے -سیدنا موسیٰؑ جیسے جلیل القدر تیز طبیعت کے مالک اور صاحبِ عزم پیغمبر کا طمانچہ کھایا ہو اور اُس مثالی فرشتے کی وہ آنکھ پھوٹ گئی ہو جو اس مثالی صورت کے لبادے میں لگی ہوئی تھی جس لبادے میں وہ آیا تھا!

دُوسرا مسلک: جبریل، میکائیل اور عزرائیل جیسے عظیم الشان فرشتے عمومی نگرانوں کا حکم رکھتے ہیں۔اوران کے انہیں کی جنس سے اوران کے ساتھ مشابہت رکھنے والے چھوٹے چھوٹے معاونین بھی ہیں، اور اُن کے یہ معاونین مخلوقات کی انواع واقسام کے حساب سے مختلف ہیں، چنانچہ ایک نوع وہ ہے جو نیک لوگوں کی رُوحیں قبض کرتی ہے۔(حاشیہ:۱)

اور ایک نوع وہ ہے جو بدبختوں کی روحیں قبض کرتی ہے، جیسے کہ آیتِ کریمہ ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا۔ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا﴾ (حاشیہ:۲)

اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ روحیں قبض کرنے والے بہت سے گروہ ہیں۔

پس اس مسلک کی رُو سے موسیٰؑ نے عزرائیل کو نہیں مارا بلکہ ان کا اپنی فطری جلالت کی بنا پر، اپنی خلقی قوّت اور اللہ

(حاشیہ:۱) ہمارے علاقے کے ایک ''سیدا'' کے لقب سے مشہور عظیم الشان ولی اللہ پر جب سکراتُ الموت کی حالت طاری ہوئی اور اولیاء کی ارواح کو قبض کرنے والا فرشتہ ان کے پاس آگیا تو انہوں نے چلا کر کہا: مجھے طالب علموں سے بہت پیار ہے اس لیے میری روح فرشتوں کا وہی گروہ قبض کرے جن کی ڈیوٹی طالب علموں کی روحیں قبض کرنے پر لگی ہوئی ہے۔اور وہ اسی طرح دربارِ الٰہی میں گریہ زاری کرتے رہے۔ اس واقعہ کی شہادت ان تمام لوگوں نے دی جو اس وقت وہاں موجود تھے۔مؤلف۔

(حاشیہ:۲) ''قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں اور آہستگی سے نکال کرلے جاتے ہیں''

کے ہاں اپنی شان وشوکت کی بنا پر عشق الٰہی کی سرشاری میں عزرائیل کے معاونین میں سے کسی معاون کے مثالی جسم کو طمانچہ مارنا بالکل معقول ہے (حاشیہ:۱)

تیسرا مسلک: بعض فرشتے ایسے بھی ہیں جن کے پاس چالیس ہزار سر ہیں، ہر سر میں چالیس ہزار زبانیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی اسی ہزار آنکھیں ہیں۔ اور ہر زبان میں چالیس ہزار تسبیحات ہیں جیسے کہ احادیث سے پتا چلتا ہے اور جیسے کہ انتیسویں مقالے کی چوتھی بنیاد میں واضح کیا گیا ہے۔

جی ہاں؛ جب فرشتوں کو عالمِ شہادت کی انواع کے حساب سے ذمہ داری سونپ دی گئی ہے اور وہ عالمِ اَرواح میں ان انواع کی تسبیحات کی نمائندگی کرتے ہیں، تو ایسا ہونا بہت ضروری ہے، کیونکہ مثال کے طور پر روئے زمین ایک مخلوق ہے جو اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کی بہت سی انواع ہیں جو اُس کے سروں کی حیثیت رکھتی ہیں، اور یہ انواع چالیس ہزار کی نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں، اور ہر نوع کے بہت سے افراد ہیں جو لاکھوں زبانوں کا حکم رکھتے ہیں۔۔۔

پس اس مسلک کی روشنی میں عزرائیلؑ کے بہت سے چہرے ہیں جو ہر فرد کی طرف متوجہ ہیں اور اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اور موسیٰؑ کا عزرائیل کو لگنے والا طمانچہ حاشا وکلا عزرائیلؑ کی شخصیت کی اصلی ماہیت اور حقیقی شکل پر نہیں لگا ہے اور نہ ہی اس میں اُن کی کوئی تحقیر یا اہانت ہے، اور نہ ہی یہ بات ہے کہ آپؑ نے عزرائیلؑ کو قبول نہیں کیا ہے! بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپؑ کی آرزو یہ تھی کہ وظیفۂ رسالت قائم دائم اور بقاء بدوش رہے؛ اسی بنا پر انہوں نے اس آنکھ پر تھپڑ دے مارا جو اُن کی اجل کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھی اور ان کی پیغمبرانہ ذمہ داری کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔۔۔ اُن کے لیے اس طرح کی آنکھ کو تھپڑ رسید کرنا بنتا بھی تھا۔۔۔!

اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَلَا يَعْلَمُ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ، قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَاللّٰهِ

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾

تیسرا مسئلہ جو کہ تیسرا خط ہے

[یہ مسئلہ ایک عموی سوال کا خاص، خصوصی پنہاں اور راز دارانہ جواب ہے جو میرے تمام بھائی کرتے ہیں ان میں سے اکثر لوگ یہ سوال زبانِ حال سے کرتے ہیں اور بعض زبانِ مقال سے۔]

(حاشیہ:۱) ہمارے علاقے میں ایک بڑا بہادر آدمی تھا، اس نے سکرات الموت میں جب ملک الموت کو دیکھا تو کہا: آپ میری رُوح اس حالت میں قبض کرنا چاہتے ہیں کہ میں بستر پر پڑا ہوا ہوں؟ یہ کہہ کر وہ اُٹھا، اپنے گھوڑے پر چڑھا اور ہاتھ میں تلوار پکڑ کر اُسے للکارتا ہوا بھاگ نکلا۔ اور ایک بہادر آدمی کی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر ہی فوت ہوا۔ مؤلف۔

سوال: آپ اپنے ہر ملاقاتی سے یہ کہتے ہیں کہ: ''میری شخصیت سے کسی قسم کی ہمت افزائی اور مدد کا انتظار مت کرو اور مجھے کوئی بابرکت آدمی بھی مت سمجھو؛ کیونکہ میں کوئی صاحبِ مقام آدمی نہیں ہوں''۔

اور آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''جیسے ایک عام سپاہی فیلڈ مارشل کے مقام کے اوامر کو آگے پہنچاتا ہے، میں بھی ایک بلند پایہ فیلڈ مارشل کے اوامر کو آگے پہنچاتا ہوں''۔

پھر یہ کہ جس طرح کوئی ''مفلس آدمی انتہائی قیمتی ہیروں کی دکان کا ایجنٹ ہوتا ہے، اسی طرح میں بھی مقدس قرآنی دکان کا ایجنٹ ہوں''۔ آپ کچھ اسی طرح کہتے ہیں، لیکن ادھر حالت یہ ہے کہ جیسے ہماری عقلیں علم کی محتاج ہیں اسی طرح ہمارے دل بھی فیض کے طالب ہیں اور ہماری روحیں بھی نور سے منوّر ہونا چاہتی ہیں۔۔۔ یوں ہم کئی مختلف جہتوں میں بہت سی چیزوں کے طالب ہیں۔ اور آپ کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ ہماری ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں، اس لیے ہم آپ کی ملاقات کے لیے چلے آتے ہیں؛ کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں عالمِ دین سے بڑھ کر ایک ولی اللہ، ایک صاحبِ ہمت اور ایک صاحبِ کمالات آدمی چاہیے۔

لیکن اگر حقیقتِ حال وہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں، تو پھر تو ہمارا آپ کی ملاقات کو آنا غلطی ہے؟ گویا کہ وہ زبانِ حال سے کچھ اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

الجواب: پانچ نقطے سنو اور پھر سوچو کہ تمہاری یہ ملاقاتیں بے سود ہیں یا سُود مند! پھر جو فیصلہ چاہو کر لو۔

پہلا نقطہ:

جیسے کسی بادشاہ کا ایک مسکین سا سپاہی اور معمولی سا غلام بادشاہ کی ترجمانی کرتا ہوا افسروں اور جرنیلوں کو شاہی تحفے اور میڈل پیش کرتا ہے اور اس طرح اُنہیں زیرِ بارِ احسان کرتا رہتا ہے۔ اب اگر وہ افسر اور مشیر یہ کہیں کہ ہم اس عام سے سپاہی کے سامنے خود کو ذلیل کر کے اس عام سے سپاہی سے احسان اور میڈل کیوں لے رہے ہیں؟ یہ بات مغرورانہ دیوانگی ہوگی۔ لیکن یہی سپاہی اپنی ڈیوٹی کے بعد اگر اس فیلڈ مارشل کے ادب واحترام میں کھڑا نہ ہو اور خود کو اس سے بڑا سمجھنے لگے تو یہ بے وقوفی پر مبنی پاگل پن ہوگا۔

اور اسی طرح اگر ان تحفوں سے خوش ہونے والے افسروں میں سے کوئی ایک اپنے مقام و مرتبے سے اتر کر متشکرانہ انداز میں اس سپاہی کے مورچہ میں مہمان بن کر جاتا ہے تو بلاشبہ بادشاہ کہ جسے اُن حالات کا علم ہوتا ہے اپنے اس مخلص خادم کے معزز مہمان کے لیے شاہی باورچی خانے سے کھانا بھیج دیتا ہے تا کہ وہ سپاہی شرمندگی سے بچ جائے جس کے گھر سوکھی روٹی کے ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اسی طرح قرآنِ حکیم کا ایک سچا خادم کتنا بھی عامیانہ حیثیت کا مالک کیوں نہ ہو، خود قرآن حکیم ہی کی ترجمانی کرتا ہوا

بغیر کسی تردّد اور پہلو تہی کے اس کے اوامر کو بڑے سے بڑے لوگوں تک پہنچاتا ہے اور سب سے زیادہ مالدار روح کے مالک لوگوں کو قیمتی جواہرات آہ و پکار کر کے تذلل کے ساتھ نہیں بلکہ فخر و استغناء کے ساتھ بیچتا ہے۔

اور وہ لوگ کتنے بھی بڑے کیوں نہ ہوں اس عام سے خادم کے مقابلے میں۔ جب وہ اپنی ڈیوٹی نبھا رہا ہو۔ تکبر کا مظاہرہ نہیں کر سکتے اور وہ خادم بھی جب ان کے پاس آئے گا تو تو میں مبتلا نہیں ہوگا اور اپنی حد سے آگے نہیں بڑھے گا۔

قرآن کریم کے ان مقدس قیمتی جواہرات کے خریداروں میں سے اگر کوئی اس نادار خادم کو ایک نیک ولی، کوئی بہت بڑا انسان سمجھتا ہے، تو یاد رکھو کہ قرآنی حقیقت کی اس مقدس رحمت کی شان یہی ہے کہ اُن کی مدد کرے، اُن کی ہمت بندھائے اور اس خادم کے علم میں لائے بغیر اور اس کی مداخلت کے بغیر اللہ تعالیٰ کے خزانۂ خاص سے انہیں نہال کرتی جائے تاکہ اس کا یہ خادم اپنے معزز مہمان کے سامنے شرمندہ نہ ہونے پائے۔

دوسرا نقطہ:

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا ہے: ''ایمانی حقائق کے صرف ایک مسئلے کا منکشف اور واضح ہو جانا میرے نزدیک ہزاروں اذواق و کرامات پر بھاری ہے، اور تمام طرق کی غرض وغایت اور نتیجہ یہی ہے کہ ایمانی حقائق کا انکشاف اور ان کی وضاحت ہو جائے۔۔۔ طریقت کا مجدد الف ثانیؒ جیسا بطلِ جلیل جب اس طرح کا فیصلہ صادر کرتا ہے تو بلاشبہ ''مقالات'' جو کہ ایمان کے حقائق کی مکمل وضاحت کرتے ہیں، اور جو اسرارِ قرآن سے مرشح ہیں وہ ولایت کے مطلوبہ نتائج کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

تیسرا نقطہ:

آج سے تیس سال قبل قدیم سعید کے غافل سر پر سخت قسم کے طمانچے پڑنے کی وجہ سے اُس نے ''اَلْمَوْتُ حَقٌّ'' والے قضیے کا تصور باندھا تو اُسے نظر آیا کہ وہ کیچڑ میں پڑا ہوا ہے۔ تب اُس نے بچ کر نکل جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور اس سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈا۔۔۔ لیکن اس نے دیکھا کہ راستے مختلف ہیں۔۔۔

اس لیے وہ تردّد میں سرگرداں رہا۔۔۔ تب اس نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ''فتوح الغیب'' نامی کتاب سے فال نکالی، چنانچہ اُس نے اُسے کھولا تو اس میں یہ عبارت نظر آئی: اَنْتَ فِیْ دَارِ الْحِکْمَةِ فَاطْلُبْ طَبِیْبًا یُدَاوِیْ قَلْبَكَ (حاشیہ)

اور عجیب بات یہ ہے کہ میں ان دنوں ''دارُ الحکمۃ الاسلامیۃ'' میں بطور عضو کام کر رہا تھا۔ اور گویا کہ میں اہلِ اسلام کے زخموں کی علاج و مداوا کرنے والا حکیم و معالج تھا، حالانکہ میں خود شدید بیمار تھا، اور بیمار کو چاہیے کہ سب سے پہلے خود اپنا

(حاشیہ) ''تو دارُ الحکمت میں ہے، اس لیے کوئی ایسا طبیب تلاش کر جو تیرے دل کا علاج کرے''۔

علاج کرے پھر دوسروں کی طرف توجہ کرے۔

شیخ نے مجھے ایسے ہی مخاطب کیا اور کہا: تُو مریض ہے اس لیے کوئی طبیب تلاش کر جو تیرا علاج کرے۔ تو میں نے کہا: آپ ہی میرے طبیب بن جائیں۔

تب میں نے خود کو اُن کا مخاطب سمجھ کر کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن اُن کی کتاب کا لہجہ بہت سخت تھا، میرے غرور کو ہولناک طریقے سے توڑتا چلا جا رہا تھا، چنانچہ اس نے میرے نفس میں شدید قسم کے عملِ جراحی کا کام کیا جسے میں برداشت نہ کر سکا، چنانچہ میں اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کتاب صرف آدھی پڑھ سکا؛ کیونکہ میرا ذہن یہی بن چکا تھا کہ اس کا رُخ میری طرف ہے اور اس کا مخاطب میں ہی ہوں اس لیے اُسے مکمل کرنا میرے بس میں نہ رہا۔ تب میں نے کتاب کو واپس الماری میں رکھ دیا۔۔۔ پھر کچھ عرصے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اُس شفا بخش عملِ جراحی کی وجہ سے پیدا ہونے والے آلام ختم ہو گئے ہیں اور اُن کی جگہ ایک قسم کی لذّت نے لے لی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے پہلے استاد کی کتاب مکمل پڑھ ڈالی اور اس سے بہت فائدہ اُٹھایا اور اس کے اَوراد و وظائف و مناجات کو کان لگا کر غور سے سنا اور نہال ہو گیا۔

پھر میرے ہاتھ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی ''مکتوبات'' نامی کتاب لگی، میں نے اُسے نیک فالی کی نیت سے کھولا تو اس میں صرف دو مکتوبات میں ''بدیع الزمان'' کا لفظ پایا جاتا ہے۔ میں نے ان دو مکتوبات کو کھول کر دیکھا تو وہ دونوں ''میرزا بدیع الزمان'' نامی آدمی کی طرف لکھے گئے تھے؛ تو میں نے کہا سُبْحَانَ اللّٰہ یہ تو مجھ سے ہی مخاطب ہے کیونکہ میرے والد کا نام ''میرزا'' اور اس دور میں قدیم سعید کا لقب ''بدیع الزمان'' تھا۔ اور میرے علم میں چوتھی صدی ہجری میں گزرنے والے ''بدیع الزمان ہمدانی''، کے علاوہ کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جو اس لقب سے مشہور رہا ہو!

اس لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ امامِ ربانی کے زمانے میں اس نام کا آدمی ضرور رہا ہو گا جس کی طرف یہ دونوں خط لکھے گئے ہیں! اور ضروری ہے کہ اس آدمی کے حالات بھی میرے حالات کے ساتھ ملتے جلتے ہوں گے! اس لیے مجھے ان مکتوبوں میں اپنی بیماری کی دوا مل گئی۔

امام ربانی ان دو مکتوبوں کی طرح دیگر مکتوبات میں بھی پورے اصرار اور تاکید کے ساتھ وصیت کرتے ہیں کہ:

اپنا قبلہ ایک ہی بناؤ، یعنی کسی ایک شخص کو اُستاد و مرشد بنا کر اس کے پیچھے چلو اور دیگر کسی کے ساتھ بھی خود کو مشغول نہ کرو۔

اُن کی یہ اہم وصیّت میری استعداد اور روحانی حالات کے موافق نہ بیٹھ سکی، میں سوچتا رہتا تھا کہ کس کے پیچھے لگوں اس کے یا اُس کے؟ چنانچہ میں حیران و سرگرداں رہا، کیونکہ ہر ایک میں مختلف پُرکشش خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لیے میں کسی ایک پر اکتفا نہیں کر سکتا تھا۔

میں اسی حیرت میں سرگرداں تھا کہ اچانک اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دل پر یہ بات وارد ہوئی کہ مختلف طرق کا سرِ آغاز، ندی نالوں کا سرچشمہ اور ان تمام سیاروں کا سورج قرآنِ حکیم ہے، اور قبلہ کو حقیقی طور پر ایک بنانے کا طریقہ صرف قرآن میں ہی ہے، اس بنا پر وہی مرشدِ اعلیٰ اور استادِ اقدس ہے۔۔۔تب اسی دن سے میں نے اپنی تمام تر توجہ قرآن کریم پر مبذول کر دی اور اس کے دامن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ یہ بات کسی بھی شک وشبے سے بالاتر ہے کہ میری ناقص پراگندہ قابلیت اس مرشد حقیقی سے کماحقہٗ فائدہ نہیں اُٹھا سکتی، البتہ اس کا فیضان جو کہ آبِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے اُسے اپنی حیثیت سے چوس سکتی ہے۔ اور اُس کے فیضان سے یہ بات بھی ممکن ہے کہ ہم اہلِ قلب اور اصحابِ حال کو ان کے درجات کے حساب سے اس فیضان کا دیدار کرا سکیں۔ پس ''مقالات'' اور رسائل کی صورت میں قرآن کریم سے کشید کردہ انوار فقط علمی اور عقلی مسائل ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ایمانی، قلبی، روحانی مسائل اور ایمانی احوال ہیں، یہ انتہائی قیمتی اور بلند پایہ معارف الٰہیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چوتھا نقطہ:

صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں سے جو کہ ولایتِ کبریٰ کے حامل اور بلند مرتبے پر فائز ہیں، اپنے تمام لطائف کے حصے قرآن پاک سے حاصل کرتے تھے اور قرآن پاک ان کا حقیقی مرشد اور ان کے لیے کافی تھا اور یہ چیز اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم جیسے ہر دور میں حقائق مہیا کرتا ہے، اسی طرح ہر دور میں ولایتِ کبریٰ کے اہل لوگوں کو اِس ولایت کے فیوض سے بھی نہال کرتا رہتا ہے۔

جی ہاں؛ ظاہر سے گزر کر حقیقت تک پہنچنے کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: یہ کہ طریقت کی برزخ میں داخل ہو اور سیر وسلوک کے ذریعے مراتب طے کرے اور حقیقت تک پہنچ جائے۔

دوسری صورت: طریقت کی برزخ میں داخل ہوئے بغیر محض لطفِ الٰہی سے براہِ راست حقیقت تک جا پہنچے۔ یہ راستہ انتہائی مختصر اور بلند پایہ ہے۔ اور صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا راستہ ہے۔

پس یہ ممکن ہے کہ قرآنی حقائق سے ٹپکنے والے انوار اور مقالات جو ان انوار کی ترجمانی کرتے ہیں اس خاصیت کے مالک ہوں! اور یہ واقعتاً اس خاصیت کے مالک ہیں۔

پانچواں نقطہ:

پانچ جزوی مثالوں کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ ''مقالات'' جیسے حقائق کا علم دیتے ہیں ویسے ہی رہنمائی کا وظیفہ بھی ادا کرتے ہیں۔

پہلی مثال: میرا دس بار یا سو بار نہیں بلکہ ہزار ہا بار کے متعدد تجربات کی بنا پر یہ پختہ اعتقاد بن چکا ہے کہ مقالات اور قرآن کریم سے آنے والے انوار میری عقل کے ساتھ میرے دل کو بھی ایمانی احوال کی سمجھ بوجھ عطا کرتے ہیں اور میری روح کو ایمان کے ذائقوں سے سرشار کرتے ہیں، چنانچہ جس طرح کسی صاحب کرامت شیخ کا کوئی مرید اپنی حاجات و ضروریات کی برآری کے لیے اپنے شیخ سے مدد اور ہمت کا انتظار کرتا ہے، بالکل اسی طرح میں بھی قرآن حکیم کے کرامت والے اسرار سے اپنی دنیوی حاجات تک کی برآری کا انتظار کرتا ہوں تو اکثر اوقات میری حاجات اس طرح پوری ہو جاتی ہیں کہ جس کی مجھے امید اور وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

اس مقام پر میں ان جزئیات سے صرف دو مثالیں ذکر کروں گا:

پہلی مثال: وہ ہے جس کی وضاحت اور تفصیل سولہویں مکتوب میں گزر چکی ہے، اور وہ یہ کہ میرے ''سلیمان'' نامی ایک مہمان کے لیے صنوبر کے درخت کی چوٹی پر سے خارقِ عادت طریقے سے ایک بہت بڑی روٹی ظاہر ہوئی چنانچہ ہم اس غیبی تحفے کو دو دن تک کھاتے رہے۔

دوسری مثال: ایک چھوٹا سا اور بہت لطیف مسئلہ ہے جو انہی دنوں میں پیش آیا، اور وہ یہ کہ:

فجر سے پہلے میرے دل میں یہ بات آئی کہ میری طرف سے کسی آدمی کو کچھ ایسی باتیں نقل کی گئی ہیں جو اس کے دل میں شکوک وشبہات اور وسوسے پیدا کر رہی ہیں، تو میں نے کہا کاش میں اس آدمی کو دیکھ سکوں تو اس کے دِل میں آنے والی کدُورت اور پریشانی کو دور کر سکوں!

اور پھر عین اُسی لمحے اپنی اُس کتاب کا ایک جزء یاد آ گیا جو ''نیس'' نامی گاؤں میں بھیجی گئی تھی، اور جو اُس وقت میرے لیے بہت ضروری تھی۔ تو میں نے کہا: کاش کہ کسی بھی طرح مجھے مل جائے! پھر فجر کی نماز کے بعد بیٹھا ہی تھا کہ وہی شخص دروازے سے اندر آیا اور اس کے ہاتھ میں کتاب کا وہی جزء تھا جو مجھے چاہیے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟

اس نے کہا: میں نہیں جانتا۔ یہ چیز تو مجھے ابھی کسی نے دروازے پر پکڑائی ہے، اور اس نے بتایا تھا کہ وہ ''نیس'' سے آیا ہے۔

تو میں نے حیران ہو کر کہا: سبحان اللہ! اس آدمی کا اپنے گھر سے یہاں تک آنا، اور اس مقالے کا ''نیس'' سے اس وقت پہنچنا کسی بھی طرح اتفاقی بات نہیں ہو سکتی! اور جس نے عین اسی لمحے میں اس جیسے آدمی کے ہاتھ میں اس جیسی کتاب کا یہ حصہ تھما کر میرے پاس بھیجا ہے بلاشبہ وہ قرآن حکیم کی توجہ ہی ہو سکتی ہے۔

تب میں نے کہا: الحمد للہ، کوئی ضرور ہے جو میرے دل کے مخفی ترین غیر اہم اور معمولی قسم کی خواہشات ورغبات کا علم

رکھتا ہے، بلاشبہ اس طرح کی ذات میرے ساتھ مہربانی کا برتاؤ رکھتی ہے اور میری حفاظت کرتی ہے اس لیے پانچ درہموں کے بدلے میں مجھے دنیا کا احسان اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔

تیسری مثال: میرا ''بھتیجا عبدالرحمان'' مرحوم مجھے آج سے آٹھ سال پہلے چھوڑ چکا تھا۔ وہ میرے بارے میں میری حد سے بڑھ کر حسنِ ظن رکھتا تھا، لیکن اس کے باوجود دنیا کی غفلت و اَوہام کے کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔۔۔ چنانچہ وہ مجھ سے اس طرح کی ہمت، توجہّ اور مدد کی توقع رکھتا تھا جو میرے پاس نہیں تھی۔ تب قرآن حکیم کی ہمت نے اُس کی مدد کی اور اُس تک اُس کی وفات سے تین مہینے پہلے دسواں مقالہ یعنی ''رسالۂ حشر'' پہنچا دیا، پس اس رسالے نے اُسے اس کی معنوی آلائشوں سے اور اَوہام وغفلت سے پاک کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنی وفات سے پہلے مجھے جو خط لکھا اس میں تین واضح کرامتوں کا اظہار کیا، گویا کہ وہ ولایت کے مرتبے تک ترقی کر گیا تھا۔ اس کا وہ خط ستائیسویں مکتوب کے فقروں میں درج کر دیا گیا، وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

چوتھی مثال: ''بوردور'' نامی شہر سے میرا ایک صاحبِ دل اُخروی شاگرد اور بھائی تھا، جس کا نام ''حسن آفندی'' تھا۔ وہ میرے متعلق حد سے زیادہ حسنِ ظن رکھتا تھا اور مجھ نادار سے ایسے ہی مدد اور ہمت کی توقع رکھتا تھا جیسے کسی بڑے ولی اللہ سے رکھی جاتی ہے۔ تب ایک دن اچانک میں نے بغیر کسی مناسبت کے ''بوردور'' کے نواحی علاقے میں رہنے والے ایک آدمی کو ''بتیسواں مقالہ'' دیا کہ وہ اس کا مطالعہ کرلے پھر مجھے ''حسن آفندی'' یاد آیا تو میں نے کہا: ''بوردور'' میں جانا ہوا تو یہ رسالہ حسن آفندی کو دینا اور اسے کہنا کہ پانچ چھ دن اس کا مطالعہ کرے۔ وہ آدمی گیا اور رسالہ حسن آفندی کو دے آیا۔ حسن آفندی کی زندگی اس وقت صرف تیس چالیس دن رہ گئی تھی۔ رسالہ ہاتھ لگتے ہی اس نے اُسے سینے سے لگایا اور اس سے ایسے سیراب ہوا جیسے کوئی پیاسا انسان اچانک آبِ کوثر مل جانے سے سیراب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس بتیسویں مقالے کو بار بار پڑھا اور اس سے لگاتار فیض یاب ہوتا رہا۔ تا آنکہ اُسے اس میں اور خاص کر اس کے تیسرے موقف میں کی گئی ''اللہ کی محبت'' والی بحث میں اپنی بیماری کی دوا مل گئی۔ اور اسے اس سے وہ فیض مل گیا جس کی توقع وہ کسی قطبِ اعظم سے رکھے ہوئے تھا۔ چنانچہ وہ صحیح سالم حالت میں مسجد کو گیا، وہاں نماز پڑھی اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ رحمۃ اللہ علیہ

پانچویں مثال: یہ جناب خلوصی صاحب ہیں، اُنہیں مقالات میں۔ جو کہ قرآنی اسرار کے ترجمان ہیں۔ نقشبندی سلسلے سے کہیں زیادہ ہمت، مدد، فیض اور نور ملا، حالانکہ نقشبندی سلسلہ سب سے اہم اور سب سے زیادہ تاثیر والا سلسلہ ہے۔ اُن کی یہ گواہی ستائیسویں مکتوب میں مذکور ہے۔

چھٹی مثال: میرے بھائی عبدالمجید نے اپنے بیٹے عبدالرحمان رحمہ اللہ کے انتقال کر جانے کی وجہ سے بہت زیادہ پریشانی محسوس کی اور انہیں بہت سے دُکھوں نے گھیر لیا۔ اور وہ مجھ سے اس طرح کی معنوی مدد اور ہمت کی توقع رکھتے تھے

جو میرے پاس تھی ہی نہیں، اس لیے میں انہیں دے ہی نہیں سکتا تھا۔ ہمارے درمیان مراسلت کا سلسلہ نہیں تھا، لیکن اب کے میں نے اچانک اُسے چند اہم مقالات اِرسال کر دیے اُنہوں نے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے خط لکھا اور کہا: الحمد للہ میں نجات پا گیا ہوں۔ میں تو گویا حواس باختہ ہو گیا تھا؛ کیونکہ اِن میں سے ہر مقالے نے ایک مرشد کا کام کیا ہے، میں اگرچہ ایک مرشد سے جدا ہو گیا ہوں لیکن مجھے یکبارگی بہت سے مرشد مل گئے اور میں نجات پا گیا۔۔۔ وہ مجھے کچھ اسی طرح لکھتا رہا۔

اور میں نے دیکھا کہ ''عبدالمجید'' ایک نئے خوبصورت مسلک میں داخل ہو گیا ہے اور اپنے سابقہ حالات سے واقعتاً نجات پا گیا ہے۔۔۔

اِن پانچ مثالوں کی طرح اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ: ''ایمانی علوم اور معنوی دوائیں، خاص کر جب قرآنِ حکیم کے اسرار سے براہِ راست اپنے زخموں کے مداوے کے لیے عملی طور پر تجربے میں لایا جائے تو یہ ایمانی علوم اور معنوی دوائیں ہر اُس آدمی کے لیے کافی و وافی ہیں جو ضرورت محسوس کرتا ہے اور انہیں پورے اخلاص اور سنجیدگی کے ساتھ استعمال کرتا ہے''۔ اور اس ضمن میں یہ چیز بالکل غیر اہم ہے کہ ان دوائیوں کو بیچنے والا کیمسٹ کون ہے اور ان کی مشہوری کرنے والا ایجنٹ کون، وہ عام آدمی ہے یا کوئی بلند مرتبہ انسان، مفلس ہے یا مالدار؛ جس طرح کا بھی ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جی ہاں؛ سورج مل جائے تو پھر چراغوں کی لو سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور میں جب سورج کا دیدار کر رہا ہوں، تو پھر مجھ سے چراغ کی روشنی مانگنا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے، اور خاص کر اس وقت جب میرے ہاتھ میں کوئی چیز ہو بھی نہ، بلکہ ضروری بات یہ ہے کہ لوگ اپنی دعاؤں کے ذریعے، معنوی تعاون کے ذریعے بلکہ ہمّت و ارادے کے ذریعے میرا تعاون کریں۔ اور میرا یہ حق بنتا ہے کہ میں ان سے مدد اور تعاون مانگتا رہوں۔ اور انہیں چاہیے کہ وہ جو فیض رسائل کے ذریعے پا رہے ہیں اُس پر راضی رہیں اور اسے کافی سمجھیں۔

﴿سُبۡحَانَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تَكُوۡنُ لَكَ رِضَاءً وَلِحَقِّهِ اَدَاءً وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحۡبِهٖ وَسَلِّمۡ

ایک چھوٹا سا خصوصی خط

جو اٹھائیسویں مکتوب کا تتمہ بن سکتا ہے

میرے دو اُخروی بھائی اور سرگرم شاگرد جناب خسرو اور جناب رأفت کے نام

''مقالات'' کا مجموعہ جو کہ قرآنی انوار سے کشیدہ ہے، اس میں ہم تین قرآنی کرامتوں کو محسوس کرتے تھے، لیکن تم لوگوں نے اپنی کوشش اور ذوق وشوق سے ان تین پر ایک اور چوتھی کرامت کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔

جہاں تک اُن تین کرامتوں کا تعلق ہے جو ہمارے علم میں ہیں، تو اُن میں سے پہلی قرآنی کرامت وہ غیر معمولی سہولت اور تیز رفتاری ہے جو اس کی تألیف میں میسّر آئی ہے، اس حد تک کہ انیسواں مکتوب جو کہ پانچ اقسام پر مشتمل ہے، پہاڑوں اور باغوں میں، کسی بھی کتاب سے مدد لیے بغیر ہر روز تین چار گھنٹوں کے حساب سے صرف تین دن میں یعنی بارہ گھنٹوں میں لکھا گیا۔ تیسواں مقالہ بیماری کی حالت میں پانچ چھ گھنٹوں میں لکھا گیا۔ جنّت کی بحث یعنی اٹھائیسواں مقالہ ''سلیمان'' کے وادی والے باغ میں گھنٹے دو گھنٹے میں لکھا گیا، میں سلیمان اور توفیق بھی اس سرعت رفتاری پر حیران تھے۔ اور اس طرح ان کی تألیف میں قرآن کی یہ کرامت تھی۔

دوسری قرآنی کرامت یہ ہے کہ اس کی کتابت میں غیر معمولی قسم کی سہولت، ذوق وشوق سامنے آیا اور کسی قسم کی اُکتاہٹ کا احساس نہ ہوا۔ چنانچہ ان میں سے کسی بھی ''مقالے'' کے ظہور میں آتے ہی بہت سی جگہوں پر کمال اشتیاق کے ساتھ اس کی کتابت شروع ہو جاتی، حالانکہ اس دور میں اُکتاہٹ اور ملال پیدا کرنے والے بہت سے اسباب موجود ہیں، لیکن ان کی کتابت کو بہت سے اہم مشاغل پر ترجیح دی جاتی تھی۔۔۔

اور تیسری قرآنی کرامت کہ ان کی قراءت بھی اُکتاہٹ پیدا نہیں کرتی، خاص کر اس وقت جب انہیں پڑھنے کی ضرورت محسوس ہو، بلکہ جوں جوں پڑھتے جائیں ذوق وشوق بڑھتا ہے اور اُکتاہٹ قریب نہیں آتی۔

تم لوگوں نے اِن کی ایک چوتھی قرآنی کرامت بھی ثابت کر دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہمارا ''خسرو'' جیسا بھائی جو خود اپنے آپ کو سُست کہتا ہے اور جس نے پانچ سال قبل ''مقالات'' کو سنا تھا اور اُن کی کتابت کے بارے میں سستی کا مظاہرہ کرتا رہا؛ اُسی خسرو نے صرف ایک مہینے کے دوران انتہائی خوبصورتی اور دقتِ نظری کے ساتھ چودہ کتابیں قلم بند کی ہیں۔ بلاشبہ یہ چیز قرآنی اسرار کی چوتھی کرامت ہے، اور خاص کر ''تینتیس دریچوں'' والے مقالے یعنی ''تینتیسویں مکتوب'' کی تو بہت زیادہ قدردانی ہوئی ہے، کہ اُسے انتہائی خوبصورت، جاذبِ نظر اور عمدہ خط کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

جی ہاں؛ دریچے نامی یہ کتاب معرفتِ خداوندی کے باب میں انتہائی قوی اور تابناک کتاب ہے، البتہ پہلے چند دریچوں میں کچھ زیادہ ہی اِجمال اور اختصار سے کام لیا گیا ہے، لیکن آگے جا کر وہ دھیرے دھیرے کھلتے چلے جاتے ہیں اور زیادہ ضوفشاں ہوتے جاتے ہیں، تمام مؤلفات کے برعکس زیادہ تر ''مقالات'' میں تقریباً یہی انداز اپنایا گیا ہے، کہ ان کا آغاز اجمال کے ساتھ ہوتا ہے لیکن پھر تدریجاً کھلتے جاتے اور روشن ہوتے جاتے ہیں۔

چوتھا مسئلہ

جو کہ چوتھا خط ہے

بِاسْمِهٖ سُبْحَانَهٗ ﴿وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾

[ایک معمولی سے واقعے کے بارے میں اُبھرنے والے سوال کا جواب جو میرے بھائیوں کی آنکھیں کھولنے کا باعث ہوگا]

میرے معزز بھائیو!

جمعرات کو ایک معزز مہمان کی آمد پر بغیر وجہ کے آپ لوگوں کی مسجد پر دھاوا بولا گیا ہے، آپ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ اس حادثے کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ لوگ آپ کو تنگ کیوں کر رہے ہیں؟

الجواب: میں مجبور ہو کر اور قدیم سعید کی زبان سے چار نقطے بیان کرتا ہوں، اس اُمید پر کہ یہ نقطے میرے بھائیوں کو متنبہ کرنے کے لیے دارومدار بنیں گے، اور آپ لوگوں کو ان سے اپنے سوالوں کا جواب بھی مل جائے گا۔

پہلا نقطہ:

اس حادثے کی ماہیت جو خلاف قانون، حرص و ہوا پر مبنی اور زندیقیت کو راضی کرنے کے لیے ایک شیطانی سازش اور نفاقی حملہ ہے، جو اس جمعرات کو ہمارے دلوں میں رعب ڈالنے کے لیے، جماعت میں سستی کی فضا پیدا کرنے کے لیے اور مجھے میرے مہمانوں کی ملاقات سے دُور رکھنے کے لیے کیا گیا ہے۔

لیکن عجیب ترین بات یہ ہے کہ جمعرات کے دن میں ایک طرف سیر و تفریح کے لیے گیا تھا، واپسی پر میں نے ایک بہت لمبا کالا سانپ دیکھا، اتنا لمبا کہ جیسے دو سانپ ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیے گئے ہوں۔ یہ میری بائیں طرف سے آیا اور میرے اور میرے ساتھی کے درمیان سے گزر گیا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا: سانپ سے ڈر کر آپ دہشت زدہ ہوئے؟

کیا آپ نے اُسے دیکھا ہے؟

تو اُس نے کہا: کیا؟

میں نے کہا: یہ خوفناک سانپ!

اُس نے کہا: نہیں: مجھے تو نظر نہیں آیا، اور آ بھی نہیں رہا ہے!

میں نے حیران ہو کر کہا: سبحان اللہ! اتنا بڑا سانپ ہمارے درمیان سے گزر گیا ہے، آپ کو نظر کیوں نہیں آیا ہے؟

اُس وقت تو میرے ذہن میں کوئی بات نہ آئی، پھر کچھ دیر کے بعد دل میں آیا کہ: یہ تیرے لیے کوئی اشارہ ہے، ہشیار رہ! پھر میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ یہ انہی سانپوں جیسا ہے جو تجھے رات خواب میں نظر آتے ہیں۔

یعنی سانپ جو مجھے رات کو نظر آتے تھے وہ رات کو نظر آنے والے سانپوں سے مراد یہ ہے کہ اس علاقے کا کوئی افسر جب میرے پاس خیانت کی نیت سے آتا ہے تو مجھے وہ سانپ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ میں نے مدیر سے ذکر کیا اور اُسے کہا: آپ جب میرے پاس غلط نیّت سے آتے ہیں تو سانپ کی صورت میں نظر آتے ہیں، اس لیے محتاط رہیں۔

اس کے پیش رو افسر بھی مجھے بسا اوقات اسی روپ میں نظر آتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سانپ جو میں نے ظاہری صورت میں دیکھا ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مرتبہ ان لوگوں کی خیانت صرف نیت تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ عملی زیادتی کی صورت اختیار کر جائے گی۔ پس ظلم وزیادتی اس مرتبہ ظاہری صورت میں اگرچہ چھوٹی سی ہوگی اور اس سے غرض میری تحقیر تھی۔ مگر اس آفیسر نے ایک بے ضمیر معلّم کی شراکت اور انگیخت سے مسلّح پولیس کو حکم دیا اور کہا: ''ان مہمانوں کو پکڑ لاؤ''۔ مہمان اس وقت مسجد میں تھے اور نماز کی تسبیحات میں مصروف تھے۔ اس حکم سے مقصد مجھے غصہ دلانا تھا اور یہ تھا کہ مجھے غصہ آجائے اور میں ''قدیم سعید'' کی طبیعت کے زیرِ اثر طیش میں آکر ان کے سامنے ان کے اس غیر قانونی اور خاص کرتنگ کرنے والے معاملے کو ماننے سے انکار کردوں۔ لیکن وہ بدبخت یہ نہیں جانتا تھا کہ ''سعید'' کی زبان میں جب قرآن کے کارخانے میں ڈھل کر باہر آئی ہوئی ہیرے کی تلوار ہے، اپنا دفاع اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹوٹی لاٹھی سے نہیں کرتا بلکہ وہ قرآن کی ہیرے والی تلوار کو استعمال کرتا ہے، لیکن ان سپاہیوں کے سروں میں چونکہ عقل تھی، اس لیے انہوں نے نماز و تسبیحات کے ختم ہونے کا انتظار کیا؛ کیونکہ کوئی بھی مُلک یا حکومت نماز ختم ہونے سے پہلے نماز اور مسجد میں دخل اندازی نہیں کرتی۔ افسر اس صورت حال سے غصے میں آگیا اور اس نے ان کے پیچھے گاؤں کے چوکیدار کو بھیج دیا اور کہا: سپاہی میرے حکم کی تعمیل نہیں کر رہے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ مجھے اس طرح کے سانپوں کے ساتھ ٹکر لینے پر مجبور نہیں کرنا۔ اس وقت تک مصروف نہیں کرتا۔ اس لیے میں اپنے بھائیوں کو بھی یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ جب تک کوئی قطعی ضرورت نہ آپڑے ایسے لوگوں کے ساتھ اُلجھ کر ٹائم ضائع مت کرو، ان کے مقابلے میں ان جیسے مت بنو اور جوابِ جاہلاں باشد خاموشی کو سامنے رکھ کر ان کے ساتھ باتیں

مت کرو۔ البتہ یہ نقطہ ذہن میں رکھو کہ:

جس طرح ایک خونخوار درندے کے سامنے کمزوری کا اظہار کیا جائے تو وہ دلیر ہو کر حملہ کر دیتا ہے، اسی طرح حیوانی طبیعت کے درندہ صفت لوگوں کے سامنے کمزوری کا اظہار کرنا انہیں آمادۂ ظلم کرتا ہے۔ اس لیے دوستوں کو چاہیے کہ وہ تمام معاملات پورے احتیاط کے ساتھ سرانجام دیں تاکہ الحاد و زندیقیت کے ہمنوا لوگ ان کی غفلت، سستی اور بے پرواہی سے غلط فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔

دُوسرا نقطہ:

آیتِ کریمہ ﴿وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾

میں صرف ظلم کا آلۂ کار بننے والوں اور ظالموں کا ساتھ دینے والوں کے لیے ہی شدید دھمکی نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اس میں ان لوگوں کے لیے بھی شدید اور دہشت ناک قسم کی دھمکی پائی جاتی ہے جو ظالموں کی طرف ادنیٰ سا میلان یا دل میں اُن کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

کیونکہ جیسے کفر پر راضی رہنا کفر ہے اسی طرح ظلم پر راضی رہنا بھی ظلم ہے۔

کسی اہلِ کمال نے اس آیت کے گوہروں میں سے ایک گوہر کو اپنے اس قول کے ساتھ بڑے کمال انداز سے اُجاگر کیا ہے۔

ظالم کا تعاون کرنے والا دنیا کا کمینہ ترین انسان ہے۔

بیداد گر شکاری کی خدمت کر کے لذّت لینے والا کُتا ہے۔ (حاشیہ)

جی ہاں؛ کچھ لوگوں کا بیوپار سانپوں جیسا ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کا کُتوں جیسا۔

کیونکہ جو اس طرح کی مبارک رات میں کسی مبارک دُعا میں مصروف مبارک مہمان کی جاسوسی کرتا ہے اور پھر ہمارے خلاف مخبری کرتا ہے اور ہمارے اس طرح سے دَرپے آزار ہو جاتا ہے کہ گویا ہم نے کسی بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہو؛ بلاشبہ ایسا آدمی اس سزا کا حق دار ہے جو اس شعر سے سمجھ میں آ رہی ہے۔

تیسرا نقطہ:

سوال: آپ پرلے درجے کے ضدی، ہٹ دھرم اور شدید نافرمان قسم کے لوگوں کی اصلاح کی راہ میں اُن کی رہنمائی کرنے کے لیے قرآن کریم کی قوّت پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کے فیضان سے اِلہام چاہتے ہیں، آپ بالفعل ایسا کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں تو پھر اپنے قریبی حدود فراموش لوگوں کو دعوت کیوں نہیں دیتے اور انہیں سیدھا راستہ کیوں نہیں

(حاشیہ) اصل شعر ترکی زبان میں یہ ہے۔

معین ظالمین دنیادہ، اربابِ دنائیدر ... کوپکدر ذوق آلان صیادِ بی انصافہ، خدمتدن۔ مترجم۔

دکھاتے؟

الجواب: اصولِ شریعت کا ایک اہم قاعدہ ہے کہ: "اَلرَّاضِیُ بِالضَّرَرِ لَا یُنْظَرُ لَہٗ" ۔ مطلب یہ کہ جو خود اپنی رغبت سے اور جانتے بوجھتے خرابی پر راضی ہو اس کی طرف شفقت و رحمت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ پس میں تو قرآن کریم پر اعتماد کرتا ہوا اور الحاد میں بہت آگے تک جا چکے ہوئے مُلحد کو چند گھڑیوں میں اگر مکمل طور پر مطمئن نہ بھی کر سکوں تو اُسے خاموش کر دینے کی استعداد کے بل پر دعوت دیتا ہوں، بشرطیکہ وہ کوئی پست ذہن آدمی نہ ہو اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جو گمراہی کا زہر پھیلانے میں لطف گیر ہوتے ہیں، جیسے سانپ اپنا زہر پھیلا کر لطف لیتا ہے۔ البتہ انسانی صورتوں میں چلنے پھرنے والے ان سانپوں کو مخاطب کرنا اور اپنی دنیا کی وجہ سے نفاق میں دھنسی ہوئی گمراہی کی گہرائیوں تک گرے ہوئے وجدان کے ساتھ کلام کرنا، کہ جس دنیا کے بدلے وہ جانتے بوجھتے ہوئے اپنے دین کو بھی بیچ ڈالتا ہے اور جانتے بوجھتے ہوئے قیمتی ہیروں کے بدلے کانچ کے میلے کچیلے فضول ٹکڑے لیتا ہے۔

میں کہتا ہوں ایسے ہی لوگوں کے ساتھ مخاطب ہونا اور انہیں حقائق سے آگاہ کرنا، حقیقت کے حق پر ظلم کرنے اور اس کی شان گھٹانے کے مترادف ہے؛ کیونکہ یہ کام ایک مشہور مَثَل "کَتَعْلِیْقِ الدُّرَرِ فِیْ اَعْنَاقِ الْبَقَرِ" کے مطابق "گائیوں کی گردنوں میں ہیرے لٹکانے" کے مترادف ہے۔

کیونکہ جو لوگ اس طرح کے کام کرتے ہیں وہ رسائل نور کے حقائق بارہا مرتبہ سُن چکے ہیں، اور وہ ان حقائق کی پہچان رکھنے کے باوجود ضلالت و زندیقیت کی مقابلے میں ان کی قیمت گرانے کے درپے رہتے ہیں۔ پس یہ لوگ سانپوں کی طرح ہیں جنہیں زہر میں لذت ملتی ہے۔

چوتھا نقطہ:

ان سات سالوں میں جو معاملات میرے ساتھ کیے گئے ہیں یکسر ذاتیات کے تحت اور قانون سے ماوراء ہیں؛ کیونکہ جلاوطنوں؛ حوالاتیوں اور قیدیوں کے قوانین اتنے واضح ہیں کہ ہر کوئی جانتا ہے۔

چنانچہ یہ تمام لوگ قانون کے مطابق اپنے اعزّہ و اقرباء کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں اور انہیں باہم مل بیٹھنے سے روکا نہیں جاتا۔ پھر عبادت اور اطاعت ہر ملک اور ہر قوم و ملت میں محفوظ سمجھی جاتی ہے۔ پھر میرے جیسے جلاوطن لوگ شہروں میں اپنے دوستوں رشتہ داروں کے ساتھ قیام پذیر ہیں، انہیں میل جول، خط و کتابت اور سیر و سیاحت سے منع نہیں کیا جاتا،

لیکن مجھے منع کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ میری مسجد پر اور میری عبادت پر زیادتی کی گئی اور یہ جبر و اکراہ کہ مجھے نمازوں کے بعد کلمۂ توحید کا ورد کرنے سے روک دیا گیا جو کہ شافعی مسلک میں نماز کے بعد پڑھی جانے والی تسبیحات کے ضمن میں ایک سنّت کا درجہ رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ "بوردور" نامی شہر کے قدیم مہاجرین میں سے ایک "شباب" نامی اَن پڑھ سا آدمی اپنی ساس

کے ساتھ آب وہوا کی تبدیلی کے لیے یہاں آیا اور میرا ہم وطن ہونے کے ناطے مجھے ملنے آگیا۔لیکن تین مسلح سپاہیوں نے اُسے مسجد سے باہر بلالیا۔ پھر اس آفیسر کو اپنی خلافِ قانون حرکت کا احساس ہوا تو یہ کہہ کر معذرت کر لی: ''میں معذرت چاہتا ہوں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ ہماری ڈیوٹی ہے'' اور اس آدمی کو جانے کی اجازت دے دی۔

اس طرح کے تمام اُمور و معاملات کو اگر اس واقعہ پر قیاس کیا جائے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ میرے ساتھ یہ سلوک محض حرص و ہوا کے تحت کیا جارہا ہے، چنانچہ یہ لوگ مجھ پر سانپ اور کتے مسلط کر دیتے ہیں اور میں انہیں خاطر میں نہیں لاتا اور خود کو اُن کے مرتبے پر نہیں اُتارتا ہوں اور ان نقصان دہ لوگوں کو ان کے شر سے بچنے کے لیے اللہ کے سپرد کر دیتا ہوں۔

لیکن وہ لوگ جنہوں نے یہ واقعہ برپا کیا تھا جو ہماری جلاوطنی کا سبب بنا، وہ اس وقت اپنے اپنے علاقوں میں ہیں، اور ان میں سے اصحاب نفوذ رؤساء اپنے قبیلوں کی سرداری کر رہے ہیں، کیونکہ ان سب کو آزاد کر دیا گیا، صرف میں اور دو آدمی اور رہ گئے ہیں، ہم تینوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ میرا ان کی اس بدبخت دنیا کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ میں نے یہ صورت حال بھی قبول کر لی اور کہا: کہ چلو کوئی بات نہیں۔

لیکن پھر ان دونوں میں سے ایک کو کسی علاقے میں مفتی کا عہدہ مل گیا۔ اب وہ اپنے علاقے کے علاوہ ہر جگہ گھومتا پھرتا ہے اور انقرہ بھی چلا جاتا ہے۔ اور دوسرے کو اس حالت میں رکھا گیا ہے کہ وہ استنبول میں اپنے چالیس ہزار ابنائے وطن کے درمیان رہتا ہوا ہر ایک سے مل سکتا ہے۔ پھر یہ دونوں معزز آدمی میری طرح تنِ تنہا بھی نہیں بلکہ صاحبِ حیثیت آدمی ہیں۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان لوگوں نے مجھ پر سختیاں کیں اور مجھے ایسے لوگوں کی بستی میں دھکیل دیا جو دردِ دل سے بالکل عاری ہیں، حتّٰی کہ میں ان چھ سالوں میں صرف بیس منٹ کی مسافت پر واقع قریبی بستی میں بھی صرف دو مرتبہ ہی جاسکا ہوں۔

مجھ پر ان لوگوں نے دوگنے ظلم واستبداد کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ آب وہوا کی تبدیلی کی خاطر چند دنوں کے لیے مجھے اس قریب ترین بستی تک بھی نہیں جانے دیا: بس ان لوگوں نے لاقانونیت کو قانون بنا کر مجھ پر نافذ کر رکھا ہے اور یہاں کے سرکاری ملازم حکومت کے اثر و نفوذ کی آڑ لے کر اپنی ذاتی اغراض پوری کرتے ہیں۔

لیکن میں ارحم الراحمین کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں اور تحدیثِ نعمت کے طور پر کہتا ہوں:

ان لوگوں کی تمام سختیاں اور ستم رانیاں قرآنی انوار کو مزید فروزاں کرنے والی غیرت وہمت کی آتش کے لیے ایندھن کا کام دیتی ہیں۔

اور یہ قرآنی انوار جو ان سختیوں سے دوچار ہوتے ہیں غیرت کی حرارت سے پھیلتے چلے جاتے ہیں، اُن کی بدولت یہ

صوبہ بلکہ یہاں کے اکثر علاقے ''بارلا'' کی بجائے ایک مدرسہ بن چکے ہیں۔ یہ لوگ مجھے ایک قیدی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ''بارلا'' درس و تدریس کی کرسی بن چکا ہے اور ''اسپارٹا'' جیسے دیگر علاقے اِن زندیقوں کی اُمیدوں کے باوجود مدرسے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّی

پانچواں مسئلہ: جو کہ پانچواں خط ہے

شکر گزاری والا خط

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ﴾

قرآن کریم اپنی بہت سی معجز بیانی سے لبریز آیات کے ذریعے شکر کی ترغیب دیتا ہے اور اس پر اُبھارتا ہے، ان میں سے چند آیات یہ ہیں:

﴿اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ﴾ ﴿اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ﴾ ﴿وَسَنَجۡزِی الشّٰکِرِیۡنَ﴾

﴿لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ﴾ ﴿بَلِ اللّٰہَ فَاعۡبُدۡ وَکُنۡ مِّنَ الشّٰکِرِیۡنَ﴾

ان میں اور ان جیسی دیگر آیات میں وہ اس چیز کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ شان وشوکت والا اور جلیل القدر عمل جس کا اللہ خالق الرحیم اپنے بندوں سے مطالبہ کرتا ہے، وہ ہے: شکر۔

چنانچہ وہ لوگوں کو وضاحت وصراحت کے ساتھ اس کی طرف بلاتا ہے، اس کا خاص اہتمام کرتا ہے اور اس کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ اور وہ یہ چیز باور کراتا ہے کہ شکر سے بے نیازی کا مطلب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تکذیب اور ان کا انکار ہے۔ اور سورۃ الرحمٰن میں آیت کریمہ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ کے ذریعے اکتیس (۳۱) مرتبہ خوفناک قسم کی دھمکی دیتا ہے اور جن وانس کو اپنے خصوصی بیان کے ساتھ اس روش کی ہولناکیوں سے اس طرح خبردار کرتا ہے کہ ناشکر گزاری تکذیب، انکار اور جانتے بوجھتے تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے۔

جی ہاں؛ جس طرح قرآن حکیم یہ چیز واضح کرتا ہے کہ شکر تخلیق کا نتیجہ اور اس کی غرض وغایت ہے، اسی طرح یہ کائنات بھی جو کہ ایک بہت بڑا مجسّم قرآن ہے، وہ بھی یہی چیز واضح کرتی ہے کہ تخلیقِ کائنات کا اہم نتیجہ شکر ہی ہے؛ کیونکہ اگر کائنات کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو یہ چیز واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ:

کائنات کی شکل وصورت، اس کا تانا بانا اور اس کی ساخت پرداخت اس اسلوب پر ہوئی ہے کہ اس کی منزل اور اس کا نتیجہ بہر کیف شکر کی صورت میں برآمد ہوتا ہے، یہاں کی ہر چیز کا رخ ایک پہلو سے شکر کی طرف ہے، حتیٰ کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تخلیق کے اس درخت کا سب سے اہم پھل شکر ہی ہے، بلکہ کائنات کے اس کارخانے کی

سب سے قیمتی اور نفیس ترین پیداوار شکر ہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمام موجودات عالم کی ساخت پرداخت اس طرز پر ہوئی ہے کہ وہ ایک بہت بڑے دائرے کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں، اور زندگی کی تخلیق اس طرز سے ہوئی ہے کہ وہ موجودات کے اس دائرے میں مرکزی نقطے کی نمائندگی کرتی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام موجودات زندگی کی خدمت میں ہیں، اس کا پاس لحاظ اور نگہداشت کرتے ہیں اور اس کی طرف اپنا رخ کیے ہوئے ہیں اور اس کی مہیا کی ہوئی خوراک اور لوازمات سے اپنی کفالت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالق کائنات زندگی کا چناؤ اپنی ان موجودات کے درمیان سے ہی کرتا ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ تمام ذی حیات جہانوں کی مخلوقات و موجودات ایک ایسے وسیع دائرے کی شکل میں بنائی گئی ہیں کہ انسان ان کے درمیان اس طرح سے ان کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے کہ تمام ذی حیات موجودات کی تخلیق وایجاد کی غرض و غایت یہی انسان بن جاتا ہے۔

خالق الکریم سبحانہ وتعالیٰ زندگی سے بہرہ ور تمام موجودات کو اس انسان کے اردگرد جمع رکھتا ہے اور ان سب کو اس کی خدمت کے لئے مسخر کر کے رکھتا ہے اور اس انسان کو ان کا سردار اور حکمران بنا دیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ خالق العظیم تمام ذی حیات میں سے انسان کو امتیازی شان بخشتا ہے اور اسے اپنے اختیار وارادے کا مرکزی نقطہ بناتا ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی بلکہ اسی طرح حیوانی دنیا بھی ایسی شکل وصورت پر ہے جو دائرے کے مشابہ ہے اور اس کے مرکز میں رزق رکھ دیا گیا ہے، اور تمام انسانوں اور حیوانوں میں حصولِ رزق کا شوق رکھ دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب کے سب اس شوق کے زیر اثر رزق کے خدمت گزار اور اس کے غلام اور ماتحت بن چکے ہیں، رزق ہی ان کا حکمران اور وہی ان کا مخدوم ہے۔ اور خود رزق کی طرف دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ وہ مالداری، تونگری، وسعت اور پھیلاؤ کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ اگر کوئی اس کی نعمتوں کو شمار کرنے بیٹھ جائے تو نہ کر سکے، حتیٰ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ زبان میں پائی جانے والی قوت ذائقہ کو رزق کی بے حد وحساب انواع واقسام میں سے کسی بھی ایک نوع یا قسم کے ذائقے کی پہچان کے لئے تمام مذکورہ ماکولات ومشروبات کی تعداد کے برابر انتہائی دقیق آلات اور انتہائی حساس معنوی پیمانوں سے نواز دیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رزق اس کائنات کی سب سے زیادہ عجیب وغریب، مالا مال، وسیع وعریض، شیریں ترین اور عالمگیر حقیقت ہے۔

پھر اسی طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جس طرح ہر چیز رزق کے اردگرد گھوم رہی ہے اور اس کی طرف آنکھ لگائے ہوئے ہے اسی طرح خود رزق بھی۔ اپنی تمام انواع واقسام سمیت۔ جسم، روح اور گفتار و کردار سے شکر کا وظیفہ ادا

کر رہا ہے۔ یہ شکر کے ساتھ حاصل ہوتا ہے، شکر کو جنم دیتا ہے، شکر کو ہی نکھارتا ہے اور شکر کا ہی دیدار کراتا ہے؛ کیونکہ رزق کی اشتہا اور اس کا اشتیاق فطری شکر کی ایک قسم ہے۔

رہا ذائقہ اور لذت اندوزی، تو یہ بھی شکر ہی ہے، لیکن غیر شعوری صورت میں۔ کیونکہ شکر کی اس قسم سے تمام حیوانات بہرہ ور ہوتے ہیں۔ صرف انسان ہی ہے جو کفر وضلالت میں بھٹک کر اس فطری شکر کی ماہیت تبدیل کر دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ شکر کی بلندیوں سے کفر کی گہرائیوں میں جا گرتا ہے۔ پھر نعمتیں۔ جو کہ خود بعینہ رزق ہیں۔ جن خوبصورت، من موہنی، انوکھی اور دیدہ زیب صورتوں، پاکیزہ، روح افزا اور عطر بیز خوشبوؤں اور پُر لذت کھانوں اور خوشگوار ذائقوں پر مشتمل ہیں، یہ بھی دراصل شکر کی داعی اور اس کی نمائندگی اور منادی کرنے والی ہیں، جو زندہ لوگوں میں اپنی اس دعوت کے ذریعے ذوق وشوق ابھارتی ہیں اور اس ذوق وشوق کے ذریعے ان کی توجہ ہمت افزائی، پسندیدگی، قدر دانی اور احترام کی طرف مبذول کراتی ہیں اور اس طرح ان کے اندر معنوی شکر کا بیج بوتی ہیں، اور صاحب شعور لوگوں کی نظریں ان نعمتوں میں غور وفکر پر لگاتی ہیں اور انہیں تحسین وآفرین پر آمادہ کرتی ہیں اور ان وسیع وعریض نعمتوں کے احترام اور قدر دانی پر اُبھارتی ہیں۔ یوں یہ نعمتیں انہیں قولی اور فعلی شکر کے راستے پر ڈالتی ہیں اور ان کا شمار شکر گزاروں میں کرا دیتی ہیں، انہیں اس شکر کے وسیلے سے پاکیزہ ترین، لذیذ ترین اور نفیس ترین ذائقے سے آشنا کرتی ہیں، اور وہ اس طرح کہ یہ نعمتیں ان کے سامنے یہ چیز ابھار کر واضح کرتی ہیں کہ یہ پاکیزہ نعمت اور لذیذ رزق اپنی تھوڑی سی ظاہری اور وقتی لذت کے ساتھ ساتھ تمہیں شکر کے طفیل اس رحمانی عنایات و التفاتات کے بارے میں غور وفکر عطا کرتا ہے، وہ غور وفکر جو حقیقی، دائمی، ابدی اور غیر متناہی لذت اور ذائقے کا حامل ہے، یعنی جہانِ رحمت کے وسیع وعریض خزانوں کے مہربان مالک کے التفاتِ کریمانہ کی یاد دلاتا ہے۔ وہ التفات اور عزت افزائی جس کی لذت اور سرخوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ وہاں انسان کو اس غور وفکر کے طفیل اس کے اس دنیا میں رہتے ہوئے ہی اُس لازوال جنت کی روحانی سرمستی کے ذائقے سے آشنا کرا دیتا ہے۔

عین اس وقت جب یہ رزق شکر کے طفیل ایک وسیع وعریض غنا و دولت سے لبریز خزانے کا روپ دھار لیتا ہے، یہی رزق شکر سے بے نیازی اور پہلوتہی سے انتہائی برے طریقے سے گہری کھائی میں جا گرتا ہے۔

ہم ''سولہویں مقالے'' میں یہ چیز بیان کر چکے ہیں کہ زبان میں پائے جانے والی قوتِ ذائقہ کا رخ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی راہ میں ہو، مطلب یہ ہے کہ جب یہ قوت رزق کی طرف توجہ معنوی شکر کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے کرے گی تو زبان کی یہ قوت ایک معزز، مکرم اور شکر گزار کے حکم میں ہوگی اور رحمتِ الٰہیہ کے وسیع باورچی خانوں کے محترم اور سپاس گزار نگران کی حیثیت اختیار کر لے گی۔ لیکن یہی قوت جب اپنی ذمہ داری نبھانے کے لیے نفسِ

امّارہ کی رضا ورغبت کو پورا کرنے کے لیے اوراس کی تشنگی کو سیراب کرنے کے لیے، یعنی جب یہ اس منعمِ حقیقی کی یاد سے غافل ہوکر نعمت کی طرف توجہ کرے گی جس نے اس پر یہ رزق انعام کیا ہے، تو زبان میں پائی جانے والی یہ قوتِ ذائقہ ایک نگران و پاسبان کے محترم مقام سے گر کر پیٹ کے کارخانے کے چوکیدار اور معدے کے اصطبل کے پہرے دار کے درجے میں جا گرتی ہے۔ اور جس طرح رزق کا یہ خادم شکر سے بے پرواہی کا رویہ اختیار کرکے ادنیٰ درجے کے نوکر کے گڑھے میں جا گرتا ہے، اسی طرح خود رزق کی اپنی ماہیت اور اس کے دیگر خُدّام وحشم ذاتی طور پر اعلیٰ مقام سے ادنیٰ مقام میں جا گرتے ہیں، بلکہ رزق کا یہ خادم ایک ایسے درجے میں جا گرتا ہے جو خالق العظیم کی حکمت کے سراسر مباین اور جدا ہے۔

پیمانہ کیا ہے؟

یادرکھیں کہ شکر کا پیمانہ قناعت، اقتصاد یعنی میانہ روی، رضا شعاری اور احسان مندی ہے۔ اور ناشکری کا پیمانہ بے نیازی، بے پرواہی، حرص، فضول خرچی، عدمِ احترام اور حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر ہر چیز ہڑپ کر جانا ہے۔

جی ہاں؛ حرص جس طرح شکر سے اعراض اور بے رپ کا نام ہے، اسی طرح وہ حرماں نصیبی کی قائد اور ذلت ورسوائی کا وسیلہ ہے، حتیٰ کہ ایک چیونٹی جو کہ ایک بابرکت اور اجتماعی زندگی کا مالک کیڑا ہے، اپنی شدتِ حرص اور ضعفِ قناعت کی وجہ سے پاؤں کے نیچے کچلی جاتی ہے، اور وہ اس طرح کہ وہ ہزاروں دانے ا اکرتی رہتی ہے، حالانکہ اگر وہ بچی رہے اور اس کے مقدر میں، ہے، تو پورے سال کے لئے اسے چند دانے ہی کافی ہوتے ہیں۔ لیکن شہد کی مکھی کا معاملہ اور ہے، اس کی مکمل قناعت اسے یہ عظمت عطا کرتی ہے کہ وہ سروں کے اوپر بلندی پر اڑتی ہے، حتیٰ کہ وہ اپنے مقدر کے رزق پر قناعت کرکے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کے لیے ازراہِ احسان خالص شہد مہیا کرتی ہے۔

جی ہاں؛ بے شک "الرحمٰن"، جو کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے سب سے بڑا اسم ہے، لفظِ جلالت مآب "اللہ" کے متصل بعد آتا ہے، "اللہ" جو کہ مطلقاً اسم اعظم اور ذاتِ اقدس کا ذاتی نام ہے۔ تو یہ اسم "الرحمٰن" اپنی مناسبت (شفقت، نرمی اور مہربانی وغیرہ) کے لحاظ سے رزق پر مشتمل ہے، اس لیے اس عظیم اسم کے انوار تک پہنچنا اس شکر کے ذریعے ممکن ہے جو کہ رزق کے کونوں کھدروں میں چھپا ہوا ہے۔ یاد رہے کہ "الرحمٰن" کا سب سے نمایاں معنیٰ "الرزاق" ہے۔ پھر یہ ہے کہ شکر کی بہت سی اقسام ہیں لیکن ان سب میں سے جامع ترین اور سرِ فہرست نماز ہے۔

شکر میں صاف شفاف قسم کا ایمان پایا جاتا ہے۔ شکر خالص توحید پر مشتمل ہے؛ کیونکہ جو شخص۔ مثلاً۔ سیب کھاتا ہے، اور اس کے آغاز میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ کہتا ہے، تو وہ اپنی اس روش سے شکر کا اظہار کرتا ہے، اس بات

پر کہ وہ سیب ایک ایسی خالص یاد دہانی ہے جو قدرتِ الٰہیہ کے ہاتھ سے براہِ راست صادر ہوتی ہے اور ایک ایسا تحفہ ہے جو کہ براہِ راست رحمتِ الٰہیہ کے خزانے سے عطا کیا جاتا ہے۔ انسان اپنے اس قول اور اس اعتقاد کی رو سے ہر چیز کو۔ جزئی ہو یا کلی۔ قدرتِ الٰہیہ کے ہاتھ کی طرف لوٹا دیتا ہے اور ہر ایک چیز میں رحمتِ الٰہیہ کی تجلی کا ادراک کرلیتا ہے۔ اور یوں وہ شکر کے ذریعے حقیقی ایمان اور خالص توحید کا اظہار کرتا ہے۔

خسارے کے وہ پہلو جن سے غفلت شعار انسان نعمتوں کی ناشکری و بے قدری کرکے دوچار ہوتا ہے، بہت زیادہ ہیں، ان میں سے ہم یہاں صرف ایک پہلو بیان کریں گے:

انسان جب کوئی لذیذ نعمت کھا کر اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ نعمت اس شکر کے طفیل ایک درخشاں نور بن جاتی ہے اور اخروی جنت کے پھلوں میں سے ایک پھل کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ اور اس بات سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ نعمت اسے لذت اور سرور بخشتی ہے۔ اس چیز پر غور وفکر کرنا کہ یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے التفات کا نتیجہ ہے، یہ غور وفکر نعمت کو انتہائی عظیم اور دائمی لذت اور لامحدود اعلیٰ ذائقہ عطا کرتا ہے۔ تو گویا کہ شکر گزار نے اپنی اس روش سے ان بلند وبالا اور عالی مقامات کی جانب خالص مغز اور صاف شفاف جوہر اور دیگر معنوی مواد ارسال کردیا ہے۔ اور چھلکے، بھوسہ اور دوسرا مہمل مواد جو استعمال ہو چکا ہے اور جس کی اب ضرورت نہیں رہی ہے، اسے اس نے نظر انداز کردیا ہے تاکہ وہ فضلات، ردی اور کوڑا کرکٹ وغیرہ پھر سے اپنے اصل یعنی اپنے اوّلین عناصر کی طرف لوٹ جائے۔

لیکن اگر منعَم علیہ نعمت پر اپنے رب کا شکر ادا نہ کرے اور از راہِ تکبر اسے اپنے لئے عار سمجھے، تو وہ وقتی لذت اپنے زوال کے ساتھ ہی اپنے پیچھے افسوس اور درد والم چھوڑ جائے گی اور خود وہ بھی گندمیل میں تبدیل ہو جائے گی۔ اور یوں وہ نعمت جو کہ ہیرے سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے، کوئلے سے بھی کم قیمت ہو جاتی ہے۔

کہنا یہ ہے کہ یہ زوال پذیر رزق شکر کے طفیل دائمی اور ہمیشہ رہنے والے ثمرات دیتا ہے۔ لیکن وہ نعمتیں جو شکر سے خالی ہوں، وہ اپنی خوبصورت، دیدہ زیب اور عالی مقام صورتوں سے کمینہ، حقیر اور بدشکل صورتوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں، اس لیے کہ غافل آدمی یہ سمجھتا ہے کہ رزق کی اخیر یہی ہے کہ جب اس سے وقتی لذت حاصل کرلی جائے تو وہ فضلات میں تبدیل ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ رزق ایک ایسی درخشاں صورت ہے جو عشق ومحبت کی مستحق ہے، اور یہ خوبصورت مکھڑا صرف شکر کی بدولت جلوہ گر ہوتا ہے، وگرنہ غفلت شعار اور ضلالت خوردہ لوگ رزق کے ساتھ عشق اور دیوانگی کا جو دم بھرتے ہیں وہ حیوانیت اور بہیمیت ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔۔۔ اسی سے اندازہ کرلو کہ غفلت شعار اور ضلالت

کردار لوگ کتنے گرانبار خسارے میں ہیں!!

زندگی سے بہرہ ور تمام مخلوقات میں سے جو مخلوق انواع واقسام کے رزق کی سب سے زیادہ محتاج ہے وہ انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ یہ اس کے اسمائے حسنیٰ کا جامع آئینہ اور اس کی ہمہ گیر قدرت پر دلالت کرنے والا معجزہ ہے۔ اس حیثیت سے انسان ایسے آلات کا مالک ہے جن کے ذریعے وہ اس کی رحمت کے وسیع وعریض خزانوں میں غور وفکر کر کے ان کی تدبیر کر سکتا ہے، ان کی قیمت کا اندازہ لگا سکتا ہے اور ان کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔۔۔ اور اُس نے اسے زمین کے اس خلیفہ کی صورت پر پیدا کیا ہے جو ایسے حساس آلات کا مالک ہے جن سے اسمائے حسنیٰ کی دقیق اور لطیف ترین تجلی کا اندازہ کر سکتا ہے۔۔۔ ان تمام وجوہات کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اس انسان میں بے حد وحساب حاجات وضروریات ودیعت کروی ہیں اور اسے بے حد وحساب مادی اور معنوی رزق کا محتاج بنا دیا ہے۔ اب ایک ہی ایسا وسیلہ ہے جو اسے "اَحْسَنِ تَقْوِيْم" کے بلند وبالا مقام تک لے جا سکتا ہے، اور وہ ہے "شکر"، اور اگر شکر معدوم ہو جائے تو انسان ظلمِ عظیم کا مرتکب ٹھہرے گا اور "اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ" کے درجے میں جا گرے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ:

شکر ان چار بنیادوں میں سے سب سے عظیم بنیاد ہے جس کا سہارا سب سے عظیم اور سب سے اعلیٰ راستے پر گام فرسائی کرنے والا سالک لیتا ہے۔ ان چار بنیادوں کی تعبیر ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے:

در طریقِ عجز مندی لازم آمد چار چیز
عجزِ مطلق، فقرِ مطلق، شوقِ مطلق، شکرِ مطلق اے عزیز

﴿اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الشَّاكِرِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ﴾

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الشَّاكِرِيْنَ وَالْحَامِدِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ آمين

﴿وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾

چھٹا مسئلہ

جو کہ چھٹا خط ہے

(کسی دوسری جگہ پر درج کیے جانے کی وجہ سے یہاں درج نہیں کیا گیا)

ساتواں مسئلہ

جو کہ ساتواں خط ہے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾

[یہ مسئلہ سات اشاروں پر مشتمل ہے]

پہلے ہم تحدیثِ نعمت کے طور پر عنایتِ الٰہیہ کے متعدد اسرار کو آشکار کرنے والے سات اسباب کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے۔

پہلا سبب:

پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے یعنی اس کے اوائل میں مَیں نے ایک سچا واقعہ دیکھا، کیا دیکھتا ہوں کہ میں مشہور پہاڑ ''ارارات'' کے نیچے کھڑا ہوں، اچانک وہ ایک دہشت ناک صورت میں پھٹ گیا اور اس نے پہاڑوں جیسے بڑے بڑے تودے دنیا کے تمام کونوں میں بکھیر دیے، اس دہشت خیز ماحول میں مَیں نے دیکھا کہ میری والدہ مرحومہ میرے پاس ہی کھڑی ہیں۔ میں نے کہا: امی! ڈرو نہیں، یہ سب اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے، اور وہ بڑا رحیم اور حکیم ہے۔

میں اسی حالت میں ہی تھا کہ اچانک ایک معزز سا آدمی سامنے آیا اور آمرانہ طریقے سے مجھے کہنے لگا: قرآن کے اعجاز کو کھول کر بیان کرو!

میں بیدار ہو گیا۔ اور یہ بات سمجھا کہ عنقریب بہت بڑا دھماکا ہونے والا ہے، اور اس انقلاب و انفجار کے بعد قرآن کے اردگرد کی فصیلوں میں دراڑیں پڑنے والی ہیں تب قرآن اپنا دفاع براہ راست خود کرے گا۔

قرآن پر دھاوا بولا جائے گا اور اس کا اعجاز اس کے لیے ایک فولادی درع کا کام دے گا۔ اور میرے جیسا آدمی اس طرح کے اعجاز کو آشکار کرنے کے لیے نامزد ہو جائے گا اور مجھے پتا چل گیا کہ یہ ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈالی گئی ہے اور اس کام کے لیے میں ہی نامزد ہوا ہوں۔

قرآن کریم کے اعجاز کی جب مقالات کے ذریعے کسی حد تک وضاحت ہو گئی ہے، تو پھر اس اعجاز کی بدولت اور اس کی اشاعت و برکات کی برکت سے اپنی ان خدمات کے سلسلے میں حاصل ہونے والی عنایات کا اظہار کرنا قرآنی اعجاز کی اعانت ہی شمار ہو گا، اس لیے ان الطاف و عنایات کا اظہار بہت ضروری ہے۔

دوسرا سبب:

قرآنِ حکیم چونکہ ہمارا مرشد، ہمارا اُستاد اور ہمارا امام ہے اور تمام آداب میں ہمارا رہنما ہے، اور وہ اپنی مدح سرائی کرتا ہے؛ اس لیے ہم بھی اس کے دیے ہوئے درس کی اتباع کرتے ہوئے اس کی تفسیر کی تعریف کرتے ہیں۔

اور پھر تالیف شدہ یہ "مقالات" چونکہ اس کی یک نوعی تفسیر ہی ہے اور یہ تمام رسائل قرآن کے حقائق اور اس کی ملکیت اور اُس کا مال ہیں۔ اور قرآن حکیم خود پوری شان وشوکت سے اپنے کمالات کا ذکر کرتا ہے اور اکثر سورتوں میں اپنی اسی انداز سے مدح کرتا ہے جو اس کے لائق ہے، خاص کر اُن سورتوں میں جن کا آغاز "الرٰ اور حٰم" جیسے حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے؛ تو بلاشبہ ہم بھی اُن ربانی عنایات کو ظاہر کرنے کے مکلف ہیں جو اس خدمت کے قبول ہو جانے کی علامت ہیں۔ اور قرآن حکیم کے اعجاز کی ان جھلکیوں کو آشکار کرنے کے مکلف ہیں جو "مقالات" میں منعکس ہو رہی ہیں؛ کیونکہ ہمارا اُستاد اسی طرح کرتا ہے۔

تیسرا سبب:

"مقالات" کے بارے میں مَیں یہ بات تواضع سے نہیں بلکہ حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کہتا ہوں کہ:

"مقالات" میں پائے جانے والے حقائق و کمالات میرے نہیں بلکہ قرآن کے ہیں اور قرآن ہی سے ٹپکے ہیں؛ حتی کہ "دسواں مقالہ" اور دیگر رسائل بھی عمومی طور پر کچھ قطرات ہیں جو قرآن کی سینکڑوں آیات سے ٹپکے ہیں۔

بات جب ایسے ہی ہے، اور میں فانی ہوں عنقریب کوچ کر جاؤں گا؛ تو پھر ضروری ہے کہ باقی رہنے والے کام اور پائندہ نقش کا تعلق میرے ساتھ نہ جوڑا جائے، اور ایسا کرنا ٹھیک بھی نہیں ہے۔

اہلِ ضلالت وطغیان کی چونکہ یہ عادت ہے کہ وہ مؤلف کی توہین کر کے اس کے آثارِ قلم کی توہین کرتے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآن کے آسمان کے ستاروں کے ساتھ وابستہ رسائل کو میرے جیسے بوسیدہ ستون کے ساتھ نہ باندھا جائے جس کا گر جانا ممکن ہے اور جو بہت سے اعتراضات وتنقیدات کا نشانہ بن سکتا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ کسی بحث یا موضوع کی امتیازی خصوصیات کو لوگوں کے رواج کے مطابق اس کے مؤلف کے طور اطوار میں ڈھونڈا جاتا ہے جسے اس مضمون یا نقش کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے، اور - اس رواج کی روشنی میں - میرے جیسے مفلس اور بے مایہ آدمی کو اور میری شخصیت کو جو کہ فی نفسہٖ ان ہزاروں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت کو بھی ظاہر نہیں کر سکتی؛ ان بلند پایہ حقائق اور بیش قیمت جواہرات کا مالک بنا دینا حقیقت پر بہت بڑا ظلم ہے۔

اس لیے میں یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ رسائلِ نور میری ملکیت نہیں بلکہ قرآن کا مال ہیں اور قرآن کی امتیازی خصوصیات کے رشحات کا مظہر بن گئے ہیں۔

جی ہاں؛لذیذ انگوروں کے خوشوں کی خصوصیات ان کی سوکھی شاخوں میں تلاش نہیں کی جاتیں۔

بس یوں سمجھو کہ میں اس سوکھی شاخ کی حیثیت رکھتا ہوں۔

چوتھا سبب:

کبھی کبھی تواضع سے کفرانِ نعمت لازم آجاتا ہے، بلکہ تواضع کفرانِ نعمت بن جاتی ہے۔اور کبھی تحدیثِ نعمت فخر بن جاتی ہے،اور یہ دونوں ہی نقصان دہ ہیں۔اب کفرانِ نعمت اور فخر سے بچنے کے لیے ہمارے پاس ایک ہی وسیلہ ہے،اور وہ یہ ہے کہ:ان خصوصیات وفضائل کا اعتراف کیا جائے لیکن ان کی ملکیت کا دعویٰ نہ کیا جائے،یعنی انسان اس بات کا اِظہار کرے کہ یہ چیز مُنعمِ حقیقی کے انعام کے آثار ہیں۔

مثال کے طور پر:اگر آپ کو کوئی شخص قابلِ فخر مرصّع ومزیّن خوبصورت سوٹ پہنا دے اور آپ اسے پہن کر بہت خوبصورت نظر آنے لگیں،اور لوگ آپ سے کہیں کہ؛ ماشاء اللہ،آج تو بڑے خوبصورت نظر آرہے ہیں!اور آپ جواب میں بڑی تواضع کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہیں:اوناں جی!میں کون ہوتا ہوں؟میں تو کچھ بھی نہیں ہوں!اس سوٹ سے خوبصورتی کہاں سے آئی!یہ تو کچھ بھی نہیں!یہ انداز یقیناً کفرانِ نعمت ہوگا،اور اس ماہر کاریگر کے حق میں بے ادبی کا مظاہرہ ہوگا جس نے آپ کو یہ سوٹ پہنایا ہے۔

اسی طرح اگر آپ اسے فخر یہ انداز میں یہ کہہ دیں کہ:جی ہاں؛میں واقعی بہت خوبصورت ہوں!کوئی ہے جو ہم سا ہو؟ ہم سا ہو تو سامنے آئے!یہ انداز بھی یقیناً خود پسندی پر مبنی فخر وغرور ہی ہوگا،اس لیے کفران اور فخر سے بچنے کے لیے آپ کو یہ کہنا چاہیے کہ:

جی ہاں؛میں خوبصورت لگ رہا ہوں،لیکن حقیقت میں خوبصورت میں نہیں بلکہ یہ لباس ہے اور وہ شخص ہے جس نے مجھے یہ لباس پہنایا ہے۔

اسی طرح میں بھی۔اگر میری آواز روئے زمین کے اطراف واکناف میں پہنچ جائے تو۔بلند آواز سے یہ منادی کرتا ہوں کہ:''مقالات'' خوبصورت ہیں اور حقائق ہیں۔لیکن یہ میرے نہیں بلکہ کچھ شعاعیں ہیں جو قرآن کریم کے حقائق سے چمکی ہیں،اور میں

وَمَا مَدَحْتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِی
وَلٰکِنْ مَدَحْتُ مَقَالَتِی بِمُحَمَّدٍ

والے قاعدے کو سامنے رکھ کر کہتا ہوں:

وَمَا مَدَحْتُ الْقُرْآنَ بِکَلِمَاتِی

وَلٰكِنْ مَدَحْتُ كَلِمَاتِي بِالْقُرْآنِ

مطلب یہ کہ قرآن کے اعجاز کے حقائق کو میں نے خوبصورتی نہیں دی ہے اور میں نے انہیں خوبصورت انداز سے بیان نہیں کیا ہے بلکہ قرآن کے خوبصورت حقائق نے میری تعبیروں کو بھی حسن بخشا ہے اور ان کی شان بلند کی ہے۔ واقعہ جب یہی ہے تو پھر قرآن کی مقالات نامی امتیازی خصوصیات کی رعنائیوں اور زیبائیوں کو آشکار کرنا اور اس انعکاس پر مرتب ہونے والی عنایاتِ الٰہیہ کو قرآنی حقائق کے نام پر بروئے کار لانا تحدیثِ نعمت کا ایک قابلِ قبول انداز ہے۔

پانچواں سبب:

آج سے کافی دیر پہلے میں نے اللہ کے ولی سے یہ سنا کہ اُس نے قدیم اولیاء کے غیبی اشارات سے ایک حقیقت کا استخراج کیا ہے اور اُسے اس پر اطمینان بھی حاصل ہے کہ: ''مشرق کی سمت سے عنقریب ایک نور کا ظہور ہوگا جو بدعات کی تاریکیوں کو پراگندہ کر دے گا''۔ میں نے اس طرح کے نور کے ظہور کا بہت انتظار کیا اور کر رہا ہوں۔ لیکن پھول چونکہ بہار میں کھلتے ہیں اس لیے اس طرح کے مقدس پھولوں کے لیے راہ ہموار کرنا ضروری ہے۔ اور ہمارا علم یہ کہتا ہے کہ ہم اپنی اس خدمت کے ذریعے ان معزز نورانیوں کا راستہ ہموار کر رہے ہیں۔ اِس لیے ان گل ہائے نو بہار کا سہرا ہمارے سر نہیں ہے۔

بلاشبہ ''مقالات'' نامی انوار کے ساتھ تعلق رکھنے والی عنایاتِ الٰہیہ کو بیان کرنا فخر و غرور کا دار و مدار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ چیز تحدیثِ نعمت اور شکر و سپاس کا دار و مدار ہوگی۔

چھٹا سبب:

عنایتِ ربانی جو کہ ترغیب کا وسیلہ ہے اور ''مقالات'' کی تالیف کی وجہ سے ہماری قرآنی خدمت فوری اور پیشگی صلہ ہے، اس عنایت کا مطلب ہے کہ ہمیں اس خدمت کی توفیق سے نوازا گیا ہے اور تحدیثِ نعمت کے لیے اس توفیق کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اگر توفیق سے بھی آگے گزر جائے اور بلند ہو جائے تو وہ اکرامِ الٰہی ہوگا، اور اکرامِ الٰہی کا اظہار کرنا ایک طرح کا معنوی شکر ہے۔ اور عنایت جب اکرام سے آگے گزر جائے تو پھر وہ لامحالہ قرآنی کرامت ہوگی اور ہم اس سے بہرہ یاب ہو چکے ہیں۔ اور اس طرح کی کرامت کا اظہار اگر اس طرح سے ہو جائے کہ ہمارے اختیار سے باہر ہو، ہمارے سان گمان میں بھی نہ ہو اور ہمیں پتا بھی نہ چلے، تو اس میں کوئی نقصان نہیں۔ اور اگر یہ عنایت معمول کی کرامتوں سے بھی اُوپر چلی جائے تو پھر بلاشبہ قرآن کے اعجاز کے معنوی شعلے ہوں گے۔ اب اعجاز کا برملا اظہار کرنا چونکہ ضروری ہے، اس لیے جو چیز اعجاز کی معاون ہوگی اعجاز کے کھاتے میں ہی جائے گی۔ اس لیے وہ فخر و غرور کا نہیں بلکہ شکر و سپاس کا مدار ہوگی۔

ساتواں سبب:

نوعِ انسانی کے اَسی فیصد لوگ اصحابِ تحقیق نہیں ہیں کہ تحقیق کر کے حقیقت تک رسائی حاصل کر کے اُسے پہچان

جائیں اور اُسے قبول کرلیں، بلکہ وہ مسائل کو اَز راہِ تقلید اُن لوگوں سے سُن کر مانتے ہیں جنہیں وہ بظاہر قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں اور اُن کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں، حتیٰ کہ ایسے لوگ ایک قوی حقیقت کو محض اس لیے ضعیف سمجھتے ہیں کہ وہ کسی ضعیف شخص کے ہاتھ ہوتی ہے جبکہ ایک بے قیمت مسئلہ اگر کسی قیمتی آدمی کے ہاتھ میں ہو تو اسے بڑا قیمتی سمجھتے ہیں۔

اس بنا پر میں ان قرآنی اور ایمانی حقائق کے بارے میں اعلان واظہار کرنے کے لیے مجبور ہوں جو میرے جیسے کمزور و نادار آدمی کے ہاتھ میں ہیں، تاکہ اکثر لوگوں کی نظروں میں ان کی قیمت نہ گر جائے۔۔۔ میں اس بات کا اعلان کرتا ہوا کہتا ہوں کہ: ''کوئی ہے جو ہمارے اختیار کے بغیر اور ہماری بے خبری میں ہم سے خدمت لے رہا ہے اور ہماری بے علمی میں ہمیں بڑے بڑے کاموں میں استعمال کر رہا ہے۔ اور اس باب میں ہماری دلیل یہ ہے کہ ہمیں کچھ ایسی عنایات اور سہولیات میسّر آجاتی ہیں جن کے بارے میں نہ ہمیں شعور ہوتا ہے اور نہ اختیار۔ پس ہم ان الطاف وعنایات کا برسرِ عام اعلان کرنے پر مجبور ہیں''۔

ان مذکورہ سات اسباب کے پیشِ نظر ہم چند کلّی قسم کی ربانی عنایات کی طرف اشارہ کریں گے۔

پہلا اشارہ:

''توافقات'' ہیں جن کی وضاحت ''اٹھائیسویں مکتوب'' کے آٹھویں مسئلے کے پہلے نکتے میں کی گئی ہے۔

اور وہ یوں ہے کہ ''معجزاتِ محمدیہ'' نامی سترہویں مکتوب میں تیسرے اشارے سے لے کر اٹھارہویں اشارے تک دو صفحوں کو چھوڑ کر باقی ساٹھ صفحات میں ایک کاتب کے نسخے میں دو سو سے زیادہ ''رسولِ اکرم ﷺ'' کے کلمات کمال موازنے کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں؛ اور کاتب کو اس بات کی خبر ہے نہ علم۔ چنانچہ جو بھی گہری نظر اور انصاف کے ساتھ دو صفحوں کو دیکھے گا وہ تصدیق کرے گا کہ یہ چیز اتفاقاً ظہور میں نہیں آئی ہے؛ کیونکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ اتفاق سے ایک یا دو صفحات میں بہت سے ملتے جلتے کلمات آجائیں اور توافق ظہور میں آجائے، لیکن یہ توافق ناقص ہوگا، اور اگر مکمل طور پر حاصل ہو جائے تو ایک دو صفحات میں ہوگا تمام صفحات میں نہیں۔ لیکن اِدھر معاملہ یہ ہے کہ ''رسولِ اکرم ﷺ'' کے الفاظ تمام صفحات میں کمال توازن کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں، کہیں ایک صفحے میں دو بارہ آگئے ہیں، کہیں تین بار کہیں چار بار اور کہیں اس سے زیادہ بار؛ اس لیے بلاشبہ ایسا اتفاق سے نہیں ہوسکتا بلکہ یہ توافق کا کرشمہ ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ حاصل ہونے والا یہ توافق جسے آٹھ مختلف کاتب مختلف نسخوں میں تبدیل نہیں کر سکے اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں مضبوط قسم کا اشارہ پایا جاتا ہے؛ کیونکہ جیسے قرآن کی بلاغت اعجاز کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے اور کسی کے لیے بھی اسی درجے تک پہنچنا ممکن نہیں رہا ہے، اسی طرح ''انیسویں مکتوب'' جو کہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات کا آئینہ

ہے، اس مکتوب میں پائے جانے والے ''توافقات''؛ اور ''پچیسویں مقالے'' میں جو کہ قرآنی معجزات کا ترجمان ہے، اور ''رسائل نور'' میں جو کہ قرآن پاک کی تفسیر ہیں۔۔۔ان سب میں پائے جانے والے توافقات ایسی عجیب وغریب صورت حال کو آشکار کرتے ہیں جو تمام کتابوں پر فوقیت لے جاتی ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ قرآن کے اور رسول کریم ﷺ کے معجزات کی کرامتوں کی ایک قسم ہیں جو ان آئینوں میں جھلملا رہے ہیں اور ان میں نقش ہو گئے ہیں۔

دوسرا اشارہ:

قرآنی خدمت کے ساتھ تعلق رکھنے والی دوسری ربانی عنایت یہ ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ مجھے کچھ محنتی، سنجیدہ اور مخلص، غیرت مند، فداکار اور جاں نثار قسم کے مضبوط عزم وارادے کے مالک بھائی مہیا کر دیے ہیں جن کے قلم ہیرے کی تلواریں ہیں، اور انہیں دیارِ غربت میں اور میل جول سے منع کیے گئے میرے جیسے تنہا، نیم خواندہ اور قلم سے محروم آدمی کے معاونین بنا دیا ہے، اور قرآنی ذمہ داری کا وہ بوجھ ان مضبوط کندھوں پر رکھ دیا ہے جو میرے کمزور اور عاجز وناتواں کندھوں پر بہت بھاری محسوس ہوتا تھا اور کمال لطف وکرم کے ساتھ میرا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ اور یہ مبارک گروہ ''خلوصی'' کی تعبیر کے مطابق وائرلیس اور ٹیلیگراف ریسیور کی اور صبری کی تعبیر کے مطابق بجلی گھر میں بجلی پیدا کرنے والی مشینوں اور پرزوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ان پہ سب لوگ مختلف امتیازات اور بیش قیمت خصوصیات کے حامل ہیں، بایں ہمہ وہ ذوق وشوق اور غیرت وحمیت، سعی وعمل اور جدوجہد وغیرہ میں ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، اور یہ چیز بھی۔ صبری کی تعبیر کے مطابق۔ غیبی توافقات کی ہی صورت ہے۔

پس ان لوگوں کا اس دور میں (یعنی جس دور میں حروف تبدیل کر دیے گئے ہیں، کوئی پریس موجود نہیں، ہر شخص ایمانی انوار کا محتاج ہے اور سستی و بے عملی پیدا کرنے والے اور ذوق وشوق کو توڑنے والے بہت سے اسباب موجود ہیں۔۔۔ ایسے دور میں) ان لوگوں کا قرآنی انوار کی نشر واشاعت کرنا اور اُنہیں ہر جگہ تک پہنچا دینا اور اُن کا اس خدمت کو نہایت ذوق وشوق سے سرانجام دینا براہِ راست قرآنی کرامت اور نمایاں قسم کی عنایتِ الٰہیہ ہے۔

جی ہاں؛ جس طرح ولایت کی کرامت ہوتی ہے اُسی طرح خالص نیت کی بھی ایک کرامت ہوتی ہے، اور خلوص کی بھی ایک کرامت ہوتی ہے، خاص کر اللہ تعالیٰ کے لیے برپا کی گئی خالص اخوت کے دائرے میں بھائیوں کے مابین پائی جانے والی خالص سنجیدہ باہمی پشتیبانی اور ربط وضبط بھی بہت زیادہ کرامتوں کا حامل ہوتا ہے، اس حد تک کہ اس طرح کی جماعت کا معنوی شخص ایک ولی کامل کی حیثیت رکھتا ہے اور عنایاتِ الٰہیہ سے بہرہ وَر ہوتا ہے۔

پس اے قرآن کی خدمت کے میدان میں میرے بھائیو اور ساتھیو!

جس طرح کسی قلعے کو فتح کرنے کا سہرا صرف فوج کے کمانڈر کے سر باندھ دینا اور سارا مالِ غنیمت صرف اُسی کی جھولی میں ڈال دینا ظلم اور غلطی ہے، اسی طرح تمہیں بھی نہیں چاہیے کہ تم لوگ اپنے قلموں سے اور اپنے معنوی شخص کی قوت سے حاصل ہونے والی فتوحات کے طفیل اُمڈنے والی عنایات کا سہرا صرف میرے جیسے نادار مسکین کے سر باندھ دو!

پس بلاشبہ اس طرح کی بابرکت جماعت میں غیبی توافقات سے بھی بڑھ کر بڑے قوی قسم کے غیبی اشارات پائے جاتے ہیں، اور مجھے وہ صاف نظر آرہے ہیں لیکن میں وہ اشارات تمام لوگوں کو اور ہر ایک کو نہیں دِکھا سکتا۔

تیسرا اشارہ

رسائل نور کے اجزاء کا شدید ترین ضدّی اور ہٹ دھرم قسم کے لوگوں کے لیے بھی تمام اہم ترین ایمانی اور قرآنی حقائق کا تابناک صورت میں اثبات کر دینا ایک الٰہی عنایت اور قوی ترغیبی اشارہ ہے؛ کیونکہ کچھ ایمانی اور قرآنی حقائق ایسے ہیں جنہیں سمجھنے سے ''ابن سینا'' جیسے پرلے درجے کے دانشور اور دُور اندیش آدمی نے بھی اپنی عاجزی و درماندگی کا اعتراف کرلیا، اور اس نے کہہ دیا کہ ''عقلِ محض کو یہاں کوئی راستہ نہیں ملتا''۔ لیکن وہ حقائق جن تک ابن سینا جیسا عبقری انسان اپنی عقل و دانش کے بل پر بار نہ پاسکا وہ دسواں مقالہ یعنی رسالۂ حشر عوام الناس بلکہ بچوں تک کو سمجھا رہا ہے!

اسی طرح سعد الدین تفتازانی علامۂ روزگار نے مثال کے طور پر ''تقدیر اور ''جزوِ اختیاری'' کے راز کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی ''التلویح'' نامی کتاب کے ''بارہ مقدمات'' والے مضامین میں چالیس پچاس صفحات میں حل کر سکے، اور اس کی تعلیم بھی صرف خاص لوگوں کو ہی دے سکے۔ لیکن رسائل نور نے ان مسائل کو چھبیسویں مقالے کے دوسرے مبحث میں جو کہ تقدیر کے بارے میں بحث کرتا ہے، صرف دو صفحوں میں حل کر دیا ہے، اور ایسے طریقے سے کہ ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔۔۔ یہ چیز اگر عنایت نہیں تو اور کیا ہے؟

اسی طرح مشکل سے حل ہونے والا یہ طلسم ایک حیرت خیز مُعمّہ یعنی طلسم کائنات اور رازِ تخلیقِ عالم جس نے عقلوں کو حیران کر رکھا ہے اور جس کے راز کی گرہ کسی بھی فلسفے سے نہ کھل سکی؛ قرآن عظیمُ الشان کے اِعجاز کی برکت سے کھل گئی، یہ گرہ ''چوبیسویں مکتوب'' میں، اور ''انتیسویں مقالے'' کے آخر میں ''ایک رمزی نکتے'' کے نام سے اور ''تیسویں مقالے'' میں ذرّات کے تحولات کی چھ حکمتوں والے مضمون میں کھولی جا چکی ہے۔ ان رسائل نے تخلیق کائنات، اس کے آغاز و انجام اور رازِ ہستی کی چیستان کو حل کر دیا ہے اور ذرّات کے تحولات میں پائی جانے والی حکمتوں کو طشت اَز بام کر دیا ہے۔ یہ رسائل سب کے سامنے ہیں انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سولہویں اور بتیسویں مقالے نے ''اَحدیت''، ربوبیت کی لاشریک وحدت اور ذاتِ الٰہی کی بے انتہا قربت اور ہماری اس سے بے انتہا دُوری کے حیرت خیز حقائق کو کمال وضاحت کے ساتھ آشکار کیا ہے۔

اسی طرح بیسواں مکتوب ہے جس نے کمال وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ قدرتِ الٰہیہ کے لیے ذرّے اور سیارے برابر ہیں، اور حشرِ اعظم میں تمام ذی اَرواح کو زندہ کرنا اُس قدرت کے لیے ایک نفس کے زندہ کرنے کے برابر آسان ہے، اور یہ کہ تخلیق کائنات کے باب میں دخل اندازی کا تصوّر عقل سے درجۂ امتناع کی حد تک بعید ہے۔۔۔ وحدت کے اس عظیم الشان راز کا انکشاف بیسویں مکتوب میں اور اس کی ذیلی بحث میں ''وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ'' کی تشریح کے تحت تین تمثیلوں کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح قرآنی اور ایمانی حقائق میں اتنی وسعت پذیری، ہمہ جہتی اور عالمگیری ہے کہ اس کا احاطہ کسی ذہین ترین انسان کا ذہن بھی نہیں کرسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان حقائق کی مُطلق اکثریت کا ظہور اپنی تمام نزاکتوں، گہرائیوں اور گیرائیوں سمیت میرے جیسے سمٹے سمٹائے، پراگندہ ذہن اور ژولیدہ حال انسان پر ہو جاتا، اور وہ انہیں برق رفتاری سے قلم بند کرتا جا رہا ہے اور اس کے پاس مراجعت یا حوالے کے لیے کوئی کتاب بھی نہیں۔۔۔ کیا یہ چیز براہِ راست ایک طاقت وَر غیبی اشارہ، عنایتِ ربانیہ کا ایک درخشاں جلوہ اور قرآنِ حکیم کے معنوی اعجاز کا ایک تابندہ نقش نہیں ہے؟

چوتھا اشارہ:

پچاس ساٹھ رسالے ایسے ہیں جن کے باب میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی اسی نظرِ عنایت سے نواز رکھا ہے؛ کیونکہ وہ رسائل میرے جیسے کسی ایسے انسان سے تألیف پا ہی نہیں سکتے جو بہت کم سوچتا ہو، ظہور میں آنے والی قلبی واردات کا پیرو کار ہو، اس کے پاس بحث ونظر اور تحقیق وتدقیق کے لیے وقت نہ ہو بلکہ یہ کام بلند پایہ ذہین لوگوں پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی کا ہے، جبکہ یہ کام اُن کی انتھک محنت اور بے لاگ توجہ سے بھی بروئے کار نہیں آسکتا۔۔۔ ان رسائل کا اس انداز سے تألیف پا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام براہِ راست اللہ تعالیٰ کی عنایت ومہربانی کا کرشمہ ہے؛ کیونکہ ان رسائل میں پائے جانے والے تمام کے تمام گہرے حقائق تمثیلوں کے ذریعے عوام الناس میں سے عام سے عام اور اَن پڑھ لوگوں تک کو پڑھائے اور سمجھائے جاتے ہیں، جبکہ کبارِ علماء کہتے ہیں: اِن میں سے اکثر حقائق سمجھ میں نہیں آتے ہیں، اس بنا پر وہ اُن حقائق کی تعلیم عام لوگوں کو بلکہ خاص لوگوں کو بھی نہیں دیتے ہیں۔

پس حقائق کی تألیف میں اور ان کی وضاحت کرنے میں کچھ اس طرح کی غیر معمولی آسان بیانی سے نوازا جانا کہ جس سے سمجھ سوچ سے بعید تر حقائق کچھ ایسے انداز سے بیان کر دیے جائیں کہ سادہ لوح انسان بھی سمجھ جائیں، میرے جیسے شخص کا کام نہیں ہوسکتا جو ترکی زبان پر دسترس نہیں رکھتا، جس کی باتیں اتنی مُغلق ہوتی ہیں کہ اکثر لوگ سمجھ ہی نہیں پاتے ہیں، اور جس کے بارے میں کافی عرصے سے مشہور ہے کہ وہ بالکل ظاہری حقائق کو بھی اُلجھا دیتا ہے، اور جس کی پرانی تألیفات اس کی اس بُری شہرت کی تصدیق بھی کرتی ہیں۔۔۔ ایسے شخص کے ہاتھوں اتنی سہل بیانی اور آساں نویسی کا ظہور

میں آ جانا یقیناً عنایتِ الٰہیہ کا کرشمہ ہے، قرآنِ کریم کے معنوی اعجاز کا ایک جگمگاتا جلوہ اور قرآنی تمثیلات کو منعکس کرنے والی شکل وصورت ہے، اس کا اپنا کمال نہیں۔

پانچواں اشارہ:

رسائلِ نور کے وسیع پیانے پر پھیل جانے کے باوجود سب سے بڑے عالم سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے عام آدمی تک، اور بڑے سے بڑے نیک ولی سے لے کر ایک فرو ترضدی ملحد فلسفی تک۔ جو کہ لوگوں کے مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا بھی ان رسائل پر تنقید نہ کرنا۔ حالانکہ یہ ان کے سامنے ہیں وہ انہیں دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور ہر گروہ نے اپنے اپنے درجے کے حساب سے ان سے فائدہ بھی اُٹھایا ہے اور کچھ گروہ اس کے طمانچوں اور تھپڑوں کی زد میں بھی آئے ہیں۔۔۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب ربانی عنایت اور قرآنی کرامت کی علامت ہے۔

پھر اس ڈھب کے رسائل جو کہ بہت زیادہ چھان بین اور گہری تحقیق وجستجو کے بعد لکھے جاتے ہیں اور غیر معمولی سرعت کے ساتھ میرے افکار وادراک کو پریشان کر دینے والے انقباضِ خاطر اور تنگی کے عالم میں لکھے اور لکھوائے جاتے ہیں؛ یہ سب عنایتِ ربانی اور اکرامِ الٰہی کے نتیجے کے سوا اور کچھ نہیں۔

جی ہاں؛ میرے تمام بھائی، میرے پاس رہنے والے تمام دوست اور تمام نسخہ نویس یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ انیسویں مکتوب کے پانچوں اجزاء کسی بھی کتاب کی طرف مراجعت کیے بغیر ہر روز تین یا چار گھنٹوں کے حساب سے کچھ دنوں میں اور مجموعی طور پر بارہ گھنٹوں میں لکھے گئے، حتی کہ چوتھا اہم ترین جزء جس نے ''رسولِ کریم ﷺ'' کے جملے کے ذریعے ختم نبوت کو واضح طور پر آشکار کیا ہے، یہ جزء محض حافظے کے بل پر پہاڑوں کے کونوں کھدروں میں اور بارش کے نیچے لکھا گیا۔

اسی طرح ''تیسواں مقالہ'' جو کہ ایک جلیل القدر گہرا رسالہ ہے ایک باغ میں چھ گھنٹوں کے عرصے میں لکھا گیا۔ اسی طرح اٹھائیسواں مقالہ ''سلیمان'' کے باغ میں دو گھنٹوں سے بھی کم عرصے میں لکھا گیا۔

دیگر زیادہ تر رسائل بھی اسی طرح تألیف ہوئے۔

اور میرے قریب تر رہنے والے لوگ جانتے ہیں کہ میں اس سے پہلے جب کبھی گھٹن کا شکار ہوتا تھا، واضح ترین حقائق کو بیان کرنے سے عاجز آ جاتا تھا، بلکہ ان سے لاعلم ہو جاتا تھا، اور خاص کر جب مرض اس گھٹن سے بڑھ جاتا میں تدریس وتألیف کے کام سے رُک جاتا تھا۔ جبکہ اہم ترین ''مقالات'' اور اسی طرح دیگر رسائل مرض اور گھٹن کے شدید ترین اوقات میں لکھے گئے اور تیز ترین رفتار سے کم سے کم وقت میں مکمل ہو گئے۔ پس یہ چیز اگر براہِ راست اکرامِ ربانی اور قرآنی کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر کوئی بھی کتاب جب اس طرح کے الٰہی اور ایمانی حقائق کو زیرِ بحث لاتی ہے تو اس کے بعض مسائل بہر حال بعض لوگوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں؛ اس بنا پر ہر مسئلہ ہر ایک کے لیے نشر نہیں کیا جاتا ہے، جبکہ ان رسائل نے نہ تو ابھی تک کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے، عکسِ عمل کی طرح کسی میں بُری تاثیر نہیں چھوڑی ہے اور نہ ہی کسی ذہن کو مخدوش کیا ہے۔ اِس ضمن میں مَیں بہت سے لوگوں سے پوچھ بھی چکا ہوں۔ اس سے ہمارے نزدیک یہ بات متحقق ہو گئی ہے کہ یہ چیز براہِ راست ایک غیبی اشارہ اور ربانی عنایت ہے۔

چھٹا اشارہ:

میرے ہاں یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ میری زندگی کے اکثر احداث و واقعات میرے اختیار و اقتدار اور شعور و تدبیر کی بساط سے باہر چلتے ہیں؛ کیونکہ ان واقعات کو قرآن کریم کی خدمت کرنے والے اس طرح کے رسائل کو جنم دینے کے لیے ایک معین روانی عطا کر دی گئی ہے اور انہیں ایک عجیب و غریب جہت بخش دی گئی ہے۔ بلکہ میری تمام کی تمام علمی زندگی "مقالات" کے ذریعے اعجاز القرآن کو بیان کرنے کے لیے تمہیدی مقدمات کی حیثیت رکھتی ہے، حتی کہ بغیر کسی سبب کے اور وجہِ جواز کے اور میری چاہت کے برعکس میری جلاوطنی، شہر بدری اور تنہائی کی اِس سات سالہ زندگی کے دوران، لوگوں سے دور میرے مشرب کے برخلاف دُور دراز کی ایک بستی میں میری زندگی کے دن گزرنا اور میرا اپنے سابقہ تمام اجتماعی تعلقات و روابط سے علیحدہ ہو جانا۔۔۔ ان تمام چیزوں نے مجھ میں کسی بھی شک وشبہ سے خالی یہ کامل اطمینان پیدا کر دیا کہ یہ سب کچھ مجھے قرآن کی خالص اور کسی بھی شائبے سے پاک صاف خدمت کرنے کے لیے تیار کرنے کا ساز و سامان ہے۔

بلکہ مجھے اس ضمن میں مکمل اطمینان حاصل ہو چکا ہے کہ یہ سختیاں جو مجھ پر یہ لوگ بسا اوقات روا رکھے ہوئے ہیں اور وہ مصیبتیں اور دشواریاں جن کی چکی میں مَیں پس رہا ہوں؛ یہ سب مجھے ایک خفیہ مہربان ہاتھ کے لطف و عنایت کے ذریعے اپنی نظر کو صرف اور صرف قرآن کریم کے اسرار و رموز میں منحصر کر لینے کے لیے آمادہ کرنے اور اسے اِدھر اُدھر بھٹکنے سے روکنے کے لیے ہے۔

اور باوجود اس کے کہ میں مطالعہ کا بہت شوقین تھا، میری روح میں قرآن کریم کے علاوہ کسی بھی دوسری کتاب سے کنارہ کش رہنے کی رغبت ڈال دی گئی ہے۔

تب مجھے اس بات کا ادراک ہو گیا کہ مطالعہ جو کہ اس اجنبیت میں میرا واحد تسلی کا سامان ہے، اس سے مجھے صرف اس بنا پر روک دیا گیا ہے کہ صرف اور صرف قرآنی آیات ہی میرا مطلق اُستاد ہیں۔

پھر تالیف شدہ رسائل اور کتابیں۔ مطلق اکثریت کے ساتھ۔ میری روح میں جنم لینے والی ضرورت کے تحت مجھے

کسی بھی بیرونی سبب کے بغیر اچانک انعام کر دی گئی ہیں، اور میں یہ رسائل جب اپنے بعض دوستوں کے سامنے ظاہر کرتا تھا تو وہ کہتے تھے: "یہ اس دور کے زخموں کی دوا ہیں" اور جب یہ پھیل گئے تو مجھے اپنے اکثر بھائیوں سے پتا چلا کہ یہ اس دور کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور اس کے زخموں کے لیے مرہم مہیا کرتے ہیں۔

یہ حالات جو بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اور یہ میری بساط میرے ارادے کے دائرے، میرے شعور اور میری حالات زندگی سے باہر ہیں۔ اور علوم ومعارف کے بارے میں میرا علماء کے انداز سے ہٹ کر تحقیق وجستجو کا ایسا انداز جو خود میرے بھی اختیار میں نہیں۔۔۔ اِن تمام باتوں سے مجھے اس بات میں قطعاً شبہ نہ رہا کہ یہ سب اس بلند پایہ نتیجے تک لے جانے کے لیے ایک قوی قسم کی عنایتِ الٰہی اور واضح قسم کا اکرامِ ربانی ہے۔

ساتواں اشارہ:

اپنی اس خدمت کے پانچ چھ سالہ دور میں ہم اپنی آنکھوں سے اِکرامِ الٰہی، عنایتِ ربانی اور کرامتِ قرآنی کے سینکڑوں اثرات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اور یہ بات کسی بھی مبالغے سے بالاتر ہے۔ ان میں سے بعض اثرات کی طرف ہم "سولھویں مکتوب" میں اشارہ کر چکے ہیں، بعض کی وضاحت "چھبیسویں مکتوب" کے چوتھے مبحث کے متفرق مسائل میں اور بعض کی "اٹھائیسویں مکتوب" کے تیسرے مسئلے میں کر چکے ہیں۔ میرے قریبی ترین ساتھیوں کو اس بات کا علم ہے، اور خاص کر میرا دائمی ہم نشیں "سلیمان" ان میں سے اکثر مسائل کا بخوبی علم رکھتا ہے۔ اور خصوصی طور پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہم رسائل ومقالات کی نشر واشاعت، تصحیح وتنقیح وترتیب اور تبییض وتسوید کے سلسلے میں کراماتی انداز سے اُمیدوں سے بڑھ کر آسانیوں سے نہال ہو جاتے ہیں۔ اب اس چیز کے بعد ہمیں اس بات میں ذرا بھی شک نہیں رہا کہ یہ سب قرآنی کرامت ہے۔ اور اس کی ہمارے پاس سینکڑوں مثالیں ہیں۔

پھر معیشت اور گزر اوقات کے باب میں ہمارا پالن پوشن اتنی شفقت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ ہم سے خدمت لینے والی صاحب عنایت ہستی ہمارے دل کے چھوٹے سے چھوٹے مطالبات ہماری اُمیدوں سے بڑھ کر ایسی جگہ سے پوری کر دیتی ہے کہ جو ہمارے سان گمان میں بھی نہیں ہوتی!

پس یہ حالت اس بات کی طرف ایک قوی تر اشارہ ہے کہ یہ قرآنی خدمت ہم سے لی جا رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے دائرے میں اور اس کی عنایت ومہربانی کے سائے میں ہمیں اس قرآنی خدمت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ﴾

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تَکُوْنُ لَكَ رِضَاءً وَلِحَقِّهٖ اَدَاءً وَعَلٰی آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا آمین۔

ایک خاص سوال کا جواب

[اس عنایت الٰہیہ کا راز ایک خاص پرائیویٹ معاملہ تھا، اسے ''چودھویں مقالے'' کے آخر میں لگا دیا گیا تھا، لیکن کسی بھی وجہ سے اکثر نسخہ نویسوں سے بھول ہوئی اور وہ اسے نہ لکھ پائے جس کی بنا پر یہ مخفی و مستور رہا۔ اس لیے اب اس کی اصل جگہ یہی ہے، اور یہ جگہ اس کے لیے موزوں ترین ہے]

میرے بھائی! آپ یہ پوچھتے ہیں کہ:

آپ نے قرآنِ کریم کے فیضان سے جو ''مقالات'' لکھے ہیں اُن میں ایک غیر معمولی قوت اور تاثیر کیوں ملتی ہے جو دیگر مفسرین و عارفین کے ہاں بہت کم ملتی ہے؟ کیونکہ بسا اوقات یہاں ایک کلمے میں پورے ایک صفحے کے برابر قوت پائی جاتی ہے، اور کبھی ایک صفحے میں پوری کتاب کی قوت ہوتی ہے؟

الجواب: یہ جواب بہت پیارا ہے۔ میں بغیر کسی لگی لپٹی کے اور بلا تکلف کہتا ہوں کہ: اس لیے کہ اس شرف کا سرچشمہ اعجازُ القرآن ہے میں نہیں ہوں۔

جی ہاں؛ اکثریت اور اغلبیت کے اعتبار سے ایسے ہی ہے؛ کیونکہ یہ مقالات:

تصوّر نہیں تصدیق ہیں (حاشیہ:۱)

تسلیم نہیں ایمان ہیں (حاشیہ:۲)

معرفت نہیں شہادت و شہود ہیں (حاشیہ:۳)

تقلید نہیں تحقیق ہیں (حاشیہ:۴)

التزام نہیں اذعان ہیں (حاشیہ:۵)

تصوّف نہیں حقیقت ہیں

(حاشیہ:۱) تصدیق: خبر دینے والے کی طرف اپنے اختیار سے سچائی کی نسبت کر دینے کو تصدیق کہتے ہیں۔ لیکن اگر خبر دینے والے کی طرف سچ یا جھوٹ یا نفی و اثبات کی نسبت نہ جائے بلکہ صرف خبر کا ادراک ہو جائے تو وہ تصور ہے۔ مترجم۔

(حاشیہ:۲) مراد ''اسلام'' یعنی یہ بظاہر مان لینا ہے، سورۂ حجرات کی آیت "قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا" کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم۔

(حاشیہ:۳) شہادت: آنکھوں دیکھی خبر دینا۔ شہود: حق کی معرفت حق کے ذریعے کرنا اور معرفت کسی چیز کا اسی شکل میں ادراک کر لینا جس شکل میں وہ دراصل ہے۔ مترجم۔

(حاشیہ:۴) تحقیق: کسی مسئلے کو اس کی دلیل کے ساتھ ثابت کرنا تحقیق اور کسی کے قول کو بغیر دلیل و حجت کے قبول کر لینا تقلید۔ مترجم۔

(حاشیہ:۵) اِذعان دل کے عزم کو اور عزم و ارادے کی پختگی کو کہتے ہیں۔ اور التزام کا مطلب ہے کسی چیز کو اپنے لیے ضروری قرار دے لینا اگرچہ وہ ضروری نہ بھی ہو۔ مترجم۔

صرف دعویٰ نہیں دعویٰ کے ضمن میں براہین ہیں اور اس راز میں حکمت یہ ہے کہ:

پہلے زمانوں میں ایمانی اصول مضبوط اور محفوظ تھے، سرِ تسلیم خم کر دینے کا جذبہ قوی اور کامل تھا۔ فروع میں اصحاب معرفت کے توضیحی بیانات بغیر دلیل کے بھی کافی ووافی اور قابلِ قبول ہوتے تھے۔

لیکن اس دور میں سائنسی گمراہیاں ایمان کی بنیادوں پر اور اس کے ارکان پر دست درازی کر چکی ہیں، اس بنا پر اس حکیم الرحیم ذوالجلال نے جو ہر بیماری کو اس کے مطابق دوا مہیا کرتا ہے۔ اُس نے میری عاجزی و درماندگی اور میرے فقر و ضعف پر ترس کھاتے ہوئے مجھ پر یہ احسان کیا کہ مجھے قرآن کی اُن تمثیلات کے ایک شعلے سے نواز دیا جو قرآن کریم کے اعجاز کا ایک تابندہ ترین مظہر شمار ہوتی ہیں، تاکہ میں اس شعلے کے ساتھ اپنی ان کتابوں کو روشن کر سکوں جو خاص طور قرآن کریم کی خدمت کے لیے لکھی گئی ہیں۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ تمثیل والے راز کی دُوربین کے ذریعے بعید ترین حقائق کو انتہائی قریب کر کے ظاہر کر دیا گیا۔

اسی طرح تمثیل کے راز میں پائی جانے والی جہت وحدت کے ذریعے متفرق اور پراگندہ تر مسائل کو یکجا کر دیا گیا۔

اور اسی طرح تمثیل کے راز کی سیڑھی کے ذریعے انتہائی آسانی کے ساتھ بلند ترین حقائق تک پہنچ حاصل کر لی گئی اور پھر اسی طرح تمثیل کے راز کی کھڑکی کے ذریعے غیبی حقائق اور اسلامی بنیادوں کے بارے میں شہود کے قریب قریب والا ایمانی یقین حاصل ہو گیا۔

چنانچہ عقل کے ساتھ ساتھ وہم و خیال حتیٰ کہ نفس و ہویٰ بھی سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے، اور شیطان بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

حاصل کلام:

میری کتابوں میں جو بھی حسن و جمال اور قوتِ تاثیر پائی جاتی ہے سب کی سب قرآنی تمثیلات کی جھلکیاں ہیں۔ میرا حصہ ان میں صرف اپنی شدید ضرورت، انتہائی قسم کی عاجزی و درماندگی اور گریہ زاری کے ساتھ دستِ طلب دراز کیے رکھنا ہے۔

پس بیماری میری ہے اور دوا قرآن کی۔

ساتویں مسئلے کی اختتامی بحث

[اس بحث میں خصوصی طور پر ان اَوہام کا اِزالہ کیا گیا ہے جو عنایاتِ الٰہیہ کی آٹھ صورتوں میں وارد ہونے والے غیبی اشارات پر وارد ہوئے ہیں یا ہوسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں عنایاتِ الٰہیہ کے ایک بہت بڑے راز کو آشکار کیا گیا ہے۔] یہ اختتامی بحث چار نکات پر مشتمل ہے۔

پہلا نکتہ:

ہم نے ''اٹھائیسویں مکتوب'' کے ساتویں مسئلے میں ''توافقات'' کے ذکر کے ضمن میں اپنے ایک غیبی اشارے کے جلوے کے مشاہدے کا دعویٰ کیا۔ اس اشارے کا احساس ہمیں آٹھ کلّی قسم کی سات آٹھ معنوی عنایات سے ہوا تھا۔ اور اس اشارے کے جلوے کا مشاہدہ ہم نے ''آٹھویں عنایت'' نامی ''توافقات'' کے عنوان کے تحت کیا تھا اور ہم اس بات کا دعویٰ کرتے چلے آرہے ہیں کہ یہ سات یا آٹھ عنایات اتنی قوی اور قطعی ہیں کہ اِن میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ مستقل طور پر ان غیبی اشارات کا اثبات کرتی ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی _ بفرضِ محال _ کمزور بھی نظر آئے، بلکہ اگر کسی کا انکار بھی کردیا جائے تو یہ چیز اس غیبی اشارے کی قطعیت میں خلل انداز نہیں ہوگی؛ کیونکہ جو ان آٹھ عنایات کا انکار نہیں کرسکے گا وہ ان اشارات کا بھی انکار نہیں کرسکے گا۔

لیکن لوگوں کے طبقات مختلف ہیں، اور عوام کا طبقہ جو کہ اکثریت کی نمائندگی کرتا ہے، زیادہ تر اپنے مشاہدے اور آنکھوں دیکھی بات پر اعتماد کرتا ہے، اس لیے میں ''توافقات'' پر وارد ہونے والے اوہام کے دفعیہ کی غرض سے حقیقت کو موازنے کی صورت میں بیان کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں، اس لیے نہیں کہ یہ حقیقت سب سے زیادہ قوی ہے، بلکہ اس لیے کہ یہ ان آٹھ عنایات میں سے سب سے زیادہ ظاہر اور عام ہے، اگرچہ دوسری عنایات بھی کچھ کم قوی نہیں ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ ہم نے اس ظاہری عنایت کے بارے میں کہا تھا۔

ہمارے تالیف کردہ رسائل میں ''قرآن'' اور ''رسول اکرم ﷺ'' کے الفاظ میں ''توافقات'' کچھ اس انداز سے نظر آتے ہیں کہ اس قسم کے شبہے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے ہیں کہ انہیں قصد اور ارادے سے منظم کیا گیا ہے اور متوازی وضع قطع دے دی گئی ہے! اور اس بات کی دلیل کہ یہ کام ہمارے قصد وارادے سے نہیں ہوا ہے، یہ ہے کہ ہمیں ان توافقات کے بارے میں تین چار سال کے بعد پتا چلا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کوئی غیبی قصد وارادہ اور عنایتِ الٰہیہ کا اثر تھا۔ اور ان دو کلمات کو ''توافق'' کی صورت میں یہ عجیب وغریب کیفیت اور وضع قطع فقط قرآنِ کریم اور رسولِ اکرم ﷺ کے معجزات کا اِثبات کرنے کے لیے دی گئی ہے، اور ان دو کلمات کی برکت قرآن پاک اور رسول کریم ﷺ کے معجزات کی

تصدیق کے لیے مُہر کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

بلکہ اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت رکھنے والے تمام کلمات بھی کثرت کے ساتھ "توافق" کا مظہر بن چکے ہیں لیکن یہ چیز چند محدود صفحات کے ساتھ خاص ہے، البتہ یہ دو کلمات ان دونوں رسالوں میں مکمل طور پر اور اکثر رسائل میں جابجا نظر آتے ہیں۔

لیکن ہم نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ اس توافق کی بنیاد دیگر کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن اس عجیب وغریب درجے میں نہیں جو بلند قصد اور بلند ارادے پر دلالت کرتا ہو!

پس باوجود اس کے کہ ہمارے اس دعوے کا توڑ موجود نہیں، تاہم پھر بھی ظاہری نظر سے اس میں ایک دو جہتیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے باطل اور بے جوڑ سی ہوں!

پہلی جہت: آپ لوگوں نے تھوڑے سے غور وفکر کے بعد ایسے توافق ایجاد کر لیے ہیں، اور قصد وارادے کے ساتھ اس طرح کام کر لینا کچھ مشکل نہیں!

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

کسی بھی دعوے کو ثابت کرنے کے لیے دو سچے گواہ کافی ہیں۔ اور ہمارے اس دعوے کے تو سینکڑوں گواہ موجود ہیں! صرف یہ ہوا ہے کہ ہمیں اس بات کا پتا تین چار سال کے بعد لگا، اور اس میں ہمارے قصد وارادے کا کوئی تعلق نہیں!

اس مناسبت سے میں ایک نقطے کی وضاحت کرتا ہوں:

یہ اعجازی کرامت اس انداز کی نہیں ہے جیسے قرآنِ حکیم بلاغت کی رُو سے اعجاز کا درجہ رکھتا ہے؛ کیونکہ انسانی طاقت بلاغت کی راہ میں چل کر قرآن کے بلاغی معجزے کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی!

چونکہ یہ اعجازی کرامت انسانی قدرت سے حاصل نہیں ہو سکتی اور قدرت کا اس میں کوئی عمل دخل ہے بھی نہیں! اس لیے اگر دخل اندازی ہو جائے تو تکلف اور بدنظمی کا شکار رہے گی۔ (حاشیہ)

تیسرا نکتہ:

خاص اشارے اور عام اشارے کی مناسبت سے ہم ربوبیت ورحمانیت کے رازوں میں سے ایک گہرے راز کی

(حاشیہ: ا) کسی ایک نسخے میں "انیسویں مکتوب" کے "اٹھارہویں" اشارے میں ہم نے "قرآن کریم" کے نو کلمات کے نیچے خط کھینچا تو اُن کے مجموعے سے لفظِ "محمد ﷺ" بن گیا۔ اور اس کے بالمقابل صفحے میں "قرآن کریم" کے آٹھ کلمات میں توافق پایا گیا اور ان کے مجموعے سے لفظ "اللہ" بن گیا! ان توافقات میں اس طرح کی بہت سی نادر مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مؤلف۔

نوٹ: اس حاشیے کی حقیقت ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

"بکر، توفیق، سلیمان، غالب، سعید"۔

طرف اشارہ کریں گے۔

ہمارے ایک بھائی نے ایک بہت خوبصورت بات کہی تھی، آپ اُس بات کو اِس مسئلے کا موضوع بنا سکتے ہیں۔ وہ بات یہ ہے:

ایک دن میں نے اُسے ایک خوبصورت توافق دکھایا تو اُس نے کہا: بہت خوب! پس ہر حقیقت خوبصورت ہے لیکن ان مقالات میں حاصل ہونے والی ''توفیق'' اور ''توافقات'' خوبصورت ترین ہیں! تو میں نے بھی کہا: جی ہاں؛ ہر چیز یا تو حقیقت میں خوبصورت ہے، یا ذاتی طور پر خوبصورت ہے، یا پھر اپنے نتائج کے اعتبار سے خوبصورت ہے۔ اور اس خوبصورتی کی نظر ربوبیتِ عامہ، رحمت کی شمولیت اور عام تجلّی کی طرف ہے۔ اور اس ''توفیق'' میں پایا جانے والا غیبی اشارہ خوبصورت ترین ہے؛ کیونکہ یہ ایسے انداز سے واقع ہوا ہے کہ اِس کی نظر خاص رحمت، خاص ربوبیت اور خاص تجلّی کی طرف ہے۔ اسے ہم ایک تمثیل کے ساتھ قریبُ الفہم بناتے ہیں:

کسی بھی بادشاہ کی شاہانہ مرحمت کا اُس کے قانون اور عمومی سلطنت کے ذریعے قوم کے تمام افراد کو شامل ہونا ممکن ہے، چنانچہ ہر فرد براہِ راست اس بادشاہ کے لطف وکرم اور اس کی سلطنت کا مظہر ہوتا ہے یعنی اس عمومی صورت کے ضمن میں افراد بہت سے خصوصی تعلقات کے حامل ہوتے ہیں۔

دُوسری جہت: اس کے خصوصی احسانات واوامر کی ہے۔ چنانچہ وہ اس عمومی قانون سے اُوپر اُٹھ کر کسی فرد کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتا ہے اور اُسے خصوصی توجہ کے ساتھ نوازتا ہے۔ اب اس تمثیل کی روشنی میں یہ سمجھو کہ: ہر چیز ذاتِ واجبُ الوجود اور خالقِ حکیم الرحیم کی ربوبیتِ عامہ اور رحمتِ شاملہ سے بہرہ یاب ہے۔ مطلب یہ کہ ہر چیز اپنے اپنے حصے میں آئی ہوئی جہت میں کسی خاص صورت میں اس کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ اپنی قدرت اور علمِ محیط کے ذریعے ہر چیز کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں اُس کا تصرّف، اُس کا عمل دخل اور اُس کی ربوبیّت کارفرما ہے، چنانچہ اس چیز کے تمام حالات و معاملات کا فیصلہ اس کے علم اور اس کی حکمت کی روشنی میں ہوتا ہے۔

اس لیے نیچر کی یہ مجال نہیں کہ اس کی ربوبیت کے تصرّف کے دائرے میں چھپ جائے یا تأثیر کی براہِ راست مالک بن جائے اور اس دائرے میں دخل اندازی کر سکے! اور نہ ہی تصادُف یا اتفاق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اُس کی حکمت کے حسّاس میزان کے دائرے میں پائے جانے والے شئون ومعاملات میں کوئی دخل اندازی کر سکے!

ہم نے رسائلِ نور میں بیس جگہوں پر قرآن کریم کی تلوار کے ساتھ اتفاق اور نیچر کی نفی کر دی ہے اور انہیں معدوم کر کے رکھ دیا ہے اور قطعی دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ یہ دونوں کسی بھی تأثیر کے مالک نہیں ہیں اور اُن کی اِن اُمور و معاملات میں دخل اندازی محال ہے!

لیکن اہلِ غفلت ربوبیتِ عامہ کے ظاہری اسباب کے دائرے میں پائے جانے والے اُن تمام اُمور کو "اتفاق" کا نام دے دیتے ہیں جن کے اسباب اور حکمتیں۔ ان کی نظر میں۔ سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ اور بعض افعالِ الٰہیہ کہ جن کی حکمتوں کا احاطہ نہیں ہوسکتا، اُن کے قوانین نیچر کے پردے کے نیچے چھپے ہوئے ہیں وہ انہیں دیکھ نہیں سکے اور ان کی پہنچ صرف نیچر تک ہی رہی۔

دوسری:

اُس کی خاص ربوبیت، اس کا خصوصی التفات اور اس کی خصوصی رحمانی امداد ہے، اور وہ اس طرح ہے کہ اسمِ گرامی "الرحمان الرحیم" اُن افراد کی مدد کرنے کے اور خصوصی تعاون کے لیے لپکتے ہیں اور انہیں ان سختیوں سے نجات دلاتے ہیں جو عام قوانین کی تنگیاں اور سختیاں برداشت نہیں کر پاتے ہیں۔

اسی بنا پر ہر جاندار اور خاص کر انسان ہر آن اُسی سے مدد مانگتا ہے اور اُس سے تعاون چاہتا ہے۔ پس اس کے احسانات جو اس کی خصوصی ربوبیت میں پائے جاتے ہیں،۔ حتیٰ کہ اہلِ غفلت کے ہاں بھی۔ نہ تو "اتفاق" کے تحت چھپ سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں نیچر کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔

پس اس راز کی روشنی میں ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ "قرآنی معجزات" اور "معجزاتِ رسول ﷺ" میں پائے جانے والے غیبی اشارات خصوصی اشارات ہیں اور ہمیں اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ یہ کوئی خصوصی امداد اور خاص عنایت ہے جو خود کو ضدی اور عناد پرست لوگوں کے مقابلے میں آشکار کر رہی ہے۔ اور اس چیز کا اعلان ہم نے محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیا ہے۔

اس ضمن میں ہم سے اگر کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اللہ ہمیں معاف فرمائے۔ آمین

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾

☆ ☆ ☆

آٹھواں مسئلہ

جو کہ آٹھواں خط ہے

''یہ مسئلہ آٹھ نکات پر مشتمل ہے جن میں چھ سوالوں کے جواب ہیں''

پہلا نکتہ: عنایتِ الٰہیہ کے تحت ہم سے قرآنِ کریم کی جو خدمت لی گئی ہے اس میں ہم نے بہت سے غیبی اشارات محسوس کیے ہیں، جن میں سے بعض کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اب ہمارے سامنے ایک نیا اشارہ آیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اکثر ''مقالات'' کے اخیر میں غیبی ''توافقات'' پائے جاتے ہیں۔ (حاشیہ)

اُن میں سے ایک یہ ہے کہ: ''رسول اکرم ﷺ'' کے لفظ ''علیہ الصلاۃ والسلام'' کی عبارت اور ''قرآن'' کے مبارک لفظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ الفاظ ایک قسم کے اعجاز اور کچھ غیبی اشارات کی ترجمانی کرتے ہیں، وہ اشارات کتنے بھی پوشیدہ اور کمزور کیوں نہ ہوں، بہر کیف میرے نزدیک بڑی اہمیت کے حامل اور بہت قوی ہیں؛ کیونکہ وہ خدمت کی قبولیت اور مسائل کی حقانیت پر دلالت کرتے ہیں، میرا غرور توڑتے ہیں اور میرے لیے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ میں تو فقط ترجمان ہوں اور میرے لیے فخر و غرور کی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے بلکہ صرف شکر و سپاس کے جذبات مہیا کرتے ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ اُن کا تعلق چونکہ صرف قرآن پاک کے ساتھ ہے اور ان کا سرچشمہ صرف قرآن ہی ہے، ہمارا جزوی اختیار قطعاً اُن میں اثر انداز نہیں ہے، کسلمندوں کو مہمیز دیتے ہیں اور ان میں یہ اطمینان پیدا کرتے ہیں کہ رسائل مبنی بر حقیقت ہیں۔ اور یہ چیز ہمارے لیے ایک طرح کا اِکرامِ الٰہی ہے؛ اور اس کا اِظہار کرنا تحدیثِ نعمت ہے، اور یہ ان سرکش لوگوں کو خاموش کر دیتے ہیں جن کی عقلیں اُن کی آنکھوں میں اُتر آئی ہیں؛ اس لیے ان کا اظہار کرنا ضروری اور بے ضرر ہے۔ ان شاء اللہ۔

اور ان اشارات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال رحمت اور لطف و کرم سے یہ احسان کیا اور قرآن و ایمان کی خدمت کے سلسلے میں ہماری ہمت بندھانے کے لیے اور ہمارے دلوں کو سکون بخشنے کے لیے اکرامِ ربانی اور احسانِ الٰہی کی صورت میں ایک غیبی اشارے سے ہمیں یہ بتا دیا کہ ہم نے جو کچھ تالیف کیا ہے حق ہے اور ہماری خدمت کے قبول ہو جانے کی علامت ہے۔ اور یہ چیز ''غیبی توافقات'' کی صورت میں ہمارے تمام رسائل میں اور خاص کر

(حاشیہ) توافقات میں اتفاق کی طرف اشارہ ہے، اتفاق اتحاد کا نشان اور وحدت کی علامت ہے۔ وحدت توحید پر دلالت کرتی ہے۔ اور توحید قرآن کی چار بنیادوں میں سے سب سے بڑی اساس ہے۔ مؤلف۔

''معجزاتِ رسول ﷺ، قرآنی معجزات اور دریچے'' نامی کتابوں میں جابجا پائی جاتی ہے؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی صفحے میں کچھ متماثل کلمات کچھ اس انداز سے رکھ دیے جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور اس چیز میں اس بات کا ایک غیبی اشارہ ہے کہ انہیں کسی غیبی ارادے کے ساتھ اس لڑی میں پرویا گیا ہے اس لیے تم اس ضمن میں اپنے شعور اور اپنے اختیار پر بھروسا نہ کرو۔ اور اس میں کچھ اس طرح کے خارق عادت غیبی انتظامات ہو رہے ہیں اور غیبی نقوش ظہور میں آ رہے ہیں کہ تمہارے اختیار کو اس کی خبر بھی نہیں اور تمہارا شعور وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ اور خاص کر ''معجزاتِ رسول ﷺ'' میں آنے والا لفظ ''رسول اکرم علیہ الصلاۃ والسلام'' اور لفظ ''صلوات'' ایک ایسے آئینے کا حکم دھار چکا ہے جو صریحاً ان غیبی توافقات کو آشکار کرتا ہے۔ بلکہ ایک نئے اور ناتجربہ کار کاتب کے نسخے میں لفظِ ''صلوات''۔ صرف پانچ صفحات کے علاوہ۔ دو سو سے زائد مرتبہ کچھ اس انداز سے بالکل متوازی صورت میں آئے ہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

پس یہ ''توافقات'' جیسے قطعی طور پر کسی اتفاق کا کرشمہ نہیں ہو سکتے کہ جس کی وجہ سے دس میں سے ایک دو کلمات میں غیر شعوری طور پر توافق پیدا ہو جانا ممکن ہوتا؛ اسی طرح ان کا سرچشمہ میرے جیسے مسکین اور غیر ماہر آدمی کی سوچ فکر کا شاخسانہ بھی نہیں ہو سکتا جس کی نظر صرف معنی میں محصور ہے اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹوں میں تیس چالیس صفحات تالیف کر لیتا ہے؛ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود نہیں لکھتا بلکہ دوسروں سے لکھواتا ہے۔

چنانچہ میں نے قرآنِ کریم کی رہنمائی کی روشنی میں اور ''اشارات الاعجاز'' نامی تفسیر کی رہنمائی میں کہ جس میں لفظِ ''اِنّا'' میں نو جگہوں میں توافق پیدا ہو گیا تھا؛ مجھے چھ سال بعد اس بات کا پتا چلا۔ اور کاتبوں نے جب اس بارے میں مجھ سے سنا تو حیرت زدہ رہ گئے!

پس جس طرح انیسویں مکتوب میں آنے والے ''رسول اکرم علیہ الصلاۃ والسلام'' اور ''صلوات'' کے الفاظ معجزاتِ رسول علیہ الصلاۃ والسلام کے لیے ایک چھوٹے سے آئینے کا روپ دھار گئے ہیں، اسی طرح پچیسویں مقالے یعنی ''قرآنی معجزات'' میں اور انیسویں مکتوب کے اٹھارہویں اشارے میں پائے جانے والے لفظِ ''قرآن'' میں بھی ایک ایسا لطیف توافق پایا جاتا ہے جو تمام رسائل میں پائے جانے والے ان ''توافقات'' کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء کی نشاندہی کرتا ہے! اور جو اُن لوگوں کے لیے اعجازُ القرآن کی چالیس صورتوں میں سے ایک صورت کی وضاحت کرتا ہے جو لوگ فقط اپنے مشاہدات پر اعتماد کرتے ہیں، اور یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے چالیس طبقات میں سے ایک طبقے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ:

پچیسویں مقالے میں اور انیسویں مکتوب کے اٹھارہویں اشارے میں لفظِ ''قرآن'' تکرار کے ساتھ سو مرتبہ آیا ہے،

اور تمام کلمات ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، اور اگر کہیں ایسا نہیں ہے تو وہ ایک نادر صورت ہے اور دوسری شعاع کے صفحہ نمبر تنتالیس میں لفظ ''قرآن'' سات مرتبہ آیا ہے، اور ہر کلمہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتا ہے۔ اور صفحہ نمبر چھپن میں لفظ ''قرآن'' نو بار آیا ہے، ان میں سے ایک کے علاوہ باقی آٹھ کلمات ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور صفحہ نمبر اُنہتر جو اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اس میں پائے جانے والے ''القرآن'' والے پانچ لفظ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اسی طرح تمام صفحات میں آنے والے ''القرآن'' کے کلمات ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور یوں تمام صفحات میں وارد ہونے والے ''قرآن'' کے کلمات ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، اور پانچ چھ کلمات میں سے صرف ایک آدھ ہی ایسا بچتا ہے جو اس کیفیت کا حامل نہ ہو۔

رہے دیگر ''توافقات''، تو ہمارے سامنے تینتیسویں صفحے میں لفظ ''اُمّ'' پندرہ بار آیا ہے اور اُن میں سے چودہ الفاظ یک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اسی طرح ہمارے سامنے والے صفحے میں لفظ ''ایمان'' نو بار آیا ہے، اور ان میں سے ہر لفظ ایک دوسرے کو دیکھ رہا ہے، پس ایک لفظ کاتب کے دو کلمات کے درمیان فاصلہ ڈالنے کی وجہ سے تھوڑا منحرف ہو گیا ہے۔

اسی طرح ہمارے سامنے والے صفحے میں لفظِ ''محبوب'' دو دفعہ آیا ہے، ایک تیسری سطر میں اور دوسرا پندرہویں سطر میں، اور یہ دونوں کمال موزونیت کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، اور ان دونوں کے درمیان لفظ ''عشق'' چار دفعہ بڑی ترتیب سے آیا ہے، اور چاروں لفظ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ اور یوں دیگر غیبی توافقات کو ان الفاظ پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

کاتب کوئی بھی ہو اور سطریں اور صفحات کسی بھی شکل میں کیوں نہ ہوں، یہ توافقات بہر حال موجود رہتے ہیں، اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہنے دیتے کہ: یہ نہ تو اتفاقات کا کام ہے اور نہ مؤلف اور کاتبوں کی سوچ فکر کا نتیجہ ہیں۔ صرف یہ ہے کہ بعض کاتبوں کے نسخوں میں یہ ''توافقات'' زیادہ توجہ کھینچتے ہیں، مطلب یہ کہ ان رسائل کا ایک حقیقی خط ہے جو انہیں کے ساتھ خاص ہے اور کچھ کاتب اور نسخہ نویس اس خط کے قریب قریب جا پہنچتے ہیں۔

اور عجیب و غریب بات یہ ہے کہ یہ ''توافقات'' زیادہ تر ان کاتبوں کے نسخوں میں نظر آتے ہیں جو حاذق اور ماہر کاتب نہیں بلکہ بالکل نو آموز اور غیر تربیت یافتہ ہیں۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ''مقالات'' جو کہ قرآن کی ایک قسم کی تفسیر ہیں، ان میں پائی جانے والی صنعت، مہارت، دانائی، جاذبیت اور مزیّت و خصوصیت کسی ایک کی ملکیت نہیں، بلکہ قرآن کے منظم اور خوبصورت حقائق کے بابرکت قد و قامت کے ساتھ میل کھانے والے اور مناسبت رکھنے والے اسالیب کے ملبوسات کسی کے اختیار اور سمجھ بوجھ

کے ساتھ کاٹے اور سیے نہیں جاتے، بلکہ ان کا جسم خود ہی تقاضا کرتا ہے کہ وہ کیسے ہونے چاہئیں۔ اور ایک غیبی ہاتھ ہی انہیں اُس قد و قامت کے مطابق کاٹتا، سیتا، پروتا اور پہناتا ہے۔

رہے ہم لوگ تو ہم تو اس باب میں ترجمان اور خادم ہیں۔

چوتھا نکتہ:

آپ لوگوں نے اپنے اس پہلے سوال میں کہ جو پانچ چھ سوالوں پر مشتمل ہے، یہ پوچھا ہے کہ:

میدانِ حشر میں لوگ جمع کیسے ہوں گے؟ کیا لوگ وہاں ننگے ہوں گے؟ یاروں دوستوں کی ملاقات اور اکٹھ کیسے ہوگا؟ ہم رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام کو شفاعت کے لیے کیسے پائیں گے؟ ایک اکیلا انسان لاتعداد انسانوں کے ساتھ ایک ساتھ ملاقات کیسے کرے گا؟ اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کا لباس کیسا ہوگا؟

اور وہاں ہمارا رہنما کون ہوگا؟

الجواب: کتبِ احادیث میں اس سوال کا جواب مکمل اور واضح طور پر موجود ہے۔ البتہ اس مقام پر ہم اپنے مسلک و مشرب کی روشنی میں صرف ایک دو نکتے بیان کریں گے:

اوّلاً: کسی مکتوب میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ میدانِ حشر کرۂ ارض کے سنوی مدار میں ہوگا، اور یہ کہ زمین ابھی سے اپنی معنوی محصولات اس میدان کی الواح کی طرف بھیجتی جارہی ہے۔ اور یہی زمین اپنی سالانہ حرکت کے ذریعے وجود کے دائرے کی صورت اختیار کر جائے گی اور میدانِ حشر اس وجودی دائرے کی محصولات کی بنا پر حشر کی شکل میں ڈھل جانے کا سر آغاز بن جائے گی۔

اور یہ ربانی سفینہ جسے کرۂ ارض کہا جاتا ہے، اپنے مرکز میں پائی جانے والی جہنم صغریٰ کو جہنم کبریٰ میں اُنڈیل دے گا اور اپنے باسیوں کو میدانِ حشر کی طرف دھکیل دے گا۔

ثانیاً: مقالات میں اور خاص کر دسویں مقالے میں اور انتیسویں مقالے میں حشر اور میدانِ حشر کے وجود کا قطعی اثبات کر دیا گیا ہے۔

ثالثاً: رہی بات دوستوں کے ساتھ اجتماع کی، تو سولہویں، اکتیسویں اور بتیسویں مقالے میں یہ بات ثابت کر دی گئی ہے کہ نورانیت کے راز کی رُو سے ایک ہی شخص ایک سیکنڈ میں ہزاروں جگہوں پر موجود ہو سکتا ہے اور ہزاروں لوگوں سے مل سکتا ہے!

رابعاً: اسمِ گرامی ''الحکیم'' کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میدان حشر میں انسان کو فقط فطری لباس پہنائے اور انسان مصنوعی لباس سے عاری رہے، بالکل ایسے جیسے کہ اُس نے انسان کے علاوہ اپنی تمام جاندار مخلوقات کو فطری لباس

پہنایا ہوا ہے۔

اس دنیا میں مصنوعی لباس کی حکمت صرف زیب وزینت میں ہی منحصر نہیں ہے، پردہ پوشی اور گرمی سردی سے بچاؤ میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ اس کی اہم ترین حکمت یہ ہے کہ:

لباس ایک فہرست اور پروگرام کی حیثیت رکھتا ہے جو تمام انواع میں اس کی قیادت وسیادت، سب کے ساتھ اُس کی مناسبت اور سب میں اس کے تصرّف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وگرنہ اللہ تعالیٰ کے لیے تو بہت آسان ہے کہ وہ اسے کوئی فطری لباس پہنا دے؛ کیونکہ اگر اس میں یہ حکمت کارفرما نہ ہوتی تو انسان اپنے بدن پر مختلف قسم کے ٹکڑے اور چیتھڑے لپیٹے پھرتا اور شعور رکھنے والے حیوانات کی نظروں میں مسخرہ بن کر رہ جاتا اور وہ معنوی طور پر اس پر ہنستے رہتے!

لیکن میدانِ حشر میں یہ حکمت اور مناسبت چونکہ باقی نہیں رہے گی اس لیے اس پروگرام کا وجود بھی نہیں رہے گا۔

خامسا: رہا راہنما، تو وہ قرآن ہے، آپ جیسے ان لوگوں کے لیے جو قرآن کے نور کے تحت آ گئے ہیں، آپ سورتوں کے آغاز میں پائے جانے والے ''الٓمٓ، الٓرٰ اور حٰمٓ، جیسے حروفِ مقطعات میں غور کریں، سمجھیں اور دیکھیں کہ قرآن کیسا شافع مشفّع، سچا پائیدار رہنما اور مقدّس نور ہے!

سادسا: رہے اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے کپڑے، تو اس ضمن میں ''اٹھائیسویں مقالے'' میں حوروں کے ستر جوڑوں کے متعلق جس دستور کی وضاحت کی گئی ہے وہ یہاں بھی لاگو ہوگا، اور وہ اس طرح ہے کہ:

اہلِ جنت میں سے کوئی بھی آدمی بلاشبہ جنّت کی تمام لذتوں سے ہمہ وقت لطف اندوز ہونا چاہے گا۔ اور جنت میں آخری درجے کی انواع واقسام کی نعمتیں اور خوبیاں ہیں، اور وہ ان تمام نعمتوں سے وقتاً فوقتاً متمتع ہوتا رہے گا: اس بنا پر وہ ایک چھوٹے سے پیمانے پر خود بھی جنت کے حُسن کے کچھ نمونے پہن لے گا اور اپنی حُوروں کو بھی پہنا دے گا جس سے وہ اور اس کی حوریں جنت کا ایک چھوٹا سا نمونہ بن جائیں گے!

اسے یوں سمجھیں کہ جس طرح ایک انسان اپنے گھر کے چھوٹے سے باغیچے میں تمام علاقے کے پھول اکٹھے کر لیتا ہے، یا جس طرح ایک دوکاندار ایک لسٹ میں اپنی دوکان میں پایا جانے والا تمام سامان اکٹھا کر لیتا ہے۔ یا پھر جسے کوئی آدمی اپنا لباس اور اپنے گھر کا ساز وسامان ان مختلف قسم کی مخلوقات کے نمونوں پر بنالیتا ہے جن میں اسے کوئی تصرّف حاصل ہے، جن پر وہ حکم چلاتا ہے یا اس طرح کی کوئی اور مناسبت رکھتا ہے؛ اسی طرح اہلِ جنت میں سے کوئی انسان، اور خاص کر اس وقت جبکہ اس نے اپنے تمام حواس اور معنوی آلات کے ساتھ بندگی کی ہوگی اور وہ جنت کی لذتوں کا مستحق ہو گیا ہوگا: اسے اور اس کی حوروں کو رحمتِ الٰہیہ کی طرف سے ایسا لباس پہنا دیا جائے گا جو جنت کے ہر قسم کے حُسن و جمال کو کچھ اس انداز سے آشکار کرے گا کہ اس کے تمام حواس کو راضی کر دے گا، اس کے تمام آلات کو نواز دے گا اور اس کے تمام

لطائف کو ذوق آشنا کر دے گا۔

اور اس بات کی دلیل کہ کپڑوں کی وہ متعدد اقسام ایک ہی جنس یا ایک ہی نوع کے نہیں ہوں گی، وہ حدیث ہے جس کا مفہوم کچھ یوں "حوریں کپڑوں کے ستر جوڑے پہنیں گی، بایں ہمہ ان کی پنڈلیوں کی ہڈیوں کا گودا نظر آ رہا ہوگا، وہ کپڑے اسے چھپا نہیں رہے ہوں گے"

مطلب یہ ہے کہ ایسے بہت سے مراتب ہوں گے جو اوپر والے جوڑے سے لے کر نیچے والے جوڑے تک حواس و احساسات و مشاعر کے ذائقوں کو مختلف پہلوؤں سے گونا گوں حسن و جمال کے ذائقوں سے نہال کریں گے۔

رہے اہلِ جہنم، تو اُنہوں نے چونکہ اپنی آنکھوں، کانوں، عقلوں، دلوں، ہاتھوں اور پاؤں یعنی اپنے تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ گناہوں کا ارتکاب کیا ہوگا، اس لیے بلاشبہ انہیں ایسا لباس پہنایا جائے گا جو مختلف اجناس کے ٹکڑوں سے بنایا گیا ہوگا، وہ لباس انہیں جہنم میں ان اعضاء و جوارح کے حساب سے دُکھ دے گا اور عذاب سے دوچار کرے گا۔ اور ان کے لیے بجائے خود ایک چھوٹی سی جہنم کا رُوپ دھار جائے گا۔ اور یہ چیز حکمت اور عدالت کے منافی نظر نہیں آ رہی ہے۔

پانچواں نکتہ:

آپ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ نبی ﷺ کے آباء و اَجداد فترت کے عرصے میں کسی دین پر تھے یا نہیں؟

الجواب: ایسی روایات ملتی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ لوگ دینِ ابراہیم کے بچے کھچے حصے کو مانتے تھے جو کہ غفلت اور معنوی ظلمات کے پردوں کے نیچے چھپ چکا تھا، اور بعض خاص لوگوں میں تسلسل کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ اس لیے یہ بات کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے نیچے آئے اور جنہوں نے ایک ایسے نورانی سلسلے کی تشکیل کی جس سے نبی اکرم ﷺ پیدا ہوئے، وہ دینِ حق کے نور سے غافل نہیں تھے اور کسی بھی طرح کفر کی تاریکیوں میں نہیں گرے تھے۔ لیکن آیتِ کریمہ:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾

واضح کرتی ہے کہ اہلِ فترت اہلِ نجات میں سے ہوں گے اور فروعی مسائل میں صادر ہونے والی غلطیوں پر اُن کا بالاتفاق مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ اگرچہ کفر میں بھی گر گئے ہوں، اور اُن کے ہاں ایمان کے اصول بھی نہ پائے جاتے ہوں، تو بھی وہ امام شافعیؒ اور امام اشعریؒ کے نزدیک اہلِ نجات ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پابندیوں کا مکلف اس وقت کیا جاتا ہے جب رسول بھیجے جائیں، اور رسالت کی آمد کا پتا چل جائے۔

لیکن چونکہ غفلت اور مرورِ زمانہ نے سابقہ انبیاء علیہم السلام کے ادیان پر دبیز پردے تان دیے تھے، اس لیے یہ ادیان زمانۂ فترت کے لوگوں کے لیے حجت نہیں تھے۔ چنانچہ اگر وہ ان ادیان کی اطاعت کرتے تو ثواب پا لیتے اور اگر

اطاعت نہ کرتے تو انہیں سزا نہ ملتی؛ کیونکہ وہ ادیان پس پردہ جا چکے تھے اس لیے حجت نہیں بن سکتے تھے۔

چھٹا نکتہ: آپ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ کیا نبی اکرم ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی رسول آیا تھا؟

الجواب: اس بات پر کوئی قطعی نص تو نہیں ملتی کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے بعد آپ ﷺ کے آباء واجداد میں سے کوئی نبی آیا ہو۔ البتہ آپ ﷺ کے اجداد کے علاوہ دوسرے لوگوں میں سے ''خالد بن سینان'' اور ''حنظلہ'' نامی دونبیوں کے نام ضرور ملتے ہیں۔

کعب بن لوی جو کہ آپ ﷺ کے آباء واجداد میں سے ایک شاعر ہیں، اُن کے ایک مشہور قصیدے کا ایک شعر ہے:

عَلَى غَفْلَةٍ يَأْتِي النَّبِيُّ مُحَمَّدٌ
فَيُخْبِرُ أَخْبَاراً صَدُوْقاً خَبِيْرُهَا

ان کا یہ صریح کلام نبوت اور معجزے کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانی نے دلیل وکشف پر اعتماد کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''بلادِ ہند میں بہت سے پیغمبر آئے ہیں، لیکن ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کی کوئی امت بن ہی نہیں سکی، یا پھر بنی تو چند محدود گمنام افراد میں منحصر رہی اس لیے ان کی نبوت شہرت نہیں پاسکی، یا تنک ث ہونے والے انبیاء علیہم السلام کو انبیاء کے علاوہ دیگر ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔

امام ربانی کے بتائے ہوئے اس دستور کی روشنی میں اس طرح کے انبیاء کا آپ ﷺ کے آباء واجداد میں سے ہونا ممکن ہے۔

ساتواں نکتہ:

آپ نے پوچھا ہے کہ: آپ ﷺ کے والدین اور دادا عبدالمطلب کے ایمان کے بارے میں صحیح ترین اور قوی ترین قول کون سا ہے؟

الجواب: جدید سعید قرآن کریم کے علاوہ دیگر کتابوں کو اپنے پاس جمع کر کے نہیں رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے قرآن ہی کافی ہے پچھلے دس برس سے اس طرح کے فروعی مسائل کے لیے میرے پاس حدیث کی تمام کتابوں سے تحقیق کرنے کے لیے وقت نہیں نکلتا ہے کہ میں صحیح ترین اور قوی ترین قول تک پہنچ پاؤں، صرف اتنا کہتا ہوں کہ:

آپ ﷺ کے والدین اہلِ نجات سے اہلِ جنت سے اور اہلِ ایمان سے ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے

حبیب اکرم ﷺ کے مبارک دل کو تکلیف نہیں پہنچائے گا اور اس دل میں پائی جانے والی پسرانہ شفقت کو مجروح نہیں کرے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ

اگر ایسے ہی ہے تو پھر انہیں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی توفیق کیوں نہیں ملی؟ اور وہ آپ ﷺ کی بعثت کو پا کیوں نہ سکے؟

تو جواب: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم کی بنا پر اپنے حبیبِ اکرم ﷺ کے والدین کو آپ ﷺ کے پسرانہ احساسات کو خوش رکھنے کی خاطر زیرِ بارِ احسان نہیں رکھنا چاہتے، اس لیے اس کی رحمت کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ اپنے حبیب اکرم ﷺ کو راضی کرے، آپ کے والدین کو سعادت بخشے اور انہیں اپنی خالص ربوبیت کے احسان تلے رکھے، تا کہ انہیں والدیت کے مرتبے سے اُتار کر معنوی اولاد کے مرتبے میں نہ لائے۔ اسی بنا پر اُس نے آپ ﷺ کے والدین و اور دادا کو ظاہری طور پر تو آپ ﷺ کی اُمت میں شامل نہیں کیا البتہ انہیں اُمت کی تمام مزیتوں، فضیلتوں اور سعادتوں سے ہمکنار کر دیا۔

جی ہاں؛ فوج کے ایک عظیم الشان فیلڈ مارشل کا والد جو کیپٹن کے رینک کا ہو جب اس کے سامنے آئے گا بیک وقت دو متضاد احساسات کی تاثیر کے نیچے دبا رہے گا۔ اس لیے بادشاہ اپنے معزز کے ساتھ مہربانی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس کے والد کو اس کی ماتحتی میں نہیں رہے گا۔

آٹھواں نکتہ:

آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے ایمان کے بارے میں صحیح ترین قول کون سا ہے؟

الجواب: اہلِ تشیع آپ کے ایمان کے قائل ہیں، لیکن اکثر اہل سنت آپ کے ایمان کے قائل نہیں ہیں۔ البتہ میرے دل میں جو وارد ہوا ہے یہ ہے کہ:

ابو طالب رسول اکرم ﷺ کے ساتھ انتہائی گہری محبت رکھتے تھے، اور ان کی یہ محبت آپ ﷺ کی ذات مبارک کے ساتھ تھی آپ کی رسالت کے ساتھ نہیں۔ اس لیے بلا شبہ اُن کی آپ ﷺ کی شخصیت کے ساتھ یہ خالص والہانہ محبت اور شفقت رنگ لائے گی اور بے کار نہیں جائے گی۔

جی ہاں، ابو طالب کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کے ساتھ خالص محبت کی ہے، دشمنوں سے آپ ﷺ کی حفاظت کی ہے اور آپ ﷺ کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ اگر اس بنا پر جہنم میں چلے جائیں کہ وہ بغض و عناد وانکار کی وجہ سے نہیں بلکہ شرمندگی اور قوی تعصب جیسے احساسات سے مغلوب ہو کر ایمان نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ

اُن کی نیکیوں کے بدلے میں ان کے لیے جہنم کے اندر ایک خصوصی جنت بنا دے، اور ان کی خصوصی جہنم کو خصوصی جنت میں تبدیل کر دے؛ بالکل ایسے جیسے وہ بعض جگہوں میں شدید سردی کے موسم میں بہار پیدا کر دیتا ہے، اور بعض لوگوں کے لیے تنگ و تاریک قید خانے کو۔ خواب کی وساطت سے۔ عالی شان محل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

وَالْعِلْمُ عِنْدَاللّٰهِ۔۔ لَا يَعْلَمُ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

اُنتیسواں مکتوب

یہ انتیسواں مکتوب نو اقسام پر مشتمل ہے، اور یہ اُس کی پہلی قسم ہے جس میں نو نکات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ﴾

میرے سچے وفادار بھائی اور قرآنی خدمت کے سلسلے میں میرے سنجیدہ اور محنتی دوست!

اس مرتبہ آپ اپنے خط میں ایک اہم سوال کا جواب چاہتے ہیں جبکہ میرے اوقات اور میرے حالات اس کے بارے میں لکھنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔

میرے بھائی!

اس سال۔ بحمد اللہ۔ رسائل نور کو لکھنے والوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ اس لیے میرے پاس جب اُن کا لکھا ہوا دوسری بار تصحیح کے لیے آتا ہے تو میں جلدی سے اُس کی تصحیح میں لگ جاتا ہوں اور یوں میرا سارا دن اسی مصروفیت میں نکل جاتا ہے جس کی وجہ سے میرے اکثر اہم معاملات تأخیر کی نذر ہو جاتے ہیں؛ اور میں اس تصحیح کے کام کو اُن امور سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ خصوصاً شعبان اور رمضان کے مہینوں میں کہ جن میں دل کا حصہ عقل سے زیادہ ہوتا ہے اور روح حرکت میں رہتی ہے۔ اس لیے اس جلیل القدر مسئلے کو میں کسی اور وقت تک مؤخر کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جب دل میں اس کے بارے میں کچھ وارد ہوگا دھیرے دھیرے آپ کے لیے قلمبند کرتا جاؤں گا سرِ دست میں تین نکتوں کی وضاحت کر رہا ہوں (حاشیہ)

پہلا نکتہ:

''قرآن حکیم کے اسرار و رموز کی مکمل معرفت حاصل نہیں ہو سکتی اور مفسرین قرآن کی حقیقت کا ادراک نہیں کر پائے''۔ اس بات کے دو پہلو ہیں اور یہ بات کہنے والے دو گروہ ہیں:

پہلا گروہ:

یہ اہلِ حق، اہلِ علم اور اہلِ تحقیق و تدقیق ہیں، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ: ''قرآن ایک ختم نہ ہونے والا خزانہ ہے۔ اور ہر دور اس کی نصوص اور محکمات کو تسلیم اور قبول کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اُن مخفی حقائق سے اپنا حصہ حاصل کرتا جاتا ہے

(حاشیہ) بالآخر یہ نو نکتوں میں پورے ہوئے۔ مؤلف۔

جو تتمات کی حیثیت رکھتے ہیں، اور جو حصے دیگر ادوار کے لیے مخفی ہیں اُنہیں ہاتھ نہیں لگاتا ہے۔

جی ہاں؛ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے حقائق مزید آشکار ہوتے چلے جائیں گے۔ اور یہی چیز مطلوب ہے وگرنہ اس سے مراد۔ حاشا وکلا۔ ان ظاہری حقائق کو شبہات کی نذر کر دینا نہیں ہے جو سلف صالحین نے بیان کیے ہیں؛ کیونکہ وہ تو قطعی نصوص، اصول اور ارکان ہیں اور ان پر ایمان لانا لازم ہے۔ اور قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ اپنے فرمانِ گرامی ﴿عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ﴾ کے ذریعے اعلان کرتا ہے کہ اس کا معنی بالکل واضح ہے اور خطابِ الٰہی اوّل سے آخر تک انہی معانی کے اِرد گرد گھومتا ہے، انہیں تقویت دیتا ہے اور بداہت کے درجے میں لے آتا ہے۔ چنانچہ ان مخصوص معانی کو قبول نہ کرنا۔ حاشا وکلا۔ اللہ کی تکذیب اور رسالت مآب ﷺ کے فہم وشعور کو اِنکار کرنے کے مترادف ہے۔ مطلب یہ کہ منصوص معانی سلسلہ وار سرچشمۂ رسالت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام ابن جریر طبری نے قرآن کے تمام معانی کو متصل اسانید کے ذریعے مسلسل منبع رسالت تک پہنچایا اور اس انداز سے اپنی بہت بڑی بیش قیمت تفسیر لکھی۔

دُوسرا گروہ:

اس گروہ میں یا تو بے عقل دوست ہے جو ابرو سنوارنے کے زعم میں آنکھیں پھوڑے جا رہا ہے؛ یا پھر عقل مند شیطان دشمن ہے جو اسلامی احکام اور ایمانی حقائق کا معارضہ کرکے۔ آپ کی تعبیر کے مطابق۔ قرآنِ حکیم کی اُن سورتوں میں کوئی دراڑ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہے جن میں سے ہر سورت قرآن کے قلعے کے لیے ایک فولادی دیوار کی حیثیت رکھتی ہے۔

پس یہ لوگ۔ حاشا وکلا۔ ایمانی اور قرآنی حقائق میں شبہات ڈالنے کے لیے اس طرح کی باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔

دوسرا نکتہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بہت سی چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں۔ ان قرآنی قسموں میں بہت سے نکتے اور اسرار و رموز پنہاں ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر:

﴿وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا﴾ میں پائی جانے والی قسم اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کائنات کا ظہور ایک عظیمُ الشان محل اور بہت بڑے شہر کی صورت میں ہوا ہے۔ اور یہی چیز ''گیارہویں مقالے'' میں وارد ہونے والی خوبصورت تمثیل کی بنیاد ہے۔

اسی طرح وہ ﴿یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ﴾ میں اعجاز القرآن کے پہلوؤں کی قدسیت بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ اہمیت کے ایسے مرتبے میں ہے کہ اس کی قسم کھائی جا رہی ہے۔

اور ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی﴾ میں، اور ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ﴾ میں پائی جانے والی قسم اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ستاروں کا گرنا جنوں اور شیطانوں کی طرف سے غیبی خبروں کے منقطع ہو

جانے کی علامت ہے تا کہ وہ وحی الٰہی میں کوئی شبہ نہ پیدا کر سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس قسم کے ذریعے اس بات کی یاددہانی بھی کراتا ہے کہ ان ہولناک ستاروں کو ان کے مقامات میں نصب کر دینے اور ان ضخیم سیاروں کو انتہائی تیزی کے ساتھ گھماتے رہنے میں عظیم الشان قدرت اور کمال حکمت کارفرما ہے۔

اور ﴿وَالذّٰرِيٰتِ﴾ اور ﴿وَالْمُرْسَلٰتِ﴾ میں پائی جانے والی قسم کے ساتھ وہ ہواؤں کے تموّج و تصریف میں پائی جانے والی اہم حکمتوں کی یاددہانی کے لیے ہواؤں پر مامور فرشتوں کی قسم کے ساتھ ان عناصر کی طرف توجہ دلاتا ہے جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اتفاقاً ہی لطیف و دقیق حکمتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں اور یوں ہی بڑے بڑے اہم وظائف ادا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ پس ہر موقع و محل میں علیحدہ علیحدہ نکتے اور مختلف فوائد ہیں۔

وقت کی کمی کے پیشِ نظر ہم تفصیل سے گریز کرتے ہوئے اجمال کے ساتھ ﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ﴾ میں پائے جانے والے بہت سارے نکتوں میں سے صرف ایک نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ:

جنابِ حق انجیر اور زیتون کی قسم کے ذریعے اپنی قدرت کی عظمت، اپنی رحمت کی کاملیت اور اپنی عظیم الشان نعمت کی یاددہانی کراتے ہیں؛ چنانچہ وہ آخری درجے کی گہری پستیوں میں لڑھکتے ہوئے انسان کا چہرہ دوسری جانب پھیر دیتے ہیں اور اس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان شکر و فکر اور عملِ صالح کے ذریعے معنوی ترقیاں حاصل کر کے اعلیٰ علیین تک پہنچ سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ دیگر نعمتوں کو چھوڑ کر صرف ان دو پھلوں کی طرف خصوصی توجہ کیوں دلائی گئی ہے، تو وہ یہ ہے کہ:

یہ دونوں پھل بڑے مفید نفع خیز اور بابرکت ہیں۔ ان دونوں کی خلقت میں ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو دقیق نظری اور نعمت کا دارومدار ہیں؛ کیونکہ زیتون انسانی غذا، معاشرتی اور تجارتی زندگی اور روشنی کے وسائل کے باب میں ایک اہم ترین بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح انجیر کی تخلیق قدرت کے ایک خارقِ عادت معجزے کا مظہر ہے، اور وہ اس طرح کہ اس کے ایک ذرّے کے برابر چھوٹے سے بیج میں انجیر کا ضخیم درخت رکھ کر محفوظ کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح اس کی قسم کے ذریعے وہ اس کے ذائقے میں پائے جانے والی، اس کی نفع خیزی اور دیگر پھلوں کے برعکس اس کے تادیر تر و تازہ رہنے والی اور اس کے دیگر فوائد والی نعمت کی یاددہانی کراتے ہیں اور انسان کو اس نعمت کی یاددہانی کے ساتھ پستیوں میں نہ گرنے اور ایمان و عملِ صالح کی بلندیوں پر چڑھنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

تیسرا نکتہ:

سورتوں کے آغاز میں پائے جانے والے حروفِ مقطعات میں ایک بہت بڑی الٰہی رمز پائی جاتی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندے کو کچھ غیبی اشارے دیتا ہے۔ اور اس رمز کی چابی اس عبدِ خاص اور اس کے وارثوں کے

پاس ہے۔

پس قرآنِ حکیم جب ہر زمانے کو اور ہر طبقے کو مخاطب کرتا ہے تو اس کے ایسے بہت سے جامع قسم کے معانی اور مختلف پہلو ہوتے ہیں جن میں ہر دور کا اور ہر طبقے کا حصہ ہوتا ہے۔ اور ان میں سے صاف شفاف ترین وہ معانی اور وہ پہلو ہیں جو سلف صالحین نے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ اہلِ ولایت اور اہلِ تحقیق نے ان مقطعات میں بہت سے ایسے غیبی معاملات کے اشارے پائے ہیں جن کا تعلق روحانی سیر و سلوک کے ساتھ ہے۔

ہم نے بلاغی اعجاز کی روشنی میں اپنی "اشارات الاعجاز" نامی تفسیر میں ان مقطعات کے بارے میں سورۂ بقرہ کے آغاز میں کچھ بحث کر دی ہے اس لیے اس کی طرف مراجعت کر لی جائے۔

چوتھا نکتہ:

پچیسویں مقالے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ قرآنِ حکیم کا حقیقی ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اس کے اعجاز میں جو اسلوب کی بلندی پائی جاتی ہے اس کا ترجمہ بھی ممکن نہیں۔ اور یہ کہ اس کے معنوی اعجاز میں پائے جانے والے بلند پایہ اسلوب سے جنم لینے والے ذوق کی وضاحت کرنا اور اس کی حقیقت کو سمجھنا انتہائی مشکل کام ہے۔ البتہ اس راستے کی نشاندہی کرنے کے لیے ہم صرف ایک دو جہتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ قرآنِ معجز بیان اپنی مندرجہ ذیل آیات

- ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ﴾ (الروم:22)
- ﴿وَالسَّمَاوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ﴾ (الزمر:67)
- ﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ (الزمر:6)
- ﴿خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾ (الاعراف:54)
- ﴿يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ﴾ (الانفال:24)
- ﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ﴾ (سبا:3)
- ﴿يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (الحديد:6)

اور اس طرح کی دیگر آیات کے ذریعے انتہائی بلند پایہ اسلوب اور معجز نما خارقِ عادت جمع (حاشیہ) میں خلاقیت کی حقیقت کی صورت گری کرتا ہے اور خیال کی نظروں کو اس کا کچھ اس انداز سے دیدار کراتا ہے کہ:

(حاشیہ) "الجمع" علم البدیع کی اصطلاح میں یہ ہے کہ متکلم متعدد اشیاء کو ایک حکم کے تحت جمع کر دے، جیسے

۱۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔

۲۔ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ۔ مترجم

اس کائنات کا بانی اور صانع و کردگار شمس وقمر کو جس ہتھوڑے کے ساتھ اُن کے ٹھکانوں میں گاڑھتا اور نصب کرتا ہے، اُسی طرح ہتھوڑے کے ساتھ عین اُسی آن میں، ذی حیات کی آنکھوں کی پتلیوں کے ذرّات کو ان کی مناسب جگہوں میں تھماتا اور نصب کرتا ہے۔ اور وہ جس پیمانے اور معنوی آلے کے ساتھ آسمانوں کو ترتیب دیتا ہے اور ان کے دروازے کھولتا ہے، اسی پیمانے کے ساتھ عین اُسی آن میں، اور عین اُسی ترتیب کے ساتھ آنکھوں کے پردوں کو کھولتا، انہیں بناتا، انہیں ترتیب دیتا اور انہیں ٹھکانا دیتا ہے۔

اسی طرح وہ صانعِ جلیل جس معنوی قدرت کے معنوی ہتھوڑے کے ساتھ آسمانوں میں ستاروں کو گاڑھتا اور نصب کرتا ہے اُسی طرح وہ اُسی معنوی ہتھوڑے کے ساتھ انسانی چہرے میں غیر محدود علاماتِ فارقہ کے نقطے نقش کرتا ہے اور اس کے ظاہری اور باطنی حواس کی نقش نگاری عین ان کی اصل جگہ میں کرتا ہے۔

مطلب یہ کہ وہ صانع الجلیل عین احدیت میں وحدانیت کا، انتہائی جمال میں انتہائی جلال کا، انتہائی خفا میں انتہائی عظمت کا، انتہائی دقّت میں انتہائی وسعت کا، انتہائی رحمت میں انتہائی حشمت کا اور انتہائی قرب میں انتہائی بُعد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یعنی اضداد کو جمع کرنے کا۔ جو کہ محال شمار ہوتا ہے۔ آخری مرتبے کو آشکار کرتا ہے، اس محال چیز کو واجب کے درجے میں ظاہر کرتا ہے اور انتہائی بلند اسلوب کے ساتھ اس کا اثبات کرتا ہے۔

گویا کہ وہ جب کام کرتا ہے تو اپنے وہ کام آنکھ اور کان کو دکھانے کے لیے ایک ذرّے پر قرآنی آیات کا ہتھوڑا مارتا ہے اور اسے اس کی جگہ پر نصب کر دیتا ہے۔ اور وہی ہتھوڑا اُسی آیت کے کسی کلمے کے ساتھ سورج پر مارتا ہے اور اُسے اس کے مرکز میں گاڑھ دیتا ہے۔

یہی وہ معجزانہ اسلوب ہے جس نے بڑے بڑے اُدباء کو اپنی بلاغت کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

اسی طرح مثال کے طور پر آیت کریمہ:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ﴾ (الروم:25)

انتہائی بلند پایہ اسلوب میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی عظمت کو بیان کرتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ:

زمین و آسمان دو اطاعت گزار لشکروں کی طرح اور دو منظم لشکروں کی چھاؤنی کی طرح ہیں۔ اور ان دونوں لشکروں میں فنا اور عدم کے پردوں میں سوئی ہوئی تمام موجودات کے ایک ہی اشارے پر انتہائی سُرعت کے ساتھ لبیک کہیں گی اور حشر اور امتحان کے میدان میں نکل آئیں گی۔۔۔

اب دیکھیں کہ آیتِ کریمہ کیسے معجزانہ بلند پایہ اسلوب کے ساتھ حشر اور قیامت کی تصویر کشی کر رہی ہے۔

اور مدّعا کے ضمن میں دلیلِ قاطع کی طرف اشارہ کر دیا ہے! بالکل ایسے جیسے بیج زمین کے بطن میں چھپ جاتے ہیں اور مُردوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ اور قطرے جو فضائے آسمان میں، عدم میں اور کرۂ ہوا میں پھیل جاتے اور چھپ جاتے ہیں؛ ہر موسمِ بہار میں کمالِ انتظام اور سرعت کے ساتھ ا ہو جاتے ہیں اور تجربہ و امتحان کے میدان میں نکل آتے ہیں۔ اور بیج زمین میں اور قطرے آسمان میں ہمہ وقت میدانِ حشر کی صورت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ جیسے کہ یہ بات مشاہدے میں ہے۔ حشرِ اکبر میں بھی یہی صورتِ حال اِسی طرح آسانی کے ساتھ برپا ہو جائے گی۔

کیا خیال ہے، کیا اِس پہلو کی روشنی میں اس طرح کی آیتوں کا حقیقی ترجمہ کرنا ممکن ہے؟ کبھی نہیں۔ اور اگر ہو بھی جائے، تو یا تو آیتِ کریمہ کی مختصر اور اجمالی سی ترجمانی ہو گی یا پھر آیت کے ہر جملے کی پانچ چھ سطروں میں تفسیر ہو گی ترجمہ نہیں۔

پانچواں نکتہ:

مثال کے طور پر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ ایک قرآنی جُملہ ہے، اور اس جملے کا علم النحو اور علم البیان کے قواعد کے تقاضوں کے مطابق کوتاہ ترین معنی یہ ہے:

كُلُّ فَرْدٍ مِنْ اَفْرَادِ الْحَمْدِ مِنْ اَيِّ حَامِدٍ صَدَرَ وَعَلٰى اَيِّ مَحْمُوْدٍ وَقَعَ مِنَ الْاَزَلِ اِلَى الْاَبَدِ خَاصٌّ وَ مُسْتَحِقٌّ لِلذَّاتِ الْوَاجِبِ الْوُجُوْدِ الْمُسَمّٰى بِاللّٰهِ

یعنی ''حمد کے تمام افراد میں سے ہر فرد جو اَزل سے لے کر ابد تک کسی بھی حامد سے صادر ہوا ہے اور کسی بھی محمود پر واقع ہوا ہے وہ اس ذاتِ واجبُ الوجود کے لیے خاص ہے اور وہی ذات اس کی مستحق ہے جس کا نام اللہ ہے''۔

پس ہمارا ''حمد کے تمام افراد میں سے ہر فرد'' کہنا ''ال'' سے برآمد ہوتا ہے جو کہ استغراق کے لیے ہے۔

''اَزل سے اَبد تک'' کا جملہ فعلیہ کو جملہ اسمیہ میں منتقل کر دینے والے قاعدے کے مطابق ''دوام و ثبات'' کا فائدہ دیتا ہے۔

''جو کسی بھی حامد سے صادر ہوا ہے'' کی قید ''حمد'' کے مصدر ہونے کی وجہ سے صادر ہوئی ہے؛ چنانچہ یہ اس طرح کے مقام پر عموم کا فائدہ دیتا ہے؛ کیونکہ اس کا فاعل متروک ہے۔

''کسی محمود پر واقع ہوا ہے'' کی قید بھی مقامِ خطاب میں مفعول کے ترک کر دینے میں عموم اور کلّیت کا فائدہ دینے کے لیے ہے۔

''للہ'' میں جو لامِ جر ہے وہ ''خاص اور مستحق'' کا معنی دیتا ہے؛ کیونکہ لام اختصاص و استحقاق کے لیے ہے۔

رہی ''واجبُ الوجود'' کی قید، تو لفظِ ''اللہ'' واجبُ الوجود پر دلالتِ التزامی کی صورت میں دلالت کرتا ہے؛ کیونکہ لفظ

''اللہ'' تمام اسماء وصفات کا جامع ہے اور اسمِ اعظم ہے، اور اس التزامی دلالت کے ذریعے ''واجبُ الوجود'' کے عنوان پر دلالت کرتا ہے؛ کیونکہ وجود کا واجب ہونا اُلوہیت کے لیے لازم اور ضروری ہے اور ''ذاتِ ذُوالجلال'' کے ملاحظے اور مشاہدے کا عنوان ہے۔

پس اگر ''الحمدللہ'' کے جملے کا اس صورت میں عربی زبان کے ماہرین کے بالاتفاق ظاہری معنی یہ ہے تو پھر قرآن کریم کا کسی دیگر زبان میں ایسا ترجمہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے جس میں اس کا معجزانہ ایجاز اور قوت برقرار رہے؟

پھر یہ بھی ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کے مابین ''عربی نحوی زبان'' کے علاوہ ایک ہی نحوی زبان ہے، اور وہ بھی کبھی عربی زبان کی جامعیت تک نہیں پہنچ سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کے کلمات جو اس فصیح و بلیغ، جامع، خارقِ عادت اور معجزنما زبان میں اور معجزنما صورت میں اور اُس ہمہ گیر علم کے جلو میں ظاہر ہوئے ہیں جو تمام جہتوں کو جانتا ہے اور اُن سب کی یکبارگی ادارت کرتا ہے، ان مقدس کلمات کا حق ان لوگوں کے ترکیبی اور تصریفی زبانوں کی وساطت سے ترجمہ کیے ہوئے کلمات کیسے ادا کرسکتے ہیں جو جزوی ذہن، کوتاہ شعور، پریشان فکر اور تاریک دل کے مالک ہیں؟

میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں، بلکہ ثابت کرسکتا ہوں کہ قرآن کا ہر حرف حقائق کے ایک خزینے کا روپ دھار جاتا ہے، چنانچہ کبھی صرف ایک حرف اتنے حقائق سکھا دیتا ہے جن سے پورا ایک صفحہ بھر جاتا ہے۔

چھٹا نکتہ:

اس معنی پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے میں اپنے اُوپر وارد ہونے والی ایک نورانی حالت اور حقیقی خیال کا ذکر کرتا ہوں۔ اور وہ کچھ یوں ہے کہ:

میں نے ایک دن ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں جمع کے صیغے والے ''نون'' کے بارے میں غور کیا۔ اور میرے دل نے ''متکلم'' کے صیغے سے ''جمع متکلم'' کے صیغے کی طرف منتقل ہونے کے اسباب پر غور کیا تو اچانک مجھ پر جمع کے اس ''نون'' سے نماز میں جماعت کا راز اور اس کی فضیلت وحکمت کا انکشاف ہوگیا۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ جامع ''بایزید'' جس میں میں نماز ادا کرتا ہوں، وہاں جماعت میں شرکت کرنے کی وجہ سے جماعت کا ہر فرد میرا ایک طرح کا سفارشی بن گیا ہے۔

اور میں نے دیکھا کہ اُس جماعت کا ہر فرد ان احکام کا اور ان دعوی جات کا شاہد اور مؤید بن گیا جن کا اظہار میں اپنی قراءت میں کرتا ہوں۔ چنانچہ اس بنا پر مجھے اپنی ناقص عبادت کو اس جماعت کی بہت سی عظیم الشان عبادات کے اندر رکھ کر درگاہِ الٰہی میں پیش کرنے کی جسارت ہوگئی۔

اور پھر اچانک ایک اور حجاب کھل گیا، یعنی: استنبول کی تمام مساجد باہم مل گئیں اور یہ شہر اسی جامع ''بایزید'' کا روپ دھار گیا اور اچانک مجھے اس بات کا شعور ہو گیا کہ میں ان کی تصدیق کا اور ان کی دعاؤں کا مظہر بن گیا ہوں۔

تب میں نے خود کو دیکھا کہ میں ان صفوں میں موجود ہوں جو سطحِ زمین کی مسجد میں خانہ کعبہ کے اِرد گرد بندھی ہوئی ہیں۔ تو میں نے کہا: ''الحمد للہ ربّ العالمین کہ مجھے اتنے زیادہ سفارش کرنے والے میسّر ہیں جو نماز میں وہی کچھ کہتے ہیں جو میں کہتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں'' اور میں نے کہا: اگر پردہ خیالی طور پر اُٹھ گیا ہے اور ''کعبہ مشرّفہ'' ایک محراب کا رُوپ دھار گیا ہے تو پھر مجھے اس موقع سے فائدہ اُٹھا لینا چاہیے، مجھے ان صفوں کو گواہ بنا لینا چاہیے! اور ایمان کا وہ ترجمان جس کا ذکر میں تشہد میں ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کی صورت میں کرتا ہوں، وہ ترجمان مجھے حجرِ اسود کے پاس بطورِ امانت رکھ دینا چاہیے!

تب ایک نئی کیفیت کھل گئی، چنانچہ میں نے دیکھا کہ میں جس جماعت کے اندر داخل ہوا تھا وہ تین دائروں میں بٹ گئی۔

پہلا دائرہ: روئے زمین پر پائے جانے والے مومنین و موحدین کی عظیم ترین جماعت۔

دوسرا دائرہ: جملہ موجودات کی جماعت جسے میں نے صلاۃِ کُبری میں دیکھا، اور وہ عظیم ترین تسبیحات ہیں اور ہر وہ جماعت ہے جو اپنی خصوصی تسبیحات و صلوات میں مصروف ہیں اور میں ان کے درمیان ہوں۔ اور میں نے دیکھا کہ مشاہدے میں آنے والی وہ خدمات جنہیں وظائف الأشیاء کہا جاتا ہے وہ ان اشیاء کی عبادات کے عناوین ہیں۔ تب میں نے ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے سر جھکا دیا اور اسی حالت میں اپنی ذات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا، تو میرے سامنے:

تیسرا دائرہ: آ گیا، اس دائرے میں مجھے ظاہری حالت اور اُوپری کیفیت کے حساب سے ایک چھوٹا سا حیرت خیز لیکن حقیقت، ذمہ داری اور کمیت کے لحاظ سے بہت بڑا جہان نظر آیا۔ اور میں نے دیکھا کہ میرے بدن کے ذرّات سے لے کر میرے ظاہری حواس تک گروہ در گروہ ہر جماعت شکر و سپاس اور عبودیت کے وظیفے کی ادائیگی میں مصروف ہے۔ چنانچہ اس دائرے میں میرے دل میں پایا جانے والا ''ربانی لطیفہ'' اس جماعت کی ترجمانی کرتا ہوا ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کا ورد کر رہا ہے، بالکل ایسے جیسے کہ میری زبان نے پہلی دو عظیم الشان جماعتوں کی نیت کرتے ہوئے یہی الفاظ دہرائے تھے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ''نعبد کا نون'' ان تین جماعتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

میں اسی حالت میں تھا کہ اچانک میرے سامنے ''قرآنِ حکیم'' کے ترجمان اور مبلّغ ''رسولِ اکرم ﷺ'' کی معنوی شخصیت اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ اپنے ''مدینہ منورہ'' نام کے معنوی منبر پر جلوہ افروز ہو گئی۔ چنانچہ میں نے معنوی

طور پر دوسرے لوگوں کی طرح ان کا ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ والا خطاب سُنا۔ اور میں نے خیالی طور پر دیکھا کہ ان تینوں جماعتوں کا ہر فرد اس خطاب کا جواب ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہتا ہوا دے رہا ہے۔ تب میرے فکر کے سامنے إِذَا ثَبَتَ الشَّيْءُ ثَبَتَ بِلَوَازِمِهِ کے قاعدے کے مطابق ایک اور حقیقت اُبھری، اور وہ یہ کہ:

جب تمام جہانوں کا پروردگار نوعِ انسانی کو اپنا مخاطب بناتا ہے اور اس طرح تمام موجودات کے سامنے کلام کرتا ہے، اور یہ رسولِ اکرم ﷺ اس خطاب کو تمام نوعِ انسان تک بلکہ تمام ذی اَرواح اور ذی شعور مخلوقات تک پہنچاتے ہیں، تو پھر ماضی اور مستقبل کے تمام زمانے زمانہ حاضر کا حکم لے چکے ہیں، اور تمام کی تمام نوعِ بشر ایک ہی مجلس میں مختلف صفوں پر مشتمل جماعت کا رُوپ دھار چکی ہے اور اس صورت میں یہ خطاب ان سب کی طرف وارد ہوتا ہے۔

تب میں نے دیکھا کہ قرآن کریم کی ہر آیت فصاحت و بلاغت اور پختگی کی چوٹی پر ہے، اور اُس اعجاز کی انتہاؤں پر ہے جو اپنے تابندہ نور کی شعاعیں ہر سمت بکھیر رہا ہے، اور وہ اپنی یہ فصاحت و بلاغت وغیرہ اپنے بہت سے مختلف قسم کے قیمتی مخاصرن کے انتہائی بلند و بالا، وسیع و عریض معزز مقام سے، اور انتہائی عظمت و جلال کے مالک اَزلی متکلم سے، اور اپنے محبوبیتِ عظمیٰ کے مقام پر فائز عالی شان ترجمان سے حاصل کرتی ہے۔

اس بنا پر عمومی طور پر مکمل قرآن، یا کوئی سورت، یا کوئی آیت ہی نہیں بلکہ اس کا ہر کلمہ ایک معجزے کا رُوپ دھار چکا ہے۔

تب میں نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى نُورِ الْإِيمَانِ وَالْقُرْآنِ اور یوں میں اُس خیال سے باہر آ گیا جو کہ عین حقیقت ہے، جیسے کہ میں اِس میں ''نعبد'' کی ''نون'' کے ذریعے داخل ہوا تھا اور مجھے اس بات کا پتا چل گیا کہ قرآن کی صرف آیات وکلمات ہی نہیں بلکہ اس کے بعض حروف بھی جیسے ''نعبد'' کا نون اہم ترین حقائق کی چمکدار چابیاں ہیں۔

دل اور خیال جب اس ''نون'' سے باہر نکلے تو عقل اُن کے سامنے آ کر کہنے لگی:

مجھے بھی میرا حصہ چاہیے میں تم دونوں کی طرح اُڑ تو نہیں سکتی اور میری دلیل اور حجت میرے پاؤں ہیں۔ اس لیے مجھے اس ﴿نَعْبُدُ وَنَسْتَعِينُ﴾ میں پایا جانے والا وہ راستہ دکھا دو جو معبود و مستعان تک پہنچاتا ہے تاکہ میں بھی آپ کی رفیقِ سفر بن سکوں۔ تب دل میں یہ بات وارد ہوئی کہ:

اس حیران و سرگرداں عقل سے کہو کہ:

کائنات میں پائی جانے والی تمام زندہ اور جامد موجودات کی طرف نظر کرو، یہ تمام موجودات کمال اطاعت و انتظام کے ساتھ وظیفے اور ذمہ داری کی صورت میں عبودیت میں مصروف ہیں۔

چنانچہ ان میں سے بعض موجودات حس اور شعور سے خالی ہیں لیکن بایں ہمہ وہ عبادت کی صورت میں پورے شعور اور

نظم وضبط کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک معبودِ حق اور آمرِ مطلق موجود ہے جو ان موجودات کو مسخر کرتا ہے اور انہیں عبودیت کی طرف کھینچتا ہے۔

اور ان تمام موجودات کو اور خاص کر ذی حیات موجودات کو ذرا دیکھ؛ ان میں سے ہر ایک کی بہت زیادہ اور انواع و اقسام کی حاجات وضروریات اور رنگارنگ کے متعدد اور مختلف مطالب ہیں جو ان کے وجود کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ اور چھوٹی سے چھوٹی ضرورت بھی ان کی طاقت کی دسترس سے باہر ہے؛ لیکن ان کے یہ غیر محدود مطالب انتہائی منظم طریقے سے اور عین مناسب وقت میں انہیں ایسی جگہ سے حاصل ہو رہے ہیں جو ان کے گمان میں بھی نہیں۔ اور یہ چیز ہمارے مشاہدے میں ہے۔

پس ان موجودات کی یہ غیر محدود حاجات وضروریات اور ان کی غیر معمولی غیبی اعانتیں اور رحمانی امدادیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ان کا کوئی حامی اور رازق ہے جو غنیِ مطلق، کریمِ مُطلق اور قدیرِ مطلق ہے۔ چنانچہ ہر چیز اس سے اعانت مانگتی ہے اور ہر ذی حیات اس سے مدد طلب کرتی ہے، اور معنوی طور پر کہتی ہے:

﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾

تب عقل نے کہا: آمنّا و صدّقنا

ساتواں نکتہ:

• پھر میں نے اس حالت میں جب ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کہا تو میری نظر ماضی کی جانب چلی گئی، تو میں نے ماضی کی طرف جانے والے انسانی قافلوں کے مابین انبیاء، صدیقین، شہداء اور اولیائے صالحین کے انتہائی روشن و درخشاں قافلے کو دیکھا، میں نے دیکھا کہ یہ لوگ ابد کی طرف جانے والے راستے میں بالکل سیدھے جادۂ کبری میں مستقبل کی تاریکیوں کو پراگندہ کرتے ہوئے رواں دواں ہیں۔ اور یہ جملہ مجھے اس قافلے کے ساتھ ملا دینے والا راستہ دکھاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ جا ملاتا ہے۔ تو میں نے بے ساختہ کہا:

''سبحان اللہ! جو ذرہ برابر بھی شعور کا مالک ہے اُسے یہ علم ہونا ضروری ہے کہ اس تابناک، کمال سلامتی کے ساتھ رواں دواں اور مستقبل کی تاریکیوں کو جگمگا دینے والے قافلۂ عظمی سے پیچھے رہ جانا کتنا بڑا خسارہ اور کتنی بڑی ہلاکت ہے!

اور جو بدعتوں کو ایجاد کر کے اس قافلۂ عظمی کو چھوڑ کر ایک طرف سے ہو کر گزرے گا وہ نور کہاں سے پائے گا اور کہاں جائے گا؟

جبکہ ہمارے مرشد رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ

اب یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ کچھ بد بخت لوگوں کو کہ جنہیں ''علمائے سوء'' کہنا چاہیے اس قطعی حدیث کے مقابلے میں کون سی مصلحت نظر آتی ہے اور وہ کون سا فتوی دے کر ایک نقصان دہ اور غیر ضروری طور پر اسلامی شعائر کے بدیہی اُمور کے آڑے آتے ہیں، ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ رائے دیتے ہیں کہ ان شعائر کو تبدیل کر دینا چاہیے! اگر کوئی چیز ہے بھی تو یہی ہے کہ معنی کی جگمگاہٹ کے کسی وقتی سے جلوے سے جنم لینے والی وقتی چوکسی اور بیداری نے ان علماء سوء کو دھوکے میں ڈال دیا ہے!

مثال کے طور پر اگر کسی حیوان کی کھال اُتاری جائے یا کسی پھل کا چھلکا اُتار دیا جائے تو گوشت اور پھل سے ایک وقتی ظرافت ظہور میں آئے گی، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ظریف گوشت اور لطیف پھل سیاہ ہو جائے گا اور اس عارضی، کثیف آلودہ اور اجنبی کھال کی تاثیر کے تحت متعفن ہو جائے گا۔

اسی طرح اسلامی شعائر کے بارے میں نبوی اور الٰہی تعبیریں بھی ایک زندہ ثواب پانے والے انسان کی کھال کی صورت رکھتی ہیں چنانچہ جب وہ کھال کھینچ لی جاتی ہے تو وقتی طور پر معانی کا کچھ نور ظاہر ہوتا ہے اور ان بابرکت معانی کی اَرواح چھلکا اُتارے ہوئے پھل کی لطافت کی طرح اُڑ جاتی ہیں۔ اور تاریک قلوب وعقول میں اپنی بشری کھال یعنی الفاظ کو چھوڑ کر خود چلی جاتی ہیں۔ نور اُڑ جاتا ہے اور اس کا دھواں باقی رہ جاتا ہے۔ بہر حال ۔۔۔

آٹھواں نکتہ: اس مذکورہ حکم کے بارے میں حقیقت کے وساتیر میں سے ایک دستور کی وضاحت کرنا ضروری ہے، اور اس طرح ہے کہ

اسلامی تربیت میں حقوق کی دو قسمیں ہیں: ''شخصی حقوق'' اور ''عمومی حقوق'' جو کہ ''حقوق اللہ'' ہی کی ایک قسم شمار ہوتے ہیں۔

اسی طرح شرعی مسائل میں سے کچھ مسائل اشخاص کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور کچھ عموم کے اعتبار سے عام لوگوں کے ساتھ، ان احکام کو دوسرے لفظوں میں ''اسلامی شعائر'' کہا جاتا ہے۔

ان احکام کے عموم کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے عام لوگ ان شعائر میں حصہ دار ہیں۔ اس لیے اگر عام لوگ رضامند نہ ہوں تو ان احکام میں دخل اندازی کرنا عام لوگوں کے حقوق پر دست درازی شمار ہوتی ہے۔

ان شعائر کے ساتھ سنت کی روشنی میں تعلق رکھنے والا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ بھی اہمیت کے لحاظ سے بڑے سے بڑا مسئلہ شمار ہوتا ہے اور وہ براہ راست تمام عالم اسلام کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

اس لیے وہ لوگ جو ان نورانی سلسلوں کو کاٹنے کی اور ان کی تخریب وتحریف کی کوشش کرتے ہیں جن کے ساتھ عصر سعادت سے لے کر اب تک تمام عظمائے اسلام بندھے ہوئے ہیں، ایسے لوگ اور ان کے ساتھ تعاون کرنے والے

ذرا ہوش کے ناخن لیں اور سمجھ لیں کہ وہ بڑی خطرناک غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ اگر ذرہ بھر شعور کے بھی مالک ہیں تو ان پر کپکپی طاری ہو جانی چاہیے!

نواں نکتہ:

شریعت کے کچھ مسائل ایسے ہیں جنہیں "تعبّدی مسائل" کہا جاتا ہے۔ یہ مسائل عقلی محاکمے کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے ہیں، چنانچہ انہیں اُسی طرح ادا کیا جاتا ہے جیسے اُن کے بارے میں حکم ہوا ہو؛ کیونکہ ان کی عِلّت خود اُمر ہی ہے۔

اور کچھ مسائل ایسے ہیں جنہیں معقول المعنیٰ کہا جاتا ہے۔ یعنی ان میں کوئی ایسی حکمت یا مصلحت پائی جاتی ہے جو اس حکم کو شرعی حکم بنانے والے پلڑے کو بھاری کر دیتی ہے۔ لیکن وہ اس کا سبب یا علت نہیں ہوتی؛ کیونکہ حقیقی علت امر الٰہی اور نہیِ الٰہی ہے۔

تعبدی شعائر کو حکمت اور مصلحت تبدیل نہیں کرتی، ان میں تعبد کی جہت ہی راجح ہوتی ہے۔ اس لیے ان میں کسی بھی طرح کی دخل اندازی نہیں ہو سکتی۔ اگر لاکھوں مصلحتیں بھی آجائیں تو بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتیں۔

اسی طرح یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ شعائر کے فائدے صرف معلوم شدہ مصلحتیں ہی ہیں یہ سمجھنا بالکل غلط ہے بلکہ یہ معلوم مصلحتیں ان شعائر کی بہت سی حکمتوں میں صرف ایک فائدہ ہو سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر: اگر کوئی یہ کہے کہ: اذان کی حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعے مسلمانوں کو نماز کے لیے بلایا جاتا ہے، اور اس کام کے لیے بندوق کا ایک فائر نکال دینا ہی کافی ہے!

لیکن یہ پاگل یہ نہیں جانتا کہ اذان کے ذریعے مسلمانوں کو بلانا اذان کی ہزاروں مصلحتوں میں سے صرف ایک ہے۔ بندوق کی آواز سے یہ مصلحت اگر پوری ہو بھی جائے تو بھی اذان کی قائم مقام نہیں ہو سکتی جو کہ ربوبیت الٰہیہ کے مقابلے میں عبودیت کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ اور اُس توحید کے اظہار کا وسیلہ ہے جو نوعِ بشر کی تخلیق کا نتیجہ ہے: اور نوعِ بشر کی ترجمانی اور اس شہر کے باسیوں کی ترجمانی میں تخلیقِ کائنات کا عظیم الشان نتیجہ ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ: جہنم بے کار اور زائد از حاجت نہیں ہے؛ کیونکہ بہتیرے اُمور ایسے ہیں جو پوری قوت کے ساتھ کہہ رہے ہیں: جہنم زندہ باد: اور جنت بھی کوئی سستی نہیں ہے بلکہ بہت مہنگے داموں ملتی ہے۔

﴿لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾

دوسری قسم

جو کہ دوسرا رسالہ ہے

رمضان کا پیغام

قسمِ اول کے آخر میں شعائرِ اسلام کے بارے میں تھوڑی سی بحث کر دی گئی ہے۔ اس لیے دوسری قسم میں رمضان المبارک کی بعض حکمتوں کا ذکر کیا جائے گا جو کہ شعائر کے مابین ایک تابندہ ترین اور اہم ترین حیثیت کا مالک ہے۔ اور یہ دوسری قسم نو گہرے نکات اور لطیف مسائل پر مشتمل ہے جو کہ رمضان المبارک کے روزوں کی بہت سی حکمتوں میں سے نو حکمتوں کی وضاحت کرتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ، هُدًی لِلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِنَ الْهُدٰی وَ الْفُرْقَانِ﴾ (البقرة:۱۸۵)

پہلا نکتہ: منظّم عبودیت کا مظاہرہ

رمضان کے روزوں کا شمار اسلام کے اوّلین ارکان خمسہ میں سے ہوتا ہے اور اسلام کے عظیم ترین شعائر میں ان کا خاص مقام ہے۔ رمضان کے روزوں سے جنم لینے والی اکثر حکمتیں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اظہار، نوعِ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی، نفسِ انسانی کی تربیت وتزکیہ اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے شکریے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔

روزے میں پائی جانے والی بہت سی حکمتوں میں سے ایک حکمت جس کا مرکزی نقطہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے، یہ ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کو ایک دستر خوان کی شکل میں بنایا ہے جو انواع واقسام کی اتنی نعمتوں سے بھرا ہوا ہے کہ اعداد وشمار سے باہر ہیں۔ اور ان نعمتوں کو اس پر کچھ اس طریقے سے ترتیب دے دیا ہے کہ سان گمان سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طریق کار سے اپنی ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ انسان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور وہ ظاہری اسباب میں الجھا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ اس روشن حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتا جو اس طریق کار سے عیاں ہو رہی ہے، ادراک کرنا تو دور کی بات ہے بسا اوقات تو وہ اس واضح حقیقت کو بھول ہی جاتا ہے۔

لیکن رمضان المبارک میں معاملہ ایسے نہیں رہتا ہے؛ کیونکہ اس کے آتے ہی تمام اہل ایمان ایک منظم لشکر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، سب کے سب اللہ تعالیٰ کی عبودیت کی پیٹی زیب تن کر لیتے ہیں اور افطاری سے کچھ دیر پہلے اپنے اس ازلی آقا کے حکم پر لبیک کہنے کی پوزیشن میں آجاتے ہیں جو ان کی مہمانی کے لیے انہیں اپنے معزز دستر خوان کی طرف بلاتے ہوئے کہتا ہے کہ: ''آؤ تشریف لاؤ''۔ اور وہ اپنی اس پوزیشن میں اس کی ہمہ گیر رحمت کا سامنا ایک کشادہ، عظیم اور

منظم عبودیت کے ساتھ کرتے ہیں۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ لوگ جو اس بلند قدر عبودیت کے مظاہرے میں شریک نہیں ہوئے اور ایسے رفیع الشان اور عزت سے معمور دستر خوان سے دور رہے، کیا ایسے لوگوں پر لفظِ انسان کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

دوسرا نکتہ: بے پایاں نعمتوں پر منعمِ حقیقی کا شکریہ

کتنی ہی ایسی حکمتیں ہیں جن کے ذریعے رمضان شریف کے روزے ہماری توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا جائے! ان حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ:

وہ کھانے جو ایک بیرا شاہی باورچی خانے سے لاتا ہے ان کی ایک اپنی قیمت ہے۔ جیسا کہ ''پہلے مقالے'' میں ذکر کیا گیا ہے۔(حاشیہ)

اب ان نفیس اور بیش قیمت کھانوں کو معمولی، ردی اور کم قیمت سمجھنا اور اس منعمِ حقیقی کو نہ پہچاننا جس نے یہ کھانے انعام کئے ہیں، انتہائی احمقانہ حرکت ہوگی، جبکہ عین اسی وقت ان کھانوں کی نفاست اور لذت سے خوش ہو کر ہم بیرے کو ٹپس اور دیگر انعامات سے نواز رہے ہوتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نوعِ بشر کے لیے روئے زمین پر اپنی اَن گنت نعمتیں بکھیری ہوئی ہیں، اور وہ ان نعمتوں کی قیمت چکانے کے لیے اور اپنے اس کارنامے کے مقابلے میں شکر کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان نعمتوں کو ہم تک پہنچانے والے لوگ اور ظاہری اسباب و ذرائع تو خادموں کا حکم رکھتے ہیں، لیکن انہیں ہم قیمت دیتے ہیں اور ان کے ممنون ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ہم اُن کا احترام کرتے ہیں اور ان کا ان کے استحقاق سے بڑھ کر شکریہ ادا کرتے ہیں؛ حالانکہ منعمِ حقیقی ان نعمتوں کی بنا پر ان اسباب و ذرائع سے بے حد و حساب درجے زیادہ شکر و سپاس کا حق دار ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کا شکریہ ہے کہ انسان کو اس چیز کا علم و ہے کہ یہ نعمتیں براہِ راست اس کی طرف سے صادر ہوئی ہیں اس لیے وہ ان نعمتوں کی کما حقہ قدر کرے، اور اسے اس چیز کا بھی احساس رہے کہ وہ ان نعمتوں کا محتاج ہے۔

لیکن وہ منعمِ حقیقی جس نے ان نعمتوں کی برکھا ہم پر برسائی ہے اسے یکسر بھول جاتے ہیں، حالانکہ چاہیے یہ کہ ہم اس کا شکر ادا کریں، اس کی تعریف میں رطب اللّسان ہوں، اس کے زیر بار احسان رہیں اور اس پر آخری حد تک خوش رہیں۔ وہ اکیلا ہی ان تمام چیزوں کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا سزاوار ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان نعمتوں پر اس ذات گرامی کا شکریہ اور اس کی جناب میں رضامندی کا اظہار کیسے کیا جائے؟ تو وہ تین طرح سے ہو سکتا ہے:

۱۔ اس چیز کی پہچان کہ یہ نعمتیں اور یہ احسانات اس کی طرف سے براہ راست صادر ہوئے ہیں۔

(حاشیہ) استاد نورسی کے مضامین کا مجموعہ جنہیں عربی میں ''مقالات''، ''الکلمات'' اور انگریزی میں "The Words" کے نام سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ تینتیس (33) چھوٹے بڑے مضامین پر مشتمل ہے جن میں سے ہر مضمون ''الکلمۃ''، ''المقالۃ'' یا "The Word" کے نام سے موسوم ہے۔ اردو میں اس کے ترجمے کے لیے ہم نے لفظ 'مقالات' اختیار کیا ہے۔ (مترجم)

۲۔ یہ کہ یہ نعمتیں بیش قیمت ہیں، ان کی قدر کی جائے۔

۳۔ یہ شعور بیدار رہے کہ ہم ہمہ وقت ان نعمتوں کے محتاج ہیں۔

بنا بریں، رمضان المبارک کے روزے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خالص اور حقیقی شکرانے اور اس کی تعریف وثنا کی چابی ہیں؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ اکثر لوگ بہت سی نعمتوں کی قدر و قیمت کا نہ تو ادراک رکھتے ہیں اور نہ ہی ان نعمتوں کی ہمہ وقت ضرورت محسوس کرتے ہیں؛ کیونکہ انہیں حقیقی بھوک کی قساوتوں اور کثافتوں سے کبھی پالا ہی نہیں پڑا ہے، مثال کے طور پر وہ مالدار اور ناز پروردہ لوگ جو بسیار خوری کی وجہ سے بدہضمی کی شکایت میں مبتلا رہتے ہیں، وہ اس نعمت کا ادراک کبھی نہیں کر سکتے ہیں جو خشک روٹی کے ایک ٹکڑے میں پنہاں ہے، جبکہ ایک مومن آدمی افطاری کے وقت اس بات کا ادراک بخوبی کر لیتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اور اس پر اس کی قوت ذائقہ بھی گواہی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ رکھنے والے رمضان میں - حکمران سے لے کر آخری درجے کے فقیر تک - اللہ تعالیٰ کے اس معنوی شکرانے پر فائز ہو جاتے ہیں، اس شکر کا باعث یہ چیز ہوتی ہے کہ وہ اس نعمتِ عظمیٰ کا ادراک کر گئے ہیں۔ باقی رہا انسان کا تمام دن کھانے پینے سے رکے رہنا، تو یہ چیز اس میں یہ اہلیت پیدا کرتی ہے کہ وہ اس نعمت کا کما حقہ ادراک کر سکے؛ کیونکہ وہ اپنے آپ کو مخاطب ہو کر کہتا ہے:

اے میری جان! اسی طرح وہ دن کے وقت کھانے پینے سے رُکے رہنے کی صورت میں کہتا ہے: یہ نعمتیں جو ہیں یہ میری ملکیت نہیں ہیں، اس لیے میں ان کے کھانے پینے میں آزاد نہیں ہوں، ان کا مالک کوئی اور ہے، اس نے اپنے فضل و کرم سے یہ ہمیں عطا کی ہیں، اور میں اب ان کے بارے میں اس کے حکم کا منتظر ہوں۔ اس طریقے سے گویا انسان نے ان نعمتوں کا معنوی شکر ادا کر دیا۔

پس یہی ایک صورت ہے جس سے روزہ اس شکر وسپاس کی چابی کا حکم لے لیتا ہے جو کہ بہت سی جہتوں سے انسانیت کا حقیقی وظیفہ ہے۔

تیسرا نکتہ: اجتماعی غمگساری

روزے کی بیش بہا حکمتوں میں سے جو کہ انسان کی اجتماعی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، ایک یہ ہے کہ:

معیشت کے لحاظ سے ہر آدمی کی پیدائش علیحدہ رنگ ڈھنگ پر ہوئی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ مالداروں سے کہتا ہے کہ وہ اپنے فقیر بھائیوں کے ساتھ تعاون کریں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل غنا کو شفقت اور رأفت پر اُبھارنے والے فقر کے حالات کا اس وقت تک نہ تو مکمل شعور ہو سکتا ہے اور نہ ہی انہیں ان خاکساروں کی بھوک کا صحیح احساس ہو سکتا ہے جب تک کہ یہ خود بھوک سے دوچار نہ ہوں، اور اس کے لیے روزہ ایک بہترین وسیلہ ہے۔ اگر روزہ نہ ہوتا تو خواہشات کے غلام اکثر مالدار لوگوں کو اس بات کا ادراک ہی نہ ہو پاتا کہ بھوک اور فقر کیا قیامت ڈھاتے ہیں اور فقراء و مساکین

شفقت اور رحمت کے کتنے محتاج ہیں! بنابریں، اپنے ہم جنسوں کے لیے شفقت اور رحمت کے جذبات۔ جو کہ انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیے گئے ہیں۔ حقیقی شکر پر اُبھارنے والی ایک اہم بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح سے ہر آدمی یہ راز پا جاتا ہے کہ اسے اس بات کا مکلف کر دیا گیا ہے کہ وہ ہر اس آدمی کے ساتھ جو کسی بھی پہلو سے اس سے زیادہ فقیر ہے، شفقت اور رحمت کا برتاؤ کرے۔ اس سے پتہ چلا کہ انسان کو بھوک کی تلخی چکھنے پر اگر روزے کی صورت میں مجبور نہ کیا جاتا تو کوئی بھی آدمی کبھی بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرنے اور ان کی مدد کرنے کے لیے کمر بستہ نہ ہوتا جس کا اسے شفقت کی وساطت سے مکلف کیا گیا ہے، اور اگر ایسا کر بھی لیتا تو کما حقہ، اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا؛ وجہ اس کی یہ ہے اس نے اپنی ذات کی تہ میں اس چیز کو حقیقی طور پر محسوس ہی نہیں کیا ہے۔

چوتھا نکتہ: تربیتِ نفس

تربیتِ نفس کے پہلو سے روزہ کئی ایک حکمتوں پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ:

نفس اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہر قسم کی پابندی سے آزادی اور خود مختاری چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا ہے۔ اس حد تک کہ وہ اپنے لیے ایک وہمی ربوبیت اور حسبِ منشا آزادانہ تصرف کا طلبگار رہتا ہے۔ نفسِ انسان اس بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نعمتوں میں نشوونما پا رہا ہے، اور خاص کر اس وقت جب کہ اسے اس دنیائے فانی میں مال و دولت اور اقتدار سے حصہ وافر مل چکا ہو اور غفلت اس باب میں اس کی معاون و مددگار بن چکی ہو۔ اس لئے وہ خدائی نعمتوں کو چوپاؤں کی طرح بغیر اجازت لے کے نگل جاتا ہے۔ لیکن رمضان المبارک میں ہر امیر و فقیر کا "من" اپنے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے اور اس بات کا ادراک کر لیتا ہے کہ وہ ان نعمتوں کا مالک نہیں ہے کہ انہیں بغیر اجازت کے نگل جائے، بلکہ وہ خود مملوک ہے آزاد نہیں، بلکہ ماتحت اور حکم کا پابند غلام ہے، اس لیے بغیر اجازت کے نہ قدم اٹھا سکتا ہے نہ ہاتھ ہلا سکتا ہے، حتی کہ پانی کی طرف بھی ہاتھ نہیں بڑھا سکتا ہے۔ اس طرح سے اس کی موہوم اور خود مختاری کا پندار ٹوٹ جاتا ہے اور وہ گلے میں اپنے پروردگار کی غلامی کا طوق ڈال لیتا ہے اور اپنا رُخ اپنے اساسی وظیفے یعنی شکر کی طرف کر لیتا ہے۔

پانچواں نکتہ: نفس کی تہذیب اور اسے اس کے بے پایاں عجز و فقر کی یاد دہانی

رمضان المبارک کے روزے میں اس لحاظ سے بھی بہت سی حکمتیں پنہاں ہیں کہ یہ نفس امارہ کی تہذیب و تربیت کرتا ہے، اس کے اخلاق و اطوار کو سدھارتا سنوارتا ہے اور اسے اس طرح کا بنا دیتا ہے کہ پھر وہ بے سر اور اندھا دھند تصرفات سے دامن کشاں رہتا ہے۔ ان میں سے ہم صرف ایک حکمت کا تذکرہ کرتے ہیں:

نفس انسانی غفلت کی وجہ سے اپنی ذات کو بھول جاتا ہے، اور اپنی ماہیت میں پائی جانے والی غیر محدود عاجزی، غیر متناہی فقر اور آخری درجے کی کوتاہیوں کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے، بلکہ اپنی ساخت میں پائی جانے والی آخری درجے کی بو

شیدہ کوتاہیوں کو نہ تو دیکھتا ہے اور نہ دیکھنا ہی چاہتا ہے؛ اس لیے وہ اس بارے میں کبھی غور ہی نہیں کرتا کہ اس کے اس ضعف و عجز کی انتہا کیا ہے اور کس طرح یہ تنزّل اور زوال کا شکار اور مصائب و آلام کا ہدف ہے! انسان یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی بناوٹ گوشت اور ہڈیوں سے ہوئی ہے جو کہ تحلیل ہو جاتے ہیں اور جلد ہی خراب ہو جاتے ہیں، چنانچہ وہ دنیا میں تصرف کرتا ہوا اس وہم میں مبتلا رہتا ہے کہ گویا اس کا جسم فولاد کا بنا ہوا ہے جو کہ موت اور زوال سے پاک ہے اور اس دنیا میں ہمیشہ رہے گا۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ وہ دنیا پر دیوانہ وار گرتا ہے، اپنے آپ کو حرص و ہوا اور طمع ولالچ سے مغلوب ہو کر اس کی گود میں گرا دیتا ہے، اس کے ساتھ محبت اور جذبات سے بھرے کھلے بندوں تعلقات رکھتا ہے، اور ہر لذیذ اور مفید چیز کو اپنی مٹھی میں بند کر لینا چاہتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنے اُس خالق و مالک کو بھول جاتا ہے جو اسے کمال شفقت سے پروان چڑھاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے انجام سے بے خبری اور اپنی اخروی زندگی سے لاعلمی کی حالت میں بداخلاقی کے گہرے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

لیکن رمضان کا روزہ غافل ترین اور سرکش ترین آدمی کو اس کی کمزوری، عاجزی، اور محتاجگی کا شعور بخشتا ہے، بھوک کے وسیلے سے ہر آدمی اپنے اور اپنے خالی معدے کے بارے میں سوچتا ہے، اس حاجت کا ادراک کرتا ہے جو اس کے معدے میں پیدا ہو چکی ہے، اور اس طرح سے وہ اپنی عاجزی اور مسکینی کو نگاہ کے سامنے رکھتا ہے۔ اور اپنے کمزور وجود کی بوسیدگی کو یاد کرتا ہے اور اس بات کا ادراک کر لیتا ہے کہ وہ رحمت اور شفقت کا بہت زیادہ محتاج ہے۔

اب دل کی گہرائیوں میں پروردگار کی مغفرت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آرزو پیدا ہوتی ہے، چنانچہ وہ نفس کی فرعونیت کو ایک طرف جھٹک کر کامل عاجزی اور انتہائی فقیری اور مسکینی کا اظہار کرتے ہوئے معنوی شکر کے ہاتھوں کے ساتھ رحمت الٰہی کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے دیوانہ وار اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ غفلت نے اس کی بصیرت پر پردہ نہ ڈال دیا ہو۔

چھٹا نکتہ: رمضان میں نزولِ قرآن کی حکمت

رمضان المبارک کے روزوں میں اس پہلو سے بہت زیادہ حکمتیں پائی جاتی ہیں کہ خصوصی طور پر اس مہینے میں قرآن کا نزول ہوا، ان میں سے صرف ایک حکمت کا ہم ذیل میں تذکرہ کرتے ہیں:

قرآن حکیم چونکہ رمضان المبارک میں نازل ہوا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ "مَن" میں اُبھرنے والی تمام کمینہ رذیل اور اوچھی حاجات وضروریات سے مکمل کنارہ کشی کی جائے اور اس آسمانی خطاب کا کما حقہٗ استقبال کرنے کے لیے تمام فضول، بےکار اور لایعنی کاموں سے اجتناب کیا جائے، اور یہ اس وقت ممکن ہے جب نزولِ قرآن کا منظر آنکھوں کے سامنے لایا جائے، اور ان روحانی اور ملائکی حالات کے ساتھ مشابہت اختیار کی جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کھانا پینا حسب ضابطہ چھوڑ دیا جائے اور قرآن پاک کی تلاوت اس طرح سے کی جائے کہ گویا کہ اس کی آیات نئے سرے سے نازل ہو رہی ہیں۔ اور اسے سنا بھی اسی شعور اور مکمل خشوع کے ساتھ جائے، اور سنتے وقت توجہ کامل طور پر اس طرف رہے کہ یہ وہ الٰہی خطاب ہے جسے سن کر ایک بلند مقام حاصل کیا جاتا ہے اور ایک اعلیٰ روحانی حالت سے سرفراز ہوا جاتا ہے

، بالکل ایسے ہی جیسے کہ سامع اس قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رہا ہے، بلکہ جبرائیل علیہ السلام سے، بلکہ اس سے بھی آگے گویا کہ وہ متکلمِ اَزلی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے سن رہا ہے۔ اس طرح کی تلاوت اور قراءت کے بعد دوسرا فرض یہ بنتا ہے کہ اسکے نزول کی حکمت بیان کرنے اور سمجھانے کے لیے اسے دوسروں کے لیے پڑھا جائے اور ان تک پہنچایا جائے ۔ رمضان المبارک کے مہینے میں پورا عالم اسلام ایسے ہو جاتا ہے جیسے ایک مسجد ہو، ایک بہت بڑی مسجد جس کا ہر کونہ اور ہر زاویہ قرآن کریم کے لاکھوں حا - ں اور قاریوں سے بھرا ہوا ہو اور سب کے سب اپنے خوش کن لہجوں اور آوازوں کے ساتھ اس الٰہی خطاب کا رس اہل زمین کے کانوں میں گھول رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ﴾ کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہوں کہ رمضان واقعی قرآن کا مہینہ ہے۔ باقی رہے دوسرے لوگ، تو ان میں سے کچھ لوگ تو ان قاریوں کی زبان سے قرآن کریم کی آیات کو انتہائی خشیت اور ہیبت سے سن رہے ہوتے ہیں اور کچھ اس کی تلاوت خود اپنے لیے انفرادی طور پر کر رہے ہوتے ہیں۔ اس پاکیزہ مسجد اور اس میں برپا اس صاف ستھرے ماحول سے ہوائے نفس کی پیروی میں زبان نکال کر صرف کھانے پینے کے لیے باہر نکل آنا کتنا معیوب ہے! کیا ایسا لالچی آدمی مسجد میں ہر جماعت کے نزدیک روحانی تنگ ظرفی کا حامل قرار نہیں پائے گا؟ اور اپنے اس ندیدہ پن کی وجہ سے وہ ان لوگوں کا ہدفِ ملامت نہیں بنے گا؟ اسی طرح وہ لوگ جو رمضان کے مہینے میں روزہ داروں کی مخالفت کرتے ہیں وہ تمام عالم اسلام کی طرف سے اہانت، دھتکار اور پھٹکار کا نشانہ بنتے ہیں۔

ساتواں نکتہ: آخرت کی کھیتی کی آبیاری

اس حیثیت سے کہ انسان اس دنیا میں آخرت کی کھیتی بونے اور آخرت کی تجارت کے لے آیا ہے اور اس وجہ سے وہ کسب واکتساب کی راہیں ڈھونڈتا رہتا ہے، اس لحاظ سے بھی رمضان المبارک کے روزے میں بہت سی حکمتیں پائی جاتی ہیں، ان میں سے ہم ایک حکمت کا تذکرہ کرتے ہیں:

رمضان المبارک میں ایک عمل کا اجر وثواب ایک ہزار گنا تک جا پہنچتا ہے۔ اس بات کا سب کو پتہ ہے کہ قرآن پاک کے ایک حرف کے بدلے دس گنا ثواب ملے گا اور یہ اس کی دس نیکیاں شمار ہوں گی، اور اس طرح وہ۔ حدیث شریف کی رو سے۔ جنت کے دس پھل چن لے گا۔ تو گویا کہ رمضان میں ہر حرف اپنے جیسے دس حرفوں کے بدلے میں آخرت کے دس پھل جنم دیتا ہے۔ اور آیات کریمہ کا ہر حرف۔ جیسے آیت الکرسی وغیرہ۔ ان ہزاروں نیکیوں کے سامنے ایک دروازہ کھول دیتا ہے تاکہ وہاں سے آخرت میں حقیقی پھلوں کے خوشے لٹک پڑیں۔ پھر یہ نیکیاں رمضان المبارک میں آنے والے جمعوں کو ساتھ ملانے سے کئی گنا بڑھ جاتی ہیں اور لیلۃ القدر میں یہ بڑھتی بڑھتی تیس ہزار تک جا پہنچتی ہیں۔ جی ہاں! قرآن کریم جو کہ اپنے ہر حرف کے عوض تیس ہزار دائمی پھل عطا کرتا ہے، اس نورانی درخت۔ جنت کے شجرۂ طوبیٰ۔ کی حیثیت رکھتا ہے، اس حیثیت سے کہ وہ اہل ایمان کو رمضان المبارک میں لاکھوں کے حساب سے دائمی اور ابدی پھل عطا کر دیتا ہے

۔۔۔اس پاکیزہ، دائمی اور نفع بخش تجارت کو نگاہ میں رکھیں اور ان لوگوں کی حالت پر غور کریں جو ان پاکیزہ اور نورانی الفاظ وحروف کی کماحقہ قدر نہیں کرتے ہیں۔ کتنے بڑے خسارے میں ہیں وہ لوگ!! رمضان المبارک کے مہینے کو آپ یوں سمجھ لیں کہ ایک انتہائی خوبصورت، دیدہ زیب اور جاذبِ نظر نمائش لگی ہوئی ہے جس میں آخرت کے لیے تجارت کا ساز و سامان بک رہا ہے۔ یا یوں سمجھیں کہ ایک بہت بڑا بازار ہے جہاں اس تجارت کا ہر سامان پوری آب وتاب کے ساتھ دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ یا یوں سمجھ لیں کہ یہ انتہائی سرسبز اور زرخیز زمین ہے جس کی لہلہاتی کھیتیاں اور سایہ دار درخت آخرت کی آمدنی کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ رمضان شریف ساون بھادوں کی بارش ہے جو اعمال کے درختوں پر پھل لگانے اور پودوں پر پھول لگانے اور انہیں پروان چڑھانے کے لیے آتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی کانفرنس ہے۔ یہ ایک خوشبوؤں بھرا مقدس تہوار ہے جو ربوبیت کی عظمت اور الوہیت کی عزت کے مقابلے میں بشری عبودیت کے انداز پیش کرنے کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے انسان کو روزے کا مکلف کیا گیا ہے تاکہ وہ غافل ہو کر صرف کھانے اور اس جیسی دوسری حیوانی خواہشات کی دلدل میں پھنس کر نہ رہ جائے۔ تاکہ وہ ہوائے نفس کی لذتوں اور دوسرے لایعنی امور کے بھنور میں نہ گھر جائے۔ گویا کہ وہ اس روزے کے ذریعے ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں ''صمدانیت'' کی جھلک نظر آتی ہے ؛ کیونکہ وہ۔ وقتی طور پر سہی۔ حیوانیت کی نفسیات سے نکل کر ایسے رنگ روپ میں آگیا ہے جو ''ملکیت'' (فرشتہ پن) کے مشابہ ہے۔ یا یوں کہیں کہ وہ اس روزے کی برکت سے اخروی تجارت میں داخل ہو کر اور دنیا سے تعلق رکھنے والی وقتی اور فانی حاجات وضروریات سے بالاتر ہو کر ایک دوسرا شخص بن گیا ہے جو دنیاوی نہیں، اخروی ہے۔ روحانی ہے۔ جو جسم کے روپ میں نظر آرہا ہے۔ جی ہاں؛ رمضان روزہ دار کو اس فانی دنیا میں، اس زوال پذیر عمر میں اور اس چھوٹی سی زندگی میں دائمی عمر اور ابدی زندگی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ رمضان کے صرف ایک مہینے کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ روزہ دار کو اسی سال کی عمر کے اعمال کے ثمرات عطا کر دے۔ قرآن پاک میں وارد شدہ الفاظ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ (شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بھی بہتر ہے)، اس راز کے لیے حجتِ قاطعہ ہیں۔ جس طرح ایک بادشاہ اپنے دورِ اقتدار میں یا ہر سال میں کچھ دن مقرر کر لیتا ہے: مثلاً وہ دن جب وہ تختِ حکومت پر براجماں ہوا تھا، یا اس کے علاوہ اس کے دورِ حکومت کا کوئی سا بھی خوشی کا دن، جس دن وہ اپنی رعایا کے ساتھ تہوار کی صورت میں خوشی مناتا ہے۔ ایسے موقع پر آپ دیکھیں گے کہ اس کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ عام دنوں والا نہیں ہوتا ہے جن میں لوگ لگے بندھے قوانین کے پابند ہوتے ہیں، بلکہ ایسے موقعوں پر وہ ان کے ساتھ خصوصی رویے کا مظاہرہ کرتا ہے اور انہیں انعام واکرام سے نوازتا ہے ، وہ لوگوں میں گھل مل جاتا ہے اور اس کے دربار سے سب دربان ہٹا دیے جاتے ہیں اور ہر خاص وعام کو شرفِ باریابی کی بغیر کسی روک ٹوک کے اجازت ہوتی ہے۔ اور یوں وہ سب کے ساتھ خصوصی برتاؤ بھی کرتا ہے اور ہر ایک کو حسبِ درجات علیحدہ علیحدہ بھی اپنے جود وکرم اور نظرِ کریمانہ سے نوازتا ہے۔۔۔وہ قادرِ ازلی ربِ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ بھی ایسے ہی کرتا ہے۔ وہ تو ازلی اور ابدی شہنشاہ ہے جو کہ اٹھارہ ہزار جہانوں کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے۔ اس جلالت مآب شہنشاہ

نے رمضان کے مہینے میں اپنے بلند قدر اور پر حکمت احکام اُتارے ہیں، اپنا قرآن حکیم اتارا ہے جس کا رخ ان ہزاروں جہانوں کی طرف ہے۔ اس لیے اس مبارک مہینے کی آمد عید اور ایک خصوصی الٰہی تہوار کا حکم رکھتی ہے، ایک ربانی نمائش گاہ اور پر ہیبت روحانی مجلس کا حکم رکھتی ہے۔ حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ماہ رمضان چونکہ ایسی عید اور ایسے تہوار کا منظر پیش کرتا ہے اس لیے اس میں روزہ رکھنے کا حکم لازمی ٹھہرا، تاکہ لوگ۔ کسی حد تک۔ سفلی اور حیوانی خواہشات ومصروفیات سے بلند ہو جائیں۔ اس روزے کی کمالی صورت یہ ہے کہ انسان کے معدے کی طرح اس کے دوسرے اعضاء آنکھ، کان، دل، خیال اور سوچ فکر سب کے سب سراپا روزہ بن جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے حواس کو ہر حرام کام اور احمقانہ اور لایعنی حرکات سے بچا کر رکھے اور ان میں سے ہر ایک کو ایسے کام پر لگا دے جو اس کی عبادت شمار ہوتا ہے، مثال کے طور پر انسان اپنی زبان کو روزے کے لئے سدھائے، اور وہ یہ ہے کہ وہ جھوٹ، غیبت، چغلی اور ناپسندیدہ باتوں سے باز رہے اور اس کی بجائے قرآن پاک کی تلاوت، اللہ تعالیٰ کے ذکر، اسکی حمد وثنا، تسبیح وتہلیل، رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام، استغفار اور اس جیسی دیگر چیزوں سے نہال رہے۔ اپنی آنکھ سے ایسی چیزوں کی طرف نہ دیکھے جن کی طرف دیکھنا اس کے لیے حرام ہے۔ اپنے کان کو فحش کلامی اور دیگر بیہودہ باتوں کی طرف سے بند کر لے۔ آنکھ سے عبرت خیز چیز کی طرف دیکھے اور کان سے حق بات اور قرآن کریم سنے۔ اور اس طرح سے وہ اپنے تمام حواس کو ایک طرح کے روزے سے آشنا رکھے یہ بات سب جانتے ہیں کہ معدہ جو کہ ایک بہت بڑا کارخانہ ہے اگر روزے کی وجہ سے اپنے تمام کام معطل کر دے تو پھر چھوٹے موٹے کارخانوں اور فیکٹریوں کی تعطیل بالکل آسان ہے۔

آٹھواں نکتہ: پرہیز شخصی حکمت

رمضان المبارک کے روزوں میں پائے جانے والی بہت سی ایسی حکمتیں جن کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ ہے، ان حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ:

روزے میں انسان کے لیے ایک کامیاب علاج پایا جاتا ہے، اور وہ ہے پرہیز، پرہیز مادی ہو یا معنوی، اس کی اہمیت طبی طور پر بہر کیف ثابت شدہ امر ہے۔ کھانے پینے کے باب میں انسان کا نفس جب بھی بے مہار ہو کر چلے گا تو اس کی یہ روشِ لامحالہ اس کی مادی زندگی میں بہت سی بیماریوں کا سبب بنے گی۔ اس کی روحانی زندگی کا حال بھی ایسے ہی ہے؛ کیونکہ اگر وہ سامنے آنے والی ہر چیز کو حلال حرام کا فرق کیے بغیر ہڑپ کر جائے گا تو اس کی روحانی زندگی زہر آلود ہو کر فاسد ہو جائے گی اور پھر دھیرے دھیرے اس کی حالت یہ ہو جائے گی کہ اس کا ''نفس'' قلب وروح کی اطاعت سے روگردانی کرے گا، ان کے آگے فروتنی اختیار نہیں کرے گا اور اوچھا ہو کر اپنی لگام اپنے ہاتھ میں تھام کر جدھر چاہے منہ اٹھا کر چل دے گا، اور بجائے اس کے کہ انسان کا حکم مان کر اس کی ماتحتی میں چلے، اسے اپنی خواہشات کے مطابق چلائے گا۔

لیکن رمضان کا معاملہ اور ہے، رمضان میں یہ ''نفس'' روزے کی طفیل ایک قسم کے پرہیز کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنے

تزکیہ وتربیت کے ضمن میں پوری سنجیدگی سے کوشش کرتا ہے اور حکم کی بجا آوری کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ اس لیے کھانے پر کھانے اور مسکین معدے کے بھرے رہنے کی وجہ سے جنم لینے والے امراض کی شکایت نہیں کرتا ہے، اور عقل وشریعت کی جانب سے صادر ہونے والے احکام پر کان دھرنے کی قابلیت حاصل کر لیتا ہے، اور حلال چیزوں کو بھی چھوڑ رکھنے کا عادی بن جانے کی وجہ سے حرام چیزوں سے کوسوں دور بھاگتا ہے اور اس بات کی آخری حد تک کوشش کرتا ہے کہ اس کی اس روحانی زندگی میں کوئی چیز خلل انداز ہو کر اسے مکدّر نہ کرے۔

پھر یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی اکثریت عموی طور پر بھوک میں مبتلا ہوتی رہتی ہے، اس لیے نوعِ انسانی کو اس نفس کی ٹریننگ کی سخت ضرورت ہے، اور یہ چیز صرف بھوک سے ممکن ہے، بھوک جو انسان کو صبر وتحمل کا عادی بناتی ہے۔ اور رمضان کا روزہ نفس کو اس چیز کا عادی بنانے اور اسے بھوک پر صبر سکھانے کا نام ہے۔ وہ بھوک جو چودہ پندرہ گھنٹے تک اور اگر سحری نہ کھائی جاسکے تو چوبیس گھنٹے تک رہتی ہے۔ تو گویا کہ روزہ انسان کی بے صبری، گھبراہٹ، ندیدے پن اور عام برداشت کے علاج کا نام ہے۔ بے صبری اور عدم برداشت انسان کی مصیبت کو دوگنا کر دیتے ہیں۔

خود معدے کی مثال ایک کارخانے کی سی ہے جس میں بہت زیادہ کاریگر اور مزدور وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اور انسان کے اندر کچھ ایسے آلات ہیں جن کا معدے کے ساتھ گہرا تعلق ہے، اس لیے نفس اگر ایک خاص مہینے میں دن کے وقت، محدود وقت کے لیے اپنی مصروفیات نہ چھوڑ سکے تو یہ ان کاریگروں اور مزدوروں کو ان کی وہ ڈیوٹی بھلا دے گا جو ان کے ساتھ خاص ہے اور سب کو اپنی وجہ سے غفلت کا شکار کر دے گا۔ انہیں اپنے زیر تسلط کر لے گا اور ان پر اپنا حکم چلائے گا، یوں وہ ان آلات وحواس پر ان کے تمام کام گڑبڑ اور بے ترتیب کر دے گا اور اس معنوی کارخانے کے دھروں اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور کثیف دھوئیں سے ان کی زندگی مکدر اور بے مزا بنا دے گا۔ اور اس طرح سے نفس ان سب کی نظریں اپنی طرف پھیر لے گا اور انہیں ان سب کی قیمتی ذمہ داریاں وقتی طور پر بھلوا دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اولیاء کرام کی ساری توجہ اس نفس یا ''معدہ'' کو سدھارنے پر مرکوز رہی ہے، اس کے لیے وہ بہت کم مقدار میں کھاتے پیتے تھے تاکہ کمال کے درجات بخوبی طے کر سکیں۔

لیکن رمضان شریف کے روزے کے ذریعے اس کارخانے کے یہ خدمت گزار یہ بات اچھی طرح سمجھ جاتے کہ وہ صرف اسی کارخانے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ اور رمضان شریف میں تمام آلات ان ملکوتی اور روحانی تماشا گاہوں میں لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنی نظریں اس کارخانے کی سفلی تماشا گاہوں کے بجائے انہی تماشا گاہوں پر لگائے رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ اہلِ ایمان رمضان المبارک میں حصہ بقدر جثہ مختلف فیوض وبرکات سے ہمکنار ہو جاتے ہیں اور معنوی مسرتوں کا مظہر بن جاتے ہیں؛ کیونکہ اس راہ میں ترقیاں بے شمار اور فیوض وبرکات بے حساب ہیں جن سے عقل، قلب، روح اور سرّ جیسے انسانی لطائف اس مبارک مہینے میں فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ معدہ کے رونے چلانے کے علی الرّغم یہ لطائف آزادانہ تبسم ریز رہتے ہیں۔

نواں نکتہ: نفس کی فرعونیت کا توڑ

اس پہلو سے کہ رمضان کا روزہ نفسِ انسانی کی وہمی ربوبیت کا بت براہِ راست پاش پاش کر دیتا ہے، اور اسے اس کی عبودیت کی صفت سے آشنا کراتا ہے اور اسے عاجزی اور مسکینی کے اظہار کا خوگر بناتا ہے؛ اس پہلو سے روزہ بہت سی حکمتوں پر مشتمل ہے، مثال کے طور پر یہ کہ:

نفس اپنے پروردگار کی پہچان نہیں کرنا چاہتا ہے، بلکہ اپنی طاغوتی فرعونیت کے زعم میں ربوبیت کا دعویٰ کرنا چاہتا ہے، چاہے اسے کتنا بھی دبایا جائے، کتنی بھی سزا دی جائے، اس کی وہمی ربوبیت والی رگ اس میں باقی رہتی ہے، یہ رگ صرف اور صرف بھوک کے اقتدار کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے۔

اس طرح سے رمضان المبارک کا روزہ براہِ راست نفس کی اس سرکش فرعونیت والے پہلو پر کاری ضرب لگا کر اس کی شان وشوکت کا بت توڑ دیتا ہے اور اسے اس میں پائی جانے والی عاجزی، کمزوری اور فقر کا آئینہ دکھاتا ہے اور اسے اس کی بندگی سے آشنا کرتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ''نفس'' سے کہا: ''میں کون ہوں اور تو کون ہے؟''۔ نفس نے جواب دیا: ''میں میں ہوں اور تو تو ہے''۔ تو اللہ نے اس کو عذاب دیا اور اسے جہنم میں پھینک دیا۔ پھر ایک دفعہ پھر پوچھا تو اس نے جواب دیا: ''میں میں ہوں اور تو تو ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کئی مرتبہ عذاب دیا لیکن وہ اپنی ''انانیت'' سے دستبردار نہیں ہوتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک کا عذاب دیا، یعنی اسے بھوکا پیاسا رکھا، اور پھر ایک دفعہ پھر پوچھا کہ ''میں کون ہوں اور تو کون ہے؟'' تو اس نے جواب دیا: اَنْتَ رَبِّیَ الرَّحِیْمُ وَاَنَا عَبْدُكَ الْعَاجِزُ ''تو میرا مہربان پروردگار ہے اور میں تیرا عاجز بندہ ہوں''۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَاةً تَكُوْنُ لَكَ رِضَاءً وَلِحَقِّهٖ اَدَاءً بِعَدَدِ ثَوَابِ قِرَاءَةِ حُرُوْفِ الْقُرْآنِ فِیْ شَهْرِ رَمَضَانَ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلِّمْ " سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ"۔ (حاشیہ)

(حاشیہ) اعتذار: رمضان المبارک سے متعلقہ یہ رسالہ انتہائی عجلت سے صرف چالیس منٹوں میں لکھا گیا ہے، اس حالت میں کہ خود میں اور کاتب دونوں ہی مریض اور مرض کی وجہ سے کمزوری سے دوچار تھے۔ اس لیے رسالہ میں کمی کوتاہی کا در آنا ایک لازمی امر ہے۔ لہذا، ہم اپنے بھائیوں سے معذرت کے خواستگار ہیں اور ان سے امید رکھتے ہیں کہ جہاں وہ مناسب سمجھیں گے تصحیح فرما دیں گے۔ مؤلف

تیسری قسم

جو کہ تیسرا رسالہ ہے

یہ قسم میں نے اپنے قرآنی خدمت میں مصروف بھائیوں سے اپنی ایک اہم نیت کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے اور ان کی فکر کو اپنی فکر کے ساتھ ملانے کے لیے لکھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ میں قرآنِ کریم کا ایک ایسا نسخہ لکھنا چاہتا ہوں جس میں قرآنِ معجز بیان کا ''اعجازی نقش'' ظہور میں آئے۔ جو کہ قرآنِ کریم کے اعجاز کی دوسو اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ تو میں نے اپنی یہ نیت ان کے سامنے رکھی تا کہ وہ مجھے متنبہ کریں اور میں اس طرح کے اعجازی نقش والے مصحف کے بارے میں ان کی رائے جان سکوں۔ اس ضمن میں اعتماد اس مصحف پر رہے گا جو حافظ عثمان کے خط سے لکھا گیا ہے۔ (حاشیہ) اور ''آیۃُ المداینۃ'' کو پورے صفحے کے لیے پیمانہ بنایا گیا ہے۔ جبکہ ''سورۃ الِاخلاص'' کو پوری سطر کے لیے پیمانہ بنایا گیا ہے۔

اور یہ تیسری قسم نو مسائل پر مشتمل ہے۔

پہلا مسئلہ: ''قرآنی معجزات'' نامی پچیسویں مقالے میں قطعی براہین کے ساتھ یہ بات ثابت کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز چالیس انواع و اقسام تک جا پہنچتا ہے۔ اس کی بعض اقسام کی وضاحت تفصیل کے ساتھ اور بعض کی اجمال کے ساتھ ضدی قسم کے لوگوں کے مقابلے میں بھی کر دی گئی ہے۔ اسی طرح انیسویں مکتوب کے اٹھارہویں اشارے میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ: ''قرآن چالیس قسم کے انسانی طبقات کے لیے اپنے اعجاز کا اظہار مختلف پہلوؤں کے ساتھ کرتا ہے۔ اس اشارے نے ان میں سے دس قسم کے طبقات کے لیے ان کے مختلف اعجازی حصوں کو ثابت کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے ہر طبقے کا اس اعجازی پہلو میں علیحدہ قسم کا حصہ ہے۔

رہے مختلف مشارب کے اولیائے کرام کے اور دیگر انواع و اقسام کے علوم و معارف کے مالک لوگوں کے بقیہ تیس طبقات؛ تو ان کا علمُ الیقین، عینُ الیقین اور حقُّ الیقین تک پہنچا ہوا یہ تحقیقی ایمان کہ ''قرآن کریم واقعی اللہ کا کلام ہے''، اُن کے اس ایمان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کریم نے ان کے لیے اپنے اِعجاز کے مختلف پہلوؤں کو آشکار کر دیا ہے، مطلب یہ کہ اُن میں سے ہر ایک کو قرآنی اِعجاز کا کوئی نہ کوئی پہلو کسی دیگر شکل میں نظر آیا ہے۔

(حاشیہ: ا) حافظ عثمان بن علی (1052-1110ھ)، جو کہ حافظ عثمان کے نام سے معروف ہیں۔ عربی کے نامی گرامی خطاط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن کریم کی کتابت کا کچھ اس طرح کا شرف بخشا کہ ان کا لکھا ہوا قرآن کریم کا نسخہ ''مصحف حافظ عثمان'' کے نام سے تمام عالمِ اسلام میں مشہور ہوا اور اس کے سینکڑوں نسخے طبع ہوئے۔ مترجم۔

جی ہاں، مختلف مشارب کے حساب سے "جمالِ اعجاز" کے جلوے مختلف ہو جاتے ہیں، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ وہ اعجاز جو کسی "عارف ولی" کی سمجھ میں آتا ہے، اِعجاز کے اس جمال کے برابر نہیں ہوتا جو ایک "عاشق ولی" کے مشاہدے میں آتا ہے۔

اور اعجاز کا وہ پہلو جو اصول الدین کے کسی علامہ اور امام کو نظر آتا ہے، اعجاز کے اس پہلو کے برابر نہیں ہوتا جو شریعت کی فروع کے مجتہد کو نظر آتا ہے۔۔۔ وغیرہ۔

میں چونکہ اعجاز کے ان تمام پہلوؤں کو تفصیل سے واضح نہیں کر سکتا جو ان تمام حضرات کو علیحدہ علیحدہ طور پر نظر آتے ہیں؛ کیونکہ میرا حوصلہ تنگ ہے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتا، اور میری نظر قاصر ہے ان سب کو دیکھ نہیں سکتی؛ اس لیے میں نے صرف دس طبقات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور بقیہ کی طرف اجمال کے ساتھ اشارہ کر دیا ہے لیکن معجزات رسول ﷺ میں ان میں سے دو طبقے مزید وضاحت کے محتاج تھے جو اُس وقت نہیں ہو سکی تھی، اس لیے اس مقام پر اُن کی کچھ وضاحت پیش کی جا رہی ہے۔

پہلا طبقہ: عوام الناس جنہیں ہم "کانوں والا طبقہ" کہتے ہیں؛ کیونکہ عام آدمی قرآن کو صرف کان کے ذریعے سننے پر ہی اکتفا کرتا ہے اور اُس کی سمجھ میں اس کا اعجاز صرف کان کی وساطت سے ہی آتا ہے۔ یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ: "یہ قرآن جو میں سن رہا ہوں دوسری کتابوں جیسا نہیں ہے، یا تو یہ ان سب سے اُوپر ہے یا سب سے نیچے۔ اب یہ بات کہ یہ سب سے نیچے ہے، یہ تو کوئی کبھی نہیں کہہ سکتا، اور ابھی تک کسی نے کہا بھی نہیں، حتی کہ یہ بات شیطان بھی نہیں کہہ سکتا، تو پھر اس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ سب سے اُوپر ہے اٹھارہویں اشارے میں اجمال کے ساتھ اتنا ہی لکھا گیا تھا۔ پھر چھبیسویں مکتوب میں "شیطانی ٹولے کے خلاف قرآنی حجت نامی پہلا مبحث" جو کہ اس اجمال کی وضاحت کے لیے لکھا گیا ہے، اِعجاز کے اِس طبقے کی صورت گری کرتا ہے اور اس کا اثبات کرتا ہے۔

دوسرا طبقہ: آنکھوں والے لوگ، یعنی عوام الناس میں سے وہ مادہ پرست لوگ جن کی عقلیں ان کی آنکھوں میں براجمان ہو چکی ہیں، یعنی جو صرف آنکھوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ چنانچہ "اٹھارہویں اشارے" میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کریم میں اس طبقے کے لیے ایسے معجزانہ اشارے پائے جاتے ہیں جو آنکھوں سے نظر آجاتے ہیں۔ اور اس دعوے کی وضاحت کرنا بہت ضروری تھا، لیکن کسی اہم ربانی حکمت کی وجہ سے جو ہماری سمجھ میں اب آئی ہے، اس وقت ایسا ہو نہ سکا۔ اس لیے اُس کے کچھ پہلوؤں کی طرف کچھ جزوی سے اور سادہ سے اشارے کر دیے گئے تھے۔

اور اب چونکہ اس حکمت میں پائے جانے والا راز ہماری سمجھ میں آچکا ہے اور ہمیں اس بات کا قطعی اطمینان ہو چکا ہے کہ اس میں تاخیر ہو جانا ہی بہتر تھا؛ اس لیے اب ہم نے اس غرض کی خاطر کہ یہ طبقہ آسانی کے ساتھ سمجھ جائے اور اُس

کے ذوق کی تسکین ہو جائے ہم نے اس طرح کا ایک ''مصحف'' لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے تا کہ وہ اعجاز کے چالیس پہلوؤں میں سے ایک ایسا پہلو آشکار کر دے جو آنکھوں سے نظر آ جائے۔

اس ''تیسری قسم'' کو ''چوتھی قسم'' کے ساتھ ملا کر بقیہ مسائل کا تعلق توافقات کے ساتھ ہے۔ اس لیے میں توافقات کے ساتھ تعلق رکھنے والی فہرست پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ اور وہ مسائل یہاں پر درج نہیں کیے گئے۔ یہاں ایک تنبیہ کے ساتھ صرف ''چوتھی قسم'' کا ''تیسرا نکتہ'' لکھا گیا ہے۔

چوتھی قسم جو کہ چوتھا رسالہ ہے۔

لفظِ ''الرسول'' میں پائے جانے والے عظیم الشان نکتے کے بارے میں ایک سو ساٹھ آیتیں لکھی جا چکی ہیں، یہ آیات اُن لوگوں کے لیے بڑی عظیم خاصیّت کی حامل اور بہت زیادہ مفید ہیں جو مختلف آیات پڑھنا یا حفظ کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح لفظِ ''القرآن'' میں پائے جانے والے عظیم الشان نکتے کے بیان میں لکھی جانے والی اُنہتر عظیم القدر آیات کی بلاغت کا درجہ غیر معمولی طور پر بہت فائق اور اس کی فصاحت کی قوّت بہت بلند پایہ ہے۔ چنانچہ یہ بھی ایک قرآنی وِرد ہے، بھائیوں کو وصیت کی جاتی ہے کہ اسے پڑھا کریں۔

مصحف شریف میں وارد ہونے والا ''القرآن'' کا لفظ سات زنجیروں کی شکل میں آیا ہے جو اس لفظ کو گھیرے ہوئے ہیں البتہ دو جگہ پر یہ لفظ ان زنجیروں سے باہر واقعہ ہوا ہے اور ان دونوں جگہوں میں یہ لفظ ''قراءت'' کے معنی میں آیا ہے جس سے اس نکتے کو مزید تقویت حاصل ہو گئی ہے۔

رہا لفظِ ''الرسول''، تو اس کے ساتھ قرآن کی دیگر سورتوں کی بہ نسبت ''سورۃ الفتح'' اور ''سورۃ محمد'' زیادہ تعلق رکھتی ہیں، اس بنا پر ہم نے اس لفظ کو ان دو سورتوں کی ظاہری زنجیروں میں ہی محصور رکھا ہے، اس بنا پر جو اس زنجیر سے باہر ہے اسے سرِ دست اس کے اندر درج نہیں کیا گیا ہے۔

وقت ملا تو۔ اِن شاءاللہ۔ لفظِ ''الرسول'' میں پائے جانے والے اسرار و رموز پر قلم ضرور اُٹھائیں گے۔

تیسرا نکتہ۔۔۔ چار نکتوں پر مشتمل ہے۔

پہلا نکتہ:

لفظ ''اللہ'' قرآن پاک میں دو ہزار آٹھ سو چھ بار، لفظ ''الرحمٰن''۔ بسم اللہ سمیت ایک سو انسٹھ بار، لفظِ ''الرحیم'' دو سو بیس بار، لفظِ ''الغفور'' اِکسٹھ بار، لفظِ ''الربّ'' آٹھ سو چھیالیس بار، لفظِ ''الحکیم'' چھیاسی بار، لفظِ ''العلیم'' ایک سو چھبیس بار، لفظِ ''القدیر'' اکتیس بار، لفظِ ''ھو'' ''لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' میں چھبیس بار آیا ہے۔ (حاشیہ)

(حاشیہ) قرآن کریم کی آیات کی مجموعی تعداد کا چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ بار ہونے میں، اور اس کا اس صفحے میں وارد ہونے والے چھ عدد اسمائے حسنٰی کے ساتھ تعلق ہونا ایک اہم راز کی طرف اشارہ کرتا ہے، لیکن وہ راز فی الحال بیان کی گرفت میں نہیں آ سکا۔ مؤلف۔

لفظِ ''اللہ'' کی اس تعداد میں بہت سے اسرار اور نکتے پائے جاتے ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم میں لفظ ''اللہ اور الرّب'' کے بعد ''الرحمٰن، الرحیم، الغفور اور الحکیم'' کے الفاظ سب سے زیادہ آئے ہیں، اور ان سب کی مجموعی تعداد قرآنی آیات کا نصف ہے۔

اسی طرح جہاں کہیں لفظ ''الرّب'' لفظِ ''اللہ'' کے معنی میں آیا ہے، اس کی تعداد بھی قرآنی آیات کے نصف جتنی ہے، یاد رہے کہ لفظ ''ربّ'' کا ذکر آٹھ سو چھیالیس بار ہوا ہے، ان میں سے پانچ سو سے کچھ زائد مرتبہ لفظ ''اللہ'' کے معنی میں آیا ہے اور دو سو سے زائد مرتبہ اس معنی میں نہیں ہے۔

اسی طرح لفظ ''اللہ'' کی ''الرحمٰن الرحیم اور العلیم'' کے ساتھ اور ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ'' کے لفظِ ''هُو'' کے ساتھ استعمال ہونے والی مجموعی تعداد بھی چار عدد کے فرق کے ساتھ قرآنی آیات کا نصف بنتی ہے، اور ''هُو'' کی بجائے لفظِ ''قدیر'' کے ساتھ نو کے فرق کے ساتھ آیات کی مجموعی تعداد کا نصف بنتی ہے۔

پس لفظ ''اللہ'' میں بہت سے نکتے ہیں، لیکن ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

دوسرا نکتہ: قرآنی سورتوں کے لحاظ سے ہے۔ ان سورتوں میں بھی بہت سے نکتے پائے جاتے ہیں، اور ان میں ایسے توافقات موجود ہیں جو قصد و ارادہ اور انتظام پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے:

ایک یہ ہے کہ سورۂ البقرہ میں لفظ ''اللہ'' چار کے فرق کے ساتھ اتنی بار ہی آیا ہے جتنی اس کی آیتیں ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ لفظِ ''اللہ'' کی بجائے لفظ ''هُو'' چار دفعہ آگیا ہے جیسے کہ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ'' میں ہے اور اس طرح توافق کی تعداد پوری ہو جاتی ہے۔

اور سورۂ آل عمران میں بھی لفظِ ''اللہ'' اُس کی آیات کے موافق اور برابر ہے، صرف یہ ہے کہ لفظِ ''اللہ'' دو سو نو مرتبہ آیا ہے اور آیتوں کی تعداد دو سو ہے، یعنی نو کا فرق ہے۔ لیکن کلامی خصوصیات اور بلاغی نکات میں اس طرح کے چھوٹے چھوٹے فرقوں سے کچھ فرق نہیں پڑتا، اور تقریبی توافقات ہی کافی ہوتے ہیں۔

اسی طرح ''نساء، مائدہ اور انعام'' تینوں سورتوں کی آیتیں ان سورتوں میں پائے جانے والے لفظ ''اللہ'' کی مجموعی تعداد کے برابر ہیں کہ ان سورتوں کی آیات کی تعداد چار سو چونسٹھ ہے، اور لفظ ''اللہ'' چار سو اکسٹھ بار آیا ہے۔ اور سورتوں کے آغاز والی بسم اللہ والے لفظ ''اللہ'' کو شامل کر کے یہ تعداد پوری ہو جاتی ہے۔

اسی طرح پہلی پانچ سورتوں میں آنے والے لفظِ ''اللہ'' کی تعداد سورۂ ''اعراف، انفال، توبہ، یونس اور ہود'' میں پایا جانے والا لفظ ''اللہ'' دو گنا ہے، مطلب یہ کہ دوسری پانچ سورتوں میں اس کی تعداد پہلی پانچ سورتوں کی تعداد سے آدھی ہے۔

اوراس کے بعد آنے والی پانچ سورتوں ''یوسف، رعد، ابراہیم، حجر اور نحل'' میں لفظِ ''اللہ'' کی تعداد اس آدھی سے آدھی ہے۔

پھر ان کے بعد والی پانچ سورتوں ''اسراء، کہف، مریم، طہٰ، انبیاء اور حج'' (حاشیہ) میں اس کی تعداد اس آدھی سے آدھی ہے۔

اوران کے بعد آنے والی پانچ پانچ سورتوں میں یہ تعداد، ی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے۔ صرف ان میں کسری اعداد کی رُو سے تھوڑا بہت فرق رہ جاتا ہے، لیکن اس قسم کے ''خطابی مقام'' میں اس طرح کے فروق کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر: ان میں سے بعض سورتوں کی ایک سو اکیس، بعض کی ایک سو پچیس، بعض کی ایک سو چون اور بعض کی ایک سو انسٹھ آیات ہیں۔

پھر اس کے بعد آنے والے سورۂ ''زخرف'' سے شروع ہونے والی پانچ سورتوں میں تعداد نصف ہو جاتی ہے، یعنی پچھلے نصف کے نصف سے نصف تک آجاتا ہے۔

سورۂ ''نجم'' سے شروع ہونے والی پانچ سورتوں میں یہ عدد تقریبی صورت میں اس نصف کے نصف کے نصف کے نصف سے نصف تک ہو جاتا ہے۔ تقریبی صورت میں اس لیے کہا کہ خطابی مقامات میں چھوٹی چھوٹی عددی کسروں کا فرق نقصان دہ نہیں۔

پھر پانچ چھوٹی سورتوں کے تین مجموعوں میں لفظ ''اللہ'' تین عدد ہیں۔

پس یہ کیفیات بتاتی ہیں کہ لفظ ''اللہ'' کی تعداد اتفاق کا کوئی عمل دخل نہیں ہے یعنی یہ صورتِ حال اتفاقاً ہی پیدا نہیں ہوگئی ہے بلکہ یہ معیّن تعداد حکمت اور انتظام کے ساتھ ظہور میں آئی ہے۔

لفظ اللہ کا تیسرا نکتہ:

مصحف شریف کے صفحات میں آنے والے لفظِ ''اللہ'' کے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے بارے میں، اور وہ اس طرح ہے کہ: لفظِ ''اللہ'' کی ایک صفحے میں پائی جانے والی تعداد ایک چہرے کے ساتھ دائیں طرف والے صفحے کی طرف، اور اس چہرے کے مقابلے والے صفحے کی طرف دیکھتی ہے، اور کبھی اپنے بالمقابل کے بائیں طرف والے صفحات کی طرف دیکھتی ہے، اور ایک چہرے سے ان صفحات کے مابعد کی طرف دیکھتی ہے۔

(حاشیہ) اس خماسی (پانچ سورتیں، پھر پانچ، پھر پانچ۔۔۔) تقسیمات کا راز کھل گیا، چنانچہ یہاں چھ سورتیں لکھ دی گئیں اور ہم میں سے کسی کو بھی اس کا پتا نہ چلا جس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ یہاں چھٹی سورت ہمارے اختیار کے بغیر غیبی طور پر آداخل ہوئی ہے تاکہ ''تھقیت'' کا یہ راز ضائع نہ ہونے پائے۔ مؤلف۔

میں نے اپنے مصحف میں ان توافقات کا تتبع کیا تو مجھے بیشتر جگہوں پر تعداد کی نسبت سے بہت خوبصورت توافق نظر آیا اور میں نے اپنے مصحف میں ان مقامات پر نشان لگا دیے چنانچہ وہ زیادہ تر تو ایک دوسرے کے مساوی تھے، اور کبھی نصف اور کبھی ایک تہائی صورت میں۔ لیکن بہر صورت حکمت اور انتظام کی خبر دیتے تھے۔

چوتھا نکتہ:

ایک ہی صفحے میں پائے جانے والے توافقات:

میں نے اپنے بھائیوں کے ہمراہ مصحف کے تین چار مختلف نسخوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تقابل کیا تو ہمیں یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ ان سب میں بھی توافقات مطلوب ہیں صرف یہ ہوا ہے کہ بعض نسخوں میں توافقات کے بارے میں کچھ خلل رونما ہو گیا ہے، کیونکہ مختلف مطابع کے کاتبوں کے پیشِ نظر مقاصد علیحدہ علیحدہ رہے ہیں۔ لیکن جب انہیں منظم صورت میں لکھا جائے گا تو تمام قرآن میں کچھ انتہائی نادر صورتوں کو چھوڑ کر دو ہزار آٹھ سو چھ بار آنے والے لفظِ ''اللہ'' کے عدد میں پائے جانے والے توافقات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جائیں گے اور اس طرح ان میں اعجاز کا شعلہ چمک اُٹھے گا؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فکر کے لیے ان وسیع دامن صفحات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں اور وہ کسی بھی صورت میں ان میں دخل اندازی نہیں کر سکتا، رہے اتفاقات، تو ان کا ہاتھ ان پر معانی حکیمانہ کیفیات تک نہیں پہنچ سکتا۔۔۔

ہم مصحف شریف کی نئے سرے سے کتابت کروا رہے ہیں تاکہ یہ ''چوتھا نکتہ'' کسی حد تک جلوہ گر ہو جائے۔ چنانچہ قرآن مجید کے سب سے زیادہ پھیلے ہوئے نسخوں کی مکمل نگہداری کرتے ہوئے اور ان کی سطروں کا مکمل خیال رکھتے ہوئے ان تمام مقامات کو نظم وضبط میں لا رہے ہیں جو اربابِ صنعت کی سُستی اور بے توجہی کی وجہ سے منظم نہیں ہو سکے۔ ایسا ہو جانے کے بعد توافقات کے حقیقی نظم وضبط میں پایا جانے والا راز اُبھر کر سامنے آ جائے گا۔ ان شاء اللہ۔ اور سامنے آ بھی چکا ہے۔

اَللّٰھُمَّ یَا مُنْزِلَ الْقُرْآنِ بِحَقِّ الْقُرْآنِ فَھِّمْنَا أَسْرَارَ الْقُرْآنِ مَادَارَ الْقَمَرَانِ وَصَلِّ وَسَلِّمْ عَلَى مَنْ اُنْزِلَتْ عَلَیْہِ الْقُرْآنُ وَعَلَى آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ آمِیْنَ

پانچویں قسم جو کہ پانچواں رسالہ ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾

مجھے رمضان شریف کے مہینے میں ایک روحانی حالت میں اس انوار بھری آیت کے پُر اَسرار انوار میں سے ایک نور کا احساس ہوا۔ اور میں نے خیال سے ملتی جلتی حالت کا مشاہدہ کیا؛ اور وہ کچھ یوں ہے: میں نے ایک قلبی واردات جیسا خیالی واقعہ دیکھا جس سے مجھے پورا اطمینان حاصل ہوگیا کہ: تمام موجودات اور ذی حیات اویس قرنی کی اُن مشہور مناجات سے ملتی جلتی مناجات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ جو اِن الفاظ سے شروع ہوتی ہیں۔

اِلٰهِیْ أَنْتَ رَبِّیْ وَأَنَا الْعَبْدُ

وَأَنْتَ الْخَالِقُ وَأَنَا الْمَخْلُوْقُ

وَأَنْتَ الرَّزَّاقُ وَأَنَا الْمَرْزُوْقُ الخ

اور یہ کہ ان اٹھارہ ہزار عوالم میں سے ہر عالم کا نور اُسمائے الٰہیہ میں سے کوئی نہ کوئی اسم ہے، اور وہ اس طرح کہ:

میں نے ایک دوسری پر لپٹی ہوئی بہت سی پتیوں والے گلاب کے پھول کے ساتھ مشابہت رکھنے والے اس عالم میں بہت سے عالم دیکھے جو ایک دوسرے کے نیچے مستور ہیں اور حجاب اندر حجاب ہزاروں حجابوں میں لپٹے ہوئے ہیں، چنانچہ ایک حجاب اُٹھتا تھا تو مجھے دُوسرا عالم نظر آجاتا، اور وہ عالم مجھے ظلمت و وحشت اور خوفناک اور دہشت کے درمیان گھیرا ہوا نظر آتا، جیسے کہ اس کی منظر کشی آیتِ نور کے بعد والی آیت کر رہی ہے:

﴿أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾

لیکن پھر اچانک اسمِ الٰہی کا ایک جلوہ ایک عظیم الشان نور کی طرح چمکنے لگا اور اُس عالم کو روشن کرنے لگا۔ پھر اس کے بعد عقل کے سامنے جو حجاب بھی اُٹھا خیال کے سامنے کوئی اور ہی عالم نظر آتا تھا، لیکن غفلت کی وجہ سے تاریکی میں غرق تھا، تب اچانک کوئی اسمِ الٰہی سورج کی طرح جلوہ فگن ہوتا اور اُس عالم کو اوّل سے لے کر آخر تک روشن کر دیتا۔

اور اس طرح یہ قلبی سیر و گردش اور خیالی سیاحت بہت دیر تک قائم رہی اور پردے کھلتے گئے چنانچہ:

میں نے جب عالمِ حیوانات کو دیکھا اور ان کے ضعف و عجز اور داماندگی و درماندگی، اور ان کی غیر محدود حاجات و ضروریات اور شدید بھوک کی طرف نظر گئی، تو وہ عالم مجھے بہت زیادہ غمگین اور تاریک نظر آیا۔ تب اسمِ گرامی ''الرزاق'' کے

بُرج سے یعنی اس کے معنی میں نام نامی "الرحمٰن" تابندہ آفتاب کی طرح طلوع ہوا اور اُس نے عالم کو اوّل سے لے کر آخر تک رحمت کی روشنی سے جگمگا دیا۔

پھر میں نے اس عالمِ حیوانی میں ہر دیکھنے والے کے مشفقانہ جذبات کو بھڑکا دینے والی تاریکی کے درمیان گھرا ہوا ایک اور غمگین عالم دیکھا، اس میں بچے اور چھوٹے چھوٹے جان دار ضعف و عجز و احتیاج کے درمیان تلملا رہے تھے۔ پھر اچانک شفقت کے بُرج سے اسم گرامی "الرحیم" طلوع ہوا اور اس نے اتنے میٹھے اور لطیف انداز کے ساتھ اس عالم کو روشن کر دیا کہ شکوہ و شکایت، نرم دلی اور غم واندوہ کے آنسوؤں کو فرح و سرور اور شکر و سپاس کی لذت سے جاری ہونے والے آنسوؤں میں تبدیل کر دیا۔

پھر اک اور حجاب کھل گیا، اور میرے سامنے عالم انسان سینما سکرین کی طرح نمایاں ہو گیا۔ مجھے وہ عالم اتنا تاریک اور دہشت ناک نظر آیا کہ میں اپنی اس دہشت کی وجہ سے آہ و فغاں میں مصروف ہو گیا اور فریاد کرنے لگا؛ کیوں کہ میں نے دیکھا کہ:

لوگوں کی ابد تک پھیلی ہوئی خوا ہیں۔ ان کے کائنات کی وسعتوں کے برابر افکار و تصوّرات اور ان کی دائمی بقا، جنت اور ابدی سعادت کو طلب کرنے والے عزائم، ہمتیں اور قابلیتیں ہیں۔

اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ کمزور، عاجز ولاچار اور فقیر و محتاج ہونے کے باوجود ان غیر محدود مقاصد اور لاانتہا مطالب کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ بہت سے آلام و مصائب، صدمات اور دشمنوں کے حملوں کی زد میں ہیں۔

مزید یہ کہ یہ چھوٹی سی عمر کے مالک ہیں اُن کی زندگی انتہائی مضطرب اور پریشان کن اور معیشت انتہائی پست اور ذلیل ہے۔

یہ لوگ زوال و فراق کی مصیبتوں سے دوچار رہتے ہیں جو دل کے لیے سب سے زیادہ دہشت خیز اور تکلیف دہ حالت شمار ہوتی ہے؛

کیونکہ یہ لوگ غفلت کی نظر کے ساتھ دیکھنے کی وجہ سے قبر اور قبرستان کو ابدی تاریکیوں میں داخل ہو جانے کا ایک دروازہ سمجھتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اس تاریک گڑھے میں یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے اور گروہ در گروہ پھینکا جا رہا ہے!

میں نے اس عالم کو جب ان تاریکیوں میں غرق دیکھا تو میرے تمام انسانی لطائف، بلکہ میرے وجود کے تمام ذرّات میرے قلب و روح و عقل کے ساتھ فریاد کرتے ہوئے رونے کے لیے تیار ہو گئے۔ تب اچانک اسمِ گرامی "الحکیم" کے برج

سے اسم گرامی ''العادل''، اسم گرامی ''الکریم'' کے برج سے اسم گرامی ''الرحمٰن''، اسم گرامی ''الغفور'' کے برج سے یعنی اس کے معنی سے اسمِ گرامی ''الرحیم''، اسم گرامی ''الوارث'' کے برج سے اسم گرامی ''الباعث''، اسم گرامی ''المُحسن'' کے برج سے اسمِ گرامی ''المُحی'' اور اسم گرامی ''المالک'' کے بُرج سے اسم گرامی ''الرّب'' طلوع ہوا، اور ان اسمائے گرامی نے عالمِ انسان میں پائے جانے والے بہت سے عوالم کو منوّر کر دیا اور آخرت کے جگمگاتے ہوئے عالم کی ایک کھڑکی کھول دی اور انسان کی تاریک دنیا پر جگمگاتے انوار کا چھڑکاؤ کر دیا۔

پھر ایک اور عظیم الشان منظر سے پردہ اُٹھا اور عالمِ ارض آشکار ہو گیا۔ اور فلسفے کے سائنسی قوانین نے خیال کو ایک دہشت ناک عالم کا مشاہدہ کروادیا۔ چنانچہ زمین پر بسنے والا انسان اس وحشت خیز تاریکی کے درمیان مجھے کچھ اس کیفیت میں نظر آیا کہ یہ بوڑھی اور سالخوردہ زمین توپ کے گولے کی رفتار سے ستر گنا زیادہ رفتار کے ساتھ غیر محدود فضا میں بھاگی چلی جارہی ہے اور ایک سال میں پچیس ہزار سال کی مسافت کے حساب سے گھوم رہی ہے اُس کے باطن میں جو ہولناک زلزلے پائے جاتے ہیں اُن کی وجہ سے یہ ہمہ وقت پھٹنے اور پارہ پارہ ہو کر بکھر جانے کے لیے تیار ہے۔۔۔ اس عالَم پر چھائی ہوئی شدید قسم کی تاریکی کی وجہ سے میرا سر گھومنے لگا۔

تب یکدم رحمت، عظمت اور ربوبیت کے برجوں سے اسم گرامی ''خَالِقُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ'' اور اَلْقَدِيْرُ، اَلْعَلِيْمُ، اَلرَّبُّ، اَللّٰهُ، رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ اور مُسَخِّرُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ'' طلوع ہوئے اور انہوں نے اس عالَم کو کچھ اس طرح منوّر کر دیا کہ کرۂ ارض مجھے ایک انتہائی منظم، مسخر، مکمل، پاکیزہ، پُر امن اور قابلِ اطمینان سیاحتی سفینے کی شکل میں نظر آیا جسے سیر و سیاحت، تفریحِ خاطر اور تجارت کے لیے تیار کیا گیا ہو!

حاصلِ کلام یہ ہے کہ: کائنات کی طرف رخ کیے ہوئے ایک ہزار ایک اسمائے الٰہیہ میں سے ہر اسم ایک سورج کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک عالم کو اور اس کے اندر پائے جانے والے تمام عوالم کو منوّر کرتا ہے۔ اور سرِّ وحدت کی روشنی میں تمام اسماء کے جلوے ہر اسم کے جلوے میں نظر آتے ہیں۔

پھر دل کا سیر و سیاحت کے لیے ذوق و شوق مزید بڑھتا ہے؛ کیونکہ اُسے ہر تاریکی کے پیچھے مختلف قسم کے انوار نظر آتے تھے، چنانچہ وہ آسمان میں گھومنے پھرنے کے لیے خیال پر سوار ہو گیا تب پردہ ہٹا اور ایک دیگر وسیع قسم کا منظر سامنے آگیا۔ تب دل عالمِ سماوات میں داخل ہو گیا اور اُس نے دیکھا کہ:

یہ نورانی مسکراہٹیں بکھیرنے والے ستارے جسامت میں کرۂ ارض سے بہت بڑے ہیں، یہ ایک دوسرے میں داخل ہو کر زمین سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ تیر رہے ہیں اور گھوم رہے ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی اگر اپنا ایک لمحے کے لیے راستہ بھٹک جائے تو دوسرے کے ساتھ ٹکرا جائے اور اس طرح کا دھماکہ کر دے کہ عالم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور

کائنات کا تارو پور بکھر جائے۔ اور یہی ستارے پھر نور کی بجائے نار اُگلنا شروع کر دیں، اور نورانی مسکراہٹوں کے ساتھ نوزانے کی بجائے وحشت برسانا شروع کر دیں، اور میں نے آسمانوں کو دیکھا کہ وہ انتہائی وسیع وعریض، عظیم الشان، خالی خالی، فارغ اور وحشت اور حیرت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ تب مجھے اپنے یہاں آنے پر ہزار بار ندامت ہوئی۔ لیکن پھر اچانک اللہ تعالیٰ کے فرمان گرامی "وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" کے بُرج سے اسمِ گرامی "رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ، وَرَبُّ الْمَلَآئِكَةِ وَالرُّوحِ" اپنے تمام جلووں سمیت طلوع ہوا۔ تب اُن ستاروں نے جن پر تاریکی چھا چکی تھی ان عظیم الشان انوار سے۔ اسی معنی کی رُو سے۔ روشنی حاصل کرنا شروع کر دی۔ اور اس طرح آسمان ستاروں کی تعداد کے برابر بجلی کے چراغوں سے جگمگا اُٹھا۔ اور ابھی جو خالی خالی محسوس ہو رہا تھا، فرشتوں اور روحانیوں سے بھر گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ متحرک سورج اور ستارے، ایسا لگا جیسے کہ سلطانُ الازل والأبد کے اَن گنت لشکروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ایک انتہائی بلند پایہ نقل وحرکت کی صورت میں سرگرم عمل ہیں اور اس سُلطانِ جلیل کی ربوبیت کی عظمت وحشمت کا اظہار کر رہے ہیں۔

اور میں اپنی تمام قوت کے ساتھ بلکہ اگر ممکن ہوتا اور اگر مجھے سنا تا جائے تو تمام مخلوقات کی ترجمانی کرتا ہوا اپنے وجود کے تمام ذرات کے ساتھ یہ آیت کریمہ تلاوت کر رہا تھا:

﴿اَللّٰهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُورِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبٰرَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلٰى نُورٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُورِهٖ مَنْ يَشَآءُ﴾

میں یہ آیت پڑھ کر واپس لوٹا اور آسمان سے زمین پر اُتر آیا، بیدار ہو گیا۔ اور میں نے کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى نُورِ الْاِيْمَانِ وَالْقُرْآنِ"

چھٹی قسم جو کہ چھٹا رسالہ ہے

[یہ رسالہ قرآن حکیم کے شاگردوں اور خادموں کو بیدار کرنے انہیں دھوکے سے بچانے کے لیے لکھا گیا ہے]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾

یہ چھٹی قسم جن وانس کی چھ سازشوں اور دسیسہ کاریوں کا اِبطال کرتی ہے اور ان کی طرف سے ہونے والے چھ قسم کے حملوں کا راستہ بند کرتی ہے۔ ان شاءاللہ۔

پہلی سازش:

انسانی شیطان جنّی شیطانوں سے حاصل کیے ہوئے سبق کی بنا پر حُبِّ جاہ کے وسیلے سے ''حزب القرآن'' کے ساتھ تعلق رکھنے والے ان فدا کار و جاں نثار خادموں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور انہیں اس مقدس خدمت سے اور اِس بلند پایہ معنوی جہاد سے رُوگرداں کر دینا چاہتے ہیں، اور وہ اس طرح کہ: اہلِ دنیا کے ہر فرد میں تصنّع حب جاہ اور ریا کاری نامی شہرت اور تصنّع کی جُزوی یا کلّی قسم کی خواہش پائی جاتی ہے، اور ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ عام لوگوں کی نظروں میں وہ مقام حاصل کر لے جسے شان وشوکت کہا جاتا ہے۔ اور یہ چیز لوگوں میں اس کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ انسان شہرت پسندی کی اس حرص میں اپنی جان تک گنوا بیٹھتا ہے۔ یہ حس اہلِ آخرت کے لیے انتہائی خطرناک، اہلِ دنیا کے لیے انتہائی پریشان کن، بہت سی بداخلاقیوں کا سرچشمہ اور انسان کی سب سے زیادہ کمزور رگ ہے مطلب یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اگر قابو میں کرنا ہو اور اسے اپنی طرف کھینچنا ہو تو اس کا آسان سا طریقہ یہ ہے کہ اس کے اس احساس کو بھڑکا دو، ایسا کرنے سے انسان اس پر غالب آسکتا ہے اور اسے اپنے ساتھ ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ اس لیے مجھے اپنے بھائیوں کے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ ڈر ہے وہ یہ ہے کہ مُلحد لوگ کہیں ان کی اِس کمزور رگ سے فائدہ نہ اُٹھالیں۔ مجھے یہ صورتِ حال بہت پریشان کرتی ہے؛ کیونکہ ان لوگوں نے اس حربے سے میرے بعض اَوپرے اور ناپختہ کار بھائیوں کو بہکا کر انہیں ہلاکت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ (حاشیہ)

اس لیے اے قرآنی خدمت کے سلسلے میں میرے بھائیو اور دوستو!

(حاشیہ:1) یہ بیچارے اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا؛ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا دل تو اُستاد کے ساتھ ہے نا! حالانکہ جو ملحدین کے دھارے کو مضبوط کرتا ہے اور ان کے پروپیگنڈے کے دھوکے میں آتا ہے بلکہ کبھی لاشعوری طور پر ان کی طرف سے جاسوسی کے لیے بھی استعمال ہو جاتا ہے، اس کا یہ کہنا کہ ''میرا دل استاد کے مسلک کے بارے میں بالکل صاف ہے'' اس مثال کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے: ایک آدمی نماز کے دوران پیٹ کی ہوا کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ نکل ہی گئی اور اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ اسے جب کہا گیا کہ تیری نماز ٹوٹ گئی ہے تو اُس نے کہا: میرا دل تو صاف ہے، نماز کیونکر ٹوٹ گئی؟ مؤلف۔

تم حُبِّ جاہ کا جھانسہ دینے کے لیے آنے والے اہلِ دنیا کے ان سازشی جاسوسوں سے، یا اِن گمراہ لوگوں سے، یا شیطان کے ان شاگردوں سے کہہ دو کہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ رضائے الٰہی، التفاتِ رحمانی اور قبولِ ربّانی ایک ایسا مقام ہے جس کے مقابلے میں لوگوں کی توجہ اور پسندیدگی ایک ذرّے کی حیثیت رکھتی ہے۔

البتہ اگر رحمت کی توجہ ہمیں مل جائے تو ہمارے لیے وہی کافی ہوگی۔ رہی لوگوں کی توجہ تو وہ اس حیثیت سے قابلِ قبول ہوگی کہ وہ رحمت کی اس توجہ کا ایک عکس اور پرَتو ہے، اگر ایسا نہیں تو وہ قطعی طور پر ہماری طلب نہیں بن سکتی؛ کیونکہ وہ قبر کے دروازے پر بجھ جائے گی اور ایک کوڑی کے برابر بھی نہیں رہے گی!

اس حُبِّ جاہ کو اگر لگام نہ دی جائے اور اس کا اِزالہ ممکن ہو تو اس کا رُخ کسی اور طرف کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

اور وہ اس طرح کہ خدمت کے چونکہ بہر کیف اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس لیے دوسرے لوگوں کی دعائیں لینے کی نیت سے اور اُخروی ثواب کمانے کی غرض سے اِس مندرجہ ذیل تمثیل کی بنیاد پر اس حبِّ جاہ کے جذبے کی ایک شرعی جہت بھی ہوسکتی ہے:

فرض کرو کہ ''جامع آیا صوفیا'' بابرکت اور قابل احترام اہلِ فضل و کمال لوگوں سے بھری ہوئی ہے، لیکن چبوترے اور دروازے پر کچھ بیوقوف، د، لونڈے اور بے حیا قسم کے شوریدہ سر لوگ کھڑے ہیں۔ اور مسجد کی کھڑکیوں سے اجنبی سیاح لگے ہوئے ہیں جو لہو و لعب میں مگن ہیں۔

اب ایک شخص مسجد میں داخل ہو اور اس جماعت میں شامل ہو جائے اور انتہائی میٹھے اُسلوب اور خوبصورت آواز میں قرآن کی چند آیتوں کی تلاوت کرے تو ہزاروں حقیقت پسند لوگوں کی آنکھیں اس کی طرف لگ جائیں گی اور وہ حسنِ توجہ اور معنوی دُعا کے ذریعے اس آدمی کو ثواب کا حق دار بنا دیں گے۔ لیکن یہ معاملہ اُن بدمعاش لونڈوں کو بیوقوف ملحدوں کو اور چند اجنبی لوگوں کو پسند نہیں آئے گا۔

لیکن اگر وہ آدمی مسجد میں جا کر جماعت میں شامل ہو کر غُل غپاڑا شروع کر دے اور اُونچی آواز کے ساتھ فحش اور گندے گانے گائے اور ناچنا شروع کر دے تو اُس کے فحاشی پر اُبھارنے کی وجہ سے وہ بیوقوف لونڈے اور بے حیا لوگ خوش ہو جائیں گے۔ اور وہ مسلمانوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر خوش ہونے والے اجنبی لوگوں کی طنزیہ ہنسی اور داد وصول کر لے گا۔ جبکہ اُس عظیمُ الشان بابرکت جماعت کے تمام افراد اُسے کراہت اور تحقیر کی نظر سے دیکھیں گے اور اسے پستیوں کے آخری درجات میں گرا ہوا سمجھیں گے۔

اس مثال کی روشنی میں یہ سمجھیں کہ عالَمِ اسلام اور براعظم ایشیا ایک عظیمُ الشان جامع مسجد ہے، اور اس میں پائے

جانے والے اہلِ ایمان واُصحابِ حقیقت اس میں پائی جانے والی قابلِ احترام جماعت ہے۔ وہ بے حیا قسم کے لونڈے وہ ریا کار لوگ ہیں جو بچگانہ عقلوں کے مالک ہیں، اور وہ شوریدہ سر اور بے شرم لوگ وہ ہیں جن کا نہ کوئی دین ہے نہ مذہب اور اجنبی سیاح وہ اجنبی صحافی ہیں جو بدیسی افکار پھیلا رہے ہیں۔

پس ہر مسلمان کا - اور خاص کر صاحبِ فضل وکمال مسلمان کا - اُس کے مرتبے کے حساب سے اس مسجد میں ایک پُر وقار مقام ہے جو ہر ایک کو نظر آتا ہے اور لوگ اس پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر اُس سے ایسے اعمال و تصرّفات کا صدور ہوتا ہے جن سے اسلام کے رضائے الٰہی اور اخلاص جیسے بنیادی اوصاف کی بُو آتی ہو، اور جن سے قرآنِ حکیم کے سکھائے ہوئے احکام اور قدسی حقائق کے ساتھ گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہو، اور اس کی زبانِ حال معنوی طور پر قرآنی آیات کی تلاوت کر رہی ہو تو وہ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ" والی دعا میں داخل ہو جاتا ہے جو کہ معنوی طور پر عالمِ اسلام کے ہر فرد کی وردِ زبان ہے، اس دُعا میں حصے دار بن جاتا ہے اور اُخوّت کی رُو سے عام اہلِ ایمان کے ساتھ جُڑ جاتا ہے۔ لیکن بعض اہلِ ضلالت کی نظروں میں جو کہ نقصان دہ حیوانات کی ہی ایک قسم ہیں، اور بعض احمقوں کی نظروں میں جو کہ داڑھی والے بچوں کی حیثیت رکھتے ہیں - ایسے لوگوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی!

اور اگر وہ آدمی اپنے ان آباء واجداد سے اور اپنے اُن اسلاف سے منہ پھیر لے جنہیں وہ فخر وشرف کا دارومدار سمجھتا ہے۔ اور اپنے اُن سلف صالحین کا روشن راستہ چھوڑ دے جن پر وہ روحانی طور پر بھروسا کرتا ہے، اور ہوا وہوس کے زیرِ اثر ریاکاری وشہرت کی غرض سے، بدعت والے کاموں اور ایسے اعمال وحرکات میں لگ جائے؛ جو ہوا وہوس سے آلودہ ہوتی ہیں، جن سے غرض ریاکاری اور شہرت ہوتی ہے اور بدعات کا نمونہ ہوتی ہیں، تو وہ آدمی معنوی طور پر تمام اہلِ حقیقت اور اہلِ ایمان کی نظر میں درکِ اسفل میں جا گرتا ہے؛ کیونکہ ایک مومن آدمی کتنا بھی عامی اور جاہل قسم کا ہو، جب اس طرح کے ریاکار لوگوں کو دیکھتا ہے تو اس کے دل کو وہ لوگ مردہ سے لگتے ہیں اور وہ انہیں معنوی طور پر ناپسند کرتا ہے، اگرچہ اس کی عقل اس چیز کا ادراک نہ کر سکے۔ مندرجہ ذیل حدیث میں اس راز کا پتا ملتا ہے:

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ (حاشیہ)

پس یہ دوسرا یعنی حبِّ جاہ کا دیوانہ اور شہرت کی حرص میں مبتلا شخص ایک غیر محدود جماعت کی نظر میں اسفل سافلین میں جا گرتا ہے اور بہت سے بیوقوفوں، مسخروں، بے وقعت اور جذباتی سے لوگوں کی نظروں میں وقتی طور پر منحوس مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کے اردگرد کچھ جھوٹے اور فریب کار دوست ہی رہ جاتے ہیں۔ جو دنیا میں اس کے لیے نقصان کا اور برزخ میں عذاب کا باعث بنیں گے اور آخرت میں اُس کے دشمن ہو جائیں گے۔ جیسے کہ اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿اَلْاَخِلَّاءُ

(حاشیہ) طبرانی الکبیر: (7497)، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم: 97/4۔ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: کشف الخفاء للعجلونی: 42/1۔ مترجم۔

﴿يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾

رہا وہ آدمی جو پہلی صورت میں ہے، اگر چہ وہ اپنے دل سے حبِّ جاہ کو باہر نہ نکالے، تو ایک قسم کا رعب دار اور شرعی معنوی مقام حاصل کر لے گا جو اُس کی حبِّ جاہ والی پھڑکتی ہوئی رگ کو ساکن کر دے گا، بشرطیکہ وہ اخلاص اور رضائے الٰہی کو بنیاد بنالے اور حبِّ جاہ کو اپنا ہدف نہ بنائے۔

یہ آدمی کسی تھوڑی سی بلکہ بہت ہی تھوڑی سی غیر اہم چیز سے محروم ہوگا لیکن اس کے بدلے میں بہت سی انتہائی قیمتی چیزیں پالے گا جن میں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ اپنے آپ سے بہت سے سانپوں کو دور ہٹالے گا اور ان کے بدلے میں بہت سی بابرکت مخلوقات کو اپنا دوست بنالے گا اور ان کے ساتھ مانوس ہو جائے گا۔ یا اپنے آپ سے بہت سی وحشی بھڑوں کو دور کر دے گا اور اس کے بدلے رحمت کا شربت پلانے والی شہد کی مکھیوں کو اپنے قریب کر لے گا اور ان کے ہاتھوں سے شہد پیئے گا، یعنی وہ ایسے دوست پالے گا جو عالمِ اسلام کے اطراف واکناف سے اس کی رُوح کو آبِ کوثر کی طرح بہت سے فیوض وبرکات سے سیراب کر دیں گے اور اپنی دعاؤں کے ذریعے اس کے نامۂ اعمال میں ثواب درج کرتے رہیں گے۔

میں نے ایک دفعہ اس تمثیل کا لبِّ لباب پوری قوت کے ساتھ ایک ایسے چھوٹے سے آدمی کے منہ پر کہہ دیا تھا جو ایک بہت بڑے دنیاوی منصب پر فائز تھا، لیکن شہرت کی حرص میں کسی ایسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھا جس کی وجہ سے اُسے تمام عالمِ اسلام کی طرف سے جگ ہنسائی کا سامنا کرنا پڑا۔

اس تمثیل نے ایک دفعہ تو اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، لیکن میں خود چونکہ اپنے آپ کو حبِّ جاہ سے نہیں بچا سکا تھا اس لیے وہ میرے بیدار کرنے سے بھی بیدار نہ ہو سکا۔

دوسری سازش:

انسان میں خوف کے اِحساس کی جڑیں بہت گہری ہیں، اور ظالم دسیسہ کار لوگ خوف کی اس رگ سے اکثر فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔ اہلِ دنیا کے جاسوس اور اہلِ ضلالت کے نمائندے عوامُ الناس کی اور خاص کر علماء کی اِس دُکھتی رگ سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، چنانچہ وہ انہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں اور طرح طرح کے وہموں کا شکار بنا دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر جیسے ایک مکار سازشی انسان چھت پر کھڑے وہمی آدمی کو کسی نقصان دہ نظر آنے والی چیز سے ڈراتا ہے اور اس کے وہم کو ہوا دے کر اُسے اُلٹے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹاتا جاتا ہے، حتی کہ اسے منڈیر تک پہنچا کر سر کے بل نیچے گرا دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی گردن ٹوٹ جاتی ہے۔

بعینہٖ اسی طرح یہ گمراہ لوگ کرتے ہیں، یہ لوگوں میں بالکل بے معنی سے اَوہام کا جوالا بھڑکا دیتے ہیں اور انہیں خوف زدہ

کر کے اہم ترین کاموں سے دُور ہٹا دیتے ہیں۔ حتّٰی کہ کچھ لوگ مچھر کے ڈنک سے ڈر کر سانپ کے منہ میں جا گھستے ہیں!

ایک دفعہ مجھے استنبول میں شام کے وقت محلّہ ''سلطان ایوب'' جانا پڑا (حاشیہ)

میرے ساتھ ایک بڑا معتبر اور معزز آدمی بھی تھا جو کشتی پر سوار ہونے سے ڈرتا تھا۔ چنانچہ ہم پُل تک آ گئے، لیکن اس وقت کوئی گاڑی وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم کشتی پر بیٹھنے کے لیے مجبور تھے۔ اس لیے میں نے اِصرار کیا اور زور دے کر کہا کہ: ہمیں کشتی پر بیٹھنا ہی ہوگا۔ تو اُس نے کہا:

میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ڈوب نہ جائیں؟

میں نے کہا: اس خلیج میں تقریباً کتنی کشتیاں ہوں گی؟

اس نے کہا: ہزار کے لگ بھگ تو ہوں گی۔

میں نے کہا: ایک سال میں کتنی کشتیاں ڈوب جاتی ہیں؟

اُس نے کہا: ایک دو ہی اور کبھی ایک بھی نہیں۔

میں نے کہا: ایک سال میں کتنے دن ہوتے ہیں؟

اُس نے کہا: تین سو ساٹھ

میں نے کہا: غرق ہو جانے کا ڈر آپ کے ذہن پر سوار ہو چکا ہے اور آپ کو خوفزدہ کر رہا ہے، ڈوبنے کے ساٹھ ہزار تین سو احتمالات میں سے ایک ہی احتمال ہے، اور اس طرح کے احتمال سے ڈرنے والے آدمی کا شمار انسانوں میں ہو سکتا ہے نہ حیوانوں میں!

پھر میں نے کہا: آپ کے حساب سے آپ کی زندگی اور کتنی ہے؟

اس نے کہا: موت کا احتمال ہر دن موجود ہے؛ کیونکہ اجل پوشیدہ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت کا احتمال ان تین ہزار چھ سو دنوں میں سے ہر دن میں موجود ہے۔ اب آپ کے سامنے کشتی کے معاملے کی طرح تین لاکھ احتمالات میں سے ایک نہیں بلکہ صرف تین ہزار احتمالات میں سے ایک احتمال ہے، اور ہو سکتا ہے کہ۔ وہ احتمال آج ہی واقع ہو جائے اور آپ آج مر جائیں! اس لیے جناب آپ پر لرزہ طاری ہو جانا چاہیے اور آپ کو رونا چاہیے اور وصیت لکھ دینی چاہیے!

میری ان باتوں کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا، اُس کی ہوش ٹھکانے لگی اور میں نے اُسے ہانپتے کانپتے کشتی میں بٹھا دیا۔

پھر میں نے کشتی میں اُس سے کہا:

''اللہ تعالیٰ نے ہمیں خوف کا شعور زندگی کو بچانے کے لیے بخشا ہے نہ کہ زندگی کو تباہ کرنے کے لیے! اور یہ خوف اس نے ہمیں ہمارے لیے ہماری زندگی کو بوجھل، دوبھر، کرب ناک، دُکھی اور دشوار بنانے کے لیے عطا نہیں کیا ہے۔ پس خوف

(حاشیہ) سلطان ایوب سے مراد حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

اگر دو، تین یا چار بلکہ چھ یا سات احتمالات میں سے ایک احتمال ہو تو کوئی حرج نہیں، بلکہ احتیاط اور چوکنے پن کے نقطۂ نظر سے اسے شرعی خوف کہنا بھی صحیح ہوگا۔ لیکن یہی خوف اگر بیس یا چالیس احتمالات میں سے ایک احتمال کی نسبت سے پیدا ہو جائے تو فقط وہم ہوگا جو زندگی کو اجیرن بنا کر رکھ دے گا!

پس اے میرے بھائیو! یہ ریاکار ملحد لوگ اگر تمہیں ڈرا دھمکا کر اس مقدس معنوی جہاد سے روگرداں کرنا چاہیں تو ان سے کہہ دو کہ:

ہم ''حزب القرآن'' ہیں، اور ہم: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ کے راز کی رُو سے قرآن کے محفوظ قلعے میں ہیں، اور ہمارے اس قلعے کے اِردگرد ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ کی محکم فصیل ہے۔ اس لیے تم لوگ ہماری اس چھوٹی سی فانی زندگی کو معمولی سا نقصان پہنچانے والے لاکھوں احتمالات میں سے صرف ایک آدھ احتمال کے ڈر سے ہمیں زبردستی ہمارے اپنے اختیار سے کسی ایسے راستے پر نہیں ڈال سکتے جو ہماری ابدی زندگی کے لیے سو فیصد نقصان دہ ہے۔ اور ان سے یہ بھی کہہ دو کہ:

راہِ حق کے مسافروں میں سے ہم یا ہم جیسا وہ کون ہے جس نے ''سعید نورسی'' کی وجہ سے کوئی پریشانی اُٹھائی ہو جو کہ قرآنی خدمت کی راہ میں ہمارے ساتھی اور اس مقدس خدمت کی تدبیریں کرنے میں ہمارے استاد اور معلم ہیں؟ اور اُن کے خصوصی شاگردوں میں سے وہ کون ہے جو اُن کی وجہ سے مصیبت میں پڑا ہو جس کی وجہ سے ہمیں بھی خطرہ ہو کہ کہیں ہم بھی اس مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں یا اس بنا پر خوف و اضطراب میں مبتلا رہیں کہ کہیں ہم پر بھی کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے؟ کیونکہ ہمارے اس بھائی کے تو ہزاروں اُخروی بھائی اور دوست ہیں اور ہم نے کسی سے کبھی یہ بات نہیں سُنی ہے کہ وہ اُس کی وجہ سے تکلیف اٹھاتا ہے، حالانکہ وہ بیس تیس سال دنیاوی معاشرتی زندگی میں مؤثر انداز میں بھرپور حصہ لیتا رہا ہے اور اُس کے ہاتھ میں سیاست کی مضبوط لاٹھی بھی تھی، جبکہ اب صورت حال یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں اُس لاٹھی کی بجائے حقیقت کا نور ہے! حالانکہ ان لوگوں نے 31 مارچ (حاشیہ) والے واقعہ میں اس کا نام بھی لکھ دیا تھا اور اس کے بعض

(حاشیہ) یہ واقعہ 13 اپریل 1909ء میں پیش آیا، ہوا یہ کہ 13 اپریل کی درمیانی شب کو ترکی فوج کی پہلی آرمی کور کے دستوں نے بغاوت کر دی اور اپنے افسروں پر قابو پالیا اور علماء کی سرکردگی میں ایا صوفیہ کے میدان میں پہنچ گئے جس کے پاس پارلیمنٹ کی عمارت واقع تھی۔ اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ شریعت نافذ کی جائے، وزیرِ جنگ اور ایوانِ صدر احمد رضا کو برطرف کیا جائے، کابینہ توڑ دی جائے اور لڑکیوں کے مدرسوں کو بند کرنے والوں کو اور بے دین لوگوں کو سزا دی جائے وغیرہ۔۔۔ استاد نورسی نے اس بغاوت کو فرو کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ فوج نے محمود شوکت پاشا کی قیادت میں اس بغاوت پر قابو تو پالیا لیکن سلطان عبدالحمید کو سازش کے الزام میں 7 اپریل 1909 کو معزول کر کے ان کے چھوٹے بھائی محمود رشاد کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ یہ حادثہ عثمانی ترکی میں مروجہ یونانی تقویم کی رُو سے 31 مارچ کا واقعہ کہلاتا ہے۔ اس واقعے سے اسلامی تحریک کو بہت نقصان پہنچا۔ اسے 31 مارچ کا حادثہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ رومی کیلنڈر کے حساب سے 31 مارچ کو پیش آیا تھا۔ رومی کیلنڈر میں سال 31 مارچ کو شروع ہوتا ہے، اور عثمانی سلطنت کے اواخر میں رومی کیلنڈر ہی مروج و مستعمل تھا۔ مترجم۔

دوستوں کو اس میں سزا بھی دے دی تھی لیکن انہیں بعد میں پتا چل گیا تھا کہ اس حادثے کے پیچھے کچھ دوسرے لوگوں کا ہاتھ تھا اور اس کے دوستوں نے پریشانی اس کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس کے دشمنوں کی وجہ سے اٹھائی تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اُس نے اُس وقت اپنے بہت سے دوستوں کو بچایا بھی تھا۔

اس بنا پر تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم ان ریاکار گمراہ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے دھتکار دو اور ان کی باتیں ان کے منہ پر مار دو کہ:

تم جیسے شیطانوں کے ذہن میں یہ بات کبھی بھی نہیں آنی چاہیے کہ ہلاکت کے خوف کے ہزار نہیں ہزاروں احتمالات میں سے ایک بھی احتمال کے ذریعے ہمارے ہاتھوں سے ابدی خزانہ نہیں چھینا جا سکتا ہے!

اور ان ریاکاروں سے یہ بھی کہہ دو کہ:

ہزاروں احتمالات میں سے ایک احتمال تو رہا ایک طرف، سو میں سے سو احتمالات کے ساتھ بھی اگر کوئی خطرہ موجود ہو، اور ہمارے پاس ذرہ برابر بھی عقل ہو تو پھر بھی ہم ڈر کر بھاگنے والے اور اُس کو چھوڑنے والے نہیں ہیں، کیونکہ بارہا دفعہ کے تجربات کے ذریعے یہ بات مشاہدے میں آ چکی ہے اور مسلسل مشاہدے میں آ رہی ہے کہ نازل ہونے والی مصیبت پہلے پہل ان لوگوں کے سر پر نازل ہوتی ہے جو خطرے اور مصیبت کے وقت اپنے بڑے بھائی اور اُستاد کی توہین کرتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے ساتھ بے رحمانہ سلوک ہوتا ہے اور انہیں پاگل شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اُن کے اجساد اور ان کی روحیں ذلت و رسوائی کے عالم میں مر جاتی ہیں۔ اور جو لوگ ان کو سزائیں دیتے ہیں وہ ان پر ترس نہیں کھاتے؛ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ:

ان لوگوں نے چونکہ اپنے مشفق و مہربان اُستاد کے ساتھ خیانت کی ہے اس لیے یہ انتہائی پست اور وہیں، ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک ہی ہونا چاہیے نہ کہ رحمت خیز۔

تو حقیقت جب یہی ہے، اور کوئی ظالم جب کسی کو زمین پر گرا کر اپنے پاؤں کے ساتھ اس کا سر کچلنا چاہے۔ اور زمین پر پڑا ہوا آدمی اس وحشی ظالم آدمی کے پاؤں کو چومنا شروع کر دے، تو یاد رکھو کہ اس ذلت کی وجہ سے سر سے پہلے اُس کا دل کچلا جائے گا اور اس کے جسم سے پہلے اس کی روح مر جائے گی۔ چنانچہ اس کا سر جاتا رہے گا اور اس کی عزت اور شرف کا صفایا ہو جائے گا؛ کیونکہ وہ اُس بے رحم ظالم درندے کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا اظہار کر کے اسے اور دلیر بنا رہا ہے۔

حالانکہ اگر وہ مظلوم اُس ظالم کے منہ پر تھوک دیتا تو اپنے دل اور اپنی روح کو بچا لیتا اور اس کا جسم مظلوم شہید بن جاتا۔

جی ہاں؛ ان ظالموں کے بے شرم چہروں پر تھوک دو۔

جن دنوں انگریزوں نے استنبول کے ورّے کی توپوں کو تباہ کر کے استنبول پر قبضہ کر لیا تھا اُن دنوں انگلیکان جو کہ اُس حکومت کا سب سے بڑا دینی مرکز تھا۔ کے چرچ کے سب سے بڑے بشپ کی طرف سے مشائخِ اسلام سے چھ عدد دینی

سوال پوچھے گئے میں ان دنوں دارُ الحکمۃ الاسلامیۃ‘(حاشیہ) میں ایک رکن کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ مشائخ نے ان سوالوں کے جواب دینے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی اور کہا کہ وہ ان چھ سوالوں کے جواب صرف چھ سو کلمات میں مانگتے ہیں! تب میں نے کہا:

ان سوالوں کے جواب میں چھ سو کلمات کے ساتھ، چھ کلمات کے ساتھ یا ایک کلمے کے ساتھ بھی نہیں بلکہ ایک دفعہ تھوکنے کے ساتھ دوں گا؛ کیونکہ اس حکومت نے۔ جیسے کہ تم دیکھ بھی رہے ہو۔ ہماری گردن اپنے پاؤں کے ساتھ روندی ہے اس لیے اس کے بشپ کے اس غرور بھرے لہجے کے ساتھ سوال کرنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر تھوکنا ضروری ہے! چنانچہ میں نے اُس وقت کہا تھا:

”اِن ظالموں کے ان چہروں پر تھوک جن میں رحم کا مادہ نہیں ہے“۔

اور اب میں کہتا ہوں میرے بھائیو! انگلستان جیسی جابر حکومت جن دنوں ہمارے ملک پر قبضہ کر چکی تھی اور موت کا خطرہ سو فیصد موجود تھا، میں نے اُن دنوں میں ان کا مقابلہ پریس کی زبان میں کیا تھا اور انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا لیکن وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے کیونکہ میں قرآن کی حفاظت میں تھا اور یہ حفاظت مجھے ہاتھوں سے پہنچنے والی تکلیف کہ جس کا صرف ایک فیصد احتمال ہے، اُس کے لیے تمہیں بھی یہ قرآنی حفاظت کافی ہے۔

پھر میرے بھائیو یہ بھی ہے کہ:

تم میں سے اکثر لوگ فوج میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ جو لوگ فوج میں نہیں گئے وہ تو مجھ سے قطعی طور پر سن چکے ہیں، اور جن لوگوں نے نہیں سنا وہ مجھ سے سن لیں کہ:

جنگ میں عام طور پر زخمی وہی ہوتے ہیں جو اپنے مورچوں سے نکل کر بھاگ اُٹھتے ہیں۔ اور سب سے کم زخم ان لوگوں کو آتے ہیں جو اپنی کمین گاہوں میں ڈٹے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ﴾

اپنے اشاری معنی کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موت سے بھاگنے والے اُس کا سامنا دوسروں سے زیادہ کرتے ہیں۔

تیسری شیطانی سازش:

یہ لوگ بہت سے لوگوں کا طمع و لالچ کے جال سے شکار کرتے ہیں۔ ہم یہ بات بہت سے رسائل میں قرآن حکیم کی

(حاشیہ) ”دار الحکمۃ الاسلامیۃ“ ایک قسم کی علمی اکیڈمی تھی جس سے اسماعیل حقی ازمیرلی، المالیلی حمدی، عمر فرید قام اور شاعر اسلام محمد عاکف جیسے ممتاز اہل علم وابستہ تھے۔ محمد عاکف اس کے سیکرٹری تھے۔ مترجم۔

آیات وبیّنات سے حاصل کردہ قطعی براہین کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ: رزقِ حلال اختیار واقتدار کے حساب سے نہیں بلکہ عجز وافتقار کے حساب سے آتا ہے۔

اس حقیقت پر غیر محدود سے اشارات، علامات اور دلائل دلالت کرتے ہیں، ان میں سے:

ایک یہ ہے کہ:

درخت جو کہ جانداروں کی ہی ایک قسم ہیں اور رزق کے محتاج ہیں اپنی جگہ پر سیدھے کھڑے رہتے ہیں اور ان کا رزق ان تک بھاگتا چلا آتا ہے، اس کے برعکس حیوانات اپنی حرص اور رزق کے پیچھے باؤلے ہو کر بھاگتے رہنے کیوجہ سے درختوں کی طرح غذا اور کامل نشوونما حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔

اسی طرح مچھلیاں جو کہ انتہائی بلیدُ الذہن ہیں، عاجز اور کمزور ہیں اور ریت میں زندگی گزارتی ہیں، وہ مکمل غذا سے بہرہ ور اور عمومی طور پر موٹی تازی نظر آتی ہیں اور بندروں اور لومڑیوں جیسے ذہین اور مقتدر جانور اپنی سوئے معیشت کی وجہ سے بالکل کمزور اور مریل سے ہوتے ہیں!

یہ چیز بھی اس بات کی دلیل ہے کہ رزق کا وسیلہ افتقار ہے اقتدار نہیں۔

پھر تمام بچوں کی معیشت کا- وہ بچے انسانوں کے ہوں یا حیوانوں کے- خوبصورت انتظام اور ان کی کمزوری اور عاجزی پر ترس کھاتے ہوئے انہیں خزینۂ رحمت سے ایسے خوبصورت طریقے سے دودھ جیسا لطیف تحفہ مہیا کرنا، اور وحشی درندوں کی معیشت کا تنگ اور دشوار ہونا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رزقِ حلال کا وسیلہ عجز وافتقار ہے ذہن واقتدار نہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ رزق کے پیچھے یہودی سب سے زیادہ بھاگتے ہیں اور اس حرص میں وہ دنیا کی سب قوموں سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ ذلت، پستی، رسوائی اور سوءِ معیشت کا سامنا کرتے ہیں حتی کہ ان میں سے امیر ترین لوگ بھی ذلیل ترین زندگی گزارتے ہیں یاد رہے کہ اُن کی سود اور اس جیسے دیگر غیر شرعی راستوں سے حاصل کی ہوئی بے پناہ دولت کو دیکھ کر ہمارے اس مسئلے پر جرح نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ رزقِ حلال نہیں ہے!

پھر بہت سے علماء واُدباء کا تنگدست ہونا اور بہت سے ناسمجھوں بیوقوں اور نامعقولوں کا صاحبِ ثروت اور مالدار ہونا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جلبِ رزق کا دارومدار ذہن واقتدار نہیں بلکہ عجز وافتقار، توکل بھری تسلیم ورضا اور زبانِ حال وزبانِ فعل سے کی جانے والی دعا ہے۔

آیت کریمہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ جو کہ اس حقیقت کو وا شگاف کر رہی ہے، ہمارے اس دعوے

کے لیے ایک اتنی قوی، مضبوط اور ٹھوس برہان کی حیثیت رکھتی ہے؛ کہ تمام نباتات وحیوانات اور تمام بچے اور رزق کے طالب تمام گروہ زبانِ حال سے اس کی تلاوت کر رہے ہیں۔

پس رزق جب مقدر رہے، اور یہ اَزراہِ احسان ملتا ہے، اور مُحسن اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہے، تو پھر اپنے ضمیر کو بلکہ اپنے بعض مقدس اوصاف کو رشوت کھلا کر اور بے غیرتی کا مظاہرہ کر کے بے برکت منحوس حرام مال قبول کرنے والے کو کچھ تو سوچنا چاہیے کہ وہ ایسا کر کے اللہ کی رحمت کو مُتّہم کر رہا ہے اور اس کے فضل وکرم کی توہین کر رہا ہے۔ اُسے سوچنا چاہیے کہ یہ روش کتنے بڑے پاگل پن کی آئینہ دار ہے!

جی ہاں، اہلِ دنیا اور خاص کر اہلِ ضلالت اپنی نقدی سستے میں نہیں دے دیتے ہیں بلکہ اُسے بڑے مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں؛ کیونکہ ایک مال دنیا کی زندگی کو تو ایک سال کے لیے کسی حد تک سہارا دے سکتا ہے، لیکن ایک غیر محدود ابدی زندگی کو تباہ و برباد کرنے کا وسیلہ بن سکتا ہے، چنانچہ وہ اس حرص کے ذریعے اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے اور اہلِ ضلالت کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش میں ہے!

پس اے میرے بھائیو!

یہ ریاکار اہلِ دنیا اور منافق طبع اہلِ ضلالت اگر تمہیں انسان کی طمع ولالچ جیسی کمزور رگ سے فائدہ اُٹھا کر بہکانا چاہیں تو مذکورہ حقیقت میں غور کرنا اور اپنے اس فقیر بھائی کو نمونہ بنالینا۔

میں تمہیں اپنی پوری قوّت کے ساتھ یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ قناعت وکفایت شعاری تمہاری زندگی کو دوام بخش دیں گے اور تمہارے لیے روٹین کی تنخواہ سے بڑھ کر رزق کی ضمانت دے دیں گے۔ اور یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھو کہ تمہیں دیے جانے والے غیر شرعی پیسے تم سے اپنے بدلے میں ہزاروں گنا زیادہ قیمت مانگیں گے۔ اور وہ تمہیں اُس قرآنی خدمت سے روک دیں گے جس میں گزرنے والی ہر گھڑی تمہارے لیے ابدی خزانوں کے دروازے کھول سکتی ہے، یا کم اَز کم تمہارے اندر سستی اور بے دلی پیدا کر دیں گے!

اور یہ چیز بہت زیادہ نقصان دے گی اور ایسا خلا پیدا کر دے گی جسے تمہاری ہزاروں ماہانہ تنخواہیں بھی پُر نہیں کر سکیں گی۔

تنبیہ:

قرآن کریم سے استفادہ کر کے ہم جو ایمانی اور قرآنی حقائق نشر کر رہے ہیں، یہ اہلِ ضلالت چونکہ اُن کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں، اس لیے منافقت اور دسیسہ کاری کا سہارا لے کر مکر وفریب کے جال پھیلاتے ہیں اور حبِّ جاہ، طمع اور خوف جیسے مختلف طریقے اختیار کر کے میرے دوستوں کو مجھ سے دُور کرنا چاہتے ہیں اور میرے

خلاف سازشیں کر کے اور میری اہمیت گھٹا کر انہیں میرے خلاف بھڑکانا چاہتے ہیں۔

ہماری ہر حرکت ہمیشہ مثبت ہوتی ہے، لیکن افسوس کہ ہر اچھے کام کے آگے آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی ذمہ داری کبھی کبھار ہمیں منفی حرکت پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس لیے میں اپنے بھائیوں کو سابقہ تین نقطوں کے ذریعے اہلِ نفاق کے پُر فریب پروپیگنڈوں کے خلاف بیدار کر رہا ہوں اور اُن پر ہونے والے حملے کا دفاع کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔

ان دنوں سب سے بڑا حملہ خود میری شخصیت پر کیا جا رہا ہے، چنانچہ وہ کہہ رہے کہ: ''سعید'' تو ''کردی'' ہے، تم لوگ اس کا احترام کیوں کر رہے ہو اور اس کی پیروی کیوں کر رہے ہو؟۔ اس بنا پر میں صرف ان جیسے لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً ''پرانے سعید'' کی زبان میں ''چوتھی شیطانی سازش پر قلم اُٹھا رہا ہوں۔

چوتھی شیطانی سازش:

کچھ ملحد لوگ جو اہم عہدوں پر فائز ہیں شیطانوں کے سکھائے ہوئے اور گمراہوں کے بتلائے ہوئے پروپیگنڈوں کے تحت میرے بھائیوں کو فریب دینے کے لیے اور ان کے اندر قومی عصبیت کی رگ بھڑکانے کے لیے مجھ پر حملہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تم لوگ ترک ہو اور ترکوں میں اللہ کے فضل سے ہر قسم کے علماء اور اہلِ کمال پائے جاتے ہیں۔ اور یہ ''سعید'' کردی ہے۔ اس لیے ایسے شخص کے ساتھ تعاون کرنا جو تمہاری قوم برادری کا نہیں، قومی غیرت وحمیت کے منافی ہے''۔

الجواب: ارے بد بخت ملحد! میں بحمد اللہ مسلمان ہوں اور میری مقدس ملت کے ہر دور میں ساڑھے تین سو ملین افراد رہے ہیں۔ اور میں اس بات سے لاکھ بار پناہ مانگتا ہوں کہ میں ان ساڑھے تین سو ملین بھائیوں کو جو کہ اس طرح کی ابدی اخوت کی بنیاد رکھ رہے ہیں، اپنی دعاؤں کے ساتھ میری مدد کر رہے ہیں اور ان میں مطلق اکثریت کردوں کی ہے؛ میں پناہ مانگتا ہوں کہ ایسے بھائیوں کو نسل وقو   ی کے اس منفی نظریے کی بھینٹ چڑھا دوں! اور ان لاتعداد بابرکت بھائیوں کے بدلے میں ان معدودے چند لوگوں کو لے لوں جن کا کوئی دین مذہب نہیں ہے۔ اپنے آپ کو کردی کہلواتے ہیں اور اُن کا شمار کرد نسل میں ہوتا ہے!

پس اے مُلحد! اس طرح کے کام تیرے جیسے احمق لوگ ہی کرتے ہیں، کہ کفار (ہنگرین) کی، اور چند یورپ زدہ ملحد اتراک کی اس دنیا کے حساب سے بھی بالکل بے فائدہ، وقتی اور عارضی سی اخوت حاصل کرنے کے لیے ساڑھے تین سو ملین لوگوں پر مشتمل جماعت کی نفع خیز، تابندہ اور حقیقی اخوت کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ہم نے منفی قومیت کی ماہیت اور اس کے نقصانات کو ''چھبیسویں مکتوب'' کے تیسرے مسئلے میں دلائل کی روشنی میں

بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اس لیے اسی کے حوالے کو کافی سمجھتے ہیں۔ البتہ اس مقام پر ہم اس تیسرے مسئلے کے آخر میں آنے والی ایک حقیقت کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں؛ کیونکہ اس میں کچھ اجمال پایا جاتا ہے، اور وہ اس طرح ہے کہ:

میں تُرک قومیت کے پردے میں ترکوں سے دشمنی کرنے والے اِن بے غیرت اور حمیّت فروش ملحدوں سے کہتا ہوں کہ:

میرا دینِ اسلام کی غیرت وحمیت اور حقیقی ابدی اُخوت کے تحت وطن عزیز کے اُن اہلِ ایمان کے ساتھ بڑا مضبوط اور حقیقی تعلق ہے جنھیں ''تُرک'' کہا جاتا ہے۔ اور میں پورے فخر واعتزاز کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھے اپنے اُن اَبنائے وطن کے ساتھ اسلام کی وجہ سے گہری محبت ہے جنھوں نے ایک ہزار سال تک اسلام کا جھنڈا فاتح بن کر چہار دانگ عالم میں لہرائے رکھا۔

لیکن تُو اے ریا کار اور چاپلوس ایجنٹ!

تیری اُخوت اتنی مجازی اور قومیت اتنی وقتی، عارضی اور مطلبی ہے کہ تجھے ''ترکوں'' کے حقیقی قومی مفاخر یاد ہی نہیں آنے دیتی۔ میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ:

کیا ترک قوم فقط بیس سے چالیس سال کے درمیان کے چند ہوس پرست، بے سُدھ اور عیش کوش جوانوں کا نام ہے؟

وہ مصلحت اور خدمت جس کا تقاضا اُن کے لیے قومی غیرت کرتی ہے، کیا وہ افرنگی تربیت میں پنہاں ہے جو انہیں وقتی طور پر ہنسا کر بڑھاپے میں رُلانے کے لیے غافل بنا رہی ہے اور حرام کاریوں پر شیر کر رہی ہے؟

قومی غیرت وحمیت اگر اسی چیز کا نام ہے اور ترقی اور زندگی کی سعادت اگر اسی کو کہتے ہیں۔۔۔ اور اگر تُو اسی طرح کا ترکی قوم پرست ہے اور اسی طرح کا جوشیلا محبِّ وطن ہے تو میں اس طرح کی ترکی قومیت سے دور بھاگتا ہوں اور تجھے بھی مجھ سے دور بھاگنا چاہیے۔

اور اگر تجھ میں ذرّہ برابر بھی شعور، انصاف اور حقیقی غیرت موجود ہے تو پھر درج ذیل تقسیمات پر نظر کرو اور اُن کا جواب دو:

اس وطن کے بیٹے جنھیں ''تُرک'' کہا جاتا ہے، چھ قسم کے ہیں:

پہلی قسم	صالحین اور اہلِ تقویٰ ہیں
دوسری قسم	بیمار اور مصیبت زدہ لوگوں کا گروہ ہے

تیسری قسم	بوڑھے لوگوں کا گروہ ہے
چوتھی قسم	بچوں کا گروہ ہے
پانچویں قسم	فقراء وضعفاء کا گروہ ہے
چھٹی قسم	نوجوانوں کا گروہ ہے

کیا پہلے پانچ گروہ ''اتراک'' نہیں؟ کیا اِن میں قومی غیرت نہیں پائی جاتی؟ کیا قومی غیرت صرف اس چیز کا نام ہے کہ چھٹے گروہ کی بدمست خوشیوں کو تحفظ دینے کے لیے باقی پانچ گروہوں کو تکلیف دی جائے، ان کا امن وسکون سلب کرلیا جائے اوران کا اطمینانِ قلب برباد کردیا جائے؟ یہ قومی غیرت ہے یا قوم دُشمنی؟ کیونکہ جو شخص اکثریت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ بلاشبہ دُشمن ہے دوست نہیں، کیونکہ حُکم اکثریت کو سامنے رکھ کر لگایا جاتا ہے۔

پس میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ: پہلی قسم والے اہلِ ایمان واہلِ تقویٰ سوادِاعظم کی مصلحتِ کبریٰ فرنگی تہذیب میں ہے؟ یا اُس راہِ حق میں گامزن رہنے میں ہے جس کے ساتھ وہ عشق کرتے ہیں اور جس کے وہ مشتاق ہیں؟ فرنگی تہذیب میں ہے یا ایمانی حقائق کی برکت سے ابدی سعادت کے بارے میں غور وفکر کرتے ہوئے حقیقی تسلی پانے میں ہے؟ یادرکھو کہ تمہارے جیسے گمراہ قسم کے ایجنٹ جس مسلک پر چل رہے ہیں وہ متقی اہلِ ایمان کے معنوی انوار کو بجھادیتا ہے اوران کی حقیقی تسلی کا ستیاناس کردیتا ہے، اورانہیں دکھاتا ہے کہ موت معدوم ہوجانے کا اور قبر ہمیشہ کے لیے دائمی فراق کا دروازہ ہے۔

اور کیا دوسری قسم والے یعنی زندگی سے نااُمید بیمار اور مصیبت زدہ لوگوں کی مصلحت الحادبھری فرنگی تہذیب کی تربیت میں ہے؟ جبکہ یہ بیچارے تو روشنی اور تسلی کے متلاشی ہیں اور اپنے آلام ومصائب کا بدلہ چاہتے ہیں، ظالموں سے انتقام لینا چاہتے ہیں، اور جس قبر کے دروازے کے قریب وہ پہنچ چکے ہیں اُس کے خوف وہراس کو دور کرنے کی آرزو میں ہیں! لیکن تم اور تمہارے ہمنوا لوگ اپنی اس جھوٹی اور بناوٹی غیرت وحمیت کی آڑ میں اس شفقت، تسلی اور حوصلہ افزائی کے محتاج بےنوا مصیبت زدگان کے دلوں پر بےرحمی کے ساتھ مزید چھریاں چلارہے ہو، ان کے سروں پر ہتھوڑے برسارہے ہو، ان کی اُمیدیں توڑرہے ہو اورانہیں مطلق مایوسیوں کے گھاٹ اُتار رہے ہو! کیا قومی حمیت اسی کو کہتے ہیں؟ اور تم لوگ اپنی قوم کی خدمت اسی طرح کرنا چاہتے ہو؟

اور تیسری قسم والے یعنی بوڑھے لوگ قوم کا ایک تہائی حصہ ہیں، یہ لوگ آہستہ آہستہ قبر کی طرف سرک رہے ہیں اور موت کے قریب ہورہے ہیں، دنیا سے دُور ہٹ رہے ہیں اور آخرت کے ساتھ مل رہے ہیں، اب یہ بتاؤ کہ ایسے لوگوں کی مصلحت، ان کی روشنی اوران کی تسلی ''چنگیز خان اور ہلاکو خان'' جیسے ظالم غدّار لوگوں کی تاریخ سننے میں ہے؟ یا تمہارے ان

کرتوتوں میں ہے جنہیں بظاہر ترقی کا نام دیا جاتا ہے لیکن معنوی طور پر وہ سقوط اور گراوٹ ہی گراوٹ ہے، جو آخرت کو بھلا دیتی ہے، اور دنیا کے ساتھ جوڑ دیتی ہے، اور جو بالکل ہی بے نتیجہ و بے ثمر ہے؟ اور کیا اُخروی نُور سینما میں ہے؟ کیا حقیقی تسلی تھیٹر اور سٹیج ڈراما میں ہے؟

اور یہ بوڑھے کمزور لوگ ان ''غیرت مندوں'' سے غیرت و حمیّت کے تحت جب احترام و توقیر کا مطالبہ کرتے ہیں تو انہیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ تم ابدی طور پر نیست ہو جانے کے لیے جا رہے ہو اور قبر کا دروازہ جسے وہ بابِ رحمت سمجھتے ہیں، اس دروازے کو وہ اژدھے کے کھلے ہوئے مُنہ کی شکل دے دیتے ہیں جو ان بوڑھوں کو نگل جائے گا اور ان کی کہانی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اور ان کے معنوی کانوں میں یہ پھبتی کر دیتے ہیں کہ تم اُسی جانب چلے جا رہے ہو۔ ان بیچاروں کو ایسی باتیں کہنا انہیں معنوی چھری کے ساتھ ذبح کرنے کے مترادف ہے۔

یہ چیز اگر قومی غیرت ہے تو اس جیسی غیرت سے لاکھ بار اللہ کی پناہ!

رہا چوتھا گروہ یعنی بچے، تو وہ اس قومی حمیّت سے رحمت کے طلبگار اور شفقت کے منتظر ہیں۔

ان میں جو ضعف و عجز اور عدمِ اقتدار ودیعت کر دیا گیا ہے اس کی بنا پر صاحبِ رحمت و قدرت خالق کی معرفت کی برکت سے اُن کی روحیں پھلتی پھولتی ہیں اور ان کی استعدادیں اور قابلیتیں پوری سعادتمندی کے ساتھ نشو و نما پاتی ہیں۔ ان معصوموں کو اگر اُس ایمانی توکّل اور اسلامی تسلیم کی تلقین کی جائے جو انہیں دنیا میں پیش آنے والے ہولناک حالات کا معاملہ کرنے کے قابل بنا دے تو یہ بھی زندگی کو ذوق و شوق کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔

اب یہ بتاؤ کہ کیا یہ چیز جدید تہذیب و تمدّن کی ترقیات کی تعلیم و تدریس میں ہے جو ان بچوں کے ساتھ بہت کم سرد کار رکھتی ہیں؟ یا خالص مادی فلسفیانہ دساتیر کی تعلیم و تدریس میں ہے جو روشنی سے عاری ہیں، جو ان بچوں کی روحوں کے چراغ بجھا دیتے ہیں اور ان کی معنوی قوت کو توڑ دیتے ہیں؟

کیونکہ انسان اگر فقط حیوانی جسم کا نام ہی ہوتا اور اس کے سر میں عقل نامی کوئی چیز نہ ہوتی تو پھر یہ بات ممکن تھی کہ یہ افرنگی اسالیب جنہیں تم تمدّنی تربیت کہتے ہو کچھ سودمند ثابت ہوتے، تم لوگ انہیں قومی تربیت کے رنگ میں رنگ دیتے اور یہ ان معصوم بچوں کا کچھ وقت کے لیے دل بہلا دیتے، اور کھلونوں کی طرح ان کی تفریح خاطر کا سامان بن کر ان کے لیے کچھ فائدہ مند ثابت ہو جاتے۔

یہ معصوم بچے چونکہ عنقریب دوسرے انسانوں کی طرح زندگی کے میدان میں اُترنے والے ہیں اور گردش ہائے روزگار کا سامنا کرنے والے ہیں، اس لیے بلاشبہ ان کے چھوٹے چھوٹے دلوں میں لمبی لمبی اُمیدیں سر اُٹھائیں گی اور ان کے چھوٹے چھوٹے سروں میں بہت سے مقاصد جنم لیں گے؛ اس لیے ان کے آخری درجے کے عجز و فقر کو سامنے رکھ کر

ان پر شفقت و مہربانی کے نقطۂ نظر سے یہ ضروری ٹھہرا کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی صورت میں ان کے دلوں میں ایک قوی درجے کا اور کبھی خشک نہ ہونے والا نقطۂ استناد اور نقطۂ استمداد مضبوط کر کے بٹھا دیا جائے اُن کے ساتھ مہربانی کے برتاؤ کا یہی ایک واحد طریقہ ہے۔ وگرنہ ان پر صرف قومی غیرت کی مستی کے نام سے مہربانی کرنے کا ڈھونگ اِن بیچارے معصوموں کو ذبح کر دینے کے مترادف ہے، بالکل اُس سودائی ماں کی طرح جو اپنے بچے کو چھری سے ذبح کر ڈالتی ہے۔ اُن کی پرورش اور معصوموں کے حق میں سراپا ظلم اور وحشی قسم کی غداری ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی آدمی بچے کے جسم کو نشو و نما دینے کے لیے اُسے اس کا دل اور دماغ نکال کر کھلا دے!

پانچواں گروہ فقراء و ضعفاء کا ہے۔ اب یہ فقراء جو اس فقر کی وجہ سے انتہائی المناک طریقے سے زندگی کی بوجھل ترین تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، اور ضعفاء جو زندگی کے ہولناک انقلابات سے بہت زیادہ متأثر ہوتے ہیں؛ کیا اِن لوگوں کا قومی غیرت میں کوئی حصہ نہیں؟ کیا یہ لوگ صرف تمہارے انہی کاموں میں حصہ دار ہیں جنہیں تم فرنگی مشرب میں رنگی ہوئی اُس فرعونی تہذیب و تمدّن کے پردے میں سرانجام دے رہے ہو جو حیا کے پردے کی ہوسنا کیوں کا پیٹ بھر رہی ہے، بعض طاقت وَر ظالموں کی شہرت و بدبختی کا وسیلہ بن رہی ہے اور ان درماندہ لوگوں کی مایوسیوں اور تکلیفوں میں اضافہ کرتی چلی جا رہی ہے؟

یاد رکھو کہ ان فقراء اور درماندہ و مصیبت زدہ لوگوں کے فقر کے زخموں کا علاج ''قومیت'' کی سوچ فکر سے کبھی بھی بر آمد ہونے والا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا علاج مقدس اسلامی فارمیسی سے ہی نکل سکتا ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ ضُعفاء کی قوت اور ان کی تابِ مقاومت اُس طبیعی فلسفے سے حاصل نہیں ہوگی جو شعور سے خالی اور تاریک ہے اور اتفاق کے ساتھ وابستہ ہے، بلکہ یہ قوت اسلامی غیرت اور مقدّس اسلامی تو فی سے حاصل ہوگی۔

چھٹا گروہ جوانوں کا ہے، ان نوجوانوں کی جوانی کو اگر دوام حاصل ہوتا تو وہ نشہ آور شراب جو تم لوگ انہیں منفی قومیت کے نام سے پلا رہے ہو ان کے لیے عارضی طور پر ضرور مفید اور وقتی طور پر نفع بخش ہوتی لیکن صورت حال یہ ہے کہ عمر کے ڈھلنے سے دُکھوں میں گھِر جانے سے اور بڑھاپے کی صبح آہیں بھرتے ہوئے اس میٹھی نیند سے بیدار ہو جانے سے جوانی کی اس شراب کا یہ لذت بھرا خُمار اُتر جائے گا اور یہ نوجوان جب ہوش میں آئے گا تو بہت زیادہ روئے گا اور سٹپٹائے گا۔ اور یہ میٹھا سپنا جب ٹوٹ جائے گا تو یہ افسوس سے ہاتھ ملے گا، غم اُٹھائے گا اور آہیں بھرے گا کہ: افسوس دن شباب کے یونہی گزر گئے! عمر ختم ہوگئی ہے اور میں خالی ہاتھ تہی دامن قبر کی طرف جا رہا ہوں۔ اور کہے گا کاش کہ میں سمجھ جاتا اور عقل سے کام لے لیتا!!

تو کیا اس گروہ کا قومی غیرت سے یہی حصہ ہے کہ انہیں تھوڑے سے عرصے کے لیے عارضی سی رنگ رلیوں کا موقع

فراہم کیا جائے اور پھر مدت مدید کے لیے آہ و بکا اور افسوس و پشیمانی کے حوالے کر دیا جائے؟ یا ان کی دُنیا کی سعادت اور زندگی کی لذت جوانی کے لذیذ دور کو نادانیوں اور حماقتوں میں گزرنے کی بجائے استقامت میں صرف کر دینے میں ہے؟ تاکہ اس فانی شباب کو عبادت کے ساتھ معنوی بقا کا حامل بنا دیا جائے اور جوانی کے اس دور میں استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کر کے ابدی دارِ سعادت میں دائمی جوانی حاصل کر لی جائے۔

اس لیے اگر تو ذرہ برابر بھی شعور کا مالک ہے تو ان سوالوں کا جواب دے!

الحاصل:

ترک قوم اگر صرف چھٹے گروہ یعنی صرف نو جوانوں کا ہی نام ہوتا اور اُن کی جوانی بھی ہمیشہ رہنے والی ہوتی اور ان کا اِس دنیا کے علاوہ اور کوئی بھی گھر نہ ہوتا تو تمہارے ترکی قومیت کے پردے میں فرنگی تہذیب سے آلودہ اعمال کا شمار قومی غیرت وحمیت میں ہوتا تب آپ لوگ مجھ جیسے آدمی کو جو کہ دُنیاوی معاملات کی بہت کم پرواہ کرتا ہے اور جو قومیت کو سوزاک کی طرح ایک جان لیوا بیماری سمجھتا ہے اور نو جوانوں کو غیر شرعی خواہشات و رغبات سے روکنے کی کوشش کرتا ہے، اور پھر اس کی پیدائش بھی دوسرے علاقے میں ہوتی ہے۔۔۔ آپ لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ کر دی ہے۔ اور ہو سکتا ہے آپ اس میں حق بجانب بھی ہوتے!

لیکن جب صورت حال یہ ہے کہ یہ ابنائے وطن جنہیں ترک کہا جاتا ہے، اِن کی۔ جیسے کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔ چھ قسمیں ہیں، تو پھر دنیا کی اس بدنتیجہ وقتی سی راحت کو ان میں سے صرف ایک ہی قسم میں مُنحصر کر دینا بلکہ اُسے اس کے ذریعے مدہوش کیے رکھنا اور باقی پانچ قسموں کو نقصان دینا اور ان کے مزاج کو پراگندہ کرنا بلاشبہ ترک قوم کے لیے دوستی نہیں بلکہ دشمنی کا ثبوت ہے۔

جی ہاں؛ میں قومیت کے لحاظ سے اگرچہ ترک شمار نہیں ہوتا ہوں لیکن میں ترکوں کے متقی پرہیز گار، مصیبت زدگان، بوڑھوں، بچوں اور فقراء کے بھلے کے لیے ہمیشہ بھاگ دوڑ کرتا رہتا ہوں۔ اور نو جوانوں کو۔ یعنی چھٹے گروہ۔ کو بھی ان تمام غیر شرعی کاموں سے روکتا رہتا ہوں جو ان کی دنیاوی زندگی میں زہر گھول دیں اور اُن کی اُخروی زندگی کو برباد کر دیں اور پل دو پل کی ہنسی کے بدلے سال تک کے لیے رونے پر مجبور کر دیں۔

میری یہ عادت صرف انہی چھ سات سالوں میں نہیں عرصہ بیس سال سے جاری ہے؛ کیونکہ میں نے ترکی زبان میں جو رسائل لکھے ہیں اور جنہیں قرآن کریم کے نور سے کشید کیا ہے، وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔

جی ہاں؛ لِلّٰهِ الْحَمْدُ وہ آثار جن کا اقتباس میں نے قرآن حکیم کے انوار سے کیا ہے، اُن آثار نے بوڑھے لوگوں کے لیے اُس نور کو آشکار کر دیا ہے جس کی انہیں شدید ضرورت تھی اور مریضوں اور مصیبت کے ماروں کے لیے واضح کر دیا ہے

کہ ان کا مفید ترین علاج اور مرہم شافی قرآن کریم کی مقدس فارمیسی میں ہے۔ اور لب گور پہنچے ہوئے عمر رسیدہ لوگوں کے لیے قرآنی انوار کی برکت سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ قبر رحمت کا دروازہ ہے معدوم ہو جانے کا نہیں۔

اور لطیف و رقیق دلوں کے مالک بچوں کے لیے قرآن کے خزانے سے مصائب و مہالک و نقصانات کے مقابلے میں ایک مضبوط قسم کا سہارا فراہم کر دیا ہے اور مدد مانگنے کے لیے انہیں ایک ایسا مرکز مہیا کر دیا ہے جو ان کی لامحدود اُمیدوں آرزوؤں کا محور ہوگا۔ اور بالفعل ان سے فائدہ بھی اُٹھایا گیا ہے۔

اور ان آثار نے فقراء و ضعفاء کے کمزور کندھوں سے قرآنی حقائق کے ذریعے تکالیفِ حیات کا وہ بھاری بوجھ اُتار دیا ہے جس کے نیچے وہ پسے جا رہے تھے۔

پس ترک قوم کی ان مذکورہ چھ اقسام کے گروہوں میں سے ہم پانچ گروہوں کی نفع مندیوں کے لیے پوری تگ و دو کرتے رہتے ہیں، رہا چھٹا گروہ یعنی نوجوان، تو ہمارا اچھے نوجوان کے ساتھ بڑا گہرا بھائی چارہ ہے۔ لیکن آپ جیسے ملحد لوگوں کے ساتھ ہمارا کسی بھی جہت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے؛ کیونکہ جو لوگ الحاد میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور اُس اسلامی غیرت و حمیت سے نکل جانا چاہتے ہیں جو ترک قوم کے تمام حقیقی مفاخر کا مجمع ہے ایسے لوگوں کو ہم ترک نہیں افرنگی سمجھتے ہیں جو ترکوں کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ اگر لاکھ بار بھی قوم پرست ترک ہونے کا دعویٰ کریں حقیقت پرست لوگوں کو گمراہ نہیں کر سکتے ہیں؛ کیونکہ اُن کی حرکات و سکنات ان کے کرتوت اُن کے اس دعوے کی قلعی کھول دیتے ہیں۔

پس اے تکلف سے فرنگی بننے والے ملحدو!

پس اے پروپیگنڈے سے میرے حقیقی بھائیوں کو مجھ سے دور کرنے والے بناوٹی فرنگی ملحدو! مجھے یہ بتاؤ کہ اپنی اس روش سے تم اس قوم کا کیا بھلا کر رہے ہو؟ تم لوگ:

پہلے نیک و پاکباز اور متقی گروہ کے نور کو بجھا رہے ہو دوسرا گروہ جو کہ رحمت اور شفقت کا مستحق ہے اس کے زخموں پر زہر چھڑک رہے ہو۔

تیسرا گروہ جو انتہائی احترام کے قابل ہے اس کی اُمیدوں پر پانی پھیر رہے ہو اور انہیں مطلق مایوسی کے گھاٹ اُتار رہے ہو۔

اور چوتھا طبقہ جو کہ بہت زیادہ شفقت کا محتاج ہے ان کی معنوی قوت کو شکست و ریخت سے دوچار کر رہے ہو اور ان کی حقیقی انسانیت کا چراغ گُل کر رہے ہو اور پانچواں گروہ کہ جسے تعاون، مدد، تسلّی اور حوصلہ افزائی کی بہت زیادہ ضرورت ہے تم اُن کی اُمیدوں آرزوؤں کی جڑیں کاٹ رہے ہو اور زندگی کو اُن کی نظر میں موت سے بھی بدتر بناتے جا رہے ہو۔

اور چھٹا طبقہ کہ جسے بیدار کرنے اور ہوش میں لانے کی سخت ضرورت ہے اُسے تم جوانی کی مست نیند میں شراب پلا پلا کر بدمست کیے جا رہے ہو جس کا انجام بہت ہی دردناک صورت میں سامنے آنے والا ہے۔

تو کیا یہی وہ قومی غیرت ہے، جس پر تم بہت سی مقدسات کو قربان کرتے جا رہے ہو؟

ترک قوم کو فائدہ پہنچانے کی تمہیں بس یہی ایک صورت نظر آتی ہے؟ لاکھ بار خدا کی پناہ!

عزیزانِ گرامی! میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ جب حق کے میدان میں مغلوب ہو جاتے ہو تو قوت کا دامن پکڑتے ہو۔ چنانچہ اس قاعدے کی رُو سے کہ ''قوت حق میں ہے حق قوت میں نہیں'' کے تحت تم لوگ اگر تمام دنیا کو میرے سر پر جلتی ہوئی آگ بنا کر رکھ دو تو یہ سر جو قرآنی حقیقت پر فدا کر دیا گیا ہے، تمہارے سامنے کبھی نہیں جھکے گا۔

اسی طرح میں آپ کو یہ بھی بتا رہا ہوں کہ اُمت کے ہاں معنوی طور پر دھتکارے ہوئے اور ان کی نظروں سے گرے ہوئے آپ جیسے یہ چند لوگ تو کیا بلکہ آپ جیسے لاکھوں لوگ بھی میرے ساتھ مادی دشمنی پر اُتر آئیں تو بھی میں انہیں کوئی اہمیت نہیں دوں گا، اور میری نظر میں ان کی قیمت چند نقصان دہ جانوروں سے زیادہ ہرگز نہ ہوگی۔

اب بتاؤ کہ تم لوگ میرا کیا بگاڑ لوگے؟

تم لوگ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہو کہ میری زندگی ختم کر دو گے یا میری اس قرآنی خدمت کی راہ میں روڑے اٹکاؤ گے، اس سے زیادہ کچھ نہیں؛ کیونکہ دنیا کے ساتھ میرے تعلق کی صرف یہی دو صورتیں ہیں۔

رہی زندگی کا خاتمہ کر دینے والی اجل، تو اُس کے بارے میں میرا یہ درجۂ شہود تک پہنچا ہوا قطعی ایمان ہے کہ وہ مقدّر ہے اور تبدیل نہیں ہو سکتی۔ حقیقت اگر یہی ہے تو پھر میں راہِ حق میں شہید ہو جاؤں، تو میں تو اس سے بھاگ نہیں رہا ہوں بلکہ اس کے انتظار میں ہوں اور خاص کر جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور مشکل سے ایک سال تک مزید جینے کی توقع رکھ سکتا ہوں! اب اس صورت میں میرے جیسے لوگوں کی بلند ترین غرض و غایت یہی ہو سکتی ہے کہ اِس عمر کے ایک سال کے بدلے میں شہادت کے ذریعے حاصل ہونے والی دائمی اور باقی رہنے والی عمر حاصل کر لی جائے!

رہا مسئلہ خدمت کا، تو الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت کے ساتھ قرآنی اور ایمانی خدمت کے سلسلے میں بہت سے بھائی عطا کر دیے ہیں جن کے ذریعے میری وفات کے بعد یہ خدمت ایک مرکز کی بجائے بہت سے مراکز میں ادا ہوتی رہے گی اور موت کی وجہ سے میری زبان تو خاموش ہو جائے گی لیکن بہت سی مضبوط زبانیں اس کی جگہ بولنا شروع کر دیں گی اور خدمت کا سلسلہ رواں دواں رہے گا۔

بلکہ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ:

جس طرح ایک دانہ زمین کے نیچے جا کر اپنی موت کے ذریعے ایک پوری ڈالی کی زندگی کا باعث بن جاتا ہے اور

یوں ایک دانے کی جگہ پر سو دانے وہی خدمت سرانجام دینے لگتے ہیں۔

میں بھی یہی اُمید رکھتا ہوں کہ میری موت اس قرآنی خدمت کے لیے میری زندگی سے بھی بڑا وسیلہ بن جائے گی!

پانچویں شیطانی سازش:

گمراہوں کا پیروکار ''انانیت'' سے فائدہ اُٹھا کر میرے بھائیوں کو مجھ سے دور کر دینا چاہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ انسان کی خطرناک ترین اور کمزور ترین رگ ''انانیت'' ہی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ یہ لوگ اس کی رگ کو بھڑکا کر کچھ بدترین کاموں کا ارتکاب کر ڈالیں۔

اس لیے میرے بھائیو! خبردار رہو کہ مبادا لوگ تمہارے اس کمزور پہلو پر گھات لگا کر حملہ کر دیں اور تمہارا شکار کر لیں۔

اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہ اہلِ ضلالت اس دور میں کبر و غرور پر سوار ہو کر گمراہی کی وادیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوششوں میں ہیں۔ اور اہلِ حق اگر حق کی خدمت کرنا چاہیں تو ضرورت اس چیز کی ہے کہ وہ بہر صورت کبر و غرور سے دستکش ہو جائیں حتی کہ اگر ''کبر'' کو استعمال کرنے میں حق بجانب بھی ہوں، تو بھی اس سے کنارہ کش ہو جائیں تاکہ وہ دوسروں کے مشابہ نہ ہو جائیں اور دوسرے لوگ ان کے بارے میں یہ نہ سمجھیں کہ یہ لوگ بھی ہماری طرح نفس پرست ہی ہیں اور یہ روش حق کی خدمت پر بہت بڑا ظلم ہوگا!۔ بس یہی ایک واحد صورت ہے جس سے وہ حق کی خدمت کر سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآنی خدمت جس کے لیے ہم ا ہوئے ہیں ''اَنا'' کی تعبیر کا نہیں بلکہ ''نحن'' کی تعبیر کا تقاضا کرتی ہے اس لیے ''میں'' مت کہو بلکہ کہو: ''ہم''

اور یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ تم لوگوں کو اس بات کا مکمل اطمینان حاصل ہو چکا ہے کہ تمہارا یہ فقیر بھائی میدان میں ''انانیت'' لے کر نہیں نکلا ہے اور تم لوگوں کو اپنی ''انانیت'' کا خادم نہیں بنانا چاہتا بلکہ اُس نے تم لوگوں کو دکھا دیا ہے کہ وہ بغیر ''انانیت'' کے قرآنی خادم ہے۔ وہ خود پسندی سے کنارہ کش رہنے اور ''انانیت'' کی حمایت و طرفداری نہ کرنے کے مسلک پر عمل پیرا ہے۔

اس پر مزید یہ کہ آپ کے لیے یہ بات قطعی دلائل کے ساتھ ثابت کی جا چکی ہے کہ میرے تمام آثار اور تمام تا ـت جو عمومی فائدے کے لیے سرِ میدان رکھ دی گئی ہیں وہ شاہی مال ہے اور تمام لوگوں کی ملکیت ہے، مطلب یہ کہ وہ قرآن سے ٹپکے ہوئے قطرے ہیں کوئی بھی آدمی قطعی طور پر اپنی انانیت کی وجہ سے ان کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا:

اور اگر بفرضِ محال میں اپنی اَنانیت کی وجہ سے ان تا ـت کا مالک بنتا بھی ہوں تو قرآنی حقیقت کا دروازہ چونکہ کھل

چکا ہے۔ جیسے کہ میرے ایک بھائی نے کہا ہے۔ اس لیے اصحابِ علم و کمال کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ میرے نقائص و عیوب سے اور میری بے قدری سے قطعِ نظر کریں اور میرے ساتھ تعاون کرتے رہیں اور اس ضمن میں بے نیازی کا مظاہرہ نہ کریں۔

سلف صالحین اور علمائے محققین کے آثار اگر چہ بہت بڑا خزانہ ہیں اور ان میں ہر بیماری کے لیے کافی و وافی دوا موجود ہے، لیکن کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ چابی خزانے سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے؛ کیونکہ خزانہ کو تالہ لگا ہوا ہو تو ایک چابی بہت سے خزانوں کا دروازہ کھول سکتی ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ علماء و فضلاء جو علمی غرور میں مبتلا ہیں: یہ بات وہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ طبع شدہ ''مقالات'' قرآنی حقائق کی چابیاں ہیں، اور ہیرے کی تلواریں ہیں جو ان حقائق کا انکار کرنے کی کوشش کرنے والوں کے سروں پر برس رہی ہیں۔

مضبوط قسم کے علمی غرور سے گرانبار اُن علماء و فضلاء کو بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہ میرے نہیں بلکہ قرآنِ حکیم کے طلبہ اور شاگرد بن رہے ہیں اور میں تو صرف ان کا کلاس فیلو ہوں۔ بلکہ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ میں اُستادیت کا دعوے دار ہوں تو بھی ہمیں چونکہ عوام سے لے کر خواص تک اہلِ ایمان کے تمام طبقات کو اُن اَوہام و شبہات سے بچانے کا وسیلہ مل گیا ہے جن سے وہ اس وقت دوچار ہیں، اس لیے ان علماء کا یہ فرض بنتا ہے کہ یا تو کوئی اس سے زیادہ آسان وسیلہ ڈھونڈ لیں یا پھر اسی وسیلے کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیں، اسے پڑھنا پڑھانا شروع کر دیں اور اسے آویزۂ گوش بنا لیں۔

علماءِ سوء کے بارے میں بڑی زبردست قسم کی سرزنش وارد ہوئی ہے، اس لیے اس دور میں اہلِ علم کو انتہائی احتیاط سے رہنا چاہیے۔ اگر تم لوگ یہ فرض کر بھی لو کہ میں یہ ایمانی خدمت۔ جیسے کہ ہمارے دشمن سمجھتے ہیں۔ اپنی اَنانیت کے لیے سر انجام دے رہا ہوں تو پھر یہ کتنی حیرانی کی بات ہے کہ بہت سے فاضل لوگ اپنی انانیت کو تیاگ کر ایک فرعونی ذہن رکھنے والے آدمی کے اِرد گرد جمع ہو چکے ہیں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ باہم مربوط ہو کر شانہ بشانہ دنیاوی اور قومی مقصد کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔

اگر ایسا ہو سکتا ہے تو تمہارے اس بھائی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس دنیاوی قیادت کے قائدین کی طرح ''انانیت'' کو چھوڑ کر قرآنی حقائق کے معاملے میں آپ لوگوں سے باہمی ربط و ضبط اور باہمی پشتیبانی کا مطالبہ کرے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارا بڑے سے بڑا عالم بھی اگر اُس کی آواز پر لبیک نہ کہے تو وہ حق پر نہیں ہوگا؟ حالانکہ وہ قرآنی حقیقت اور ایمانی حقائق کی دعوت کے پردے میں اپنی انانیت چھپائے ہوئے ہے۔

پس اے بھائیو! انانیت کی سب سے زیادہ خطرناک جہت وہ ہے جسے حسد اور غیرت کہا جاتا ہے۔ اِس لیے عمل اگر خالص اللہ کے لیے نہ ہو تو اُس میں حسد داخل ہو کر اُسے برباد کر دیتا ہے، چنانچہ جس طرح انسان کا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ

سے نہ حسد کرتا ہے اور نہ اس کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے۔ اسی طرح اُس کی آنکھ کان پر حسد نہیں کرتی اور اس کا دل اس کی عقل پر غیرت نہیں کھاتا ہے: آپ تمام لوگ بھی اسی طرح ہی ہیں، چنانچہ تم میں سے ہر آدمی ہماری اس جماعت کے معنوی شخص میں ایک عضو اور ایک حاسّہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے تمہاری وجدانی ذمہ داری یہ ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے ساتھ حسد نہ کرے بلکہ ہر شخص دوسرے شخص کی خوبیوں پر فخر کرے اور ان خوبیوں پر خوش رہے۔

ایک چیز اور رہ گئی، اور وہ ہے تُم میں اور تمہارے دوستوں میں اس فقیر کے بارے میں حسد کی رگ کا پایا جانا۔ اور یہ چیز سب سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ تم لوگوں میں بڑے جلیل القدر اور متبحر قسم کے علماء موجود ہیں، اور اہلِ علم کی ایک قسم میں بہت زیادہ علمی انانیت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ اگرچہ وہ ذاتی طور پر متواضع بھی ہو تو بھی وہ اس علمی جہت سے مغرور اور اَنا پرست ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنی انانیت کو فوری طور پر نہیں چھوڑ سکتا اور وہ اپنے دل اور اپنی عقل کو کتنا بھی سنبھال کر کیوں نہ رکھے اس کا نفس بہرکیف امتیازی حیثیت چاہتا ہے اور اس علمی انانیت کی جہت سے اپنی ''اَنا'' کی اس حد تک تشہیر چاہتا ہے کہ تألیف شدہ رسائل کے ساتھ ٹکراؤ اور ان کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کا دل رسائل کو پسند کرتا ہے اور اس کی عقل انہیں بہت اچھا سمجھتی ہے اور انہیں بہت بلند پایہ مانتی ہے، لیکن اس کا نفس علمی غرور وانانیت سے جنم لینے والے حسد کی وجہ سے ان کے ساتھ مخفی طور پر دشمنی رکھتا ہے اور ان ''مقالات'' کی قدر وقیمت گرانے کی آرزو رکھتا ہے تاکہ اُس کی اپنی فکری کاوشوں کا قد اِن کے برابر ہو جائے اور وہ بھی اسی طرح ہاتھوں ہاتھ بکیں اور رواج پا جائیں۔ اس لیے میں مجبوراً یہ بات سب تک پہنچا رہا ہوں کہ:

وہ لوگ جو قرآنی دروس کے اس حلقے میں آ چکے ہیں، وہ کتنے بھی متبحر عالم اور مجتہد کیوں نہ ہوں ایمانیات کے ساتھ تعلق رکھنے والے علوم کی رُو سے اُن کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ ان ''مقالات'' کی شرح ووضاحت اور تنظیم سازی کریں؛ کیونکہ ایسی بہت سی علامات ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ ہماری ڈیوٹی ان ایمانی علوم کے بارے میں فتویٰ دینے پر لگائی گئی ہے۔ اس لیے اگر کوئی ہمارے حلقے میں رہتے ہوئے اپنے علم اور غرور واَنانیت سے اشارہ پا کر کوئی ایسی چیز لکھنا چاہے گا جو شرح ووضاحت کے دائرے سے باہر ہوگی وہ ناکام معارضے اور ناقص تقلید کے حکم میں ہوگی؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سی دلیلوں اور علامتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ''رسائل نور'' کے اجزاء قرآن کریم سے ٹپکے ہوئے قطرات ہیں۔ اور تقسیمِ اعمال کے قاعدے کی روشنی میں ہم میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی کام کی ذمہ داری اُٹھائی ہوئی ہے۔ جس سے ہم آبِ حیات کے یہ قطرے ضرورت مندوں تک پہنچاتے ہیں۔

چھٹی شیطانی سازش:

یہ ہے کہ شیطان انسان کی سستی اور کسلمندی والی رگ سے، جسمانی راحت وآرامش اور نوکری اور ملازمت والی رگ

سے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔

جی ہاں؛جنّی اور انسانی شیطان ہر سمت سے حملہ آور ہوتے ہیں، چنانچہ جب وہ ہمارے کسی بھائی کو دیکھتے ہیں کہ وہ مضبوط دل گڑے ارادے، سچی دوستی، خالص نیت اور ہمتِ عالی کا مالک ہے،تو اُس پر چاروں طرف سے حملہ آور ہو جاتے ہیں،اور وہ اس طرح کہ:

ہماری اِس خدمت کو سستی اور کمزوری کا شکار بنانے کے لیے ان کی سستی اور آرام طلبی اور ان کی ملازمتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

اور اپنی مکروہ سازشوں کے ذریعے ان میں سے کچھ لوگوں سے ان کی بے خبری میں زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں تاکہ اُنہیں اِنہی کاموں میں اُلجھائے رکھیں اور یوں اُن کے پاس قرآنی خدمت کے لیے کوئی وقت ہی نہ بچے۔

اور کچھ لوگوں کو وہ دنیا کے دلکش قسم کے کام پیش کر دیتے ہیں تاکہ ان کی دنیاوی حرص و ہوس جاگ اٹھے اور وہ قرآنی خدمت کے باب میں غفلت کا شکار ہو جائیں اور یوں ان پر ہلّہ بولنے کے راستے بہت دراز ہیں لیکن ہم نے انہیں مختصر کر کے بیان کر دیا ہے باقی ہم آپ لوگوں کی فہم وفراست پر چھوڑ رہے ہیں۔

پس اے میرے بھائیو!

یہ بات ذہن میں رکھو کہ آپ لوگوں کی ذمہ داری نہایت مقدّس اور تمہاری خدمتگزاری بہت بلند پایہ ہے اور تمہاری عمر کی ہر گھڑی اتنی قیمتی ہے کہ پورے دن کی عبادت کا حکم لے سکتی ہے اس بات کی تمہیں اچھی طرح سے جانکاری ہو جانی چاہیے تاکہ یہ تمہارے ہاتھوں سے نکل نہ جائے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا﴾

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ، الْحَبِيبِ الْعَالِي الْقَدِيرِ، الْعَظِيمِ الْجَاهِ، وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلِّمْ آمين

ایک مختصر سی قدسی تاریخ

وہ سال کہ جس میں قرآنِ حکیم کے اَسرار میں سے ایک اہم اعجازی سرّ آشکار ہوا، اس کی تاریخ لفظ ''قرآن'' میں ہی پائی جاتی ہے اور وہ اِس طرح کہ حروفِ ''اَبجد'' کے حساب سے لفظ ''قُرآن'' کے تین سو اکاون اعداد ہیں اور اس میں دو الف ہیں۔ پوشیدہ الف کو اگر سکون (حاشیہ:۱) کے ساتھ پڑھا جائے تو وہ الف کے معنی میں ہوگا۔

پس ایک ہزار تین سو اکاون سال کو قرآنی سال کے جملے سے تعبیر کرنا بالکل صحیح ہے؛ کیونکہ رسائل نور جو کہ قرآن کی تفسیر ہیں ان کے اجزاء میں اس سال لفظِ ''القرآن'' کے توافقات کے اسرار میں سے ایک عجیب قسم کے سرّ کا ظہور ہوا ہے۔ اِسی طرح قرآن میں آنے والے لفظِ ''اللہ'' میں اس سال ایک معجزانہ توافق کا ظہور ہوا ہے۔ پھر اسی سال قرآن کریم کی جدید اسلوب میں کتابت نے ایک خوبصورت اعجازی نقش کو آشکار کیا ہے۔ پھر قرآن کے شاگردوں نے حروف کی تبدیلی کی تحریک کے مقابلے میں پوری قوت کے ساتھ قرآنی خط کی حفاظت کی جو تگ و دو کی ہے، وہ بھی اسی سال ہوئی۔ اور پھر قرآن کے اہم ترین معجزانہ اذواق کا ظہور بھی عین اسی سال میں ہوا۔ اسی طرح اس سال میں قرآن کریم کے ساتھ تعلق رکھنے والے بہت سے واقعات کا ظہور کچھ اس انداز سے ہوا کہ گویا وہ اسی سال وقوع پذیر ہونے والے تھے۔

چھٹی قسم جو کہ چھٹا رسالہ ہے، کی ذیلی بحث

چھ سوال: یہ خاص پرائیویٹ ذیلی بحث مستقبل میں وارد ہونے والی تحقیر و اہانت اور نفرت بھری باتوں سے بچنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ یعنی جب یہ کہا جائے کہ تُھو ہے اُس دور کے بے غیرت لوگوں پر! تو اُن کے تُھوک سے بچنے کے لیے یا اُسے اپنے چہروں سے پونچھنے کے لیے سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔ اور یہ ایک عریضہ ہے جو اُن متمدّن لوگوں کے سروں پر دے مارنے کے لیے لکھا گیا ہے جو اس بغیر میم کے مدنیت (دنیت) (حاشیہ:۲) کے دلدادہ ہیں جو اس دور میں انسان کے منہ سے ایک لاکھ منہوں سے ''جہنم زندہ باد'' کا نعرہ بلند کروا رہی ہے۔

اور تا کہ اس سے یورپ کے اُن وحشی قائدین کے کان گونج اُٹھیں جو انسانی تہذیب کے پردے میں وحشیانہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور تا کہ اُن ظالم لوگوں کی اندھی آنکھوں میں داخل ہو جائے جنہوں نے ہم پر ان بے ضمیر اور غدّار قسم کے لوگوں کو مسلّط کر رکھا ہے۔

(حاشیہ:۱) ''فَــعِــلْ'' (عین کی زیر کے ساتھ) کو علم صرف کے قاعدے کے مطابق ''فَعْل'' (عین پر جزم کے ساتھ) پڑھا جاتا ہے، جیسے کَتِف کو ''کتف'' پڑھا جاتا ہے۔ اس بنا پر کسرے والے الف کو سکون کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ تب اس کے اعداد ایک ہزار تین سو اکاون ہوں گے۔ مؤلف۔

(حاشیہ:۲) گھٹیاپن، پستی اور کمینگی وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴾

پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ملحدین کی ستم رانیوں اور دست درازیوں کا سلسلہ اِن دنوں بڑی گھمبیر اور بدترین صورت اختیار کر گیا ہے چنانچہ اب اس معاملے نے ہماری سرّی اذان اور اِقامت میں، میری پرائیویٹ غیر سرکاری عبادت گاہ میں جسے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا ہے، اور میری اس میں اپنے دو چار خاص بھائیوں کے ساتھ مل کر ادا کی جانے والی خصوصی عبادت میں دخل اندازی شروع کر دی ہے۔ اور مجھے کہا گیا ہے: تم لوگ نماز عربی میں کیوں پڑھتے ہو اور اذان چھپا کر کیوں کہتے ہو"؟ اور یہ چیز بھی اُسی ظلم وستم کی ایک کڑی ہے جو دیگر پریشان حال اہلِ ایمان پر روا رکھا جا رہا ہے۔

خاموش رہ کر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اس لیے میں اب جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں میرے مخاطب یہ پست خیال ضمیر فروش نہیں ہیں جن میں بات سُننے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں ہے، بلکہ میرے مخاطب فرعونی ذہنیت رکھنے والے وہ قائدین ہیں جو اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے ظلم واستبداد کے ذریعے قوم کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں:

اے بدعت (حاشیہ) والحاد کے پرستارو! میرا تم لوگوں سے مطالبہ ہے کہ مجھے میرے ان چھ سوالوں کے جواب دو:

پہلا سوال: دُنیا میں کسی بھی قوم کے، کسی بھی حکومت کے، حتیٰ کہ آدم خوروں کے اور خونخوار وحشی درندوں کے سرداروں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں اور وہ کسی قانون قاعدے اور دستور کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔ لیکن تم لوگ کس دستور کے تحت یہ عجیب قسم کا ظلم وستم روا رکھے ہوئے ہو؟ ہمیں وہ دستور تو دکھاؤ!

یا پھر تم کچھ پست ذہن   ر قسم کے سرکاری ملازموں کی خواہش ل کو قانون کا درجہ دے رہے ہو؟

کیونکہ دنیا میں کوئی ایسا قانون نہیں ملے گا جو کسی ذاتی اور پرائیویٹ عبادت میں دخل اندازی کو جائز سمجھتا ہو۔ اس بارے میں کوئی قانون بن ہی نہیں سکتا ہے۔

دُوسرا سوال: ضمیر کی آزادی کا قانون۔ خاص کر آزادی کے اس دور میں اور بالخصوص موجودہ تہذیب کے دائرے میں تمام نوعِ انسانی میں عمومی طور پر کارفرما ہے؛ اب تم لوگ کس چیز کے بل بوتے پر ضمیر کی آزادی کے اس عمومی قانون کو توڑنے کی جرأت کر رہے ہو؟ اس دستور کو پامال کر رہے ہو؟ اور یوں نوعِ بشر کی تحقیر کر رہے ہو؟ اور اگر لوگ اعتراض کریں

(حاشیہ) واضح رہے کہ یہاں بدعت کا وہ مفہوم ہرگز نہ لیا جائے جو خصوصی طور پر مسلمانانِ عالم کے مسالک و مذاہب کے مابین مشہور ہو چکا ہے، یعنی بزعمِ خویش مستحب اور مستحسن اُمور، بلکہ اس سے مراد وہ عقائد و نظریات ہیں جو تجدیدِ دین کے نام پر دین کے متوازی چلتے ہیں اور کفر تک پہنچا دیتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ قرونِ اُولیٰ میں خارجیت، رافضیت اور باطنیت جیسے عقائد پر بدعت کا اطلاق ہوتا تھا۔ مترجم۔

تو ان کے اعتراض کو بیکار سمجھ کر اہمیت نہیں دیتے ہو؟

پھر تم نے اپنے لیے "سیکولرازم" کا نام استعمال کر کے دین اور الحاد و بے دینی میں عدم مداخلت کا اعلان کس طاقت کے سہارے کیا ہے؟ جبکہ خود تم از راہِ تعصب الحاد و بے دینی کو اپنا دین مان کر دین اور دین دار لوگوں پر زیادتیاں کر رہے ہو؟ بلاشبہ تمہاری یہ زیادتیاں اور دست درازیاں چھپی نہیں رہیں گی، تمہیں ان کے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟

تم وہ لوگ ہو کہ بیس حکومتوں میں سے کوئی چھوٹی سی حکومت تم پر اعتراض کر دے تو تم اس کے اعتراض کو رد نہیں کر سکتے ہو؛ لیکن تم ضمیر کی آزادی کو طاقت کے بل پر بجبر و اکراہ تبدیل کرنے کی کوششوں میں کیوں مصروف ہو؛ گویا کہ تم بیس حکومتوں کے ایک ساتھ کیے گئے اعتراض کو فضول سمجھ کر کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے ہو؟

تیسرا سوال: میرے جیسے شافعی المذہب آدمی کو کچھ بے ضمیر علماء کی طرف سے حنفی مذہب کی روشنی میں دیے گئے خود حنفی مذہب ہی کے منافی فتوے کی پیروی کرنے کا پابند کیوں کرتے ہو؟

اگر تم لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شافعی مذہب کے پیروکار لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ شافعی مذہب کو نابود کرنے کی کوشش کر کے تمام شافعیوں کو حنفی بنانے کے بعد مجھے اسکی پیروی کرنے پر مجبور کر دیا جائے، تو پھر ہو سکتا ہے کہ یہ کہنا صحیح ہو کہ یہ تمہارے جیسے بے دین لوگوں کا قانون ہے، وگرنہ تو اسے ہوس پرستانہ کمینگی کا نام ہی دیا جائے گا۔

اور ہم اس طرح کے لوگوں کی خواہشوں کے نہ تو پیروکار ہیں اور نہ انہیں جانتے پہنچانتے ہیں!

چوتھا سوال: میرے جیسے دیگر اقوام کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں کو تُرکی زبان میں اِقامت کہنے کا پابند کس اُصول کی بنا پر کرتے ہو؟ اور وہ بھی ایک ایسے محرّف اور بدعت سے آلودہ افرنگ زدہ تُرک تو تو کی ترجمانی کر رہا ہے جو قدیم سے اسلام کے ساتھ گھلی ملی ہوئی، انتہائی متمدّن، مہذّب اور دل کی گہرائیوں سے اپنے دین کا احترام کرنے والی ترک قو تو کے کلی طور پر منافی اور متضاد ہے؟ یہ سب تم کسی اصول کے تحت کر رہے ہو؟

جی ہاں! میرا حقیقی ترکوں کے ساتھ اگرچہ دوستی اور بھائی چارے کی رُو سے بڑا گہرا تعلق ہے، لیکن اس کے باوجود میرا تم جیسے یورپ زدہ ترک قوم پرستوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

بنابریں، آپ لوگ مجھے اس چیز کا پابند کیسے کر سکتے ہیں اور کس قانون کے تحت؟

"اَکراد" کہ جن کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے یہ لوگ ہزاروں سال سے اپنی تو تو اور اپنی زبان نہیں بھولے ہیں اور ہمیشہ سے وطن پرستی میں ترکوں کے حقیقی بھائی بن کر اور میدانِ جہاد میں اُن کے رفقاء و مددگار رہے ہیں تم لوگ اِن کردوں کو اگر اِن کی قومیت سے دستبردار کر دو اور ان سے ان کی قومی زبان فراموش کرا دو، تو پھر تو ممکن ہے کہ ہمارے جیسے

لوگوں پر پابندی عاید کرنا ایک وحشی اور بے حق قسم کے قانون کا حکم لے لے، وگرنہ ایسا اقدام صرف اور صرف ہوائے نفس کا شاخسانہ ہوگا۔

لیکن یاد رہے کہ اشخاص کی ہوائے نفس کی پیروی نہیں کی جاتی۔ اور ہم اس کی پیروی نہیں کریں گے۔

پانچواں سوال: کوئی بھی حکومت اپنے قوانین اپنی رعایا پر اور ان لوگوں پر تو لاگو کر سکتی ہے جنہیں وہ اپنی رعایا میں شمار کرتی ہے لیکن ان لوگوں پر نہیں جنہیں وہ اپنی رعایا شمار ہی نہیں کرتی؛ کیونکہ اس صورت میں وہ لوگ کہیں گے:

ہم لوگ چونکہ آپ کی رعایا نہیں ہیں اس لیے تم ہماری حکومت نہیں ہو!

مزید یہ بھی یاد رہے کہ کسی بھی ملک میں، کسی بھی شخص پر ایک ہی وقت میں دو سزائیں جاری نہیں کی جاتی ہیں؛ چنانچہ قاتل کو یا تو قتل کر دیا جاتا ہے یا جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک ہی جگہ پر ایک ہی وقت میں قتل اور جیل ایک ساتھ نہیں چلتا ہے!

اب سوال یہ ہے کہ میری طرف سے وطن یا قوم کو کسی بھی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے لیکن اس کے باوجود تم لوگوں نے مجھے آٹھ سال (حاشیہ:۱) سے قید میں ڈالا ہوا ہے اور میرے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا ہوا ہے جو کسی حقیقی، بدیسی اور بہت ہی زیادہ بیگانے مجرم کے ساتھ بھی نہیں رکھا جاتا! تم لوگوں نے حقیقی مجرموں کو تو معاف کر دیا ہے لیکن میری آزادی چھین لی ہے اور مجھے شہری حقوق سے محروم کر دیا ہے، اور تم میں سے کسی ایک کو بھی یہ تک کہنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ یہ وطن کا بیٹا ہے!

مجھے یہ بتاؤ کہ میرے جیسے آدمی کو جو تمہارے لیے ہر طرف سے اجنبی ہے اپنے ان حریّت شکن قوانین کا پابند کیوں بنا رہے ہو جو تم نے اس بدنصیب قوم کی مرضی کے خلاف ان پر مسلّط کر رکھے ہیں؟

پہلی جنگ عظیم میں (حاشیہ:۲) وطن کے دفاع کے لیے بہادری، جوانمردی اور سرفروشی کے جو انمول واقعات ظہور میں آئے اور جن کا وسیلہ آرمی سٹاف آفیسرز کی گواہی کے مطابق میری ذات بنی، اُن تمام واقعات کو تم لوگوں نے جب جُرم ہی قرار دے دیا، اسی طرح دُکھوں ماری اس قوم کے لیے اخلاقِ حسنہ کی نگہداشت اور ان کی دنیاوی اور اُخروی سعادتمندی کی ضمانت کے لیے اور اس راہ میں کی جانے والی تمام مؤثر کوششوں کو بھی تُم لوگوں نے جرائم کے کھاتے میں ہی ڈال دیا؛

اور پھر اُس شخص کو تم نے سزا بھی دے دی جس نے اپنے لیے اُن کُفر اور ہوس پرستی پر مبنی خطرناک اور معنوی طور پر

(حاشیہ:۱) اور اب تو یہ سزا اٹھائیس سال ہوگئی ہے۔ مؤلف۔

(حاشیہ:۲) پہلی جنگِ عظیم میں استاد نورسی نے اپنے شاگردوں کا ایک فدائی دستہ تیار کیا اور خود اُس کی قیادت کر کے روس کے خلاف جنگ لڑی۔ لیکن زخمی ہو کر گرفتار ہوئے اور شمالی روس میں دو سال چار مہینے تک قید میں رہے۔ تا آنکہ روس میں 1917 میں کیمونسٹ انقلاب آجانے اور انارکی پھیل جانے کے بعد وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ مترجم۔

نقصان دہ یورپی اسالیب کو قبول نہ کیا؛ تو پھر سزا تو ایک ہی ہونی چاہیے، میں نے اُسے قبول نہ کیا لیکن تم نے مجھ پر سزا جبر کر کے دے ڈالی۔

یہ بتاؤ کہ زور و جبر کے ساتھ اب یہ دوسری سزا کس قانون کے تحت دی جا رہی ہے؟

چھٹا سوال: تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم کلی طور پر تمہارے برخلاف اور برعکس ہیں۔ اور جو معاملہ میرے ساتھ کیا جا رہا ہے اُس سے یہ بات کھل کر سامنے بھی آجاتی ہے کہ تم لوگ اپنی دنیا کے لیے اپنے دین اور آخرت کو قربان کر رہے ہو؛ تو پھر ہم تو تمہارے خیال کے مطابق ہمارے درمیان پائے جانے والے اس اختلاف کی وجہ سے تمہارے برعکس اپنے دین اور اپنی آخرت کے لیے اپنی دنیا کو قربان کرنے کے لیے ہر دم تیار ہیں؛ کیونکہ قُدسی شہادت حاصل کرنے کے لیے تمہاری اس ظالم اور وحشی حکومت کے سائے میں ذلت و خواری کے ساتھ گزرنے والی اپنی اس حیاتِ مستعار کے سال دو سال کو قربان کر دینا ہمارے لیے آبِ کوثر کا حکم رکھتا ہے۔

لیکن میں تم پر لرزہ طاری کرنے کے لیے قرآنِ حکیم کے فیضان اور اس کے اشاروں پر اعتماد کرتا ہوا تمہیں حتمی طور پر واشگاف لفظوں میں کہہ رہا ہوں کہ: ''مجھے قتل کر دینے کے بعد تم جی نہ سکو گے! ایک دستِ قہّار تمہیں تمہاری اِس جنت نما اور محبوب دنیا سے دھتکار کر باہر کر دے گا اور تم فوراً ابدی تاریکیوں کے گھاٹ اُتار دیے جاؤ گے۔ اور تمہارے یہ نمرودی ذہن رکھنے والے ظالم رؤساء و سربراہ بہت جلد قتل ہو جائیں گے اور میری طرف بھیج دیے جائیں گے۔ تب میں حضرتِ الٰہیہ میں ان کی گردنیں پکڑ لوں گا اور عدالتِ الٰہیہ میں اُن کو اسفلَ سافلین میں گرا دینے کی وجہ سے اُن سے اپنا انتقام لوں گا۔

اے دنیا کے بدلے اپنے دین اور آخرت کو بیچ دینے والے بدبختو!

اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چھیڑ خانی نہ کرنا، لیکن اگر تم باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ تم لوگوں سے میرا انتقام دو گنا لیا جائے گا۔ اس لیے تمہیں لرزہ براندام رہنا چاہیے۔

میں اللہ کی رحمت سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ میری موت میری زندگی سے بڑھ کر اس دین کی خدمت کرے گی۔ اور میری موت تمہارے سروں پر بم بن کر پھٹے گی اور تمہارے سروں کے پرخچے اُڑا کر رکھ دے گی۔

جرأت ہے تو آؤ اور پہنچاؤ نقصان مجھے!

لیکن یاد رکھو کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے!

میں تو تمہاری تمام تر دھمکیوں کے مقابلے میں اپنی پوری قوت کے ساتھ یہ آیت کریمہ تلاوت کر رہا ہوں:

﴿اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ﴾

ساتویں قسم

سات اشاروں پر مشتمل ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾

﴿يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾

[یہ قسم سات اشاروں سے عبارت ہے جو کہ تین سوالوں کے جواب میں لکھی گئی ہے اُن میں سے پہلا سوال چار اشاروں پر مشتمل ہے]

پہلا اشارہ:

جو لوگ اسلامی شعائر کو تبدیل کرنے کے درپے ہیں اُن کا بھروسہ اور اُن کی دلیل کا سرچشمہ غیروں کی اندھی تقلید ہے، جیسے کہ دیگر بُرے کاموں میں بھی اسی طرح ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

لندن میں جو اجنبی لوگ ہدایت پا کر حلقۂ ایمان میں داخل ہو رہے ہیں، اپنے اپنے علاقوں میں اذان اور اقامت جیسے بہت سے اُمور کا اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کرتے ہیں اور عالمِ اسلام اُن کے اس عمل کے سامنے خاموش رہتا ہے اور ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ اُس کے خاموش رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کا کوئی شرعی جواز ہے!

الجواب: اس قیاس میں فرق اتنا واضح ہے کہ کسی بھی لحاظ سے اُن پر قیاس کرنا اور اُن کی تقلید کرنا اصحابِ شعور کا شیوہ نہیں ہو سکتا کیونکہ غیروں کے علاقوں کو شریعت کی زبان میں دارُ الحرب کہا جاتا ہے۔ چنانچہ دارُ الحرب میں کئی ایسے کام جائز ہیں جن کی دارُ الاسلام میں گنجائش نہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ دیارِ فرنگ عیسائیت کی شان وشوکت کا گڑھ ہے، وہاں کوئی بھی ایسا علاقہ نہیں ہے جو اپنی زبانِ حال کے ساتھ شرعی اصطلاحات کے معانی اور قُدسی کلمات کے مفاہیم کا شعور دے سکے یا اُن کی تلقین کر سکے۔ اسی بنا پر وہاں قُدسی معانی کو مقدس الفاظ پر ترجیح دے دی گئی ہے؛ یعنی معانی کی حفاظت کے لیے الفاظ کو ترک کر دیا گیا ہے اور نسبتاً چھوٹی اور آسان برائی کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ لیکن دیارِ اسلام میں علاقہ خود اپنی زبانِ حال کے ساتھ اہلِ اسلام کو ان مقدس کلمات کے اجمالی سے معانی کی تلقین کر دیتا ہے۔

اہلِ اسلام کی وہ تمام گفتگوئیں اور وہ تمام مسائل جو اسلامی عادات، اسلامی تاریخ، عام اسلامی شعائر اور تمام ارکانِ اسلام کے اِرد گرد گھومتے ہیں اور روایاتی تسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں اہلِ ایمان کو ہمہ وقت ان مقدس کلمات کی اجمالی طور پر تلقین کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس علاقے کے معابد اور دینی مدارس کے علاوہ قبروں کے پتھر ایک ملقِن اور معلّم کی

حیثیت رکھتے ہیں اور اہلِ ایمان کو ان مقدس معانی کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

اب جو آدمی خود کو مسلمان کہتا ہے، اور وہ دنیاوی کاموں کے لیے ہر دن انگریزی کے پچاس الفاظ سیکھتا ہے، وہی آدمی اگر پچاس سال میں "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" جیسے ہر دن دہرائے جانے والے مقدس کلمات نہ سیکھ سکے تو کیا اس کا مرتبہ جانور سے بھی پچاس درجے نیچے نہ ہوگا؟ ان کلمات کا اس طرح کے جانوروں کے لیے نہ تو ترجمہ کیا جاسکتا ہے اور نہ انہیں چھوڑا جاسکتا ہے۔

ان کلمات کو چھوڑ دینا قبروں کے تمام پتھروں اور کتبوں کو کھرچ کر صاف کر دینے کے مترادف ہے، انہیں زمین بوس کر دینے اور قبروں میں پڑے ہوئے ان آباء واجداد کی توہین وتحقیر کے مترادف ہے جس سے وہ اپنی قبروں میں پڑے کانپ اُٹھیں گے اور زندہ لوگوں کے خلاف سراپا احتجاج بن جائیں گے!

یہ علمائے سُوء، جن کا ملحدین کے ساتھ گٹھ جوڑ ہو چکا ہے، قوم کو دھوکہ دینے کے لیے کہتے ہیں:

''امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ: ''ضرورت پڑنے پر دیارِ عرب سے دور علاقوں میں عربی زبان سے بالکل نابلد لوگوں کے لیے ضرورت کے درجے کے حساب سے سورۂ الفاتحہ کو عربی زبان میں پڑھنے کی بجائے اس کا فارسی ترجمہ پڑھنا جائز ہے''۔ اُن کا یہ کہنا اگر ٹھیک ہے تو پھر ہم بھی تو ضرورت مند ہی ہیں، اس لیے ہم تُرکی زبان میں پڑھ سکتے ہیں!

الجواب: امام اعظمؒ کے علاوہ تمام ائمۂ عظام اور مجتہد ائمۂ کرام، سب کے سب امام اعظمؒ کے برعکس اس فتوے کے خلاف فتوی دیتے ہیں۔ اور عالمِ اسلام کا جادۂ کُبریٰ اور شاہراہ عام وہی ہے جس پر یہ ائمۂ کرام گام فرسا ہیں پس یہ عظیم اُمت تو صرف شاہراہِ عام پر ہی چل سکتی ہے، اس لیے جو لوگ اس اُمت کو خصوصی اور تنگ راستے میں چلانا چاہتے ہیں اُسے گمراہ کر رہے ہیں۔

رہا امام اعظم کا فتوی، تو وہ پانچ صورتوں کے ساتھ خاص ہے:

پہلی صورت: یہ اُن لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو اسلام کے مرکز سے بہت دور دراز کے ملکوں میں رہتے ہیں۔

دوسری صورت: اس چیز کی بنیاد حقیقی ضرورت پر ہے۔

تیسری صورت: یہ چیز صرف فارسی زبان کے ترجمے کے ساتھ خاص ہے جو کہ -ایک روایت کے مطابق- اہلِ جنت کی ایک زبان شمار ہوتی ہے۔

چوتھی صورت: اس کے جواز کا حکم سورۂ الفاتحہ کے ساتھ خاص ہے، تاکہ جسے فاتحہ نہیں آتی وہ نماز نہ چھوڑے۔

پانچویں صورت: جواز کا اظہار اس لیے کیا گیا ہے تاکہ یہ چیز عوام کے لیے ایمانی قوت سے اُبھرنے والی اِسلامی غیرت کی وجہ سے مقدس معانی کو سمجھنے کا باعث بن جائے۔ وگرنہ ایمان کی کمزوری کی راہ سے دَر آنے والے، منفی قومیت

سے پیدا ہونے والے، ضعفِ ایمان سے اور عربی زبان سے نفرت کی وجہ سے جنم لینے والے تخریبی میلان کے تحت ان کا ترجمہ کرکے اصل عربی الفاظ کو چھوڑ دینا تو صرف دین کو چھوڑ دینے اور اس کے خلاف بغاوت کا دوسرا نام ہے۔

دوسرا اشارہ:

اِسلامی شعائر کو تبدیل کرنے والے تجدید کے ان داعیوں نے اپنے کام میں جوازِ عمل کے لیے **اوّلاً:** تو علمائے سوء سے فتوی مانگا، اور عوام کو وہ فتوی دکھایا جس کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ پانچ صورتوں کے ساتھ خاص ہے اور

ثانیاً: تجدید کے اِن دعوے داروں نے یہ منحوس سوچ فکر اجنبی انقلابیوں سے لی ہے، اور وہ اس طرح کہ:

یورپ کو کیتھولک (حاشیہ) مذہب پسند نہ آیا، چنانچہ باغیوں انقلابیوں اور فلسفیوں نے عام لوگوں سے پہلے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرلیا جو کہ کیتھولک مذہب کے پیروکاروں کے مطابق ایک بدعت پر مبنی اور علیحدگی پسند مذہب ہے۔

چنانچہ ان لوگوں نے فرانسیسی انقلاب سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور کیتھولک مذہب کے کچھ احکام کو زمین بوس کر کے پروٹسٹنٹ اِزم کا اعلان کر دیا۔

اب اس علاقے کے ایجنٹ جنہوں نے صرف اندھی تقلید کرنا سیکھا ہے، اب کہہ رہے ہیں: ''اس طرح کا انقلاب اگر عیسائیوں میں آ گیا ہے، اور شروع میں ان تمام انقلابیوں اور احتجاجیوں کو مرتد کہا جاتا تھا، لیکن ان عیسائیوں نے بھی دھیرے دھیرے اس انقلاب کو قبول کرلیا؛ تو پھر اسلام میں بھی اس طرح کا دینی انقلاب آ سکتا ہے!''

الجواب: اس قیاس میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ اُس سے بھی زیادہ ہے جو پہلے اشارے والے قیاس میں ہے؛ اور وہ اس طرح کہ عیسائیت میں سیّدنا عیسیٰ ؑ سے صرف دین کی بنیادیں اخذ کی گئی ہیں اور معاشرتی زندگی کے اکثر احکام اور شرعی فروعات کی تشکیل حواریوں کی طرف سے اور دیگر روحانی رہنماؤں کی طرف سے ہوئی ہے۔ اور ان میں سے ایک بہت بڑی قسم سابقہ مقدس کتابوں سے حاصل کی گئی ہے؛ کیونکہ سیدنا عیسیٰ ؑ دنیاوی لحاظ سے کوئی حاکم یا سلطان اور عمومی معاشرتی قوانین کا مرجع نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عُرفی قوانین اور تمدُّنی دساتیر کو نصرانی شریعت کے نام سے قبول کرلیا گیا، گویا کہ

(حاشیہ) کیتھولک: واضح رہے کہ اس وقت دنیا میں جو عیسائی پائے جاتے ہیں ان کی اکثریت تثلیث کی معتقد ہے اور یہ بنیادی طور پر تین کلیسائیوں میں بٹے ہوئے ہیں:

۱: مشرقی کلیسا، جو کہ یونانی کلیسا Greek orthodox کہلاتا ہے۔ اس میں چودہ مختلف کلیسا شامل ہیں جیسے کلیسائے روس، یونان اور بلقان وغیرہ۔

۲: رومن کیتھولک Roman catholic اس میں آسٹریا فرانس وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ پروٹسٹنٹ Protestant، یعنی رومن کیتھولک کے منکرین۔ اس میں جرمن سوئزرلینڈ، سکاٹ لینڈ، انگلستان اور جرمن وغیرہ شامل ہیں۔ مترجم۔

عیسائی دین کی بنیادوں کو باہر سے لباس پہنایا گیا اور اُسے ایک دیگر صورت شکل مل گئی! اب اگر یہ صورت شکل تبدیل کر دی جائے اور اس لباس کو تبدیل کر دیا جائے تو دینِ عیسیٰ کی بنیاد کا باقی رہ جانا ممکن ہے اور اس سے عیسیٰ کی تکذیب نہیں ہوگی اور اُن کا انکار لازم نہیں آئے گا۔

جبکہ دین اور اسلامی شریعت کے مالک فخرِ عالم ﷺ دین و دنیا کے سردار تھے اور مشرق و مغرب اور اندلس و ہند اُن کے پایہ ہائے تخت تھے، اس لیے آپ ﷺ نے دین کے اُصول بھی خود بیان فرمائے اور اس کے فروع و احکام بھی، حتی کہ اس دین کے چھوٹے سے چھوٹے ادب کے بارے میں اُنہوں نے خود بتایا ہے۔ آپ خود ہی اس کے بارے میں خبر دیتے ہیں اور اس کا حکم دیتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی فروعات قابلِ تبدیل لباس کا حکم نہیں رکھتی ہیں کہ انہیں تبدیل کر دیا جائے تو بھی دین کی بنیاد باقی رہے گی۔ بلکہ یہ فروعات دین کی بنیاد کا جسم ہیں۔ بلکہ اُن کی جلد سے کم نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ اُس کے ساتھ کچھ اس طرح گھل مِل گئے ہیں کہ اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتے کہ اُن کے تبدیل کر دینے سے براہِ راست صاحبِ شریعت کی تکذیب یا اس کا انکار لازم آئے!

رہا اختلافِ مذاہب، تو وہ اُن نظری دساتیر کو سمجھنے کے انداز سے پیدا ہوا ہے جو دساتیر آپ ﷺ نے بیان کیے ہیں رہے اس کے ضروری دساتیر جنہیں محکمات کہا جاتا ہے اور جن پر ضروریات دینیہ کا اطلاق ہوتا ہے اور جو تأویل قبول نہیں کرتے ہیں، تو وہ کسی بھی طرح اور کسی بھی جہت سے قطعی طور پر قابل تبدیل نہیں ہیں اور ان میں اجتہاد کی گنجائش ہرگز نہیں، جو بھی انہیں بدلے گا وہ دین کا باغی ہوگا اور: "يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الْقَوْسِ" کے قاعدے میں داخل ہو جائے گا۔

ان اہلِ بدعت کے پاس اپنے اِلحاد و ارتداد کے جواز کا وسیلہ کچھ اسی طرح کا ہی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں: انقلابِ فرانس کہ جس نے عالمِ انسانیت میں نت نئے واقعات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا ہے اور جس انقلاب کو بہت سے لوگوں کی طرف سے درست کہا گیا اور انگلستان نے اس کے بعد بہت سی ترقی بھی کی؛

الجواب: پہلے دو قیاسوں کی طرح اس قیاس میں بھی فرق بالکل واضح ہے؛ کیونکہ فرانس میں عیسائیت، اور خاص کر کیتھولک مذہب اشرافیہ اور حکومتی کارندوں کے ہاتھوں تحکم واستبداد کا ذریعہ بن گیا تھا، چنانچہ اَشرافیہ اور بااثر لوگ اس مذہب کی وساطت سے عوام الناس میں اپنا اثر ونفوذ قائم رکھتے تھے۔

اسی طرح یہ مذہب عوام میں سے اُن غیور، جوشیلے اور پُرعزم لوگوں کو رگیدنے اور پیس ڈالنے کا بہانہ بن گیا تھا جنہیں وہ لاقانونی اور انارکسٹ کہتے تھے۔

اسی طرح یہ مذہب آزادی کے ان علمبردار مفکرین کو کچل کر رکھ دینے کا وسیلہ بن گیا تھا جو اس ظالم اشرافیہ کے ظلم و استبداد کے خلاف مزاحمت کرتے تھے۔

بلکہ بلادِ فرنگ میں لگ بھگ چار سو سال جنم لینے والی شورشوں اور بغاوتوں کی وجہ سے خود یہ مذہب ہی عوام الناس کے آرام و سکون چھیننے کا اور اجتماعی، معاشرتی زندگی میں بدنظمی، لاقانونیت اور انارکی پھیلانے کا سبب بن گیا تھا۔ اسی بنا پر اس مذہب پر۔ الحاد کے نام پر نہیں۔ بلکہ عیسائیت کے ایک دوسرے مذہب کے نام پر حملہ ہوا اور عوام کا طبقہ اور فلاسفہ کا طبقہ اس کے خلاف غیظ و غضب سے بھر گیا، تا آنکہ وہ تاریخی حادثہ پیش آ گیا جو سب کو معلوم ہے۔ (حاشیہ)

جبکہ اسلام میں کسی بھی مظلوم اور مفکر کو دینِ محمدی اور شریعتِ اسلامیہ کے خلاف شکوہ سنجی کا حق ہرگز نہیں پہنچتا ہے؛ کیونکہ یہ دین اُس کی حمایت کرتا ہے اور اسے غیظ و غضب میں مبتلا نہیں کرتا۔ اسلام کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، اسلام پسندوں کے درمیان دینی نقطۂ نظر سے خانہ جنگی کے صرف اِکا دُکا واقعات پیش آئے ہیں۔ لیکن کیتھولک مذہب چار سو سال تک داخلی ہنگامہ آرائیوں اور خانہ جنگیوں کا سبب بنتا رہا!

پھر یہ بھی ہے کہ اسلام خواص سے بڑھ کر عوام کے لیے ایک محفوظ قلعے کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ خواص یا اشرافی طبقے کو عوام پر ظلم نہیں ڈھانے دیتا بلکہ انہیں وجوبِ زکوٰۃ اور حرمتِ ربا کے ذریعے ایک طرح سے عوام کے خادم بناتا ہے؛ کیونکہ وہ کہتا ہے: "سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ ـــ خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ"

مزید یہ کہ وہ عقل کو گواہ بناتا ہے، اُسے بیدار کرتا ہے، اور قرآن حکیم کی زبان کے ذریعے انسان کو بہت سے اُمور میں عقل کے مقدس حوالے دے کر اُسے تحقیق و تدبّر پر اُبھارتا ہے، مثال کے طور پر وہ کہتا ہے:

أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ؟ أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ؟ أَفَلَا يَتَفَكَّرُوْنَ؟

اور اس طرح وہ اہلِ علم اور اصحابِ عقل کو دین کے نام پر بڑا اُونچا مقام اور خاص اہمیت دیتا ہے۔ عقل کا ہاتھ نہیں چھوڑتا ہے اور اہلِ فکر کی زبانوں پر پابندی نہیں لگاتا اور کیتھولک مذہب کی طرح اندھی تقلید کا مطالبہ نہیں کرتا۔

حقیقی عیسائیت کی نہیں بلکہ موجودہ عیسائیت کی بنیاد میں اور اسلام کی بنیاد میں ایک بُنیادی نقطے کا فرق ہے۔ اس لیے

(حاشیہ) اس سے مراد 21 اکتوبر 1517ء کا دن ہے جو عیسائیت کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس دن مارٹن لوتھر نے پوپ کے خلاف اعلانیہ بغاوت کر دی تھی اور پادری ٹیٹ زیل سے کہہ دیا تھا کہ وہ مسیح مذہب کے خلاف کام کر رہا ہے۔ اس نے پچانوے سوالات پر مشتمل ایک بیان تیار کر کے 21 اکتوبر 1517ء کو مقامی گرجا کے صدر دروازہ پر آویزاں کر دیا اس سوالنامے نے جرمنی کے لوگوں میں انقلابی روح پھونک دی اور وہ پوپ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ 1520ء میں لوتھر کے حامیوں نے رومن کیتھولک سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کے بعد جرمنی میں ایک نیا کلیسا وجود میں آ گیا۔

مارٹن لوتھر کے حامیوں نے چونکہ پاپائیت کے خلاف پروٹسٹ یعنی احتجاج کیا تھا اس لیے اس تحریک کے حامی پروٹسٹنٹ کہلائے۔ مترجم۔

یہ دونوں سابقہ فروق کی طرح بہت سی جہتوں میں علیحدہ علیحدہ راستوں پر چلتے ہیں، اور وہ اہم بنیادی نقطہ یہ ہے:

اسلام خالص اور حقیقی توحید کا دین ہے، چنانچہ وہ تمام وسائط واسباب گرا دیتا ہے، انانیت کو پاش پاش کر دیتا ہے، خالص عبودیت کی بنیادیں استوار کرتا ہے، نفس کی ربوبیت سے شروع کر کے تمام اقسام کی باطل ربوبیتوں کا قلع قمع کر کے انہیں قطعی طور پر ردّ کرتا ہے۔

یہی وہ راز ہے جس کے پیشِ نظر خواص میں سے اگر کوئی انسان مکمل طور پر دین دار بن جائے تو وہ ''انانیت'' اور پندارِ نفس سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور جو انانیت سے دستبردار نہیں ہوتا وہ دین میں کٹر مضبوط نہیں ہوتا، بلکہ دین کا ایک حصہ چھوڑ بیٹھا ہے۔

لیکن موجودہ عیسائیت چونکہ یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں، اس لیے وہ اسباب و وسائط کو حقیقی طور پر مؤثر مانتی ہے اور دین کے نام پر ''انانیت'' کے ساتھ مزاحمت نہیں کرتی بلکہ ''اَنانیت'' کو مقدس سمجھتی ہے کہ گویا یہ عیسیٰ کی مقدس وکیل ہے یہی وجہ ہے عیسائیوں کے خواص کے لیے جو کہ دنیاوی طور پر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوں ممکن ہے کہ وہ مکمل طور پر دین دار ہوں۔ جیسے کہ سابق امریکی صدر ''ولسن'' اور سابق برطانوی وزیر اعظم ''لارڈ جارج''۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے دین کے بارے میں تعصب رکھنے والے کسی بھی بشپ کی طرح دین دار لوگ تھے!

لیکن مسلمانوں میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ وہ اس طرح کے عہدوں پر فائز ہو کر بھی مکمل طور پر کٹر اور مضبوط دین دار رہے ہوں؛ کیونکہ یہ، کبر وغرور سے مکمل طور پر دستبردار نہیں ہوتے، اور حقیقی تقویٰ اور کبر وغرور ایک جگہ جمع نہیں ہوتے!۔

جی ہاں؛ جس طرح عیسائیوں کے خواص واشراف کا تعصب اور مسلمانوں کے خواص واشراف کی کمزوری اور ڈھیلا پن دونوں کے درمیان بڑے اہم فرق پر دلالت کرتا ہے اسی طرح عیسائیوں میں سے اُبھرنے والے فلاسفہ کا اپنے دین کے بارے میں بے پرواہ ہونا یا دین کے ساتھ مقابلے کا انداز اختیار کر لینا؛ اور اسلام میں پیدا ہونے والے حکماء فلاسفہ کا اپنے فلسفہ وحکمت کی عمارت دین کی بنیادوں پر رکھنا بھی ان دونوں کے درمیان بڑے اہم فرق کی نشاندہی کرتا ہے۔

پھر عیسائی عوام میں سے وہ لوگ جو مصائب وآلام میں گرفتار ہیں اور جو زندگی کا بیشتر حصہ جیلوں میں گزارتے ہیں، وہ دین کی طرف سے کسی مدد کی توقع نہیں رکھتے، بلکہ اُن میں سے اکثر لوگ قدیم زمانے سے بھٹکتے اور ملحد بنتے رہے ہیں حتی کہ تاریخ کے مشہور ترین انقلابی جنہیں ملحد اور انارکسٹ کہا جاتا ہے اور جو فرانس میں بہت بڑے انقلاب کا علمبردار بنے، وہ یہی مصیبت زدہ لوگ تھے۔

لیکن اسلام میں مصائب وآلام میں گرفتار اور جیلوں میں پڑے ہوئے لوگوں کی مطلق اکثریت دین سے مدد کے منتظر ہوتے ہیں، بلکہ خود دین دار بن جاتے ہیں۔ یہ حالت بھی دونوں کے درمیان واضح فرق کی نشاندہی کرتی ہے۔

تیسرا اشارہ:

اہلِ بدعت کہتے ہیں: اس دینی تعصب نے ہمیں تہذیب کے قافلے سے بہت پیچھے دھکیل دیا ہے، اس دور میں زندگی تعصّب سے دستبردار ہوکر ہی گزاری جاسکتی ہے۔ یورپ نے یہ دینی تعصّب چھوڑا ہے تو ترقی کی ہے!

الجواب: تم لوگ غلطی پر ہو، بہک چکے ہو یا بہکا رہے ہو؛ کیونکہ یورپ اپنے دین کے لیے بہت زیادہ تعصب رکھتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی عام بلغاری شہری سے یا کسی انگریز سپاہی سے، یا کسی فرانسیسی انقلابی سے یہ کہا جائے کہ: پگڑی باندھو اگر نہیں باندھو گے تو جیل میں ڈال دیے جاؤ گے؛ تو وہ اپنے تعصب کے تقاضے کے تحت کہے گا: جیل تو رہی ایک طرف، تم لوگ مجھے قتل بھی کردو نا، تو بھی میں اس طرح کا حقیر کام کرکے اپنے دین اور اپنی قوم کی توہین نہیں کروں گا!

پھر تاریخ گواہ ہے کہ اہلِ اسلام نے جب اپنے دین پر مکمل طور پر عمل کیا اپنے اس زمانے کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی کرتے رہے اور بلندیوں پر گئے اور جب بھی دین کے بارے لوچ اور نرمی کا مظاہرہ کیا پستیوں میں گرے۔ لیکن عیسائیت کا حال اس کے برعکس رہا۔

اور یہ صورتِ حال بھی ایک اہم بنیادی فرق کی وجہ سے پیدا ہوئی!

پھر اسلام کو دیگر اَدیان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے؛ کیونکہ ایک مسلمان اگر اسلام سے نکل جائے اور اپنا دین چھوڑ دے تو پھر کسی بھی نبی پر ایمان نہیں رکھے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا اقرار بھی نہیں کرے گا، بلکہ کسی بھی مقدس چیز کی پہچان اور اس کا اعتقاد ہی نہیں رکھے گا۔ اور اس میں وہ وجدان ہی باقی نہیں رہے گا جو کمالات کا دار و مدار بنتا ہے؛ کیونکہ اس کا وجدان کُلّی طور پر ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائے گا یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نظر میں ایک حربی یعنی جنگجو کافر کو حقِ حیات حاصل ہے، کہ مملکت کے اندر ہوگا اور مصالحت اور معاہدہ کرے گا، یا مملکت کے اندر ہوگا اور جزیہ دے گا تو اس کی زندگی اسلام میں محفوظ رہے گی لیکن اس کے برعکس مرتد کو حقِ حیات حاصل نہیں ہے؛ کیونکہ مرتد کا ضمیر اور وجدان فسخ ہو چکا ہوتا ہے، چنانچہ وہ معاشرتی زندگی کے لیے زہر کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

لیکن عیسائیوں میں الحاد پرستی کی راہ پر چلنے والا آدمی ممکن ہے معاشرتی زندگی کے لیے سُود مند رہے اور ممکن ہے کہ وہ بعض مقدّس اشیاء کا معتقد بھی رہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بعض انبیاء کو بھی مانتا رہے اور کسی جہت سے اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان رکھے!

اب حیرانی کی بات یہ ہے کہ اہلِ بدعت بلکہ زیادہ صحیح تعبیر کے مطابق الحاد پرست اس الحاد و زندیقیت سے کون سے فائدے کی آس لگائے بیٹھے ہیں؟ اگر اُن کے پیشِ نظر علاقے کی اِدارت اور امنِ عام ہے، تو اللہ کو نہ ماننے والے دس بے لگام بیوقوف ملحدوں کی ادارت کرنا اور ان کی برائیوں کو رفع دفع کرنا ایک ہزار دین داروں کی ادارت کرنے سے بھی کہیں

زیادہ مشکل ہے۔

اور اگر ان کے سروں پر ترقی کا بھوت سوار ہو تو پھر اس طرح مُلحدین حکومتی ادارے کے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ہیں اور ترقی کی راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ امن وسلامتی کے دشمن ہیں جو کہ ترقی اور تجارت کے بنیادی ستون ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ لوگ تخریب کار ہیں، کیونکہ ان کے مذہب کا تقاضا یہی ہے اور دنیا میں سب سے بڑا احمق وہ ہے جو ان جیسے بے لگام، انتشار پسند ملحدین سے ترقی اور زندگی کی سعادتمندی کی اُمید رکھتا ہے!

اِن میں سے کسی احمق نے جو کہ کسی اہم عہدے پر قابض ہے کہا ہے: ہم ''اللہ اللہ'' کہتے ہیں اس لیے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اور یورپ نے ''توپ، بندوق'' کہا ہے اس لیے آگے نکل گیا ہے ایسے لوگوں کی باتوں کا جواب تو ''جوابِ احمقاں باشد خاموشی'' والے قاعدے کے مطابق خاموشی ہی ہے، لیکن ان احمقوں کے پیچھے چونکہ کچھ بد بخت عقل مند بھی لگے ہوئے ہیں، اس لیے ہم کہتے ہیں:

ارے بدنصیبو! یہ دنیا تو ایک مہمان خانہ ہے اور موت برحق ہے، کہ روزانہ اُٹھنے والے تیس ہزار جنازے اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ کیا تم موت کو قتل کر سکتے ہو؟ ان گواہوں کو جھٹلا سکتے ہو؟ اگر یہ نہیں کر سکتے ہو تو تمہیں اس بات کا علم ہو جانا چاہیے کہ موت ہی تمہیں ''اللہ اللہ'' کہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تمہاری وہ کون سی توپ اور کون سی بندوق ہے جو اللہ اللہ کی بجائے دمِ واپسیں پر پہنچے ہوئے سکرات میں مبتلا انسان کی آنکھوں کے سامنے سے ابدی تاریکیوں کو دور کر سکتی ہے اور اس کی مطلق نا اُمیدی کو مطلق اُمید میں بدل سکتی ہے؟

تو موت جب موجود ہے، اور قبر میں داخل ہونا ہی ہے، اور یہ زندگی جا رہی ہے اور باقی رہنے والی زندگی آرہی ہے، تو پھر اگر ایک دفعہ ''توپ، بندوق'' کہا جائے تو ایک ہزار دفعہ ''اللہ اللہ'' کہنا انتہائی ضروری ہے۔ بلکہ خود بندوق بھی اگر فی سبیل اللہ استعمال ہو تو وہ بھی ''اللہ اللہ'' کہتی ہے۔ اور خود توپ بھی ''اللہ اکبر'' کہتی ہوئی گونجتی ہے اور ''اللہ'' کا نام لے کر گولہ چھوڑتی اور تھامتی ہے۔

چوتھا اشارہ:

تخریب کار اہلِ بدعت کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم تو وہ جو دین کے ساتھ محبت اور دوستی کا دم بھرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم قو تو کی مٹی میں دین کا نورانی درخت لگا رہے ہیں جو کہ بہت کمزور ہو چکا ہے۔ اس طرح وہ قو تو کے ذریعے دین کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ اور گویا وہ اپنے اس انداز سے اسلام دوستی کے نام سے اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔

دوسری قسم کے لوگ اپنی بدعتوں کو رواج یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ ہم قومی فکر کو مضبوط کرنے کے لیے، قومی سوچ فکر کی بنیاد رکھنے کے لیے، قوم کا نام روشن کرنے کے لیے قوم کو اسلام کا پیوند لگانا چاہتے ہیں۔

پہلی قسم کے لوگوں کو ہم کہتے ہیں کہ: اے نادار علمائے سوء کہ جن پر "نادان دوست" کا لقب صادق آتا ہے!

یا اے بے عقل اور جاہل ومجذوب صوفیو!

اسلام کا شجرِ طوبیٰ کہ جس کی رگیں کائنات کے حقائق تک پھیلی ہوئی ہیں، یہ درخت ایک موہوم اور وقتی سی، جزوی سی، خصوصی اور منفی بلکہ مطلبی، ظالم اور تاریک اندھیری قومیت کی مٹی سے نہیں بویا جا سکتا ہے، اور اسے وہاں پہ بونے کی کوشش کرنا حماقت بھری تخریب کاری اور نئی شرارت ہے۔

اور دوسری قسم کے قوم پرستوں سے ہم کہتے ہیں کہ: اے بدمست ایجنٹو! سابقہ دور کو تو دورِ قومیت کہنا ممکن تھا، لیکن دورِ حاضر دورِ قومیت نہیں ہے؛ کیونکہ بالشوک اور اشتراکی (حاشیہ) مسائل افکار پر غالب آچکے ہیں اور قومیت کے مفہوم کی توڑ پھوڑ کرتے چلے جارہے ہیں اور قومیت کا دور ختم ہو رہا ہے۔

اور اسلام کی ابدی اور دائمی حمیّت کی وقتی، مضطرب اور ڈگمگاتی قومیت کے ساتھ نہ تو پیوند کاری کی جاسکتی ہے اور نہ اسے اس کے ساتھ باندھا جاسکتا ہے، اور اگر یہ پیوند کاری کردی گئی تو یہ اسلامی قومیت کو تو برباد کرہی دے گی، اصلی قومیت کی اِصلاح بھی نہیں کرسکے گی اور اُسے باقی بھی نہیں رہنے دے گی۔

جی ہاں؛ وقتی پیوند کاری میں ایک وقتی سا ذائقہ اور وقتی سی قوت ہوتی ہے، لیکن ہوتی بڑی وقتی سی ہے اور اس کا انجام بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

پھر اس طرح کرنے سے ترک قوم دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گی اور ان کے درمیان ایک ایسا شگاف پیدا ہوجائے گا جسے پھر سے جوڑنا مشکل ہو جائے گا، تب اُمت کی قوّت اور شان وشوکت ھباءً منثورًا چلی جائے گی، کیونکہ اس صورت میں دونوں ٹکڑے ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش میں مصروف رہیں گے؛ کیونکہ ترازو کے دو پلڑوں میں ایک دوسرے کے بالمقابل دو پہاڑ پڑے ہوں تو بالکل تھوڑی سی قوّت بھی ان دونوں قوّتوں کے ساتھ بڑا اہم کردار ادا کرسکتی ہے اور ایک کو اُوپر تک بلند کرسکتی ہے اور دوسرے کو نیچے تک جھکا سکتی ہے۔

دوسرا سوال۔ دو اشاروں پر **مشتمل** ہے

پہلا اشارہ: جو کہ پانچواں اشارہ ہے، اور یہ ایک اہم سوال کا مختصر سا جواب ہے۔

سوال: ظہورِ مہدی کے بارے میں بہت سی صحیح روایات پائی جاتی ہیں، جو بتاتی ہیں کہ وہ آکر فساد کی لپیٹ میں آئی

(حاشیہ) بالشوک: (Bolshevik) انقلاب پسند، سیاسی انتہاپسند۔ روسی کیمونسٹ پارٹی کا رکن۔

ہوئی دنیا کی اصلاح کر دیں گے۔ جبکہ یہ زمانہ تو جماعت کا ہے نا کہ فرد کا! اب ایک آدمی کتنا بھی چالاک ہشیار کیوں نہ ہو، اگر چہ وہ ایک ہزار آدمیوں کی چالاکی ہشیاری کا مالک کیوں نہ ہو، لیکن وہ کسی بڑی جماعت کا ترجمان اور اس جماعت کی معنوی شخصیت سے مات کھا جائے گا۔

اور اس کی ولایت کی قوت اس دور میں کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو، تو بھی جو فساد اس دور میں پھیل چکا ہے اور تمام انسانی معاشرے پر چھا چکا ہے وہ اس کی اصلاح کیسے کر پائے گا؟

حضرت مہدی علیہ السلام کے تمام کام اگر خارقِ عادت ہوں گے تو وہ حکمتِ الٰہیہ کے اور اس دنیا میں جاری و ساری اللہ کی عادت کے قوانین کے خلاف ہوں گے؟

ہم مہدی علیہ السلام کے اس مسئلے کا راز سمجھنا چاہتے ہیں؟

الجواب: اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال رحمت کے ساتھ اسلامی شریعت کی ابدیت کی حمایت ونگہداشت کے لیے ہر اُس دور میں جب اُمّت کے اندر فساد رونما ہوا کوئی مصلح، مجدّد، عظیم الشان خلیفہ، عظیم ترین قطب، کامل ترین مرشد یا اس طرح کے ''مہدی علیہ السلام'' کے ساتھ مشابہت رکھنے والے یگانۂ روزگار بابرکت لوگ ضرور بھیجے ہیں اور اُن کے ذریعے اُس نے فساد کا ازالہ کیا ہے، اُمّت کی اصلاح کی ہے اور دین محمدی علیہ الصلوۃ والسلام کی حفاظت کی ہے۔

اُس کی عادتِ جاریہ جب یہی ہے تو پھر وہ آخری زمانے کے سب سے بڑے فساد میں ایک نورانی شخص کو بھیجے گا جو **مجتہدِاجلّ، مجدّدِ اکبر**، قطبِ اعظم، حاکم، مہدی اور مُرشد ہوگا۔ اور وہ شخص اہلِ بیتِ نبوی سے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ جو زمین وآسمان کے درمیان والے عالم کو ایک سیکنڈ میں بھر دیتا اور خالی کر دیتا ہے۔

سمندر پر چلنے والی تیز ہواؤں کو ایک منٹ میں ساکن کر دیتا ہے۔ اور وہ قدیرِ الجلیل بہار کے موسم میں ایک گھنٹے میں موسمِ گرما کا نمونہ پیدا کر دیتا ہے اور موسمِ گرما میں ایک گھنٹے میں موسمِ سرما کی تندی و تیزی ایجاد کر دیتا ہے؛ وہ ''امام مہدی علیہ السلام'' کے ذریعے عالمِ اسلام پر چھائے ہوئے بادلوں کو بھی پراگندہ ومنتشر کر سکتا ہے۔ اور اس چیز کا اس نے وعدہ بھی کیا ہے۔ اور وہ اپنا وعدہ عنقریب بہر صورت پورا کرے گا۔

اس مسئلے کو اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے زاویے سے دیکھا جائے تو انتہائی آسان ہے اور اگر اس میں حکمتِ ربانی اور اسباب کے دائرے کے زاویے سے غور کیا جائے تو اس حد تک معقول ہے کہ اگر ''مخبرِ صادق'' نے اس کی خبر نہ بھی دی ہوتی تو بھی ضرور بالضرور ایسے ہی واقع ہوتا، اور یہ ہر حال میں واقع ہوگا۔ اربابِ فکر ونظر کا یہی فیصلہ ہے اور حکمتِ ربانی کا یہی تقاضا ہے اور وہ اس طرح کہ:

''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ فِي

اَلْعَالَمِیْنَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ"

والی دعا جسے تمام اُمت عموی طور پر اپنی تمام نمازوں میں دن میں پانچ بار دہراتی ہے، مشاہدہ بتاتا ہے کہ یہ دعا قبول ہو چکی ہے۔ الحمد للہ۔ چنانچہ آل محمد ﷺ نے بھی آل ابراہیم کی طرح وہی کیفیت اختیار کر لی ہے، اور وہ اس طرح کہ مختلف زمانوں میں اور مختلف علاقوں میں اکثر مبارک سلسلوں کی رہنمائی نورانی اشخاص ہمیشہ سے مرکزی قیادت وصدارت کا کردار ادا کرتے آئے ہیں (حاشیہ) اور یہ اتنی کثرت میں ہیں کہ ان قائدین کی مجموعی کیفیت ایک بہت بڑے لشکر کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ لوگ مادی شکل میں داخل ہو جائیں اور مل جل کر ایک جماعت کی کیفیت اختیار کر لیں اور دینِ اسلام کو آپس کے ربط وضبط اتفاق اور بیداری وچوکسی کا ذریعہ بنالیں اور ایک مقدس ملت کا رُوپ دھار جائیں تو کسی قوم کا کوئی بھی لشکر اُن کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکے گا۔

یہ شان وشوکت والا لشکرِ جرار محمد ﷺ کی آل ہے، اور یہ امام مہدی علیہ السلام کا خصوصی لشکر ہے۔

جی ہاں، تاریخ عالم میں اس وقت کوئی نسل ایسی نہیں پائی جاتی جس کے سلسلہ ونسب کی کڑیاں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی اور باہم گر پیوستہ ہوں، جو بلند پایہ شرف اور خالص وعالی شان حسب ونسب کی امتیازی خصوصیت کا مالک ہو جیسی کہ "سادات" کی یہ نسل ہے جس میں پائے جانے والے لوگ آلِ بیت کی طرف منسوب ہیں یہی لوگ قدیم سے اہلِ حقیقت کے تمام سلسلوں کے سرخیل رہے ہیں، اور اہلِ کمال کے مشہور قائد ہیں۔ اور عصرِ رواں میں یہی بابرکت نسل کمیت کے لحاظ سے لاکھوں کی تعداد میں موجود ہے۔ اور یہ لوگ تمام عالم کے برابر بیدار چشم کے مالک اور با برکت نبوی سلسلۂ نسب کے شرف سے مشرّف ہیں۔ اِن کے دل ایمان اور حبِّ نبوی سے بھرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وجود میں بڑے بڑے حادثات وواقعات رُونما ہوں گے جو اس طرح کی عظیم جماعت میں اس مقدس قوت کو بیدار کریں گے تو پھر بلاشبہ اس عظیم الشان قوت میں پائی جانے والی یہ بلند پایہ حمیّت کی یہ رگ پھڑکے گی اور "امام مہدی علیہ السلام" زمام قیادت ہاتھ میں لے لیں گے اور اسے کشاں کشاں حق وحقیقت کی طرف لے جائیں گے۔

اس واقعے کا اس طرح ظہور میں آنا ایسے ہی ہے جیسے اس خزاں کے بعد موسمِ بہار آئے گا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کی سُنّت، عادت اور اُس کی رحمت سے اس بات کے منتظر اور اُمید وار ہیں۔ اور اس انتظار میں رہنا ہمارا حق ہے۔

دوسرا اشارہ (یعنی چھٹا اشارہ)

اور وہ یہ ہے کہ "امام مہدی علیہ السلام" کی نورانی جماعت "سفیانی" کی تخریب کار بدعت پرور حکومت کی اصلاح

(حاشیہ) حتی کہ سید احمد سنوسیؒ جو کہ انہیں میں سے ایک ہیں، لاکھوں مریدوں کی قیادت کر رہے ہیں۔ سیّد ادریسؒ کے ایک لاکھ سے زائد مرید ہیں، اور سید یحیٰؒ کی زیرِ امارت لاکھوں انسان ہیں۔۔۔ یوں ان سادات کے قبیلے کے افراد میں اِن پاکیزہ سپوتوں جیسے بہتیرے لوگ موجود ہیں۔ علاوہ بریں اس قبیلے میں سید عبد القادر جیلانیؒ، سید ابوالحسن شاذلیؒ اور سید احمد بدویؒ جیسے معنوی بہادر واولوالعزم سپوت بھی موجود ہیں۔ مؤلف۔

کرے گی اور سنتِ نبوی علیہ الصلوۃ والسلام کو زندہ کرے گی۔ یعنی ''سفیانی'' کی قیادت جو رسالتِ محمدی علیہ الصلوۃ والسلام کے انکار کی نیت سے عالمِ اسلام میں شریعتِ محمدی علیہ الصلوۃ والسلام کے انکار کی تگ ودو میں مصروف ہوگی، وہ ''امام مہدی علیہ السلام'' کی جماعت کی معجزانہ معنوی تلوار سے قتل ہوجائے گی اور اس کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اسی طرح عیسائیوں کی غیور وفدا کار جماعت جو کہ اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں ''نصرانی مسلمان'' کہا جائے، یہ جماعت عیسی علیہ السلام کے حقیقی دین اور اسلام کے حقائق کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور ''دجّال'' کی اس قیادت کو قتل کردے گی جو عالمِ انسانیت میں ''اُلوہیت'' کا انکار کرنے کی نیت سے تہذیب وتمدن اور انسانی مقدّسات کو برباد کرتی اور انہیں پراگندہ کرتی چلی جارہی ہوگی اور اس طرح یہ جماعت عیسیؑ کی قیادت میں اس دجّالی قیادت کے تاروپود بکھیر دے گی اور انسانیت کو اُلوہیت کے انکار سے بچالے گی۔

یہ راز بڑا طویل ہے اس لیے ہم یہاں مختصر سے اشارے کے ساتھ اِسی پر اکتفا کرتے ہیں، کیونکہ اس بارے میں دیگر کئی جگہوں پر تھوڑی بہت بحث ہو چکی ہے۔

ساتواں اشارہ یعنی تیسرا سوال:

یہ لوگ کہتے ہیں: آپ کے سابقہ دفاعات اور آپ کا راہِ اسلام میں تگ ودو کرنے کا انداز وہ نہیں جو عصرِ حاضر کا تقاضا ہے۔

پھر آپ اس ڈگر پر نہیں چل رہے ہیں جو دورِ حاضر کے مفکرین نے یورپ کے مقابلے میں اسلام کا دفاع کرنے میں اختیار کی ہے، سوال یہ ہے کہ آپ نے ''قدیم سعید'' کے طور اطوار کیوں چھوڑ دیے ہیں اور آپ یہ تگ ودو عظیم الشان معنوی مجاہدین کے اسلوب میں کیوں نہیں کرتے ہیں؟

الجواب: قدیم سعید کو اور مفکرین کو یورپی فلسفے کے کچھ دستور پسند آئے تھے، یعنی ان لوگوں نے اس فلسفے کے کچھ اصولوں کو اختیار کرلیا اور خود انہی کے اسلحہ کے ساتھ اُن کے مقابلے میں میدان میں اُترے۔ یہ لوگ اس کے چند اُصولوں کو چونکہ جدید سائنس کا درجہ دے کر انہیں غیر متزلزل انداز کے ساتھ تسلیم کر لیتے ہیں۔

اس لیے وہ اسلام کو کوئی حقیقی عملی صورت دینے میں ناکام ہورہے ہیں؛ کیونکہ وہ اسلام کے درخت کے ساتھ ایسی حکمت کی ٹہنیوں کی پیوند کاری کر رہے ہیں۔

جسے وہ بڑی گہری اور مضبوط جڑوں والا سمجھ رہے ہیں۔ گویا کہ وہ اپنے اس عمل کے ذریعے اسلام کو مضبوط کر رہے ہیں!

لیکن اس انداز سے چونکہ دشمنانِ اسلام پر بہت کم غلبہ حاصل ہوتا ہے، مزید یہ کہ اس میں اسلام کی شان وشوکت بھی

ایک طرح سے گھٹتی ہے اس لیے میں نے یہ اسلوب چھوڑ دیا اور یہ بات بالفعل آشکار کر دی کہ اسلام کی بنیادیں اتنی گہری ہیں کہ فلسفے کی گہری سے گہری بنیادیں بھی وہاں تک نہیں جاسکتی ہیں بلکہ اس کے مقابلے میں وہ بالکل سطح پر رہتی ہیں۔

اس حقیقت کو ''تیسویں مقالے'' نے، ''چوبیسویں مکتوب'' نے اور ''انتیسویں مقالے'' نے دلائل و براہین کے ساتھ طشت اَز بام کر دیا ہے۔

پس پہلے راستے میں چونکہ یہ گمان ہوتا ہے کہ فلسفہ بڑی گہرائی کا مالک ہے اور اس کے مقابلے میں اسلام کے احکام سطحی سے ہیں، اس لیے اسلام کی حفاظت کے لیے فلسفے کی شاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا جاتا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ فلسفے کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں نہیں!

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيمَ اِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ

آٹھویں قسم یعنی رُموزِ ثمانیہ

توافق کے بارے میں چھوٹے چھوٹے آٹھ عدد رسائل ہیں جو کہ علمِ جفر کا ایک اہم قانون، مخفی علوم کی اور قرآن کے بعض غیبی اسرار و رموز کی ایک اہم کلید ہے۔ انہیں عنقریب کسی دوسرے مجموعے میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس لیے یہاں نہیں لکھے گئے (حاشیہ:۱)

نویں قسم

تلویحاتِ تسعہ (حاشیہ:۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

[یہ قسم خصوصی طور پر ولایت کے طرق کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ اور یہ نو تلویحات پر مشتمل ہے۔]

پہلی تلویح: تصوف، طریقت، ولایت اور سیر و سلوک کے عناوین کے تحت لذت و سرمستی سے بھرپور ایک مقدس اور

(حاشیہ:۱) ان کی فہرست کی ایک قسم کو ''ذوالفقار'' نامی کتاب کے عربی نسخے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ مترجم۔

(حاشیہ:۲) تلویح کا معنی بھی اشارہ کرنا ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ اشارہ عام ہے، دور سے کیا جائے یا نزدیک سے، لیکن تلویح صرف دُور سے اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ مترجم۔

نورانی روحانی حقیقت پائی جاتی ہے جس کے بارے میں بہت سے اربابِ کشف و ذوق نے اعلان کیا ہے اور اس کے درس و تدریس اور تمحیص و تعریف کا اہتمام کیا ہے اور اس سے متعلق ہزاروں ہزاروں کتابیں لکھی ہیں، اور اس طرح اُمت کو اور ہمیں اس کے بارے میں خبر دی ہے۔ جَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا كَثِيْرًا

اس مقام پر ہم حالاتِ حاضرہ کی کچھ مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے چند رشحات کی وضاحت کریں گے ظاہر ہے کہ یہ رشحات حقیقت کے اس بحرِ ذخار کے چند قطروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوال: طریقت کیا ہے؟

الجواب: ''طریقت'' کی غرض و غایت اور اس کا ہدف شہود کے ساتھ مشابہت رکھنے والی ایک وجدانی اور ذوقی حالت تک پہنچنے کے لیے معراجِ محمدی کے سائے تلے اور اس کے جھنڈے کے نیچے روحانی سیر و سلوک کے ذریعے دل کے قدموں کے ساتھ چل کر منزلیں طے کرنا ہے تاکہ ایمانی اور قرآنی حقائق کی پہچان ہو جائے اور ان کا انکشاف ہو جائے۔ پس طریقت تصوّف کے نام پر ایک بلند ترین انسانی راز اور عالی شان بشری کمال ہے۔

جی ہاں؛ انسان چونکہ اس کائنات کی جامع ترین فہرست ہے، اس لیے انسان کا دل ہزاروں جہانوں کے لیے ایک معنوی نقشے کی حیثیت رکھتا ہے۔

جی ہاں؛ جس طرح یہ غیر محدود انسانی علوم و فنون ہی اس بات کی دلیل ہیں کہ انسان کے سر میں پایا جانے والا دماغ ایک طرح سے کائنات کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل ایسے جیسے وائرلیس، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کی لامحدود لائنوں کی ایک ایکسچینج ہوتی ہے۔ اسی طرح لاکھوں کے حساب سے یہ نورانی کتابیں جو غیر محدود اور لاتعداد اولیاء نے لکھی ہیں، اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کی ماہیت میں پایا جانے والا اس کا دل بھی کائنات میں پائے جانے والے غیر محدود اور لاتعداد حقائق کی گٹھلی کی اور دار و مدار کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان کا دل اور اس کا دماغ جب اس طرح کی مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں ہزاروں اُخروی اور ابدی مشینیں اور کل پُرزے اور ادوات و آلات رکھ دیے گئے ہیں جیسے کہ ایک گرانڈیل درخت کو اس کے ایک چھوٹے سے بیج میں رکھ دیا گیا ہے؛ تو پھر بلاشبہ اس دل کے خالق نے یہ ارادہ کیا کہ دل سرگرمِ عمل رہ کر ''قوت'' سے ''فعل'' کی طرف آ جائے اور منکشف ہو کر ہر حال میں متحرک رہے۔ اس لیے اُسے اسی طرح سے پیدا کیا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے جب یہی چاہا ہے تو پھر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ دل بھی عقل کی طرح کام کرتا ہے۔ اور دل کو کام میں لانے کا سب سے بڑا وسیلہ اُسے راہِ طریقت میں اور ولایت کے مراتب میں ذکرِ الٰہی کے ذریعے ایمانی حقائق کی طرف متوجہ رکھنا ہے۔

دوسری تلویح: اس قلبی سیر وسلوک

کی شاہِ کلید اور اس رُوحانی حرکت کا وسیلہ ذکرِ اِلٰہی اور تفکّر ہے۔ اور اس ذکر وفکر کے محاسن گنتی سے باہر ہیں۔ ان کے غیر محدود اُخروی فوائد سے اور اس کے انسانیت کو کمالات تک ترقی دینے والے نتائج سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے، اور ان کے صرف ان جزوی سے فوائد کو دیکھا جائے جن کا تعلق اِس مضطرب دنیاوی زندگی کے ساتھ ہے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ:

ہر انسان ہر حال میں تسلّی کا طالب ہے اور ذوق وشوق کی تلاش میں ہے، اور اس طرح کا اُنس ڈھونڈ رہا ہے جو اس کی وحشت دُور کر دے تاکہ وہ سکھ کا سانس لے اور زندگی کی پریشانیوں سے اور اس کی بوجھل تکلیفوں سے کسی حد تک خلاصی پالے۔

دوسری طرف انسانی تمدُّن دوسرے لوگوں کے ساتھ مانوس ہونے کے اور تسلّی پانے کے جتنے بھی اور جو بھی وسائل مہیا کرتا ہے وہ دس میں سے ایک دو کو اور وہ بھی وقتی طور پر ہی اُنس واُلفت اور تسلّی مہیا کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی مہیّا کی ہوئی تسلّی غفلت نشے اور بدمستی کے بل پر ہوتی ہے۔

اور اُسی فیصد لوگ یا تو پہاڑوں اور وادیوں میں انفرادی زندگی گزار دیتے ہیں، یا غمِ روزگار اُنہیں آبادیوں سے دُور لے جاتا ہے، یا پھر اگر انسانی معاشرے کے اندر رہ بھی جائیں تو بڑھاپے اور سالخوردگی جیسے آخرت کے بارے میں ڈرانے والے افکار سے جنم لینے والی پریشانیوں کی وجہ سے معاشرے میں پائے جانے والے اُنس سے محروم رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ حالت انہیں کوئی اُنس یا تسلّی فراہم نہیں کر پاتی ہے۔ یاد رکھو کہ ان جیسے لوگوں کے لیے حقیقی تسلّی، خالص اُنس اور میٹھا ذوق صرف اس چیز میں ہے کہ انسان ذکر وفکر کے ذریعے دل کو متحرک کرے، چنانچہ وہ ان دُور دراز کے علاقوں میں، وحشت خیز پہاڑوں میں اور تشویشناک وادیوں میں رہ کر اپنے دل کی طرف متوجہ ہو جائے اور ''اللہ اللہ'' کا وِرد کرے اور اپنے دل کو اس ذکر کے ساتھ مانوس کرے۔ پھر اس اُنس کی برکت سے اپنی طرف دیکھنے والی اِردگرد کی تمام وحشت خیز اشیاء کے بارے میں یہ تصوّر کرے کہ یہ تمام اُشیاء اُنس اور محبت بھری مسکراہٹ بکھیر رہی ہیں۔ چنانچہ وہ یوں کہے کہ:

میرا خالق جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس کے عبادت گزار حد سے زیادہ ہیں اور وہ میری اس وحشت خیز جگہ میں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور وہ ہر طرف موجود ہیں، اس لیے میں اکیلا نہیں ہوں اور وحشت محسوس کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں۔

یوں اُسے اِس ایمان بھری زندگی سے ایک مانوسیّت پیدا کرنے والا ذوق ملے گا اور وہ زندگی کی سعادتمندی وفیروز بختی کا معنی سمجھ جائے گا اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرے گا۔

تیسری تلویح:

ولایت رسالت کی ایک حُجّت اور طریقت شریعت کی ایک برہان ہے؛ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایمانی حقائق جسے

رسالت آگے پہنچاتی ہے ولایت انہیں ایک قسم کے قلبی شہود اور روحانی ذوق کے ذریعے حق الیقین کے درجے میں دیکھتی اور ان کی تصدیق کر دیتی ہے۔ پس اس کی یہ تصدیق رسالت کی حقانیت کی قطعی حجت ہوتی ہے۔

جن احکام کا درس شریعت دیتی ہے، طریقت اُن سے استفادہ کرنے، ان سے فیض پانے اور ان احکام کو چکھنے اور ان کا انکشاف کر دینے کی وجہ سے اس بات کی واضح برہان ہے کہ شرعی احکام مبنی برحق ہیں اور یہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔

جی ہاں؛ جیسے ولایت اور طریقت رسالت وشریعت کی حجت اور دلیل ہیں، اسی طرح یہ اسلامیت کے راز کی رُو سے اسلام کے کمال کا راز، اس کے انوار کا دارومدار، انسانی ترقیوں کی کان اور اس کے فیضانات کا سرچشمہ ہیں۔

اب باوجود اس کے کہ اس میں یہ بہت بڑا راز پایا جاتا ہے اور یہ چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے؛ کچھ گمراہ فرقے اس کے انکار پر اڑے ہوئے ہیں اور اس طرح وہ جن انوار سے خود محروم ہوئے ہیں دوسروں کو بھی ان سے محروم رکھنے کا سبب بن رہے ہیں۔

اور سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اہل السنہ واب عہ کے متعدد ظاہر بین علماء اور اہل السنہ ولب عہ کی طرف منسوب کچھ غافل قسم کے سیاستدان اہلِ طریقت کی کچھ غلطیاں اور غلط کاریاں دیکھ کر ولایت وطریقت کے اس خزینۂ عُظمٰی کے دروازے بند کر دینے کی سر توڑ کوشش میں مصروف ہیں۔ بلکہ اسے سرے سے منہدم اور زمین بوس کر دینے کی اور اس آبِ حیات مہیا کرنے والے ابلتے ہوئے چشمے کو خشک کر دینے کی پوری جدوجہد کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اَشیاء ومناہج ومسالک میں کوئی شاذونادر چیز ہی کمی کوتاہی سے پاک اور ہر پہلو سے صحیح اور خوبصورت ہوتی ہے! اس لیے کمی کوتاہی، غلط استعمال اور غلطیوں کا سرزد ہونا ایک ضروری عمل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی آدمی جب کسی ایسے کام کو ہاتھ ڈالتا ہے جس کا وہ اہل نہیں ہوتا تو کام خراب کر دیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ آخرت میں اپنی ربانی عدالت اعمال کے توازن کے مطابق نیکیوں یا برائیوں کے پلڑے کو بھاری کر کے ظاہر کرے گا چنانچہ جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوا اور جھک گیا اسے حسنِ ثواب سے نوازا جائے گا اور اس کے اعمال شرفِ قبولیت پائیں گے۔ اور جس کا برائیوں کا پلڑا بھاری اور نیکیوں کا ہلکا ہوا اُسے سزا ملے گی اور اس کے اعمال ردّ کر دیے جائیں گے۔

یاد رہے کہ اس ضمن میں اعمال کو ''کمیت'' کے حساب سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ انہیں اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے ''نوعیت'' کو، چنانچہ بسا اوقات ایک نیکی ایک ہزار برائیوں پر بھاری ہو جاتی ہے، بلکہ کبھی اسے ختم کر دیتی، مٹا ڈالتی اور نیک آدمی کو بچانے کا سبب بن جاتی ہے۔

عدالت الٰہیہ کا میزان جب یہی ہے اور وہ اسی کے مطابق فیصلہ کرتی ہے، اور حقیقت اس چیز کو عین حق سمجھتی ہے، تو

پھر طریقت کی سنتِ مطہرہ کے دائرے میں ادا کی گئی نیکیاں بلاشبہ اس کی برائیوں پر بھاری ہوں گی۔

اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اہلِ طریقت نے اہلِ ضلالت کے حملوں کے دوران اپنے ایمان کی حفاظت کی ہے، حتیٰ کہ کسی بھی سلسلے کی طرف منسوب ہونے والا ایک عام مخلص آدمی کسی بھی مدعیِ علم سے بڑھ کر اپنے ایمان کی حفاظت کرتا ہے؛ کیونکہ طریقت میں رہ کر اس نے جو روحانی ذوق حاصل کیا ہے اور اس کے دل میں اولیاء کرام کے بارے میں جو محبت ہے، حتیٰ کہ اگر وہ کبائر کا ارتکاب بھی کر لے، تو بھی صرف فاسق ہو سکتا ہے کافر نہیں؛ کیونکہ وہ آسانی کے ساتھ الحاد و زندیقیت کی صفوں میں داخل نہیں ہو سکتا اور روحانی سلسلوں کے اقطاب و مشائخ کے ساتھ شدید محبت اور پختہ اعتقاد کی صورت میں اس کے دل میں جو وابستگی پیدا ہو چکی ہے اسے کوئی بھی قوت توڑ نہیں سکتی ہے۔ اور چونکہ ان پر اسے جو اعتماد ہو چکا ہے اور ان کے بارے میں اُسے جو اطمینانِ قلب حاصل ہو چکا ہے گمراہی چونکہ اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اس لیے اس کے اس بھروسے اور رضامندی کا بندھن ٹوٹ نہیں سکتا، اور جب تک وہ اِس بھروسے سے محروم نہیں ہو گا کفر میں داخل نہیں ہو گا۔

پس وہ آدمی جو ''طریقت'' سے بے بہرہ ہے اور اس کا دل دھڑکتا نہیں اس کا اس دور کے زندیقوں کے سامنے اپنی مکمل طور پر حفاظت کرنا انتہائی مشکل ہے، اگرچہ وہ کتنا بھی بڑا گہرا عالم کیوں نہ ہو!

ایک بات اور رہ گئی: اور وہ یہ کہ طریقت کو اُس وقت تک اپنایا نہیں جا سکتا اور اُس کے بارے میں ان مذاہب و مشارب کی نیکیوں یا برائیوں کو دیکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے خود کو اہلِ طریقت کہہ کر ظلم ڈھایا ہے اور کچھ نے کوئی ایسی صورت شکل اختیار کر لی ہے جو تقویٰ کے بلکہ اسلام کے دائرے سے باہر ہے۔

اگر ہم ان تمام بلند پایہ دینی، اُخروی یا رُوحانی نتائج سے صَرفِ نظر کر لیں جن تک طریقت پہنچاتی ہے اور عالمِ اسلام کے دائرہ کار کے اندر ان میں سے صرف ایک نتیجے کو سامنے رکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ''طریقت'' ان ایمانی وسائل کے ہراول دستے میں ہے جو مسلمانوں کے مابین اسلامی اخوت کے دائرے کو وسیع کرتے ہیں اور عالمِ اسلام کے اطراف و اکناف میں اپنے مقدّس رابطے کا جھنڈا لہراتے ہیں۔

یہ صوفیانہ سلسلے اُن تین قلعوں میں سے ایک رہے ہیں جن کی آہنی دیواروں پر عیسائیوں کے سیاسی حملے اور ان لوگوں کی تمام چالیں دم توڑتی رہی ہیں اور توڑ رہی ہیں جو اسلام کی روشنی کو بجھانے کی کوششوں میں مصروف رہے ہیں۔ اس لیے ان سلسلوں نے عالمِ کفر اور صلیبیوں کے حملوں کے باوجود ساڑھے پانچ سو سال تک خلافتِ اسلامیہ کی نگہداشت کے ضمن میں جو کردار ادا کیا ہے ہمیں اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

پس پانچ سو جگہوں پر پائی جانے والی ان خانقاہوں میں جو کہ مدرسوں اور مسجدوں کے پیغام کی تکمیل کر رہی

ہیں؛ جوش وخروش کے ساتھ ''اللہ اللہ'' کرنے والوں کی معرفتِ الٰہی سے پھوٹنے والی ایمانی قوت، روحانی محبت اور ذوق وشوق؛ یہ سب چیزیں مجموعی طور پر اس مرکزِ اسلامی میں اہلِ ایمان کے لیے ایک سب سے بڑے نقطۂ ارتکاز کی تشکیل کرتی ہیں۔

پس اے کھوٹی حمیّت اور کھوٹی قومیت کے دعوے دارو اور عقل سے عاری ایجنٹو! تم لوگ یہ بتاتے کیوں نہیں کہ تمہاری معاشرتی زندگی میں وہ کون سی اچھائی ہے جسے طریقت کی کوئی برائی برباد کر رہی ہے؟

چوتھی تلویح:

راہِ طریقت میں چلنا آسان ہونے کے باوجود مشکلات سے بھرا ہوا اور دشوار گزار ہے۔ یہ راستہ چھوٹا سا ہونے کے باوجود بہت لمبا ہے، نفیس اور بلند پایہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطرات سے گھرا ہوا ہے، اور وسیع ہونے کے باوجود انتہائی تنگ ہے۔

یہی وہ گہرے راز ہیں جن کی وجہ سے اس راہ میں چلنے والے کبھی غرق ہو جاتے ہیں، کبھی لڑکھڑاتے ہیں اور تکلیفیں اُٹھاتے ہیں۔ بلکہ کبھی اُلٹے پاؤں واپس ہو جاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، مثال کے طور پر: طریقت میں دو مشرب یا منہج پائے جاتے ہیں: ''سیرِ انفسی'' اور ''سیرِ آفاقی''۔

سیرِ انفسی کا آغاز نفس سے ہوتا ہے۔ اِسے اپنانے والا باہر سے اپنی نظر کو پھیر لیتا ہے اور اپنی ''انانیت'' میں نقب لگا کر اُسے چیرتا ہوا دل پر نظریں جمائے رکھتا ہے۔ پھر وہاں سے آگے گزر جاتا ہے اور دل میں، اور دل سے حقیقت تک پہنچنے کا راستہ کھول لیتا ہے۔۔۔ پھر وہاں سے گزر کر کونی آفاق میں پہنچ جاتا ہے اور انہیں اپنے دل کے نور کی برکت سے منور پاتا ہے، تب وہ تیز رفتاری کے ساتھ چلتا ہوا واصل ہو جاتا ہے؛ کیونکہ جس حقیقت کا مشاہدہ اُس نے نفس کے دائرے میں کیا ہے اُسے وہ اس سے بہت بڑے پیمانے میں آفاق میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ مخفی طریقوں کی اکثریت اسی راستے کے مطابق چلتی ہے۔

اس سیر وسلوک کی سب سے بڑی بنیاد ''انانیت'' کی شان وشوکت کو توڑ دینا، ہوا وہوس سے دستبردار ہو جانا اور نفس کو مار دینا ہے۔

رہا دوسرا منہج، تو اس کا آغاز ''آفاق'' سے ہوتا ہے۔ اس میں چلنے والا اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ جلیلہ کا مشاہدہ اِس وسیع وعریض آفاقی کونی دائرے کے مظاہر میں کرتا ہے پھر نفس کے دائرے میں آجاتا ہے۔ چنانچہ وہ ان تجلیات کے انوار کا اپنے دل کی کائنات کے آفاق میں چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر مشاہدہ کرتا ہے۔ تب دل میں اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ایک قریب ترین راستہ کھل جاتا ہے اور اسے نظر آجاتا ہے کہ دل واقعتاً ذاتِ صمد کا آئینہ ہے۔ یوں اس کی آرزو

کی تکمیل ہو جاتی ہے اور وہ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

پہلے مشرب میں اگر سالک ترکِ ہوا کے ذریعے نفس کو قتل کرنے سے عاجز آجائے اور ''انانیت'' کو توڑ نہ سکے تو وہ مقامِ شکر سے مقامِ فخر میں جا گرتا ہے، اور وہاں سے غرور کی کھائی میں لڑھک جاتا ہے۔ اور اگر یہ چیز محبت سے صادر ہونے والے جذب سے پیدا ہونے والے سُکر کے ساتھ مل جائے تو اس سے ایسے دعووں کا صدور ہونے لگتا ہے جو اس کی حد سے اور اس کی اوقات سے کہیں زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ یہی وہ دعوے ہیں جنہیں ''شطحات'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس روش سے وہ خود بھی نقصان اُٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی پہنچاتا ہے۔

''شطحات'' والے آدمی کی مثال ایک چھوٹے سے سرکاری افسر کی ہے جو لیفٹیننٹ کے رینک پر ہو لیکن اُس چھوٹے سے دائرے میں قیادت کی مستی اور لذت اُسے آپے سے باہر کر دے اور وہ نشے کی حالت میں خود کو فیلڈ مارشل سمجھ لے جو ایک بہت بڑے لشکر کی قیادت کرتا ہے۔ اور یوں اس کے سب سے چھوٹے دائرے میں ہو کر اس پر اس کی جزوی سی قیادت کا معاملہ بہت بڑے پیمانے پر کام کرنے والی قیادت کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا ہے۔

بالکل ایسے جیسے بعض لوگوں کی نظر میں سورج کی چھوٹے سے آئینے میں منعکس ہونے والی تصویر اُس کی اس تصویر کے ساتھ ملتبس ہو جاتی ہے جو سطح سمندر پر منعکس ہو رہی ہوتی ہے؛ کیونکہ وہ دونوں وسعت اور بڑائی میں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں۔

یہی حالت اس ولی اللہ کی ہے جو خود کو ایسے بہت سے لوگوں سے بڑا اور عظیم الشان سمجھتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہیں، بلکہ وہ ان کے مقابلے میں ایسے ہوتا ہے جیسے مَور کے مقابلے میں مکھی۔

لیکن اس طرح کے دعوے کرنے والا خود کو ایسے ہی دیکھ رہا ہوتا ہے جیسے کہ بیان کر رہا ہوتا ہے۔ اور ویسے ہی دیکھ رہا ہوتا ہے جیسے کہ وہ کہہ رہا ہوتا ہے۔

میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو قطبِ اعظم کے تمغے سجائے ہوئے تھا، قطب کے احوال کا دعویٰ کر رہا تھا اور اس کے طور اطوار اپنائے ہوئے تھا، حالانکہ اس میں قطبیّت کی صرف یہی صفات تھیں کہ وہ بیدار ہو گیا تھا اور سُکر سے صحو کے مقام میں آگیا تھا، اور صرف یہ تھا کہ، رازِ ولایت کی رُو سے وہ شعور کی منزل میں تھا۔ میں نے اس سے کہا:

ارے بھائی! جس طرح سلطنت کے قانون کے مطابق صدرِ اعظم کے بڑے دائرے سے لے کر کسی قصبے کے مدیر کے چھوٹے دائرے تک ایک ہی انداز کے متعدد کلی اور جزئی جلوے ہوتے ہیں، اسی طرح ولایت اور قطبیّت کے بھی مختلف جلوے اور دائرے ہیں۔ اور ہر مقام کے بہت سے سائے ہیں۔

آپ نے کہیں چھوٹے سے کونے کی ادارت کے ساتھ مشابہت رکھنے والے کسی چھوٹے سے دائرے میں ہوتے

ہوئے ''صدر'' کے ساتھ مشابہت رکھنے والی قطبیت کے کسی جلوۂ عظمیٰ اور مظہرِ اعظم کا مشاہدہ کر لیا ہے، جس سے آپ پر معاملہ خلط ملط ہو گیا ہے اور آپ دھوکہ کھا گئے ہیں، آپ نے جو کچھ دیکھا ہے درست، صحیح اور سچ ہے، البتہ آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ غلط ہے؛ کیونکہ ایک مکھی کے لیے پانی کا ایک چلّو وسیع سمندر ہے۔

وہ بھائی میری اس بات سے ہوش میں آ گیا اور چوکس ہو گیا اور اللہ کے حکم سے اس بھنور سے نجات پا گیا۔

اسی طرح میں نے متعدد ایسے لوگ دیکھے جو خود کو بہت قریب پہنچا ہوا شمار کرتے یا خود کو ''امام مہدی علیہ السلام'' جیسا سمجھتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک یہ کہتا تھا کہ عنقریب میں ''مہدی'' بن جاؤں گا۔

یہ لوگ جھوٹے اور دھوکہ باز نہیں ہیں، صرف یہ ہے کہ دھوکہ کھا جاتے ہیں؛ اِن کے دھوکہ کھا جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے ہی حق سمجھتے ہیں۔ لیکن جس طرح کہ اسمائے الٰہیہ کی عرشِ اعظم سے لے کر ذرّے تک تجلیات پائی جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی ہے کہ الوان ونفوس میں اِن تجلیات کے مظاہر خود اسی نسبت سے متفاوت ہیں۔ اور ولایت کے مراتب جو کہ ان مظاہر کو حاصل کرنے اور ان سے مشرّف ہونے کا نام ہے، وہ بھی متفاوت ہیں۔

اس التباس کا اہم سبب یہ ہے کہ اولیاء کے بعض مقامات میں ''امام مہدی علیہ السلام'' کے خواص اور وظائف پائے جاتے ہیں، اور ان میں قطبِ اعظم کے ساتھ خاص نسبت کا اور خضرؑ کے ساتھ خاص تعلق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

چنانچہ کچھ مقامات ایسے ہیں جن کے بعض مشاہیر کے ساتھ خاص تعلقات اور روابط ہیں، حتی کہ ان مقامات پر ''مقامِ خضر'' کا ''مقامِ اویس'' کا اور ''مقامِ مہدیت'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس راز کی بنا پر اس مقام تک یا اس مقام کے کسی جزء تک یا اس کی کسی پرچھائیں تک پہنچ جانے والے لوگ اپنے آپ کو مشہور یگانہ روزگار سمجھنا شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ کوئی ان میں سے اپنے آپ کو خضر یا مہدی سمجھتا ہے، یا اس کا یہ خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ وہ قطبِ اعظم ہے۔

اس صورتِ حال میں اگر اس کی انانیت اس حد تک مٹ گئی ہو کہ اس میں احبِّ جاہ کا اور دوسروں پر فخر کرنے کا شائبہ تک بھی باقی نہ رہا ہو تو اس کی مانی نہیں جائے گی اور اس کے حد سے بڑھے ہوئے دعووں کو ''شطحیات'' شمار کیا جائے گا۔ اور بسا اوقات اسے ان چیزوں کا ذمہ دار بھی نہیں ٹھہرایا جائے گا اور اُسے معاف رکھنا بھی ممکن ہو گا۔

لیکن یہی دعوے اگر کسی ایسے شخص سے صادر ہوں جس کی انانیت بدستور باقی اور حبِّ جاہ کی آرزومند ہو، اور اگر اس کی یہ انانیت اس پر غالب آ جائے گی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مقامِ شکر کو پیچھے چھوڑتی ہوئی فخر کی منزلوں میں لے جائے تو پھر وہاں سے وہ ڈھیرے ڈھیرے نیکیوں کو برباد کر دینے والے غرور کے گھاٹ جا اُترے گا۔ اور پھر یا تو جنوں کا شکار ہو جائے گا یا حق کے راستے سے بھٹک جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اولیائے عظام کو اپنے جیسا سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور ان کے بارے اس کا حُسنِ ظن کم ہونا شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ نفس کتنا بھی مغرور کیوں نہ ہو جائے بہر کیف اُسے اپنی کمی کوتاہی کا

ادراک ہوتا ہے، اپنی اسی کوتاہی کی بنا پر وہ ان اولیائے عظام کو خود پر قیاس کرتا ہے اور انہیں بھی اپنی طرح ناقص سمجھتا ہے، اور نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ اس کے دل میں انبیائے کرام علیہم السلام کا احترام بھی کم ہو جاتا ہے۔

پس جو اِس طرح کی صورتِ حال میں مبتلا ہو جائے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے میزان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر رکھے، اُصولِ دین کے علماء دساتیر کے کو اپنے لیے پیمانہ بنالے ''امام غزالیؒ'' اور ''امام ربانیؒ'' جیسے محقق اولیاء کی تعلیمات کو اپنے لیے دلیلِ راہ بنالے، اپنے آپ پر ہمیشہ تہمت رکھتا رہے اور خود کو ہمیشہ عاجز، فقیر اور قصور وار سمجھتا رہے۔

اس مشرب میں بعض سالکین کے ہاں جو ''شطحات'' ملتے ہیں وہ حبِ نفس سے جنم لیتے ہیں؛ کیونکہ محبت کی آنکھ کو کمی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ ایسا سالک اپنی کوتاہ، نالائق اور کانچ کے ٹکڑے جیسی ذات کو اِس حبِّ ذات کی وجہ سے زمرد و الماس سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

اس قسم کے سلوک میں جو بات سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ یہ ہے کہ: وہ جزوی معانی جو الہام کی صورت میں دل پر وارد ہوتے ہیں ان معانی کو سالک اللہ کا کلام سمجھ لیتا ہے اور انہیں ''آیات'' کا نام دے دیتا ہے، جس کے نتیجے میں وحی کے بلند پایہ مقدس مرتبے کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔

جی ہاں؛ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہد کی مکھی اور دیگر جانداروں کے الہام سے لے کر عوام الناس کے الہام تک اور نوعِ بشر کے خصوصی الہام تک، اور عام فرشتوں کے الہام سے لے کر خاص مقرب فرشتوں کے الہام تک تمام اِلہامات کلماتِ ربانیہ کی ہی ایک قسم ہوتے ہیں، لیکن کلام ربانی خطابِ ربانی کے مختلف جلوے ہوتے ہیں جو مظاہر و مقامات کی قابلیتوں کے حساب سے ستر ہزار پردوں کے پیچھے سے جگمگاتے ہیں۔

رہا اس طرح کے الہامات کو ''آیات'' کا نام دینا جو کہ اُس قرآن کے حصوں اور ٹکڑوں کا نام ہے جو وحی اور کلام اللہ کا خاص نام اور اُس کی واضح مشخص مثال ہے، تو یہ بالکل غلط ہے۔

کیونکہ سورج کی مستور و مخفی لیکن ہمارے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے چھوٹے سے رنگین مجلاّ آئینے میں نظر آنے والی صورت کی آسمانوں والے سورج کے سامنے کیا نسبت اور کیا حیثیت ہوگی؟

یہی معاملہ ان دعوے داروں کے دلوں میں پائے جانے والے الہامات کا ہے جب انہیں اس ''قرآن'' کے سورج کی آیات کے مقابلے میں رکھا جائے جو کہ براہِ راست اللہ کا کلام ہے۔ جیسے کہ بارہویں، پچیسویں اور ا م یں مقالے میں واضح کر دیا گیا ہے اور ثابت کر دیا گیا ہے۔

جی ہاں! اگر یہ کہا جائے کہ ہر آئینے میں ظاہر ہونے والی سورج کی یہ صورتیں سورج ہی کی صورتیں ہیں اور اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، تو اس کی یہ بات حق ہے۔ لیکن کرۂ ارض کو آئینوں والے ان سورجوں کے ساتھ اور ان کی کشش کے

ساتھ نہیں باندھا جا سکتا ہے۔

پانچویں تاویح:

''وحدۃ الشہود'' کا مشرب جو کہ طریقت کے مشرب ''وحدۃ الوجود'' کے تحت پایا جانے والا ایک اہم مشرب ہے، یہ مشرب نظر کو صرف واجبُ الوجود میں منحصر کرتا ہے، یعنی صرف ''واجبُ الوجود'' ہی حقیقی طور پر موجود ہے اور بقیہ تمام موجودات سائے، وہم اور خیال ہیں اور اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اُن پر ''واجبُ الوجود'' کے مقابلے میں وجود کا اطلاق کیا جا سکے! اس بنا پر اس مشرب والے موجودات کو وہم اور خیال سمجھتے ہیں اور ترکِ ماسوی اللہ کے مرتبے میں اسے عدم شمار کرتے ہیں۔ حتی کہ وہ اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ موجودات کو اسمائے حسنیٰ کی تجلیات کے خیالی آئینے شمار کرتے ہیں۔

یہ مشرب ایک اہم حقیقت پر مشتمل ہے، اور وہ یہ کہ: اس کے قائلین کے نزدیک ایمانی قوت اور حق الیقین کے درجے تک پہنچی ہوئی ولایتِ عالیہ کے انکشاف کی بنا پر ممکنات کا وجود اس حد تک سُکڑ جاتا ہے کہ وہم خیالی اور عدم کے درجے تک جا پہنچتا ہے۔ یعنی یہ لوگ ''واجب الوجود'' یعنی اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کائنات کے وجود کا انکار کر دیتے ہیں۔

لیکن اس مشرب میں ہلاکت خیز خطرات پائے جاتے ہیں، ان میں سے پہلا اور اہم ترین یہ ہے کہ:

ایمان کے ارکان چھ ہیں، اور ایمان باللہ کے علاوہ بھی ارکان پائے جاتے ہیں، جیسے ایمان بالآخرت وغیرہ۔ اور یہ ارکان ممکنات کے وجود کا تقاضا کرتے ہیں، کیوں ان محکم ارکان کی بنیاد خیال پر نہیں رکھی جا سکتی!

اس لیے اس مشرب کو ماننے والا جب سُکر و استغراق کے عالم سے نکل کر صحو کے عالم میں داخل ہو جائے تو اُسے کسی بھی صورت میں اس مشرب کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہیے۔ اور اس کے لیے لازم ہے کہ اس مشرب کے تقاضے کے مطابق عمل ہرگز نہ کرے اور اس قلبی، حالی اور ذوقی مشرب کو عقلی، قولی اور علمی مشرب کے رُوپ میں تبدیل بھی نہ کرے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب و سنت سے وارد ہونے والے عقلی دساتیر، علمی قوانین اور کلامی اصول اس مشرب کے متحمل نہیں اور اُن میں اس کے مطابق چلنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مشرب خلفائے راشدین، ائمۂ مجتہدین اور کبار سلف صالحین میں صراحت کے ساتھ نظر نہیں آتا ہے۔

ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ مشرب کوئی اعلیٰ ترین حتی کہ عالی شان مشرب نہیں، بلکہ ناقص لیکن بڑا اہم بڑا خطرناک اور بڑا بوجھل اور ذائقے دار مشرب ہے۔ اور اس کے اس ظاہری ذائقے کی وجہ سے اس میں داخل ہونے والے اس سے باہر آنا پسند نہیں کرتے ہیں اور اسے اپنی اس پسندیدگی اور وارفتگی کی وجہ سے ایک بلند پایہ مرتبہ سمجھتے ہیں۔

ہم چونکہ ''نقطہ'' نامی مضمون میں اور بعض ''مقالات و مکتوبات'' میں اس مشرب کی بنیاد اور ماہیت کو چندے وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، اس لیے اُس پر اکتفا کرتے ہوئے اس مقام پر اس اہم مشرب کے ایک اہم گڑھے کی

وضاحت کرتے ہیں جس میں ''وحدت الوجود'' میں سرگرداں لوگ عام طور پر گر پڑتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ:

یہ ایک ایسا مناسب مشرب ہے کہ جس سے ترکِ ماسوی اللہ کی روشنی میں مادی اسباب کے دائرے سے آگے گزر کر ممکنات سے قطعِ تعلق کر لینے والے اخص الخواص لوگ مطلق استغراق کی حالت میں اس کا مظہر بن جاتے ہیں۔

اور وہ لوگ جو اسباب میں غرق اور دنیا کے عاشق ہیں اور مادی فلسفے کے ذریعے نیچر کی دلدل میں دھنس چکے ہیں، ایسے لوگوں کی نظروں کو اس مشرب کی علمی صورت میں تلقین کرنا انہیں نیچر اور مادہ میں مزید غرق کر دینے اور اسلامی حقیقت سے دور ہٹا دینے کے مترادف ہے؛ کیونکہ دنیا کی عاشق اور اسباب کے دائرے کے ساتھ چمٹی ہوئی نظر اس فانی دنیا کو ایک طرح کی بقا اور دوام دینا چاہتی ہے اور اپنی اس محبوب دُنیا کے ختم ہو جانے کو اور اس کو اپنے ہاتھوں سے جاتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی۔

چنانچہ وہ ''وحدت الوجود'' کے وسیلے سے اس کا وجود ہمیشہ رہ جانے والا سمجھتی ہے۔ وہ اپنی محبوب دنیا کے کھاتے میں اور اُسے مکمل طور پر بقا و دوام اور ابدیت کا مالک بنا دینے کی بنا پر اس فانی دنیا کو معبود کے درجے تک پہنچا دیتا ہے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے انکار کے گڑھے میں گرنے کے لیے راستہ ہموار کر لیتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔

اس دور میں مادی سوچ فکر کی بنیادیں چونکہ اس حد تک مضبوط ہو چکی ہیں کہ یہ مادہ پرست لوگ مادیات کو ہی ہر چیز کا اصل اور مرجع سمجھتے ہیں، اور خواص اہلِ ایمان مادیات کو معدوم اور کچھ بھی نہ ہونے کی حد تک غیر اہم اور فضول سمجھتے ہیں؛ اس لیے اگر اس دور میں ''وحدت الوجود'' کو رواج دے دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ مادہ پرست اس پر قبضہ کر لیں اور اسے حجت بنا کر کہیں: ''ہم بھی تو یہی کہتے ہیں نا''! حالانکہ دنیا میں اگر ان مادہ پرست اور نیچر پرست لوگوں سے سب سے زیادہ دُور کوئی مشرب ہے تو وہ ''وحدت الوجود'' کا مشرب ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحدت الوجود کا اعتقاد رکھنے والے اپنی ایمانی قوّت کی برکت سے الٰہی کا اس حد تک اہتمام کرتے ہیں کہ کائنات و موجودات کا یکسر انکار کر دیتے ہیں۔

لیکن مادہ پرست موجودات کو اتنی اہمیّت دیتے ہیں کہ کائنات کے بھروسے پر اللہ تعالیٰ کا انکار کر دیتے ہیں۔

ان دونوں گروہوں کا مقابلہ ہی کیا ہے؟

چھٹی تلویح:

۔۔۔تین نقطے ہیں۔

پہلا نقطہ: ولایت کا خوبصورت ترین، مضبوط ترین، تابندہ ترین، اور سب سے زیادہ مالا مال راستہ سنتِ مطہرہ کی اتباع ہے؛ یعنی یہ کہ سالک اپنے اعمال و حرکات میں سنتِ مطہرہ کو پیشِ نظر رکھے اور اس کی پیروی اور تقلید کرنے اور اپنے افعال و معاملات میں احکامِ شرعیہ کو تصوّر میں رکھے اور اسے دلیلِ راہ بنائے۔

پس اُس کے معمول کے اور عادی حالات، عُرفی اور رواجی معاملات اور فطری حرکات اس اتباع و اقتدا کے وسیلے سے عبادات کی شکل دھار جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ سنت کی پیروی میں سنت و شریعت کو نگاہ میں رکھ کر مردِ مومن کا ہر عمل اُسے حکمِ شرعی کی یاد دلائے گا، یہ یاد اُسے صاحبِ شریعت کی یاد دلائے گی اور صاحبِ شریعت کی یاد اُسے اللہ تعالیٰ کی یاد دلائے گی، اور یہ یاد ایک قسم کی حضوری کا سبب بنے گی۔ تب اس حالت میں عمر کی گھڑیوں کو حضوری کی حالت میں کی گئی دائمی عبادت میں تبدیل کر دے گی۔

اس بنا پر سنتِ مطہرہ کی پیروی جادۂ کبریٰ ہے، اور یہ صحابہ کرام اور سلف صالحین کا راستہ ہے جو کہ نبوت کی ولایتِ کبریٰ جیسی وراثت کے مالک ہیں۔

دُوسرا نقطہ:

ولایت کے تمام طُرق اور طریقت کی تمام راہوں کے لیے اِخلاص ایک اہم بنیاد ہے؛ کیونکہ اخلاص ہی شرک خفی سے نجات حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے۔ اس لیے جس کے دل میں اخلاص نہیں وہ ان راستوں میں نہیں چل سکتا اور ان راستوں میں چلنے کے لیے جو قطعی قوت درکار ہے وہ ہے محبت۔

جی ہاں؛ محبت اپنے محبوب پر تنقید کرنے کے بہانے نہیں ڈھونڈتی اور اس میں کوئی کمی کوتاہی دیکھنے کی روادار نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے محبوب کے کمال پر ''دلالت کرنے والی کمزور سی علامتیں بھی اسے مضبوط ترین دلیلیں نظر آتی ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ اس کے محبوب کے حق میں ہوتی ہیں۔

اس راز کی رُو سے جو لوگ اپنے دلوں کیساتھ محبت کی راہ سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ شبہات و اعتراضات پر کان نہیں دھرتے اور نہایت آسانی کے ساتھ خود کو ظنون و اَوہام سے بچا لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ہزاروں شیطان بھی ا[illegible] ہو جائیں تو بھی اُن کے محبوب حقیقی کے کمال پر دلالت کرنے والی کسی ایک نشانی کو بھی زائل نہیں کر سکتے ہیں اور اگر یہ محبت نہ ہو تو انسان اپنے نفس اپنے شیطان اور خارجی شیطانوں کے وسوسوں کے نیچے مضطرب اور پریشان رہے گا اور شیاطین کے اعتراضات و شبہات کے آگے شکست کھا جائے گا۔ پس اس صورتِ حال میں اسے گہری نظر، ایمان کی قوت اور جوانمردی کی مضبوطی و پائداری ہی محفوظ رکھ سکتی ہے۔

پس اس راز کی رُو سے، اللہ تعالیٰ کی معرفت سے وارد ہونے والی محبت ولایت کے تمام مراتب میں ایک اہم تریاق اور اکسیر کا حکم رکھتی ہے البتہ محبت کی راہ میں ایک بڑا مہلک گڑھا ہے، اور وہ یہ کہ:

اس بات کا خدشہ بہرکیف موجود ہے کہ مُحب کہیں گریہ وزاری و محویت جیسے رازِ عبودیت سے گزر کر ناز و نخرے اور دعوے کی ڈگر پر نہ چل پڑے اور غیر متوازن ہو کر ڈگمگاتا پھرے، اسی طرح اس بات کا بھی خدشہ ہے کہ اس کے غیر اللہ کی

طرف متوجہ ہوتے وقت یہ محبت ''حرفی معنی'' سے ''اسمی معنی'' میں تبدیل ہو جائے! اور یوں یہ محبت جو تریاق ہے اس کے لیے زہرِ قاتل بن جائے! یعنی جب وہ غیر اللہ کے ساتھ محبت کرے تو ضروری ہے کہ اس کے ساتھ دل کی وابستگی اللہ کے نام سے اور اسی کے لیے ہو اور اس حیثیت سے ہو کہ یہ دل اس کے اسمائے حسنٰی کا آئینہ ہے۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ محب اللہ کو چھوڑ کر محبوب کی صفات کی طرف، اس کے شخصی کمال طرف اور اس کے ذاتی جمال کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، یعنی اس کے ساتھ اسمی معنی میں محبت کرتا ہے۔ حتی کہ ممکن ہے کہ اس کے ساتھ ایسے بھی محبت کرے کہ اللہ اور نبی کا تصور بھی نہ کر سکے!

اس طرح کی محبت اللہ کی محبت کا وسیلہ نہیں بن سکتی بلکہ اس کے لیے حجاب کا کام دیتی ہے۔ اور اگر یہ ''حرفی معنی'' میں ہو تو اللہ کی محبت کا وسیلہ بن جاتی ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ اللہ کی محبت کا جلوہ ہے۔

تیسرا نقطہ:

یہ دنیا دائرُ الحکمت اور دائرُ الخدمت ہے دائرُ الجزاء اور دائرُ المکافات نہیں۔

اعمال اور خدمات کا بدلہ جو اس دنیا میں ملتا ہے، وہی برزخ اور آخرت میں ملے گا۔ اور یہاں پہ کیے گئے اعمال برزخ اور آخرت میں ثمرات عطا کریں گے۔

حقیقت جب یہی ہے تو پھر ضروری ہے کہ اُخروی اعمال کے نتائج و ثمرات کا مطالبہ اس دنیا میں نہ کیا جائے۔ اور اگر یہ مل جائیں تو پھر ضروری ہے کہ خوشی خوشی نہیں بلکہ غم و اندوہ کے ساتھ قبول کرنا چاہیے؛ کیونکہ یہ بات قرینِ عقل نہیں کہ اخروی اعمال کے ثمرات جو کہ جنت میں کبھی ختم نہیں ہوں گے، انہیں اس فانی دنیا میں فانی صورت میں کھا کر ختم کر دیا جائے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ جیسے ہمیشہ روشن رہتے چراغ کے بدلے میں کوئی ایسا چراغ لے لیا جائے جس کی روشنی لمحے میں ختم ہو جائے گی!

یہی وہ گہرا راز ہے جس کی بنا پر اولیائے کرام خدمت، مشقت، مصیبت اور تکلیف کو خوشگوار سمجھتے ہیں اور اسے بطیب خاطر قبول کرتے ہیں، مصیبت آنے پر واویلا نہیں کرتے، ناز نہیں کرتے، برافروختہ نہیں ہوتے اور حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے اور کہتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلَی کُلِّ حَالٍ

اور جب اللہ تعالیٰ انہیں کشف و کرامات و اذواق و انوار سے نوازتا ہے تو انہیں اللہ کی خاص توجہ اور نظرِ کرم سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور اس طرح کی کرامت کو چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس پر فخر نہیں کرتے بلکہ پہلے سے زیادہ شکر و عبودیت کا پیکر بن جاتے ہیں۔ ان میں بہتیرے تو ایسے ہیں کہ وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اُن کے یہ احوال چھپے رہیں بلکہ آرزو کرتے ہیں کہ ختم ہی ہو جائیں تا کہ ان کے اعمال میں پائے جانے والے اخلاق میں کہیں خلل نہ آ جائے!

جی ہاں؛ کسی مقبول بندے پر اللہ تعالیٰ کا اہم احسان یہ ہے کہ اسے اپنے پر کیے جانے والے احسان کا احساس تک نہ

ہونے پائے۔ تاکہ وہ تضرع وخاکساری اور نیازمندی وانکساری کے دائرے سے نکل کر ناز ونخرے کے دائرے میں اور حلقۂ شکر سے نکل کر حلقۂ فخر میں داخل نہ ہو جائے:

اس حقیقت کی بنا پر اصحابِ ولایت وطریقت ہمیشہ اُن اذواق وکرامات سے حلقہ گریزاں رہیں جو کہ ولایت سے ٹپکنے والے چند چھینٹوں کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کی توجہ اسی طرف مبذول ہو جائے اور وہ انہیں چیزوں کو پسند کرنا شروع کر دیں، تو یہ روش ہمیشہ رہنے والے اُخروی ثمرات کو اسی دنیا میں فانی صورت میں کھا لینے کے مترادف ہوگی۔ اس پر مزید یہ کہ یہ لوگ اپنے اعمال میں اس اخلاص سے محروم ہو جائیں گے جس کے ذریعے ولایت ملتی ہے، اور اس طرح خود ولایت سے محروم ہونے کا راستہ ہموار کریں گے۔

ساتویں تلویح۔۔۔چار نکتے ہیں۔

پہلا نکتہ:

شریعت اللہ تعالیٰ کی احدیّت پر مشتمل مطلق ربوبیت سے بغیر کسی پردے اور رُکاوٹ کے براہ راست صادر ہونے والے خطابِ الٰہی کا نتیجہ ہے۔

اس لیے طریقت اور حقیقت کے بلند ترین مراتب شریعت کے اجزاء کا حکم لے لیں گے، چنانچہ دونوں ہمیشہ شریعت کے لیے وسیلے مقدّمے اور خادم کے حکم میں رہیں گے۔ اور یہ ان کے مُحکمات ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ طریقت وحقیقت کے مسالک شریعت کے حقائق تک پہنچنے کے لیے وسائل، خدّام اور زینوں کا حکم رکھتے ہیں۔

چنانچہ سالکِ طریقت، خود شریعت کے اندر حقیقت کا معنیٰ اور طریقت کا راز موجود ہونے کی وجہ سے تدریجاً سب سے بلند مرتبے تک جا پہنچتا ہے۔ تب طریقت اور حقیقت شریعتِ کبریٰ کے اجزاء بن جاتے ہیں۔

اس بنا پر شریعت کو ظاہری چھلکا سمجھنا اور حقیقت کو اس کا باطن، اُس کا نتیجہ اور اس کی غرض وغایت سمجھنا یکسر غلط ہے جیسا کہ بعض اہلِ تصوف کا خیال ہے۔

جی ہاں؛ شرعی احکام کے انکشافات مختلف ہوتے ہیں اور لوگوں کی سمجھ سوچ کے درجات وطبقات کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ عوام کی کچھ چیزیں عوام الناس پر منکشف ہوتی ہیں اور کچھ خواص پر۔ اس لیے عوام کے لحاظ سے ظاہری شریعت کو ہی شریعت کی اصل حقیقت سمجھ لینا بھی غلط ہے اور شریعت کے خواص پر منکشف ہونے والے مرتبے کو ''حقیقت'' کا اور ''طریقت'' کا نام دے دینا بھی غلط ہے۔

کیونکہ شریعت کے بہت زیادہ مراتب ہیں اور نوعِ انسان کے عمومی طبقات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

اس راز کی بنا پر، اہلِ طریقت اور اہلِ حقیقت جُوں جُوں اپنے مسلک میں آگے بڑھتے ہیں اُن میں شریعت کی پیروی کا انجذاب واشتیاق بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ وہ چھوٹی سے چھوٹی سنت نبوی کا دامن بڑے سے بڑے مقصد کی طرح مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں اور اس کی پیروی کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وحی الہام سے جس قدر بلند درجہ رکھتی ہے، شرعی آداب جو کہ وحی کا ثمر ہیں، آدابِ طریقت سے جو کہ الہام کے ثمر ہیں۔ اُسی حساب سے زیادہ بلند درجہ رکھتی ہے اور اہمیت کی حامل ہے۔

دوسرا نکتہ:

طریقت اور حقیقت وسیلہ ہیں اس لیے اِن کے لیے ضروری ہے کہ یہ دونوں وسیلے کے دائرے سے باہر ہرگز نہ نکلیں۔ لیکن اگر یہ وسیلے کے دائرے سے نکل کر مقصود بالذات ہوگئیں تو پھر شریعت کے محکم اعمال اور سنت نبوی کے آداب رسمی سے اُمور بن کر رہ جائیں گے اور دل کی توجہ کسی اور طرف ہو جائے گی۔

مطلب یہ ہے کہ پھر سالک حلقۂ ذکر کو نماز سے زیادہ اہمیت دے گا، اس کے دل میں اپنے اوراد واذکار کی نماز سے زیادہ کشش ہوگی اور وہ آدابِ طریقت کی مخالفت سے کبائر سے بڑھ کر بچے گا۔۔ حالانکہ طریقت اور اورادِ تصوف اِن فرائض میں حقیقی ذوق کی تسلی کا دارومدار بنیں خود اس ذوق کا سرچشمہ نہ ہوں۔

مطلب یہ کہ سالکِ راہ کی خانقاہ جامع مسجد میں نماز کے ذوق کا اور اس کے ارکان کو صحیح طور پر ادا کرنے کا وسیلہ ہونا چاہیے۔ وگرنہ جو مسجد میں رسمی طور پر جلدی جلدی نماز ادا کر کے اپنے ذوق اور کمال کو خانقاہ میں ڈھونڈتا ہے وہ حقیقت سے دور ہونا شروع ہو جاتا ہے!۔۔۔

تیسرا نکتہ:

سوال: سنت نبوی اور احکامِ شریعت سے باہر طریقت کا وجود پایا جاتا ہے؟

الجواب: ہے بھی، اور نہیں بھی۔

ہے اس لیے کہ بعض کامل اولیاء شریعت کی تلوار کے ذریعے معدوم کر دیے گئے اور نہیں اس لیے کہ محقق اولیائے کرام سعدی شیرازی کے بیان کردہ اس دستور پر متفق ہیں:

محال است سعدی براہِ صفا
ظفر بُردن جز در پے مصطفیٰ

یعنی یہ محال ہے کہ کوئی شخص جادۂ نبوی ﷺ سے باہر رہ کر اور آپ ﷺ کی پیروی کیے بغیر حقیقت کے حقیقی انوار تک پہنچ جائے۔

اس مسئلے میں پایا جانے والا راز یہ ہے:

رسول اکرم ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء اور عمومی نوعِ بشر کی ترجمانی کرنے میں اللہ تعالیٰ کے مخاطب ہیں، اس لیے بلاشبہ نوعِ بشر کا آپ کے راستے سے باہر رہ کر چلنا ممکن ہی نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ آپ ﷺ کے جھنڈے کے نیچے رہیں۔

اور اہلِ جذب واستغراق چونکہ اپنی مخالفت کے بارے میں جوابدہ نہیں ہیں، اور انسان میں چونکہ بعض لطائف ایسے ہیں جو مکلف نہیں اور پابندی کے دائرے میں نہیں آتے ہیں اس لیے یہ لطیفہ جب انسان میں مستحکم ہو جائے اور اس پر غالب آجائے تو یہ شرعی تکالیف کی مخالفت کرنے پر جوابدہ نہیں۔

اور پھر چونکہ انسان میں کچھ ایسے لطائف ہیں جو جیسے کہ مکلف نہیں ہیں ویسے ہیں اختیار کے تحت نہیں ہیں۔ حتی کہ وہ عقل کی تدبیر کے تحت بھی نہیں ہیں اور وہ لطیفہ عقل اور قلب کی سنتا بھی نہیں، تو بلاشبہ وہ لطیفہ جب کسی شخص پر غالب آجائے تو شریعت کی مخالفت کرنے کے باوجود وہ شخص ولایت کے مرتبے سے نہیں گرے گا۔ لیکن یہ چیز صرف اُسی وقت کے ساتھ خاص ہے، اور اِس اثناء میں اُسے معذور سمجھا جائے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے کسی ایسی شے کا صدور نہ ہو جس سے شریعت کے حقائق اور ایمانی قواعد کے انکار کی، اُن کی تحقیر کرنے کی اور انہیں بے وقعت جاننے کی بُو آتی ہو! اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شریعت کی حقانیت کا اور اس کے احکام کا علم رکھتا ہو اگر چہ ان پر عمل نہ کرتا ہو۔ وگرنہ جب اس پر یہ حال غالب آجائے اور ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ جس سے ان محکم حقائق کے خلاف انکار وتکذیب کی کیفیت پیدا ہو جائے، تو یہ۔نعوذ باللہ۔ہلاکت کی علامت ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ جو اہلِ طریقت شریعت کے دائرے سے باہر ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جن کا ابھی ذکر ہوا ان لوگوں پر یا تو حال؛ استغراق اور جذب وسُکر غالب آجاتا ہے، یا پھر ان پر وہ لطائف حکم چلانا شروع کر دیتے ہیں جو کوئی پابندی قبول نہیں کرتے یا اختیار وارادے کی پروا نہیں کرتے اور یوں شریعت کے دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔

لیکن شریعت سے یہ خروج اس بنا پر نہیں ہوتا کہ وہ احکام شریعت کا احترام نہیں کرتے یا ان پر عمل نہیں کرنا چاہتے، بلکہ وہ انہیں بغیر ارادہ واختیار کے مجبوراً چھوڑتے ہیں۔ اس قسم کے اولیاء موجود ہیں۔ اور ان کے درمیان ایسے کبار اولیاء بھی رہے ہیں جن پر وقتی طور پر یہ حالت غالب رہی بلکہ ان میں سے بعض کے بارے میں محقق اولیائے کرام نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ وہ صرف یہی نہیں کہ دائرۂ شریعت سے خارج ہیں بلکہ بعض تو ان میں سے دائرۂ اسلام سے بھی خارج ہیں، بشرطیکہ وہ رسالتمآب محمد ﷺ کے لائے ہوئے احکام میں سے کسی حکم کو جھٹلاتے نہ ہوں، اگر چہ ان پر عمل نہیں کرتے، اور

عمل اس لیے نہیں کرتے کہ یا تو انہیں ان احکام کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، یا وہ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے، یا انہیں ان کے بارے میں کوئی سُدھ بُدھ اور علم نہیں ہے اور یا اُن کے بارے میں علم حاصل کر ہی نہیں سکتے، لیکن اگر کسی کو علم ہو جائے اور پھر بھی انہیں قبول نہ کرے، یہ نہیں ہو سکتا!۔۔۔

رہے دوسری قسم کے اولیاء، تو وہ طریقت وحقیقت کے تابندہ اذواق کی مستی میں مجذوب ہو جاتے ہیں، چنانچہ انہیں شریعت کے حقائق کا وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا جو کہ ان کے اپنے مذاق سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی کو تو شریعت کے یہ حقائق رسمی سے اور ذوق سے خالی نظر آتے ہیں کیونکہ وہ اس کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان کی پابندی قبول نہیں کرتا، چنانچہ وہ شریعت کو ظاہری چھلکا سمجھتا ہے اور جو حقیقت اس نے پائی ہوتی ہے اُسے اساس، مقصد اور غرض وغایت سمجھتا ہے اور کہتا ہے: ''جو حقیقت میں نے پالی ہے مجھے وہی کافی ہے''۔ اور یوں وہ احکامِ شریعت کے مخالف عمل کرتا رہتا ہے۔

اس قسم کے اولیاء میں سے جو عقل وشعور سے عاری نہیں ہو جاتے ہیں ان سے ان کے اعمال کی باز پُرس ہو گی اور وہ ہلاک ہوں گے۔ بلکہ بعض تو شیطان کے لیے مسخرہ بن جائیں گے۔

چوتھا نکتہ:

گمراہ اور بدعتی فرقوں میں کچھ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو اُمت کی نظر میں مقبول ہیں، جبکہ بعینہٖ انہیں کی طرح کے کچھ اور لوگ ہیں جنہیں اُمت ردّ کر دیتی ہے، حالانکہ بظاہر ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا ہے!

میں اس معاملے میں بڑا متحیر تھا، مثال کے طور پر زمخشری جو کہ معتزلی ہے، مذہب اعتزال میں انتہائی متعصب ہے لیکن اس کے باوجود اہلِ سنت کے محقق علماء اس کی تکفیر نہیں کرتے اور اُسے گمراہ نہیں کہتے اور اُس کے لیے راہِ نجات کی تلاش میں رہتے ہیں، حالانکہ اس نے اُن پر بڑے سخت قسم کے اعتراضات کیے ہیں۔

اس کے برعکس ''ابوعلی جبائی'' جیسے دیگر ائمہ معتزلہ جو کہ ''زمخشری'' کے مقابلے میں کہیں زیادہ نرم ہیں اُنہیں یہ لوگ مردود ومطرود سمجھتے ہیں۔

یہ راز مجھے اکثر پریشان کیے رکھتا تھا۔ پھر لطفِ الٰہی کی طفیل میری سمجھ میں یہ آیا کہ:

زمخشری نے اہلِ سنت پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کا سرچشمہ دراصل یہ ہے کہ اسے حق کے ساتھ شدید محبت ہے اور وہ اپنے مسلک کو حق سمجھتا ہے۔ یعنی اس کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی حقیقی تنزیہ یہ ہے کہ جاندار اپنے افعال کے خالق خود ہوں اس لیے وہ تنزیہ باری تعالیٰ کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے ''خلقِ افعال'' کے مسئلے میں اہلِ سنت کے قاعدے اور دستور کو قبول نہیں کرتا۔ اور معتزلہ کے دیگر مردود ائمہ اس لیے مردود ٹھہرے ہیں کہ وہ اہلِ سنت کے ان قوانین ودساتیر کا انکار اس بنا پر

نہیں کرتے ہیں کہ انہیں حق کے ساتھ محبت ہے، بلکہ اس بنا پر کرتے ہیں کہ ان کی کوتاہ عقلیں ان دساتیرِ عالیہ تک پہنچ نہیں سکیں اور یہ وسیع کوتاہ قوانین ان کے تنگ افکار میں سما نہیں سکے ہیں۔

اوران کی کوتاہ عقلیں ان قوانین کا احاطہ نہیں کرسکی ہیں۔اس لیے ان کے اقوال مردود ہیں اور وہ خود بھی مردود ہیں۔

معتزلہ جو اہلِ سنت کی مخالفت کرتے ہیں جیسے اس کی علم الکلام میں دوصورتیں ہیں، اسی طرح سنت نبوی کے دائرے سے باہر پائے جانے والے اہلِ طریقت کی مخالفت کی بھی دوصورتیں ہیں:

پہلی صورت: یہ کہ وہ امام زمخشریؒ کی طرح اپنے حال اور اپنے مشرب پر شیفتہ وفریفتہ رہے اور شریعت کے آداب کی پابندی سے کسی حد تک آزاد رہے جن کا ذائقہ اسے حاصل نہیں ہوسکا ہے۔

دوسری صورت: وہ طریقت کے دساتیر کے مقابلے میں شریعت کے آداب کو حاشا وکلّا کوئی اہمیت نہ دے؛ کیونکہ اس کی کوتاہ دانی شریعت کے وسیع وعریض اذواق کا احاطہ نہیں کرسکتی اور اس کا کوتاہ مقام ان آدابِ عالیہ تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

آٹھویں تلویح:

اس میں آٹھ قسم کی مہلک بھول بھلیوں کی وضاحت ہے۔

پہلی: سنت نبوی کی صحیح طور پر پیروی نہ کرنے والے بعض اہلِ سلوک وطریقت ولایت کو نبوت پر ترجیح دینے کی وجہ سے مہلک گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ ''چوبیسویں اور تیسویں مقالے'' میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت کردی گئی ہے کہ نبوت کتنی بلند ہے؛ اور نورِ نبوت کے مقابلے میں ولایت کی روشنی کتنی مدھم ہے!

دوسری: کچھ حدود فراموش قسم کے اہلِ طریقت اپنے سلسلے کے اولیاء کو صحابہ کرام پر ترجیح دینے بلکہ انہیں انبیاء کے مرتبے میں دیکھنے کی وجہ سے ہلاکت کے گھاٹ جا اُترتے ہیں۔ ''بارھویں اور ستائیسویں مقالے'' میں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اس کی ذیلی بحث میں یہ بات قطعی طور پر ثابت کردی گئی ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صحبتِ نبوی کی نعمت سے سرفراز ہیں اور یہ چیز ولایت میں ممکن نہیں ہے، اس لیے صرف یہی نہیں کہ اولیاء صحابہ کرام سے کسی بھی وقت بڑھ نہیں سکتے بلکہ اُن کی برابری بھی نہیں کرسکتے۔ اور وہ انبیاء کے مرتبے تک بھی نہیں پہنچ سکتے!

تیسری: کچھ متعصب اور حدود فراموش اہلِ طریقت سنت کے بالکل خلاف چلتے ہیں، چنانچہ وہ طریقت کے آداب و اَوراد کو سنتِ نبوی پر اس حد تک ترجیح دیتے ہیں کہ سنت چھوڑ دیتے ہیں لیکن اپنا وِرد نہیں چھوڑتے۔ اس صورتِ حال سے شرعی آداب سے فراری اور رستگاری کی حالت سامنے آتی ہے جس سے سالک ورطۂ ہلاکت میں جا گرتا ہے۔ یہ چیز بہت سے مقالات میں ثابت کردی گئی ہے۔ جیسے کہ امام غزالیؒ اور امام ربانیؒ جیسے محقق اہلِ طریقت فرماتے ہیں:

''دشمنِ نبویہ میں سے صرف ایک سنت کی اتباع اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک سو آداب اور خصوصی نوافل سے بڑھ کر قبول ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ ایک فرض ایک ہزار سنتوں پر ترجیح رکھتا ہے۔ پس ایک سنتِ نبوی ایک ہزار آدابِ تصوّف پر ترجیح رکھتی ہے۔

چوتھی: کچھ انتہا پسند متصوّفین الہام کو وحی جیسا ہی سمجھتے ہیں اور الہام کو وحی کی ہی ایک قسم شمار کرتے ہیں اور یوں گرداب میں گھِر جاتے ہیں۔ اعجازُ القرآن کے بارے میں لکھے گئے ''بارہویں اور پچیسویں مقالے'' میں اور دیگر رسائل میں وحی کی بلند مرتبی کا، اس کی ہمہ گیریت کا اور اس کی تقدّس مآبی کا انتہائی قطعی طریقے سے اثبات کر دیا گیا ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ الہام اس کے مقابلے میں بالکل جزوی سی اور مدھم سی چیز ہے۔

پانچویں: کچھ اہلِ تصوّف جو کہ رازِ طریقت سے آگاہی نہیں رکھتے ہیں، کمزوروں کو مضبوط کرنے کے لیے، کسلمندوں کو دلیر کرنے کے لیے اور خدمت وعبادت کی مشقتوں اور اُکتاہٹوں میں تخفیف کرنے کے لیے طلب و آرزو کے بغیر حاصل ہو جانے والے انوار و کرامات کو بہت اچھا سمجھتے ہیں، اور یوں ان انوار و اذواق و کرامات کو عبادات و خدمات و اَوراد پر ترجیح دینے کی وجہ سے تباہی کے بھنور میں جا پھنستے ہیں۔ یہ چیز اجمال کے ساتھ اسی کتاب کی چھٹی تلویح، کے ''تیسرے نقطے'' میں بیان کر دی گئی ہے۔ اور دوسرے مقالات میں قطعی انداز سے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ: یہ دارِ دنیا دارِ خدمت ہے دارِ آخرت نہیں۔ اس لیے جو شخص اپنی اُجرت یہیں پہ طلب کرتا ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والے دائمی پھلوں کو فانی اور وقتی صورت میں تبدیل کرتا ہے اس پر مزید یہ کہ وہ دنیا میں باقی رہنے کے ذائقے کو زیادہ پسند کرتا ہے کہ اس کی نظرِ اشتیاق برزخ کی طرف اُٹھتی ہی نہیں، چنانچہ وہ دنیا کی زندگی کے ساتھ بطورِ عادت محبت رکھتا ہے، چنانچہ وہ دُنیا کی زندگی کے ساتھ محبت صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس دنیا میں اُسے آخرت کی جھلک نظر آتی ہے!

چھٹی: اہلِ سلوک میں سے کچھ لوگ جو اہلِ حقیقت میں سے نہیں ہیں، اُس وقت ورطۂ ہلاکت میں جا گرتے ہیں جب مقاماتِ ولایت کی پرچھائیوں کو، اور ان کے جزوی سے نمونوں کو مقاماتِ اصلیہ کلّیہ کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں: ''چوبیسویں مقالے'' کی دوسری شاخ میں اور تمام ''مقالات'' میں یہ بات قطعی طور پر ثابت کر دی گئی ہے کہ:

وہ آئینے جن پر سورج کا عکس پڑ رہا ہے، ان کے متعدد ہونے پر اگرچہ سورج بھی متعدد ہو جاتے ہیں اور اس طرح ہزاروں مثالی سورج عین اصلی سورج کی طرح روشنی اور حرارت کے مالک ہوتے ہیں لیکن یہ تمام مثالی سورج حقیقی سورج کی بہ نسبت انتہائی کمزور ہوتے ہیں۔

بعینہٖ اسی طرح انبیائے کرام اور اولیائے عظام کے مقامات کی بھی پرچھائیاں ہوتی ہیں۔ اہلِ سلوک ان مقامات میں جب داخل ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو ان اولیائے عظام سے بڑا سمجھنے لگتے ہیں، بلکہ خود کو انبیاء سے بھی آگے سمجھتے ہیں

اور یوں ہلاکت کے گھاٹ جا اُترتے ہیں۔

ہلاکت کے ان مذکورہ تمام گھاٹوں سے خود کو محفوظ رکھنے کا بہترین وسیلہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان کے اصولوں کو اور مشہودات کو جب وہ ان بنیادوں سے ٹکرائیں۔ متّہم کریں؛ ورانہیں غلط قرار دیں۔

ساتویں: اہلِ ذوق وشوق میں سے کچھ لوگ ہلاکت کے گڑھے میں اس وقت گرتے ہیں جب وہ فخر وغرور، ناز و نخرے بڑے بڑے دعووں، شطحات، لوگوں کی توجہ طلبی ورمرجع عوام بننے کی خواہش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان تمام چیزوں کو شکر و سپاس، گریہ وزاری، حمد وثنا اور خودداری واستغنا پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ بلند ترین مرتبہ عبدیتِ محمدیہ ہے جسے ''محبوبیت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اور صرف عاجزی وانکساری، شکر وسپاس خشوع وخضوع اور فقر واستغنا کے ذریعے عبودیت کی اس حقیقت کے کمال تک پہنچنا ممکن ہے۔ عبودیت کی بنیاد کا اصل راز یہی ہے۔

بعض اولیائے کرام غلبۂ حال کی وجہ سے وقتی طور پر بغیر اختیار کے فخر وناز شطحات کے سحر میں گرفتار ہوئے، لیکن اس نقطے میں ارادہ واختیار کے ساتھ اُن کی اقتدا نہیں کی جائے گی؛ ان لوگوں نے راہنمائی کی تو ہے لیکن خود۔ اس ضمن میں ہدایت یافتہ نہیں ہیں اس لیے ان کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

آٹھویں: اہلِ سلوک میں سے کچھ ناز بُردہ: خود پسند اور جلد باز لوگ جب ولایت کے ان پھلوں کو دنیا میں ہی کھا لینا چاہتے ہیں جو آخرت میں توڑے اور کھائے جائیں گے، اور ان کا سلوک وتصوّف اُن سے جب اس قسم کے مطالبے کرتا ہے اور ان کی نیت کھل کر سامنے آجاتی ہے تو وہ ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں ﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ جیسی آیات کے ذریعے اعلان کر دیا گیا ہے، جیسے کہ بہت سے مقالات میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ: عالمِ بقا کا صرف ایک پھل اس فانی دنیا کے ایک ہزار باغوں پر ترجیح رکھتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ با برکت پھل یہاں نہ کھائے جائیں۔ لیکن اگر طلب اور توجہ کے بغیر مل جائیں تو پھر ضروری ہے کہ ان پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور انہیں اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھا جائے جو مکافات اور بدلہ چکانے کے لیے نہیں بلکہ ذوق وشوق کو بھڑکانے کے لیے کیا گیا ہے۔

نویں تلویح:

اس مقام پر ہم اجمال کے ساتھ طریقت کے بہت سے فوائد وثمرات میں سے نو فوائد ذکر کریں گے۔

پہلا فائدہ:

صحیح ومستقیم طریقت کے ذریعے ایمانی حقائق کا عین الیقین کے درجے میں ظہور وانکشاف ووضاحت جو کہ ابدی سعادت میں ابدی خزانوں کی چابیاں، اُن خزانوں کے سرچشمے اور کانیں ہیں۔

دوسرا فائدہ:

یہ ہے کہ طریقت دل کو حرکت میں رکھنے کا وسیلہ بن جائے، دل جو کہ انسانی مشینری کے لیے مرکز اور سپرنگ یا ٹریگر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور دل کو حرکت دی جائے تو دل دیگر انسانی لطائف کو حرکت میں رکھے اور انہیں ان کی فطرت کے اس نتیجے کی طرف لے جائے جس کے لیے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اور اس طرح انسان حقیقی انسان بن جائے۔

تیسرا فائدہ:

یہ ہے کہ انسان عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کے سفر میں طریقت کے سلاسل میں سے کسی سلسلے میں منسلک ہو جائے۔ اور لبدُ الآباد کی راہ میں اس نورانی قافلے کا رفیقِ سفر بن جائے اور یہ کہ وہ تنہائی کی وحشت سے خلاصی پا جائے اور ان لوگوں کے ساتھ دنیا اور برزخ میں معنوی طور پر مانوس ہو جائے اور یہ کہ اَوہام وشبہات کے مقابلے میں ان کے اجماع واتفاق پر بھروسا کرے اور اس راہ میں ہر اُستاد ومرشد کو ایک قوی سند اور برہانِ مبین کا درجہ دے اور ان کی برکت سے ذہن پر وارد ہونے والے اوہام وشبہات کا دفعیہ کرلے۔

چوتھا فائدہ:

یہ ہے کہ وہ صاف شفاف طریقت کی وساطت سے ایمان میں پائی جانے والی معرفت خداوندی کے ذائقے کو اور اس معرفت میں پائی جانے والی اللہ کی محبت کو سمجھ جائے اور یہ چیز سمجھ جانے کی برکت سے دنیا کی بے پایاں وحشت سے اور کائنات میں پائی جانے والی بے پایاں اجنبیت سے خلاصی پا جائے۔ ہم بہت سے مقالات میں یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ سعادتِ دارین، لذتِ بے الم، اُنسِ بے وحشت، حقیقی ذوق اور حقیقی سعادت ایمان اور اسلام کی حقیقت میں ہے۔ اور ایمان اپنے دامن میں جنت کے شجرِ طوبیٰ کی گٹھلی لیے ہوئے ہے جیسے کہ ''دوسرے مقالے'' میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ گٹھلی طریقت کی تربیت کے ساتھ نشوونما پاتی اور منکشف ہوتی ہے۔

پانچواں فائدہ:

یہ ہے کہ انسان کو شرعی احکام میں پائے جانے والے لطیف حقائق کا شعور ہو جائے اور وہ طریقت اور ذکرِ الٰہی کی طرف سے وارد ہونے والے قلبی انتباہ کی وساطت سے اُن کی قدر کرنے لگ جائے۔ تب اطاعتوں اور عبادتوں کی ادائیگی بیکار میں نہیں کی جائے گی، بلکہ وہ اشتیاق کے ساتھ اطاعت کرے گا اور عبادت کا حق ادا کرے گا۔

چھٹا فائدہ:

یہ ہے کہ انسان مقام توکل، رتبہ تسلیم اور درجۂ رضا حاصل کرلے جو کہ حقیقی ذوق، سنجیدہ تسلی بے شائبہ لذت اور بے

وحشت اُنس کا وسیلہ اور دار و مدار ہے۔

ساتواں فائدہ:

یہ ہے کہ وہ اخلاص کے ذریعے۔ جو کہ سلوک طریقت کے لیے اہم شرط اور اہم نتیجہ ہے۔ شرک خفی سے اور ریا کاری و تصنع وغیرہ جیسے رذائل سے خلاصی حاصل کر لے از رتزکیہ کی وساطت سے۔ جو کہ طریقت کی عملی ماہیت ہے۔ انانیت کی تباہ کاریوں سے اور نفسِ امارہ سے نجات حاصل کر لے۔

آٹھواں فائدہ:

یہ ہے کہ وہ طریقت میں ذکرِ قلبی اور تفکرِ عقلی کے ذریعے حاصل کی ہوئی اپنی توجہ، حضورِ قلبی اور قوی نیت کے ساتھ اپنی عادات کو عبادات میں تبدیل کر لے اور اپنے دنیاوی معاملات کو اُخروی اعمال کا رُوپ دے لے۔ اور یوں اپنی عمر کے سرمائے کو اچھے طریقے سے استعمال کر کے اپنی عمر کے لحات کو ایسی گٹھلیاں بنا لے جو ابدی زندگی کے خوشے اور بالیاں اُگائیں گی۔

نواں فائدہ:

یہ ہے کہ وہ قلبی سیر و سلوک اور روحانی مجاہدے اور معنوی ترقیات کی روشنی میں عمل کرے تا کہ انسانِ کامل بن جائے، یعنی تا کہ حقیقی مومن اور مکمل مسلمان بن جائے۔ مطلب یہ کہ وہ صرف ظاہری صورت میں مسلمان نہ رہے بلکہ ایمان کی اور اسلام کی حقیقت حاصل کر لے۔ یعنی یہ کہ وہ اس کائنات میں براہِ راست خالقِ کائنات ذُوالجلال کا عبد، مخاطب، صدیق اور خلیل اور کسی جہت سے کائنات کا ترجمان بن جائے۔ اور یہ چیز واضح طور پر آشکار کر کے کہ وہ احسنِ تقویم میں پیدا کیا گیا ہے؛ فرشتوں پر بنی آدم کی برتری ثابت کرے۔ اور یہ کہ وہ شریعت کے دونوں پروں یعنی ایمان اور عمل کے ذریعے مقاماتِ عالیہ میں پرواز کرے اور سعادتِ ابدی کو نگاہ میں رکھے، بلکہ اسی دنیا میں رہتے ہوئے اس سعادت میں داخل ہو جائے۔

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ عَلَى الْغَوْثِ الْاَكْبَرِ فِىْ كُلِّ الْعُصُوْرِ، وَالْقُطْبِ الْاَعْظَمِ فِىْ كُلِّ الدُّهُوْرِ، سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ الَّذِىْ تَظَاهَرَتْ حِشْمَةُ وَلَايَتِهٖ وَ مُقَامُ مَحْبُوْبِيَّتِهٖ فِىْ مِعْرَاجِهٖ، وَانْدَرَجَ كُلُّ الْوَلَايَاتِ فِىْ ظِلِّ مِعْرَاجِهٖ

وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ آمين

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

☆ ☆ ☆

اللہ تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ

(یہ انتہائی مختصر ذیلی بات عظیم اہمیت اور ہر شخص کے لیے بہت سے فوائد کی حامل ہے)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ تک پہنچنے کے لیے بہت سی راہیں اور بے شمار راستے ہیں۔ اور تمام درست اور صحیح سالم راستوں کا منبع ومصدر اور سرچشمہ قرآن کریم ہے۔ البتہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض راستے دوسرے راستوں سے مختصر، محفوظ اور کشادہ ہیں۔

میں اپنی کم فہمی کے علی الرغم قرآن کریم کے فیضان سے ایک مختصر، سیدھا اور ہموار راستہ پانے میں کامیاب ہوگیا ہوں، اور وہ ہے: عجز، فقر، شفقت اور تفکر کا راستہ۔

جی ہاں! عجز وانکسار بھی عشق کی طرح ایک ایسا راستہ ہے جو اللہ تک پہنچا دیتا ہے، بلکہ یہ عشق کے راستے سے زیادہ محفوظ راستہ ہے؛ کیونکہ یہ راستہ ''عبودیت'' کی راہ سے ''محبوبیت'' کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

فقر کا راستہ بھی اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی **''الرَّحمٰن''** تک پہنچاتا ہے۔

شفقت بھی عشق کی طرح ہی مُوصل اِلی اللہ راستہ ہے، بلکہ یہ عشق سے زیادہ تیز رو اور کشادہ اور وسعت بداماں ہے؛ کیونکہ یہ راستہ اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی **''اَلرَّحِیْم''** تک پہنچاتا ہے۔

تفکر بھی عشق ہی کی طرح ہے لیکن یہ اس سے زیادہ سرمایہ دار، تابناک اور وسعت بداماں ہے؛ کیونکہ یہ سالک کو اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی **''اَلْحَکِیْم''** تک پہنچاتا ہے۔ یہ مختصر راستہ اس راستے سے مختلف ہے جسے اہل سلوک نے عام طور پر ''خفاء'' کے راستوں میں اختیار کیا ہے۔ خفاء کے راستے جو کہ لطائف عشرہ کی طرح دس مراحل پر مشتمل ہیں۔ (حاشیہ:۱)

اور یہ راستہ جہر کے راستوں سے بھی مختلف ہے جو کہ نفوسِ سبعہ (حاشیہ:۲) کے حساب سے سات مراحل پر

(حاشیہ:۱) لطائفِ عشرہ۔ حضرات مجددیہ رحمہم اللہ کے نزدیک انسان دس لطائف سے مرکب ہے، اُن میں سے پانچ عالمِ امر سے متعلق ہیں اور پانچ عالمِ خلق سے۔ عالمِ امر کے لطائف کی جڑیں عرش کے اُوپر ہیں اور جسمِ انسانی میں اُن کے مختلف ٹھکانے ہیں۔ یہ لطائف قلب، روح، سرّ، خفی اور اخفی ہیں۔ اور عالمِ خلق کے لطائف نفس اور عناصر اربعہ ہیں۔ ان کی اصل بھی لطائفِ عالمِ امر کی اصل ہے۔ جملہ لطائف مختلف انوار سے منور اور مختلف اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے زیر قدم ہیں۔ سرِّ دلبراں، ص 356۔

(حاشیہ:۲) تصوف کی اصطلاح میں نفس کی مندرجہ ذیل سات قسمیں ہیں: نفسِ کلیہ، نفسِ ناطقہ، نفسِ حیوانیہ، نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ، نفسِ مطمئنہ اور نفسِ ملہمہ۔ مترجم۔

مشتمل ہے۔ان سب کے برعکس یہ طریقہ صرف چار مرحلوں پر مشتمل ہے،اور یہ طریقت سے زیادہ شریعت ہے۔

خبردار! کسی غلط فہمی کی وجہ سے غلطی نہ کر بیٹھنا؛ کیونکہ عاجزی، فقر اور تقصیر سے مقصود صرف ان چیزوں کا اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار ہے نہ کہ لوگوں کے سامنے عاجزی، مسکینی اور ناتوانی کا اظہار کرنا۔

باقی رہے اس مختصر راستے کے اوراد و اذکار، تو وہ اتباعِ سنت، فرائض کی ادائیگی اور کبائر سے کنارہ کش رہنا اور خاص کر نماز کو تعدیلِ ارکان کے ساتھ ادا کرنا ہے۔

رہی ان تمام مراحل کے سرچشموں کی قرآن میں موجودگی، تو وہ یوں ہے:

☆ ﴿فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النجم:32)

یہ آیت کریمہ پہلے مرحلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

☆ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (الحشر:19)

یہ آیت کریمہ دوسرے مرحلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

☆ ﴿مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (النساء:79)

یہ آیت کریمہ تیسرے مرحلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

☆ ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ (القصص:88)

یہ آیت کریمہ چوتھے مرحلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اب ان چاروں مرحلوں کی انتہائی اختصار کے ساتھ وضاحت کی جاتی ہے۔

پہلا مرحلہ:

اس کی طرف یہ آیت کریمہ اشارہ کرتی ہے:

﴿فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ﴾۔اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف اپنے آپ کو ہی پاک صاف نہیں سمجھنا چاہیے۔واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنی جبلت اور فطرت کے تقاضوں کے زیر اثر اپنی ذات سے بہت محبت کرتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسے صرف اپنی ذات سے عشق ہے اور بس۔اس کے لیے اپنی ذات سب سے مقدم ہے، وہ اپنی ذات کے لیے ہر چیز کی قربانی دے دیتا ہے اور اپنی ذات کی ایسی تعریف کرتا ہے جو صرف معبود واحد کے لائق ہے۔اپنی شخصیت ہر عیب سے دور اور ہر کمی کوتاہی سے بالا سمجھتا ہے۔بلکہ وہ کبھی اپنی غلطی تسلیم کرتا ہی نہیں، اور اپنی ذات کا ایسے دفاع کرتا ہے جیسے کہ وہ اس کی معبود ہے اور یہ اس کا پجاری۔اور اس چیز میں وہ اس حد تک چلا جاتا

ہے کہ اپنے ان اعضاء وجوارح کو اپنی تقدیس کے لیے استعمال کرنے لگتا ہے جو اللہ نے اسے صرف اپنی حمد وثناء کے لیے عطا کیے ہیں۔ اور یوں وہ ﴿مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ﴾ (الفرقان: 43) کا چلتا پھرتا مفہوم بن جاتا ہے۔ چنانچہ وہ خود پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھنے لگتا ہے۔ اس لیے اس کی اس ذات کا تزکیہ ضروری ٹھہرا۔ اور اس مرحلے میں اس کے تزکیہ وتطہیر کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنا تزکیہ نہ کرے اور خود کو نیک پاک اور پارسا نہ سمجھے۔

دوسرا مرحلہ:

یہ مرحلہ وہ ہے جس کا سبق یہ آیت کریمہ دیتی ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ﴾؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور غفلت کی رَو میں بہ جاتا ہے، اور اگر کبھی اسے موت کا خیال آئے تو یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ صرف دوسروں کا حصہ ہے، اور اگر کبھی فنا وزوال کا منظر آنکھوں کے سامنے آئے تو یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ چیز صرف اوروں کا مقدر ہے مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں؛ کیونکہ نفسِ امارہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اجرت کے حصول اور عیش وعشرت کے وقت میں خود کو یاد رکھتا ہے اور ان چیزوں کے ساتھ مضبوطی سے جُڑ جاتا ہے، لیکن جہاں خدمت، عمل اور مشقت کا سامنا ہو وہاں خود کو یکسر بھول جاتا ہے اور نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بنا بریں اس مرحلے میں اس کے تزکیے، تطہیر اور تربیت کا اسلوب یہ ہے کہ:

اس حالت کے بالکل برعکس عمل کیا جائے، یعنی عین نسیان میں عدمِ نسیان، مطلب اس کا یہ ہے کہ اُجرت اور عیش ونشاط کے سمے ''نفس'' کو بھلا دیا جائے، اور خدمات اور موت کے وقت اس کے بارے میں غور فکر کر لیا جائے۔

تیسرا مرحلہ:

یہ وہ مرحلہ ہے جس کی طرف یہ آیت کریمہ راہنمائی کرتی ہے:

﴿مَآ أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ﴾، اور وہ اس طرح کہ نفس جس چیز کا ہمیشہ تقاضا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بھلائی کی نسبت اپنی طرف کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ فخر اور خود پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے میں انسان کو یہ چاہیے کہ وہ اپنی ذات کے نقص، کمی کوتاہی اور عجز

وفقر کو نگاہ میں رکھے۔ اور تمام کمالات ہر حسن وخوبی کو اپنے جلیل القدر خالق و مالک کا احسان سمجھے، اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتیں سمجھ کر سینے سے لگائے اور پھر ان پر فخر کرنے کی بجائے شکر کرے اور اپنی مدح سرائی اور شیخی بگھارنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں مصروف رہے۔ اس مرحلے میں تزکیہ نفس کا جو انداز بتایا گیا ہے وہ اس راز سے لیا گیا ہے جو اس آیت کریمہ میں پایا جاتا ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾

اور راز یہ ہے کہ نفس یہ بات جان لے کہ اس کے کمال کا راز اس کے عدمِ کمال میں پنہاں ہے، اس کی طاقت اور قدرت کا راز اس کی عاجزی اور درماندگی میں ہے اور اس کی دولتمندی اور تونگری اس کے فقر میں ہے۔

چوتھا مرحلہ:

وہ ہے جس کی تعلیم یہ آیت کریمہ دیتی ہے:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾، اور وہ اس طرح کہ نفس اپنے آپ کو خودسر، آزاد اور مستقل اور موجود بالذات سمجھتا ہے، اسی بنا پر وہ ایک قسم کی ربوبیت کا دعوی کرتا ہے اور اپنے معبود حقیقی کے مقابلے میں نافرمانی کا رویہ اپناتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس حقیقت کا ادراک کر جائے جو ابھی بیان کی جا رہی ہے تو اس دعوے سے دستبردار ہو سکتا ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ:

ہر چیز ذاتی طور پر اور اپنے اسمی معنی کے لحاظ سے زوال آشنا، فنا پذیر، حادث، نیست اور نابود ہے۔ لیکن وہ اپنے حرفی معنی کی رُو سے اور صانع ذوالجلال کے اسماء کا آئینہ ہونے کے لحاظ سے شاہد بھی ہے مشہود بھی اور واجد بھی ہے موجود بھی۔

پس اس مرحلے میں نفس کا تزکیہ وتطہیر یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کی پہچان کر لے کہ: اس کا عدم اس کے وجود میں ہے اور اس کا وجود اس کے عدم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھے اور اپنے وجود کی نسبت اپنی طرف کرے تو کائنات کے برابر عدم کے گھنگھور اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے، یعنی جب نفس اپنے شخصی وجود کے دھوکے میں مبتلا رہے اور اپنے موجد حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو تنہا اور عدم وفراق کے غیر متناہی اندھیروں میں غرق پائے گا۔ بالکل ایسے جیسے سیاہ رات کے گھنگھور اندھیروں میں ایک درماندہ جگنو اپنی کمزور سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی لیے پھر رہا ہو۔ لیکن جب وہ انانیت، غرور اور خود فریبی سے کنارہ کش ہو جائے گا تو

اس وقت اس پر یہ حقیقت کھلے بندوں آشکار ہو جائے گی کہ اس کی اپنی ذات بذات خود کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ وہ تو ایک آئینہ ہے جس سے اس کے موجدِ حقیقی کی تجلیات کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور اس طرح وہ تمام موجودات کو اور غیر متناہی وجود کو پالیتا ہے۔

جی ہاں! جو اللہ کو پالیتا ہے وہ سب کچھ پالیتا ہے؛ کیونکہ عالم موجودات تمام کا تمام اس ربِّ ذُوالجلال کے اسمائے حسنیٰ کی تجلیات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

خاتمہ

یہ راستہ جو کہ عجز، فقر، شفقت اور تفکر پر مشتمل چار مراحل سے وجود پاتا ہے، اس کی تفصیلی وضاحت اگرچہ ہماری کتاب **"مقالات"** میں ابتداء سے لے کر "چھبیسویں مقالے تک" آچکی ہے۔ یہ کتاب حقیقت کے علم، شریعت کی حقیقت اور قرآن کریم کی حکمت سے متعلق بحث کرتی ہے۔ تاہم پھر بھی ہم یہاں ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہیں جو کہ چند نکتوں پر مشتمل ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

یہ راستہ دوسرے کسی بھی راستے کی بہ نسبت مختصر، قریب ترین اور کم مسافت والا ہے؛ کیونکہ یہ چار مراحل سے عبارت ہے۔ مثال کے طور پر عاجزی، کو لے لیں کہ جب یہ دل میں گھر کر جاتی ہے تو اسے براہ راست قدیر ذوالجلال کے حوالے کر دیتی ہے۔ جبکہ عشق جو کہ اللہ تک پہنچانے والا تیز ترین راستہ ہے۔ اس راہ میں جب عشق دل میں گھر کرتا ہے تو دل پہلے پہل معشوق مجازی کے ساتھ چمٹا رہتا ہے، پھر ایک وقت میں جب عشق مجازی کے اثرات زائل ہوتے ہیں تب جا کر کہیں محبوب حقیقی تک رسائی ہوتی ہے۔

پھر یہ راستہ دیگر راستوں کی بہ نسبت زیادہ محفوظ ہے؛ کیونکہ اس میں نفس اپنی اوقات سے زیادہ شطحات، دعوے اور زٹل بازیاں نہیں کرتا ہے؛ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں تو انسان کو اپنی ذات میں عجز و فقر اور کمی کوتاہی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے، اس لیے وہ حد سے کیسے بڑھے گا اور شیخیاں کیسے بگھارے گا؟

پھر یہ کہ یہ راستہ ایک شارعِ عام اور بڑی گزرگاہ ہے؛ کیونکہ یہ راستہ کائنات کو معدوم کرنے یا اسے قید خانہ بنانے پر مجبور نہیں کرتا ہے؛ جس طرح کہ اہلِ **"وحدۃُ الوجود"** اس کائنات کو عدم اور نیست خیال کرتے ہیں اور حضور قلبی اور روحانی اطمینان کے حصول کے لیے کہتے ہیں: **"لاموجودَ إلا هو"**. اور اسی طرح اہلِ **"وحدۃُ الشهود"** نے کائنات کو نسیان یا فراموشی کے قید خانے میں قید کر رکھا ہے اور اطمینان قلب کے حصول کے لیے کہتے ہیں: **"لامشهودَ إلا هو"**.

جبکہ قرآن کریم پوری وضاحت کے ساتھ کائنات کو معدوم نہیں ہونے دیتا ہے۔ اور اس کی تمام زنجیریں کھول کر اسے قید خانے سے آزاد کرتا ہے۔ تو یہ راستہ جو قرآن کریم کے منہج پر ہے، کائنات کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ تمام کی تمام اپنے جلیل القدر خالق کے لیے مسخر ہے اور اس کی راہ میں سراپا خدمت ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ تمام

موجودات اسمائے حسنیٰ کی تجلیات کے مظاہر ہیں، گویا کہ یہ آئینے ہیں جو ان تجلیات کو آگے منعکس کرتے ہیں۔ یعنی فاطر ذوالجلال اس کائنات سے اس کے حرفی معنی کے لحاظ سے تو خدمت لے رہا ہے لیکن اسمی معنی کے لحاظ سے اُسے اس چیز سے علیحدہ رکھتا ہے کہ وہ بذات خود خادم یا مسخر بن سکے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان غفلت سے نجات پا جاتا ہے اور قرآن کریم کے روشن اور کشادہ راستے پر چلتا ہوا دائمی حضوری کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اور یوں اسے اللہ تک پہنچنے کے لیے کائنات کی ہر شے سے راستہ مل جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:

یہ راستہ موجودات کو ان کے اسمی معنی یعنی ان کی ذات کے لحاظ سے نہیں دیکھتا ہے، یعنی موجودات کو اس نظر سے نہیں دیکھتا کہ یہ سب خود آپ ہی سے اپنے لیے مسخر اور خودکار ہیں، بلکہ انہیں اس چیز سے الگ کرکے ان کے سپرد ایک اور قسم کی ذمہ داری کرتا ہے، اور وہ یہ کہ یہ تمام کی تمام اللہ کی مسخر اور اس کی زیر فرمان ہیں۔

مکتوبات کے معاملات میں خدمت

سرانجام دینے والوں کے لیے امام نورسی کی دُعا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَا اَللّٰهُ يَا رَحْمٰنُ، يَا رَحِيْمُ، يَا فَرْدُ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ، يَا حَكَمُ يَا عَدْلُ يَا قُدُّوْسُ!

بِحَقِّ الْاِسْمِ الْاَعْظَمِ، وَبِحُرْمَةِ الْقُرْآنِ الْمُعْجِزِ الْبَيَانِ، وَلِشَرَفِ الرَّسُوْلِ الْاَكْرَمِ، اِجْعَلِ النَّاشِرِيْنَ وَالطَّابِعِيْنَ لِمَجْمُوْعَةِ الْمَكْتُوْبَاتِ هٰذِهٖ، وَاَعْوَانَهُمُ الْمُبَارَكِيْنَ، وَطُلَّابَ الرَّسَائِلِ النُّوْرِ الصَّادِقِيْنَ؛ اِجْعَلْهُمْ مَظَاهِرَ لِسَعَادَةِ الْاَبَدِيَّةِ؛ فِيْ جَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ، آمِيْنَ؛ وَوَفِّقْهُمْ دَائِمًا فِي الْخِدْمَةِ الْاِيْمَانِيَّةِ وَالْقُرْآنِيَّةِ، آمِيْنَ؛ وَاكْتُبْ فِيْ دَفْتَرِ حَسَنَاتِهِمْ، اَلْفَ حَسَنَةٍ، مَقَابِلَ كُلِّ حَرْفٍ مِنْ مَجْمُوْعَةِ الْمَكْتُوْبَاتِ، آمِيْنَ، وَاَحْسِنْ اِلَيْهِمْ بِالثَّبَاتِ وَالدَّوَامِ وَالْاِخْلَاصِ، فِيْ نَشْرِ الْاَنْوَارِ، آمِيْنَ..

يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ! اِجْعَلْ جَمِيْعَ طُلَّابِ رَسَائِلِ النُّوْرِ، مَسْعُوْدِيْنَ فِي الدَّارَيْنِ، آمِيْنَ؛ وَاحْفَظْهُمْ مِنْ شُرُوْرِ شَيَاطِيْنِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ، آمِيْنَ؛ وَاعْفُ عَنْ سَيِّآتِ هٰذَا "السَّعِيْدِ" الْعَاجِزِ الْبَائِسِ، آمِيْنَ..

باسم جميع طلاب النور، سعيد النورسیؒ

تیسواں مکتوب

عربی زبان میں اشارات الاعجاز نامی تفسیر ہے جو کہ طبع ہو چکی ہے۔

اکتیسواں مکتوب

اکتیس ''لمعات'' پر مشتمل مستقل مجموعے کا نام ہے جو علیحدہ صورت میں طبع ہو چکا ہے۔

بتیسواں مکتوب

''لوامع'' نامی رسالہ ہے جو ''قطرہ'' ''ذرہ'' ''شمہ'' ''زھراء'' کے ہمراہ ذیلی بحثوں سمیت طبع ہو چکا ہے۔

تینتیسواں مکتوب

تینتیس دریچے پر مشتمل رسالہ ہے جو معرفتِ الٰہیہ کی طرف کھلتے ہیں۔ یہ ایک جہت سے تینتسواں مقالہ بھی ہے۔ اسی بنا پر اسے مقالات نامی مجموعے میں شائع کیا گیا ہے اور یہاں درج نہیں کیا گیا۔

حقیقتوں کی گٹھلیاں

توضیح

اس بات پر ایک مدت ہوگئی ہے کہ میرے چچا جان ''بدیع الزمان'' مسائل کی طرف عقل سے نہیں بلکہ دل سے توجہ کرتے ہیں، اوران کے دل پر جس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے مجھے املاء کروا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''علم وہ ہے جو دل میں قرار پکڑ جائے، علم اگر صرف عقل تک ہی محدود رہے تو وہ انسان کی ملکیت نہیں بنتا''۔ اور کہا کرتے تھے: ''یہ مسائل صرف علمی قواعد ہی نہیں ہیں، بلکہ یہ وہ مسائل ہیں جو میں نے بعض قلبی دساتیر سے وجدان کی صورت میں اخذ کیے ہیں''۔ انہوں نے مجھے یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ: ''میری قلبی واردات میں سے اپنی پسندیدہ باتوں کا انتخاب کرلیا کرو''۔

پس میں نے ان کی مندرجہ ذیل کتابوں میں سے یہ پھول چنے ہیں:

''نُقْطَةٌ مِنْ نُوْرِ مَعْرِفَةِ اللّٰہِ'' ''اِشَارَاتُ الْاِعْجَازِ فِیْ مَظَانِ الْاِیْجَازِ، سنوحات، شُعَاعَات، مَعْرِفَةُ النَّبِیِّ، رُمُوْز، طُلُوْعَات، مُحَاکَمَات، مُنَاظَرَات، اِشَارَات، قِزْلُ اِیْجَاز.

(مطبعة الاوقاف الاسلامیة استنبول میں پہلی دفعہ 1337ھ میں طبع ہونے والے نسخے سے اقتباس)۔

مترجم۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ أَجْمَعِیْنَ

1۔ عصرِ مریض، عُنصرِ سقیم اور عضوِ علیل: ان سب کا طبی نسخہ ہے اتباعِ قرآن۔

2۔ دور دراز کا عظیم الجانب براعظم ۔۔۔ بدنصیب ۔۔۔ خاندانی شرافت کا حامل مشہور مُلک، بدبخت ۔۔۔ جلیل القدر معزز اُمت رہنما کے بغیر بے مہار ۔۔۔ اس کا طبی نسخہ ہے اسلامی اتحاد۔

3۔ جو ایسے مضبوط قبضے کا مالک نہیں جس کے ذریعے وہ زمین کو، اور تمام نجوم وشموس کو اُٹھا سکے اور انہیں تسبیح کے دانوں کی طرح تحریک دے سکے، وہ تخلیق و ایجاد کا دعوی نہیں کرسکتا؛ کیونکہ ہر چیز دوسری چیز کے ساتھ وابستہ ہے۔

4۔ حشر کے دن تمام ذی اُرواح کو زندہ کرنا قدرتِ الٰہیہ کے لیے ویسے ہی گراں نہیں ہے جیسے کہ اُس کے لیے ایک پتنگے کو سردی کے تمام موسم میں نیند کے ساتھ مشابہت رکھنے والی گہری نیند کے بعد زندہ کرنا اور

اس کی نشوونما کرنا؛ کیونکہ قدرتِ الٰہیہ ذاتی ہے متغیر قطعاً نہیں ہوتی ۔ یہ ممکن نہیں کہ اس میں عاجزی دَر آئے، اور نہ ہی اس میں رکاوٹیں مداخلت کرتی ہیں، چنانچہ اس میں مراتب قطعاً نہیں ہیں، اور اس کی بہ نسبت تمام چیزیں برابر ہیں۔

5۔ جس نے مچھر کی آنکھ پیدا کی ہے، وہ وہی ہے جس نے سورج کو بھی پیدا کیا ہے۔

6۔ جس نے کھٹمل کے معدے کو منظم کیا ہے، وہ وہی ہے جس نے شمسی نظام کو بھی منظم کیا ہے۔

7۔ کائنات کی تألیف میں ایک اس طرح کا غالب اور زور دار قسم کا اعجاز پایا جاتا ہے کہ اگر ہم ۔بفرضِ محال ۔یہ مان لیں کہ نیچر کے جتنے اسباب ہیں ان میں سے ہر سبب فاعل و مختار اور مقتدر ہے، تو یہ تمام تر اسباب کمال عاجزی و انکساری کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اس اعجاز کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے کہ: سُبْحَانَكَ لَا قُدْرَةَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

8۔ اسباب کو حقیقی تأثیر نہیں ملی ہے ۔۔۔ وحدت و جلال کا یہی تقاضا ہے۔ البتہ یہ ہے کہ اسباب بادشاہت کی جہت میں قدرت کے ہاتھوں کے آگے پردہ بن گئے ہیں ۔۔۔ عزت و عظمت کا یہی تقاضا ہے؛ اور یہ اس لیے ہے کہ ظاہری نظر میں بادشاہت کی جہت میں چھوٹے موٹے حقیر سے معاملات میں قدرت کا ہاتھ نظر نہ آئے۔

9۔ مَلَکُوت کی جہت جو کہ ہر شے میں قدرت کے تعلق کا محل ہے، بالکل پاک صاف اور شفاف ہے۔

10۔ عالمِ شہادت ایک زربفت پردہ ہے جو کہ عوالمِ غیب پر ڈال دیا گیا ہے۔

11۔ ایک نقطے کو اس کے صحیح مقام پر ایجاد کرنے کے لیے ایک ایسی غیر متناہی قدرت کا ہونا ضروری ہے جو تمام کائنات کو ایجاد کر سکتی ہو؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کی اس کتابِ کبیر کے ہر حرف ۔اور خاص کر وہ جو زندگی سے بہرہ وَر ہے۔ کا ایک چہرہ ہے جو کتاب کے ہر جملے کی طرف دیکھ رہا ہے، اور اس کی ایک آنکھ ہے جو اس کی طرف اُٹھی ہوئی ہے۔

12۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ: لوگ عید کا چاند دیکھ رہے تھے، لیکن ابھی کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔ پھر اچانک ایک بوڑھا آدمی حلف اُٹھا اُٹھا کر کہنے لگا کہ میں نے چاند دیکھا ہے، لیکن جو چیز اُس نے دیکھی ہے وہ چاند نہیں بلکہ اس کے اَبرُو کا کمان کی شکل کا ایک سفید بال ہے جو نیچے لٹک آیا تھا! اب کہاں وہ بال اور کہاں ہلال؟ اور کہاں ذرّات کی حرکات اور کہاں انواع کو شکل و صورت عطا کرنے والا فاعل؟

13۔ نیچر ایک مثالی طبعہ ہے، یہ خود کوئی چیز طبع نہیں کرتی ہے، نقش گر نہیں نقش ہے، فاعل نہیں قابلِ انفعال یعنی منفعل ہے۔ منبع و مصدر نہیں بلکہ پیمانہ ہے، ناظم نہیں نظام ہے، قدرت نہیں قانون ہے، خارجی حقیقت نہیں ارادی شریعت ہے۔

14۔ وجدان جو کہ باشعور فطرت ہے، اُس میں گڑھے ہوئے جذب و انجذاب کا تعلق ایک حقیقی جاذب کے جذب سے ہے۔

15۔ فطرت جھوٹ نہیں بولتی، چنانچہ ایک بیج جب یہ کہتا ہے کہ: میں عنقریب پھوٹوں گا اور اُگوں گا، میں عنقریب بارآور ہوں گا، تو اُس میں نشوونما کا میلان ہوتا ہے اور وہ سچا ہے۔ اور انڈا جب کہتا ہے کہ: میں جلد ہی چوزہ بن جاؤں گا، تو اس میں زندگی کا میلان ہوتا ہے، اور وہ باذن اللہ چوزہ بن جاتا ہے، اور وہ سچا ہے۔ اور پانی کے ایک چلو میں پایا جانے والا جامد ہو جانے کا میلان جب یہ کہتا ہے کہ: عنقریب میں اس سے زیادہ جگہ گھیرلوں گا تو لوہا بھی اپنی تمام تر سختی کے باوجود اسے جھٹلا نہیں سکتا، بلکہ اگر اس کی بات سچی ہوئی تو وہ لوہے کو بھی پارہ پارہ کر دے گا۔ پس یہ میلانات صرف ارادۂ الٰہیہ سے صادر ہونے والے تکوینی اُمور کی تجلیات ہیں۔

16۔ قدرتِ اَزلی جو کہ چیونٹیوں کو بغیر امیر کے اور شہد کی مکھیوں کو بغیر رئیس اعظم کے نہیں رہنے دیتی، وہ نوعِ بشر کو بھی بغیر نبی کے نہیں رہنے دیتی۔ چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا جس طرح عالمِ شہادت میں انسان کے لیے رسولِ گرامی ﷺ کے ایک معجزۂ کبریٰ کی حیثیت رکھتا ہے، اُسی طرح معراج بھی عالمِ ملکوت میں ملائکہ اور روحانیات کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ایک معجزہ کبریٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور آپ ﷺ کی نبوت کی ولایت نے اس روشن ترین کرامت کا اثبات کر دیا ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ کی تابندہ شعلے کی طرح چمکتی دمکتی شخصیت عالمِ مَلکوت میں برق و بدر کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔

17۔ کلمۂ شہادت کے دونوں جزء ایک دوسرے کی گواہی دیتے ہیں، چنانچہ پہلا جزء دوسرے جزء کے لیے برہانِ ''لِمّی''(۱) ہے، اور دوسرا جزء پہلے جزء کے لیے برہانِ ''اِنّی''۔

18۔ زندگی کثرت میں وحدت کی تجلی کی ایک نوع ہے، اس لیے وہ اتحاد کی طرف دھکیلتی ہے، پس زندگی ایک واحد شے کو ہر شے کا مالک بنا دیتی ہے۔

19۔ روح ایک خارجی وجود رکھنے والا اور شعور رکھنے والا قانون ہے، اور یہ ثابت شدہ دائمی قوانین کی طرح عالمِ امر اور صفتِ ارادہ کی طرف سے آتی ہے، قدرت نے اسے حِسّی وجود پہنا دیا ہے، اور اسے اس جوہر کے لیے سیّال اور لطیف صدف بنا دیا ہے۔ بلاشبہ روحِ موجود قانونِ معقول کی بہن ہے، یہ دونوں دائمی ہیں اور دونوں کی آمد عالمِ امر سے ہوتی ہے۔ قدرتِ اَزلی اگر انواع کے قوانین کو خارجی وجود پہنا

---

(۱) دلیل ''لِمّی'' یا برہانِ ''لِمّی'' اُس کو کہتے ہیں جس میں علت سے معلول پر استدلال کیا جائے: اور دلیل ''اِنّی'' اس کو کہتے ہیں جس میں معلول سے عِلّت پر استدلال کیا جائے۔ مترجم۔

دے تو وہ روح بن جائیں۔ اور روح اگر شعور کو پرے پھینک دے تو وہ بھی نہ مرنے والے قانون کا رُوپ دھار جائے۔

20۔ موجودات کا مشاہدہ صرف روشنی سے ہوتا ہے، اور موجودات کے وجود کی پہچان زندگی کے ذریعے ہوتی ہے، پس یہ دونوں ہی کشّاف ہیں۔

21۔ نصرانیت کے سامنے عنقریب صرف دو ہی راستے ہوں گے، یا تو اس کا چراغ گل ہو جائے گا، یا پھر وہ اچھا انتخاب کرے گی اور ہتھیار پھینک کر اسلام کے دامن میں پناہ لے لے گی۔ یہ بہت دفعہ پارہ پارہ ہو چکی ہے، حتیٰ کہ پروٹسٹنٹ بن گئی۔ لیکن یہ چیز بھی اسے راس نہ آسکی، چنانچہ پروٹسٹنٹ پارہ پارہ ہوئی اور توحید کے قریب ہوگئی، اور ایک دفعہ پھر پارہ پارہ ہونے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ اب یا تو یہ بجھ جائے گی اور اس کا کام تمام ہو جائے گا، اور یا پھر اپنے سامنے ایسے جامع قسم کے اسلامی حقائق کو پائے گی جو حقیقی نصرانیت اور اس کے اصول و مبادی پر مشتمل ہوں گے، چنانچہ وہ سرِ تسلیم خم کر دے گی۔ رسول کریم ﷺ نے اس عظیم الشان راز کی طرف اپنے اس فرمان میں اشارہ کیا ہے۔ عنقریب عیسیٰ اُتریں گے۔ وہ میری امت میں سے ہوں گے اور میری شریعت کے مطابق عمل کریں گے۔

22۔ وہ چیز جو تمام لوگوں کو اتباع اور مثالِ اوامر پر آمادہ کرتی ہے، وہ ہے مصدر و سرچشمہ میں پائی جانے والی قدسیّت، قدسیّت ہی جمہور الناس کو دلیل و برہان کی قوت اور حجت کی سنجیدگی سے کہیں بڑھ کر اتباع و انقیاد پر آمادہ کرتی ہے۔

23۔ شریعت کے ننانوے فیصد مسائل۔ جو کہ دینی ضروریات اور مسلّمات پر مشتمل ہیں۔ اُن میں سے ہر مسئلہ ہیرے کا ایک ستون ہے، رہے اجتہادی اختلافی مسائل، تو وہ صرف دس فیصد ہیں۔ اور ہیرے کے نوے ستون سونے کے دس ستونوں کے زیرِ حمایت نہیں ہو سکتے، پس فقہی کتابوں کو اور اجتہادات کو قرآن کریم کو دیکھنے کے لیے آئینوں کا اور دوربینوں کا کام دینا چاہیے، نہ یہ کہ یہ چیزیں اس کے آگے پردہ بن کر تن جائیں، اس پر تاریک سایہ بن کر اُسے ڈھانپتے رہیں، اور اُس کا بدل بن جائیں۔

24۔ جس شخص میں بھی اجتہاد کی استعداد پائی جاتی ہے وہ خود اپنے لیے اجتہاد کر سکتا ہے، لیکن وہ شریعت سازی نہیں کر سکتا۔

25۔ کسی بھی سوچ فکر کی طرف دعوت دینا اس بات کے ساتھ وابستہ ہے کہ جمہور علماء اسے قبول کرتے ہیں، وگرنہ وہ ایک مردود بدعت ہوگی۔

26۔ انسان فطری طور پر معزز و مکرّم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ حق کی تلاش میں رہتا ہے، اپنے اس تحقیقی سفر کے دوران اس کا پالا کبھی کبھار باطل سے پڑ جاتا ہے، لیکن وہ اسے حق سمجھ کر اپنے سینے میں چھپا لیتا ہے اور

اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ حقیقت کی تلاش وجستجو کے دوران اس کے اختیار کے بغیر گمراہی اس کے سر پر سوار ہو جاتی ہے،تب وہ اس گمراہی کو حق سمجھ لیتا ہے اور اسے ٹوپی کی طرح پہن لیتا ہے۔

27۔ قدرت کے بہت سے آئینے ہیں، اور ان میں سے ہر آئینہ ایک دوسرے سے زیادہ شفاف اور زیادہ لطیف ہے، اور یہ پانی سے لے کر ہوا تک، اور ہوا سے لے کر اثیر تک، اور اثیر سے لے کر عالمِ مثال تک، اور عالمِ مثال سے لے کر عالمِ اَرواح تک، بلکہ زمان تک اور فکر تک ۔۔۔متنوع ہوتے جاتے ہیں۔

چنانچہ ہوا کے آئینے میں صرف ایک کلمہ لاکھوں کلمات بن جاتے ہیں، چنانچہ قلم قدرت تناسل کے اس راز کو بڑی عجیب شکل کے ساتھ نقل کر کے لکھتا جاتا ہے۔انعکاس یا تو ہُویّت پر مشتمل ہوتا ہے، یا پھر ہُویّت اور ماہیت دونوں پر۔ مادے کی کثیف تماثیل۔یعنی اُس کی صورتیں۔ متحرک اموات سے عبارت ہیں۔لیکن نورانی ارواح کی ان کے آئینوں میں پائی جانے والی تماثیل زندہ اور زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔یہ اگر زندگی کا عین نہیں ہیں تو اس کا غیر بھی نہیں ہیں۔

28۔ سورج اپنی محوری حرکت کے ذریعے جب جُھر جھری لیتا ہے تو اس کے پھل نہیں گرتے ہیں،لیکن اگر وہ جھرجھری نہ لے تو اس کے پھل یعنی سیارے گرتے اور بکھر جاتے ہیں۔

29۔ غور فکر کا نور جب تک دل کی روشنی کے ساتھ پھڑک نہ جائے اور تابندہ تر نہ ہو جائے، اور اس کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائے تو اندھیرا ہی رہتا ہے اور تاریکیاں ہی بکھیرتا ہے، چنانچہ جیسے آنکھ کا سفید لیکن غیر روشن دن اپنی سیاہ رات کے ساتھ ممزُوج نہ ہو(1) تو وہ آنکھ نہیں بنتی اور اسے بینائی نہیں آتی، یہی صورت حال اس سفید سوچ فکر کی ہے جس میں سویدائے قلب نہ پایا جاتا ہو۔

30۔ علم میں اگر اِذعانِ قلب نہ ہو تو وہ جہل ہے؛ کیونکہ التزام اور چیز ہے اور اعتقاد اور چیز۔

31۔ اباطیل کی اچھی تصویر کشی کرنا صاف دلوں کو بہکانے کے مترادف ہے۔

32۔ عالمِ مرشد کو بکری کی طرح ہونا چاہیے نہ کہ پرندے کی طرح، چنانچہ بکری اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور پرندہ اپنے بچے کے مُنہ میں قے انڈیلتا ہے۔

33۔ کسی بھی شے کا وجود اس کے تمام اجزاء کے وجود پر موقوف ہے، جبکہ اس کا عدم اس کے ایک جزء کے عدم

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کی سفیدی جو کہ دِن کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے، وہ اگر آنکھ کی رات کے ساتھ مشابہت رکھنے والی سیاہی کے ساتھ نہ ہو تو آنکھ دیکھ نہیں پاتی۔مؤلف۔

پر موقوف ہے؛ یہی وجہ ہے کہ کمزور آدمی اپنی طاقت کو ثابت کرنے کے لیے تخریب کی طرف میلان رکھتا ہے، اور اس بنا پر وہ ایجابی اور تعمیری کام کرنے کے بجائے سلبی اور تخریبی کاموں کا ارتکاب کرتا ہے۔

34۔ حکمت کے دساتیر جب حکومت کے قوانین کے ساتھ ممزوج نہ ہوں، اور حق کے قوانین جب قوّت کے روابط کے ساتھ ممزوج نہ ہوں تو وہ جمہور عوام کے درمیاں بارآور نہیں ہوتے۔

35۔ ظلم نے اپنے سر پر عدالت کی ٹوپی پہن رکھی ہے، خیانت نے غیرت وحمیت کی چادر اوڑھ رکھی ہے، جہاد کو بغاوت کا نام دے دیا گیا ہے، اور قید و بند پر حریّت کا اطلاق کر دیا گیا ہے، اضداد اسی طرح اپنی صورتیں تبدیل کر چکی ہیں۔

36۔ منفعتوں کے اِردگرد گھومنے والی سیاست ایک خطرناک وحشی درندہ ہے۔

37۔ ایک بھوکے وحشی درندے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا اُس کی شفقت کے جذبے کو نہیں اُبھارتا بلکہ اس کی بھوک کو بھڑکاتا ہے، اس پر مزید یہ کہ وہ اپنی کچلیوں کا اور پنجوں کی اُجرت کا مطالبہ بھی کرے گا۔

38۔ وقت نے یہ حقیقت آشکار کر دی ہے کہ جنت سستی نہیں ہے، اور جہنم بھی زائد از ضرورت نہیں۔

39۔ اہلِ دنیا کے خواص کی وہ مزیّت جو تواضع اور باہمی ہمدردی کی مقتضی ہے وہ تکبّر اور غرور کا سبب بن گئی ہے، اور فقراء کا عجز اور عوام کا فقر جو کہ رحمت واحسان کے جذبات اُبھارنے والے تھے، وہ ان کی غلامی اور پستی کا سبب بن گیا ہے۔

40۔ کسی بھی چیز میں اگر محاسن وفضائل پائے جائیں تو ان کی نسبت فوراً خواص کی طرف کر دی جاتی ہے اور انہیں تحفے میں دے دیے جاتے ہیں، لیکن اگر اس میں برائیاں پائی جائیں تو لوگ وہ برائیاں عوام کے سر تھوپ دیتے ہیں اور انہیں ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

41۔ انسان کے غور وفکر کی اگر کوئی غرض وغایت نہ ہو اور اس کے سامنے کوئی بلند پایہ ہدف نہ ہو، یا وہ اغراض ومقاصد بھول جائے یا بھول جانا ظاہر کرے تو اذہان ''اَنا'' یعنی انفرادیت کی طرف مُڑ جاتے ہیں اور اسی کے اِردگرد گھومتے رہتے ہیں۔

42۔ اگر آپ جمعیت بشری کی برائیوں میں غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ: اُن کی تمام تر کمزوریوں، خرابیوں اور بدحواسیوں کی اُسّ الأساس، اور انسانی معاشرے میں دَر آنے والے تمام تر اخلاقِ رذیلہ کا سرچشمہ صرف دو جملے ہیں:

پہلا جملہ۔ اگر میرا پیٹ بھر گیا ہے تو کوئی دوسرا بھوک سے مر جائے تو مجھے کیا لگے۔

دوسرا جملہ۔ تُو کما تاکہ میں کھاؤں، اور تُو تھک تاکہ میں آرام کروں۔

پہلے جملے کی رَگ کاٹنے کے لیے ''زکوۃ'' ہے، اور دوسرے جملے کی بیخ کنی کے لیے اور اس کی دوا کے لیے

صرف ''حرمتِ سُود'' ہے۔قرآن کریم کی عدالت دنیا کے دروازے پر کھڑی ہو جاتی ہے اور سود سے کہتی ہے: اندر آنا منع ہے۔نوعِ بشر نے جب اس کلام پر کان نہ دھرا تو زناٹے دار تھپڑ کھایا۔اور اب قبل اس کے کہ اُسے اس سے بھی زیادہ زوردار اور کڑوا تھپڑ کھانا پڑے،اسے اس کی بات سُننا ہوگی۔

43۔ ملکوں اور قوموں کے درمیان ہونے والی جنگیں اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ چکی ہیں اور انسانی طبقات کی لڑائیاں اُن کی جگہ لے رہی ہیں۔کیونکہ انسان جس طرح قیدی بننا پسند نہیں کرتا اسی طرح مزدور بننا بھی پسند نہیں کرتا۔

44۔ جو کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی غیر مشروع راستے پر چلتا ہے،بسا اوقات اسے یہ سزا ملتی ہے کہ وہ اپنے مقصود سے دور جا گرتا ہے؛ کیونکہ یورپ کی محبت جیسی غیر مشروع محبت کا بدلہ محبوب کا غدارانہ انداز میں عداوت کرنا ہے۔

45۔ ماضی اور مصائب کی طرف ''تقدیر'' کی نظر سے دیکھنا چاہیے،جبکہ مستقبل اور معاصی کی طرف تکلیف یعنی شرعی پابندی کے زاویے سے دیکھنا لازم ہے۔اس مقام پر ''جبر'' اور ''اعتزال'' آپس میں صلح کر لیتے ہیں۔

46۔ جس چیز کا حل ممکن ہو اس کے بارے میں عاجزی کا سہارا نہیں لینا چاہیے،اور جس کا علاج ممکن نہ ہو اس سے جزع فزع کی پناہ نہیں لینی چاہیے۔

47۔ زندگی کا زخم بھر جاتا ہے،لیکن اسلام کی عزت،اُمت کے شرف و وقار اور اس کے عظمت و سعادت کا زخم بہت گہرا ہے۔

48۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ایک کلمہ ہی ایک مکمل فوج کو جنگ میں دھکیل دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔اور ایک گولی تیس ملین جانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔(۱)

اور کبھی ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جب ایک معمولی سی حرکت بھی انسان کو اعلیٰ علّیین تک بلند کر دیتی ہے۔۔۔اور ایک چھوٹا سا شغل اسے اسفل سافلین میں گرا دیتا ہے۔

49۔ سچائی کا ایک دانہ ہی جھوٹوں کا ایک پورا کھلیان خاکستر کر دیتا ہے،ایک حقیقت خیالات کے ایک انبار سے بہتر ہے۔

آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ جو بات کریں سچی کریں،لیکن یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ آپ جتنی بھی سچی

---

(۱) ڈنمارک کے ولی عہد پر چلائی گئی ایک گولی پہلی جنگ عظیم کی آگ بھڑکانے کا سبب بن گئی تھی جس کی بھینٹ تیس ملین جانیں چڑھ گئی تھیں۔مؤلف۔

باتیں ہیں سب کہہ دیں؛ کیونکہ لَا یَلْزَمُ مِنْ لُزُوْمِ صِدْقِ کُلِّ قَوْلٍ قَوْلُ کُلِّ صِدْقٍ [ہر بات کے سچ سچ کہنے کے لازم ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سچ بات کہہ ہی ڈالی جائے]۔

50۔ جس نے اپنے دیکھنے کا انداز خوبصورت بنا لیا، اس کی سوچ دیدہ زیب اور اس کے غور وفکر کا انداز خوبصورت ہو جاتا ہے، اور جس کے غور وفکر کا انداز خوبصورت ہو جاتا ہے وہ زندگی کا لطف اُٹھاتا ہے اور اس سے لذت یاب ہوتا ہے۔

51۔ اُمید لوگوں میں زندگی کی روح پھونکتی ہے اور نا اُمیدی انہیں قتل کر دیتی ہے۔

52۔ یہ اسلامی ملک کہ جس نے بہت پہلے سے اِعلائے کلمۃ اللہ کے لیے، اور عالمِ اسلام کی جو کہ جسدِ واحد کی حیثیت رکھتا ہے حریّت کے دوام واستمرار کی حفاظت کے لیے جہاد جیسے فرضِ کفایہ کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھی ہے، اور خلافت کا پرچم اُٹھائے ہوئے خود کو عالمِ اسلام کے فداکار و جاں نثار کے مقام پر رکھا ہوا ہے، اِس ملک کو پہنچنے والے مصائب کا عوضانہ اُسے ضرور ملے گا اور اِن مصائب کی جگہ ایک اس طرح کی سعادت لے لے گی جس کی برکت سے عالمِ اسلام اٹھکھیلیاں کرے گا۔۔۔ اِس مصیبت نے عالمِ اسلام کے اَطراف واکناف میں اِسلامی اخوّت کو اُبھارنے اور اسے فروغ دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، وہ اسلامی اخوّت جو ہماری زندگی کا جوہر اور اس کی روحِ رواں ہے۔

53۔ تہذیب وتمدُّن کا سہرا اُس نصرانیت کے سر پر باندھ دینا جس میں اُس کا عمل دخل نہیں، اور پستی وپسپائی جو کہ اسلام کی دشمن ہے اُسے اس روپ میں ظاہر کرنا کہ وہ اس کی ہمہ وقتی دوست بن چکی ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ افلاک کا پہیہ اُلٹا گھوم گیا ہے۔

54۔ ہیرے کا ایک نایاب ٹکڑا کتنا بھی زنگ آلود کیوں نہ ہو ہمہ وقت چمکتے رہنے والے شیشے کے ٹکڑے سے بہتر ہے۔

55۔ جو لوگ ہر چیز کو مادے میں ہی تلاش کرتے ہیں، ان کی عقلیں اُن کی آنکھوں میں ہیں، اور آنکھ معنویات کے معاملہ میں اندھی ہے۔

56۔ مجاز جب علم کے ہاتھ سے نکل کر جہل کے ہاتھ لگ جائے تو حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور خرافات کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

57۔ وہ احسان جو احسانِ الٰہی سے بڑھ جائے، احسان نہیں؛ کیونکہ کسی بھی چیز کے بارے میں صرف وہی کچھ کہنا چاہیے جو کچھ کہ وہ ہے۔

58۔ شہرت انسان کو ایسی چیز کا بھی مالک بنا دیتی ہے جس کا مالک وہ ہوتا نہیں۔

59۔ حدیث نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام وسر چشمۂ حیات اور ملہمِ حقائق ہے۔

60۔ دین کا اِحیاء اُمت کا اِحیاء ہے، اور دین کی زندگی نورِ حیات ہے۔

61۔ قرآن کریم جو کہ تمام تر نوعِ بشر کے لیے رحمت ہے، صرف اسی تہذیب کو قبول کرتا ہے جو تمام لوگوں کی یا کم اَز کم مطلق اکثریت کی کفالت کرتی ہے، جبکہ تہذیبِ حاضر کی بنیاد پانچ سلبی بنیادوں پر استوار ہے۔

۱۔ اس کا نقطۂ استناد اور بنیادی جوہر ''قوت'' ہے، اور قوّت کی فطرت میں تجاوز و تعدِّی ہے۔

۲۔ اس کا ہدف اور قصد: منفعت خوری ہے، اور اس کا کی فطرت میں مقابلہ بازی اور دھکم پیل ہے۔

۳۔ زندگی میں اس کا دستور: جنگ و جدل ہے اور اس کا لازی تقاضا باہمی جھگڑے ہیں۔

۴۔ اس کا انسانی گروہ کے درمیان رابطہ سلبی قومیت و عصریت ہے جو کہ دوسروں کو نگل کر پھلتی پھولتی اور وسعت پکڑتی ہے، اور اس کے نتیجے میں خوفناک تصادم ظہور میں آتا ہے۔

۵۔ یہ نوعِ بشر کی پر کشش خدمت کرتی ہے، اور یہ خدمت نام ہے ہوا و ہوس کے جذبات کو بھڑکانے کا اور نفسِ امارہ کی خواہشات و رغبات پر لبیک کہنے کا، وہ ہوائے نفس جو انسان کو معنوی طور پر مسخ کرنے کا سبب ہے۔

رہی وہ تہذیب جو شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے دامن میں ہے اور جس کا وہ حکم دیتی ہے تو:

اس کا نقطۂ استناد ''قوّت'' کے بجائے ''حق'' ہے، اور حق کی خاصیت ہے عدالت و توازن اور اس کا ہدف منفعت کے بجائے فضیلت ہے۔ اور فضیلت کی صفت ہے مؤدت اور تجاذب۔ اس میں وحدت کی جہت عُنصریت اور قومیت کے بجائے دینی وطنی اور صنفی (۱) رابطہ ہے، اور اس رابطے کی صفت مخلص اخوت، سنجیدہ مسالمہ اور خارجی ظلم وعدوان کے مقابلے میں صرف دفاع ہے۔

زندگی میں اس کا دستور جنگ و جدل اور زور آزمائی کے بجائے باہمی تعاون ہے، اور تعاون کی صفت ہے اتحاد و تساند۔

یہ تہذیب ہوس و ہوا کے بجائے ہُدیٰ کی بنیاد رکھتی ہے، اور ہدی کی صفت ہے انسان کو رُوحانی طور پر کمالات کے زینوں پر چڑھا دینا۔

اس لیے اپنے ہاتھ کو اسلام سے پیچھے مت ہٹا جو کہ ہمارے وجود کا حامی ہے، اور اس کے دامن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے، وگرنہ ہلاک ہو جائے گا۔

62۔ عموی مصائب صرف اکثریت کی غلطیوں کی وجہ سے نازل ہوتے ہیں۔ پس مصیبت کسی جرم کا نتیجہ اور مکافات کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

---

(۱) صنفیت: اس سے مقصود وہ ارتباط ہے جو ہم جنس میلانات و افکار و اذواق و طبائع سے ترتیب پانے والی صنفِ واحد میں پایا جاتا ہے۔ مترجم۔

63۔ شہید خود کو زندہ سمجھتا ہے؛ اُس نے چونکہ سکرات الموت کا مزا نہیں چکھا ہوتا ہے، اس لیے وہ یہ سمجھتا ہے کہ جس زندگی کی اُس نے قربانی دی ہے وہ باقی رہنے والی اور غیر منقطع ہے۔ صرف اتنا ہے کہ وہ خود کو ایک بہتر عالم میں محسوس کرتا ہے۔

64۔ خالص قرآنی عدالت کسی ۔ بے گناہ انسان کا خون رائیگاں نہیں جانے دیتی اور اس کی زندگی ختم نہیں کرتی، اگر چہ اس کی جان لینے میں تمام نوعِ بشر کی زندگی پنہاں کیوں نہ ہو، چنانچہ جس طرح یہ دونوں قدرت کی نظر میں برابر ہیں، اُسی طرح عدالت کی نظر میں بھی برابر ہیں۔ لیکن وہ شخص کہ جس میں حرص وانانیت مضبوطی سے اپنے قدم جما چکی ہو وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو ہر اُس چیز کو ختم کر دینا چاہتا ہے جو اُس کی حرص کی تکمیل کی راہ میں کھڑی ہو جاتی ہے، اس حد تک کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ سارے عالم کو اور تمام نوعِ بشری کو تباہ کر کے رکھ دے۔

65۔ خوف اور ضعف خارجی تأثیرات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

66۔ کسی مزعوم مضرّت کے لیے محقّق مصلحت کو قرباں نہیں کیا جا سکتا۔

67۔ استنبول کی موجودہ سیاست ایک ہسپانوں بیماری کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے جس کی وجہ سے ہذیان پیدا ہوتا ہے۔

68۔ ایک مجنوں سے اگر یہ کہا جائے کہ: آپ تو بالکل ٹھیک ہیں، آپ بڑے اچھے ہیں، تو وہ واقعتاً ٹھیک ہو جائے تو یہ کوئی نادر بات نہیں، اسی طرح اگر کسی عاقل سے یہ کہہ دیا جائے کہ تُو بڑا خراب آدمی ہے، تو بہت بُرا ہے اور وہ واقعتاً برا بن جائے تو کچھ بعید نہیں۔

69۔ دشمن کا دُشمن دوست ہے جب تک وہ اس کا دشمن رہے، اور دشمن کا دوست دشمن ہے، جب تک کہ وہ اس کا دوست رہے۔

70۔ ضدّ یہ ہے کہ: شیطان جب کسی شخص کی مدد کرتا ہے تو اُس کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ تو فرشتہ ہے، اور اس پر رحم کھاتا ہے، لیکن جب کسی فرشتے کو دیکھتا ہے جو اس کے ساتھ اختلاف رائے رکھتا ہو، تو اس کے بارے میں کہتا ہے: ''وہ تو فرشتے کے بھیس میں شیطان ہے''۔ اور اس طرح اس پر لعنت کرتا ہے۔

71۔ کبھی ایک مرض کی دوا دوسرے مرض کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے اور دوا جب حد سے بڑھ جائے تو الٹی تأثیر کی حامل بن جاتی ہے۔

72۔ وہ جمعیت جس میں تساند یعنی باہمی پشتیبانی پائی جاتی ہے، وہ جمعیت ساکن چیزوں کو حرکت دینے کا ایک آلہ ہے، اور وہ جماعت جس میں تحاسد یعنی باہمی حسد ہو وہ حساب میں ضربِ کسری کے مشابہ ہے۔

73. جماعت میں اگر ایک صحیح[1] ہو تو جمع وضم کو حساب میں ضرب کسری کی طرح مُصغّر کر دیا جاتا ہے۔

74. بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ عدمِ قبول، قبولِ عدم کے ساتھ ملتبس ہو جاتا ہے، حالانکہ عدمِ قبول کی دلیل عدمِ دلیلِ ثبوت ہے۔ لیکن جہاں تک قبولِ عدم کا تعلق ہے تو وہ دلیلِ عدم کا محتاج ہے، پس ان میں سے ایک شک ہے اور دوسرا انکار۔

75. ایمانی مسائل میں دَر آنے والا شک اگر ایک دلیل تو کیا سو دلیلیں بھی گرا دے تو بھی مدلول کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا؛ کیونکہ دلیلیں تو ہزاروں ہیں۔

76. لوگوں کے سوادِ اعظم کی پیروی کرنا واجب ہے؛ امویوں نے جب اکثریت اور سوادِ اعظم پر اعتماد کیا تو وہ اپنی بے اعتنائی اور توہین آمیز رویوں کے باوجود بالآخر اہلُ السنۃ والجماعۃ گنتی میں داخل ہو گئے، جبکہ علویوں نے تعداد کی قلت پر اعتماد کیا تو ان میں سے بعض لوگ۔ پختہ تر ہونے کے باوجود۔ رافضیت کے دائرے میں داخل ہو گئے۔

77. جب حق میں اتفاق اور اُحق میں اختلاف ہو جائے تو حق، اُحق سے زیادہ اُحق ہو جاتا ہے۔ اور حسن اُحسن سے بھی زیادہ اُحسن ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی کو اپنے مذہب کے بارے میں یہ کہنے کا حق ہے کہ: ''یہ حق ہے، یہ حَسن ہے''، لیکن اسے یہ حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ: ''یہی حق ہے، یہی حسن ہے''۔

78. اگر جنت نہ ہوتی تو جہنم عذاب نہ دیتی ہو۔

79. زمانہ جوں جوں بوڑھا ہوگا قرآن جوان ہوتا جائے گا اور اس کے اسرار ورموز نکھر کر سامنے آتے جائیں گے، نور جیسے دور سے نار کی طرح نظر آتا ہے، اُسی طرح کبھی کبھی بلاغت کی شدت بھی مبالغہ نظر آتی ہے۔

80. حرارت کے مراتب برودت کے تداخُل سے عبارت ہیں۔ اور حسن کے درجات قبح کے تداخل سے عبارت ہیں۔ رہی قدرتِ اَزلی، تو وہ ذاتی، لازمی اور ضروری ہے؛ لہٰذا اس میں عجز چونکہ سرایت نہیں کرتا اور خلل انداز نہیں ہوتا، اس لیے اس میں مراتب اور درجات بھی نہیں ہیں۔ اس کی بہ نسبت تمام چیزیں برابر ہیں۔

81. سورج کی تمثال چونکہ اس کے فیض کی تجلّی ہے، اسی لیے سطحِ سمندر اور اس کے قطرات میں عین اُسی ہویّت کو آشکار کرتا ہے۔

---

(۱) حساب کا یہ معلوم قاعدہ ہے کہ: ضرب اور جمع سے رقم بڑھ جاتی ہے، مثال کے طور پر: 4x4=16، لیکن حساب کسری میں ضرب وجمع سے رقم چھوٹی ہوتی جاتی ہے مثال کے طور پر ثُلث کو ثُلث میں ضرب دینے سے حاصل ضرب نوآتا ہے۔ انسانی جماعتوں کی صورتِ حال بھی یہی ہے اگر ان کے درمیان صدق واستقامت پر مبنی وحدت نہ ہو تو، چنانچہ یہ جب جب زیادہ ہوتی ہیں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں، اور ان میں فساد وانحلال دَر آتا ہے۔ مؤلف۔

82۔ زندگی توحید کی ایک تجلی ہے، اور اس کی انتہائی منزل وحدت کا حصول ہے۔

83۔ جب تک ولی لوگوں کے درمیان، قبولیت کی گھڑی جمعہ میں، لیلۃ القدر رمضان میں، اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم اسمائے حسنیٰ میں اور اجل عمر میں پوشیدہ رہیں گے اور ان کا کسی کو علم نہیں ہوگا، ان میں سے ہر ایک کی قیمت اور اہمیت باقی رہے گی؛ اسی طرح ایک مبہم عمر کے بیس سال اُس معین عمر کے ایک ہزار سال سے کہیں بہتر ہیں جس کا آخری قدم اور انجام معلوم ہو۔

84۔ دنیا میں گناہ کا انجام اُخروی سزا کی بڑی دلیل ہے۔

85۔ قدرت کی نظر میں جس طرح زندگی بہت اہمیت رکھتی ہے، اسی طرح رزق بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے، چنانچہ قدرت ذی حیات کو عدم سے وجود اور تقدیراً اُسے ایک معیّن لباس پہنا دیتی ہے، اور عنایت و توجہ اس کو رونق مہیا کرتی ہے۔ پس زندگی ایک حاصل شدہ محدود اور مشاہدے میں آنے والی چیز ہے۔ رہا رزق تو وہ وقتی طور پر غیر حاصل، تدریجی اور منتشر چیز ہے جو انسان کو تدبیر پر آمادہ کرتا ہے۔ بھوک سے موت واقع نہیں ہوتی؛ کیونکہ انسان جسم میں ذخیرہ شدہ چربی اور دیگر مواد کو مکمل طور پر استعمال کر لینے سے پہلے مرتا نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت کا سبب انعدامِ رزق نہیں بلکہ وہ بیماری ہے جو ترکِ عادت سے جنم لیتی ہے۔

86۔ گوشت خور وحشی جانوروں کا حلال رزق غیر محدود حیوانات کے مردہ اجسام ہیں، یہ جانور اپنا یہ رزق حاصل کر کے زمین کا چہرہ بھی صاف کرتے ہیں۔

87۔ ایک لقمہ ایک روپے کا ہے اور دوسرا بطورِ مثال دس روپے کا ہے، اور منہ کے چند لمحے اُس مہنگے لقمے سے لذت گیر ہونے کے معمولی سے فرق کے سوا، منہ میں داخل ہونے سے پہلے اور حلق سے گزرنے کے بعد یہ دونوں برابر ہیں؛ اس بنا پر حاسۂ ذوق کہ جس کی ڈیوٹی صرف تفتیش اور پہریداری ہے، اُسے خوش کرنے کے لیے ایک کے بجائے دس روپے خرچ کر دینا اسراف کی بدترین صورت ہے۔

88۔ جب لذتیں آواز دیں تو اُنہیں جواب میں یہ کہنا چاہیے کہ: ''گویا کہ میں کھا چکا ہوں''، جس نے بھی اس جملے کو اپنا دستور بنا لیا، وہ ''صَانکی یدم ''[1] نامی مسجد کو کھا جانے کی گنجائش رکھتا ہے لیکن اس نے نہیں کھائی۔

---

(۱) یہ مسجد استنبول میں محلّہ سلطان محمد فاتح میں واقع ہے: کہا جاتا ہے کہ اس کے بانی کا جب بھی کوئی چیز کھانے کا جی چاہتا تو وہ کہہ دیتا ''صَانکی یدم ''یعنی گویا کہ میں کھا چکا ہوں۔ اس طرح اس نے اتنے پیسے جمع کر لیے جو مسجد بنانے کے لیے ضروری تھے۔۔۔ یہیں سے اس کا نام یہ پڑ گیا۔ مترجم۔

89۔ پچھلے دور میں اکثر مسلمان بھوکے نہیں تھے، اس بنا پر ترَفُّہ اور آسودگی جائز الاختیار تھی۔ لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ بھوکے ہیں، اس لیے تلذُّذ کے باب میں کوئی اختیار نہیں۔

90۔ عارضی لذت کے لیے تبسم ریز ہونے کے بجائے، عارضی رنج والم کے سامنے مسکراہٹیں بکھیرنا چاہیے؛ کیونکہ لذتہائے گزراں انسان کی زبان پر حسرتوں بھرے الفاظ جاری کر دیتی ہیں، اور وہ تو صرف اور صرف دکھ درد کا ایک چھپا ہوا نظر نہ آنے والا ترجمان ہے، جبکہ آلام ہائے گزراں انسان کے منہ سے یہ نکلواتے ہیں کہ: ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو پوشیدہ لذت اور نعمت کے بارے میں خبر دیتا ہے۔

91۔ نسیان بھی ایک نعمت ہے؛ کیونکہ یہ صرف روزانہ کے آلام ومصائب ہی چکھاتا ہے، اور آلام ومصائب کے جو انبار لگ چکے ہوتے ہیں، اُنہیں فراموش کر دیتا ہے۔

92۔ ہر مصیبت میں ایک نعمت کا درجہ ہے، بالکل ایسے جیسے کہ اس حرارت کے درجات ہیں جس میں برودت سرایت کر جاتی ہے، اس لیے بڑی مصیبت میں پائے جانے والے نقصان کو سوچ اور چھوٹی مصیبت میں پائی جانے والی نعمت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے، وگرنہ چھوٹی چیز میں اگر ہوا بھر دی جائے اور اُسے بڑا کر دیا جائے تو وہ پھول کر بڑی ہو جاتی ہے۔ اور جب اس کی وجہ سے قلق واضطراب کا اظہار کیا جائے تو وہ جڑواں ہو جاتی ہے اور اُس کی دل میں پائی جانے والی وہمی مثال ایک ایسی حقیقت کا رُوپ دھار جاتی ہے جو دل کو پیس کر رکھ دیتی ہے۔

93۔ ہر شخص ایک کھڑکی کا مالک ہے جس سے وہ دیکھنے اور دکھانے کے لیے معاشرے کی طرف جھانکتا ہے، اور اس کھڑکی کا نام ہے مقام ومرتبہ۔ یہ کھڑکی اگر اُس کے قد وقامت کی قدر وقیمت سے بلند ہو تو وہ تکبر سے بلند قامتی کے اظہار کی کوشش کرتا پھرتا ہے، لیکن اگر وہ کھڑکی اس کے قد وقامت کی قیمت سے پست ہو تو وہ کبڑا ہو کر تواضع کا اظہار کرتا ہے اور اتنی پستی اختیار کرتا ہے کہ اس کا مشاہدہ اسی درجے میں کیا جاتا ہے۔ انسان عظمت کے کس درجے پر فائز ہے، اُسے ماپنے کا ایک ہی پیمانہ ہے، اور وہ ہے تواضع، رہا اس کی پستی اور اس کے چھوٹے پن کو ماپنے کا پیمانہ، تو وہ ہے تکبر اور تعاظُم۔

94۔ عزتِ نفس جس کا احساس ایک کمزور کو طاقت ور کے مقابلے میں ہوتا ہے، یہی عزتِ نفس اگر طاقت ور میں ہو تو تکبر اور غرور بن جائے گی، اسی طرح تواضع جس کا احساس ایک طاقت ور کو کمزور کے مقابلے میں ہوتا ہے، وہ تواضع اگر کمزور میں ہو تو ذلت اور پستی شمار ہوگی۔

ایک سربراہ کی سنجیدگی اپنے اصل مقام پر وقار ہوگی لیکن اس کی نرمی، تواضع اور فروتنی کی دلیل ہوگی۔

ایک آدمی اگر خود اپنی ہی نمائندگی کر رہا ہو تو اس کی گناہگاروں اور غلط کاروں سے عفو ودرگزری کی اور اپنا سب

کچھ قربان کر دینے کی روش یقیناً ایک بہت اچھا کام ہے، لیکن وہی آدمی اگر جماعت کا ترجمان ہو تو اس کی یہ روش خیانت ہوگی اور وہ غلط کام کا مرتکب ٹھہرے گا۔

انسان اپنی ذات کے لیے تو غصہ پی سکتا ہے، لیکن اُسے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی کسی ذاتی خصوصیت پر فخر کرتا پھرے، البتہ اُس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اُمت کی نمائندگی میں فخر کر لے، لیکن اس کی نمائندگی میں غصہ نہیں پی سکتا۔

95۔ مقدمات کی ترتیب میں توکل کرنا کسلمندی ہے، اصل توکل یہ ہے کہ نتائج کی ترتیب میں معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ انسان کا اپنی قسمت پر راضی رہنا قناعت ہے، کہ یہ سعی وعمل کے میلان کو تقویت دیتی ہے، جبکہ موجودہ چیزوں پر اکتفا کر کے بیٹھ رہنا کوتاہیٔ ہمت کی دلیل ہے۔

96۔ جس طرح معروف شرعی اوامر میں طاقت وعصیاں پایا جاتا ہے، اسی طرح تکوینی اوامر میں بھی طاعت و عصیان ہے۔ شریعت کا اطاعت گزار وعصیان کار اپنی جزا وسزا۔ غالباً۔ آخرت میں دیکھتا ہے، اور تکوینی اُمور یا سُننِ کونیہ کا اطاعت گزار وعصیاں کار۔ غالباً۔ اپنی جزا وسزا دنیا میں ہی پالیتا ہے۔

جیسے صبر کا بدلہ نُصرت ہے، بے کارمی و کسلمندی کا بدلہ ذِلّت اور سِفلہ پن ہے، اسی طرح سعی وعمل کا بدلہ تونگری و بے پرواہی ہے اور ثابت قدمی کا بدلہ غلبہ ہے۔ وہ عدالت جس میں مساوات نہ ہو عدالت نہیں۔

97۔ تماثُل تضاد کی داعی ہے، تناسب تساند کی اساس ہے، نفس کا چھوٹا پن تکبر کا سرچشمہ ہے، ضعف غرور کا معدن ہے، عجز مخالفت کا منبع ومصدر ہے، اور شغفِ علم کا اُستاد ہے۔

98۔ قدرتِ فاطرہ نے تمام ذی حیات کو لگام دے رکھی ہے، اور ان میں حاجت کی رُو سے فہرست انسان ہے، اور خاص کر بھوک کی حاجت۔

اس نے تمام ذی حیات کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے، اور اس طرح اس نے دنیا کو ہرج مرج سے بچالیا ہے اور حاجت کو تہذیب کا اُستاد بنا کر انسان کے لیے ترقی کی راہیں آشکار کر دی ہیں۔

99۔ گھٹن اور تنگی بے حیائی و بدقماشی کی تعلیم دیتی ہے، نا اُمیدی گمراہیٔ فکر کا سرچشمہ ہے، اور دل کی تاریکی تنگیٔ روح کا سرچشمہ ہے۔

100۔ إِذَا تَأَنَّثَ الرِّجَالُ بِالتَّهَوُّسِ. تَرَجَّلَ النِّسَاءُ بِالتَّوَقُّحِ جب بیوقوف مرد ہوس کی وجہ سے عورتیں بن جائیں تو پھر نافرمان عورتیں بے حیائی کے ساتھ مرد بن جاتی ہیں کوئی خوبصورت عورت جب بھی کسی ایسی مجلس میں داخل ہوتی ہے جہاں اخوت و بھائی چارے کی فضا غالب ہے، وہاں جاتے ہی وہ ریاکاری، رقابت، حسد اور انانیت کی رگوں کو برانگیختہ کر دیتی ہے۔ پس عورتوں کی بے پردگی میں ایک مہذب ومتمدن انسان کے اندر چھپے ہوئے برے اخلاق نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

101۔ اس دور میں نوعِ بشر کی گناہوں میں لتھڑی ہوئی بے احتیاط و بے لگام روحوں کے لیے ان مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی تصویروں یعنی ان چھوٹے چھوٹے جنازوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

102۔ شرعی طور پر ممنوع ہیکل؛ یا تو ظلمِ متحجر ہیں، یا ہوائے متجسم، یا ریائے متجسد۔

103۔ توسُّع اور اجتہاد کا میلان اگر ان لوگوں کی طرف سے ہو جو اسلام کے دائرے میں حقیقی طور پر اس کی تمام تر مسلّمات کو قبول کر کے داخل ہوئے ہیں، تو وہ ہمہ جہت سے مکمل ہونے کا میلان ہوگا، لیکن میلان اگر ان لوگوں کی طرف سے ہو جو ضروریاتِ دین کو بے کار سمجھتے ہیں، تو وہ میلان تخریب کاری کا میلان ہوگا اور وہ مجتہد لااُبالی ہونے کی وجہ سے اس دائرے سے باہر شمار ہوگا؛ کیونکہ جب تباہ کن تیز ہوائیں چلتی ہیں اُس وقت مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اجتہاد کے دروازے کھول دینے کی بجائے اُس کی کھڑکیاں بھی بند کر دی جائیں۔

جو لوگ دین کی پروا نہیں کرتے انہیں رخصتیں دے کر ان کے ساتھ لطف و نرمی کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ انہیں عزائم کے ذریعے سختی کے ساتھ جھنجھوڑ کر بیدار کر دینا چاہیے۔

104۔ ہائے مسکین حقائق! جب یہ عام پست قسم کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں تو اپنی قیمت کھو بیٹھتے ہیں۔

105۔ ہمارا یہ کرۂ ارض حیوان کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، زندگی کے آثار ہویدا کرتا ہے۔ کیا خیال ہے۔ اگر یہ اتنا چھوٹا ہو جائے کہ ایک انڈے کا حجم اختیار کر جائے، تو کیا یہ ایک قسم کا حیوان ہی نہ بن جائے گا؟ یا اگر ایک جرثومہ جب ہمارے اس کرے جتنا بڑا ہو جائے تو کیا وہ اس کے مشابہ نہ ہو جائے گا؟ اور اگر اس میں زندگی آجائے، تو اس میں روح بھی ہوگی، اور اگر یہ کائنات اِتنی چھوٹی ہو جائے کہ انسان کا حجم اختیار کر جائے، اور اس کے نجوم وکواکب ذرّات و بے نظر جواہرات کا رُوپ دھار جائیں؛ تو کیا وہ بھی ذی شعور حیوان نہ بن جائے گا؟ اللہ تعالیٰ کے اس طرح کے بہت سے حیوانات ہیں۔

106۔ شریعتیں دو ہیں۔

ایک ہماری مشہور شریعت جو انسان یعنی عالمِ اصغر کے افعال و احوال کو منظم کرتی ہے۔ اور یہ صفتِ ''کلام'' سے برآمد ہوتی ہے۔

دوسری وہ فطری شریعتِ کبریٰ جو کہ کائنات یعنی انسانِ اکبر کی حرکات وسکنات کو منظم کرتی ہے۔ اور یہ صفتِ ''ارادہ'' سے برآمد ہوتی ہے اسے کبھی غلطی سے نیچر کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اور ملائکہ ایک بہت بڑی اُمت ہیں، وہ تکوینی اوامر کے حامل ہیں، ان کی ترجمانی کرنے والے ہیں اور اُن کے مطابق ڈھلنے والے ہیں، وہ اوامر جو صفتِ ''ارادہ'' سے آتے ہیں اور جنہیں فطری شریعت کہا جاتا ہے۔

107۔ اِذَا وَازَنْتَ بَیْنَ حَوَاسِّ حُوَیْنَةٍ خُرْدَ بِیْنِیَّةٍ وَحَوَاسِّ الْاِنْسَانِ تَرَی سِرًّا عَجِیْبًا اِنَّ